ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

جلد ۴ — بابت مارچ سنہ ۱۹۴۱ء — شمارہ ۳

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) "یہ ادارہ ادبیات اردو" کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابلِ اشاعت متصور نہ ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کرکے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کرکے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی - وی پی یا وی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر خیریت آباد سے شایع ہوا

بھاگ متی المخاطب بہ حیدر محل

سنہ ۹۷۴ھ تا ۱۰۱۶ھ

[illegible]

AZAM STEAM PRESS

بھاگ متی یا حیدر محل

بھاگ متی کو دکن اور خاص کر حیدر آباد کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ حیدر آباد جیسا فرخندہ بنیاد شہر اسی کی عشق و محبت کی دائمی یادگار ہے۔ بھاگ متی کے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کی عشق عاشقی کا تذکرہ سب سے پہلے خود اسی کی زندگی میں تاریخ فرشتہ، طبقات اکبری، منشآت فیضی اور قطب مشتری وغیرہ کتابوں میں لکھا گیا ہے۔ قطب مشتری کے مصنف ملا وجہی نے تو اس واقعہ کے متعلق استعارہ کے پیرایے میں تفصیلی حالات بیان کردے ہیں۔ طبقات اکبری (سنہ ۱۰۰۲ھ) میں لکھا ہے:۔

"برپاترے بھاگ متی نام عاشق شد و شہرے بنا کردہ بھاگ نگر موسوم ساخت و یک ہزار سوار نوکر آں فاحشہ ساخت کہ دائم ملازم رکاب او بودند تا غایت سنہ اثنی والف ہجری نہ سالست کہ حکومت می کند" ص ۴۴۴ مطبوعہ منشی نولکشور

جب فیضی کو شہنشاہ اکبر نے دکن کی مہم کے لئے روانہ کیا تو اس نے اپنی ایک عرضداشت میں دکن کی خود مختار اسلامی سلطنتوں کا حال بادشاہ کی اطلاع کے لئے لکھ بھیجا تھا جس میں محمد قلی قطب شاہ سے متعلق لکھتا ہے:۔

"تشیع دارد و معمورہ ساختہ و عمارات پرداختہ بھاگ نگر بنام بھاگ فاحشہ کہنہ و معشوقۂ قدیمۂ اوست"

یہ عرضداشت منشآت فیضی میں درج ہے جس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ مورخ فرشتہ نے لکھا ہے:۔

"و آں قطب فلک اجلال در اوائل پادشاہی بر فاحشہ بھاگ متی عاشق شدہ ہزار سوار ملازم او گردانیدہ تا بطریق امرائے کبار بہ دربار آمد و شد می نمودہ باشند۔ و درآں ایام چوں از زبونی آب و ہوائے گولکنڈہ خلائق متنفر و پر اندوہ بودند قطب شاہ در چہار کروہے بلدہ مذکور شہرے . . ساختہ موسوم بہ بھاگ نگر گردانید" (صفحہ ۱۷۳)

محمد قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد گولکنڈہ میں جو تاریخیں لکھی گئیں ان میں بھاگ متی کا حال درج نہیں ہے۔ البتہ بعد کی تاریخوں مثلاً حدیقۃ العالم، تاریخ قطب شاہی (قادر خاں) اور گلزار آصفی میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ موخر الذکر تاریخ میں ابراہیم قطب شاہ کے بیان میں لکھا ہے:۔

"پل دریائے موسیٰ بسبب تعشق شہزادہ مرزا محمد قلی کہ بر حسن جانفزائے بھاگ متی طوائف میلے کلی داشت تیار گردید حقیقت آں ایں کہ شہزادۂ مذکور بر طبق عادت معہود کہ مواصلت خفیہ لذت بسیار میدید ہموارہ بوقت شب از قلعہ محمد نگر بخانۂ طوائف مذکورہ در موضع چچلم کہ آبادی بلدہ حیدر آباد بر زمین ہموں موضع واقع است آمد و شد می داشت۔ روزے موسم باراں موافق معمول خود بوقت شب قصد نمودہ چوں بر بر دریائے موسیٰ رسید دید کہ طغیانی آب از حد زیادہ است کہ فیل نہ دستی کوہ پیکری تواند قدم اندرونش گذارد فوراً در جذبۂ عشق و محبت اسپ سواری خود را بے اندیشہ در تلاطم تموج آب انداخت و بہ زور حفظ حقیقی بسلامت برآمد" (صفحات ۱۴، ۱۵)

یہ واقعہ حیدر آباد میں زبان زد خاص و عام ہے اور راقم الحروف نے اس تاریخی واقعہ کو افسانے کی شکل میں پیش کرکے "چچلم کی رقاصہ" کے عنوان کے تحت اپنی کتاب سیر گولکنڈہ میں شامل کیا ہے۔

گلزار آصفی سے تقریباً پچاس سال قبل حیدر آباد میں ایک اور تاریخ حدیقۃ العالم لکھی گئی تھی اس میں بھی بھاگ متی کا ذکر موجود ہے کہ:۔

"بادشاہ درآں ایام بزنانہ بھاگ متی نام تعلق خاطر داشت

چنانچہ ہزار سوار ملازم او گردانید تا ہمچو امرائے کبار بدربار آمد و شد می نمودہ باشد۔ لہٰذا نخست آں (شہر حیدرآباد) را بہ بھاگ نگر موسوم ساخت و مستقر سریر سلطنت خود گردانید" (صفحہ ۲۱۵)

بہر حال موجودہ معلومات کی بناء پر اتنا یقین سے کہا جاتا ہے کہ محمد قلی عنفوان شباب ہی میں (یعنی ۱۴ سال کی عمر میں) بھاگ متی پر عاشق ہوا اور اس کی خاطر طغیانی رود موسیٰ میں اپنا گھوڑا ڈال دیا جب اس خطرناک جرات کی خبر اس کے باپ ابراہیم قطب شاہ کو ہوئی تو اس نے ندی پر پل بنوادیا۔ اس کے کچھ دن بعد ہی ابراہیم کا انتقال ہوگیا اور محمد قلی نے تخت نشین ہوتے ہی اپنی محبوبہ کے اعزاز و اکرام میں اضافہ کی خاطر ہزار سوار اس کے یہاں متعین کر دیئے جو ہر وقت اس کے جلوس میں رہتے اور وہ اسی شان و شوکت کے ساتھ موضع چچلم سے گولکنڈہ آیا کرتی تھی اور خود محمد قلی بھی اس کے یہاں جایا کرتا۔ اسی اثناء میں اس نے اپنی محبوبہ کے گاؤں کو ایک عظیم الشان شہر میں تبدیل کرنے کی ٹھانی اور جب یہ شہر بن گیا تو اسی کے نام پر اس کا نام بھاگ نگر رکھا۔

حیدرآباد میں خود دولت خانۂ عالی اور دیگر محلات کے بن جانے کے ساتھ ہی محمد قلی نے بھاگ متی کو اپنے حرم میں داخل کرلیا اور شادی کے بعد مشتری اور بعد کو حیدر محل کا خطاب دیا۔ اور اس کے لئے ایک خاص محل بھی بنوادیا جس کا نام حیدر محل یا حیدر منڈ وہ رکھا گیا۔ پھر اس خطاب کی مناسبت سے بھاگ نگر کا نام بھی حیدرآباد میں تبدیل کر دیا گیا۔ بعض مورخین کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ محمد قلی نے بھاگ متی کے انتقال کے بعد پشیمان ہو کر شہر کا نام بدل دیا کیونکہ اس نے خود اپنی نظموں میں اپنی محبوبہ حیدر محل کا ذکر کیا ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ خطاب بھاگ متی ہی کو دیا جاسکتا تھا جو آخر وقت تک جملہ مورخین کے قول کے مطابق اس کی چہیتی محبوبہ تھی۔ اثناء [illegible] بعد محمد قلی نے اس امر کی کوشش کی تھی کہ بھاگ متی اور بھاگ نگر کا نام لوگوں کے ذہن سے محو ہو جائے اور حیدر محل اور حیدرآباد رائج ہو جائیں۔ چنانچہ جب وجہی نے بھاگ متی سے عشق عاشقی کا قصہ لکھا تو اس میں بھی اس نام کو چھپائے رکھا اور خود محمد قلی نے بھی اپنے کلیات میں اس نام کی بجائے جگہ جگہ حیدر محل کا نام لکھا ہے۔ ورنہ لازمی تھا کہ جب وجہی مشتری کے سامنے محمد قلی کی معشوقاؤں کا تذکرہ کراتا ہے تو بھاگ متی کا بھی ضرور ذکر کرتا لیکن اس نے تو خود بھاگ متی ہی کو مشتری کے نام سے ظاہر کیا ہے۔ اور اس مشتری یا بھاگ متی کے متعلق محمد قلی نے اپنے کلیات میں دو نظمیں اور مختلف جگہوں پر اشعار لکھے ہیں۔

یہ نظمیں کلیات کے صفحہ ۲۶۲ تا ۲۶۴ پر درج ہیں۔ ایک نظم میں وہ مشتری کو اپنی آنکھ کی پتلی کہتا ہے اور اس کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ :-

"سب کو تیرے جوبن سے عشق ہے۔ تیرے ہونٹ کوثر کا پیالہ پلاتے ہیں، ان پر محبت کا نشان ہے اور ان کے چومنے سے نبات شرما جاتی ہے۔ ہوشیار سے ہوشیار عورتوں میں تو ہوشیار ہے اسی لئے میں تجھے منا کر اپنے دل میں بٹھاتا ہوں وغیرہ"

ایک دوسری نظم میں وہ کہتا ہے :-

اے قطب شاہ تو اپنے معشوقوں کی سلامتی کے لئے دعا کر کیونکہ اس کے جینے سے تمام دنیا پر تیری فرمانروائی ہے۔ زندگی اسی کا نام ہے کہ جسم میں دل ہو۔ اور ہمارا دل ہمارا معشوق ہے جس میں عشق کی مستی ہے جس کی وجہ سے وہ ہمارے دل میں عرصے سے جگہ پائے ہوئے ہے، جہاں اس کا نور سورج کی شعاعوں سے زیادہ خوش نما اور روشن ہے۔ زحل تے بہت سے دشمنوں [illegible] کو

میٹ دیا ہے اور مشتری کے طالع کی وجہ سے ہمارے
طالع کو بقا حاصل ہے۔ اس لئے اے خدا قطب شاہ کے
اس تارے کو اپنی عنایت سے سرفراز رکھ"

ان نظموں کے علاوہ محمد قلی نے مختلف جگہوں پر حسب ذیل خیالات
کا اظہار کیا ہے کہ :۔

اے قطب شاہ تو شادی و خوشی کر کہ نیز رشتہ اس کے رشتہ
سے بندھا ہوا ہے اور مشتری تیرے لئے باعث برکت
ثابت ہو رہی ہے۔
تو ثانی سلیمان ہے اور فتح و فیروزی تیرے ہی لئے ہے
اور تو نے اپنا منظور نظر بنا کر مشتری کو بھی شرف یاب کر دیا۔

اس کے شعر ہیں ؎

رشتہ ترا اس رشتہ سوں ہے بند معانی
شادی و خوشی کر کہ اہے مشتری تج راس
توں سلیماں ثانی تج برج فیروزی و فتح
مشتری پایا شرف تیری نظر منظور تھے

بعض شعروں میں وہ مشتری کو اپنی بزم میں رقص کناں
ظاہر کرتا ہے، جس سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بھاگ متی ہی کا پہلا
خطاب تھا :۔

ع کرے مشتری رقص مجھ بزم میں نت ع زہرہ و مشتری سوں پاتر نچا جاؤں
ندا رو ما دی موتیاں کی آرتی بھر کر
سو زہرہ مشتری کے ہت (ہاتھ سے) پلا ڈلائے آج

اسی طرح حیدر محل یا حیدر پیاری کے متعلق بھی اس کے
کلیات میں تین نظمیں اور مختلف اشعار دستیاب ہوتے ہیں۔
جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیدر محل فن موسیقی کی ماہر تھی اور محمد قلی
کی خاص معشوقہ تھی۔ ایک نظم میں کہتا ہے کہ :۔

حیدر محل بہشت سے صفات [illegible] روز بروز
عیش و عشرت کے ساتھ عشق کے طبل بجاتی ہے۔
اس کے سرو جیسے قد پر نور تن کا جلوہ نظر آتا ہے
اور سب معشوقائیں اس کو دیکھ کر شرماتی ہیں۔ وہ اپنی
پیشانی پر عشق کا ٹیکا (قشقہ) لگاتی ہے اور چاروں
طرف نور تن کے تار بجتے ہیں وہ عشق کی چادر اوڑھ کر
بیر بہوٹی کی طرح سرخ نظر آتی ہے۔ اے قطب شاہ
تو شکر کر کہ حیدر کی غلامی کی وجہ سے تجھ کو یہ مہ جبین
ملی جس کی وجہ سے تیرے سر پر تاج سجتا ہے (دیکھو صفحہ ۲۵۷)

ایک دوسری نظم میں لکھتا ہے کہ :۔

نبیؐ کے صدقے میں حیدر پیاری ملی ہے جس نے اپنے
مختلف انداز سے میرے دل کو اپنے دل سے باندھ
لیا ہے۔ وہ عشق کے پر اسرار راگ گاتی ہے' اس
کے بال میں کنول کی تازگی اور آفتاب کی چمک ہے
وہ اپنی بھوؤں میں کاجل لگاتی ہے جسم میں نارنجی
رنگ کی تنگ چولی پہنتی ہے۔ اور آنکھوں کے
خط سرمہ کے ذریعے سے میرے دل پر حملہ کرتی ہے (دیکھو صفحہ ۲۵۸)

ایک دوسری نظم میں جو نامکمل دستیاب ہوئی ہے لکھا ہے کہ :۔

حیدر محل محبت و عشق کا جلوہ گائے اور یزدانی نغمہ
بجائے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں جلوے کے لئے
کنگن پہن رکھا ہے' وہ اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو
پتلیوں کی طرح نچائے وغیرہ (دیکھو صفحہ ۲۵۸)

محمد قلی نے اس حیدر محل یا حیدر پیاری کے لئے ایک
محل بھی بنا دیا تھا جس کا نام حیدر محل یا حیدر منڈوہ رکھا تھا
اس کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔ اس نظم میں لکھتا ہے :۔

حیدر محل میں حیدر پیاری کا جلوہ گاؤ اور اس
نو محل میں [illegible] اور [illegible] فتح و نصرت کے

طبل بجاؤ۔ اے ساقی سیم ساق میری بزم میں صراحی لے آ۔ اور پیالے کی روشنی میں مجھے اپنے سائیں کی صورت دکھا۔ (یہ قاعدہ ہے کہ جلوہ کے وقت آئینہ میں دولھا کو دلہن کی صورت دکھاتے ہیں) اور سورج کے طبق سے لے کر نقل و شراب اپنے رخساروں میں رکھ لو اور پیاری کی محبت کے ہار پیارے کے گلے میں ڈالو۔ اِس نیک ساعت میں سینوں پر پستانیں زیب دیتی ہیں۔ دودھ اور مصری سے آبحیات کے اِن گھڑوں کو بھر دو۔

اس جلوے کے وقت بادشاہ اتنا اچھا نظر آتا ہے کہ پدمنیاں اور چتینیاں سب شاہ کے روپ کی دیوانی ہوگئی ہیں۔ اے سکھیو ان کے ہاتھ سے قول کا بیڑا اٹھا کر شہ کو کھلاؤ۔ نبیؐ کے صدقے میں آج قطب شاہ کو جلوے میں بیٹھنا نصیب ہوا ہے۔ اس لئے حوروں اور پریوں کو چاہیے کہ شہ پر سے خود کو واریں۔" (صفحہ ۲۱۷)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم حیدر محل کے ساتھ شادی کرنے کی تقریب میں لکھی گئی ہے۔ اور بھاگ متی کو نکاح کے وقت ہی حیدر محل کا خطاب دیا گیا تھا۔ اور بعد کو اسی کے خطاب کے لحاظ سے بھاگ نگر کا نام حیدرآباد میں تبدیل کر دیا گیا۔

بھاگ متی نے محمد قلی کی زندگی میں ۱۰۱۷ھ سے قبل چالیس بیالیس سال ہی کی عمر میں وفات پائی۔ کیونکہ تاریخ فرشتہ اور قطب مشتری دونوں کی تصنیف کے وقت اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے زمانۂ وفات کا یہ اندازہ اس وجہ سے صحیح نکلتا ہے کہ بعض مورخوں نے شہر کے نام کی تبدیلی کو بھاگ متی کی وفات سے لازم و ملزوم قرار دے کر بتایا ہے کہ تعمیر کے سترہ سال بعد اس کا نام حیدرآباد رکھا گیا[1]۔ گویا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ۱۰۱۶ھ کے لگ بھگ گولکنڈہ کی یہ مشہور مہ جبین اپنے عاشق جانباز کو داغ مفارقت دے گئی۔

---

[1] تاریخ قطب شاہی مولفہ قادر خاں بیدری ۱۲۴۹ھ میں لکھا ہے :۔
"بعد ہفدہ سال بہ حیدرآباد موسوم گردید" (صفحہ ۱۶)

آخر میں نمونے کے طور پر خود محمد قلی کی ایک نظم کے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ یہ ساڑھے تین سو سال قبل کی اُردو ہے :

حیدر محل میاتے نابات گھول ساجے ‏ ‏ ‏ دن دن انند سیتے طبلاں مدن کے باجے
(محبت سے نبات ‏ ‏ سے عشق بجاتی ہے)

اس سرو قد کے اوپر جلوہ ہے نور تن کا ‏ ‏ ‏ عشق کے پاتراں سب اس کاس دیکھ لاجے
(اس کے ‏ ‏ شرماتے ہیں)

سب عاشقاں کے دل میں ہی عشق پھول جلوہ ‏ ‏ ‏ پتلیاں نین کیاں میر من میں انندسوں کاجے
(پھول کا ‏ ‏ آنکھ کی)

چادر عشق کا اوڑھے جوں بیر بھوٹی دیسے ‏ ‏ ‏ تیرے عشق کے لاجاں دیکھے ہیں لاجوں بھاجے
(نظر آئے)

صدقے نبی شکر کر تج کوں ملی اے پاتر ‏ ‏ ‏ حیدر غلامی سیتے تجہ سیس تاج ساجے
(یہ ‏ ‏ کی سے تیرے سر پر سجتا ہے)

سید محی الدین قادری زورؔ

سماج

دھرا ہوا ہے جہالت کے سر پہ تاج ابھی نہیں "عروس" کی آزادیوں کا راج ابھی
دلوں کے بھید سے واقف نہیں سماج ابھی ہر آرزو کو کچل دو یہ ہے رواج ابھی
جو پائے حسن اطاعت پہ حسرتیں سج دو
تو والدین کی مرضی پہ زندگی تج دو

مراد یہ نہیں۔ مغرب کے کان کاٹے ہند خلیج عفت و عصمت گنہ سے پاٹے ہند
فضائے عیش و طرب میں بھرے سپاٹے ہند بتانِ نفس پرستی کے پاؤں چاٹے ہند
مگر ضرور ہے شادی کو اذن کا سہرا
نہ یہ کہ "رعبِ ادب" کا دکھادیا پہرا

جنھیں رواسمِ فرسودہ ناپسند نہیں مُقلّدینِ قدامت ہیں ہوشمند نہیں
نہیں کسی کی تباہی سے کچھ گزند نہیں غرض کہ بزم محبت میں سربلند نہیں
رواں زبانوں پہ اپنی پسند کی "لے" ہے
یہ جانتے نہیں "میلانِ طبع" کیا شے ہے

ہوا ہوں آج میں گستاخ اس کی شادی سے بدل گئی جو مرادوں کو نامرادی سے
چُرا رہا ہوں نگاہیں خوش اعتمادی سے ٹپک رہا ہے مری "نظم بے ارادی" سے
سماج نقد و نظر کے لئے سنبھل جائے
سناؤں گا وہ حقیقت کہ جی دہل جائے

وہ جس نے مجھ سے کیا تھا نباہ کا وعدہ عنایت و کرم بے پناہ کا وعدہ
رخِ صبیح پہ زلف سیاہ کا وعدہ حکایتِ غم دوری پہ آہ کا وعدہ
تبسمِ لب رنگیں میں عہدِ دلجوئی
نگاہِ مست میں قول و قسم کی یکسوئی

جو مجھ کو مقصدِ ہستی قیاس کرتی تھی جو دردِ سوز دروں التماس کرتی تھی
جو مجھ سے چشمِ مروت کی آس کرتی تھی جو میرے جذبۂ صادق کا پاس کرتی تھی

وہ ہر ادائے محبت اساس پر مائل
میں دل سے ہدیۂ ہوش و حواس پر مائل

وہ ہم کے ساتھ رہے کمسنی کے کھیلوں میں — گلاب توڑ لئے۔ جا چھپے ہیں بیلوں میں
سفر میں جھول گئے۔ کھڑکیوں پہ ریلوں میں — کمر میں ہاتھ دئے پھر رہے ہیں میلوں میں
یہی کہ جن پہ ہوئی جہل کی بلا غالب
سمجھ رہے تھے ہمیں ایک جان دو قالب

تُلے ہماری تباہی پہ یہ ظلوم و جہول ! — خطا معاف! نہیں ٹھیک جن کی عقل کی چول
تراش رکھے ہیں اِن سب نے وہ اصولِ فضول — نہ جن میں حسنِ تدبّر، عمق نہ عرض نہ طول
بزرگ ہیں انھیں خامی پہ ٹوکنا کیسا
بڑے ہیں اِن کو ارادوں سے روکنا کیسا

"رسوم شرق" نے مجبور کر دیا ہم کو — جنونِ عشق میں مشہور کر دیا ہم کو
یگانگت سے بہت دور کر دیا ہم کو — غمِ فراق سے معمور کر دیا ہم کو
نشاطِ جلوۂ دیدار و باز دید بھی بند
پیام و سلسلہ جنبائی "رسید" بھی بند

لکھا یہ اس نے کہ اب زہر کھا رہی ہوں میں — غمِ ملال سے پیچھا چھڑا رہی ہوں میں
غلط رویۂ شادی مٹا رہی ہوں میں — تم آؤ جلد کہ دنیا سے جا رہی ہوں میں
سمجھائے جا کہ جو میں نے اُسے نشیب و فراز
گلے میں ڈال کہ باہیں کہا "قبولِ نیاز"

سماج ہم پہ تو یہ ظلم کر چکی لیکن — وہ آگیا ہے زمانہ قریب ہیں وہ دن
جہاد کے لئے اٹھیں گے نوجوان ہم سِن — بہے گی چار طرف سیلِ جذبۂ باطن !
نہ ہو سکے گا کہیں "اختیارِ نفس" پہ جبر
کرے گا اپنی تباہی پہ "اِذنِ بے جا" صبر

شاد عارفی

گونگی لڑکی

شہر میں بڑی بڑی عالیشان عمارتیں بھی تھیں محل بھی تھے، کوٹھیاں بھی تھیں ۔ اوسط قسم کے چھوٹے بڑے نئی پرانی وضع کے کچے اور پکے مکانات بھی تھے ۔ ٹوٹی پھوٹی بے کواڑ کی کوٹھریاں بھی تھیں اور گھاس پھوس کی جھونپڑیاں بھی، لیکن ایک غریب گونگی لڑکی کے لئے نہ محلوں میں جگہ تھی نہ مکانوں میں نہ جھونپڑیوں میں ۔

قیمتی نفیس سامان سے آراستہ باعظمت ایوانوں اور دلکشا باغوں کی لطیف فضا میں سانس لینے والوں کے پاس دولت تھی، پیسہ تھا لیکن نظر نہ تھی اور احساس نہ تھا کہ وہ اپنی امیرانہ دلچسپیوں اور قیمتی مسرتوں کی بھول بھلیاں سے تھوڑی دیر کے لئے بھی باہر آکر اپنے گردوپیش کی کثیف فضا کو دیکھ سکتے، مفلس سسکتی ہوئی روحوں کی تکلیف اور درد کو محسوس کر سکتے اور اپنی خود غرضیوں کو جان سکتے ۔ متوسط طبقے کے پاس نظر تھی کچھ احساس بھی تھا اور کچھ پیسہ بھی لیکن وہ تو اپنی ہی خواہشوں اور آرزوؤں کے گورکھ دھندے میں الجھے ہوئے تھے ۔ اور انہیں اپنی اصلی حیثیت اور شخصیت پر مصنوعی خوش نما پردے ڈالنے، دولتمندوں کی ریس کرنے، ذاتی مسرتوں کے حصول کے لئے وسیلے تلاش کرنے، اپنی دلچسپیوں کے لئے نئی نئی تجاویز اور پروگرام بنانے سے کب فرصت تھی کہ وہ اپنے مبہم احساس ہمدردی اور جذبۂ انسان دوستی کو زیادہ وسیع بنا سکتے اور اپنی وقتی مسرتوں سے علٰحدہ ہو کر دوسروں کے لئے بھی کچھ سوچ سکتے اور اس پر عمل کر سکتے ۔

جھونپڑیوں اور شکستہ مکانوں میں جینے والوں کے پاس نظر تھی احساس تھا، دل تھا، دل میں درد تھا ۔ وہ زندگی کے طوفان میں روندی ہوئی زندہ نعشوں کو دیکھ سکتے تھے ۔ ان کی آہ و بکا کو سن سکتے تھے ۔ ان کے درد کو اپنے درد کی طرح محسوس کر سکتے تھے ۔ بھوک کی جان لیوا تکلیف کو جانتے تھے، سمجھتے تھے ۔ مگر ان کے پاس پیسہ کہاں تھا کہ وہ بھوکی روحوں کو آسودہ کر سکتے اور انھیں زندگی کے طوفان سے بچا لیتے ۔

وہ خدا اور خدا کے دولتمند بندوں کی نظروں سے گری ہوئی اکیلی، بے گھر، بے سہارا بھوکی، پیاسی، خستہ تن ہستیوں کو گلیوں اور سڑکوں پر درد اور تکلیف سے کراہتے اور گھسٹتے ہوئے دیکھتے تو ان کا دل دکھتا وہ ان کی بے کسی پر دل ہی دل میں آنسو بہاتے مگر وہ ان کے لئے کیا کر سکتے تھے ۔ وہ تو خود ہی دولت کی چکی میں پس رہے تھے ان میں اتنی سکت کہاں تھی کہ وہ ان کے لئے بھی روٹی فراہم کرتے اور ان کی تنہائی کی بے کسی کو دور کر سکتے ۔

تاہم غریب گونگی لڑکی بالکل تنہا اور بے یار و مددگار بھی نہ تھی اگر خدا کی برتر مخلوق، انسان کی ہمدردیاں اور محبتیں اس کے لئے نہ تھیں تو نہ سہی ۔ ابھی اس سرزمین پر ایسی مخلوق باقی تھی جو انسان اور خدا دونوں کی نظروں میں ذلیل و خوار سہی مگر ہمدردی اور محبت کے جذبہ سے بیگانہ نہ تھی

چند بے ہنگم، بدصورت، لال پیلے گلیوں میں پھرنے والے کتے اس کے دوست اور مددگار تھے ۔

غریب لڑکی کے پاس زبان نہ تھی اور اس کے ساتھی بھی بے زبان تھے وہ آپس میں ایک دوسرے سے باتیں

نہ کر سکتے تھے۔ مگر ان کی نگاہیں زبان تھیں وہ ایک دوسرے کو خوب جانتے اور سمجھتے تھے۔

جب گونگی لڑکی بھوکی ہوتی تو اس کے دوست دروازوں پر جھٹکے ہوئے دستر خوانوں کے سوکھے روٹی کے ٹکڑے چن کر اس کے کھانے کے لئے لاتے اور موقعہ پاتے تو دوکانوں اور ہوٹلوں سے تازہ روٹی اور کیک بھی چرالاتے اور جب رات تھوڑی دیر کے لئے "انسانی درندوں" کو اپنے پُرسکون گہوارے میں جھلا جھلا کر غافل کر دیتی اور گونگی لڑکی بھی دن بھر کی آوارہ گردی سے تھک کر کسی دوکان کے سامنے یا پل کے کنارے سخت پتھروں پر نیم برہنہ جسم کو صرف اپنے لانبے گھنے بالوں سے ڈھک کر سو رہتی تو اس کے وفادار ساتھی اس کی حفاظت کرتے اور اُسے ہر خطرے سے محفوظ رکھتے۔

راہرو ایک انسانی شکل کو چند ذلیل جانوروں کی ہمراہی میں سڑکوں اور گلیوں میں گھومتا دیکھتے تو ان کی پیشانیاں شکن آلود ہو جاتیں۔ بھویں سکڑ جاتیں اور وہ حقارت کے ساتھ اپنی نظریں دوسری طرف پھیر کر تیزی سے آگے بڑھ جاتے۔ دولت کی فراوانی میں پلے ہوئے بے فکر نوجوان شام کی تفریح کے لئے اپنے دوستوں کی ہمراہی میں قہقہے لگاتے، بیکار اور فضول گفتگو کرتے، قیمتی کپڑوں اور سوٹ بوٹ میں ملفوف، بار بار شیروانی کی سلوٹیں برابر کرتے۔ ٹائی کو ٹھیک کرتے آپ اپنی رفتار کی نزاکت پر اتراتے نگاہوں میں غرور و تمکنت کی جھلکیاں لئے ہوئے باہر نکلتے۔ اور گونگی لڑکی کو کتوں کے ساتھ دوکانوں کے سامنے کی گری پڑی چیزیں کھاتے دیکھتے تو ایک لمحے کے لئے ان کے شگفتہ قہقہے تھم جاتے۔ اور وہ اپنے جسموں کو انتہائی بیزاری اور نفرت کے انداز میں سکیڑ کر تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ جاتے گویا وہ ڈرتے تھے کہیں یہ نجاست انھیں نہ چھو جائے۔ لیکن کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی ان کے دل کی تہیں متحرک نہ ہوتیں اور وہ بھول کر بھی کبھی یہ نہ سوچتے تھے کہ زندگی کے اس کریہہ منظر کی ذمہ دار بڑی حد تک خود اُن کی ہستیاں ہیں اور انہی کی مالکانہ اور امیرانہ خود غرضیوں، عیش پسندیوں، بے فکری اور بے حسی نے ان کے ساتھی مخلوق کو حیوانوں اور جانوروں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

فیشنی، خوش نما ساڑیوں میں ملبوس نوجوان لڑکیاں خوش رنگ موٹروں میں اپنے ناز پرور دہ جسموں کو ریشمی گدیلوں کا سہارا دیے سڑک پر سے گزرتیں اور اتفاقاً کبھی اُن کی نظر گونگی لڑکی پر پڑ جاتی اور وہ اس کے بالوں کو دیکھتیں تو ایک بے اختیار جذبۂ تحسین سے بے چین ہو جاتیں لیکن یہ جذبہ دوسرے ہی لمحہ رشک و حسد میں تبدیل ہو جاتا وہ سوچتیں بھلا ایک گلیوں اور سڑکوں پر ماری ماری پھرنے والی فقیر لڑکی کو اتنے لانبے اور خوبصورت بالوں کی کیا ضرورت اور وہ قدرت کی اس بے وجہ فیاضی پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتیں اور اللہ میاں کی اس بے انصافی پر اس طرح برہم ہوتیں گویا دولت اور ثروت کی مالک بن کر وہ خدا کو بھی اپنی ملک جانتی اور سمجھتی تھیں خدا صرف امیروں کے لئے ہے غریبوں سے اُسے کیا سروکار اور وہ کیوں اس کی عنایت اور مہربانی کے مستحق قرار پائیں۔ اور شاید ان کی زندگی میں کبھی کوئی لمحہ ایسا نہ آتا جب کہ وہ اپنے اس خود غرضانہ احساس پر متاسف ہوں۔ انھیں اپنی قیمتی

مصروفیتوں سے کبھی اس کی فرصت ہی نہ ملتی تھی -

سورج کی روشنیاں چاند کی ضیاؤں میں اور چاند کی ضیائیں سورج کی روشنیوں میں تبدیل ہوتی رہیں - دن گزرتے رہے - شہر کے شکستہ پرانے مکانات ٹوٹتے پھوٹتے اور نئی عمارتیں بنتی رہیں - دوکانوں پر نیا نیا مال آتا اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتا رہا - سر برآوردہ عہدہ داروں کی تنخواہوں میں ہر سال اضافہ اور مزدور پیشہ لوگوں کی روزی میں دن بدن کمی ہوتی رہی غرض زندگی اور موت کا کبھی نہ ختم ہونے والا کھیل بدستور کھیلا جاتا رہا گونگی لڑکی کے ساتھیوں میں کچھ کمی ہوئی کچھ اضافہ لیکن اس کی زندگی کے ساکن دریا میں کوئی نمایاں تلاطم پیدا نہ ہوا - وہ یونہی گلیوں اور سڑکوں پر پھرتی اور گری پڑی چیزیں کھا کر زندگی کی گھڑیاں گزار رہی تھی - لیکن اسے دیکھنے والے اب اس سے اتنے بیگانہ نہ رہے تھے - اکثر راہروؤں کی نظریں اب اس پر پڑتیں تو تھوڑی دیر کے لئے ضرور اس کے چہرے پر ٹھیر جاتیں بلکہ اکثر آوارہ گرد، شوقین مزاج نوجوان، راہ چلتے چلتے اسے دیکھ کر رک جاتے اور جلدی سے اپنی بے داغ صاف اور ملائم انگلیوں میں کوئی چمکدار سکہ پکڑ کر شوق کے ساتھ اس کے قریب پہونچنے کی کوشش کرتے - اس لئے نہیں کہ اس کی ناداری اور مفلوک الحالی پر ان کا دل دکھتا تھا اور وہ اس کے ساتھ ہمدردی اور نیکی کرنا چاہتے تھے بلکہ صرف اس لئے کہ بچپن اور جوانی کے معصوم امتزاج نے اب اس کی نگاہوں اور چہرے میں ایک عجیب غم آمیز دلکشی پیدا کر دی تھی - اور وہ مفلس جوانی کی اس ارزاں خراب سے نہ صرف اپنی نگاہوں ہی کو سیر کرنا چاہتے تھے بلکہ اس کے تکلم کی شیرینی سے اپنے سامعہ کو بھی مسرور بنانا چاہتے تھے - لیکن جب وہ جانتے کہ وہ گونگی ہے اور ان کی خودغرضانہ دریا دلی کے جواب میں ہمیشہ پیوست رہنے والے لب متحرک نہیں ہو سکتے اور وہ انھیں کوئی دلنواز نغمہ نہیں سنا سکتی تو دل ہی دل میں اپنی فیاضی پر کسی قدر پشیمان ہوتے ہوئے واپس لوٹ جاتے -

بہت جلد ہر ایک جان گیا کہ اس کی جوانی گونگی تھی اور اس کا حسن بے آواز اور اب پھر دنیا کی نگاہوں میں اس کی حیثیت اس تنکے کے مانند تھی جسے لوگ مسلسل پیروں تلے روندتے ہیں اور انھیں اس کی خبر بھی نہیں ہوتی -

---

تین دن کی مسلسل بارش کے بعد پانی تھما تو گونگی لڑکی کانپتی، لڑکھڑاتی اپنی غیر محفوظ جائے پناہ سے باہر نکلی - شام بہت دلنواز تھی - ہواؤں میں موسم بہار کی سی تازگی اور شگفتگی پیدا ہو گئی تھی - مکانوں اور دوکانوں کے چھجوں سے ابھی تک پانی کے قطرے موتیوں کی جھالر کی طرح لٹک رہے تھے اور سورج کی آخری کرنیں گہرے اودے اور نیلے بادلوں کو گلابی اور سنہرا بنا رہی تھیں - سڑکوں پر معمول سے زیادہ ہجوم تھا - ہر شخص کے چہرے پر ایک نئی کیفیت تھی موسم کی دلفریبی سے ہر دل متاثر نظر آ رہا تھا اور متفکر چہروں پر بھی آج تبسم کی جھلکیاں تھیں - لیکن گونگی لڑکی آج بہت خستہ اور پریشان تھی اس کے ساتھی پانی اور آندھی سے گھبرا کر نہ جانے کہاں چھپ گئے تھے اور وہ تنہا رہ گئی تھی - وہ اپنے چاروں طرف متجسس نظریں ڈالتی ہوئی آگے بڑھی مگر پانی میں بھیگتے رہنے سے خون اس کی رگوں میں جم گیا تھا اور اس کے پاؤں حرکت کرنے سے

جواب دے رہے تھے۔ بالآخر وہ ایک گلی کے نکڑ پر پہونچ کر رک گئی اور ایک طرف دیوار کے سہارے کھڑی ہو کر اپنے ساتھیوں کا انتظار کرنے لگی۔ اس کا بوڑھا دوست تو ضرور آئے گا۔ اُسے اس کا یقین تھا اُسے اس کی وفاداری اور دوستی پر پورا اعتماد تھا اور محبت کے اسی اعتماد نے زندگی کی کلفتوں کو اُس کے لئے بہت کچھ سہل بنا دیا تھا۔

شام کا دھندلکا بڑھتا جا رہا تھا۔ چراغ روشن ہو چکے تھے۔ لیکن گونگی لڑکی کے منتظر کانوں کو کوئی آواز سنائی نہ دی۔

بھوک کی شدت سے اس کے اعضا سنسنا رہے تھے تین دن سے اس نے کچھ بھی نہ کھایا تھا اور وہ اس ناقابل برداشت جانکاہ تکلیف سے مجبور ہو کر اپنے غلیظ پانی میں بھیگے ہوئے کپڑوں کے پھٹے ہوئے چیتھڑے نوچ نوچ کر چبا رہی تھی کہ دفعتاً ایک بالوں دار جسم کے لمس نے اسے چونکا دیا۔

یہ اس کا بوڑھا دوست تھا جو اُس کے پیروں سے اپنا سر رگڑ رہا تھا۔ گونگی لڑکی نے ایک بے تاب خوشی کے ساتھ اسے اپنے سے لپٹا لیا اور بے اختیار اس کے سر اور پیٹ کے بالوں کو چومنے نہیں بلکہ چبانے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے اور وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر مسلسل اس کے بالوں کو چبا رہی تھی بوڑھے جانور کی آنکھیں بھی نم تھیں اور اس کے دوسرے ساتھی بھی قریب کھڑے خوشی سے اپنی دُمیں ہلا رہے تھے۔

قریب سے گذرنے والے اس کریہہ منظر کو دیکھ کر ناک بھوؤں چڑھا رہے تھے اور غریب لڑکی کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور اُس کی غلاظت پسند فطرت پر اس سے اظہار نفرت کر رہے تھے۔ لیکن گونگی لڑکی کو ان کی کیا پروا تھی

وہ اس وقت اُس ہجوم اور شور و غل میں بھی اپنے سچے پریمی دوستوں کے ساتھ تنہا تھی۔ اسے ان دو پاؤں کے جانوروں سے بھلا کیا سروکار تھا جن کی جیون بھی پریم کے راگوں سے یکسر نا آشنا تھی۔ وہ بغیر کسی خیال کے اسی طرح بوڑھے جانور کو لپٹا لپٹا کر پیار کرتی اور اُس کے نرم بالوں کو چباتی رہی یہاں تک کہ اس کے بھوکے پیاسے ہیجان میں کچھ ٹھیراؤ اور سکون پیدا ہو گیا۔ پھر اُس نے اپنی نمناک نگاہیں سڑک کے اس پار ہوٹل کی طرف اٹھائیں اور اپنے ساتھیوں کے طرف دیکھا بے زبان جانور اس کا مطلب سمجھ گئے۔ بوڑھے کتے نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دی اور دوسرے کتوں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے فوراً سڑک کے کنارے پہونچ گیا اور منتظر تھا کہ ذرا آمد و رفت کا سلسلہ منقطع ہو اور وہ سڑک پار کر کے ہوٹل پہونچے اور اپنی گونگی مالکہ کے لئے تازہ روٹی چرا کر لائے۔ وہ اور اس کے ساتھی اسی انتظار میں مستعد کھڑے تھے کہ اسی وقت ایک سائیکل سوار اپنی سائیکل کے پیچھے روٹیوں کا ایک بڑا سا پُلندا باندھے سامنے سے گزرا۔ گونگی لڑکی اور بوڑھے جانور کی نظریں ایک ساتھ روٹی پر پڑیں اور دوسرے لمحہ معمر جانور ایک چھلانگ میں سائیکل کے پیچھے تھا اور اچک کر ایک روٹی کو اپنے دانتوں کی گرفت میں لینا ہی چاہتا تھا کہ سائیکل ایک جھٹکے کے ساتھ آگے نکل گئی اور وہ لڑکھڑا کر بیچ سڑک پر گرا اور پیچھے سے آتی ہوئی ایک تیز رفتار موٹر کا پورا پہیہ اُس کے جسم پر سے گزر گیا۔

گونگی لڑکی نے جس کی نگاہیں برابر اس کا تعاقب کر رہی تھیں یہ دیکھا اور زندگی میں پہلی بار اس کے منہ سے ایک تیز چیخ نکل گئی اور وہ راہروؤں کو ہٹاتی، ڈھکیلتی

دیوانوں کی طرح اس کے قریب پہونچ گئی اور دم توڑتے ہوئے جانور کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے زخموں سے بہتے ہوئے خون کو اپنے بالوں میں جذب کرنے لگی۔

وفادار جانور نے بڑی کوشش سے آنکھیں کھول کر آخری بار اس کی طرف دیکھا وہ اپنی ناکامی پر نادم معلوم ہوتا تھا اور اس کی آنکھوں میں رنج و تاسف کے آنسو تھے کہ وہ اپنی بھوکی مالکہ کے لئے کھانا فراہم نہ کر سکا۔ آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے چہرے کے بالوں میں جذب ہو گئے اور پھر اس نے آنکھیں بند کر کے اپنی مالکہ کی گود میں دم توڑ دیا۔

اس وقت تک گرد و پیش لوگوں کا کافی ہجوم ہو گیا تھا۔ ہر شخص متجسس تھا اور ایک دوسرے کے شانوں پر سے اچک اچک کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ واقعہ کیا ہے۔ موٹر بھی مجبوراً رکی ہوئی تھی۔ اور صاحب موٹر جو اپنے لباس اور وضع قطع سے کسی ذی مرتبت اور دولتمند خاندان کا سپوت معلوم ہوتا تھا چہرے پر غرور اور تبختر کے آثار لئے ۔ پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ڈالے اپنی سیٹ پر اسی طرح سینہ تانے خاموش بیٹھا تھا اور ایک ذلیل جانور کے لئے لڑکی کی اس مجنونانہ فریفتگی پر حقارت سے مسکرا رہا تھا گونگی لڑکی نے اس کے تبسم کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوف امڈ آیا۔ یہی اس کی زندگی کے عزیز ساتھی کا قاتل تھا ۔ اس نے رنج و غصہ اور جذبۂ انتقام سے بے تاب ہو کر دوسرے کتوں کی طرف دیکھا جو اس کے ساتھ ہی وہاں پہونچ گئے تھے ۔ اور قریب ہی کھڑے اپنے بزرگ ساتھی کا خاموش ماتم کر رہے تھے ۔ انھیں تو صرف اشارہ کی دیر تھی ۔ انھوں نے اپنی مالکہ کی غضبناک نظریں دیکھیں تو دیوانہ وار وحشی درندوں کی طرح خوش پوشش نوجوان کی موٹر کی طرف جھپٹ پڑے اور قریب تھا کہ ان کے تیز دانت اس کی نرم کھال میں دھنس جاتے کہ پولیس موقعہ پر پہونچ گئی اور ان کے ڈنڈوں نے کمزور جانوروں کو مار بھگایا "یہ لڑکی دیوانی ہے" اس نے دیوانے کتوں کو پال رکھا ہے" دولتمند انسان اب ضبط نہ کر سکا اور چلا چلا کر گونگی لڑکی کو پاگل اور دیوانہ ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

" ہاں یہ لڑکی سچ مچ پاگل ہے" "ہم نے اکثر اسے سڑکوں پر کتوں کے ساتھ پھرتے دیکھا ہے" " اور وہ آپ اپنے کپڑے چبایا کرتی ہے۔ اور کتوں کے بالوں کو بھی چباتی ہے" دولتمند انسان کی حمایت میں مجمع سے ایک ساتھ مختلف آوازیں بلند ہو رہی تھیں ۔

بیچاری غریب لڑکی سوگوارانہ انداز میں مردہ جانور کے جسم کو اپنے بالوں میں چھپائے اسی طرح خاموش بیٹھی ہوئی تھی ۔ مگر اس کے رنج و غم سے کسے سروکار تھا۔

ذی اثر اور باوقار ہستی کی کوششیں کامیاب ہو گئیں اس کے عقلمندانہ فیصلہ نے گونگی لڑکی کو پاگل خانہ بھجوا دیا اور اس کے بقیہ ساتھی زہر دے کر مار ڈالے گئے۔

اب وہ سچ مچ پاگل ہو گئی تھی اور تمام پاگلوں میں سب سے زیادہ خطرناک سمجھی جاتی تھی ۔

اس کے نوجوان چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں جسم کی کھال لٹک پڑی تھی اور آنکھوں میں زندگی کی روشنیوں کی بجائے موت کی تصویر تھی اور وہ ایک بائیس سالہ لڑکی کی بجائے ایک چالیس سالہ بڑھیا

معلوم ہوتی تھی - اور اس کی شکل کچھ ایسی بھیانک ہوگئی تھی کہ ہر شخص اس سے خوف کھاتا تھا۔

اسے پاگل خانے میں سب سے علحدہ ایک تاریک کوٹھری میں رکھا گیا تھا اس لئے کہ وہ انسانی شکلوں کو دیکھ کر کتوں کی طرح بھونکنے لگتی تھی اور انھیں کاٹ کھانے کے لئے دوڑتی تھی - دوسرے پاگل بھی اس سے ڈرتے تھے اور کوئی اس کے قریب جانے کی جرأت نہ کرتا تھا حتیٰ کہ اس کا کھانا بھی اسے اس وقت پہونچایا جاتا تھا جب کہ وہ سوئی ہوتی یا اپنے بالوں کو چومتی اور چباتی ہوتی تھی جو اس کا محبوب مشغلہ تھا اور اس وقت وہ اپنے گرد وپیش سے بالکل بے خبر ہوتی تھی -

رضیہ

غم کا روگ

دل کی دھڑکن بڑھتی جائے ۔۔۔ دکھ کی ندی چڑھتی جائے
آشا بے سدھ سوئی پڑی ہے ۔۔۔ پریم کی ناگن پاس کھڑی ہے
لب پر نالے گھوم رہے ہیں ۔۔۔ آگ کے بادل جھوم رہے ہیں
نینن میں اک باغ کھلا ہے
من کو غم کا روگ لگا ہے

دیوانہ مشہور ہوا ہوں ۔۔۔ عقل سے کوسوں دور ہوا ہوں
دنیا دیکھ کے ہنس دیتی ہے ۔۔۔ مجھ سے کیا بدلہ لیتی ہے
نیند کا دریا رک سا گیا ہے ۔۔۔ خوشیوں کا سر جھک سا گیا ہے
جینا اب مرنے سے برا ہے
من کو غم کا روگ لگا ہے

راز کا مجھ کو ہوش کہاں ہے ۔۔۔ نام کسی کا وردِ زباں ہے
گا نا سن کر رو دیتا ہوں ۔۔۔ زخموں کا منہ دھو لیتا ہوں
آنکھوں میں ساون آیا ہے ۔۔۔ اک پردیسی گھبرایا ہے
پی بن جینا کیا جینا ہے
من کو غم کا روگ لگا ہے

الطاف مشہدی

ہوس کا دھوکا

آج سے کوئی چھ مہینے پہلے کی بات ہے۔ یہی میاں شاہد جو اب مجنوں کا سا حال اٹھائے بلکتے بلبلاتے میرے سامنے بیٹھے ہیں، کلی کی طرح چٹکتے، مسکراتے میرے ہاں آئے تھے۔ وہ دن بھی یاد رہے گا اور آج کا دن بھی۔ اُس وقت ان کا یہ عالم تھا جیسے سکندر اعظم کے ساری دنیا کو فتح کرنے کے منصوبہ کو انھوں نے پورا کر دیا ہے۔ اور ساری دنیا ان کے زیرنگیں ہے اور بات کیا تھی تو صرف اتنی کہ کسی لڑکی نے ان سے بے تحاشا کہہ دیا کہ............ "میں تم سے محبت کرتی ہوں" اور شاہد اس بے چاری کی خوشنمائی، لائک خصلتی اور قدرشناسی کا قصیدہ بڑے والہانہ انداز میں میرے گوشگزار کرنے لگے۔ میں نے زچ ہو کر کہا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا تم کو یہ نصرتیں مبارک ہوں، لیکن اس کے انجام سے تمھیں آگاہ کر دینا ہر ناصح کا فرض ہے۔ آج سے نہیں جب سے تم میں اِس مرضِ عشق کی علامتیں رُونما ہونے لگیں ہیں میں نے تمھیں سنبھالنے کی کوشش کی ہے۔ تم ہمیشہ مجھ سے بدکتے رہے اور میں تم سے ہاتھ دھو کر رہرو راہِ محبت کا خدا ہی حافظ کہہ کر چپ ہو رہا۔ لیکن اب پانی سر سے اونچا ہوتا نظر آتا ہے۔ اِس لڑکی کا اعترافِ محبت تمھیں کہیں کا نہ رکھے گا...... تم کیا جانو عورت کے دل کتنے ہوتے ہیں، زبانیں کتنی ہوتی ہیں"

میرے آخری جملہ پر شاہد نے اپنے کان کھڑے کئے۔ دیدے پھاڑ کر تمسخرانہ انداز میں کہا "تم کیا جانو..." مجھ پر اِس کے تمسخر کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا ہم بہت کچھ جانتے ہیں...... کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے ہم بہت کچھ جانتے ہیں...... میں نے تجربہ کارانہ انداز سے گردن ہلائی اور سوچنے لگا کہ اپنی داستانِ محبت سنا دوں اسے...... اور میرے ذہن میں اس وقت کتنی بھولی بسری باتوں نے کروٹ لی...... ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے زخموں کے انگور کسی نے نوچ ڈالے۔ اُف کرکے میں چپ ہو رہا...... ہونٹوں میں ارتعاش سا پیدا ہوا...... اعضا میں خفیف سی لرزش دوڑ گئی...... شاہد مسکرانے لگا...... ہم بھی تو سنیں آخر کیا ہیں ترے افسانے، میں نے اپنی اضطراری کیفیت پر قابو پا لیا۔ سوچا کہ گزشتہ پر صلواۃ بھیجنا ہی بہتر ہے...... اور پھر شاہد سے کہنے کا تو کوئی موقع ہی نہ تھا۔ اسے اپنی پڑی ہے، اور اِس منزل میں ہے جہاں ہوش و حواس چھن جاتے ہیں اور ایک سُرور کی سی کیفیت طاری رہتی ہے...... محبت اور محبوب کے سوا کسی تیسری چیز کا دھیان ہی نہیں ہوتا...... میں نے اپنے آپ کو مسرور و مطمئن ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ شاہد چھوڑو اِس قصہ کو۔ پھر کبھی کہیں گے۔ ہاں تم سناؤ سناؤ اپنے افسانے...... شاہد تو بس چھیڑ چاہتا تھا۔ ایک سرد لمبی آہ پوری طرح سینہ سے باہر نہیں نکلی تھی کہ زبان چلنے لگی۔ "آہ! کچھ نہ پوچھو دوست...... لوگ کہتے تھے محبت میں مزہ ہوتا ہے...... آج مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہوا ہے۔ لوگ سچ کہتے تھے...... میں نے محبت کا مزہ چکھ لیا ہے۔ محبت ایک آسمانی برکت ہے۔ سرُورِ سرمدی ہے، کیفِ لازوال ہے...... نعمتِ غیر مترقبہ ہے لیکن تمھیں کبھی مجھ سے اتفاق ہوگا کہ ان ساری مزیداریوں کا انحصار صرف مطلوب سے محبت کا جواب محبت سے ملنے میں ہے، میرا مطلب سمجھ گئے نا تم...... میں نے جواب دیا۔ ہاں سمجھ گیا لیکن تم سمجھنے میں غلط فہمیاں نہ کر بیٹھنا...... میں پہلے بھی

کہتا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ وہ زمانہ گیا جب اوتھیلو جیسے کریہہ حبشی پر کسی شہزادی کا دل آجاتا تھا......
آپ آئینہ میں اپنی صورت دیکھنا ناغہ نہ کیا کیجئے.......
آج کل محبت ظاہری صورت شکل سے ہوتی ہے ہر زمانہ کا ایک ایک معیار ہوتا ہے...... لوگ کہتے ہیں کہ دوست اور آئینہ کے یکساں فرائض ہیں۔ میں صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ اس صدی کی بدصورت سے بدصورت لڑکی آپ پر ایک چھوڑ ہزار جان سے بھی عاشق نہیں ہو سکتی..... تم کو دھوکا دیا جارہا ہے، تم کو الّو بنایا جارہا ہے...... تم سے کھیلا جارہا ہے... جس لڑکی نے تم سے کہا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے وہ جھوٹ بول رہی ہے... تمھاری تباہی کے درپے ہے۔ لڑکی آپ سے محبت کرتی ہے کوئی اور وہ بھی کیسی لڑکی۔ گورا رنگ، بڑی بڑی غلافی آنکھیں سرو قامت، گداز جسم، خوش مزاج .. اور آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے...... شاہد ہکا بکا میرے جذبہ تقریر کی حرکات پر غور کر رہا تھا..... میں اس قدر جوش میں کیوں آگیا تھا۔ شاہد کے ساتھ اس قدر درشتی کیوں برت رہا تھا مجھے خود اس کا احساس نہیں۔ لیکن ہاں اس کا تو مجھے بھی اعتراف ہے کہ شاہد کی اِس کامیابی پر مجھے رشک سا ہو رہا تھا۔ کیوں اس لڑکی نے اعتراف محبت کیا؟ حالانکہ میرے بارے میں تو کسی نے یہ بھی باور نہ کیا کہ مجھے ان سے محبت ہے... میں نے شاہد سے معافی چاہ لی۔ اور وہ مایوس او دل گرفتہ میرے ہاں سے چلا گیا۔

لیکن آپ یہ نہ سمجھئے کہ شاہد نے پھر اس قسم کا تذکرہ چھیڑا ہی نہیں۔ دوسرے ہی دن....... ہر پھر کے وہی "دوست عجب لڑکی ہے... حسن بھی محبت بھی......

جی چاہتا ہے کہ اس پر سے نچھاور ہو جاؤں..... تم کہتے تھے کہ عورت بُری چیز ہے۔ بابا ہم تو سچی محبت کے قائل ہوگئے۔ ذرا اس سینہ کو چیر کر دیکھو...... کتنا خوبصورت دل دھڑک رہا ہے۔ اس کی نظر میری صورت پر نہیں میرے دل پر پڑی اور دل نے اپنے جوہر دکھا دیئے۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی" مجھے شاہد کو کھری کھری سناتے جھجک سی محسوس ہونے لگی میں نے کہا "تم بہت خوش قسمت ہو۔ خدا نے تمھاری بدصورتی کی تلافی یوں کی کہ ایک حسین چاہنے والی مل گئی۔ تم دونوں کی محبت دن پر دن استوار ہوتی جائے۔

شاہد نے فوراً ٹوک دیا ارے پرسوں ہی کے واقعہ کو لو میں ذرا دیر سے گیا تو بس کیا دیکھتا ہوں...... حیران، پریشان...... اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہل رہی ہے، کسی پہلو چین نہیں..... مجھ پر نظر پڑی تو وفور مسرت سے چہرہ دمک اٹھا۔ لیکن اس طرح منہ پھلا لیا جیسے بہت خفا ہے "کہاں تھے اتنی دیر" ؟ اس انداز میں پوچھا ہے کہ میں وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا...... ہائے...... یہی تو زخم کلیجے کو کھائے جاتے ہیں....... میں نے کہا ع ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا...... آپ کے لئے ایک ناچیز تحفہ خرید نے میں دیر ہوگئی۔ کمر پہ ہاتھ رکھ، بھویں سکیڑ لیں اور...... نا صاحب اس طرح کی خوشامدوں سے میں بہت دور بھاگتی ہوں ...... بھاگئے۔ میں نے کہا اور بڑھ کر اس کی کلائی پر چھوٹی سی خوبصورت گھڑی باندھ دی بھاگ گئے نا.... میں نے ہانپتے ہوئے کہا..... جیسے بھاگ بھاگ کر آرہا ہوں...... اور کام کیا تھا تو صرف آگے بڑھنا اس کی کلائی تھامنا...... اور گھڑی باندھ دینا.......

ہانپ گیا قسم ہے..... پھر کیا ہوا..... میں نے دلچسپی کا اظہار
کرتے ہوئے کہا پھر یہ ہوا کہ رات کا کھانا ساتھ کھائے۔ بڑے
اصرار کے ساتھ روکا مجھے اور کھاتے وقت کی دلگی تو نہ
پوچھو..... اِدھر میں نوالہ اٹھاتا ہوں تو وہ بھی اٹھاتی ہے
ادھر میں منہ کھولتا ہوں تو ادھر وہ..... ہنسی تو روکے نہ رکی
اور شرارت کی انتہا ہوگئی نا..... میں ہنستا ہوں تو ادھر بھی ہنسی
لاحول ولاقوۃ بڑی شریر ہے ..... اور یہ دیکھو.. شاہد
نے جیب سے ایک چھوٹا سا پرزہ نکالا ..... اور میری طرف
بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ پڑھو اِسے' میں تو کوئی بیس دفعہ
پڑھ چکا ہوں..... چٹھی پر زنانی خط میں لکھا تھا.....
پیارے! تم مجھے بے حد یاد آتے ہو..... تم بڑے بے درد ہو
میری محبت کا تمھیں اعتبار نہیں۔ میں نہیں جانتی تمھیں اس کا
کیسے یقین دلاؤں.. تم تو مانتے ہی نہیں..... سچ کہتی ہوں
تمھارے بغیر نہ دن کو چین ہے نہ رات کو نیند..... خواب
میں بھی تمھیں کو دیکھتی ہوں..... اور اکثر یہ شعر گنگناتی ہوں۔

زندگی دردِ سر ہوئی حاتم
کب ملے گا مجھے پیا میرا

فقط تمھاری

تو اسے سنبھال کر رکھو تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام
آئے..... شاہد نے مسکراتے ہوئے چٹھی لے لی..... اور
سنجیدہ بن کر پوچھنے لگا۔ "اب کیا کروں" میں نے جواب دیا.....
"شادی"۔ شادی کا نام سنتے ہی ہشاش بشاش چہرہ
ٹھٹھر کے رہ گیا... "کیوں؟" میں نے تشویش کے ساتھ
پوچھا... کچھ نہیں..... بات دراصل یہ ہے کہ وہ عجب
خیالات کی لڑکی ہے۔ شادی کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت
نہیں۔ کہتی ہے کہ سچی محبت ہو تو پھر دنیوی راہ ورسم کی پابندی
ضروری نہیں..... میں اتنا سن کر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا.........
ارے یہ تو اور بھی خوشی کی بات ہے۔ یار! واقعی تم پر تو اب
رشک آجاتا ہے..... کس مزے میں ہو اور کیسے سستے
چھوٹ رہے ہو..... لاؤ ملاؤ تو رمہ کا ہاتھ..... لیکن شاہد
مطمئن نہ تھا..... ہٹو یار تمھیں تو مذاق کی سوجھی ہے اور
یہاں تلوؤں سے لگی ہے..... میں نے اسے چھیڑنا مناسب
نہ سمجھا..... اور چپ ہو رہا۔ شاہد بھی اسی طرح خاموش
سوچتا ہوا بیٹھا رہا ..... پھر کچھ سوچ کر مسکرانے لگا.....
جیب سے ایک مخمل کی ڈبیہ نکالی..... اور میری طرف
بڑھاتے ہوئے کہنے لگا..... دیکھو تو کیسی ہے.... میں نے
ڈبیہ کھولی' ایک چم چم کرتی سونے کی انگوٹھی نظروں کے
سامنے تھی.. میں نے تھوڑی دیر تک انگوٹھی کو بڑے غور سے
دیکھا.. ..خوبصورت اور قیمتی انگوٹھی تھی۔ شاہد نے پوچھا۔
محبت کو تحفے تحائف سے مالا مال کر دینا چاہیے کیوں؟....
میں نے اسی طرح انگوٹھی کو پھیر پھیر کر دیکھتے ہوئے کہا" برا
خیال نہیں"۔

اسی طرح شاہد کی محبت تحفے تحائف..... خوشامد
برآمد اور کھلونوں کے سہارے پھلتی پھولتی رہی..... اور
میرا دوست بھلے چنگے انسان سے خاصا مجنوں بن گیا.....
سوتے جاگتے میں اسی کی باتیں..... ہچکی آئی نہیں کہ دیکھو
شاید اس نے یاد کیا..... ڈاکیہ پکارا نہیں کہ.....کیوں
بھئی میرے نام کوئی خط..... بس جب دیکھو اس کی رضا جوئی
کے لئے سرگرداں..... میں بھی تماشائی کی طرح ہاتھ پہ ہاتھ
دھرے بیٹھا دیکھتا رہا کہ کون کون سے رنگ بدلے جائیں گے
کیا کیا کھیل کھیلے جائیں گے ..... میں نے شاہد سے تو کچھ کہا
نہیں۔ لیکن میرا دل کہتا تھا کہ شاہد کا ستارہ بہت جلد گردش میں

آنے کو ہے .... میرا قیاس صحیح نکلا ... مجھے اس سے
خوشی نہیں الٹا افسوس ہے ..... شاہد میاں میرے سامنے
بیٹھے ہوئے ہیں بلکتے بلبلاتے ...... میں بھی غمگین ہوں ....
دردمند لہجے میں پوچھ رہا ہوں ۔ کیا ہوا ؟ ۔ شاہد جواب
دینا چاہتا ہے ۔ لیکن جیسے حلق میں پھندا پڑ گیا ہو ....
میں نے پھر پوچھا کیا ہوا' ارے یہ کیا ۔ شاہد بچوں کی طرح
بلک بلک کر رونے لگا ..... ارے یہ کیا بچپن ہے ۔ روتے ہو
شاہد کے آنسو اِس طرح ٹپاٹپ گر رہے تھے جیسے لڑھکی
ہوئی شیشی میں سے گولیاں ۔ میں آگے بڑھ گیا ۔
اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے سر کو تھام لیا" بندہ خدا
کچھ کہو بھی ..... آخر کیا افتاد پڑی ... شاہد کے آنسو تھمنے
لگے ۔ ہچکیوں کو وہ پی پی جا رہا تھا ..... لیکن خود میرا حال
غیر ہونے لگا اپنے ایک عزیز دوست کی آنکھ میں آنسوؤں
کو دیکھ کر میرا دل بھی بھر آیا ۔ اور میری آنکھیں بھی پُرنم
ہوگئیں ... میں نے دھیمے لہجہ میں پوچھا "کیا ہوا شاہد"
تو میری آواز میں بھی آنسو تھے ... شاہد سنبھل رہا تھا....
میری آواز کو سن کر پھر پھوٹ بہا ... کوئی آدھ گھنٹہ کے
بعد دونوں کے دل قابو میں آئے اور شاہد نے کہنا شروع کیا
جو نہ ہونا تھا سو ہوا ... جس چیز کا شان و گمان بھی نہ تھا
وہ حقیقت بن کر سامنے آگئی ۔ تمھاری باتیں میرے
لئے مذاق تھیں لیکن آج وہ سچی پیشین گوئیاں ثابت
ہو رہی ہیں ۔ مجھ بدنصیب سے کھیلا گیا .... مجھ بدصورت
کو محبت کا دھوکا دیا گیا ۔ الو بنایا گیا ... مجھے کہیں کا نہ
رکھا گیا ۔ میرا دل روند دیا گیا .... مٹی
میں ملا دیا گیا ۔ آہ ... کون الو کا پٹھا کہتا ہے کہ محبت میں
مزہ ہوتا ہے ... میں کہتا ہوں محبت ہے ہی کہاں اِس
مکّار دنیا میں نہ محبت نہ مزہ ۔ ... ہاں محبت کی کینچلیاں
پہن پہن کر ناگنیں ڈستی پھرتی ہیں ..... آہ ! میرا دل...
میرا دل ... کیا ہوا شاہد ... آخر کچھ کہو بھی ... ...
میرے دوست سب کچھ ہوگیا' میں زندہ بھی کیا گیا ... مارا بھی گیا
دفنایا بھی گیا ... اٹھایا بھی گیا اور دوزخ میں پھینک بھی
دیا گیا ...... کیا ہوتی ہیں یہ لڑکیاں اور کیا ہوتی ہے ان
کی محبت ۔ ... تمھیں یاد ہے نا وہ چیٹھی ۔ تمھیں یاد ہے نا
اور وہ ساری باتیں جو میں نے تم سے کہی تھیں ..... وہ سب
دھوکا تھا ۔ مکر تھا ... اور تھا ... تھا ۔ میں دیوانہ...
ارے بھئی آخر کچھ کہو نا ۔ کیا ہوا .. کیا کیا اس نے .... کیا
تمھارے تحائف واپس کر دئے ۔ ... تمھیں برا بھلا کہا ۔ ...
کیا ہوا آخر ۔ ... میں نے بے صبری سے پوچھا ۔
اس لڑکی نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا ہے جو کسی جلّاد
سے ممکن نہیں ... خدا کرے آج ہی قیامت آجائے ۔
آسمان ٹوٹ پڑے ۔ زمین شق ہو جائے ..... کیا اچھا
صلہ ہے محبت کا ...... وفا اور انصاف تو کوئی اس سے
سیکھے .... پرسوں کی بات ہے ..... چاندنی چٹکی ہوئی تھی ۔
مجھے کسی طرح اس سے ملنے کا موقع مل گیا ..... نارنگی کے
درخت کے نیچے ہم دونوں کھڑے تھے ۔ نارنگی کے پھولوں
کی تیز خوشبو نے مست بنا دیا ..... اور پھر ان کی سج دھج
بھی آنکھوں میں کھُبی جا رہی تھی ۔ مستی کے عالم میں مجھ سے
کونسی حرکت سرزد ہوئی ۔ مجھے نہیں معلوم ہوش ٹھکانے ہوئے
تو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے زور کا تھپڑ میرے گال پہ
مارا ہو ۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں تو وہ بھی غائب ۔ دیوانگی
کی سی حالت میں افتاں و خیزاں گھر پہنچا ۔ رات بھر کسی کروٹ
چین نصیب ہوا ہو تو جیسی چاہو قسم لے لو ..... صبح کو اٹھا تو

سر میں درد تھا...... اور مریض کی طرح دنیا کی ہر چیز کو بے کیف اور اُداس دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے مجھے خط لا دیا　خط پڑھتا ہوں تو پاؤں تلے زمین نکل گئی خداوندا یہ کیا۔ ۔کل تک محبت کرنے والی ۔ میرے لئے بے چین رہنے والی آج یکایک کیسے بدل گئی ۔کس طرح لکھ سکی ہوگی ۔تمھاری محبت کو آزمالیا ۔تم آئندہ سے میری دہلیز میں قدم نہ رکھنا۔ ورنہ بے عزتی کے ساتھ نکلوا دئے جاؤ گے سمجھے... ۔میں نے سخت غلطی کی تھی جو تمھاری پیشقدمیوں کو طرح دے گئی ۔تمھاری صورت کی طرح تمھاری روح بھی مکروہ ہے ۔تم مردوں کی سب سے ارزل قسم ہو عورت کی تنہائی اور اُس کے اعتماد سے اس طرح فائدہ اٹھانا چاہتے ہو... ۔ترم ۔ترم ۔شاہد اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اس کے جذبات کا صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل ہے..... اس کے صدمہ کی شدت کو وہی محسوس کرسکتے ہیں جن کے دل بھی ٹوٹے ہوں، امیدوں اور ارمانوں پر پانی پھر گیا ہو منزل کی طرف جا رہے ہوں ۔لیکن پیچھے سے کوئی انھیں زخمی کر دے۔ ...اڑنے کے لئے پر تول رہے ہوں اور گرفتار کر لئے جائیں، میرے دل کا حال نہ پوچھئے ۔زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا۔ ... دہکتی آگ کی طرح دہک رہا تھا میں اپنے دوست کے حال پر آنسو بہا رہا تھا ۔ اور اس سنگدل لڑکی کے لئے سوچ رہا تھا کہ اگر وہ مل جائے تو میں اس کا گلا گھونٹ دوں.... میں نے گڑگڑا کر خدا سے دعا کی کہ وہ اس کی خوشیوں کو بھی اسی طرح پامال کرے..... .... اور اس کا دل بھی اسی طرح ٹوٹے ...وہ بھی اسی طرح آنسو بہاتی رہے ۔۔ سر پٹختی رہے.... اس کا بھی سکون و اطمینان چھن جائے... خداوندا تو اس سے اس ظلم کا انتقام لے ...

شاہد نے گردن اٹھائی ۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے ..... وہ میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا... ہاں شاہد نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔ میں نے تم سے کہا نہیں شاید آج کل ایک حسین نوجوان آنے جانے لگا ہے ... خدا جانے کیا ہونے کو ہے... کچھ نہیں .. سب ٹھیک ہوگا... قدرت انتقام لے رہی ہے...... وہ بھی ستائی جائے گی تباہ کر دی جائے گی ...... اس کے سکون... خموشی.... اور عزت کے پرزے پرزے اڑا دئے جائیں گے سمجھے۔ میں اس جوش کے ساتھ کہہ رہا تھا جیسے شاہد سے نہیں مجھ سے بے انصافی کی گئی ہے...... اور واقعی میں بھی تو ستایا ہوا تھا ... اپنی بدنصیبی کا خیال آیا تو میں خود کو سنبھال نہ سکا۔ روتا ہوا شاہد کے گلے لپٹ گیا۔ ۔ اور ہم دونوں بہت دیر تک روتے رہے.........

رشید قریشی

سرگذشت ادارۂ ادبیات اُردو مرتبۂ خواجہ حمید الدین شاہد: شائع ہو چکی ہے۔ جو حضرات حیدرآباد کی اُردو خدمات سے واقف ہونا چاہتے ہیں صرف بارہ آنے کے اسٹامپ روانہ کر کے یہ مجلد کتاب ضرور منگائیں جو تین سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔

باپ کا ترکہ

مرحوم از قبیلۂ اہلِ نگاہ تھا جوشِ سخا کا جس کے زمانہ گواہ تھا
ظالم کے حق میں منتقمِ بے پناہ تھا تھا راستی میں فردِ گرگج کلاہ تھا
سنگم بنا ہوا تھا جدید و قدیم کا
زندہ مجسمہ تھا مذاقِ سلیم کا

طوفانِ غم میں اشک بہاتا نہ تھا کبھی شکوے گلے زبان پہ لاتا نہ تھا کبھی
اہلِ دوَل کے ناز اٹھاتا نہ تھا کبھی باطل کے آگے سر کو جھکاتا نہ تھا کبھی
آلائشِ جہاں سے رہی پاک زندگی
گزری مثالِ شعلۂ بے باک زندگی

تھا راہِ مستقیم کا جانباز شہسوار مقبولِ خلق عاشقِ آقائے نامدار
مظلوم کا رفیق، غریبوں کا غمگسار غیروں کا دردمند، عزیزوں کا جاں نثار
اہلِ وطن کو تحفۂ اخلاق دے گیا
گنجِ متاعِ حسنِ عمل ساتھ لے گیا

کہنے کو داغِ ہجر دیا یاد کے لئے چھوڑا غم ایک خاطرِ ناشاد کے لئے
کچھ نونہالِ گلشنِ ایجاد کے لئے رکھا نہ آسرا کوئی اولاد کے لئے
مردِ خدا نے دولتِ بیدار چھوڑ دی
لختِ جگر کے واسطے تلوار چھوڑ دی

سکندر علی وجد

سَوانح نِگاری

گذری ہوئی یادوں کو تازہ کرتے رہنا ایک فطری جذبہ ہے ہر زندگی سے ماضی کی کوئی نہ کوئی یاد ضرور وابستہ رہتی ہے جب اِس یاد سے دل میں یہ احساس پیدا ہونے لگے کہ موجودہ زندگی ہم کو ماضی سے ورثہ میں ملی ہے اور یہ ماضی کی ایک ودیعت ہے جس کو مستقبل کے ہاتھ سونپنے کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے تو پھر یہی یاد ہماری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ بن جاتی ہے ہر دور ماضی سے کچھ افکار اور شعائر لیتا ہے اور ان کو مستقبل کے حوالے کردیتا ہے سوانح کا مقصد بھی کچھ یہی واضح کرنا ہے کہ کسی خاص شخصیت نے زمانے کو کیا افکار دئے اور شعائر حیات میں اس نے ..... کس طرح حصہ لیا۔ سوانح نگاری کے مقاصد یہیں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ اس کا ایک اہم مقصد اس وقت تک تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے جب تک کہ اس شخصیت کے کردار اور حالات کو ان کے اصلی روپ میں پیش نہ کیا جائے۔

سوانح نگار حال کے دامن کو ماضی سے باندھ دیتا ہے اِس اعتبار سے مورخ اور سوانح نگار دونوں کا دائرہ عمل تقریباً ایک ہو جاتا ہے لیکن مورخ جہاں پوری ہیئت اجتماعی سے بحث کرتا ہے سوانح نگار صرف کسی خاص فرد کے ذاتی حالات اور کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ہیئت اجتماعی میں اس کا مقام معین کرتا ہے۔

سوانح نگاری کے بعض جدید نظریوں نے اس کے دائرہ عمل کو بہت محدود کر دیا ہے بعض کی رائے میں سوانح نگار کے فرائض صرف یہیں تک محدود ہوتے ہیں کہ وہ کسی شخصیت کے افکار ذاتی حالات اور کردار کا ایک مکمل خاکہ پیش کردے۔ ان کے نزدیک ماحول پر روشنی ڈالنا صرف مورخ کا کام ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ شخصیت اور ماحول پر بیک وقت گفتگو کرنا کسی قدر مشکل ہے ایسا کرنے میں بسا اوقات شخصیت ماحول میں ضم ہو کر رہ جاتی ہے لیکن بڑی شخصیت کو ماحول سے جدا کرکے دیکھا نہیں جاسکتا۔ ہر بڑی شخصیت اپنے ماحول کو کسی نہ کسی طرح متاثر کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب تک اس کے ذاتی حالات کا مطالعہ ماحول سے ملاکر نہ کیا جائے اس کی حیاتِ عمل کے سارے پہلو نمایاں ہونے نہیں پاتے کامیاب سوانح نگار شخصی حالات میں ماحول کی تاریخ کو کچھ اس طرح پیش کردیتا ہے کہ سوانح نگاری کا یہ عیب بجائے خود ایک حسن بن جاتا ہے۔

قدیم زمانے کا سوانح نگار کسی شخصیت پر بعض محاسنِ اخلاق کو اجاگر کرنے یا اس کے برے پہلوؤں کو واضح کرنے کو ہی سوانح نگاری سمجھتا تھا خود شخصیت سے اس کی دلچسپی دوسرے درجہ کی ہوتی تھی۔ یہ خیال کہ سوانح میں کسی زندگی کی ایسی تصویر پیش کی جائے کہ اس میں سیرت و عمل کے صحیح خد و خال نظر آجائیں سترھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے اس سے پہلے سوانح کی شخصیت اخلاقی اصولوں اور فلسفیانہ نظریوں کے دھندلکے میں بالکل مبہم ہو کر رہ جاتی ہے۔ خود پلوٹارک کی لکھی ہوئی شہرہ آفاق سوانح عمری بھی اس خامی سے پاک نہیں ہے اس میں شک نہیں کہ سوانح نگار کو ایک ادیب اور مورخ کے دوہرے فرائض انجام دینے پڑتے ہیں لیکن سوانح نگاری کا تعلق زیادہ تر ادب سے ہی ہے ادب کی کوئی راست اور قطعی غرض و غایت

تو نہیں ہوتی لیکن اِس میں ایک چھپا ہوا غایتی میلان ضرور ہوتا ہے سچا ادب وہی ہے جو نظریوں کو دماغ پر مسلط کرنے کی بجائے ان کو چپکے چپکے دلنشین کردے اور اس طرح ہمارے سیکھنے اور سمجھنے والے شعور کو جس کو آپ چاہیں تو درس گیر شعور سے تعبیر کرسکتے ہیں انجانی میں بیدار کردے

سوانح نگار کا فرض کسی زندگی کے بیتے ہوئے حالات کو من وعن بیان کردینا ہوتا ہے یہی اس کی مورخانہ حیثیت قرار دی جاسکتی ہے لیکن اس کے ساتھ جب وہ ان تاثرات کا بھی ذکر چھیڑ دیتا ہے جن کا کسی زندگی کے بنانے میں بڑا حصہ رہا ہے تو اس کا یہی جذباتی تاثر اس کی سوانح عمری کو ایک غیر فانی ادبی کارنامہ بنا دیتا ہے ۔

نام رفتگاں کو باقی رکھنا اور ان کی یاد کو تازہ کرتے رہنا ایک فطری جذبہ ہے سوانح نگاری کا محرک عموماً یہی جذبہ ہوتا ہے کسی فرد کی سوانح حیات ہی سب سے زیادہ اس کے نام کی بقا کی ضامن ہوسکتی ہے مجسموں تصویروں عمارتوں اور اسی طرح کی دوسری یادگاروں میں ہم زندگی کی وہ روح نہیں دیکھ سکتے ۔جو سوانح عمری میں ہر جگہ جھلکتی ہے سوانح نگار اپنی ادبی فن کاری سے کسی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کردیتا ہے ایسی تصویر پیش کرنے کے لئے بڑی فن کارانہ م[illegible]ت کی ضرورت ہوتی ہے یہ نہو تو آپ سمجھ لیجیے کہ اس نے کسی زندگی کی محض تاریخ لکھ دی ہے اور اس کا سوانح عمری سے جو ایک متنقل اور اہم صنف ادب ہے کوئی تعلق نہیں ہے ۔سوانح عمری کے علاوہ دوسری یادگاروں سے دل میں اس زندگی کا کوئی موہوم اور مبہم تصور تو آجاتا ہے جس کی وہ پرتو ہوں لیکن کسی اچھی سوانح حیات میں آپ اس زندگی کی اور کبھی اس کے ماحول کی دل کی دھڑکن تک سن سکتے ہیں ۔

سوانح نگار کسی شخصیت کی تصویر اس کی سیرت اور عمل سے بناتا ہے ۔سوانحی مقاصد کے اعتبار سے سیرت کو جسے آپ چاہیں تو عالم افکار سے تعبیر کرسکتے ہیں اعمال سے جدا نہیں کیا جاسکتا ۔ہر انسان کے کچھ ذہنی افکارات اور فطری رجحانات ہوتے ہیں اِن ہی سے اس کی سیرت مبنی ہے عمل ان افکار اور رجحانات کی صورت پذیری کا نام ہے وہ افکار جو اپنے آپ کو اعمال کے سانچے میں ڈھال سکیں ۔

سوانح نگاری کے نقطۂ نظر سے بیکار ہیں ایسی شخصیتیں جن کے فکر وعمل میں ہم آہنگی نہ ہو سوانح کا صحیح موضوع نہیں بن سکتیں ۔

بڑی شخصیتوں کے افکار اور رجحانات بھی بلند ہوتے ہیں یہ جب ایک بار عمل کے سانچے میں ڈھلنے لگتے ہیں تو ان کا اثر شخصی اور انفرادی حدود سے نکل کر پوری ہیئت اجتماعی پر پڑتا ہے سوانح نگار اپنا موضوع منتخب کرتے ہوئے یہی دیکھتا ہے کہ کسی شخصیت کے عمل نے اس کی فکر کا کہاں تک ساتھ دیا ہے اور ہیئت اجتماعی نے اس سے کیا اثرات قبول کئے ہیں ان اثرات کو واقعات اور حالات میں اپنی طرف سے ردو بدل کئے بغیر وہ جس قدر موثر انداز میں محسوس کراسکے اسی قدر زیادہ اس کا کارنامہ غیر فانی سمجھا جائے گا ۔پڑھنے والوں کے دل میں چپکے چپکے یہ احساس پیدا کردینا کہ وہ ایک ایسی زندگی کے حالات پڑھ رہے ہیں جو بہر نوع ایک قیمتی زندگی تھی یا اس زندگی میں عام لوگوں کی توجہ اور دلچسپی جذب کرلینے کے بہت سے سامان تھے دراصل سوانح نگاری کا وہ چھپا ہوا غایتی میلان ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا تھا ۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس مختصر تشریح کے بعد آپ

مجھ سے اِس بارے میں متفق ہو چکے ہوں گے کہ سوانح کے
موضوع کے انتخاب کے لئے کچھ حدود اور ضابطے معین
کرنے ضروری ہیں۔ ادب کا مقصد اب صرف تفریح ہی نہیں رہا ہے
آرٹ حسنِ محض کا نام نہیں ہے آج ہمارا اجتماعی وجدان
آرٹ میں حسن اور حقیقت کو ہم آہنگ دیکھنا چاہتا ہے۔
اور اِس بات کا بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ آرٹ کے ذریعے
حقیقت سے محض واقف ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اُس کو
محسوس کرکے غیر شعوری طور پر اپنی زندگی کے کچھ ایسے خاکے
تعمیر کرے جو اِس میں زندگی کی تاب پیدا کر سکیں اور اس کے
جذبۂ عمل کو متحرک کر سکیں۔ وہ زمانہ گیا کہ سید انشاء مرحوم
کسی چڑیا کی بات جو چیونٹے کہی ہو ہر ایک سے پوچھتے پھرتے
تھے تاکہ اِس میں اپنی طرف سے نون مرچ لگا کر والیٔ شہر کو
خوش کر سکیں۔ آج دنیا کو ایسے قصوں کی ضرورت ہے نہ
اس کو اتنی فرصت ہے کہ اِس مسابقت اور کشمکش کے
دور میں اپنا وقت ان پر صرف کر سکے۔

اِس اعتبار سے سوانح حیات کی اہمیت اس دور
میں یوں بڑھ جاتی ہے کہ اس کی بنیاد زندگی کی ٹھوس حقیقتوں
پر رکھی جاتی ہے اور یہ حقیقتیں کچھ ایسے دلنشیں پیرایہ میں پیش
کی جاتی ہیں کہ طبیعت پر گراں نہیں گزرنے پاتیں اور جی
ان کو بہر نوع قبول کر لینے کو تیار ہو جاتا ہے۔

سوانح کی اِس اہمیت کو محسوس کر لینے کے بعد
یہ سوال فطری طور پر دل میں پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کی
کونسی حقیقتیں ایسی ہو سکتی ہیں کہ جن کی بنا پر کسی شخصیت
کو سوانح کے موضوع کے لئے انتخاب کیا جا سکے۔ میں نے
آپ سے کہا ہے کہ شخصیت کو ماحول سے جدا کرکے نہیں
دیکھا جا سکتا۔ ہر بڑی شخصیت ماحول کو متاثر کرتی ہے۔
اسی وجہ سے اُس کے حالات سے عام طور پر دلچسپی لیجاتی ہے
اور اس کے حالات، افکار اور واقعات کو سوانح کے
ذریعے محفوظ کر لینے کا خیال عام طور پر دل میں پیدا ہوتا ہے
گویا سوانح حیات صرف انہی شخصیتوں کی مرتب کی جا
سکتی ہے جنھوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے اپنے زمانے
اور ماحول کی توجہ جذب کی ہو یا اُن کی زندگی میں کچھ ایسی
خصوصیتیں رہی ہوں جن کو زمانے کی عام نظر غیر معمولی
قرار دے۔ معلم اخلاق، مصلح معاشرت، سیاسی رہنما، شاعر
فلسفی سب کسی نہ کسی حیثیت سے زمانے کی توجہ جذب
کرتے ہیں زمانے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کے حالات
ان کے افکار اور ان کے طریق عمل سے آگہی حاصل کرے
اور آنے والی نسلوں کے لئے ان کی یاد کو غیر فانی بنا دے
سب سے پہلے سوانح نگار نے خواہ کسی غرض اور غایت
سے سوانح نگاری کی ابتدا کی ہو اِس میں کوئی شک نہیں
کہ اس نے اہلِ ادب کے لئے ایک مستقل شاہراہ کھول دی
اور ایک بڑی اہم صنفِ ادب کی بنا ڈالی۔ اس صنف
نے کیا کیا ارتقائی مدارج طے کئے اور کن کن منزلوں
سے گذرتی رہی اِس کے متعلق میں نے دو ایک اشارے
ابھی کئے ہیں۔

سوانح کے موضوع انتخاب کے لئے جس طرح
بعض شرائط اور ضابطے معین کئے جا سکتے ہیں ویسے
اس کے طرز اسلوب اور طریقۂ فکر کے لئے معین نہیں کئے
جا سکتے۔ باسول نے ڈاکٹر جانسن کے سوانح حیات
لکھے، لاک ہارٹ نے اسکاٹ کی سوانح عمری تصنیف
کی، رابرٹ ساودی نے نلسن کی زندگی لکھی۔۔۔۔۔
یہ سب سوانح نگاری کے بے حد کامیاب نمونے

سمجھے جاتے ہیں لیکن آج کے سوانح نگار کے لئے یہ ضروری نہیں
ہے کہ وہ ان نمونوں کے جو اپنی جگہ پر بالکل مکمل حیثیت رکھتے
ہیں پیروی کرے۔ آرٹ یا ادب کا کوئی بنا بنایا ضابطہ نہیں
ہوتا بے ساختگی، اپج اور تخلیقی قوت کی بنا پر ہر ادبی کارنامہ
اپنا مقام آپ پیدا کرلیتا ہے بات یہ ہے کہ زندگی کے کسی
شعبے میں ترقی کی راہیں مسدود نہیں ہوگئی ہیں اسی میں
سوانح نگار سے یہ توقع رکھنا بے جا ہے کہ وہ ایسے قدم ترقی
بڑھائے بغیر قدیم نمونوں کی وفا شعارانہ پیروی کرے گا۔ ایسا
کرنے سے ایک طرف اگر اس کے آرٹ کے ترقی پسند رجحانات
کو ٹھیس لگتی ہے تو دوسری طرف ہمارا اجتماعی شعور طرز کی
یکسانی سے اکتانے لگتا ہے اور سوانح عمری کی اثر انگیزی
اس سے متاثر ہوتی ہے۔

زندہ شخصیتوں کی سوانح حیات مرتب کرنے کا رجحان
آج کل بہت عام ہو چلا ہے اور ایسی سوانح عمریاں بہت مقبول ثابت
ہو رہی ہیں تاہم اس کی مقبولیت کا راز سوانح نگاری کے
فن اور خوبی سے زیادہ شخصی عظمتوں میں پنہاں ہے۔ بہت
ممکن ہے کہ ان شخصیتوں کی زندگی کے ہنگامہ پرور دور کے
گذر جانے کے بعد ان کی سوانح حیات میں مستقبل کے لئے کوئی
کشش باقی نہ رہے سوانح نگار کی ادبی اور فنی خام کاری ہے
ہر اہم تخلیقی ادبی کارنامے کی طرح اچھی سوانح عمری وقت
اور زمانے کی قید سے آزاد رہتی ہے۔ سوانح نگاری کے مشہور
معلم اور نقاد سڈنی لی کے نزدیک سوانح حیات کا مکمل ہونا
اس کی کامیابی کے لئے اہم ترین شرط ہے چونکہ موت کے
بغیر کوئی زندگی مکمل نہیں ہوسکتی اس لئے زندہ شخصیتوں
کی سوانح بھی اس وقت تک تشنۂ تکمیل رہتی ہے جب تک
ان کی زندگی اور کارناموں پر تکمیل کی مہر نہ لگادے۔

ڈاکٹر جانسن نے کسی موقع پر کہا تھا کہ خود نوشتہ
سوانح عمری یا آپ بیتی سے بہتر کوئی سوانح نہیں ہوسکتی
یہ ضروری نہیں ہے کہ اس رائے سے کاملاً اتفاق کیا
جاسکے لیکن بعض خاص ضرورتوں میں اس رائے کی صحت
تسلیم کرنی ہی پڑتی ہے بہت کم مصنفین ایسے ہوں گے جو
آپ بیتی لکھتے ہوئے اپنے جذبۂ پندار و خود نمائی کو دبا
سکیں لیکن کہیں کہیں ان آپ بیتیوں میں کچھ ایسے تاثرات
اور جذبات ہوتے ہیں جن کا ظاہر کرنا شاید کسی دوسرے
کے بس کی بات نہیں ہوسکتی انگلستان کے مشہور مصنف ایچ جی
ویلز نے ابھی ابھی ایک خود نوشتہ سوانح عمری شائع
کی ہے اس میں ہم کو بعض ایسے دلچسپ اور جذباتی تاثر سے
بھرے ہوئے موقعے ملتے ہیں جن کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ
ڈاکٹر جانسن نے جس وقت اپنی رائے قائم کی ہوگی اس وقت
شاید اس کے ذہن میں کچھ اس طرح کی سوانح عمری کا
خاکہ ہوگا۔

ویلز نے جس تاثر اور جذبہ کے تحت یہ آپ بیتی لکھی ہے
اس کا اندازہ اس کے پہلے باب کی ابتدائی سطروں سے
ہوسکتا ہے اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے" وہ دن بیت گئے
وہ گھڑیاں گذر گئیں جب میں زندگی کے ہر مظہر کو دلچسپ
اور انوکھے انداز سے دیکھتا تھا آج میں ان بیتے ہوئے
دنوں پر نظر ڈالتا ہوں تو دل میں پھر سے کچھ نئی امنگیں
اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں"۔ یہی احساس زندگی ہے جس نے
ویلز کی سوانح عمری کو ایک غیر فانی کارنامہ بنا دیا ہے۔

میں نے دو چار انگریزی کی مشہور سوانح عمریوں کا
ابھی ذکر کیا ہے ان کی خصوصیات اور ان کے طرز پر گفتگو
کرنے کا یہ موقع نہیں ہے تاہم باسول کی لکھی ہوئی جانسن کی

زندگی کا ذکر کرنا سوانح نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ بعض ناقدین اس مشہور سوانح عمری کو اس اندھی عقیدت کا نتیجہ سمجھتے ہیں جو باسول کو جانسن کی ذات سے تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ خواہ یہ سوانح عمری اندھی عقیدت کا نتیجہ ہو یا نہ ہو اس میں کچھ ایسی جاذبیت ہے کہ ہر دور میں اور ہر زمانہ میں اس کی مقبولیت اور دلچسپی مسلم رہی ہے اگر یہ عقیدت مندی کا ہی نتیجہ ہے تو شاید یہ کہنا پڑے گا کہ باسول سے پہلے کسی سوانح نگار نے اپنے جذبۂ عقیدت کا اس سے بہتر طرز اور پیرایہ میں استعمال نہیں کیا تھا۔

اُردو میں سوانح نگاری کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے، شبلی اور حالی کو چھوڑ کر بہت کم ادیبوں نے اس اہم صنفِ ادب کو مشکور کیا ہے شبلی کی سوانح عمریوں میں تاریخی پہلو بہت زیادہ نمایاں ہوتا ہے لو کہیں کہیں ان کے لطیف اسلوب بیان اور پالیزہ طرز انشا سے ان کی سوانح عمریوں میں بڑی قوت اور زندگی پیدا ہو جاتی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی پڑھنے والے پر اس کا اثر ہوتا ہے کہ اس نے کسی زندگی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے زندگی کا احساس ان سوانح عمریوں میں پوری قوت کے ساتھ نظر نہیں آتا۔ الفاروق اور سیرت النبی شبلی کی سوانح نگاری کا شہکار سمجھے جا سکتے ہیں کہیں کہیں تو ان کتابوں کو پڑھنے والا شبلی کے پیدا کردہ ماحول میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔ حالی نے بھی سوانح نگاری کی طرف توجہ کی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے سوانح عمریوں کے بعض نہایت کامیاب نمونے چھوڑے ہیں۔ اُردو کے انشا پردازوں میں حالی اپنے غیر جذباتی اور سنجیدہ طرز کے لئے مشہور ہیں اس کے باوجود حیات جاوید اور یادگار غالب میں جذباتی تاثر کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ الذیز افتخار عالم مارہروی کی تصنیف ہے اور بعض خصوصیتوں کے اعتبار سے اُردو زبان کی اچھی سوانح عمریوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔

کسی زندگی کا ایک باب یا ایک پہلو بعض اوقات مکمل سوانح سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے فرحت اللہ بیگ کا مضمون ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی اور عبدالماجد دریا بادی کا مضمون مرزا رسوا اپنی نوعیت کے اعتبار سے مکمل سوانح عمریوں سے زیادہ دلچسپ واقعاتی اور اثر انگیز ہیں۔

ان قلیل قدر کارناموں کے ہوتے ہوئے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوانحی ادب کے اعتبار سے ابھی ہماری زبان بہت تہی مایہ ہے زندگی کے کسی شعبہ میں ترقی کی راہیں بالکل مسدود نہیں ہو گئی ہیں ترقی کرنے کا گُر یہی ہے کہ گذشتہ کارناموں کی روشنی میں آئندہ کی راہیں تلاش کی جائیں یہی وہ سبق ہے جو ہم کو سوانح نگاری کے مقاصد سے ملتا ہے۔ اسی پر کاربند ہو کر ہم اپنے لئے ذہنی مسرت اور سرشاری کے لازوال خزانے اپنے لئے مہیا کر سکتے ہیں۔

عمر مہاجر

اپنے قائد سے!

مبارک اپنی قوم کی قیادت اے خجستہ خُو　　ہر ایک کے خیال میں بسا ہوا ہے تو ہی تو
تری نظر سے جلوہ گر مُدبّرانہ جُستجو　　ترے اثر سے بہرہ ور مُفکّرانہ آرزو

فلاحِ قوم کے سوا تری کچھ آرزو نہیں
جو منفعل ہو قوم سے وہ تیری جستجو نہیں

محبتِ وطن کی مے پلا کے سب کو مست کر　　وفا پرست جو نہیں انھیں وفا پرست کر
مطابق اپنی رائے کے وطن کا بندوبست کر　　موافقوں کو ساتھ لے مخالفوں کو پست کر

یگانگت جتائے جا تو اپنے حال و قال کی
بلندیاں دکھائے جا اسی طرح خیال کی

تجھی سے پوری قوم کی لگی ہوئی ہے آج لَو　　کہ رہبرِ انقلاب کی ترے خیال کی ہے ضَو
اُدھر بہا کے لے چلے یہ تیری قائدانہ رَو　　جدھر تجلّیاں کرے "حیاتِ تازہ" نو بہ نَو

نظر فروز وسعتیں ہوں عرصۂ حیات کی
ضرورت آج قوم کو ہے تیرے التفات کی

ہر ایک دل میں جوشِ زن حیات کی اُمنگ کر　　بنا غیور قوم کو' لحاظ نام و ننگ کر
اصابت اپنی رائے کی دکھا' عدو کو دنگ کر　　بوقت صُلح' صُلح کر بوقت جنگ' جنگ کر

وہ کام کر جو مقتضی ہے فطرتِ بلند کا
سوال اب نہیں رہا پسند و ناپسند کا

علی منظور

وہم

ایک رومانی شام کو میں سیدھا سادا لباس زیب تن کئے، تفریحی دھن میں، خفیف سی تبدیلی کے ساتھ اقبال مرحوم کا مصرع "حسن نسوانی ہے بجلی میری فطرت کے لئے" گنگناتا ہوا آبادی کے ایک گنجان حصہ میں چلا جارہا تھا۔ دفعتاً میری نظر انگریزی وضع کے ایک بنگلے کی کشادہ کھڑکی میں رکی۔ ایک دوشیزہ حسن و شباب کی مکمل تصویر بیٹھی، البیلے انداز سے اپنے بکھرے گیسو سنوار رہی تھی اِس بے پناہ جلوۂ حسن نے مجھ پر عالم محویت طاری کردیا۔ کوئی دو منٹ بعد، آس پاس دیکھ، راہرووں کی نظریں بچا کھڑکی کے قریب، ایک مخفی مگر "کھڑکی نما" کنج میں کھڑا ہوکر، میں نے اس "حسین منظر" پر اپنی نظریں جمادیں۔ ادھر وہ اپنی دھن میں محو آرائش تھی اور ادھر میں نے مختلف زاویہائے نگاہ سے اس کے حسن کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ اتصال نگاہ پر کچھ مرعوب سا ہوا اگر پھر سنبھل کر موقع کو غنیمت جان ٹکٹکی لگادی۔ اس نے بھی کچھ دیر، پلکوں کو جنبش دئے بغیر، اپنی نگاہوں سے مجھ پر بجلیاں گرائیں، پھر دو منٹ کی غیر حاضری کے بعد کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال، میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک پیسہ پھینکا۔ میری غیور و خود دار طبیعت نے اِس بے عزتی کا تحمل نہ کیا۔ جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال یہ جملہ "دام کا نہیں پریم کا بھکاری" لکھا اور پیسہ پر لپیٹ دھاگا باندھ، تیزی سے کھڑکی میں پھینکا۔ اس نے جملہ کو پڑھ کر مسکراتے ہوئے اندر کی راہ لی، کامل ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد بصد مایوسی "دل ہمارا لے کے رخصت ہوگئیں" گنگناتا ہوا گھر لوٹا کرسی پر دراز ہوکر خیالات کی رو میں بہ گیا۔

اس......کی مسکراہٹ ضرور......کیا واقعی میرے پریم بھرے جملہ نے اس کے دل میں بھی......؟ نہیں......تو پھر مسکرانا......؟......حقارت......تو پھر آثار خفگی کا عدم وجود......؟ شاید پہلی ہی نظر میں میری اس جسارت پر اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ کھیل گئی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو کھڑکی میں رہ کر میری اس "ناشائستہ" حرکت کا......

ائیں!......جواب کیوں دینے چلی جب کہ میرے "پریم کی بھیک" نے اس کے دل پر......ٹھیک بالکل درست! اور یہی تاثر مسکراہٹ کی صورت میں نمودار ہوا اچھا تو اس نے غائب ہوکر پھر نمودار ہونے کا نام کیوں نہ لیا؟......تو پھر وہ معشوق ہی کیا ہوا......بصد کرب و اضطرار وقت کٹا دوسرے دن سرشام اپنے خیال کا تائیدی یا تردیدی جواب حاصل کرنے کے عزم مصمم سے نکلا۔ الحمد اللہ وہ کھڑکی میں بدستور موجود تھی نظریں دوچار ہوئی ہی تھیں کہ بجلی کی سی تیزی سے غائب ہوگئی۔ میں نے سابقہ "محفوظ جائے پناہ" پر استادہ ہوکر، مشغلۂ بیکاری کے طور پر بار بار کھڑکی کی تیلیاں شمار کرنی شروع کردیں کوئی پانچ منٹ بعد، میری پڑوسن، کریم بی کو اپنی طرف آتے دیکھا تو سیدھا ہوکر منہ سے سیٹی بجاتا ہوا، متانت سے پوچھا "کریم بی! تم کدھر؟" اس نے کہا "میاں! میں سامنے کے بنگلے میں ملازم ہوں، چھوٹی بیگم صاحب نے یہ چٹھی تمھیں دینے کو کہا ہے" چٹھی دی اور چلتی بنی۔ میں نے نظر اٹھائی کھڑکی خالی تھی۔ پھر امید و بیم کی حالت میں چٹھی کو پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا:۔

پریم کی بھیک، معشوقوں کی طرف سے
"جوتیوں" کی شکل میں تقسیم کی جاتی ہے اگر
سر کھجلا رہا ہو تو بسم اللہ، ہم بھی تیار ہیں"

ایں! "جوتیاں"؟ ایک قہر آلود نگاہ کھڑکی کی طرف دوڑائی قہقہہ......

یا وحشت! دل بانسوں اچھلنے لگا۔ جوشِ غضب نے حواس مختل کردیئے۔ غیر ارادی طور پر غیظ آمود آواز میں میری زبان سے نکلا "اگر یاد رہے! بھیک کی نوعیت پر بھکاری کی دعا یا بددعا کا انحصار ہے" بھڑکے ہوئے دل کو سنبھالتا اور اپنے مکروہ اقدام پر کڑھتا ہوا گھر پہنچا۔ محبت کئی بھاڑ میں جذبات نفرت نے دل میں ڈیرے ڈالے، طبیعت پر ظلم کرکے اس "جگر خراش واقعہ" کو صفحۂ دل سے محو کردیا۔

کوئی دو ہفتے بعد ایک دن جب میں بیٹھک میں مصروف مطالعہ تھا، کریم بی گھبرائی ہوئی داخل ہوئی اور گفتگو میں مجھ سے سبقت کرتے ہوئے پریشان لہجہ میں بولی "رضیہ بی بی سخت علیل ہیں" میں نے گھبرا کر پوچھا "کون رضیہ؟" اس نے کہا "وہی جنھوں نے آج سے کچھ دن پہلے میرے ذریعے آپ پاس چٹھی روانہ کی تھی" مٹھیاں بھینچتے ہوئے میں نے دل میں کہا رضیہ ناہنجار رضیہ تو اس سے مطلب؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا فکر کے آثار چہرہ سے دور کرکے سنجیدگی سے کہا۔ "تو اس سے مجھے کیا غرض؟" کہنے لگی "میں کیا جانوں، بی بی کے حکم سے آپ کو خبر دینے آئی ہوں، بخار جنبش نہیں کھا رہا ہے ڈاکٹر عاجز آگئے ہیں"۔

باللعجب! وہ اور مجھے اپنی علالت کی خبر دے تعجب ہے! دل ہی دل میں سوچ کر "ہو نہ ہو یہ میری زبان سے نکلے ہوئے لفظ بددعا کا ہی اثر ہے۔ او نہ، عورت کی ذات بھی کس قدر وہمی ہے" جذبات نفرت پر محبت غالب آنے لگی میں نے کچھ غور کے بعد کہا "ان کے کان میں آہستہ سے کہہ دو کہ بھکاری کی دعا ان کے ساتھ ہے"

کریم بی کی زبانی معلوم ہوا کہ دوسرے ہی دن بخار اتر گیا تھا۔ واہ رے اعتقاد۔

کچھ دن بعد رضیہ نے کریم بی کے ذریعہ مجھے طلب کیا۔ میں نے اپنی شان خودداری نباھنے کی خاطر، حقارت آمیز انداز میں وہاں جانے سے انکار کردیا۔ دوسرے ہی دن یہ چٹھی پہونچی:۔

"...... آپ کے انکار سے مجھے قلبی صدمہ پہنچا میں آپ کی دعا کی برکت سے اچھی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ میرے مزاحیہ جملے نے آپ کو بددعا پر آمادہ کیا، اُف! مرد بھی کیسے جلد باز اور انتقام پسند ہوتے ہیں۔ آپ کو میری قسم آج شب کے آٹھ بجے ضرور ہمارے غانہ باغ میں تشریف لائیے۔ کیونکہ آپ سے ایک ضروری بات کہنی ہے" رضیہ

آخر "دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت" بھر آیا اور میں آواز ضمیر کی مخالفت کرتا ہوا معینہ وقت پر "حسن کی سرکار" میں پہنچا رضیہ نے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا، مگر مجھے محو سکوت پاکر اس کے نازک چہرہ پر فکر کے آثار نمایاں ہوگئے۔ کچھ سوچ کر، متبسم لب وا کئے اور "جوتیوں" والا جملہ واپس لیتے ہوئے صفائی چاہی۔ میں نے بے ساختہ مسکراتے ہوئے اس کو معاف کردیا۔

بہت دیر تک ہم دونوں میں دلچسپ موضوعوں پر گفتگو رہی دوران گفتگو میں اس نے لطیف اور غیر محسوس انداز میں مجھ سے نفرت کا تو نہیں مگر اپنی مجبوری کا اظہار کیا اور پایان کار گھبراتی ہوئی کہنے لگی "ایک بات عرض کروں اگر خاطر شکنی نہ ہو" گفتگو ہی سے تاڑ گیا تھا مگر اس جملہ پر مجھے یقین کلی ہوگیا کہ یہ ضرور میری محبت کو ٹھکرائے گی۔ بخیر مستقبل اللہ کے ہاتھ دل کو مضبوط کرکے میں نے کہا "بھلا آپ جیسی عقلمند میری خاطر شکنی کیوں کرنے چلیں، ہاں ہاں فرمائیے

شوق سے فرمایئے" اس نے رکتے رکتے کہا "نہیں نہیں اس سے آپ کو .... مگر میں اس میں ...." میں نے کہا "کہو بھی آخر بات کیا ہے" شرماتے ہوئے دبی زبان سے اس نے کہنا شروع کیا۔

"میں اس ضلع کے تعلقدار صاحب کے فرزند......

سے منو ...... وہ مجھ پر فدا ہیں اور میں بھی ان پر ...... اور ...... ابھی جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ میری حالت متغیر ہوگئی دل نے شدید قسم کی بے چینی محسوس کی۔ رہا نہ گیا۔ بہ سرعت اٹھ کھڑا ہوا اور چلتے ہوئے ہیبت زدہ آواز میں اس کی زبان سے سنا "یہ آپ چلے؟ افسوس دل شکنی ..... مگر ہاں ...... بد دعا...... ......

"رشید" میرا دلی دوست ہے۔ اس کا کوئی راز مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ اس نے کئی دفعہ اپنی بیوی کے عجیب عجیب قصے سنائے ایک مرتبہ کہا "خدا جانے میری بیوی پر کونسا بھوت سوار ہے جب کبھی بیمار پڑتی ہے" "بد دعا' بد دعا" کی رٹ لگاتی ہے۔ نوکروں کو حکم دے رکھا ہے کہ جیسے ہی کوئی بھکاری یا بھکارن دروازہ پر آموجود ہو' مجھے خبر کرنا۔ وہ خود اپنے ہاتھوں انھیں خیرات دیتی اور دروازہ کی آڑ میں کھڑی ہو کر لفظ بہ لفظ ان کے دعائیہ جملے سنتی ہے"

عبدالعزیز غوثی

غزل

ہوش کی دنیا' عقل کے راگ — لے بیٹھے ہو کیا کھٹراگ !

گانے والے دیپک راگ — دھیمے سُروں میں برسا آگ

بچ کر رہ ان زلفوں سے — ڈس لیں گے یہ کالے ناگ

دوش پر ہیں زلفیں اُن کی — لہراتے ہیں کالے ناگ

آپ کے بس کی بات نہ تھی — میری قسمت' میرے بھاگ

سوئے چمن کیوں رخ کرتی — بجلی کو ہے مجھ سے لاگ

بن جاتے ہیں اشک ہوا — کون بجھائے جی کی آگ !

سورج سر پر آ پہنچا — سونے والے اب تو جاگ

جب ہے محبت ہی کا کال — دنیا کو لگ جائے آگ

من کی دنیا' رازِ حیات
من کی دنیا کو نہ تیاگ

سلیمان اریب

لفافے بدلنا

نہ گُل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں
یہ گلچینی ہے یا لُٹس ہے گلچیں یا ہے قزّاقی (حالیؔ)

لفافے بدلنا آج کل غزل گو شعرا میں عام ہو گیا ہے اور اِس طوفانِ بے تمیزی میں بڑے بڑے اساتذہ (جن کو لوگ رئیس المتغزلین فصیح البیان وغیرہ وغیرہ لکھتے ہیں) بھی بہے جا رہے ہیں۔ جہاں متقدمین کا کوئی اچھا شعر نظر آیا بس رال ٹپکنے لگی فوراً چوری کے مال کو گلا دیا (الفاظ بدل دیئے، بحر و ردیف تبدیل کر دی تخلص ٹھونس دیا) اور اپنا لیا ـــــ مگر اس لوٹ میں چند غزل گو ایسے بھی بچے ہوئے نظر آ رہے ہیں جن کا دامن ان آلائشوں سے پاک ہے۔ جو پانی میں رہنے کے باوجود "کنول" کی طرح پانی سے علٰحدہ ہیں اور جو "حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند" کو غلط ثابت کر دکھا رہے ہیں اور پکار پکار کر کہہ رہے ہیں:۔

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

لفافے بدلنے کی چند مثالیں مشہور غزل گو حضرت جگرؔ مراد آبادی کے مطبوعہ دیوان "شعلۂ طور" سے پیش کرتا ہوں اور ساتھ ساتھ اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو حضرت جگرؔ سے کوئی عناد نہیں۔

جگرؔ (مراد آبادی)		شعراء متقدمین		
رہرو منزلِ بے خودی ہے جگرؔ	وہ نشیب و فراز کیا جانے	جو رہِ عشق میں قدم رکھے	وہ نشیب و فراز کیا جانے	داغؔ
ہم سمجھتے ہیں رازِ رامش و رنگ	زاہدِ پاکباز کیا جانے	کیفِ مئے بادہ خوار سے پوچھو	یہ مزہ پاکباز کیا جانے	〃
دامان و جیب ہو گئے نذرِ جنوں تمام	باقی کفن کے واسطے اک تار بھی نہیں	دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں	لینے کفن کے واسطے اک تار بھی نہیں	غالبؔ
پھنکا جاتا ہے دل جس سوزِ غم سے	جہنم میں وہ چنگاری کہاں ہے	آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں	سوزِ غم ہائے نہانی دور ہے	〃
صورت دکھا کے پھر مجھے بے تاب کر دیا	اک لطف آ چلا تھا غمِ انتظار میں	دکھلا کے اک جھلک مجھے بے تاب کر دیا	مانوس ہو گیا تھا غمِ انتظار سے	سوداؔ
موت اِک دامِ گرفتاریٔ تازہ ہے جگرؔ	یہ نہ سمجھو کہ غمِ عشق نے آزاد کیا	مرگ ہم قید دیگری حافظؔ	از غمِ عشق کے شوی آزاد	حافظؔ
مجھی میں رہے تم سے مستور ہو کر	بہت پاس نکلے بہت دور ہو کر	درمن و از نظر شوی مستور	تو قریبی و ہم نمائے دور	سعدیؔ
دل کے ہوتے ہوئے جاتے ہو کہاں اے موسیٰ	اس میں کچھ جلوے ہیں ایسے کہ سرِ طور نہیں	دل میں خود سوز ہی کیوں رہ پہ جاؤ دل موسیٰ	گھر میں جو آگ ہی میرے وہ سرِ طور نہیں	شہید دہلوی
وہ لاکھ مٹاتے رہیں دنیائے تمنا	کہتے ہیں جسے دل کبھی تنہا نہ رہے گا	ایک ارمان نکلتا ہے تو سو آتے ہیں	دل عجب گھر ہے کہ ہرگز نہیں ویراں ہوتا	مومنؔ
ہائے کیا چیز گلِ داغِ محبت ہے جگرؔ	خشک ہونے پہ بھی بوئے وفا دیتا ہے	یہ گل داغِ محبت بھی عجب چیز ہے درد	لاکھ کملائے مگر بوئے وفا رکھتا ہے	میر دردؔ
یہ ترکِ جستجو بھی کیا ترکِ جستجو ہے	اِس میں بھی پا رہا ہوں اک شان جستجو کی	یہ ترکِ آرزو بھی اک آرزو ہی ٹھہری	اِس میں بھی دیکھتا ہوں اِک شان آرزو کی	شہیدؔ
نکہتِ گل کا بھی دماغ نہیں	کتنا آزردۂ بہار ہوں میں	ہجر میں آزردۂ باغ۔ کس	نکہتِ گل کا ہے دماغ کسے	مصحفیؔ
مجھے نہ چھیڑ بہت اے نسیمِ صبح کرم	تمام شوق و شکایت کا ماجرا ہوں میں	نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی	تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں	انشاؔ

ان چربوں کے علاوہ چند اور بھی ہیں مگر بخوفِ طوالت انہی پر اکتفا کرتا ہوں کہ میرے دعوی کی دلیل کے لئے بہت کافی ہیں میں نے صرف ان ہی متقدمین کے ایسے اشعار پیش کئے ہیں جن کے مطبوعہ دواوین میں یہ سب کے سب اشعار موجود ہیں جن کی ہر صاحبِ ذوق بآسانی تحقیق فرما سکتا ہے۔

احمد علی مجاہد

سنتری

غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ فرانس اور جرمنی کے دریا برف سے منجمد ہو گئے تھے۔ برف باری کے خوف سے لوگ مکان سے باہر قدم رکھتے ہچکچاتے تھے۔ غریب مزدور پیٹ بھرنے کی خاطر نکلتے اور کام کرتے کرتے برف کی طرح سرد پڑ جاتے۔

ایسے خوفناک موسم میں ایک نوجوان سنتری پہرہ پر کھڑا اپنا فرض انجام دے رہا تھا کڑاکے کے جاڑے میں اس کے اعضا مفلوج ہوے جا رہے تھے۔ لیکن وہ بت بنا کھڑا رہا۔

جب اس کی محبوبہ کو اس کا علم ہوا تو وہ بے تابانہ دوڑتی ہوئی آئی۔ ڈیرے کی مدھم روشنی میں سنتری کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ تاریکی میں آنے والے کو سنتری نے پہچان لیا۔ اور منہ موڑ کر ٹہلنے لگا۔ کہ شاید وہ اس سے واقف ہو جائے اور منت سماجت کرکے اسے اپنے فرائض سے غافل کردے۔

آتے ہی وہ اس سے چمٹ گئی۔ اور اس کو گرمانے کے لئے اپنی نازک ہتھیلیوں سے اس کا چہرہ رگڑنے لگی اور بے ساختہ بوسوں سے اس کو پریشان کردیا۔

لڑکی نے اس سے منت کی کہ صرف تھوڑی دیر کے لئے اس کے گھر چل کر کچھ کھا پی لے۔ مگر سنتری نے انکار کردیا۔ وہ اس کے پیروں پر گر پڑی اور گڑگڑا کر التجا کرنے لگی۔

"صرف چند لمحوں کے لئے چلے جاؤ۔ اپنی لوسی کی خاطر"

"میں مجبور ہوں پیاری میں یہاں سے ایک انچ بھی ہٹ نہیں سکتا"

"اگر تم نہیں مانتے تو لو میں بھی یہیں کھڑی رہتی ہوں"

"لیکن تم نازک ہو اور میں قوی" "میں نے جی کڑا کرلیا ہے"

"ہٹ نہ کرو۔ فرض سے ہٹنا موت کو بلانا ہے۔ ایک سپاہی کے لئے سب سے بڑی بدنامی!"

"میں بھی تمہارے ساتھ ٹھنڈی ہو جاؤں گی"

خیمے کی روشنی ٹمٹما کر خاموش ہو گئی۔ یکے دکے تارے جو چمک رہے تھے وہ بھی کہر میں چھپ گئے۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ اور اس کے تھپیڑوں سے نازک لڑکی ڈگمگانے لگی۔ اِدھر سپاہی گرا ہی چاہتا تھا۔ لڑکی کے دل میں یکایک جوش پیدا ہوا اس نے اس کے بٹن کھول کر وردی اتاری، بندوق ہاتھ سے چھین لی۔ اس نے اس کو جھنجوڑتے ہوئے کہا "سیدھے گھر چلے جاؤ۔ میں تمھاری جگہ کھڑی رہتی ہوں" اور اس نے وردی پہن لی۔ اور لبادا اور ٹوپ اوڑھ لیا، وہ چلا گیا اور یہ اپنی فتح پر اس قدر نازاں تھی کہ موسم کی تلخی کو بھول گئی۔

اتفاقاً ایک افسر جیبی برقی روشنی ڈالتا ہوا اِدھر سے گزرا۔ لڑکی نے سلامی نہیں دی۔ وہ بت بنی کھڑی تھی۔ افسر اس کے پاس آیا۔ اس نے سوالات کی بوچھاڑ کردی لڑکی اس قدر مرعوب ہو گئی تھی کہ اس کو کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ اور اس کی آنکھوں سے جھڑی لگ گئی۔

وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ اور آتش دان کے پاس بٹھا دیا۔ جب اس کا خوف کم ہو گیا تو اس نے رُکتے رُکتے تمام واقعہ بیان کردیا۔

علی الصبح سپاہی کو طلب کیا گیا۔ لیکن وہ بے حد کمزور ہو گیا تھا۔ اس لئے اسے ڈاکٹر کے پاس رجوع کردیا گیا۔

چوتھے روز جب اسے سزائے موت سنائی گئی تو اِس صدمے سے اس کی محبوبہ کا سینہ پھٹ گیا لیکن اس نے

عزم کرلیا کہ ہر ممکن طریقے سے اسے بچانے کی کوشش کرے گی ورنہ جان دیدے گی۔

وہ پریشان حال سب افسروں سے ملی۔ اور کمانڈر کے قدموں پر گر کر اس کی جان بخشی کی التجا کرنے لگی۔

سب اسے جانتے تھے۔ اس کے بین پر کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کا دل نہ بھر آیا ہو۔ افسروں کی بیویوں نے بھی سفارش کی۔

بالآخر اس نے دلوں کو موم کردیا۔ اور اس کا محبوب اُسے مل گیا۔

شبیر حسین قیس

کیفیات

مرے دلِ پُرحزن کی دھڑکن عجیب نغمہ سنا رہی ہے
سُنو کہ اس سازِ زندگی سے صدا ترنم کی آ رہی ہے

عجب زمانہ تھا بے دلی کا دل حزیں تو غضب ہی نکلا
میں جس تمنا پہ ہنس رہا تھا وہی مجھے اب رلا رہی ہے

جسے سمجھتا تھا دل کی دھڑکن وہی ہے مضرابِ سازِ ہستی
وہ ساز جس پر تری محبت ترانۂ شوق گا رہی ہے

ہمارے نالوں کے جوش میں بھی ہے اک سکونِ خوشی کا عالم
بھنور کے دامن میں کشتیٔ غم قریب ساحل کے آ رہی ہے

وہ اک مرا بدنصیب دل تھا ہوا نہ جو آج تک شگفتہ
نہیں تو گلزارِ آرزو میں کلی کلی مسکرا رہی ہے

مرے دلِ مضطرب سے شعلے اگر نکلتے ہیں کیا تعجب
کہ اس کے برقِ نظر کی گرمی کمال اپنا دکھا رہی ہے

عجیب مشکل کا سامنا ہے کروں گا کس طرح عرضِ مطلب
مری تمنا ہزاروں شکلیں بنا بنا کر مٹا رہی ہے

وہ غنچۂ آرزو ہمارا جو کب کا مرجھا چکا تھا ہادیؔ
نسیمِ امیدِ کامرانی اسی کو اب پھر کھلا رہی ہے

ہادیؔ مچھلی شہری

ترقی پسند ادب

انسان زبان کے ذریعے سے اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتا ہے یہ سب سے بڑی نعمت ہے جو خدائے قادر نے انسان کو عطا فرمائی ہے۔ اسی سے انسانوں اور حیوانوں میں فرق و امتیاز ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ انسان نے وہ چیز ایجاد کی جسے ہم تحریر کہتے ہیں۔ تحریر کی ایجاد ظاہر ہے کہ تمدن کی ضرورتوں کی وجہ سے ہوئی ہوگی۔ یہ ایجاد انسانی تہذیب کی سب سے اہم اور سب سے زیادہ منفعت بخش ایجاد ہے۔ تحریر ہی کے ذریعہ سے حکمائے قدیم اور علمائے عالم کے خیالات ہم تک پہنچے ہیں۔ اور اسی سے ہمارا ترقی پسند دَور آنے والے دوروں کے لئے ایک شمع ہدایت ہوگا جس کی روشنی میں وہ اپنی اور ہماری حالتوں کا موازنہ کریں گے۔ جیسا کہ آج ہم اپنی اور عہد سلف کی حالتوں کا موازنہ کرتے ہیں۔

ادب کیا ہے

قومیں جوں جوں ترقی کرتی ہیں ان کے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے اور تہذیب و تمدن وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اس سے انسانی زندگی مختلف پہلوؤں میں تقسیم ہو جاتی ہے بعض طبائع جو زیادہ نازک زیادہ ارفع اور اعلیٰ ہوتی ہیں جن میں غور و خوض کا مادہ خاص طور پر زیادہ ہوتا ہے وہ اپنی ذہنی کیفیات اور قلبی واردات کو ظاہر کر دینا شروع کر دیتی ہیں کبھی یہ ہوتا ہے کہ انسان کے مشاہدے اور تجربے میں کچھ چیزیں نوخوغا رہ جاتی ہیں یا فطرت ان کو ایسی قوت ودیعت کرتی ہے کہ ان میں ان مشاہدوں اور تجربوں کے محفوظ کرنے کی صلاحیت اوروں سے زیادہ ہوتی ہے یہ گروہ جب اپنے خیالات، محسوسات، تجربات اور مشاہدات عمدہ پیرایہ میں بیان کرتا ہے تو اس کو فن لطیف کہتے ہیں جس کا دوسرا نام ادب ہے۔

ارتقائے ادب

دنیا کی ہر چیز اپنی جگہ پر ایک خاص حالت میں نہیں رہتی۔ تغیر اور تبدیلی کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ پیدائش، نمو، بلوغ، شباب، شیب اور فنا ہر چیز کے لئے ہے۔ حتیٰ کہ زمین و آسمان کے لئے بھی جب کہ ہر چیز کی فطرت کا یہی تقاضہ ہے تو پھر خیالات و محسوسات تجربات و مشاہدات کے اثرات بھی مختلف دَور زندگی میں مختلف ہوں گے۔ خود بیان کرنے والوں کے لئے بھی اور اس بیان کے سننے والوں کے لئے بھی۔ ادب پرتو ہے کسی قوم کے رجحانات کا اور جوں جوں ان رجحانات میں تغیر ہوتا جائے گا ادب میں بھی تغیر ہوتا چلا جائے گا' اذہان قومی کی سطح ایک دور میں قریب قریب یکساں رہتی ہے اس لئے اس ہر دور کا ادب بھی یکسانیت لئے ہوئے ہوتا ہے ایک جملے سے ایک مصرعہ سے تصویر کے ایک ہلکے سے عکس سے یا کسی بت کی تراش سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کس دور کی پیداوار ہے۔ مثال کے طور پر ہم اردو ادب پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اردو کا بالکل ابتدائی دور دیکھئے اس کے بعد دکنی دور پر نظر ڈالئے۔ خصوصاً ولی اور سراج کے کارناموں پر غور کیجئے اس کے بعد دہلی میں شعر و سخن کے چرچوں کو دیکھئے۔ لکھنوی دور ادب پر نظر ڈالئے۔ میر اور سودا کی کوششیں مشکور ہوتی ہوئی دیکھئے ذوق، مومن اور غالب کے جلسوں میں شرکت کیجئے اور ان سب کے بعد موجودہ دور کا مطالعہ کیجئے صاف نظر آجائے گا کہ اردو ادب نے کیونکر بتدریج ارتقا حاصل کیا ہے اور صدیوں کی مسلسل کوششوں اور کاوشوں کے بعد کیونکر وہ اب اس درجہ پر پہنچا ہے جس پر کہ وہ آج ہے۔

رجحانات ادبی

ادب میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ آیا ادب قومی رجحانات کا تابع ہے یا وہ قومی رجحانات کو اپنا تابع بنانا چاہتا ہے۔ اس مسئلہ میں

اختلاف ہے۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ ادب اس وقت تک
مقبول نہیں ہو سکتا اور زندہ رہ سکتا ہے جب تک وہ فوری رجحانات
کا ساتھ نہ دے اور بعض کے نزدیک وہ ادب ادب ہی نہیں جس کو
مقبول ہونے کے لئے قوم کی خوشامد کرنی پڑے۔ ان کے نزدیک
ادب کا کام یہ ہے کہ وہ قومی رجحانات کی رہبری کرے۔ اگر اس میں
کوئی نقص اور خامی ہو تو اسے دور کرنے کی کوشش کرے۔
اگر پستی ہو تو رفعت بخشے لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ ادب کا زیادہ حصہ
تابع ہوتا ہے قوم کے رجحانات کے اور ایسا ادب جو رجحانات و خواہشات
کا تابع نہیں ہوتا، بہت کم ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو اس زمانے میں
نہ وہ مقبول ہوتا ہے نہ مطبوع۔ یہ ممکن ہے کہ کسی آئندہ دور میں
وہ سرسبز ہو جائے۔

دنیا کی تاریخ انقلاب میں یہ عجیب بات ہے کہ انقلاب سے
سالہا سال پہلے ایسے مصور، شاعر، مصنف اور فلسفی پیدا ہوئے
جنھوں نے آنے والے انقلاب کے لئے راستہ صاف کیا۔ بلکہ اگر
نگاہ عمیق سے دیکھا جائے تو اصلی انقلاب تو یہی لوگ کر چکے تھے
بعد میں لوگ انھیں کے تاثرات سے متاثر ہوئے اور سیاسی و
ادبی دنیا میں جو انقلابات ہوئے وہ دراصل نتیجہ تھے انھیں
ذہنی انقلابات کے جو یہ لوگ قوم کے دماغوں میں پہلے سے پیدا
کر گئے تھے۔

ترقی پسند ادب

عام طور پر اس کا مفہوم یہ ہے کہ صدیوں کی قائم شدہ روایات سے بغاوت
کی جائے۔ اس کی ابتدا فرانس سے ہوئی۔ یہاں سب سے پہلے
تخت سے بغاوت کی گئی۔ اس کے بعد مذہب سے۔ مذہب سے
بغاوت کا سبب یہ ہوا کہ کلیسا نے شہنشاہیت کی پشت پناہی
کی۔ کلیسا کا قبضہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ والٹیر نے
پادریوں کا اس قدر مذاق اڑایا کہ مذہبی لوگوں کی عزت و توقیر
دلوں سے جاتی رہی۔ روسو نے انقلاب کا پیغام فرانس کو اور
تمام دنیا کو دیا۔ اس کے بعد فرانس کے شاعر نے "رسائی" والی
نظم لکھی جس نے فرانس کے گوشے گوشے میں آگ لگا دی۔ لوگ
جوق جوق انقلابی فوج میں شریک ہوگئے۔ جمہوریہ فرانس کے ابتدائی
دور میں مذہبیات ایسا کفر تھا جس کی طرف اہل فرانس بھول کر
بھی رخ نہیں کرتے تھے۔ رابس پیری کی پوجا، عقل کی دیوی
کی پوجا، قوم اور ملک کی پوجا ان کا شعار تھا اور مذہب کی طرف
رخ کرنا گناہ۔

فرانس کے انقلاب نے کسی ملک پر ایسا اثر نہیں ڈالا
جیسا روس پر۔ ملک استبداد و انانیت کے پنجے میں گرفتار تھا۔
ظلم و ستم کا ہر طرف دَور دَورہ تھا۔ امرا اپنے فرائض سے بے خبر
غریبوں کی گاڑھی محنت کی کمائی پر عیش و عشرت کرتے تھے۔
آخر کار وہاں بھی بغاوت ہوئی۔ ٹالسٹائی اور دیگر انقلاب پسند
ادیبوں نے ناول ڈراما اور مختصر افسانہ نویسی کے ذریعہ عوام کو
بغاوت اور انقلاب پر آمادہ کیا غریبوں کی زندگی کا مطالعہ
کرکے ان کی تصویریں دنیا کے سامنے پیش کیں۔ امیروں کی
کھوکھلی زندگی کی ہیبتناک تصویریں منظر عام پر لائی گئیں جس نے
حکومت کرنے والی ذات کا رعب ختم کر دیا ٹالسٹائی سے لے کر
گورکی تک اکثر مصنفین نے یہ کام انجام دیا۔

مختصر افسانہ نویسی اور اس نئے آرٹ کا شہرہ تمام دنیا میں
ہوگیا اور مظلوم قوموں نے بھی اسی شاہراہ پر گامزن ہونے کی
کوشش شروع کر دی۔ اپنی قوم کو بیدار کرتے نیز ان کے دماغوں
میں انقلاب کا بیج بونے کے لئے افسانے اور نظمیں لکھی جانے
لگیں۔ فرانس کی طرح روس میں بھی کلیسا نے تخت کی حمایت
کی چنانچہ شہنشاہیت کے خلاف انقلاب، پادریوں کی کوتاہ
اندیشی کی وجہ سے کلیسا کے خلاف بھی انقلاب بن گیا۔

چنانچہ مذہبی لوگوں کا مذاق اڑانا اور ان پر پھبتیاں کسنا انقلاب اور ترقی پسندی کا جزو لازمی بن گیا۔

ترقی پسند ادب ہندستان میں

روس کے انقلاب کی دھوم اور ترقی پسند ادب کی اہم طاقت کے چرچے ہندستان میں بھی پہنچے یہاں ایک جماعت ایسی موجود تھی جو حکومت کے خلاف لوگوں کو آمادہ کرنا اپنا نصب العین سمجھتی تھی۔ ہمارے ملک میں جو ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی وہ زیادہ تر کانگریس یا کانگریس سے ہمدردی رکھنے والے افراد پر مشتمل ہے کانگریس کے ایک حصے پر اشتراکی رنگ جس طرح حاوی ہوتا چلا جا رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ اشتراکیت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات روس کی پیروی کرنا اپنے لئے ضروری سمجھتے ہیں روس میں جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے انقلاب صرف تخت کے خلاف نہیں ہوا بلکہ کلیسا کے خلاف بھی۔ اس کی تقلید میں ہمارا ہر ترقی پسند ادیب مذہب سے خفا ہے اور اس کا مذاق اڑا کر اپنے ترقی پسند ہونے کا ثبوت دیتا ہے مثال کے طور پر "انگارے" کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جس کو پڑھ کر آپ میری رائے سے متفق ہو جائیں گے۔

کیا ترقی پسند ادب کی بقا ممکن ہے

یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب آسان نہیں۔ دنیا کا بڑا حصہ اپنے ہر قسم کے عقائد میں پختہ ہوا کرتا ہے اور اپنی زندگی میں "بدعت" کو راہ دینے سے حتی الامکان گریز کرتا ہے۔ اس چیز کو دیکھتے ہوئے کم از کم ہندوستان میں تو امید نہیں کہ ترقی پسند ادب سرسبز ہو۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بغاوت دراصل بغاوت ہے بھی یا ہم نے ارتقائی ادب کا نام ترقی پسند ادب رکھ لیا ہے۔ انسان تہذیب و تمدن، ادبیات مذہب غرض ہر شئے میں بتدریج ترقی کرتے کرتے اس درجے پر پہنچا ہے کیا کوئی چیز اصل سے جدا ہو کر قایم اور زندہ رہ سکتی ہے؟ چنانچہ اب یہ صورت قایم رہ سکتی ہے یا نہیں۔ دنیا کے لئے اس کا نتیجہ اچھا نکلے گا یا برا یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس کا حل کبھی نہ کبھی ہوگا ضرور لیکن ابھی نہیں !!!

بڑا خطرہ

ترقی پسند ادب کو بقائے دوام حاصل ہو یا نہو لیکن فی الوقت تو یہ چیز ہمیں بڑے خطرے سے آگاہ کرتی ہے۔ مذہب کو سیاسی میدان میں لا کر پارٹی بازیوں کی کشاکش میں ڈالنا خطرناک ہے۔ ہمارے علماء اگر ایک سیاسی جماعت کی موافقت کریں گے تو دوسری جماعت جب کبھی برسر اقتدار ہوگی تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے حریفوں ہی کو نہیں بلکہ علماء کو بھی اور ان کے مذہب کو بھی کچلنے کی کوشش کرے گی۔ یہ کوئی خیالی اور فرضی خطرہ نہیں۔ بلکہ فرانس، روس اور مختلف ممالک کے انقلاب کی تاریخ ہماری اس رائے کی شاہد ہے۔

بلقیس بانو

اُردو فاضل (ادارۂ ادبیات اُردو)

مددگار مدرسہ فوقانیہ نسواں۔ نامپلی

عظمت اللہ خاں مرحوم

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے ٭ یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

عظمت اللہ خاں مرحوم میرے عزیز بھی تھے۔ اور عزیز دوست بھی مگر میری اور اُن کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا میں قدامت پسند ہوں۔ اور وہ زمانے سے دو قدم آگے رہنا چاہتے تھے۔ میں پرانے شاعروں کو اپنی تحریروں سے زندہ کرنا چاہتا ہوں اور انھوں نے اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان "شاعری" ہے اس سرے سے اس سرے تک سارے اُردو کے شاعروں کو دنیائے شاعری سے بارہ پتھر باہر کر دیا ہے۔ میں لکیر کا فقیر ہوں اور وہ جدت پسند تھے۔ اور جدت پسند بھی ایسے کہ باوجود اِس تن و توش اور مضبوط قویٰ کے مرے بھی تو کس مرض میں، کہ دق میں

لکھنے کا انھیں ہمیشہ سے شوق تھا۔ مگر معلوم نہیں کہ وہ لکھتے کس وقت تھے کیونکہ اُن کے پاس لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے ایک ہے کہ اپنا مضمون سنا رہا ہے دوسرا ہے کہ شعر پڑھ رہا ہے ... یہ آرام کرسی پر بیٹھے واہ واہ اور سبحان اللہ سے اس کا دل بڑھا رہے ہیں۔ اور اسی واہ واہ اور سبحان اللہ میں کچھ ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جس سے مضمون میں اصلاح بھی ہو جائے۔ اور پڑھنے والے کو یہ بھی نہ معلوم ہو کہ اس پر اعتراض کیا گیا ہے۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس مقام میں وہ رہتے تھے وہاں رہ کر انسان لکھنا پڑھنا تو درکنار جی بھی کیسے سکتا ہے، مکان کیا تھا، خاصہ اچھا قفس تھا۔ اول تو صحن ہی چھوٹا تھا، اس پر گملوں کی بھرمار نے اس کو اور بھی تنگ کر دیا تھا

. . . . دروازے سے گھستے ہی داہنے ہاتھ کی طرف ایک پتلا سا برآمدہ اور بہت ہی پتلا سا کمرہ تھا، کمرے کی کھڑکیاں بازار کی طرف کھلتی تھیں۔ کھڑکیوں کے نیچے ہی موری تھی اور سڑک کے دوسرے طرف شراب خانہ، میونسپل کمیٹی کی موری کی تعریف میں کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے ایک طرف موری کی خوشگوار بُو اور دوسری طرف شراب کے بھپکے، اس کمرہ میں بیٹھنا بس عظمت اللہ خاں ہی جیسے شخص کا کام تھا اور کوئی دوسرا ہوتا تو گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا، یہ انہی کے قویٰ تھے کہ کئی بار اس مصیبت کو برداشت کر گئے لیکن آخر کہاں تک، دق ہو گئی، اور مر گئے۔

وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے تھے۔ کوئی ان کے ہاں بیٹھا تو انھوں نے کتاب الٹ میز پر رکھ دی اور اس سے باتیں کرنے لگے، وہ گیا اور انھوں نے کتاب اٹھائی۔ ہاں لکھتے ہوئے میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا، پھر بھی انھوں نے اتنا لکھا ہے کہ چھپنے پر ان کے مضامین کی شاید دو جلدیں ہو جائیں اُن کو قطعاً شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں تھا۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ اُردو شاعری کا جو رنگ پڑ گیا ہے اس کو بالکل نیا جامہ پہنا دیا جائے اِس لئے انھوں نے نہ صرف ہندی بلکہ انگریزی اور فرانسیسی شاعری کا مطالعہ بھی بڑی گہری نظر سے کیا۔ انگریزی مضمون کے ترجمے کئے، ہندی پنگل کو سائنٹیفک اصول پر ڈھالا اور ان کی محنت کا نتیجہ اب "سریلے بول" کی شکل میں آپ کے سامنے آرہا ہے، اِن کی زندگی ہی میں لوگوں نے اس نئے راستے پر چلنا شروع کر دیا تھا، اور اب یہ رنگ ذرا ابتر ہو رہا ہے۔ اگر اس رنگ میں لکھنے والا کوئی میر یا مرزا پیدا ہو گیا تو یقین جانئے کہ پرانا رنگ مدھم پڑ جائے گا اور گل و بلبل کی بجائے اُردو کے باغ میں آم پر کوئل کوکنے لگے گی۔

عظمت اللہ خاں کے مرنے کے بعد ہی ایک مضمون "یادِ رفتگاں" کے عنوان سے چھپا تھا۔ اُس کی چند سطریں

یہاں دیتا ہوں، اِس سے اُن کی تحریر اور اُن کی تعلیمی حالت کا اندازہ ہوسکے گا۔

مطالعہ کے شوق نے اُن کی معلومات کو وسعت دی۔ اُن کی تحریر میں قوت پیدا کی، اُن کے قلم میں زور دکھایا، یہی مطالعہ تھا جس سے اُن کو مختلف زبانوں کی طرز تحریر سے باخبر کیا۔ مختلف خیالات سے آگاہ کیا، اور بالآخر انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار ایسے طریقے پر شروع کیا جس میں انگریزی کی متانت، فرانسیسی کی خوشی، فارسی کی ظرافت اور ہندی کے درد کی جھلک تھی۔ وہ کسی تاریخ دہلی میں پیدا ہوئے تو ہوئے ہوں انھوں نے اجمیر کالج میں کبھی بہ حیثیت طالب علم نام پیدا کیا ہو تو کیا ہو، انھوں نے انگریزی میں (ESSAY) لکھنے میں سونے کا تمغہ پایا ہو تو پایا ہو، مگر صرف دُو تاریخیں ان کے نام کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گی، ایک وہ تاریخ جس روز انھوں نے اُردو ادب پر قلم اٹھایا اور دُوسری وہ تاریخ جب دستِ قضا نے اُن کے ہاتھ سے قلم چھین کر ان کو ہمیشہ کے لئے خاموش کردیا۔

اس وقت "سرِ پلیول" آپ کے سامنے ہے، اس میں پہلا مضمون "شاعری" پر ہے، انھوں نے بتایا ہے کہ اُردو شاعری کیا ہے اور اس کو کیا ہونا چاہیے، انھوں نے شاعری کی بہترین تعریف سمجھی ہے کہ "شاعری تخیلی پیکر کا پیدا کرنا ہے" اور اس کے دُو پہلو ہیں، ایک یہ کہ جو چیز موجود ہو مگر سامنے نہ ہو اس کو لفظوں میں اس طرح دکھایا جائے کہ اصل صورت سامنے آجائے، دوسری یہ کہ جو چیز موجود نہ ہو اس کو ایک تخیلی پیکر اس طرح دیا جائے کہ ہر پڑھنے والے کے سامنے ایک ایسی تصویر کھیچ جائے کہ وہ اس کو اصلی سمجھنے لگے، اسی پر بحث کرکے انھوں نے اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ تخیلی پیکر اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک نظم مسلسل نہ ہو، اور اِس بناء پر انھوں نے کہا ہے کہ۔

میں پہلے ہی کہہ آیا ہوں کہ میری اور مرحوم کی طبیعت میں اختلاف ہے۔ میں اُردو شاعری کو اتنا ناقص نہیں سمجھتا جتنا وہ سمجھتے ہیں، اور شاعری کے لئے نظم کے مسلسل ہونے کو لازم نہیں جانتا۔ اردو شاعری میں "حیات انسانی کا چربہ" تو نہیں ہے لیکن اس میں انسانی احساسات کے نقشے بدرجۂ اتم موجود ہیں اور "سو سنار کی اور ایک لوہار کی" والی مثل کی طرح اس کا ایک شعر اکثر نظم مسلسل کے سو شعر پر بھاری پڑتا ہے، مثلاً غالبؔ کا یہ شعر لیجئے ؎

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس شعر کو پڑھ کر جو واقعات آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں اِن کو اگر نظم مسلسل میں ادا کیا جائے، تو یقین مانئے خاک اثر نہ رہے گا۔ انسانی طبیعت کی الجھن عبدالرحمٰن خاں احسان کے اس شعر سے بہتر کسی نظم مسلسل میں اس اثر کے ساتھ ظاہر کی جاسکتی ہے، لکھتا ہے ؎

دیکھیو میری طرف سچ کہیو اے اختر شناس
کیوں فلک کو تو نے دیکھا میرے اختر دیکھ کر

یہی وجہ ہے کہ اُردو کے بہت سے اشعار زبان زد خلائق ہوگئے، اور ہر پڑھا لکھا اور اَن پڑھ ان کو بے تکلف پڑھتا اور لطف اٹھاتا ہے۔ اگر وہ رنج میں ہے تو یہ شعر اس کے رنج میں ایک لطف پیدا کردیتے ہیں، اگر وہ خوشی میں ہے تو یہ شعر اس کی خوشی کو دوبالا کردیتے ہیں، مرحوم نے ہندی شاعری کی تقلید پر زور دیا ہے مگر ہندی کی کوئی نظم مسلسل ایسی موثر نہیں ہے جیسے اس کے "دوہے" وجہ یہ ہے کہ نظم مسلسل کا

لطف باغوں میں آرام کرسی پر لیٹ کر فرصت سے پڑھنے میں اٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں اُردو رائج ہے وہاں والوں کو یہ آرام کہاں نصیب ہے، یہ تو ایسے چھوٹے چھوٹے فقرے چاہتے ہیں۔ (خواہ وہ نثر میں ہوں یا نظم میں) جن کو باآسانی یاد کر لیا جا سکے، جن کو چلتے پھرتے پڑھا جا سکے، اور جن سے انسانی احساسات کی مردہ قوتوں کو جگایا جا سکے۔

لیکن باوجود اس کے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ اب تک نظم مسلسل کی ہمارے ادب میں کمی ضرور تھی جو، اب ایک حد تک پوری ہو رہی ہے۔

اسی شاعری کے مضمون میں مرحوم نے علم عروض سے بھی بحث کی ہے، اور بتایا ہے کہ کس طرح بحروں کے پھندوں سے نکال کر ایک سائنٹیفک اصول پر لایا جا سکتا ہے، ہندی پنگل پر سب سے بہتر کتاب قدر بلگرامی مرحوم نے لکھی ہے میں نے اس کو بھی دیکھا ہے۔ علم عروض کی بھی کچھ کتابیں پڑھی ہیں اور انگریزی کی "پروسیڈی" کو بھی کالج والوں نے میرے دماغ میں اتارنے کی کوشش کی ہے، ان سب کے پڑھنے پڑھانے کے بعد میری وہ رائے قایم ہوئی ہے جو پانچ چھ سو سال قبل مولانا رومؔ قایم کر چکے تھے۔

شعر می گویم بہ از آبِ حیات
من نہ دانم فاعلاتن فاعلات

یعنی یہ کہ جب تک آدمی "کن رس" نہ ہو اس وقت تک یہ پنگل اور عروض سب بیکار ہیں، اندھے شاعر ہو سکتے ہیں۔ بہرا شاعر نہیں ہو سکتا اور انسان کی طبیعت کو بحروں سے یا کسی سائنٹیفک پیمانہ سے محدود نہیں کیا جا سکتا، استاد ذوق کا واقعہ تو آپ کو یاد ہو گا کہ انھوں نے ایک غزل ایسی کہی تھی جو کسی بحر میں نہیں آتی تھی، لوگوں نے اعتراض کیا جواب

دیا گیا کہ یہ ایک نئی بحر سہی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس بحر کا اضافہ علم عروض میں ہو گیا، بہرحال میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کے لئے علم عروض یا پنگل کی گہرائیوں میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا ذوق سخن ایک ایسا پیمانہ ہے جو اِن تمام پابندیوں سے بالاتر ہے، پھر بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ عظمت اللہ خاں مرحوم نے جو طریقہ اشعار کے جانچنے کا قائم کیا ہے وہ ایک بہت آسان طریقہ ہے، اور اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اوزان کی کوئی حد بندی نہیں رہی ہے اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی نظموں میں عملاً بتلا دیا ہے کہ یہ طریقہ کس طرح کام میں لایا جا سکتا ہے، یہ ضرور ہے کہ جو کوئی ان نظموں کو پہلے پہل پڑھے گا اس کا دل شروع میں اچاٹ رہے گا لیکن ایک آدھ دور کے بعد اس کو اِن نظموں میں مزا آنے لگے گا، کیونکہ ہر نظم اصلیت پر مبنی ہے اور دلی جوش کے ساتھ لکھی گئی ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ "کل جدید لذیذ"

اس کتاب میں آپ بعض ایسی نظمیں بھی دیکھیں گے جو انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ اِس ترجمے میں روانی ایسی ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ سبب یہ ہے کہ مرحوم نے اِن نظموں میں مکھی پر مکھی نہیں ماری ہے بلکہ جہاں ان کو اپنے ملک کے خیالات کے لحاظ سے تبدیلی کی ضرورت ہوئی وہاں بلاتکلف تبدیلی کر دی اول تو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ ہی ایک مشکل کام ہے اور پھر نظم کو جوں کا توں نظم میں تبدیل کرنا ایک ناممکن سا کام ہے، ایسی صورت میں بہتر طریقہ یہی ہے کہ حتی الامکان نظم کا ترجمہ نظم میں کرتے وقت زیادہ زور مضمون اور مضمون کی اسپرٹ پر دیا جائے۔ تاکہ اس نظم کے اصلی خیالات

اور تشبیہات ترجمہ میں آجائیں اور اس کے ترجمے کو لفظی ترجمہ نہ کہا جاسکے۔

بہر حال اب اس کی ضرورت ہے کہ ان لوگوں کو جنھیں شاعری سے واقعی لگاؤ ہے، اس جدید رنگ کو اختیار کرنے میں "لومتہ لائم" کی پروا نہ کرکے اور اس دُھن میں لگ کر کہ ہم کو یہ جدید رنگ اردو ادب میں داخل کرنا ہے، پوری کوشش کرنی چاہیے اگر یہ رنگ اصلی ہے تو پختہ ہو کر ہمیشہ کے لئے قایم ہوجائے گا، اگر نقلی ہے تو چند دنوں کے بعد خود بخود مٹ جائے گا خود ان لوگوں کا نام دنیا میں قایم رہے گا، اردو ادب کا پھیلاؤ بڑھے گا، اور ساتھ ہی ساتھ عظمت اللہ خاں مرحوم کا نام زندہ ہوجائے گا جنھوں نے اپنی ساری عمر اس جدید رنگ سے لوگوں کو روشناس کرنے میں صرف کردی۔

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

فرحت اللہ بیگ

رقص

جس طرح انگڑائیاں لیتی ہے شاعر کی امنگ
جس طرح بجتے ہیں کالی بدلیوں میں جل ترنگ

جس طرح دل پر اثر کرتا ہے لحنِ آبشار
جس طرح دل میں اتر جاتا ہے پھولوں کا نکھار

جس طرح ٹھنڈی ہوا سے گرم ہوجاتا ہے دل
کیفیاتِ درد میں جس طرح کھو جاتا ہے دل

جلوہ آرا جس طرح ہوتی ہے گلشن میں بہار
خواب سے جس طرح چونکاتی ہے بوندوں کی پھوار

جس طرح چھنتی ہے کالی بدلیوں سے چاندنی
فصلِ گل میں جس طرح ہوتی ہے رخشاں زندگی

یونہی، دل میں رقص سے ہوتے ہیں زندہ ولولے
رُوح میں تحلیل ہوجاتے ہیں شیریں زمزمے

رقص جب کرتا ہے کوئی دلبرِ شیریں صفات
بے تکلف رقص کرتی ہے یہ ساری کائنات

جھومتے ہیں نخل، گرمِ رقص ہوتی ہے صبا
مسکراتے ہیں گلستاں، وجد کرتی ہے فضا

چاند کے سینے میں جوئے شوق ہوتی ہے رواں
رقص سے معمور ہوجاتا ہے تاروں کا جہاں!

رقص کے جادو سے یوں معمور ہوتی ہے فضا
وسعتِ دل کیا، بساطِ ذرّۂ ناچیز کیا

مسکراتی ہے زمیں سے تا بہ گردوں زندگی
نبضِ ہستی میں نظر آتی ہے جنبش رقص کی

تحسین سروری

پیار کی راتیں پیار کی باتیں

(۱)

برسات کی کالی "زلفیں" جیسی کالی راتیں - کمرے کے باہر مسلسل اور موسلا دھار بارش کا شور، ہوا کا فراٹا، بوندوں کی پڑ پڑ، پرنالوں کی بھڑ بھڑ، نالیوں کی سر سر کمرے کے دروازے بند، اندر دو مست مئے الفت، نیند کے ماتے پڑے محبت کے سہانے خواب دیکھتے ہیں - کڑ کڑ کڑ بادل گرجتا ہے، بجلی زور زور سے چمکتی ہے، ایسی چمکتی ہے کہ اس کی چمک بند کمرے کے اندر بھی آتی ہے - دونوں بہ یک وقت جوانی کی متوالی نیند سے ذرا کروٹ بدلتے ہیں اور نیم وا، خمار آلودہ، مدبھری آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں پھر ایک کا نازک سر ایک کا کشادہ سینہ، ایک کے لانبے لانبے بال، ایک کے ہاتھ کی انگلیوں کا شانہ

بارش اپنی مسلسل پڑ پڑ کرتی ہے، نم زمین کی خوش گوار سوندھی سوندھی بو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہوتی ہے، ہوا سَر سَر کرتی لوریاں گاتی ہے، بوندیں پٹ پٹ کر کے تال بجاتی ہیں - دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں، ایک خوشگوار خنکی محسوس کرتے ہوئے - ایک دوسرے پر تیز تیز، گرم گرم سانسیں چھوڑتے ہوئے پھر مست خواب ہو جاتے ہیں -

پیار کے دن ہیں، پیار کی راتیں - !!

(۲)

گرما کی مختصر راتیں، چاندنی کی بہاریں - صحن میں چھڑکاؤ کیا ہوا، خفیف سی خنکی پھیلی ہوئی، بیچ صحن میں - ایک پلنگ پر، سفید چادر بچھی ہوئی، کچھ پھول بکھرے ہوئے، فضا میں بھینی بھینی بو پھیلاتے ہوئے - ایک مست ناز - چاندنی ہر طرف چھٹکی ہوئی، صبح صادق جس کی گود میں سوتی ہوئی، تارے ماتھے کے پسینے کی بوندوں کی طرح بکھرے ہوئے، چاند سونے والے کو ٹکٹکی باندھا ہوا - رشک سے حسد سے - پلنگ سے ذرا دور ایک کرسی پر ایک محو نظارہ - ہوا مچل کر چلتی ہے، ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت بخش - پتے کھڑکھڑاتے ہیں - پھر - کوئی کروٹ بدلتا ہے - چھن ایک ہلکی، مدھم جھنکار - ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چلتا ہے، چھین کپڑوں سے معطر پسینے کو لے اڑتا ہے - ہوا کا جھونکا ٹھنڈا ٹھنڈا - روح پرور - روح پرور - جان آگئی جان آگئی -

پیار کے دن ہیں، پیار کی راتیں - !!

(۳)

جاڑوں کی طویل - پہاڑ جیسی طویل راتیں - مگر آنکھ جھپکتے گزرنے والی راتیں - رُوئی اور دوئی کے مزے اٹھانے کی راتیں رضائی، دلائی - قربت، یکجائی - ہوا کانٹوں کی طرح چبھتی ہے، پانی برف بن جاتا ہے، کہر پڑتی ہے، پالا پڑتا ہے، جاڑا ہوتا ہے، دانت بجتے ہیں - جاڑا ہوتا ہے؟ ہونے دو - دانت بجتے ہیں؟ بجنے دو - دو روحیں اس سے بے پروا، بے خبر - جوانی کا گرم خون محبت کی گرمی، ساری سردی اور سارے جاڑے کا علاج —

پاس انگیٹھی ہے، جسم پر رضائی ہے اور بازو - ایک دن کی محنت اور مشقت کا تھکا ہارا، محبت کا مارا - ایک گھر میں بیٹھی اس کی راہ دیکھنے والی، اس کے انتظار میں گھڑیاں گنے والی —

ہو ہو ہو ہو — ہو ہو — سرد ہوا چلتی ہے، سردی ہوتی ہے - ایک کی گردن ایک کی باہیں - ایک کی تیز اور گرم سانسیں - ایک کا قوی اور مضبوط جسم - دوسرے کا گداز اور نرم — کپکپاتا، تھرتھراتا — آہاہاہا، آہاہاہا —

پیار کے دن ہیں، پیار کی راتیں - !!

ساحر

— — — —

فیضی کے منشآت

مشاہیر حکماء میں، حکیم مصری، حکیم عمادالدین محمود اور کمال الدین حسین وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ حکیم مصری کے متعلق اُس کے الفاظ یہ ہیں :-

"دریں دیار نام حکیم مصری بسیار است و کارنامہ ہائے علاجِ او بے شمار الحق باایں دانائی و دقیقہ رسی و تشخیصِ امراض..... ...امروز طبیبے مثلِ او نشاں نمی دہند۔"

حکیم عمادالدین محمود کے متعلق سرسری طور پر درج ہے کہ مدت ہوئی کہ یہ مشہد میں انتقال کر گیا ہے۔ دوسرے طبیب حکیم کمال الدین حسین تھے، جن کو خان احمد گیلانی نے عراق سے طلب کیا تھا، اور ان سے "قانونِ شیخ" پڑھا تھا۔ گزشتہ سال ہی یہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔

حکیم ابوالفتح کے متعلق یہ اظہارِ خیال کرتا ہے کہ :-

"شاگردِ رشید حکیم عمادالدین محمود بود، غریب دریافتے و رسائی در ہمہ چیز داشت طبیبے یک گوشۂ فضائلِ او بودہ نادرۂ زماں بود"

آگے چل کر لکھتا ہے کہ :-

"حکیم ہمام استاد دیدہ است و اجازت نامہ ہائے اوستادانِ دارو بہ بندہ نمودہ بود کہ از علم و صداقت و کُل و فضلِ او بسیار نوشتہ۔ والحق چنیں ست و غریب فطرتِ عالی دارد۔ نظرِ حضرت کیمیا وی وجود و کمال بخشِ مستعداں است۔ خوش صاحبِ استعدادے کہ آئینۂ فطرتِ او بجاکِ ایں آستاں انجلا یابد۔"

لکھا ہے کہ نظام الملک (والئ احمدنگر) کے دربار میں دو مشہور و معروف طبیب ہیں، ایک حکیم کاشی، جو مدت سے یہاں ہے، اور اپنے آپ کو گمنام کر رکھا ہے، شاید اس کو حکیم مصری پہچانتا ہو، اور دوسرا حکیم علی گیلانی، جو کہ شیراز سے ہندوستان آیا ہے۔ بقیہ ہندی اطباء میں معمولی ہندو ہیں، جن میں سے کوئی بھی خاص امتیاز نہیں رکھتا۔ علی گیلانی، حکیم فتح اللہ شیرازی کا شاگرد ہے۔ ایک زمانہ سے اس فتح اللہ شیرازی کی بڑی شہرت سنی جاتی ہے، سنا کہ سالِ گزشتہ اس کو جالی بیگ نے چالیس تومان بھیج کر شیراز سے طلب کیا تھا، اور اب وہ ٹھٹھہ میں ہے۔ اگر خانِ خاناں کے نام فرمان صادر فرمایا جائے کہ اس کو درگاہِ والا میں بھیجے تو اس بے چارے باکمال کی سرفرازی کا باعث ہوگا، اور وہاں سے شیراز کا رستہ بھی قریب ہے۔

اس کے بعد دو عرضداشتیں ہیں، جو احمدنگر سے ۹ اخورداد اور ۱۰ آبان ماہِ الٰہی کو لکھی گئیں، لیکن سنہ درج نہیں۔

تیسری میں لکھا ہے کہ یکایک فرمان ملنے پر فدوی حسب الحکم روانہ ہوا، اور ۹ جمادی الاولیٰ کو برہان پور پہنچا تو لوگ تعجب کرنے لگے کہ ۲۵ کوس کس طرح ایک ہی منزل میں طے ہو گئے۔

ان عرائض کے ختم ہونے کے بعد کتاب کا دوسرا باب شروع ہوتا ہے، چونکہ ابواب "لطائف" سے تعبیر کئے گئے ہیں، اس لئے یہ "لطیفۂ دوم" ہے، جس میں شرفاء، علماء اور عرفاء کی مراسلت کے مکتوبات شامل کئے گئے ہیں۔

پہلے تین خطوط مولینا معین الدین محمد الہاشمی کے نام ہیں، جو عربی میں درج ہیں۔ چوتھا جوان ہی کے نام فارسی میں لکھا گیا ہے، اس میں تحریر ہے کہ خود اس نے ۹۸۵ھ

ہیں علوم دین کے متعلق ایک غیر منقوط کتاب لکھی ہے، اُس اطلاع
کے ساتھ ساتھ ان کی خدمت میں اس کو ملاحظہ کے لئے بھیجنا بھی ہے۔
ذیل کا اقتباس اس اجمال پر تفصیل کے لئے پیش ہے۔

"آں کہ در سنہ خمس وثمانین وتسمائۃ، کتابے غیر
منقوط، بہ علوم دین مربوط، تالیف نمودہ، موشح
بنام ہمایوں انتظام حضرت ظل اللٰہی خلد اقبالہ بہ نظر
خورشید اثر در آوردہ، بہ عربستان (کہ تجلی اسم متکلم
درآں ولایت بہ شابہ الیست کہ پایۂ فصاحت و
بلاغت بہ معراج اعجاز رسیدہ) ارسال داشتہ
بود، وبہ نشان۔ .... صول وکجل قبول......
صنادید عرب واساطین ادب ممتاز داشتہ۔"

"چوں آں حقایق پناہ را توجہ خاص باب یا ضے کہ
اشعار تازہ نقیر دارد، بہ توقیع ترویج. وترویج
بہ مجلس عالی (لازال مجمعا الافاضل والاہالی) مرسل
داشت۔ امید کہ بہ انظار قدسیہ منظور گردد
واز بضائر شموس نظایر، پروانہ نور یابد۔ والسلام
علیکم اولاً و آخراً۔"

اس کے بعد ایک ایسا خط درج ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علمائے
عصر سے، کسی نے اس کی مزاج پرسی کی ہے تو اس کا جواب ایک
پرلطف لطیفہ کے ذریعہ دیتا ہے، کہتا ہے کہ:۔

"سخن ہماں است کہ از یکے پرسیدند کہ
چونی ــــ ؟
گفت، چناں کہ می دارند
گفت ــــ چوں می دارند؟
گفت ــــ چوں می خواہند
زیادہ بریں چہ نویسد، واز حالات ایشاں چہ پرسد۔
الحمد للہ علیٰ کل حال، والسلام فی المبداء والمآل۔"

اس لطیفہ کے اختتام پر، مولوی شیخ جمال اللہ نامی ایک بزرگ
سے مراسلت کرتا ہے۔ جس میں عضد الدولہ (غالباً شاہ فتح اللہ
شیرازی) کی تاریخ وفات ۲ر شوال سہ شنبہ، آخر روز لکھتے
ہوئے بڑے ہی افسوس کا اظہار کیا ہے، لیکن سنہ ہی درج نہیں۔

اس خط کے بعد ملا ظہوری کے نام ایک محبت نامہ لکھا گیا
ہے، جو عجیب وغریب ہے، اس سے بہت سے نتائج ظاہر ہوتے
ہیں، اور صاحبان کمال کی قدر دانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ظہوری
کو خطاب کرتا ہے کہ میں تمھاری آتش فراق میں جل رہا
ہوں، لیکن تمھیں کچھ احساس بھی نہیں۔ انتہائی صداقت
اور خلوص سے کہتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت تمھیں بے حد یاد فرماتے
ہیں، اور آج کل عزیمت شاہانہ بھی پورے پورے طور پر
دکن فتح کرنے کی طرف مائل ہے، تم خط تو پہلے ہی سے بہت
کم لکھتے ہو، اور جب جواب دیتے ہو، تو بڑی دیر سے ملتا
ہے، تمھاری ان ہی باتوں پر تو دل خون ہوتا ہے۔ خط لکھنا
کس قدر آسان کام ہے، پھر تم کس لئے اس معاملہ میں بخل
سے کام لیتے ہو۔

فیضی کے اس خط کو پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اُس کو
اپنے فضل وکمال پر گھمنڈ اور غرور ہونے کے باوجود، اس نے
ظہوری سے اس طرح عاجزانہ مراسلت کس طرح روا رکھی۔
یا ظہوری کے دربار اکبری میں حاضر ہونے میں کوئی خاص سیاسی
مصلحتیں وابستہ تھیں، یا اس کے فضل وکمال کا اس وقت
اس قدر رعب بیٹھا ہوا تھا۔

ظہوری کے نام ۱۴ر محرم سنہ ۹۹۲ھ کا مکتوبہ ایک اور خط ہے۔

جس میں وہ اشعار لکھ بھیجے ہیں جو اس نے شہزادۂ سلیم (جہانگیر) کے عقد کے موقع پر کہے تھے، جس کے ہر مصرعے سے تاریخ نکلتی ہے۔

"زہے عقدِ دُرپاشِ سلطان سلیم" "کہ پرتو دہد سالِ امید را"
"زپروردنِ آفتابِ دولت" (۹۹۳ھ) "قرانی شدہ ماہ و ناہید را" (۹۹۳ھ)

وحید الدین میر شاہ میرزا نامی کوئی بزرگ ہیں، انھیں لکھتا ہے کہ اس سے پہلے میں نے ایک غیر منقوط رسالہ جو بادشاہ کے نام سے لکھا ہے، اُسے آپ کی خدمت میں بھی بھیجا تھا، شاید آپ کے مدرسہ میں اس پر درس ہوتا ہوگا

اس کے بعد کا خط ایک نامعلوم صاحب کے نام ہے جنھیں اپنی کتابیں تحفتہً بھیجی ہیں، لیکن ان کے نام نہیں لکھے۔

مشہور دبیر، منشی ملا عبداللطیف (برہان پوری) کو لکھتا ہے کہ اس عاجز کو آج کل طبی کتابوں کا بڑا شوق ہے، آپ کی ولایت میں جو اہلِ کمال کا منبع و ملجا ہے اگر طب کی نایاب کتابیں دستیاب ہوسکتی ہوں تو مجھ پر کرم فرماکے میرے لئے خرید لیا کیجیے۔ میں نے آنے جانے والوں سے سنا ہے کہ شہر احمد نگر میں معمولی اور بےکار کتابیں بھی بڑی قیمت میں فروخت ہوتی ہیں، وہاں سے بھی آپ اپنے مذاق اور انتخاب سے جس قیمت پر بھی ہو، کتابیں خرید کر بھیجیے۔ قیمت کے معاملات میں تکلف کی ضرورت نہیں۔

حسبِ ارشاد جو دیوان کہ حال ہی میں مرتب اور منقح ہوا ہے، عجلت اور ضرورت کی وجہ سے بغیر کسی مقابلہ کے روانہ کردیا جاتا ہے۔

ملک محمود کے بعد، کمال الدین حسین خطاط شیرازی کو لکھتا ہے کہ، مولانا عبدالقادر سے معلوم ہوا کہ آپ عمارات اور مزاروں کی مرمت کی خاطر آگرہ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں لاہور کی سیر کے بعد ضرور اُدھر تشریف لے جائیے۔ کیونکہ اُن عمارتوں پر آپ کی توجہ کی سخت ضرورت ہے یہ خط رجب ۹۹۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔

اس کے بعد کے خط میں شیخ جمیل الدین پور شیخ جلال ساکن کالپی کو مخاطب کرتا ہے، اور بڑی منت و سماجت کے ساتھ، ان سے تشریف آوری کی درخواست کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ میں نے حال ہی میں ۱۰ ربیع الثانی ۱۰۰۲ھ کو اپنی "بے نقط تفسیر" مکمل کرلی ہے، جو صاحبانِ فضل کو حیران کردے گی۔ اس کے خاتمہ پر (۹۹) فقروں میں جو عبارت لکھی ہے، وہ مقاصد کو حاصل ہونے کے سوا، تبارک و تعالیٰ کے اسماءِ حسنہ پر مشتمل ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ ہر فقرہ سے تفسیر کا سالِ اختتام بھی معلوم ہوتا ہے۔ حال ہی میں عراق سے میر حیدر معمائی ایک فاضل یہاں آیا ہے، اتفاق کی بات ہے، یا تائیدِ غیبی سمجھئے کہ اس نے بھی پورے سورۂ اخلاص سے تفسیر کا سالِ اتمام حاصل کیا ہے۔ بے شک یہ اتفاقات کچھ الہاماتِ غیبی ہی پر دلالت کرتے ہیں۔

اس کے بعد کا خط بھی موصوف ہی کے نام ہے۔ جس میں مندرج ہے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ آگرہ تشریف لاچکے ہیں، اور پھر بعد کو معلوم ہوا کہ نہیں وطنِ مالوف تشریف لے جاچکے ہیں۔ آج کل موسم اچھا ہے، اگر لاہور تشریف لے آئیے گا تو بہتر ہے۔

ربیع الثانی ۱۰۰۲ھ میں جو تفسیر مکمل ہوئی تھی، وہ اسی سال صاف بھی ہوگئی ہے، اعلیٰ حضرت نے خاص طور پر ایک خمسہ کہنے کی فرمائش کی ہے، اور "افسانۂ نل دمن" کو جو کہ ہندوستان کے مشہور عاشق و معشوق ہیں، پہلی مرتبہ مجھے نظم کرنے کے لئے

حکم صادر فرمایا ہے کہ "جو بحر کہ عمدہ ہوگی، نظم کی جائے گی۔ آگے چل کر کہتا ہے کہ :-

"چوں بحور اربعہ، خمسہ" تقسیم یافتہ، ایں را در زمین لیلیٰ مجنوں گفتن لایق دید، بموجب اشارۂ عالی کہ آں چہ گفتہ شود ماہ بماہ بعرضِ اقدس رسد۔ در عرضِ چہار ماہ، ہزار بیت گفتہ شد۔ معدودے ماندہ۔ در بیں دو سہ روز خاتمہ گفتہ می شود میبد کہ اپند دوستاں شد۔ دیگر سوانح آں را بموجب اشارتے کہ از غیب روئے نمود، نیاضی "تخلص کردہ می شود۔ بہر دو تخلص اگر نفسے چند باقی باشد، شعر گفتہ خواہد شد۔

اسامی کتب خمسہ ایں است :-

اول :- "مرکزِ ادوار" (کہ اکثرے در فسحتے بود) گفتہ شدہ بود

دوم :- "سلیمان و بلقیس" پیش ازیں ہفت سال، در لاہور بنیاد کردہ بود۔

چیزے جند ازاں گفتہ۔

سوم :- "نل دمن" کہ تمام شد۔

چہارم :- "ہفت کشور" کہ در احوال ہفت اقلیم گفتہ خواہد شد، آن در زمین ہفت پیکر خواہد بود۔

پنجم :- "اکبر نامہ" آں ہم جستہ جستہ وقتے گفتہ بود، چوں سخن پیش آمدہ، بتازگی گفتہ خواہد شد۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

"دیگر دریں شہر ہنگامۂ شعر بسیار گرم، طبایع را ابتلائے دیگر است، فقیر خود ترک صحبت ہا گرفتہ، خلوت گزیں است، بہر حال بباید کہ نزودی سہ ہزار مخطوط خواہند رفت دیگر چہ گوید والدعا۔"

مکرری نویسد کہ رتبہ قدم فرمایند و ہیچ سببے و خیلے نہ فرمائید گرامی راہ نہ دہند۔ العبد الاقل فیضی۔"

موصوف الصدر کے نام ایک اور خط لکھنے کے بعد، دوسرے میں حاجی شیخ عبدالحق کو بھی اپنی تفسیر کے بارے میں لکھتا ہے، اور ان سے بھی اس کو ملاحظہ فرمانے کی استدعا کی ہے۔ ان کے نام اور پانچ خط ہیں، جن میں کوئی بات قابل ذکر نہیں۔

اس کے بعد کے خط میں "مولانا" برادر نقبائے شیرازی سے مراسلت کی ہے۔ مولانا غوثی کے نام دو خط درج ہیں، پہلے میں لکھا ہے، میری تفسیر کے آغاز کی تاریخ سید محمد شامی نے (جو احمد نگر میں ایک بزرگ تھے)

لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین

سے استخراج کی تھی۔

دوسرا خط قلعہ تمورت سے ۱۰ ار رمضان کا لکھا ہوا ہے" سنہ درج نہیں، ایک نظم احمد آباد (گجرات) کی حسن شکایت میں لکھی ہے، کہتا ہے۔

منم کشتۂ گجراتیانِ بیدادم ‏ ‏ خراب کردۂ خوبانِ احمد آبادم

سہی قدے ز سر ناز جلوہ نہ نمود ‏ ‏ کہ ہم چو سرو بدنبالِ او بیفتادم

بہ ہر طرف کہ خرامید، سروِ آزادی ‏ ‏ غلامِ او شدم و خطِ بندگی دادم

چو رشکِ گلشنِ فردوس، احمد آباد است ‏ ‏ از و مباد، برونم کنند چوں آدم

بروں نرفتن از آں جا تصور محال ‏ ‏ چرا بروں نہ روم، من ہم آدمی زادم

بہ حسنِ مردمِ گجرات یاد میت و لے ‏ ‏ نمی روند جوانانِ دہلی از یادم

حدیثِ عشق تو فیضی کہ نقلِ مستاں ‏ ‏ بہ بزمِ جرعہ کشے دہلوی فرستادم

اسی ضمن میں لکھتا ہے کہ میں نے اس سفر کے حالات ایک مثنوی کی صورت میں لکھے ہیں، جب صاف ہو جائیں گے، تو ضرور ارسالِ خدمت کروں گا۔ نمونتہ ۲۱ شعر نقل کرنے پر اکتفا کی ہے۔

اس کے بعد لکھتا ہے کہ مولانا غزالی نے آدھی رات کے وقت احمد آباد میں، ساتویں رجب کو انتقال فرمایا، اور سرکھنج میں

مدفون ہوئے۔ میں نے بھی ان کی تاریخ وفات یہ لکھی ہے۔

چوں غزالی مشہدی بہ جہاں بود از شاعران نام فریب
سال تاریخ فوت آں، زاں بود می شود "شاعرے عوام فریب" ۹۹۰

شیخ حسن کالپی کے نام تین خط لکھے ہیں، پہلے میں
شیخ صاحب کو کہا ہے کہ آپ آتے ہوئے کتاب "مقاصد الشعرا"
لیتے آئیے، کیوں کہ تذکرہ (؟) کا اختتام اسی کتاب پر موقوف
ہے اور دوسری کتابیں بھی جو حاصل ہو سکتی ہوں، ساتھ لیتے آئیے۔

دوسرے خط میں کوئی اہمیت نہیں، البتہ تیسرے میں
لکھا ہے کہ "طبقات ناصری" کے لئے آپ نے جو خط لکھا ہے
وہ میرے پاس اجمیر بھیجا گیا تھا، چونکہ میں وہاں نہیں تھا، اس
لئے اب یہاں آیا ہے۔ خدا کی قسم مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ نے
کتاب مانگی ہے اور مشاغل کی کثرت کی وجہ سے یاد بھی نہ تھا
کہ یہ کتاب میرے پاس ہے، اپنی صاحب خانہ سے دریافت
کرنے پر معلوم ہوا کہ گزشتہ سال میرے بھائی شیخ ابوالفضل یہاں
آئے تھے، اور وہ اس کتاب کو لے گئے ہیں اُن کے اس
یاد دلانے پر مجھے بھی خیال آیا۔ خیر آپ کسی وقت میاں ابوالخیر
کو بھیج دیجئے کہ وہ آکر بھائی صاحب کی کتابوں سے اس کو تلاش
کرکے نکال لیں۔ بھائی کی کچھ کتابیں تو آگرہ میں پڑی ہیں اور
کچھ ان کی حویلی میں۔ اس لئے سب ایک جگہ نہیں، متفرق
ہیں، جب وہ گھر آئے تھے تو عجلت میں "طبقات" کو ان کے
حوالہ کردیا تھا، لیکن آج تک واپس نہ ملی جب آپ کی وجہ
سے اس کتاب کی ضرورت پڑی تو یہ یاد آئی، اس یاد سے
میں کچھ مضطرب سا ہو گیا ہوں، اگرچہ کتاب ضایع نہ ہوئی
ہوگی، مگر ضرورت کے وقت جب نہ ہو تو، اس کا نہ ہونا، فوت
ہوجانے کے مماثل ہے، انشاء اللہ فقیر بعد میں بھیج دے گا۔

اس کے بعد یہ ایک مشتبہ فقرہ لکھا ہے، اس سے
آپ جو چاہیں مطلب نکال لیجئے۔

مجموعۂ کہنہ راحق وملک خود دانستہ، وفرستادن آں
بسیار صعب نمودہ، ملازماں ازاں دست بشویند کہ اں
مقدار تصرف جائز است۔"

اس باب کے آخر پر دس خطا اور ہیں، جن میں کوئی ایسی خصوصیت
نہیں، جو معرض بیان میں لائی جائے۔

تیسرے باب، یعنی "لطیفہ سوم" میں حکما، معاصر وغیرہ
کے نام کل چھ خطوط ہیں۔ صفحہ (۲۰۷) پر ۳ر شوال سہ شنبہ کو جو
خط حکیم عین الملک کے نام ہے، اس میں لکھا ہے کہ نواب
وحید الزمانی علامۃ العلماء شاہ فتح اللہ نے کشمیر میں سفر آخرت
اختیار فرمایا۔ اعلیٰ حضرت اس طرف تقریباً ۲۰ کوس آچکے
تھے، یہ خبر سنی تو نہایت افسوس فرمایا۔

۱۹ر شوال پنجشنبہ کی رات میں حکیم ابوالفتح نے بھی
انتقال کیا تو حکم شاہی ہوا کہ ان کو مقام "حسن ابدال" میں
سپرد خاک کیا جائے۔ اس سانحہ سے اعلیٰ حضرت کو انتہائی
رنج ہوا، اور بے اختیار آنسو بھر آئے۔

"لطیفۂ چہارم" میں امرائے عظام، اور احبائے کرام کے
موسومہ خطوط ہیں۔ پہلا خط راجہ علی خاں مرزبان خاندیس کے
نام ہے، جس میں لکھا ہے کہ:

"بموجب استدعا می نماید کہ از کتاب تعلق نامہ کہ از
انفاس متقدسہ امیر خسرو است، چند ورق از اول
وچندے از آخر رفتہ التفات فرمودہ، دو جزو از اول
وہمیں قدر از آخر بہ یکے از خدمت گاراں امر فرمایند
کہ بہ خطے مسودہ بہ جہۃ بندہ مصحوب حاملان عریضہ
بفرستید۔"

اس کے بعد مرزا عبدالرحیم خان خاناں کے موسومہ تین خط نقل کئے

گئے ہیں، دوسرے خط میں لکھا ہے کہ یہ فقیر بادشاہ کے حکم کی بنا، پر فرمانِ شاہی کو لیکر ولایت دکن پہنچا، اور سید عبدالقادر عیدروسی سے ملاقات کا شرفِ حاصل کیا، جو بڑے زبردست اور باکمال بزرگ ہیں۔

اس باب کے چھٹے خط میں جو میر محمد معصوم بکری کے نام ہے، لکھا ہے کہ برادرِ علامی (ابوالفضل) سخت علیل تھے، اور زندگی سے مایوسی ہوچکی تھی، تو عین اس موقع پر حکیم مصری یہاں ایک عطیہ الٰہی کی طرح پہنچے، اکثر حکماء کے غلط معالجہ اور سہو کی وجہ سے ڈھائی مہینے تک سخت علالت رہی، پھر بھی مرض کی تشخیص نہ ہوسکی تھی، بالآخر حکیم مصری نے ایسا علاج کیا کہ مزاج صحت کی طرف مائل ہوگیا اور خدا نے فضل فرمایا۔

زیرِ نظر کتاب کا آخری باب "جو لطیفہ پنجم" سے موسوم ہے، اس میں اس کی انشاء پردازی کے نمونوں کے علاوہ، "والد بزرگوار، واخوانِ خلت آثار، واقارب و معارف" کے نام مشتمل ہیں۔

پہلا خط اپنے والد "مبارک" کو لکھا ہے، دوسرے میں ابوالفضل کو خطاب کرتا ہے کہ

"دو ایک دن میں نقلِ مکان ہوجائے گا، فقیر کی کتابوں میں، کتاب مصیبت نامہ شیخ عطار ہے، اسے مطالعہ فرمائیے۔ سیورہ نامی ایک شخص ہندوی زبان کی ایک کتاب لے آیا تھا، اس کو ہیبت خاں کے پاس بھیج دیا، تو انھوں نے خرید لی، اور کہتے تھے کہ بڑی اچھی کتاب ہے۔"

۲۱ ربیع الثانی دوشنبہ کو ایک اور خط ابوالفضل کے نام لکھا ہے، جس میں لکھا ہے کہ

"آپ نے کتاب ظہور الانوار کے جمع کرنے کے متعلق جو فرمایا ہے، وہ مبارک ارشاد ہے۔ فقیر نے فتح پور میں ایک رسالہ جمع کیا تھا، جس میں بارہ ابواب تھے لیکن افسوس کہ یہ حوادثِ روزگار سے تاراج ہوگیا، کیا لکھوں بڑا تعجب ہے کہ لاہور پہنچنے تک ایک مصرعہ بھی مجھ سے موزوں نہ ہوسکا۔"

دو خط اور ہیں، آخر کے خط میں بھائی کو لکھتا ہے کہ، اس نامہ کے حامل مولانا کمال کشمیری ہیں اور جو اخلاص کی وجہ سے آرہے ہیں، ان سے ملاقات فرمائیے۔

سب سے آخر پر شیخ افضل محمد بن شیخ یوسف قادری اکروی کے نام دو خط ہیں، بعد کے خط میں اپنی تفسیر کے متعلق لکھا ہے کہ

"تفسیر سواطع الالہام کے چار جزو، میاں سعید الدین کے ہمراہ بھیجتا ہوں، اس کو بعض عامی کاتبوں نے اصل مسودہ سے نقل کیا ہے جس کا پڑھنا مشکل ہے، اگر فرصت ہو تو بیاض سے مقابلہ کرلیجیے، اور بالفعل وسیلۂ یادگار رہنے دیجیے۔"

۳

اس "لطیفۂ فیاضی" کا ایک دوسرا جزو اس کے مرتب حکیم نورالدین عبداللہ عین الملک شیرازی کے منشآت پر مشتمل ہے، حکیم صاحب نے اپنے ماموں فیضی کے رقعات کے ساتھ آخر پر اپنے بھی مکتوبات شامل کردیئے ہیں یہ "منظومۂ سیوم" سے موسوم ہے۔ حمد و ثنا کے بعد لکھتا ہے:-

در عہدِ شاہ نورالدین جہانگیر — کہ یاد از عدلِ او عالم منور
فراہم آمدہ رقعاتِ نامی — سوادِ حرف ہا چوں مشک اذفر
ز ترتیبش بجستم سالِ تاریخ — بگفت "انشائے نورالدین احقر"

"انشائے نورالدین احقر" سے سنہ (۱۰۲۲) ہجری برآمد ہوتا ہے، اور خود "لطیفۂ فیاضی" سے جو اس پورے مجموعہ کا نام ہے، جیسا کہ ہم نے ابتدا میں لکھ دیا ہے ۱۰۳۵ھ نکلتے ہیں۔

ممکن ہے کہ نورالدین نے فیضی کے رقعات جمع کرنے سے قبل علیحدہ

طور پر اپنے خطوط اکھٹے کر لئے ہوں، اور اس وقت ہی اپنے مکاتیب کے لئے یہ تاریخ لکھی ہو، اور بعد میں اس مجموعہ میں انھیں بھی شریک کر دیا ہو۔

نورالدین نے اس باب کی تمہید کے بعد ایک جگہ اپنا نام اس خط میں جو ڈھاکہ (صوبہ بنگالہ) سے غرہ شعبان ۱۰۲۲ھ کو لکھا گیا تھا، یہ لکھا ہے۔

" نورالدین محمد عبداللہ حکیم عین الملک المسمی بہ شمس الدین علی شیرازی "

اس حصہ کے خطوط میں سنہ اور ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، اس لئے یہ غیر مرتب حالت میں نظر آتے ہیں۔

ایک عرضی جو اسلام جاہ شیخ علاء الدین اسلام خاں کے نام ہے، لکھا ہے کہ صوبہ دکن میں لاحاصل محنت کے بعد کہ وہاں کے لشکر کا نفاق، بغض اور ان کی خرابیاں تو آپ پر ظاہر ہیں، بڑے ہی مشکل سے چھٹکارا پاکر نکلا، اور آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے ارادے سے پٹنہ تک آیا تھا کہ یہاں نواب افضل خاں سے ملاقات ہوئی۔ تو انھوں نے روک لیا ہے، اس لئے آپ میری طلب میں ایک خط ان کے نام لکھئے۔ یہاں خانِ موصوف کے اعزہ نے بڑی کوشش اور جبر سے اس پریشانی کے عالم میں، میری شادی کرا دی ہے۔

ایک خط میں اپنے پدرِ بزرگوار کو یہ حالات لکھ بھیجے ہیں کہ ۹ ذیحجہ کو میر کا پسر خواجہ جہاں شاہی فرمان کے ساتھ جس میں تقصیرات کی معافی، اور دلجوئی درج ہے، یہاں وارد ہوا ہے۔ فرمان مبارک میں یہ بھی درج ہے کہ شیخ ابوالفضل کی جاگیر سنبل پور، چاند پور وغیرہ تمھیں سرفراز کئے گئے ہیں اور شامل خاصہ بطور تبرک روانہ ہے، فوراً حاضر آستانِ عالی ہونے کی عزت حاصل کرو۔ چنانچہ حکم اقدس کی بنا پر نکل رہا ہوں۔ آیندہ کیا حشر ہوگا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

۱۶ ربیع الاول غالباً ۱۰۲۸ھ کا ایک خط ہے، جس میں یہ لکھا ہے کہ اوائل صفر میں، میں آگرہ پہنچا، اور ۵ صفر چہارشنبہ کو دربار میں حاضر خدمتِ اقدس ہوا، لیکن دشمنوں کے کہنے سننے کی وجہ سے اس فدوی کی طرف توجہ نہیں ہوئی، دو دن تک تو سلام کا ہی حکم نہ ملا تیسرے دن طلب فرمایا، اور بڑی سختی سے گفتگو فرمائی، اور غنیمت ہے کہ سلامتی کے ساتھ واپس لوٹنا میسر ہوا۔

اس کے بعد کے خطوط میں کوئی اہمیت نہیں ہے، نہ ان لوگوں کے نام لکھ دیئے جاتے ہیں جن کے لئے یہ تحریر کئے گئے ہیں۔

حکیم حیدر علی ملازم و مصاحب نواب مہابت خاں۔ عموی حکیم عبدالحی۔ عموی حکیم طاہر۔ اکرم خاں پور اسلام خاں چشتی۔ شیخ عبدالصمد المخاطب کرم خاں پور معظم خاں کوکلتاش چشتی فتح پوری۔ افضل خاں۔ مرزا سیف اللہ پور قلیچ محمد خاں۔ مرزا اسداللہ۔ موسیٰ خاں چشتی المشہور مودود شیخ ابوتراب، مرزا لطف اللہ، حاجی علی بیگ۔

زیر نظر نسخہ کے چھوٹی تقطیع پر (۲۷۰) صفحات ہیں۔ کتب خانۂ آصفیہ میں ایک اور ناقص نسخہ " انشائے فیضی " کے نام سے نمبر (۸۰) فن انشائے فارسی پر موجود ہے۔ یہ بہت مختصر اور کم ہے، بہ ظاہر اس ناقص نسخے اور مکمل نسخے میں، جس سے یہ مضمون مرتب کیا گیا ہے، کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور معلوم ہوتا ہے۔

اس ناقص نسخہ میں ایک مقام پر یہ عبارت درج ہے۔

"تمت تمام شد این نسخہ کہ .... نسخہ است علی ید الضعیف اقل العباد الاحد الصمد نور الدین محمد ابن عبداللہ حکیم ولد حکمت پناہ حکیم عین الملک عفا عنہم تمت بالخیر والسعادت۔ رقم یافت ۱۴ محرم الحرام ۱۰۱۱ھ روز یکشنبہ من مقام احمد نگر"

اس ناقص نسخے کے (۹۴) صفحے ہیں، اور یہ بھی چھوٹی تقطیع پر لکھا گیا ہے۔

معین الدین رہبر فاروقی

حیات محمد قلی قطب شاہ

صحیح حالات و واقعات کو بہم پہنچانے کے لئے موصوف نے بڑی جانکاہی سے کام لیا ہے..... کتاب کے متعلق مزید لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ ڈاکٹر زور کا نام نامی اس کتاب کے ہر طرح مکمل ہونے کی ضمانت ہے۔ ہندوستان کا گوشہ گوشہ جہاں اردو پڑھی اور سمجھی جاتی ہے ڈاکٹر صاحب کی اردو کی بے لوث خدمات کا معترف ہے..... کتاب کئی حیثیتوں سے نہایت دلچسپ ہے۔ ایک شاعر بادشاہ کی خلوت و جلوت کی داستان، اردو ادب کے ابتدائی دور کی کہانی، سلطنت گولکنڈہ کی عظمت و شوکت کا فسانہ اردو ادب و تاریخ سے ذوق رکھنے والے حضرات کو میرے خیال میں اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

کاروان یکم فروری ۱۹۴۱ء

کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے عدیم النظیر حیثیت رکھتی ہے اور اندازِ بیان میں مورخانہ اسلوب کے ساتھ ساتھ افسانوی رنگینی جلوہ گر ہے۔ زور صاحب چونکہ ادبیات کے تاریخی پہلو پر مورخانہ نظر رکھتے ہیں اس لئے اس تاریخی تصنیف میں بھی ان کی ادیبانہ ہمہ دانی کا عنصر غالب ہے

عالمگیر فروری ۱۹۴۱ء

ڈاکٹر زور اردو کے ان مخلص اور سرگرم کارکنوں میں سے ہیں جنھوں نے اردو ادب کے دامن کو ادب و شعر اور تاریخ و سیاست سے مالا مال کر دیا ہے..... متعدد کتابوں کی چھان بین قلمی اور مطبوعہ تواریخ کا مطالعہ، حیدرآباد کی سیکڑوں عمارتوں، مقبروں، عاشور خانوں اور کتبوں کی تلاش۔ غرض اس تاریخ کو قلمبند کرنے کے لئے اور صحیح حالات بہم پہنچانے کے لئے موصوف نے بڑی جد و جہد کی ہے۔

شاعر آگرہ دسمبر ۱۹۴۰ء

نمودِ زندگی

یہ جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کی ایک سو ایک نظموں اور غزلوں اور رباعیوں کا دوسرا بیش بہا مجموعہ ہے۔ جناب موصوف حیدرآباد کے مشہور و معروف اور پختہ مشق شاعر ہیں اردو کا شاید ہی کوئی ایسا بلند پایہ رسالہ ہوگا جو آپ کے کلام کی اشاعت سے محروم رہا ہو..... علی منظور صاحب قدیم و جدید رنگ شاعری کی معتدلانہ روش پر نہایت استقلال کے ساتھ چل رہے ہیں اور آپ اس رنگ میں جو کچھ کہتے ہیں خوب کہتے ہیں۔ صوفیانہ جذبات کی سادگی اور مشق سخن کی پختگی آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں..... ہمیں امید ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو کا یہ مبارک تحفہ دنیائے ادب میں مقبولیت کا درجہ حاصل کریگا۔

سہیل گیا جنوری ۱۹۴۱ء

اردو کی نئی کتابیں

۱۔ پاکستان اور ہندوستان۔ (تحریک پاکستان کی تشریح) از عبدالقدوس ہاشمی ۴۲۶ صفحات قیمت مجلد عالی پتہ محبوبیہ کارخانہ جلدسازی حیدرآباد دکن۔

۲۔ واردات (مسلمانوں کی عہد گزشتہ و حاضرہ کی سرگزشت) از سرمست خاں آزاد قیمت ۲؍ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

۳۔ فلاحِ دین و دنیا (اسلامی انسائیکلوپیڈیا) ساتواں ایڈیشن ۶۰۰ صفحات قیمت للعہ خواجہ بکڈپو۔ دہلی۔

۴۔ رہبر اختیاری ریاضی (میٹرک کے گیارہ سال کے پرچوں کا حل) از شاہ حامد صدیقی ۱۵۶ صفحات قیمت عہ دکن بٹن فیاکٹری حسینی علم۔ حیدرآباد دکن۔

۵۔ حیاتِ اویس قرنی (عہد عالمگیر کی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ) از منظور حسن رضوی ۱۶۸ صفحات قیمت عہ مہتمم کتب خانہ مطبع رضوی دہلی۔

۶۔ شہید کربلا قرآن کی روشنی میں۔ از ابو مصلح ۲۷۲ صفحات قیمت ے ادارہ عالمگیر تحریک قرآن مجید۔ حیدرآباد۔

۷۔ راجپوت گوتین (راجپوت قوم کی تاریخ) از چودھری محمد افضل خاں ۳۲۰ صفحات قیمت عہ منیجر اخبار مسلم راجپوت لاہور۔

۸۔ خوفناک دنیا حصہ اول و دوم (افریقہ بورنیو وغیرہ کے جنگلوں کے حالات) ۴۹۲ صفحات قیمت عالی ۱۱؍ ڈاکٹر سبزواری۔ ڈنٹل کالج چوک آرہ۔ صوبہ بہار۔

۹۔ یارانِ میکدہ (مختلف لوگوں کے کردار مزاحیہ انداز میں) از عبدالشکور ۱۵۱ صفحات۔ مکتبۂ جامعہ دہلی۔

۱۰۔ ٹروٹسکی کا بیان (خود نوشت سوانح) مترجمہ ایم۔ ایم جوہر ۱۱۸ صفحات قیمت ۱۰؍ مکتبہ جامعہ دہلی۔

۱۱۔ یادِ اقبال (نظمیں) مرتبہ غلام سرور نگار ۱۲۰ صفحات عہ ۲؍ اقبال اکیڈیمی۔ لاہور۔

۱۲۔ پھلوں سے علاج۔ از حکیم محمد عبداللہ ۵۲ صفحات قیمت عہ منیجر العلاج۔ روڑی۔ ضلع حصار۔

۱۳۔ حلفیہ مجربات (مجرب نسخے حلف کے ساتھ) از حکیم محمد عبداللہ ۱۲۸ صفحات قیمت عہ منیجر العلاج روڑی ضلع حصار۔

۱۴۔ فولادتن اسٹالن (سوانح) از شانتی نرائن ۲۸۶ صفحات مرکنٹائیل پریس۔ لاہور۔

۱۵۔ ابنِ سعود (سوانح) از محمد عبداللہ ۱۳۱ صفحات تعلیمی پرنٹنگ پریس۔ لاہور۔

۱۶۔ حورِ ایران (تاریخی ناول) از محمد صادق حسین ۳۸۴ صفحات تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور

۱۷۔ تواریخ ٹاک کھشتریہ از جھنڈا سنگھ ۲۴۸ صفحات وزیر ہند پریس امرتسر۔

۱۸۔ تاریخ جموں از حشمت اللہ خاں ۹۴۴ صفحات محمد تیغ بہادر پریس۔ لکھنؤ۔

۱۹۔ جدید قانون قبضہ اراضی صوبہ متحدہ از نرائن پرشاد ۲۰۰ صفحات محمد تیغ بہادر پریس۔ لکھنؤ۔

۲۰۔ خوشنما زندگی کا راز (طبی نسخے) از بابا برج لال۔ ۲۲۶ صفحات مرکنٹائیل پریس۔ لاہور۔

مرزا سیف علیخاں

تنقید و تبصرہ

نازو اور دوسرے افسانے :۔ از اختر انصاری بی اے ناشر مکتبہ جہاں نما دہلی صفحات ۱۴۴ قیمت ایک روپیہ۔

اختر انصاری صاحب اچھے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ اور ان کے چھوٹے چھوٹے افسانے اکثر اردو رسائل میں چھپتے اور شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ یہ ان کے چودہ مختصر قصوں کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر جاں گداز داستانیں ہیں اور سماج کی تلخیوں کی بے تکلف تصویریں۔ اسلوب بھی دلچسپ ہے۔ توقع ہے کہ کتاب مقبول ہوگی۔

بیدر کا ظالم ہمایوں اور اس کی ملکہ :۔ از احمد اللہ خاں صاحب منصور ۸۰ صفحات قیمت چار آنے۔

کسی ملک کی تاریخ کا ذوق اس وقت تک عام نہیں ہو سکتا جب تک کہ ٹھوس تحقیقی کتابوں کے علاوہ ایسی چھوٹی چھوٹی دلچسپ کتابیں نہ لکھی جائیں جن میں تاریخی واقعات کو دلکش اسلوب میں نہ بیان کیا جائے۔ خاص کر دکن کی تاریخ سے متعلق ابھی بہت کچھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ منصور صاحب نے یہ چھوٹی سی کتاب بیدر کے ایک بہمنی بادشاہ کے متعلق سبق آموز پیرایے میں لکھی ہے۔ اور بچے اس کے مطالعے سے ضرور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

عربوں کی گزشتہ تجارت اور انگلستان کی صنعت و حرفت ۔۔ مرتبہ مولوی مجیب احمد صاحب تمنائی صفحات ۸۰ قیمت آٹھ آنے۔

یہ کتاب ایک عرصہ قبل اس وقت شایع ہوئی تھی جب کہ ہندوستانی مسلمان تجارت اور صنعت و حرفت کو حقیر نظروں سے دیکھا کرتے تھے اب اس کا دوسرا ایڈیشن مصنف کے دوست حاجی محمد خاں صاحب نے شایع کیا ہے۔ کیونکہ سفر حج کے اثنا میں جب انھوں نے حرم شریف کے اکثر و بیشتر باشندوں کی نکبت و افلاس کی حالت دیکھی تو ان پر بڑا اثر ہوا کیونکہ ایک زمانہ وہ تھا کہ عربوں کی تجارت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور ان کے شوق جستجو کے آگے بڑے سے بڑے سمندر بھی کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے۔ اسی کے اسباب و علل اور عروج و زوال کے حالات اس کتاب میں قلمبند کئے گئے ہیں اور اس کا دوسرا ایڈیشن اس لئے شایع کیا گیا ہے کہ اس کی آمدنی سے حرم شریف کے باشندوں کی امداد کی جائے۔

نمودِ زندگی :۔ مجموعہ کلام سید علی منظور۔ ناشر ادارۂ ادبیات اردو ۲۱۲ صفحات قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

یہ مولوی سید علی منظور صاحب حیدر آبادی کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے منظور صاحب پختہ مشق اور مشہور شاعروں میں سے ہیں ان کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز ان کی سادگی اور پرکاری میں پوشیدہ ہے۔ وہ عہد حاضر کے ان کامیاب شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے زندگی کی ترجمانی کو اپنا اہم مقصد قرار دے رکھا ہے۔ جدید رنگ کے انقلابی شاعروں کی طرح علی منظور جذبات کی رو میں بہنا نہیں چاہتے بلکہ جذبات کو اپنے قابو میں رکھ کر ایک پختہ گام سالک کی طرح آگے بڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری نوجوانوں کے کلام کی طرح مجذوب کی بڑ نہیں معلوم ہوتی۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں خود بھی سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی سمجھنے کا موقع دیتے ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کی سو سے زیادہ نظمیں اور چند غزلیں اور رباعیاں بھی شریک ہیں لیکن وہ اصل میں ایک نظم گو شاعر ہیں اور نظمیں ہی ان کے کمال سخن کی بہترین نمائندہ ہیں۔

باقیاتِ بجنوری :۔ مرتبہ محمد فاتح فرخ ناشر مکتبہ جامعہ دہلی

صفحات ۲۴۴ مجلد۔ قیمت دو روپیے آٹھ آنے۔

یہ کتاب اردو کے ایک جواں مرگ انشاء پرداز ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مضامین، مکاتیب اور منظومات کا مجموعہ ہے، جو ٹائپ کے حروف میں بہت ہی پاک صاف اور انگریزی کتابوں کی طرز پر چھاپا گیا ہے۔ ابتدا میں پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کا ایک مختصر سا تعارف بھی ہے۔ لیکن کتاب کی ترتیب میں بعض خامیاں رہ گئی ہیں جن کی وجہ سے ادب کے طالب علم کی تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ خطوط کن کے نام لکھے گئے تھے۔ اور مضامین میں کونسے ایسے ہیں جو شائع ہو چکے ہیں۔ اور کونسے غیر مطبوعہ ہیں۔ اسی طرح نظموں کی ترتیب بھی بجنوری کے شایان شان نہیں کی گئی ہے۔ ہر نظم نئے صفحہ سے شروع ہونی چاہیے تھی کیونکہ نظموں کے عنوان جلی قلم میں نہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی نظم ہے جس میں کئی ذیلی سرخیاں آگئی ہیں۔

ترتیب کی اس خامی کو اگر زندہ ہوتے تو عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم بھی پسند نہ کرتے اور اسی لئے یہ خامیاں شدت سے محسوس ہو رہی ہیں۔ ان کو چھوڑ کر پوری کتاب اس قابل ہے کہ اردو ادب کا ذوق رکھنے والے اس کو آنکھوں سے لگائیں۔ اسلوب بیان کے علاوہ بجنوری مرحوم کے خیالات بھی ایسے لطیف اور پاکیزہ تھے کہ ان کی نظیر بہت کم اردو انشاپردازوں میں مل سکتی ہے۔ محاسن کلام غالب کے مصنف کی تحریریں ایسی نہیں ہیں کہ عہد حاضر کی نثر نگاری میں ان کو اہمیت حاصل نہ ہو سکے۔ دیوان غالب کا نسخۂ حمیدیہ مرتب کر کے مرحوم نے اردو کے اہل ذوق ادیبوں اور خدمت گزاروں کی صف میں ایک اچھی جگہ حاصل کر لی ہے۔ ان کی تمام تحریروں میں فکر کی بلندی اور عقل کی پختگی نمایاں ہے۔ یہی حال ان کی نظموں کا بھی ہے اگرچہ وہ عظمت اللہ خاں مرحوم کی طرح مروجہ تکلفات شعر و سخن سے آزاد رہنا چاہتے تھے لیکن ان کے کلام میں وہ لوچ اور درد پیدا نہ ہو سکا جو عظمت مرحوم کا حصہ تھا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ بجنوری مرحوم دماغ سے زیادہ کام لیتے تھے۔ اور عظمت کے یہاں دل کی حکمرانی ہے۔ لیکن اگر وہ زندہ رہتے تو اقبال کی طرح اپنی فکر کی رسائیوں کی وجہ سے کیا تعجب کہ ایک پیغام گو شاعر ثابت ہوتے۔ زمانے نے ان کو موقع نہ دیا۔ بجنوری نے اپنے شعر و سخن کے رباب کو چھیڑا ہی تھا کہ ان کی انگلیاں ہمیشہ کے لئے ساکت و صامت ہو گئیں۔

افسوس ہے کہ محمد فاتح فتح صاحب نے جو بجنوری مرحوم کے فرزند ہیں خود کوئی دیباچہ یا مقدمہ نہیں لکھا۔ ضرورت تھی کہ ان کے حالات بھی شریک ہوتے اور ان اصحاب کا بھی اس موقع پر شکریہ ادا کیا جاتا جنھوں نے مرحوم کے خطوط اور نظموں کی فراہمی میں مرتب کا ہاتھ بٹایا۔ خاصکر آصف علی صاحب بیرسٹر دہلی اور مرزا حسین علی خاں صاحب پروفیسر حیدرآباد کا ذکر ضروری تھا جنھوں نے خطوں اور نظموں کا ایک قابلِ ذکر حصہ مرتب کو فراہم کر دیا۔

عقل و جنوں :۔ از حکیم برق موسوی بڑی سائز ۱۹۶ صفحات مجلد قیمت ایک روپیہ مطبوعہ شمس المطابع حیدرآباد۔

یہ حکیم میر کاظم علی صاحب برق موسوی کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جس میں پہلے نوجوان مصنف نے تعارف کے عنوان سے اپنے حالات سے روشناس کیا ہے۔ اس کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ برق صاحب حکیم میر ناصر علی صاحب رعد کے فرزند حکیم سید نوازش علی آلعہ مرحوم کے بھتیجے، میر کاظم علی

شعلہ کے پوتے اور میرالشعراء احمد علی خاں شہید دہلوی کے پڑپوتے ہیں۔ اس طرح سے شعر و سخن کا ذوق ان کو اپنے آبا و اجداد سے ورثہ میں ملا ہے۔ یہ سب بزرگ صاحبان دیوان اور متعدد کتابوں کے مصنف و مولف گزرے ہیں۔ اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس صاحب علم و فضل خاندان کا یہ ورثہ اب تک محفوظ چلا آرہا ہے۔ اور وہ مثل صحیح معنوں میں صادق آتی ہے کہ

دیے سے دیا یوں ہی جلتا رہا

برق صاحب کا جو کلام اس مجموعہ میں شامل ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو زبان اور خیالات پر قابو حاصل ہے اور وہ ایک روز اردو کے اچھے شاعروں کی صف میں آجائیں گے۔ بشرطیکہ یہی مشغلۂ شعر و سخن جاری رہے اور برق صاحب ابھی سے سستی شہرت کے طلبگار نہ ہوں۔ اس مجموعہ کی بعض نظمیں مثلاً۔ رکشا عابد روڈ، جسین بھکارن، نکمے کی دعا۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ برق صاحب اردو ادب کے جدید رجحانات سے بھی واقف ہیں، اور اگر وہ کوشش کریں تو ایک اچھے ترقی پسند شاعر ثابت ہوں گے۔

بستانِ تجلیات :۔ از میر غضنفر علی شاہ صاحب جناب حیدرآبادی رائل سائز ۷۶ صفحات قیمت دو روپے مطبوعہ عمدہ دکن پریس سلطان بازار حیدرآباد۔

یہ مولوی میر غضنفر علی شاہ صاحب قادری الجمالی کے کلام کا مجموعہ ہے جو مولوی بشیر الدین صاحب بشیر قریشی کے اہتمام سے شایع ہوا ہے۔ جناب صاحب ایک صوفی منش بزرگ ہیں اور ان کے کلام میں زیادہ تر ایسی ہی نظمیں پائی جاتی ہیں جو تصوف و عرفان سے تعلق رکھتی ہیں۔ نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے جو لوگ نعت و منقبت سے لطف اندوز

ہونا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب گنجِ شائیگاں ثابت ہوگی۔ کتابت و طباعت بھی نہایت پاک و صاف ہے۔

ابتدائی حیوانات حصۂ اول :۔ از ستیا نارائن سنگھ ایم ایس سی۔ عبدالرحمن خاں ایم ایس سی۔ سید مہدی علی ایم ایس سی چھوٹی سائز ۱۴۰ صفحات۔

یہ کتاب ابتدائی حیوانات کے موضوع پر لکھی گئی ہے اور اس کی ترتیب کے وقت مولفین نے جامعہ عثمانیہ کے انٹرمیڈیٹ کے معیار کو پیش نظر رکھا ہے تاکہ عوام کے علاوہ اس جماعت کے طالب علم بھی مساوی طور پر اس سے فائدہ اٹھا سکیں حیوانات سے متعلق اردو میں عام فہم کتابوں کی کمی ہے۔ اور نوجوان مصنفوں نے یہ کتاب مرتب کر کے اردو کی ایک اچھی خدمت انجام دی ہے۔ اس میں جگہ جگہ تصویریں اور نقشے شامل ہیں۔ اور پوری کتاب ترتیب، طباعت، اور کاغذ کے لحاظ سے ایک انگریزی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ اس کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن میں سے پہلے میں حیوانیات پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ دوسرے ابواب میں مختلف قسم کے حیوانات مثلاً ملیریائی طفیلی۔ زمینی کینچوا۔ جھینگر۔ مچھر اور گھریلو مکھی جیسے دلچسپ موضوعوں پر مفید معلومات پیش کی گئی ہیں۔ کتاب کا اسلوب اس قابل ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگ اس سے بخوبی استفادہ کر سکتے ہیں۔

ٹروٹسکی کا بیان :۔ مترجمہ ایم ایم جوہر صاحب ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی چھوٹی سائز ۱۰۸ صفحات قیمت دس آنے۔

جامعہ ملیہ کی طرف سے کچھ عرصہ سے علوم جدیدہ اور سیاسیات حاضرہ سے متعلق ایسی چھوٹی چھوٹی مفید کتابیں شایع ہو رہی ہیں جن کے مطالعہ سے قوموں میں مفید ذہنی انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس کا مطالعہ ان نوجوانوں کے لئے معلومات آفریں ثابت ہوگا

جو بیسویں صدی کے مشہور روسی انقلاب کو ٹھیک طور پر سمجھنا چاہتے ہیں۔ لینن کے معاونین اور شرکائے کار میں ٹروٹسکی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اور علمی اور اصولی لحاظ سے بھی لینن کے بعد اسی کو انقلاب روس کا سب سے بڑا آدمی اور انقلابی نظریوں کا سرگرم ترین علمبردار سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ زمانہ کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ لینن کا دست راست ہونے کے باوجود ٹروٹسکی کو اس کی جانشینی کا موقع حاصل نہ ہوا۔ اور اس کے رقیب اسٹالین کی خاموش کوششوں اور تدبیروں نے اتنی کامیابی حاصل کر لی کہ ٹروٹسکی کو تمام عمر جلاوطنی اور خانہ بدوشی میں گزارنی پڑی لیکن وہ نچلا بیٹھنے والا آدمی نہ تھا۔ اس نے ہر جگہ اور ہر حالت میں اپنا کام جاری رکھا اور اس کی یہی سرگرمی تھی جس کی وجہ سے اسٹالین کو ہر وقت خدشہ لگا رہتا تھا۔ اور اسی لئے اس نے اپنے قدیم رفیق اور سردار کے خلاف کئی بار مقدمہ دائر کیا اور ہر وقت قابل گردن زدنی ثابت کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ اس کو کامیابی ہو گئی اور ٹروٹسکی کو اپنی سرگرمیوں اور اصول پرستی کی سزا بھگتنی پڑی۔ زیر نظر کتاب میں ایک ایسے ہی مقدمہ کی کارروائی پیش کی گئی ہے۔ اور جواب کے طور پر ٹروٹسکی نے جو بیان دیا تھا اس کو محفوظ کر کے عوام کی اطلاع کے لئے شایع کیا گیا ہے۔ اصل کتاب انگریزی میں چھپی تھی۔ اور اب جامعہ ملیہ کی طرف سے اس کا ترجمہ شایع ہوا ہے۔

ٹروٹسکی نے اپنے بیان میں بہت سی ایسی باتیں پیش کی ہیں جن کے مطالعہ سے لینن کے انقلابی گروہ کی اندرونی سازشوں اور جماعت بندیوں کی نسبت مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ نیز اشتراکی رجحانات اور اصول کے سمجھنے میں بھی آسانی ہو جاتی ہے۔

رگبی کی زندگی :- ۲۴۰ صفحات مطبوعہ جامعہ ملیہ دہلی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ یہ دلچسپ اور مفید کتاب سلسلۂ یاد ایام مدرسہ کی ایک کڑی ہے۔ جس کو مولوی سجاد مرزا صاحب ام اے نے قائم کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے متعلمین اور معلمین دونوں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور ان دونوں کی تربیت و اصلاح کو پیش نظر رکھ کر ہی اس سلسلے کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے تعارف کے آخری حصہ میں مولوی سجاد مرزا صاحب نے یہ امید ظاہر کی ہے کہ۔

"سلسلۂ یاد ایام مدرسہ انگریزوں اور جرمنوں کے قومی مدارس کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کر کے نہ صرف اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کرے گا بلکہ ہماری تعلیمی تحریکوں کو ایک تعمیری صورت میں تبدیل کر دے گا۔"

یہ ایک بڑا اچھا خیال ہے اور اگر اس سلسلہ کی اور کتابیں چھپ جائیں تو یقین ہے کہ ہماری تعلیمی تحریکیں ایک تعمیری صورت حاصل کر سکیں گی۔

رگبی کی زندگی اصل میں ایک انگریزی کتاب ہے جس کا ترجمہ مولوی سجاد مرزا صاحب کی نگرانی میں مختلف اصحاب نے کیا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ حصہ بلبیر پرشاد صاحب ایم اے ڈپ ایڈ کا ہے جنھوں نے زبان کی سادگی اور صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا ہے یہ کتاب اس قابل ہے کہ نہ صرف اساتذہ اور طلبہ ہی اس کا مطالعہ کریں بلکہ طلبہ کے والدین کو بھی ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

بشریٰ :- از عنایت رسول صاحب عباسی چریا کوٹی۔ بڑی سائز ۲۴۴ صفحات مطبوعہ شروانی پرنٹنگ پریس علیگڑھ۔

یہ کتاب آنریبل ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان صاحب جج فیڈرل کورٹ دہلی کی فرمایش اور ڈاکٹر سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب کے مصارف سے محمد مقتدی خاں صاحب شروانی کے اہتمام میں شایع ہوئی ہے۔ ابتدا میں موخر الذکر صاحب نے ایک تعارف بھی لکھا ہے جس میں نفس کتاب کے بعض مذہبی معتقدات کا تخلیہ کیا ہے۔ اصل کتاب بھی بہت محنت اور تلاش و جستجو سے لکھی گئی تھی اور اس کے سینے میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے لیکن عبرانی حروف کے لئے بہتر ہوتا کہ اصل لوہے کا ٹائپ استعمال کیا جاتا۔ کیونکہ آج سے ایک عرصہ قبل سر سید احمد خاں نے تہذیب الاخلاق میں عبرانی حروف ٹائپ میں چھپوائے تھے۔ کتاب کا موضوع یہ ہے کہ آنحضرت پیغمبر اسلام کے متعلق توریت و انجیل اور دیگر صحف انبیاء میں کیا کیا بشارتیں درج ہیں۔

یہ کتاب ان لوگوں کے لئے قابل مطالعہ ہے جو مذہب اسلام کے آغاز اور پیغمبر اسلام کی فضیلت اور اہمیت سے متعلق تاریخی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

رسالے

ساقی دہلی کے مرتب اردو کے مشہور ادیب اور محسن مولوی نذیر احمد کے پوتے مولوی شاہد احمد صاحب بی اے آنرز دہلوی ہیں۔ جو خود بھی اردو کے ایک اچھے ادیب اور لکھنے والے سمجھے جاتے ہیں۔ اور گیارہ سال سے ایک دلچسپ اور معیاری رسالہ ساقی دہلی سے شایع کر رہے ہیں۔ اس کا سنہ ۱۹۴۱ء کا سالنامہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے جس میں زیادہ تر افسانے شامل ہیں۔ اس سالنامہ کی طرح ساقی کے عام پرچوں کی بھی خصوصیت یہی ہے کہ اس میں اعلیٰ پایہ کے افسانوں اور اردو ڈراموں کے علاوہ دوسری زبانوں کے شاہکار ڈراموں اور افسانوں کے مستند ترجمے بھی شایع کئے جاتے ہیں۔ نظموں کا حصہ بھی برا نہیں۔ خاص طور پر بہزاد لکھنوی، شاد عارفی، سید علی منظور اور تابش دہلوی کی نظمیں قابل ذکر ہیں۔ مضامین اور افسانوں میں امتیاز علی تاج، عنایت اللہ دہلوی، سید بادشاہ حسین، ماہر القادری اور کرشن چندر کے رشحات قلم بطور خاص لایق مطالعہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کے معیاری افسانے جتنے ساقی میں شایع ہوتے ہیں اردو کے کسی دوسرے رسالے میں نہیں ہوتے۔

ساقی کے عام پرچوں کی طرح اس سالنامے میں بھی ایک کمی یہ ہے کہ اس میں تصویریں شامل نہیں ہیں۔ اور اس کے بعض مضامین اتنے خفی قلم میں لکھوائے گئے ہیں کہ ان کو پڑھنا بار معلوم ہوتا ہے۔

ادب لطیف کے مدیر مسئول برکت علی صاحب بی اے اور مدیران اعزازی باری۔ احسان دانش اور راجندر سنگھ بیدی ہیں۔ اس کا سرورق بہت سادہ رکھا گیا ہے۔ اور ساقی کے سالنامے کی طرح رنگین اور دیدہ زیب نہیں ہے۔ لیکن اس میں دو تصویریں شامل ہیں اور پورے سالنامے کو مختلف عنوانوں مثلاً۔ افسانہ، شعرستان، بحث و نظر اور ڈرامہ کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ آخر میں انتظاریہ کے عنوان سے چند ایسے مضامین شامل کئے گئے ہیں جو دیر میں وصول ہوئے تھے۔ پورے سالنامے کی ترتیب بڑے سلیقے اور محنت سے کی گئی ہے۔ اکثر مضامین اردو کے مشہور ادیبوں سے لکھوائے گئے ہیں۔ جن میں عبدالمجید سالک، امتیاز علی تاج، عبدالقادر سروری۔ شاہد احمد، حکیم احمد شجاع وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح شاعروں میں علی اختر۔ احسان دانش۔ جوش ملیح آبادی۔ اختر شیرانی فصاحت جنگ جلیل۔ جگر مرادآبادی، سیماب اکبرآبادی شامل ہیں۔

رسالے کے آغاز اور اختتام پر اشتہارات کے صفحوں

صفحات شریک ہیں جن سے حجم میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔
بعض دواؤں کے اشتہارات اس قابل نہ تھے کہ شریک کئے جاتے۔

عالمگیر لاہور کا سالنامہ ۱۹۴۱ء کے خاص نمبر کے نام سے شایع کیا گیا ہے۔ اس میں جو علمی اور تحقیقی مضامین شریک ہیں وہ بہت اچھے ہیں۔ چند رنگین تصویریں بھی ہیں جو زیادہ تر عوام کے مذاق کو ملحوظ رکھ کر منتخب کی گئی ہیں۔ مضمون نگاروں میں شبلی بی کام، ماہر القادری، اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔ پروفیسر حامد حسن، میرزا ادیب، بادشاہ حسین۔ اور احسان علی شاہ اور شاعروں میں، جلیل، سیماب، امجد، احسن اور شاکر میرٹھی قابل ذکر ہیں۔ کتابت طباعت اور کاغذ اور ترتیب کے لحاظ سے یہ سالنامہ ساقی اور ادب لطیف سے بہت پیچھے ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد ۲۷۶ ہے لیکن درمیان میں دواؤں وغیرہ کے متعدد اشتہار بھی شریک ہیں۔ جن میں سے ایک دو ایسے بھی ہیں جن کو قطعاً شریک نہ کرنا چاہیے تھا۔

سہیل افسانہ نمبر۔ رسالۂ سہیل گیا کا خاص نمبر ہے۔ جو افسانوں کے لئے وقف کر دیا گیا ہے اور ماہ اکتوبر ۱۹۴۰ء میں شایع ہوا اس میں چند اصحاب کی تصویریں بھی شریک ہیں اور متعدد اچھے افسانوں کے علاوہ فن افسانہ سے متعلق معلوماتی اور تنقیدی مضامین بھی درج ہیں یہ ایک کامیاب کوشش ہے اور اس کے بعض افسانے اور نظمیں اردو ادب میں اضافہ سمجھے جا سکتے ہیں۔

ہمایوں لاہور۔ یہ ۱۹۴۱ء کا سالگرہ نمبر ہے جو صرف ۹۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سالنامے میں صرف میاں بشیر احمد ایڈیٹر کا مضمون اردو ۱۹۴۰ء میں اتنا اہم اور پر از معلومات ہے کہ بجائے خود ایک کتاب معلوم ہوتا ہے۔ اس مضمون کو اگر اور تفصیل کے ساتھ لکھا جاتا تو صرف یہی ایک موضوع ایسا تھا جو پورے سالنامے کے لئے کافی ہوتا۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہمایوں کے سالگرہ نمبر میں جو دوسرے مضامین نظم و نثر شامل ہیں وہ کوئی کم درجہ کے ہیں پورا پرچہ خاص توجہ اور سلیقہ کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ اگر دوسرے رسالوں کے مدیر صاحبان بھی اسی طرح ہر سال اپنے سالناموں میں گزشتہ سال کی اردو خدمات کا جائزہ پیش کرتے رہیں اور اپنے نقطۂ نظر سے دوران سال کی کاوشوں پر تبصرہ کریں تو اردو سے متعلق ہر سال تعمیری مواد جمع ہوتا رہے گا۔

بشیر احمد صاحب کی اس قابل تقلید پیش قدمی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

اطلاعیں

اُردو لائبریری نیا سنسار (کتاب گھر) بانکی پور پٹنہ کی طرف سے ایک زبردست ادبی اسکیم تیار کی گئی ہے۔ اِس قسم کی کوششوں کی اردو کو بڑی ضرورت ہے تاکہ ادب کا ذوق عام ہو اور کم دام میں اچھی کتابیں فراہم ہو سکیں۔ اِس اسکیم کی تفصیل یہ ہے :-

۱- اِس سیریز میں کم سے کم ایک کتاب ہر مہینے شایع ہو گی۔
۲- ہر کتاب کم سے کم (۹۶) صفحوں کی ہو گی۔
۳- ہر کتاب کی قیمت آٹھ آنے ہو گی۔
۴- کتابیں ادبی، تنقیدی، نفسیاتی، معاشرتی، معاشیاتی اور سیاسی موضوعات پر ہوں گی
۵- ہر کتاب مختصر، مکمل، مستند اور عام فہم ہو گی۔
۶- سر دست ذیل کے موضوعات پر کتابیں تیار ہیں :-

اردو افسانہ نگاری، اردو ادب، نئے زاویہ نگاہ سے، نفسیاتی خاکے، میکسم گورکی کی کہانیاں، سیاسی نظریے، ریبہ، ایک بنگالی ناول۔

مجلس احیاء خوش نویسی اس نام سے حیدرآباد میں ایک انجمن قائم ہوئی ہے جس کے صدر نواب اکبر یار جنگ بہادر معتمد میر لطیف علی صاحب اور ارکان نواب بہادر یار جنگ بہادر، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، سید احمد محی الدین صاحب ایڈیٹر رہبر اور خواجہ محمد احمد صاحب ہیں۔ اِس مجلس کی خواہش ہے کہ فن خوش نویسی کو از سر نو نمایاں کیا جائے چنانچہ فی الحال ایک کل ہند مقابلہ خوش نویسی مقرر کیا گیا ہے جس میں ماہرین فن سے بہترین نمونے طلب کر کے ان نمونوں کے لئے جو مقابلۃً سب سے بہتر ثابت ہوں انعامات دئے جائیں گے تاکہ اس فن کی جانب دوسروں کو رغبت پیدا ہو۔ اِس غرض کے لئے فی الحال چھ سو (۶۰۰) روپے کے انعامات منظور کئے گئے ہیں جو حسب ذیل نمونہ ہائے خطاطی کے لئے مقابلہ کنندگان کو دئے جائیں گے۔

(۱) خطِ نسخ پہلا انعام (۱۰۰) ایک سو روپے، دوسرا انعام (۵۰) پچاس روپے (۲) خطِ نستعلیق۔ پہلا انعام (۱۰۰) ایک سو روپے دوسرا انعام (۵۰) پچاس روپے۔ (۳) خطِ کوفی۔ پہلا انعام ایک سو روپے، دوسرا انعام، پچاس روپے۔ (۴) طغرا پہلا انعام " " " " " مزید معلومات معتمد حسینی محلہ مکان مرزا حیدر حسین بیگ صاحب حیدرآباد سے مل سکتی ہیں

مرکز انسداد بیکاری غالب صاحب حیدرآبادی نے گول بنگلہ حیدرآباد میں ایک مرکز قائم کیا ہے جہاں ہر قسم کے ملازم (تعلیم یافتہ وغیر تعلیم یافتہ فن داں وغیر فن داں) اندرون تین یوم فراہم کردئے جاتے ہیں۔ جو لوگ ملازمت چاہتے ہیں یا جن اصحاب کو ملازمین کی ضرورت ہے وہ اس پتے پر مراسلت کریں۔ یہ مرکز کامیاب ہو سکتا ہے اگر دونوں قسم کے ضرورتمند اصحاب اس کے ساتھ تعاون کریں۔

اِفتتاحیہ شاخ بلارم

۵ فروری کو صدر بازار بلارم میں اِدارہ کی شاخ کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر سروری صاحب نے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

سب سے پہلے، میں اِس مایوسی میں، آپ کے ساتھ شریک ہونے کا اظہار کرتا ہوں جو اِس وقت ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی ہر دلعزیز شخصیت کی بجائے ایک گم نام شخص کو اپنے سامنے دیکھ کر، آپ کے دلوں میں پیدا ہوئی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب ایک اور اہم علمی خدمت کے سلسلے میں، شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اِسی لئے اِدارۂ ادبیات اردو کی شاخ کے افتتاح سے متعلق خدمت مجھ کو انجام دینی پڑ رہی ہے۔

آپ میں سے اکثر حضرات واقف ہوں گے کہ ادارۂ ادبیات اُردو دس سال سے حیدرآباد میں، نہایت خاموشی کے ساتھ، اردو زبان اور ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اور اُس نے اب تک ستر کے قریب کتابیں مختلف علوم وفنون کی شایع کی ہیں جن میں سے بعض، اردو زبان کی نہایت اہم کتابوں میں شمار ہونے لگی ہیں۔ اس کے خدمت گذاروں کا حلقہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اور ریاست کے کئی اضلاع میں اس کی شاخیں قایم ہو چکی ہیں۔ اس کا کام کئی شعبوں پر تقسیم ہے، جن میں سے شعبۂ زبان، شعبۂ تاریخ دکن، شعبۂ شعرا و مصنفین دکن شعبۂ تنقید، شعبۂ اطفال، شعبۂ طلبہ، شعبۂ خواتین اور شعبۂ اردو امتحانات نے اب تک نمایاں کام انجام دئیے ہیں۔ اِن شعبوں کی مختلف مجلسوں میں آپ کو ملک بھر کے بہترین علمی خدمت گذاروں کے نام نظر آئیں گے جو مختلف علمی کام انجام دے رہے ہیں۔

ادارہ کا قیام اور اُس کی ترقی دراصل، ڈاکٹر زور کی اَن تھک محنت کا نتیجہ ہے۔ قیام یورپ سے واپسی کے بعد ڈاکٹر صاحب نے محسوس کیا کہ حیدرآباد میں مصنفین اور مولفین کے لئے ایک ایسے مرکز کی شدید ضرورت ہے، جو نہ صرف ان کی اچھی اچھی کتابوں کو شایع کرے، بلکہ بضرورت ان کے کام میں مشورے بھی دے سکے اور ان کے باہمی ربط اور تبادلۂ خیال کے لئے مرکز فراہم کرے۔ اُردو کے چند پُر خلوص خدمت گذار افراد ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور اپنے عطیوں سے، کام کے آغاز کا موقع فراہم کر دیا آج نہ صرف حیدرآباد میں ادارہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، بلکہ ہندوستان کے طول وعرض میں، اس کے کام کی شہرت ہے اور اس کی کتابیں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جا رہی ہیں۔

ادارہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ حضرت والاشان اعظم جاہ بہادر شہزادۂ برار و ولی عہد سلطنت آصفیہ، اس کے سرپرست اعلیٰ اور رائٹ آنربیل سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ اور راجہ شام راج بہادر وغیرہ اِس کے سرپرست اور نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام سیاسیات اس کے صدر ہیں۔

ادارہ کے ماہوار آرگن یعنے رسالہ "سب رس" کو آپ حضرات پڑھ چکے ہوں گے، یہ نہ صرف حیدرآباد کا بہترین رسالہ ہے، بلکہ ہندوستان بھر میں اردو کے بہترین اور مقبول رسالوں میں شمار ہو رہا ہے۔ اِس کے علاوہ، ایک رسالہ، بچوں کے لئے "بچوں کا سب رس" بھی جاری ہے۔

اِدارہ میں اردو زبان کی تمام مطبوعات فراہم کر کے ایک مرکزی کتب خانہ بھی قایم کیا گیا ہے۔ جو کتب خانہ آصفیہ، اور کتب خانہ عالی جناب نواب سالار جنگ بہادر کو چھوڑ کر، حیدرآباد میں اردو کا سب سے وسیع کتب خانہ ہے، جس میں ہر علم وفن کی مطبوعات اور مخطوطات کی اتنی تعداد موجود ہے کہ، حیدرآباد کا

تاریخ، تمدن، ادبی ارتقا اور اردو زبان کے عام مسائل پر تحقیق کرنے والوں کے لئے کافی گنجایش موجود ہے، چنانچہ حیدرآباد سے باہر کی جامعات سے علماء آتے اور اس کتب خانے سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ ابھی جامعہ بمبئی کے ریسرچ اسکالر مسٹر میستری یہاں آکر استفادہ کرگئے ہیں۔

ادارہ کی شاخیں اس وقت گلبرگہ، کلیانی، جالنہ، محبوب نگر، کشتگی وغیرہ میں قایم ہیں اور اردو کی نشر و اشاعت میں نہایت قابل قدر کام انجام دے رہی ہیں۔

ادارہ کے اردو امتحانات یعنے سند اردو دانی، اردو عالم اور اردو فاضل خوش نویسی اور خطاطی و کتابت، حیدرآباد کے لئے ایک نعمت ثابت ہوئے ہیں۔ ہم میں بہت سے ایسے اصحاب اور خواتین ہیں جو کسی مدرسہ یا کالج میں شریک ہو کر تعلیم حاصل نہیں کرسکتے اور اسی لئے، آئندہ ذہنی اور علمی ترقی کے موقعوں سے باز رہ گئے ہیں ان کے لئے ادارہ نے تین مدارج کے امتحانات مقرر کئے ہیں، ان امتحانات کو ریاست اور بیرون ریاست میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکے گا کہ پہلے ہی سال امتحانات میں تین سو سے زیادہ امیدوار شریک ہوئے بمبئی میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پونا میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور مدراس کے جامعہ دارالسلام عمرآباد میں ان امتحانات کی ترویج کی کوشش کی جارہی ہے۔

ادارہ کی شاخ قایم کرنے سے، دراصل زیادہ سے زیادہ علمی خدمت گذاروں کو ادارہ کی علمی برادری میں شریک کرنا مقصود ہے۔ اس کے قواعد و ضوابط آپ حضرات مطالعہ فرماچکے ہوں گے۔ ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ادارہ کے اغراض و مقاصد یعنے اردو مطالعہ خانے اور کتب خانے قایم کرنا، بالغوں کے لئے تعلیم کا انتظام کرنا اور اردو امتحانات کے لئے امیدوار کو تیار کرنا، مولفین اور مصنفین کی مشوروں اور دوسرے طریقوں سے امداد کرنا، اردو زبان کی خدمت اور صحیح ادبی اور علمی ذوق کو نشو و نما دینا۔

ـــ ان تمام اغراض کی تکمیل میں ادارے سے متعلق تمام اصحاب ہمیشہ آپ کی مدد اور تعاون کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ ایک فوری فائدہ آپ کو یہ حاصل ہے کہ ادارہ کی تمام مطبوعات آپ کے کتب خانے کے لئے نصف قیمت پر مل جائیں گی۔

میں اس ریاست گیر اور جو خدانے چاہا تو ہندستان گیر علمی برادری میں آپ کی شرکت کے لئے آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور اس گرد و نواح کے لئے آپ کی شاخ کو فال نیک سمجھتا ہوں مجھے توقع ہے کہ اس علمی مشعل سے جسے چند خاموش کارگذاروں نے شہر حیدرآباد میں روشن کیا ہے، آپ ایک برقی قمقمہ روشن کریں گے اور اس کی ضیا سے اطراف و اکناف کو منور کردیں گے۔

بلارم کی شاخ کے معتمد مولوی شیخ عبداللہ صاحب منتخب ہوئے ہیں اور سرگرمی کے ساتھ ادارہ کا کام انجام دے رہے ہیں۔

عبدالقادر سروری

کپل میں ادارہ کی شاخ

۱۳ فروری کو مولوی سرفراز علی صاحب بی اے۔ ڈپ ایڈ پرنسپل مدرسہ کپل کی توجہ سے ایک جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں ادارہ کی شاخ قایم کرنے کی تحریک منظور ہوئی اور حسب ذیل عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا:۔

معتمد مولوی محمد حسین صاحب۔ شریک معتمد مولوی محمد عبدالرزاق صاحب۔ منتظم مولوی امین الدین صاحب۔ قاضی کپل اور اراکین میر سعادت علی صاحب وکیل کپل سید امین الدین حسینی صاحب وکیل۔ سراج الحسن صاحب قادری تاجر عبدالرشید صاحب سید اسمعیل صاحب علوی، بشیر الدین صاحب۔ شرف الدین صاحب

سید نبی اللہ صاحب۔ عبدالسبحان صاحب۔ پنڈت بشنو پنت ۔

اِس شاخ نے اُردو عالم اور اُردو دانی کی جماعتیں کھول دی ہیں اور اِن جماعتوں میں تعلیم پانے والوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اِس وقت تک تیئیس ۲۳ اُردو عالم اور چالیس ۴۰ اُردو دانی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور توقع ہے کہ اِس سال کیل ہی میں ایک زنانہ مرکز امتحان بھی قایم کرنا پڑے گا ۔

دُوسری نئی شاخیں

عثمان آباد اور رخانہ پور میں بھی شاخیں قایم ہوئی ہیں جن کی تفصیل آئندہ شمارہ میں درج رہے گی ۔

پربھنی میں اُردو امتحانات کا جلسۂ تقسیم اسناد

۲۴ جنوری ۱۹۴۱ء کو ادارہ ادبیات اُردو شاخ پربھنی کے زیر اہتمام ایک جلسہ عام مولوی ولی حسن صاحب اول تعلقدار ضلع پربھنی کی صدارت میں مارکیٹ پولین ہال میں منعقد ہوا جس میں جملہ مقامی عہدہ دار مثلاً راجہ ڈھونڈے راج بہادر ناظم عدالت، شرف الدین احمد صاحب منصف، حبیب الرحمن صاحب زائد ناظم عدالت، شیو کمار لال صاحب مہتمم پولیس، ابرار حسین صاحب صدر مدرس، عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری، احمد عبدالحی صاحب مددگار مہتمم پربھنی اور دیگر اصحاب نے شرکت کی، احمد عبدالحی صاحب کی تحریک اور معتمد شاخ حمید اللہ خاں شیدا کی تائید سے صدر جلسہ نے کرسی صدارت کو زینت بخشی گل پوشی کے بعد معتمد شاخ پربھنی نے اسناد، تمغے اور تین عدد سر گذشت ادارہ جناب صدر کی خدمت میں پیش کئے جس کی ایک ایک کاپی راجہ ڈھونڈے راج بہادر اور سید عارف الدین حسن صاحب کو جناب صدر نے منجانب صدر ادارہ عطا کی اور کامیاب طلبہ اُردو عالم کو اسناد و تمغہ تقسیم کرنے کے بعد نہایت بصیرت افروز تقریر فرمائی، راجہ ڈھونڈے راج بہادر ناظم عدالت نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے نہایت دلچسپ تقریر کی اور کامیاب طلبہ سے کہا کہ کامیابی کی اسناد لینے کے بعد تمھارا کام ختم نہیں ہوا بلکہ اب علمی کام ختم ہوا اور عملی کام باقی ہے جس کا پورا کرنا تمھارا فرض ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم لوگ اپنے بعد کے آنے والوں کے لئے راہبر ثابت ہوں گے۔ اس کے بعد مولوی ابرار حسین صاحب نے بھی نہایت دلچسپ تقریر فرمائی جس میں موصوف نے طالب علم اور متعلم کے فرق کو نہایت وضاحت سے بیان فرمایا اور طلبہ کو نصیحت کی معتمد شاخ نے یہ تحریک پیش کی کہ ادارۂ ادبیات اُردو شاخ پربھنی کے نائب صدر مولوی جلال الدین صاحب اشک کا تبادلہ ہو جانے کی وجہ سے اس جگہ پر کسی کا انتخاب ابھی تک عمل میں نہیں آیا جس کے لئے مولوی ابرار حسین صاحب بہ اتفاق آرا نائب صدر منتخب ہوئے ۔ یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ موصوف نے نہایت سرگرمی سے حصہ لینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ادارۂ ادبیات اُردو شاخ پربھنی کے خاموش اور سرگرم رکن مولوی عبدالواحد صاحب یم یس سی مددگار مدرسہ فوقانیہ درس و تدریس میں، سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں اور وعدہ فرمایا ہے کہ معلومات سائنس اُردو فاضل کو بھی پڑھائیں گے جس کے لئے ہم موصوف کے ممنون ہیں ۔

مولوی ابرار حسین صاحب کی تقریر کے بعد حمید اللہ خاں شیدا معتمد نے روئداد ادارہ مرتبہ جناب علی اکبر صاحب صدر امتحانات شعبہ پڑھ کر سنائی جس سے حاضرین ادارے کی کارگذاریوں سے واقف ہوئے۔ آخر میں ادارے کی قابل فخر ہستی مولوی سید عارف الدین حسن صاحب نے صدر جلسہ کے توسط سے یہ اعلان فرمایا کہ سال ۱۳۵۰ف کے ہونے والے امتحان اُردو فاضل، اردو عالم اور اُردو دانی میں پربھنی سے اول آنے والے طالب علموں کو ایک ایک مڈل عطا کیا جائے گا جو "عطیہ عارف الدین حسن" ہوگا شکریہ کے بعد آخر میں مولوی میر احمد علی شاب منصرم تحصیل دار ہنگولی نے دعا فرمائی کہ خداوند کریم ہمارے بادشاہ ذی جاہ حضرت سلطان العلوم

کی عمر اقبال میں ترقی عطا کرے جن کی بدولت آج اردو ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ زینے طے کر رہی ہے ۔

پربھنی میں اُردو کی نمائش

عرس کے موقع پر پربھنی میں جو نمائش منعقد ہوئی تھی اس میں نہایت نمایاں جگہ پر ادارۂ ادبیات اُردو شاخ پربھنی کا اسٹال اعلیٰ پیمانے پر سجایا گیا تھا اس کے لئے آٹھ یوم کی مسلسل کوششوں سے چند چارٹ اور تصاویر وغیرہ بنائے گئے تھے ۔ پربلی سے اشرف الدین صاحب فیضیؔ بھی آگئے تھے اور انھوں نے کام میں بڑی مدد کی ۔ اُردو کے قدیم شعرا، جدید شعرا ۔ اُردو کے بہترین نثر نگار ۔ اُردو جرائد کے ایڈیٹروں کی تصویریں ۔ ادارہ ادبیاتِ اُردو کے تمام شعبوں کو تقسیم کیا جاکر تفصیل کار اور کارکنانِ ادارہ کی سرگرمی کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوشش کی گئی ۔ ہندستان کے نقشے میں اردو کے ابتدائی دَور اور مرکزوں کو بھی بتلایا گیا تھا ۔ دکن میں اردو کی ترقی کے سلسلے میں ادارے نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کی تفصیل وغیرہ کے چارٹ بنائے گئے تھے ۔ بہرحال اسٹال نہایت خوبصورت سجایا گیا تھا جس کو تقریباً پانچ ہزار لوگوں نے دیکھا اور نہایت اچھے تاثرات لے گئے ۔ ادارے کا لٹریچر بھی تقسیم کیا گیا ۔ عوام کو اردو امتحانات میں شرکت کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ۔ امید ہے کہ اس مرتبہ زیادہ سے زیادہ طلبہ شریک ہوں گے ۔ ہماری یہ کوشش بہت کامیاب رہی ۔ چنانچہ اسٹال کو دیکھ کر کمیٹی نمائش نے ایک نقرئی مڈل اور ایک سند عطا کی جس کو فریم کرکے ادارے کے مطالعہ گھر میں لگا دیا گیا ہے ۔ اس نمائش کے موقع پر اسٹال وغیرہ کی ترتیب میں مولوی عارف الدین حسن صاحب نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا اور مولوی محمد فاروق صاحب دوم تعلقدار نے بھی مدد کی جو لائق شکریہ ہیں ۔ دیگر اراکین میں خاص طور پر محمد سلیمن صاحب جلالیؔ، مرزا نظیر بیگ صاحب، ناصر بن حبیب اور اشرف الدین صاحب فیضیؔ نے خاص طور پر حصہ لیا ۔ اس خصوص میں ہم عبدالعلام صاحب کے شکرگذار ہیں کہ موصوف نے اپنی قیمتی تصاویر اور کتب خانہ وغیرہ عطا کئے ۔

ادارہ کے نئے رکن

حسب ذیل خواتین و حضرات نے ادارہ کی رکنیت قبول فرماکر اپنی اردو دوستی کا ثبوت دیا ہے جس کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے ۔

رکن دوامی ۔ محل مرزا مہدی خاں کوکب مرحوم

رکن الف ۔ بلقیس بانو صاحبہ، بشیر النسا بیگم صاحبہ، اعظم النسا بیگم صاحبہ، عزت بیگم صاحبہ، رابعہ بیگم صاحبہ، محمد اکرام الدین صاحب تحصیلدار، سید میر صاحب (دستور آباد) الحاج قاسم خاں صاحب (افانہ پور)

رکن ب ۔ جیلانی بیگم صاحبہ، وحید بانو صاحبہ ۔

رکن شعبۂ طلبہ ۔ اکرام حسین صاحب افانہ پور، محمد قطب الدین صاحب افانہ پور، عزیز احمد صاحب (افانہ پور) محمود علی صاحب (خیریت آباد) عبدالمجید قریشی صاحب (نظام شاہی) مظفر علی خاں صاحب (خیریت آباد) عارف علی خاں صاحب (خیریت آباد) خدا بخش صاحب عبدالرزاق صاحب، رشید احمد صاحب، محمد مزمل حسن صاحب مجید احمد صاحب فاروقی، حسن الدین علی صاحب، برہان الدین صاحب محمد معین الدین صاحب ۔

ادارہ کا معاینہ

یوں تو ایسا کوئی دن نہیں گذرتا جب کہ ادارہ کے معاینہ اور استفادہ کے لئے کوئی نہ کوئی صاحب تشریف نہ لاتے ہوں، لیکن گذشتہ دو تین ماہ میں ہز اکسلنسی سر اکبر حیدری، آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر اور آنریبل سید عبدالعزیز کے علاوہ مختلف علم دوست اصحاب مثلاً غلام احمد خاں صاحب، ہاشم علی خاں صاحب، سید محی الدین صاحب سید تقی الدین صاحب، احمد محی الدین صاحب انصاری اور انوار اللہ صاحب وغیرہ نے ادارہ کے کتب خانے اور کام کا دلچسپی سے معاینہ کیا ۔

ادارہ کے شعبے ادارے کے مختلف شعبے برابر سرگرم کار ہیں جن میں چند کی روئداد یں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

شعبۂ زبان اس اثنا میں اس شعبہ کے دو جلسے ہوئے جن میں سے صرف ایک کی روئداد یہاں درج ہے۔ یہ جلسہ ۱۲ دسمبر ۱۹۴۰ء کو منعقد ہوا

حاضرین:۔ مولوی قاضی عبد الغفار صاحب، ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی، ڈاکٹر جعفر حسن صاحب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور مولوی سید محمد صاحب، مولوی عبد القادر صاحب سروری پنڈت دتنشی دھر صاحب ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب

سابقہ جلسے کی روئداد پڑھی گئی اور اراکین نے اس کی توثیق فرمائی۔

(۱) حسب ذیل امور بغرض تصفیہ پیش ہوئے:۔

۱۔ دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی کی مراسلت اراکین کے روبرو پیش کی گئی۔ دار الترجمہ کی جانب سے ادارہ ادبیات اردو کو چند کتابیں بطور تحفہ اس شرط کے ساتھ ارسال کی گئیں کہ ان پر تنقید نہ کی جائے۔ اسی سلسلے میں بالاتفاق طے پایا کہ یہ شعبہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ وہ ارباب متعلقہ کو یہ بتادے کہ اس کے حق تنقید پر اس طرح کی پابندی کسی صورت میں گوارا نہیں کی جاسکتی اور یہ امر افسوسناک ہے کہ حکام متعلقہ نے ایسی شرط قایم کرنے کو مناسب خیال فرمایا۔ یہ شعبہ بہر حال ضروری سمجھتا ہے کہ دار الترجمہ کی جن کتابوں پر ضرورت ہو آزادانہ تنقید کرے۔

(۲) مدرسہ کورو کروکنگ کے نام کی تبدیلی کے سلسلے میں بالاتفاق طے پایا کہ جناب ناظم صاحب تعلیمات کی مراسلت کے حوالہ و نقل کے ساتھ محکمہ سرکار کو اس طرف توجہ دلائی جائے۔

(۳) دکھنی محاوروں کہاوتوں وغیرہ کے سلسلے میں محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ و محترمہ احمد النساء بیگم صاحبہ ثریا جبیں کی مرسلہ فہرستیں مولوی قاضی عبد الغفار صاحب کے سپرد کی گئیں تاکہ عام محاوروں سے دکھنی محاوروں کو علٰحدہ کرلیا جائے اور طے پایا کہ بعد ازاں یہ فہرست بغرض تشریح مولوی ضیاء الدین احمد صاحب انصاری کے پاس روانہ کی جائے۔

(۴) شعبہ کی جانب سے اس کا انتظام کیا گیا تھا کہ تحریک استحکام وقار زبان سرکاری بدفاتر سرکاری کے سلسلے میں رکن شعبہ مولوی سید محمد صاحب انجمن طیلسانیین کے مشترکہ وفد میں نمائندگی فرمائیں۔ اراکین نے اس انتظام کی توثیق فرمائی۔

(۵) حسب قرارداد نمبر ۲ اجلاس منعقدہ ۸ امرداد ۱۳۴۹ف صحافتی الفاظ اور اصطلاحوں کے اردو ترجموں میں یکسانیت پیدا کرنے اور ان کو معیاری بنانے کے لئے طے پایا کہ ایک مجلس مقرر کی جائے جو مندرجۂ ذیل اراکین پر مشتمل ہوگی:۔

(۱) مولوی قاضی عبد الغفار صاحب (۲) مولوی عبد القادر صاحب سروری (۳) ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب (۴) مولوی ضیاء الدین احمد صاحب انصاری (۵) پنڈت ونشی دھر صاحب

اس مجلس کے اجلاس ہر فصلی ماہ کے دوسرے اور چوتھے جمعہ کو شام کے ساڑھے چار بجے دفتر روزنامۂ پیام میں منعقد ہوا کریں گے۔

(۶) بالاتفاق حسب ذیل قراردادیں منظور کی گئیں اور طے پایا کہ مقامی اخبارات میں ان کی اشاعت کا انتظام کیا جائے:۔

(۱) اردو کی ہر جہتی ترقی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ

لسانیات کے مسلمہ اصول کے مطابق غیر زبانوں کے جو
الفاظ اردو میں داخل ہوگئے ہیں اور جن کا تلفظ بھی
اُردو زبان کی فطرت اور اُردو دانوں کی کثرت استعمال
سے بدل گیا ہے ان کو مروجہ طریقہ پر لکھا اور بولا جائے
نہ کہ اصل زبان کے تلفظ کے مطابق مثلاً ستمبر اور دسمبر
نہ کہ سپٹمبر اور ڈسمبر۔ ادارہ کا یہ شعبہ تمام انجمنوں اداروں
اخباروں اور دفتروں سے یہ اپیل کرتا ہے کہ اردو میں
غیر زبانوں کے مروجہ لفظوں کو نہ صرف اردو صرف و نحو کے
مطابق استعمال کریں بلکہ ان کا تلفظ بھی اردو طریقہ سے کریں

(۲) اردو کتابوں کی افادیت بڑھانے کے لئے بہت
ضروری ہے کہ ہر کتاب کے آخر میں مضمون واری اور
نام واری اشاریہ (انڈکس) شایع کیا جائے تاکہ
حوالوں کی تلاش اور مطلوبہ موضوع سے متعلقہ عبارت
معلوم کرنے میں سہولت ہو۔ یہ شعبہ تمام ناشروں سے
عام طور پر اور جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو، ہندوستانی
اکاڈیمی، دارالمصنفین اور جامعہ ملیہ کے ارباب سے
خاص طور پر اپیل کرتا ہے کہ آئندہ اپنی ہر کتاب کے
ساتھ اشاریہ (انڈکس) ضرور شایع کریں۔

شعبۂ نسواں

شعبۂ نسواں کا سولھواں اجلاس بمقام
جوبلی ہال بتاریخ ۱۹ جنوری ۱۹۴۱ء شام کے
ساڑھے پانچ بجے منعقد ہوا اور ذیل کی خواتین نے شرکت کی:-
(۱) رابعہ بیگم صاحبہ (۲) جہاں بانو بیگم صاحبہ (۳) بشیر النساء بیگم صاحبہ
(۴) معتمد شعبہ۔

یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اکثر خواتین نے باوجود اعلان اور
تاکید کے بھی پرچۂ دستخط پر اپنے نہ آسکنے کی اطلاع نہ دی۔ ہم
ان سے درخواست کرتے ہیں کہ اتنی تکلیف وہ ہماری خاطر گوارا
کریں تاکہ دوسروں کو زحمت انتظار نہ ہو۔ اگر انھیں فاصلہ پر
اعتراض ہے تو کوئی ایسی جگہ مقرر کی جائے جہاں انھیں آنے
میں سہولت ہو۔

اجلاس میں جن امور پر غور کیا گیا ان میں سب سے زیادہ
اہم مدرسۂ بالغات واقع اڈک میٹ کے قیام کا سوال تھا
تصدق فاطمہ بیگم کی غیر موجودگی میں اس کے بند کرنے کا سوال
ملتوی رکھا گیا اور یہ تجویز ہوئی کہ تاوقتیکہ دوسرا مدرسہ کسی محلہ
میں قایم نہ کر لیا جائے یہ مدرسہ بدستور قایم رہے۔
طالبات کی کمی اگر محسوس ہو تو دوبارہ اعلان کروایا جائے۔
مسز باقر علی خاں سے استدعا کی جائے کہ وہ وقتاً فوقتاً مدرسہ
کو اپنی بیش بہا رائے سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔
مسز حسن لطیف سے دریافت کیا جائے کہ آیا وہ
سوزن کاری سکھانے میں ہماری مدد کریں گی یا نہیں۔ اور
ان کی آمادگی پر طالبات کو ہفتہ میں ایک بار انہی کے گھر بھجوانے
کا انتظام کیا جائے۔

۲۔ شعبے نے سردست ایک لڑکیوں کا مدرسہ بھی
اڈک میٹ میں قائم کر رکھا ہے، جس کی نگرانی بھی رابعہ بیگم صاحبہ
کے ذمہ ہے۔ اس کے لئے قبل ازیں امداد کی درخواست
صدر مہتممہ کو دی گئی تھی۔

۳۔ اراکین کی رائے ہوئی کہ اضلاع پر شعبہ کی شاخوں
کا قیام زیادہ کارآمد ثابت ہوگا چنانچہ نرمل، ناندیڑ، محبوب نگر
ورنگل وغیرہ میں ان کے قیام کے متعلق تجویز عمل میں آئی۔
بشیر النساء بیگم صاحبہ نے بنگلور میں ایک شاخ قایم کرنے
کی اور جہاں بانو بیگم صاحبہ نے کلکتہ میں قایم کرنے کی رائے دی
اور اس کے متعلق کوشش کرنے کا ذمہ بھی لیا۔

۴۔ یہ طے پایا کہ بشیر النساء بیگم صاحبہ کا کلام شعبے کی

طرف سے شایع کرنے کا انتظام کیا جائے اور بشیر النساء بیگم صاحبہ سے استدعا کی گئی کہ وہ اپنا کلام چھپوانے کی ہمیں اجازت دیں۔

شعبۂ شعراء و مصنفین دکن

۱۱ر جنوری ۱۹۴۱ء کو اس شعبہ کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں مولوی سید محمد صاحب معتمد شعبہ کے علاوہ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی اور ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ نے شرکت کی۔ تاریخ ادب عربی مرتبۂ مولوی ابو الفضل صاحب ایم اے کی نسبت طے پایا کہ یہ کتاب مولف کو نظر ثانی کے لئے دی جائے، تاکہ وہ اس کو مختصر کریں اور مصر کی مطبوعہ تاریخ مولفہ کے طور پر بی۔ اے کے نصابی معیار کے مطابق مرتب کریں۔

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکشؔ کے مجموعۂ نظم "کھوئے ہوؤں کی جستجو" کی اشاعت کی اس شرط کے ساتھ سفارش کی گئی کہ شاعر اپنی ان تاریخی نظموں پر مختصر سے نوٹ تحریر کردیں تاکہ ان کی افادیت اور لطف اندوزی میں اضافہ ہو۔

مرقع نثر کی ترتیب سے متعلق تبادلۂ خیال کیا گیا اور طے پایا کہ اس کی تفصیل آئندہ مجلس میں پیش ہو۔

مولوی علی اختر صاحب کے مجموعۂ کلام "انوار" کو جلد از جلد شایع کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی۔

تاریخی آثار کا معائنہ

ادارہ کی طرف سے ہر چھٹی یا فرصت کے موقع پر ان مقامات کا سفر کیا جاتا ہے جو حیدرآباد کے اطراف و اکناف تاریخی یا ادبی اہمیت کی وجہ سے قابل معائنہ ہیں۔ چنانچہ اس عرصے میں بھی عہد قطب شاہیہ کے مشہور وزیر اعظم میر محمد مومن کی بنائی ہوئی مسجدوں، تالابوں اور بستیوں کا معائنہ کیا گیا۔ ماہ جنوری میں ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ، مولوی سید محمد صاحب مولوی میر عباس علی صاحب (نبیرۂ میر محمد مومن) اور مولوی صدیق علی صاحب نے دو بار سیداباد (موجودہ سیداباغ) کی بستی مسجد اور سرائے کا معائنہ کیا اور مسجد میں میر محمد مومن کا لگایا ہوا جو کتبہ موجود ہے اس کے چربے لئے گئے۔ ان کی تصویریں آئندہ کسی موقع پر سب رس میں شایع کی جائیں گی۔

سیداباد میں میر صاحب نے جو سرائے بنائی تھی وہ کسی زمانہ میں بڑی آباد ہوگی۔ کیونکہ یہ شاہی راستے پر واقع تھی۔ اب بھی اس کے کچھ بچے کھچے کمرے غریبوں کے مکان بن گئے ہیں اور اس طرح سے یہ سرائے آباد ہے۔

مسجد کے عقبی حصے کی طرف اس سرائے کی جملہ کمانیں اس وقت تک محفوظ ہیں۔ حالانکہ اس کو بن کر آج تین سو چھیالیس سال کا عرصہ ہوچکا ہے۔ اس میں جملہ چھپن کمرے بنائے گئے تھے۔ عقبی حصہ کو چھوڑ کر بقیہ تینوں پہلوؤں کے وسط میں دروازے تھے۔ اور ان دروازوں کے دونوں طرف سات سات کمانیں تعمیر کی گئی تھیں۔ سرائے کے عقبی حصہ میں پتھر کی بڑی بڑی سلیں چھت سے باہر نکال کر جو خوبصورت چھجا بنایا گیا تھا اس کے اہتمام اور مضبوطی کو دیکھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ سرائے کس عمدہ پیمانے پر بنائی گئی تھی۔

سیداباد کے معائنے کے بعد میر محمد مومن کے بنائے ہوئے ایک دوسرے گاؤں میر پیٹھ کا معائنہ کیا گیا۔ چنانچہ پہلی بار ۲ر فروری ۱۹۴۱ء کو مولوی سید محمد صاحب ایم اے اور ڈاکٹر زورؔ صاحب نے ظل اللہ گوڑہ (موجودہ جل اللہ گوڑہ) اور میر پیٹھ کا سفر کیا وہاں کے تالاب مسجد اور کتبہ وغیرہ کے دیکھنے کے بعد جب یہ یقین ہوگیا کہ یہ سب میر محمد مومن ہی کے بنائے ہوئے آثار ہیں تو ۵ر فروری کو ادارہ کی طرف سے تاریخی

معائنے کا انتظام کیا گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر زورؔ صاحب، پروفیسر مجید صدیقی صاحب، پروفیسر سید محمد صاحب، مولوی عبد الرحمن شریف صاحب، مولوی صدیق علی صاحب (ماہر حریہ) اور بھگوان داس صاحب (فوٹوگرافر) نے اس روز کئی گھنٹے میرپیٹھ میں گذارے۔ اور مسجد کی تصویریں اور کتبوں کے چربے لئے گئے۔ میرپیٹھ کے دونوں معائنوں کے وقت مولوی عبد الرشید صاحب بی اے نے (جو حسن اتفاق سے اسی باغ میں رہتے ہیں جو میر صاحب کا لگایا ہوا ہے) بڑی زحمت اٹھا کر اس جماعت کی معلومات میں اضافہ کا انتظام کیا اور ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ چنانچہ مسجد کو درختوں وغیرہ سے صاف کیا، دھلوایا، کتبوں میں سے چونا اور گرد و غبار نکلوایا اور اس جماعت کی پر تکلف ضیافت بھی کی جس کے لئے ادارہ کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

میرپیٹھ شہر حیدرآباد سے تقریباً سات میل کے فاصلہ پر جنوب مشرق کی سمت میں واقع ہے اور اس کا راستہ چمپا پیٹھ، کرمن گھٹ اور ظل اللہ گوڑہ پر سے گذرتا ہے لیکن چمپا پیٹھ کے بعد سے کچی سڑک ہے جس پر سے موٹر بہ زحمت کے ساتھ میرپیٹھ تک پہنچتی ہے۔

سرگذشت

ادارۂ ادبیات اُردو

مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہدؔ

ادارہ کی دس سالہ سرگذشت نہایت ہی محنت اور سلیقہ سے مرتب کر کے شایع کی گئی ہے اس میں ادارۂ ادبیات اردو کی ہمہ جہتی علمی و ادبی خدمات کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ ایک مستقل کتاب ہو گئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے نہ صرف ادارہ کی علمی و ادبی خدمات کا پتہ چلتا ہے بلکہ حیدرآباد کی علمی سرگرمیوں اور اردو نوازیوں کا ایک خاکہ پیش نظر ہو جاتا ہے

کتابت و طباعت بہت ہی نفیس اور پاکیزہ ہے

تعداد تصاویر (۲۵) خوشنما جلد اور گرد پوش بھی ہے

تعداد صفحات (۳۰۴)　　　　قیمت صرف ۱۲ر

ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹ نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳ رجسٹرڈ ایم ۳۹۵۰

(ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں)

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
من کی بتا ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگذشت عالب ...	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
دکن نمبر (۷۸ تصاویر)	۱۹۸	۲	۰	۰
ارمغان حذب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سرسید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سرسالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۹۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب ...	۵۶	۰	۲	۶
" دوسری کتاب ...	۵۶	۰	۴	۶
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۹	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰
رسائل طب ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں ...	۴۰	۰	۴	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈ سورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں ...	۸۹	۱	۰	۰
ٹگور اور ان کی شاعری	۱۲۸	۱	۴	۰
متاع سخن ...	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن ...	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن ...	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی ...	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم ...	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
مدارس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ ...	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن ...	۱۰۴	۱	۴	۰
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم ...	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۲	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہد
سکینہ بیگم
عبد الحفیظ صدیقی بی ایس سی

جلد ۴ بابت مئی ۱۹۴۱ء شمارہ ۵

قطعۂ تاریخ وفات حسرت آیات علیا حضرت مادرِ دکن نور اللہ مرقدہا

تو اے ذاتِ علیا کہ در تربتی | بہ عالم ہمان سایۂ رحمتی
کند عرض تاریخِ رحلت جلیل | دعا الحق الا ادخلی جنتی

سنہ ۱۳۶۰ھ

(دیگر)

طالبِ مولا کہ بودہ بر درِ مولا رسید | طائرِ روحش بہ اوجِ عالمِ بالا رسید
رفت آں قدسی شمائل گفت تاریخش جلیل | مادرِ ظلِ خدا در سایۂ زہرا رسید

سنہ ۱۹۴۱ء

فصاحت جنگ جلیل

تعزیتی قرار دادیں

ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبہ طلبہ کا ایک تعزیتی جلسہ بتاریخ ۱۶ خورداد ۱۳۵۰ف شام میں پانچ بجے ڈاکٹر زور صاحب معتمد اعزازی ادارہ و صدر شعبہ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں اراکین شعبہ طلبہ اور کارکنانِ ادارہ نے بھی شرکت کی حسب ذیل قرار داد تعزیت منظور کی گئی۔

"شعبہ طلبہ ادارۂ ادبیات اردو کا یہ جلسہ اعلیٰ حضرت جلالۃ الملک سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کی والدۂ ماجدہ حضرت بڑی بیگم صاحبہ مرحومہ و مغفورہ کے انتقال پر ملال پر اپنے انتہائی رنج و الم کا اظہار کرتا ہے۔ اور دست بدعا ہے کہ مرحومہ و مغفورہ کو خداوند تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور اعلیٰحضرت شاہ ذیجاہ اور خانوادۂ آصفی کو صبر جمیل عطا ہو۔" آمین

معین الدین احمد انصاری
(معتمد شعبہ)

ادارہ کے شعبۂ نسوان کا جلسہ جو ۲۰ اپریل ۱۹۴۱ء کو محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ کی صدارت میں منعقد ہوا اس میں حسب ذیل قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔

"ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسوان کی اراکین نسوانی دنیا کی ایک عظیم الشان اور بے نظیر ہستی یعنی حضرت بڑی بیگم صاحبہ قبلہ مرحومہ و مغفورہ کے سانحہ ارتحال پر اپنے دلی رنج و ملال کا اظہار کرتی ہیں۔ اور دست بدعا ہیں کہ خدا مرحومہ کو اعلیٰ علیین میں مقام ارفع اور شاہ ذیجاہ کو صبر جمیل اور ہم سب کو ان کی تقلید کی توفیق عطا فرمائے۔" آمین

سکینہ بیگم
معتمد شعبہ

سانحۂ عظیم

یہ نظم ۲۴ اپریل ۱۹۴۱ء کو انجمن خواتین اسلام کے جلسۂ تعزیت کے موقع پر سنائی گئی تھی۔

(سکینہ بیگم)

ملکِ دکن پہ چھائیں گھٹا ٹوپ بدلیاں
رنج و الم اداس فضاؤں سے ہے عیاں

چہرے اداس، خاک بسر اور چشم تر
اہلِ دکن ملول و پریشاں ہیں سر بسر

دفتر، دکانیں، مدرسے، بازار بند ہیں
مندا ہے کاروبار، سبھی فکرمند ہیں

اس سرزمیں پہ صبح سے جھاڑو نہیں ہوئی
کنگھی کو فکرِ زینتِ گیسو نہیں ہوئی

ماتم کدہ پرانی حویلی ہے رات سے
محشر بپا ہے "امِ دکن" کی وفات سے

بے چین و بے قرار و پریشان ہیں حضور!
فرطِ الم سے جسم معلّٰی ہے چور چور

دل ہل گئے، پرانی حویلی کا در کھلا
وابستگانِ ملک کا سیلاب امنڈ پڑا

کہرام مچ گیا کہ چلیں مادرِ دکن!
چمکے نصیب قبر کے، سوتی ہے انجمن

ہمراہی جلوس ہیں گو فاصلہ ہے دور
اللہ رے احترام! کہ پیدل چلے حضور

ہر سمت منہ کیے تھے یہی خاص و عام میں
کتنا وقار "ماں" کا ہے قلبِ نظام میں

منظر وہ ہائے "مسجدِ جودی" کے سامنے
سرکار آگے آئے سواری کو تھامنے

مقبول بارگاہ میں ماں کی دعا ہوئی!
فرزند ہی سے آخری خدمت ادا ہوئی!

اس دور میں کہ حفظِ مراتب کا کال ہے
ماں باپ کے حقوق کا کس کو خیال ہے

لیکن حضورِ والا نے جو حق ادا کیا
دنیا کو درسِ خدمتِ مادر سکھا دیا

فرزند! اور وہ بھی ریاست کے حکمراں
قلب و دماغ امورِ ریاست سے سرگراں

پھر بھی یہ ذوق و شوقِ اطاعت کا حال تھا
بیمار ماں کا ہر گھڑی، ہر دم خیال تھا

جس وقت سے کہ ماں کی طبیعت خراب تھی
کیا بے قرار، ذاتِ جلالت مآب تھی

آرام تھا نہ نیند۔ نہ کچھ بھوک پیاس تھی
رہتے اداس اداس، پہ صحت کی آس تھی

تبدیلئ مزاج پہ ہر لحظہ تھی نظر
تیمار داریوں میں رہے رات رات بھر

موجود جاں نثار اگرچہ ہزار تھے
لیکن دوا پلاتے تھے خود اپنے ہاتھ سے

رحمت خدا کی اُس شہ عالی مقام پر!
ماں نے دعائیں جس کے لئے کی ہوں عمر بھر!

اے خوش نصیب مادرِ شہ، مادرِ دکن!
کس کو نصیب ہے ترے مرنے کا بانکپن!

اے مہربان ماں! تری شفقت کی یاد پر
غمگین اور اداس عروس البلاد ہے

چاروں طرف سے تعزیتی تار آئے ہیں
دلداریٔ حضور کا پیغام لائے ہیں

ماتم کی مجلسیں ہیں کہیں بزمِ تعزیت
سلطاں کے ساتھ سوگ میں ہے ساری سلطنت

یہ موت وہ ہے جس پہ کہ ہے زندگی نثار
ہے کارنامہ تیرا ریاست کا شاہکار

دَم سے ترے وقارِ دکن کو ثبات ہے
بیٹے کے کارناموں میں ماں کی حیات ہے

دنیا کبھی نہ بھولے گی اُس نیک نام کو
ترکے میں جس نے چھوڑا ہے سابع نظام کو

بشیر النساء بیگم بشیر

مہاراجہ بہادر اور سر محمد اقبال کے غیر مطبوعہ خط

وارڈن ہو یسٹلڈ روڈ بمبئی۔

مئی ڈیر اقبال! شاد باش وشاد زی از فضلِ رب۔

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔ اس یاد فرمائی کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ مجھ جیسے ناچیز فقیر کو جس طرح آپ دل سے چاہتے ہیں، خدا کی مہربانی بھی آپ پر دونی رہے۔ بھئی اقبال۔ سچے دوست کی یہی تعریف ہے کہ ایک ناچیز اور ہیچ میرز دوست کے ساتھ دوستی نباہ دے۔ مجھے اب تک اس کا عقدہ نہ کھلا کہ آپ سے مجھے کیوں دلی خلوص ہے بجز اس کے کہ آپ ہی کا خلوص اس کا باعث یا عقدہ سمجھوں۔ مگر افسوس ہے کہ میں اپنے ایسے دوست کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔ نہ اس قابل ہوں۔ اس سفر میں زیر باری بہت ہوئی امید ایک حبہ کی نہیں۔ زر می طلبی سخن درین است۔ نہ اجمیر کے دربار میں حاضر ہو سکا نہ لاہور، نہ امرتسر میں اپنے احباب سے ملا، نہ ہردوار کے منظر کے درشن ہوئے۔ ہائے۔ اس قید بے زنجیر کا ستیاناس ہو انسان دنیوی اغراض کے لئے کس قدر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور آزاد ہو کر غلامی قبول کرتا ہے۔ یا اللہ جس قدر عمر باقی ہے اس کو تو ہی آزادی میں بسر کرا دے۔ اب میں باز آیا۔ ایسی امارت سے توبہ توبہ۔ بجز اس کے کہ دُنیا کی دلالی میں رو سیاہی کی ہی توقع ہر طرح ہو سکتی ہے۔ سرخروئی محال ہے۔ الاَمن پشاہ شاد میں اگر جاذبہ کی قوت ہوتی تو پھر کیا پوچھتے۔ مگر شاد تو ہر طرح ناکارہ ہے۔ کوئی بات بھی حاصل نہ کی۔ صرف فضل کا امیدوار ہے۔ اگر خلوص ہے تو خدا کی ذات سے امید ہے کہ اقبال سے حیدرآباد کا اقبال چمک جائے گا ہوائی جہاز کا منظر بے شک اچھا ہوا ہو گا۔ مگر یہ تو کہئے کہ سب کے حواس قایم تھے یا ہوائیں کے ساتھ ہوا ہو گئے۔ بہر حال آپ ہر طرح کے تماشے دیکھئے اور ہمیں ترسائیے۔ ایک غزل تازہ مرسل خدمت ہے۔ مالکِ یوم الدین کہاں ہیں ان کی خدمت میں کہہ دیجئے آیاکَ نعبدُ و آیاکَ نستعین۔

بڑے ہوشیار (نعبد) کے مطلب کو تو قبول کر لیتے ہیں مگر نستعین پر انجان ہوتے ہیں۔ اللہ ان کو شاد و بامراد رکھے۔

۸ مارچ کو انشاء اللہ تعالیٰ بندہ یہاں سے راہی حیدرآباد ہو گا۔ مہربان آپ کے بچوں کی تصویریں اور اپنی ایک تصویر ضرور بھیجئے۔ یوں تو میرے دل میں آپ کی تصویر ہے مگر اپنے احباب کو اگر دکھانا منظور ہو تو کس طرح دکھاؤں کہ یہ اقبال شاد نواز ہے۔ خدا حافظ

جوابِ علامہ سر اقبال

(لاہور، مارچ ۱۹۱۷ء)

سرکارِ والا تبار تسلیم مع التعظیم!

والا نامہ پرسوں مل گیا تھا جس میں سرکارِ دولت مدار کے حیدر آباد واپس جانے کی خبر تھی لہٰذا یہ عریضہ حیدر آباد ہی کے پتہ پر لکھتا ہوں کہ سرکار کل بمبئی سے رخصت ہو جائیں گے۔

فارسی غزلوں کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ آپ کا والا نامہ بار دوم میں ملا تھا۔ یہاں کے وکالت پیشہ احباب میں بعض ذوقِ سخن رکھتے ہیں۔ اہلِ پنجاب کے دلوں پر آپ کا نقش تو پہلے سے ہے۔ فارسی غزل "کیستم من" جب پڑھی گئی تو اربابِ ذوق سرمست ہو گئے۔ واقعی لاجواب غزل ہے۔ انہیں باتوں سے اقبال آپ کا گرویدہ ہے۔ امارت، عزت و آبرو، جاہ و حشم عام ہے مگر دل ایک ایسی چیز ہے کہ ہر امیر کے پہلو میں نہیں ہوتا۔ کیا خوب ہو اگر سرکارِ عالی کا فارسی دیوان مرتب ہو کر دیدہ افروزِ اہلِ بصیرت ہو۔

مجھے جو خلوص سرکار سے ہے اس کا راز معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں یہ راز مضمر ہے اس دل میں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بخشا ہے۔ سرکار کی قبائے امارت سے میرے دل کو مسرت ہے مگر میری نگاہ اس سے پرے جاتی ہے اور اس چیز پر جا ٹھہرتی ہے جو اس قبا میں پوشیدہ ہے۔ الحمد للہ کہ یہ خلوص کسی غرض کا پردہ دار نہیں اور نہ انشاء اللہ ہو گا۔ انسانی قلب کے لئے اس سے بڑھ کر زبوں بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا خلوص پرور دہ اغراض و مقاصد ہو جائے۔ انشاء اللہ العزیز اقبال کو آپ حاضر و غائب اپنا مخلص پائیں گے۔ اللہ نے اس کو نگاہ بلند اور دلِ غیور عطا کیا ہے جو خدمت کا طالب نہیں اور احباب کی خدمت کو ہمیشہ حاضر ہے۔ اللہ اکبر سے دو چار روز ہوئے ملاقات ہوئی تھی آپ کا تذکرہ بھی ہوا تھا۔ ایا کہ مستعین کا دور دورہ پھر ہو جائے گا مطمئن رہیے۔ آج کل لاہور میں سلطان کے سرائے میں ایک مجذوبہ نے بہت لوگوں کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ کسی روز ان کی خدمت میں بھی جانے کا قصد ہے۔ شاد کا پیغام بھی پہنچا دوں گا۔

قید سے گھبرانا کیا! اس کی شدت انشاء اللہ لطفِ آزادی کو دوبالا کر دے گی۔ عرصہ ہوا میں نے پھول سے خطاب کیا تھا۔

"اگر منظور ہے تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا۔ تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگل بھی ہے۔ انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے"

تصویر ابھی کوئی پاس نہیں، نئی بنوا کر سرکار کی خدمت میں حاضر کروں گا۔ لڑکا دہلی کالج میں پڑھتا ہے۔ ذہین و طباع ہے مگر کھیل کود کی طرف زیادہ راغب ہے۔ آج کل اس فکر میں ہوں کہ اس کو کہیں مرید کرا دوں یا اس کی شادی کر دوں کہ اس کے ناز میں نیاز پیدا ہو جائے۔

ناز تا ناز است کم خیزد نیاز۔ ناز ہا سازد بہم خیزد نیاز

اس کی تصویر بھی انشاء اللہ حاضر ہو گی۔ والسلام مخلص قدیم

محمد اقبال

مزدور

وہ جو پسینے میں شرابور دن رات محنت میں مصروف ہے،
مزدور کہلاتا ہے۔
اس کا نغمہ اس کا رونا۔ اس کی روزی ہے۔
وہ بادشاہت کا دشمن ہے۔
شہنشاہ کے خلاف آواز بلند کرنا اس کا کام ہے۔
پر وہ سکّہ جس پر بادشاہ کی تصویر کندہ ہے،
اسے حاصل کرنا اس کا مقصد ہے۔

چغتائی

ٹوٹا ہوا ریکٹ

پانی کا اک بلبلہ جیسے
حد سے زیادہ پھول گیا ہو!
میلا سا اک قمقمہ جیسے
کوئی فضا میں بھول گیا ہو!
جیسے اک ننھا غبارہ — اڑ اڑ کر نغمے گاتا ہے!
دن میں ایک بڑا سیارہ — دو جانب آتا جاتا ہے!
صاف زمیں پر جال ہے اس پر دل کی اک دنیا اڑتی ہے
یہ "تارا" کی "گیند" نہیں ہے، یہ میری آشا اڑتی ہے!
امرت رکھنے والی ناگن
جالی اور گل کاری کا پھن
حرکت کی آتی ہے آہٹ
وہ اٹھا اک "نازک ریکٹ"!!
گاہے اچھا ہاتھ لگا کر — اپنے اوپر اتراتی ہیں
گاہے ضربیں "خالی" پا کر — غصے میں شرما جاتی ہیں!
دوسری جانب کھیلنے والے پہلے خود موقع دیتے ہیں
کچھ لمحے کے بعد ہرا کر غصے کی لذت لیتے ہیں!
کالج کے رومانی لڑکے پاس ہی سے آتے جاتے ہیں
دیکھ کے "ٹینس لان" کی جانب سہگل کے گانے گاتے ہیں!
پوچھ رہی ہیں ساتھی سے وہ، بولو کیسا کھیل رہی ہوں؟
سوچ رہی ہیں اپنے جی میں سب سے اچھا کھیل رہی ہوں!
ہاں، یہ کیسی گیند کی تیزی
کیا اب کھیل ترقی پر ہے؟

یہ متواتر ضربیں کیسی

کیا مقصود اپنا جو ہر ہے؟

لیکن یہ کیا کھیلنے والے کیسے اچانک رک سے گئے ہیں؟
کچھ ہنس کر کچھ پوچھ رہے ہیں، کچھ تارا کو دیکھ رہے ہیں!؟
چپ ہیں وہ ماتھے پہ پسینہ ان کے جیسے چھوٹ گیا ہے
کھیلتے کھیلتے جانے کیسے ان کا ریکٹ ٹوٹ گیا ہے!
"ٹینس لان" کو جاؤں کیسے میں کب اس سوسائٹی کا ہوں
بس ان کا "ٹوٹا ہوا ریکٹ" "دور" یہاں سے دیکھ رہا ہوں!

سلام (مچھلی شہری)

غزل

حسن بھی چارہ ساز ہو نہ سکا	غم سے دل بے نیاز ہو نہ سکا
حسن سے ترکِ ناز ہو نہ سکا	اہتمامِ نیاز ہو نہ سکا
حسن ہو کر عیاں، عیاں نہ ہوا	عشق کا راز، راز ہو نہ سکا
فطرتِ عشق بندگی ہی تو ہے	حسن بندہ نواز ہو نہ سکا
کیا قیامت ہے ان جفاؤں پر	تجھ سے میں بے نیاز ہو نہ سکا
دہر ہے ناشناسِ لذتِ درد	غم ترا جاں نواز ہو نہ سکا

اک حقیقت ہے زندگی، یعنی!
میں رہینِ مجاز ہو نہ سکا

سلیمان اریب

ایک خط

جسے منزل سمجھ کر چل پڑے تھے وہ نہیں ملتی
اگر جائیں تو ہم اب کس طرف اے ہم سفر جائیں

روحنا —— نمستے!

مگر تم کہو گی ہم نہیں سمجھتے۔ اور حقیقت میں کوئی کیونکر سمجھے۔ "ن" خود اپنے اندر انکاری خصوصیت رکھتا ہے۔ خیر چھوڑو اس ہندی اردو کے قضیے کو ؏

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

تو تم کو انسان انسان میں تمیز کرنی آگئی ہے۔ اچھا یہ کب سے؟ مگر انسان کا پہچاننا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اپنے نفس پر قابو پانا۔ تم نے بھی کھیل سمجھا ہے شاید اس کو۔ بعض لوگوں کو کبھی تم نے کسی کا مذاق اڑاتے نہیں دیکھا؟ یعنی بہ الفاظ دیگر محفل میں چار لوگوں کو دیکھ کر کسی "ایک" کو بنانے کی کوشش کرنا۔ کسی کی بیماری کا تمسخر کرنا۔ کسی کے درد و کرب کو سن کر اپنی تنگ نظری و بے حسی کا ثبوت دینا۔ اس طرح کہ سننے والے کے دل کو ٹھیس لگے۔ مگر روحنا۔ ایسے لوگ آنکھوں میں سے گر جاتے ہیں۔ ان کی سوسائٹی میں کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔ سماج ایسی ذہنیت والوں کو حقارت سے دیکھتی ہے۔ انسان کو انسان سے ہمدردی کے صرف دو بول کی امید ہی تو رہتی ہے۔ ایسے لوگ اپنی ہر دلعزیزی کے موقع کو بھی کھو دیتے ہیں، جو سب سے بڑی طاقت ہے۔ دوستوں کے دلوں کا پھٹ جانا معمولی بات نہیں ہے۔ مگر ایسے کو دوست کون سمجھتا ہے۔ فرض کرو تمہارے سر میں درد ہے اور میں کہوں "افوہ! آپ کے سر میں درد بھی ہوتا ہے؟ یہ تو کوئی ایسی بڑی چیز نہیں، ہمیں بخار آتا ہے۔ دونوں رہتا ہے۔ ویسا ویسا ٹمپریچر۔ جو طبی نقطۂ نظر سے ۱۰۴° بخار سے زیادہ خطرناک ہے۔ اور میں تمہاری حرارت کو سن کر تمہارا اس طرح مذاق اڑاؤں "سنا ہے آپ کو بخار ہے اور ٹمپریچر کچھ ایسا زیادہ بھی نہیں۔ ارے ہم تو ۱۰۲° بخار میں سینما دیکھتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں۔ یہ تو کوئی ایسی بات نہیں"۔ میری ان سفاکانہ سفلی باتوں کو سن کر تم اخلاقاً مسکرادو گی کیونکہ بعض مواقع زندگی میں ایسے بھی آتے ہیں کہ کوئی چیخ چیخ کر رونا چاہتا ہو اور اس کو مجبوراً مسکرانا پڑتا ہے مگر تمہارے دل سے پوچھو اس وقت کیا کہتا ہے اور اس کے پاس میری کیا عزت یا وقعت باقی رہی ہے۔ دکھ بیماری کوئی اپنے بس کی بات تو ہے نہیں۔ یہ ہمارے اور نیچر کے ساز باز ہیں ہم نیچر کے خلاف چلتے ہیں۔ اس کے اصول کی پابندی نہیں کرتے۔ نیچر ہمارا انتقام لیتی ہے۔ تو اس میں کسی میرے کا بے معنی، بے ہنگام و بے موقع دخل کتنی تضیع اوقات کا باعث ہے۔ اصولاً میری ایسی باتوں سے تمہارا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ برسوں کی دوستی پر پانی پھر جاتا ہے۔ ان سب کے ہوتے ہوئے بھی تم مجھے انسان سمجھو تو پھر مجھے تمہیں انسان سمجھنے میں مجبوراً پس و پیش ہوگا۔

بعض وقت کسی ایک "خاص شخص" سے سوسائٹی کے ایک گروہ کو کچھ حسد یا جلاپا سا ہو جاتا ہے۔ بس اس کے پیچھے تو یہ جاہل اور ناسمجھ ٹکڑی ہاتھ دھو کے پڑ جاتی ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ جتنی جتنی سمجھ اتنی اتنی ان بچاروں کی باتیں۔ لیکن تم ان پست فطرت ہستیوں کی فطری و جبلی کمزوری کو کیسے بدل سکتی ہو۔ ؎

وحشت دیہ جنون نہ یہ اختلاج ہے — یہ درد وہ ہے درد ہی جس کا علاج ہے

غرض انسان، نام ہی کا بس انسان ہے روحنا، وہ
اس کے اوصاف و کردار میں تو انسانیت کا کوئی جوہر نہیں۔
منطق کے پرچہ میں ایک سوال آیا تھا "ایک احمق، انسان
نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ انسان ایک ذی عقل ہستی ہے"۔
اسی طرح نفسیات کے اس سوال نے تو واقعی میرے
ہوش گم کر دیے تھے "ہم ہر چیز کو دو آنکھوں سے
دیکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ چیز ایک ہی دکھائی دیتی
ہے"۔ میں نے تو یوں تیوں اس کا جواب دے کر
ممتحن کو تشفی دے دی تھی، لیکن تم بتا سکتی ہو کہ
یہ کیونکر ہوتا ہے؟

اسی طرح ایک اور سوال تھا "انسانی فرد
بجائے خود ایک جماعت ہے۔ تم بہ حیثیت ماہر نفسیات
اس معمہ کو کس طرح حل کرو گے؟" تم کہو گی اسی چیز کو
تو غالب نے بہت دنوں پہلے بتا دیا تھا ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

خیالات ملتے جلتے ہیں، لیکن ڈگر علیحدہ، ایک کا راستہ
شاعری ہے دوسرے کا نفسیات لیکن بات تو پتہ
کی ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ماہر نفسیات
ہی بت کر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ نفسیات ایک
ضروری علم ہے خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو انسان
کو پہچاننا چاہتے ہیں —— اور جب تک تمہارا اپنا
ظاہر و باطن یکساں نہ ہوگا۔ تمہیں دوسرے میں نیک
و بد کی تمیز مشکل ہو جائے گی۔ ہیرے کو ہیرا کاٹتا ہے۔
ایک ایسے شخص کا دل جو دوسرے کے دل کو دکھاتا ہے،
میرے نزدیک اس پتھر سے بدتر ہے جو تمام دن تمہارے
صحن میں پڑا ہوا تمازت آفتاب سے جلتا رہتا ہے، وہ
جلتا ہے۔ جلاتا نہیں۔ تم کبھی کبھی بچوں کی سی باتیں مت
کرو روحنا۔ حالانکہ جماعت میں جب کبھی معلمہ پوچھتیں کہ
"سمجھ لیا نا آپ نے؟" اور تم اپنی سوا گز کی گردن زور زور
سے ہلا دیتیں مطلب یہ کہ ہاں میں سمجھ گئی۔ لیکن مجھے معلوم
تھا تمہارے خیالات کہیں دور دور بھٹکتے رہتے اور صرف
ان کو خوش کرنے تم سفید جھوٹ کہتیں اور اپنی گردن
ہلا دیتیں۔ تم کہتی ہو "ظرافت اور مزاح میں ایسا کیا فرق
ہے؟" زمین آسمان کا فرق ہے۔ ظرافت کا سلسلہ خوش
خلقی اور تواضع سے ملتا ہے۔ ظریف خوش مزاج ہوتا ہے
دل شکن نہیں ہوتا۔ وہ ہنساتا ہے۔ رلاتا نہیں۔ اس کے
برعکس مزاح کا تعلق ٹھٹول، بے جا ہنسی، بھونڈے
اور دل گداز مذاق سے ہے۔ جو صرف آزاد منش بے حس
لوگ ہی گوارا کر سکتے ہیں۔ جن کے دلوں کی حس قریب
قریب مردہ ہے۔ حساس طبیعتوں کے لئے ایسی صحبتیں
وبالِ جان ہو جاتی ہیں۔

ہاں مرجانا مشکل ہے، لیکن زندہ رہنا بھی تو
کوئی آسان کام نہیں۔ فرض مجبوری کا دوسرا نام ہے۔
تم اس کو نہیں جانتیں۔

اسی لئے کہتی ہوں کہ تم مجھے خط تو لکھو لیکن
اس کے جواب کی توقع مت رکھو۔ میں اظہارِ بیان میں
بہت بھڑک جاتی ہوں۔ دریا کا بند جب ٹوٹ جاتا ہے تو
سیلاب مشکل سے رکتا ہے، اور یہ اسی وقت رکتا ہے،
جب کہ طوفان و تلاطم میں کمی ہو جاتی ہے۔ دکھتی ہوئی رگ
کو مت چھیڑو اب ختم کر دوں گی —— فقط

جہاں بانو بیگم

مہذب چور

(ایک مختصر نثری ڈراما)

کردار

(۱) شیر دل ۔ ایک سائنس داں مہذب چور۔
(۲) ناصر ۔ شیر دل کا ساتھی۔
(۳) ڈاکٹر توفیق مرزا۔ جو جسم انسانی پر ریڈیم کی شعاعوں کے اثر کی تحقیق کرنی چاہتے ہیں۔
(۴) صدر جلسہ اور سامعین۔

مناظر

منظر اول۔ شیر دل اور ناصر کی گفتگو۔
منظر دوم۔ ڈاکٹر توفیق مرزا کی تقریر۔
منظر سوم۔ شیر دل اور ناصر کی دوبارہ گفتگو۔
منظر چہارم۔ ڈاکٹر کا چور کو پکڑنا۔ دونوں کی بحث۔
منظر پنجم۔ چور پر ڈاکٹر صاحب کا تجربہ ٹیلیفون کے ذریعہ گفتگو۔
منظر ششم ڈاکٹر صاحب خود تجربہ خانے میں۔ ٹیلیفون پر مکالمہ۔

پہلا منظر

ناصر۔ آج کل تو بہت سوکھی گزر رہی ہے۔ بہت دنوں سے کوئی شکار ہاتھ نہیں لگا۔ بھئی شیر دل! اب تو تمھاری باری ہے۔

شیر دل۔ ہاں ٹھیک ہے اب میری ہی باری ہے۔ مجھے خود اس کی فکر ہے۔ ممکن ہے قریب میں ایک صورت نکل آئے۔

ناصر۔ آخر میں بھی تو معلوم کروں تم نے کیا منصوبہ باندھا ہے؟

شیر دل۔ تم نے آج کا اخبار تو دیکھا ہی ہوگا۔

ناصر۔ مگر اس میں تو کوئی ایسی بات نہ تھی۔

شیر دل۔ کیوں کیا ڈاکٹر توفیق مرزا کے متعلق کوئی خبر نہیں پڑھی۔

ناصر۔ بس یہی کہ آج شام کو ٹاؤن ہال میں ان کی تقریر ہے۔ شاید کچھ ریڈیم منگوایا ہے۔ کچھ تحقیق کرنی چاہتے ہیں۔

شیر دل۔ ہاں۔ ریڈیم کوئی بیس ہزار روپیوں کا ہے، اور یہ میرے لئے کافی ہے۔

ناصر۔ مگر وہ تم کو ملے گا کیسے؟ اور پھر ریڈیم جیسی تیز شعاعوں والی چیز کا اٹھا لانا بھی تو ممکن نہیں۔

شیر دل۔ ان سب باتوں کو تو ہم پر چھوڑ دو۔ ہم نے بھی سائنس پڑھی تھی آخر وہ کس دن کے لئے؟ اچھا اب میں تو ٹاؤن ہال تقریر سننے کے لئے جاتا ہوں۔ تم ذرا ڈاکٹر کے گھر جاؤ۔ مکان کا نقشہ ذرا تفصیل سے دیکھ کر آؤ۔ میں بھی تقریر کے بعد یہیں واپس آتا ہوں۔

ناصر۔ اچھی بات ہے۔ (دونوں جاتے ہیں۔ پردہ گرنے کی آواز)

دوسرا منظر

(ٹاؤن ہال میں جلسہ)

صدر جلسہ:۔ حضرات!

بزم سائنس عظیم آباد کی جانب سے آج کا جلسہ اس غرض سے منعقد کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر توفیق مرزا ریڈیم کے متعلق ایک عام فہم تقریر فرمائیں۔ اب میں ممدوح سے

مطمئن ہوں کہ ہم کو اپنے خیالات سے مستفید کریں۔

(تالیاں)

ڈاکٹر: جناب صدر، و معزز حاضرین!

میں بزم سائنس کا ممنون ہوں کہ مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا اس طرح موقع عطا فرمایا گیا۔ مجھے اس وقت کوئی طویل تقریر کرنی نہیں ہے۔ ریڈیم کے متعلق میں نے جو سرسری معلومات حاصل کی ہیں ان کے بیان پر اکتفا کروں گا۔ میں نے خود کچھ ریڈیم منگوایا ہے اور تحقیقاتی کام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میں اس میں کامیاب رہا تو شاید مزید معلومات پیش کر سکوں گا۔ آج کی تقریر گویا ایک تمہید ہے۔

۱۸۹۶ء میں پیرس کے مشہور سائنس داں پروفیسر بیکورل نے غیر بصری شعاعوں کا پتہ چلایا۔ ایک مرتبہ رات کو انھوں نے یورینیم کی شیشی اتفاقاً ایک عکسی تختی کے قریب رکھ دی تھی۔ دوسرے دن انھوں نے دیکھا کہ باوجود تاریکی کے تختی پر تصویر کا خاکہ بن گیا۔ پروفیسر صاحب نے یہ خیال کیا کہ شاید اس دھات میں سے کوئی ایسی شعاع نکلتی ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی۔ اس تجربے کا حال سن کر پروفیسر کیوری اور ان کی بیوی میری کیوری نے تحقیق شروع کی۔ ان دونوں نے معلوم کیا کہ بعض اور دھاتیں بھی ہیں جن سے ایسی غیر بصری شعاعیں نکلتی ہیں۔ کچھ عرصہ بعد پروفیسر کیوری نے تو انتقال کیا لیکن ۱۹۱۱ء میں ان کی خاتون میری کیوری نے دنیا کی سب سے قیمتی دھات ریڈیم کا انکشاف کیا۔ یہ دھات اس قدر کمیاب ہے کہ آج بھی دنیا میں اس کی مجموعی مقدار ۲۰ تولے سے زیادہ نہیں ہے۔

ریڈیم چاندی کی طرح سفید اور چمک دار دھات ہے۔ اس سے تین قسم کی غیر بصری شعاعیں نکلتی ہیں۔ بعض شعاعیں ایسی تیز ہوتی ہیں کہ لوہے کی ٹھوس تختی بھی ان کو روک نہیں سکتی۔ ریڈیم کی تیز شعاعوں سے سرطان کا علاج کیا جاتا ہے۔ جب شعاعیں قریب سے ڈالی جاتی ہیں تو سرطان میں داخل ہو کر جراثیم اور فاسد مادے کو جلا دیتی ہیں۔

طبی نقطۂ نظر سے اب اس امر کی تحقیق کرنی ہے کہ ایک محفوظ فاصلے سے جسم انسانی پر ریڈیم کی شعاعوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔ تجربوں کے ذریعہ جب ہم یہ معلوم کر لیں گے کہ انسان کتنے فاصلے سے اور کتنی دیر تک شعاعیں برداشت کر سکتا ہے تو یقین مانیے کہ ہم تمام امراض پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی تحقیق سے ایک نیا طبی دور شروع ہو جائے گا اور دنیا میں کوئی ایسا مرض باقی نہ رہے گا جس کو ہم لاعلاج قرار دیں۔

(تالیاں)

تیسرا منظر

ناصر۔ تقریر تو ۵ بجے ختم ہو چکی ہوگی، مگر شیر دل کا اب پتہ نہیں۔

(شیر دل داخل ہوتا ہے)

شیر دل۔ معاف کرنا ناصر تمھیں انتظار کرنا پڑا۔ ایک ضروری کام کی وجہ سے میں وقت پر نہ آ سکا۔ کہو، تم مکان دیکھ آئے۔

ناصر۔ ہاں اچھی طرح سے۔ یہ مکان کا نقشہ ہے۔ دیکھو یہ نیا تجربہ خانہ ہے۔ بالکل جدید وضع کا۔ مگر اس میں داخل ہونے کا

صرف ایک دروازہ ہے اور اس پر چور گھنٹی لگی ہے کوئی اس دروازے کے قریب گیا اور گھنٹی خود بخود بجنی شروع ہوئی

شیر دل۔ اچھا۔ اور یہ کمرہ تجربہ خانے سے کتنی دور ہوگا۔
(نقشے پر انگلی سے بتاتا ہوا)

ناصر۔ یہی کوئی دو سو قدم پر۔ اچھا کہو تو تقریر میں کوئی کام کی بات بھی سنی۔

شیر دل۔ ہاں ہاں میرا جو قیاس تھا وہ صحیح نکلا۔

ناصر۔ پھر ہمیں بھی تو بتاؤ۔

شیر دل۔ بھئی ناصر، اب وقت تنگ ہے۔ مجھے جانے دو۔ میں یہ نقشہ بھی ساتھ لے جاتا ہوں۔ پھر کل ہمیں ملیں گے۔

ناصر۔ اچھی بات ہے، کل ہی سب تفصیل معلوم ہوجائے گی۔
(شیر دل چلا جاتا ہے)

چوتھا منظر

ڈاکٹر۔ (اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے غور و فکر کرتے ہوئے آہستہ سے کہتا ہے)
میں سمجھتا ہوں کہ انسان ۱۰ فٹ کے فاصلے پر ایک گھنٹے تک زندہ رہ سکتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ تجربہ اندیشناک ہے۔ کوئی کیوں اپنی جان خطرے میں ڈالے گا۔
(کمرے سے کچھ دور کسی کے دبے پاؤں چلنے کی آواز)

ڈاکٹر۔ (چونک کر) اس وقت تجربے خانے کی طرف سیڑھی کی آہٹ کیسی!
(چور گھنٹی بجتی ہے ٹر۔ ر۔ ر۔ ر۔ ر۔ ر۔ ر۔۔۔۔)

ڈاکٹر دوڑتا ہے۔ چور بھی دوڑتا ہے (دونوں کے پیروں کی آواز)

ڈاکٹر۔ ٹھیر جاؤ ورنہ میں طمنچہ چلا دوں گا۔
(چور رک جاتا ہے)

ڈاکٹر۔ "تم کون ہو؟" (ذرا غصے سے)

چور۔ "آپ کی طرح ایک انسان" (اطمینان کے ساتھ)

ڈاکٹر۔ "اتنی رات گئے تمہارا یہاں کیا کام؟"

چور۔ "اس خیال سے آیا تھا کہ کچھ ہاتھ لگے تو لیتا جاؤں"

ڈاکٹر۔ "چہرے اور لباس سے تو تم ایک مہذب آدمی معلوم ہوتے ہو، معمولی حالات میں تو شبہ بھی نہ ہو کہ تم اس قدر ڈھیٹ ڈاکو ہو۔"

چور۔ "ڈاکٹر صاحب۔ خانگی افکارات اور پریشانیاں ایک مہذب آدمی کو بھی چوری پر مجبور کر دیتی ہیں۔"

ڈاکٹر۔ "مگر مہذب ہونے کا دعویٰ تم کو پولیس کی گرفت سے نہیں بچا سکتا۔ تم پولیس کے حوالے کئے جاؤ گے۔"

چور۔ ڈاکٹر صاحب میں ایک شریف آدمی ہوں، تباہ حالی، مفلسی اور کثیر العیالی نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ آخر انسان اپنے بچوں کو کب تک بلبلاتا ہوا دیکھ سکتا ہے؟ آپ ایک شریف اور ہمدرد انسان ہیں۔ میری خطا معاف کر دیں۔"

ڈاکٹر۔ "میں تمہاری باتوں میں نہ آؤں گا۔ چور ایک سماجی مجرم ہوتا ہے۔ سماج کی عافیت کے مدنظر تم کو پولیس کے حوالے کر دینا میرا فرض ہے۔ مجھے معاف کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

چور۔ "ڈاکٹر صاحب اس سے تو بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے ختم ہی

کردیں۔ باوجود مفلسی کے مجھے اپنی عزت جان سے زیادہ عزیز ہے۔
خدا کے لئے آپ میری عزت بچا لیجئے۔

ڈاکٹر۔ "نہیں، نہیں۔ (پھر ذرا سوچ کر) تمہاری رہائی کی صرف ایک صورت ہے۔ اگر تم میری شرط منظور کرلو۔"

چور۔ "ڈاکٹر صاحب آپ جو شرط چاہیں پیش فرمائیں مجھے ہر طرح منظور ہے۔"

ڈاکٹر۔ میں ایک طبی تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ (خوش ہو کر) مگر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس تجربے کے دوران میں آپ کو جسمانی تکلیف ہوگی۔ اگر آپ اس کو قبول کرلیں تو مجھے بڑی مدد ملے گی اور میں بہت ممنون ہونگا۔

چور۔ "ڈاکٹر صاحب۔ میں گرفتاری اور بےعزتی کے مقابلہ میں سخت سے سخت تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ (خوش ہو کر)

ڈاکٹر۔ آپ اس تجربہ خانے میں چلے جائیے میں باہر سے دروازہ بند کردوں گا پھر تجربہ ختم ہونے تک آپ باہر نہ آئیں گے۔ میز پر ریڈیم رکھا ہے۔ سامنے کرسی رکھی ہے۔ قریب میں تھرمامیٹر اور گھڑیال رکھی ہے۔ ٹیلیفون کے ذریعہ میں کوئی آدھے گھنٹے کے فاصلے سے کیفیت دریافت کروں گا۔ آپ تفصیل سے بیان کریں۔

چور۔ جی بہت خوب۔

پانچواں منظر

ڈاکٹر۔ ہالو!

چور۔ ہالو۔ ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر۔ آدھا گھنٹہ گزر چکا۔ بتائیے اب کیا کیفیت ہے۔

چور۔ ڈاکٹر صاحب تپش ۱۰۲° ہوگئی ہے۔ گھبراہٹ بے انتہا ہے۔ اتنے ہوش نہیں کہ نبض شمار کروں۔

ڈاکٹر۔ گھبرائیے نہیں، میں آدھے گھنٹے کے بعد پھر آپ سے بات کروں گا۔ اب آپ کچھ گانا سنئے۔

(ٹیلیفون رکھ دیتا ہے)

(کوئی ۵ سکنڈ کا وقفہ)

ڈاکٹر۔ ہالو! اب ایک گھنٹہ ہو چکا، کہئے کیا حال ہے۔

چور۔ مردود، موذی، قاتل آخر تیرا ارادہ کیا ہے۔ کیا مجھے یوں ہی مار ڈالے گا؟

ڈاکٹر۔ میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ کو تکلیف ہوگی پھر آپ کا اتنا بگڑنا کس طرح درست ہوسکتا ہے؟ آپ ایک اہم تحقیقات میں مدد دے رہے ہیں تھوڑی سی تکلیف اور سہی۔

چور۔ تیری تحقیق کی ایسی تیسی۔ میں تو مرا جا رہا ہوں اور تجھ پر تحقیق کا بھوت سوار ہے۔ ارے ظالم اختلاج بہت بڑھ گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ دل سینے سے باہر نکل آئے گا۔
بدمعاش۔ خونی جانور کو بھی تو اس بری طرح نہیں مارتے۔ اُف۔ اُف۔ اوف (دھڑام)

(کرسی پر سے گر جاتا ہے)

ڈاکٹر۔ (ٹیلی فون رکھتے ہوئے) او ہو بے ہوش ہوگیا (گھبرا کر) کہیں مر نہ جائے۔ مجھے جلد وہاں جانا چاہیے (تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جاتا ہے)

تجربہ خانے کا دروازہ کھولتا ہے (کچھ سرسراہٹ ہوتی ہے)

ڈاکٹر۔ یہاں تو سب اندھیرا پڑا ہے۔ (کھٹکا دبا کر روشنی کھولتا ہے)
(ایں یہاں نہ تو وہ چور ہے اور نہ ریڈیم۔

(باہر سے کوئی دروازہ بند کرلیتا ہے)

ڈاکٹر ۔ (گھبرا کر) ہائیں یہ باہر سے دروازہ کس نے بند کیا
(دوڑ کر کھولنے کی کوشش کرتا ہے)

چھٹا منظر

ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔

ڈاکٹر ۔ ہلو۔ کہاں سے۔
شیردل ۔ "کہیے جناب ڈاکٹر صاحب آپ کی تپش اور نبض کی کیا حالت کیا ہے؟" (الفاظ پر زور دیتے ہوئے طنزاً)
ڈاکٹر ۔ "تم بڑے موذی اور نالایق ہو۔" (ذرا گرم ہو کر)
شیردل ۔ "دیکھیے ڈاکٹر صاحب آپ کو ایسے الفاظ زیب نہیں دیتے۔ میز کے خانے میں تپش پیما رکھا ہے۔ براہ کرم اپنی تپش سے مطلع کیجیے۔ آپ ایک ایسی تحقیق میں مدد دے رہے ہیں جو بنی نوع انسان کے لئے بیحد مفید ثابت ہوگی اور آپ کا نام تاریخ تحقیقات میں سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔" (طنزاً)
ڈاکٹر ۔ "میں تجھے ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں" (برہم ہو کر)
شیردل ۔ ہا ہا! معاف فرمایئے اب وقت گزر چکا۔ آپ کمرے میں ہر طرح محفوظ ہیں۔ پولیس تک آپ نہیں پہنچ سکتے۔ میں نے دروازہ باہر سے مقفل کر دیا ہے۔
ڈاکٹر ۔ "شیردل پاجی تو جاتا کہاں ہے۔ میں ابھی پولیس اسٹیشن کو ٹیلیفون سے اطلاع دیتا ہوں۔"
شیردل ۔ "اس کی زحمت نہ کیجیے۔ آپ نے نہایت دور اندیشی سے تجربہ خانے کے ٹیلیفون کو صرف اس کمرے سے وابستہ رکھا تھا تا کہ جو غریب آپ کے تجربے کا شکار ہو اس کی آہ و فغاں کوئی سن نہ سکے۔ اپنی اس دور اندیشی کی داد مجھ سے لیجیے۔ اب آپ کسی اور سے گفتگو نہیں فرما سکتے صرف میری تحقیقات میں مدد فرما سکتے ہیں۔ فرمایئے گھبراہٹ تو نہیں محسوس ہوتی؟ ہونٹ، زبان اور حلق میں خشکی تو نہیں معلوم ہوتی؟"
"مردود۔ نالایق۔ پاجی۔ کمینے" (برافروختہ ہو کر)
"میں آپ کی کیفیت پوچھ رہا ہوں اور آپ اپنے صفات عالیہ گنائے جا رہے ہیں جناب عالی براہ کرم اپنی کیفیت واضح طور پر بیان کیجیے"
ڈاکٹر ۔ "بدمعاش۔ چور۔ ڈاکو" (اور برافروختہ ہو کر)
شیردل ۔ "جناب عالی۔ میں نہ بدمعاش ہوں نہ ڈاکو۔ ایک مہذب، شائستہ اور چالاک انسان ہوں۔ خدا نے عقل دی ہے، کم عقلوں سے فائدہ اٹھا لیتا ہوں۔ اس عمل کو چوری جیسے گھٹیا لفظ سے تعبیر کرنا کتنی بڑی غلطی ہے۔"
ڈاکٹر ۔ "بدمعاش۔ چور میں اور تجھ میں کیا فرق ہے؟"
شیردل ۔ "ڈاکٹر صاحب یہ ایک علمی بحث ہے۔ اس میں اتنا الجھنا چاہیے۔

[چور میں اور مجھ میں وہی فرق ہے جو ایک مہتر اور ڈاکٹر میں ہوتا ہے۔
مہتر آپ کے بول و براز کو صاف کرتا ہے، ڈاکٹر بھی قارورے اور فضلے کا امتحان کرتا ہے۔ اگر آپ محض اس سطحی مماثلت کی بنا پر ڈاکٹر کو مہتر کی طرح حقیر خیال کرنے لگیں تو کتنی بڑی غلطی ہوگی؟]
بات یہ ہے کہ حقارت نفس عمل سے نہیں ہوتی بلکہ اس طریق عمل کے لحاظ سے ہوتی ہے جس کے ذریعے کوئی عمل کیا جائے۔ آپ نے روپیہ کے ذریعہ ریڈیم حاصل

کیا تھا اور میں نے تدبیر کے ذریعہ ۔ وہ مین چور اور نہ آپ چور ۔ آپ جسم انسانی پر اس کے اثرات کی تحقیق کرنی چاہتے تھے مگر ناکام رہے ۔ البتہ میں اپنی تحقیق میں کامیاب رہا ۔

ڈاکٹر ۔ "بلبلا یہاں ۔ دغا باز ۔ چوری کو تحقیق کہتا ہے؟"

بشیر علی ۔ "نہیں ڈاکٹر صاحب نہیں ۔ بس آپ تو واللہ خفا ہی ہو گئے ۔ سنئے تو ' میں نے یہ معلوم کیا تھا کہ جب ریڈیم کی اشعاعی قوت زائل ہو جاتی ہے تو وہ سیسہ بن جاتا ہے ۔ پس میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی شعاعیں سیسے میں سے نہ گزر سکتی ہوں گی ۔ چنانچہ میں نے سیسے کی ایک ڈبیہ پورے اہتمام کے ساتھ تیار کروائی اور اپنے خیال کی تصدیق کے لئے یہاں حاضر ہوا ۔ جب آپ نے مجھے تجربہ خانے میں بند کیا تو میں نے نہایت احتیاط سے ریڈیم کو ڈبیہ میں منتقل کیا ۔ یہ ڈبیہ میری جیب میں گھنٹے بھر سے ہے ۔ میرے جسم پر کوئی مضر اثر نہیں ہوا ۔ اس لحاظ سے میں اپنی تحقیق میں کامیاب رہا ۔ بہرحال خوش ہونا چاہیے کہ آپ کی محنت ٹھکانے لگی ۔ تحقیق ہو چکی ۔ آپ نے نہ کی میں نے کی ۔ صبح تک اپنے تجربہ خانے میں آرام فرمائیے مجھے اس ریڈیم کے کئی حصے کر کے پوری احتیاط کے ساتھ مختلف شہروں کو بھیجنا ہے ۔ خدا حافظ ۔"

حبیب احمد فاروقی

(حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا)

غزل

احساس بے خودی تک پہونچی ہیں سرد آہیں
ناسازگارِ الفت ہیں میری التجائیں

توبہ کے توڑنے کو جی چاہتا ہے میرا
مجبور کر رہی ہیں اٹھتی ہوئی گھٹائیں

جور و جفا نے ان کی کیا سحر کر دیا ہے
اب دل کی دھڑکنیں بھی دینے لگیں دعائیں

تاریک ہو رہی ہے دنیائے رنج و فرقت
نالوں کی بجلیاں ہیں آہوں کی ہیں گھٹائیں

محشر اٹھا رہی ہیں ' فتنے جگا رہی ہیں
رکتی ہوئی نگاہیں ' جھجکی ہوئی ادائیں

عظیم حیدرآبادی

مہاراجہ بہادر کی شاہ پرستی

اور دیگر حالات

سطورِ ذیل اس لئے قلم بند کرکے اشاعت کے لئے بھیجی جارہی ہیں کہ وہ آپ کے رسالہ کے ذریعے محفوظ ہوجائیں۔

اس وقت تو سب ہی یہ جانتے ہیں کہ مہاراجہ کے چراغِ ہستی نے، جو رونق وضیاء دکھلائی، اور جس جود وسخا اور خلق و مروت سے ایک جہان کو مسخر کرلیا، وہ صرف دربار آصفیہ کا تصدق تھا، اور عالی قدر سلطان دکن آصفجاہ سادس وسابع کی ایک ادنیٰ نظرِ التفات تھی کہ اس کی بدولت مہاراجہ وہ سب کچھ بن گئے، جس سے اب ایک دنیا واقف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی اس کامیاب زندگی میں ان کی فطری صلاحیتوں اور خوبیوں کو بھی دخل تھا، مگر اس سے کون انکار کرسکے گا کہ بے نظیر، مردم شناس اور قدرداں شاہانِ جلیل القدر نے ان کو ان کے ان صفات وکمالات کا وہ صلہ عنایت فرمایا، جو سلطنت میں اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا، اور دمِ آخر تک الطافِ شاہانہ برابر مبذول رہے، مہاراجہ کا علاج معالجہ توجہ شاہی کا مرکز بنا رہا، اور حضور پر نور ہر وقت اطبار کے نام فرامین اور ہدایات جاری فرماتے رہے۔ عیادت کے لئے خود سواری مبارک آیا کرتی۔ جب وہ سانحہ پیش آگیا، جو لابدی تھا، تو اپنے ایک قدیم وفادار اور بے مثل شخص کی موت سے حضرت پیر و مرشد کو بیحد رنج پہنچا، ؎

شہنشاہِ جہاں را از وفاتش دیدہ پرنم شد
سکندر اشکِ حسرت ریخت، کافلاطوں نہ عالم شد

صدارتِ عظمیٰ سے سبکدوشی کے بعد، مہاراجہ بہادر کا اکثر وقت علمی وتفریحی مشاغل میں صرف ہوتا تھا، اور تقریباً ہر روز شب میں سکندرآباد کسی ایک سینما تشریف لے جاتے، اور رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے ایوانِ شاہی کو واپسی عمل میں آتی تھی، جس واقعہ کا ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں، وہ اوائل ربیع الاول ۱۳۵۹ھ کا ہے، اور جسے راقم الحروف کے ایک دوست نے اس کے وقوع پذیر ہونے کے دوسرے یا تیسرے ہی دن ہم سے بیان کیا۔ وہ راوی ہیں کہ حسبِ قاعدہ مہاراجہ بہادر کی سواری، جب رات میں سکندرآباد سے واپسی کے وقت چار مینار سے گزرتی، تو ایک بڑھیا، جو ایک مینار کے پائین میں بیٹھا کرتی ہے، صدائیں لگاتی، اور کہتی کہ "اللہ میرے نبچے والے راجہ کو سلامت رکھے عمر واقبال میں ترقی دے" مہاراجہ بہادر اپنی فطری عادت کے موافق اسے سرفراز فرماتے، اور سواری گزر جاتی تھی۔ تقریباً ہر روز رات میں یہ بڑھیا دستِ سوال دراز کرتی، اور سخی راجہ دستِ کرم بڑھا دیتے۔

ایک رات جب کہ ساڑھے بارہ بج رہے تھے مہاراجہ کی سواری چار مینار کے مشرقی مینار کے قریب سے (جو یونانی صدر شفاخانہ کی جانب ہے) گزر رہی تھی، مینار کے پائین سے حسبِ عادت یہ صدا آئی کہ "اللہ میرے نبچے والے سخی راجہ کے عمر واقبال میں ترقی دے" موٹر سے سخی داتا کا ہاتھ اٹھا اور ابرِ جود وسخا بن کر برس گیا۔ گاڑی کچھ ہی آگے بڑھی تھی، حکم ہوا کہ لوٹالو، اور اس مینار کے قریب اس

بڑی بی کو پاس لے چلو۔ ملازمین موٹر کا دروازہ کھولتے ہیں، اس کے باوجود کہ موٹر میں بیٹھنا اٹھنا ان کے لئے سخت مشکل تھا بدقت تمام نیچے اتر پڑے۔ اور بڑھیا سے خطاب کرکے فرمایا کہ:۔

"تم ہر روز مجھ ایسے بوڑھے کو عمر و اقبال کی ناحق دعائیں دیتی ہو، میں تو امروز فردا کا مہمان ہوں، بلکہ تمھاری سچی اور دلی دعائیں اس بادشاہ کے حق میں ہونی چاہئیں، جس کے در پر مجھ سے ہزاروں غلام اور کتے پڑے رہیں۔ دعا کرو کہ اللہ پاک اس ریاست کے بادشاہ سلامت اور ان کے شہزادگاں و شہزادیاں کے عمر و اقبال میں ترقی عطا فرمائے، اور اس ریاست کو دشمنوں اور بلاؤں سے محفوظ رکھے۔"

یہ فرمانے کے بعد بوڑھیا سے اصرار فرمایا کہ وہ ان دعاؤں کو ان کے سامنے اپنی زبان سے دہرائے۔ چنانچہ اس نے دہرانا شروع کیا، اور اس کے ساتھ ہی مہاراجہ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے، اور اس بڑھیا کے ساتھ ساتھ خود بھی ان فقروں کو دہراتے جاتے اور آمین کہتے جاتے تھے، آنکھوں سے آنسو رواں تھے اس وقت ان پر کچھ اس طرح بے کلی اور اضطراب کا عالم طاری تھا کہ ایک عجیب رقت انگیز کیفیت نمایاں ہو رہی تھی۔ اس پیرانہ سالی کے باوجود کہ لوگوں کو انھیں سہارا دینا پڑتا تھا، بڑی دیر تک کھڑے رو رہے تھے، اور جسم تھرا رہا تھا، پیر لڑکھڑاتے تھے۔ جب کچھ سکون ہوا، ملازمین کے سہارے موٹر میں سوار ہو گئے، اور گاڑی ایوان شاد روانہ ہو گئی۔ مجھ سے اور لوگوں نے اس کی تصدیق کی کہ بعد راتوں میں اس مینار کے پاس ایک بڑھیا بیٹھا کرتی ہے۔

مہاراجہ نے زندگی بھر داد و دہش کی، اور ہر روز خزانہ سے رُپے آتے اور تقسیم ہو جاتے۔ بیمار ہونے سے قبل تک اس طویل عمر میں کسی دن یہ بے نظیر عادت ترک نہ ہوئی اور یہ ان کے لئے بمنزلۂ فریضہ بن گئی تھی۔ دوسرے راوی نے مجھ سے بیان کیا کہ تین دن تک چونکہ مہاراجہ بالکل بیہوش رہے، اس لئے خیرات ملتوی رہی۔ ۵ ربیع الثانی دوشنبہ کے دن روح پرواز کرنے سے کچھ دیر قبل کسی نے کہا کہ سرکار کی عادت کے خلاف تین چار دن سے آج تک غربا پر کچھ تقسیم نہ ہوا، اور سرکار مرض کی شدت کے باعث سخت تکلیف میں مبتلا ہیں، چنانچہ اس پر توجہ کی گئی، اور اکنیوں سے بھری ہوئی تھیلیاں منگوائی گئیں، اور ملازمین کو فقرا پر تقسیم کرنے کے لئے دی گئیں جو سیکڑوں کی تعداد میں ڈیوڑھی کے سامنے جمع تھے۔ ان لوگوں نے ان پر تھیلیاں لٹا دیں اور جونہی کہ ادھر یہ تقسیم ختم ہوئی ادھر مہاراجہ کی روح پرواز کر گئی، عقیدت مند کہنے والوں نے کہا کہ شاید سرکار کی روح زندگی بھر اس صفتِ حسنہ کے ناغہ ہونے کو پسند نہ کرتی تھی، اس لئے جسدِ خاکی چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی، جوں ہی کہ خیرات ختم ہو گئی، نزع کی کیفیت دور ہو کر، روح نے خوشی سے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔

مہاراجہ اپنی علمی قابلیت میں ایسے فرد فرید تھے کہ اس دور میں ہندوستان میں اس طرح "مجمع العلوم والکمال" افراد بہت کم پیدا ہوئے، اور اتنی خوبیوں کا ایک شخص کی ذات میں جمع ہو جانا فی الحقیقت ایک حیرت انگیز بات ہے۔ مہاراجہ فارسی، انگریزی، عربی، مرہٹی، کنڑی، ہندی اور

پنجابی زبانوں پر کافی عبور رکھتے تھے، اور اول الذکر دو زبانوں میں اہلِ زبان کی طرح گفتگو کرتے ہوئے ان کو بہت سے آدمیوں نے سنا ہے۔ خصوصیت سے فارسی کا لب و لہجہ بالکل ایرانیوں کا سا تھا۔ اردو، ان کی مادری زبان تھی۔ مختلف فنون میں انھیں بلا مبالغہ استادانہ منصب حاصل تھا۔

(۱) ان کا خطِ نسخ و نستعلیق ایک ماہر کے درجہ کو پہنچ چکا تھا۔ امرا میں نواب لطف الدولہ وغیرہ ان کی ہمسری کرتے تھے۔ لیکن خطِ شکستہ نہایت پختہ اور عجیب شان رکھتا تھا، ضعیفی کے باوجود آخر عمر تک بھی اس کے رنگ میں فرق نہ آیا، مولانا محمد علی، اور ڈاکٹر اقبال کا خط بھی عمدہ تھا۔ ہمارے پاس مہاراجہ کے بیسیوں خطوط ہیں، اور ہماری رائے ہے کہ ان کا خط اِن حضرات سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ ان کے دستخط بھی خوبصورت اور خاص شان کے مالک تھے۔

(۲) ایک اچھے مصور بھی تھے، ہم نے ان کے کھینچے ہوئے قلمی تصاویر و مناظر دیکھے ہیں۔ اپنے بعض مقربین کو جنھیں وہ چاہتے تھے۔ ان کی تصویریں بنا کر انھیں مرحمت فرمائی تھیں۔

(۳) فنونِ طبیہ میں، مشرقی اور مغربی دونوں طرز کی طبابت کی، اور اپنے ابتدائی دور میں باضابطہ مطب بھی کیا تھا۔ بیسیوں نسخے خود اپنی ذاتی صلاحیت سے مرتب کیا کرتے۔ میں نے ان کی مرتبہ و مرکبہ چورنِ شاد اور دیگر معاجین وغیرہ دیکھی ہیں۔

(۴) اپنے نانا کی توجہات پر فنِ موسیقی میں بھی مہارت حاصل فرمائی تھی۔ راجہ نریندر بہادر نے ایک دفعہ ایک صوفی صاحب کے روبرو مہاراجہ بہادر سے ارشاد کیا کہ بابا ہمیں ہمارے دادا (یعنی چندولال) نے شاکر علی، باقر علی نامی دو بڑے مشہور گویوں سے تعلیم دلائی تھی، تم بھی اس فن کو سیکھو، فقیر صاحب جو اس وقت موجود تھے، انھوں نے سن کر یہ کہا مہاراج آپ بھی غضب کرتے ہیں، یہ گانا سیکھ کر کیا کریں گے"، اس پر راجہ نریندر بہادر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ اجی شاہ صاحب یہ بہت بڑا اور اعلیٰ فن ہے افسوس ہے کہ گویوں اور طوائف کے اس کو اختیار کر لینے سے حقیر سمجھا جانے لگا، اگر یہ اس کمال سے واقف نہ ہوں گے تو کل اہلِ فن کی قدر کرنا کیا جانیں گے۔ چنانچہ مہاراجہ کشن پرشاد نے نانا کی ان توجہات کے باعث ستار وغیرہ بجانے میں خوب مشق بہم پہنچائی، باجوں میں انھیں سب سے زیادہ روشن چوکی پسند تھی، اور اس کے بے حد دل دادہ تھے۔ اچھے اچھے منتخب بجانے والوں کو ڈیوڑھی پر ملازم رکھا تھا۔ اور اکثر و بیشتر اس کے بجنتری انعام سے سرفراز ہوتے تھے۔ ہمارے شہر کے اکثر لوگ اس باجہ سے ان کی دلچسپی کا حال خوب جانتے ہیں۔

(۵) فنونِ حرب میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے، بنوٹ، نشان اندازی، شمشیر زنی، تیر افگنی میں دست گاہ بہم پہنچائی تھی۔ میر عظمت علی مندوزئی نے انھیں بنوٹ اور تیر اندازی سکھائی تھی، ایک دفعہ کا ذکر ہے جبکہ ان کے نانا راجہ نریندر بہادر زندہ تھے اور کبوتر اڑا رہے تھے، انھوں نے اپنے چہیتے نواسے کو حکم دیا کہ نشانہ لگاؤ، حکم کا ملنا ہی تھا کہ نشست سے تیر چھوٹا، وہ ایک کبوتر کے پیوست ہو گیا، جو اڑتے اڑتے زمین پر گر پڑا، راجہ نریندر بہادر بے حد خوش ہوئے استاد میر عظمت علی خاں کو دوشالہ مرحمت کیا۔

شعر کا سنگار پسندِ خاطر تھا، مگر تصوف کی چاشنی، اور علم و ادب کے شغف نے انھیں اس میں انہماک سے باز رکھا تھا۔

(۶) اپنے دور کے پختہ مشق شاعر، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر گوئی فرمائی۔ کلام کا بیشتر حصہ اردو زبان میں ہے،

جس میں مثنوی، قصیدہ، مخمس، مسدس، غزل، وغیرہ سب ہی شامل ہیں، حضرت آصف (غفراں مکان علیہ الرحمہ) سے شرف تلمذ حاصل فرمایا تھا۔ ایک بلند درجہ انشا پرداز و مصنف کی حیثیت سے بھی ان کو دنیا جانتی ہے۔ ان کے مکتوبات کا ایک مجموعہ ان کی مدار المہامی کے دور میں چھپا تھا۔ جو اب بہت کمیاب ہوگیا ہے جو اردو زبان کی ایک گراں قدر یادگار رہے گا۔ اس کے پڑھنے سے ان کے زور قلم، اور زور بیان کا اندازہ ہوتا ہے، جس میں غالب کے طرز پر اپنا ایک اچھوتا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ ان کی تصانیف بہت سے فنون پر حاوی ہیں، جو تصوف، فلسفہ، تاریخ، ادب، اخلاق، ناول اور سفرنامے وغیرہ پر مشتمل ہیں۔

(۷) علم نجوم میں بھی مہارت حاصل تھی۔ ڈیوڑھی کے بہت سے ملازم جب کبھی انھیں کوئی لڑکا تولد ہوتا تو ایک درخواست گزرانتے کہ سرکار فدوی زادہ کے لئے، ستاروں کے سعد و نحس کو دیکھ کر کوئی نام تجویز فرمائیں۔ صرف حسب درخواست نام ہی سرفراز نہیں ہوتا بلکہ درخواست گزار کے پاس اس کے ساتھ عطا بھی پہنچتی تھی۔ کبھی کبھی تاریخی نام بھی مرحمت ہوتے تھے۔ ملازمین پر اس کا اثر اتنا ہوتا کہ ان کے دلوں سے بے اختیار سچی دعائیں نکلتی تھیں۔

مہاراجہ کے اس فن میں اچھی مہارت سے متعلق ایک ایسے واقعہ کا ذکر یہاں مناسب ہوگا، جو خود راقم الحروف پر گزرا ہے۔

اختر کے والد بزرگوار (اللہ ان کی قبر کو نور سے منور رکھے) کو مہاراجہ کی پیشی میں حاضری کا اختصاص حاصل تھا، اوائل عمری کا زمانہ تھا۔ ایک دن میرے ہم عمر احباب نے مجھ سے تفریح پر چلنے کی فرمائش کی، اور بہت مجبور کیا لیکن یہ پایا کہ فلاں دوست کے گاؤں چلیں گے، جو شہر سے کافی دور تھا۔ اس وقت میرے لئے یہ دقت تھی کہ مجھے شہر سے باہر دور دراز مقامات پر جانے کی اجازت نہ تھی، میں نے ساتھ چلنے سے انکار کیا، اور اپنی مجبوری ظاہر کی، سید سجاد حیدر یلدرم نے ایک مضمون میں جس کا عنوان ہی یہ ہے کہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" بالکل بجا لکھا ہے۔ اسی طرح میرے تمام عذرات پیش نہ گئے، اور کہا گیا کہ کسی نہ کسی طرح ساتھ چلنا ہی پڑے گا، اور تفریحاً "عثمان ساگر" جانے کے بہانے سے اجازت حاصل کرلی جائے۔ حضرت والد ماجد قبلہ اس روز گھر پر موجود نہ تھے، بلکہ مہاراجہ بہادر کی پیشی میں حاضر تھے، اسی لئے میں نے والدہ صاحبہ سے اسی حیلہ کو پیش کرکے اجازت حاصل کرلی، اور شام تک گھر لوٹ جانے کا یقین دلایا۔ غرض یہ کہ رفقاء کی جماعت نکلی، بجائے عثمان ساگر کے اس گاؤں کو پہنچی، جہاں چلنا پہلے ہی سے طے کرلیا گیا تھا۔ سارا دن لطف و مسرت سے بسر کیا، چونکہ مجھ پر پابندیاں عائد تھیں، جب شام کی تاریکی بڑھنے لگی، تو سب سے پہلے میں نے لوٹ جانے کا تقاضا شروع کیا، کچھ اور ساتھی بھی اس پر آمادہ ہوگئے، مگر خدا ان دوست کا بھلا کرے، جن کا یہ گاؤں تھا، انھوں نے یہ ضد شروع کی، اور کہنے لگے کہ "بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے آپ حضرات میرے پاس آئیں، اور یوں ہی لوٹ جائیں دن بھر سب تھک چکے ہیں، اس لئے شب یہیں بسر کیجئے، اور صبح ناشتہ کے بعد نکلئے، میں نے سارا انتظام کرلیا ہے، میں کسی صورت سے آپ لوگوں کو جانے نہ دوں گا" یہ سنتے ہی میری پریشانی کی انتہا نہ رہی، جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا، میرا خوف بھی بڑھتا جاتا تھا۔ ایک طرف والدہ صاحبہ کے انتظار اور ان کی پریشانی کا خیال تھا، تو دوسری طرف والد صاحب کا خوف لگا تھا۔ میں تنہا کیا کرسکتا، جب کہ ساری جماعت بدل گئی ہو۔

چار و ناچار رہنا ہی پڑا۔ اللہ اللہ کرکے نماز مغرب ختم ہونے کے بعد ہم شہر لوٹنے کے لئے نکلے۔

چونکہ میں نے والدہ صاحبہ سے عثمان ساگر جانے اور بعد مغرب لوٹنے کی اجازت لی تھی آپ جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں کی بڑی بوڑھی عورتیں کسقدر وسوسہ والی ہوتی ہیں۔ اسلئے میرے واپس نہ ہونے سے انکی پریشانیوں کی کوئی حد نہ رہی۔ مجھے اسوقت تک تیرنا بھی نہ آتا تھا، وہ سمجھنے لگیں کہ یہ لوگ تالاب گئے تھے، خدا جانے کیا بات پیش آئی، جو اب تک نہ لوٹے۔ جب صبح تک بھی میں گھر نہ پہنچا تو انتہائی اضطراب کے عالم میں انھوں نے والد صاحب قبلہ کے پاس یہ ماجرا لکھکر آدمی کو مہاراجہ بہادر کی ڈیوڑھی دوڑایا۔ حضرت اسوقت پیشی میں حاضر تھے، چونکہ یہ چٹھی تشویشناک تھی، اسلئے وہیں پیشی میں ان کے پاس پہنچائی گئی، جسکو پڑھکر وہ بھی سخت پریشان ہوئے، اور مہاراجہ بہادر سے عرض حال کرکے جانیکی اجازت مانگی۔ تو فرمایا کہ ٹھیریے۔ کاغذ اور پنسل طلب کیا، اور دائرہ وغیرہ کچھ بنایا۔ والد صاحب سے میرا نام دریافت کیا، اور میرے گھر سے نکلنے کا وقت اور دوسرے متعلقہ سوالات فرمائے۔ ان کے جوابات کے بعد نتیجہ استخراج کرکے فرمایا کہ آپکا لڑکا کسی پانی کے مقام پر نہیں گیا ہے، بلکہ وہ مشرقی رخ کے کسی ایک دیہات کیطرف گیا ہے، اپنے احباب کیساتھ بخیر و عافیت ہے۔ آپکے یہاں سے اپنے گھر پہنچنے سے قبل ہی وہ لوٹ جائیگا۔ اطمینان سے جائیے کوئی فکر کی بات نہیں۔

حضرت والد ماجد قبلہ ڈیوڑھی سے نکل کر کوئی دن کے ۱۱ بجے گھر تشریف لائے اور میں ان سے زیادہ دس منٹ قبل گھر پہنچ چکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی خفگی کا اظہار ہوا چونکہ مرحوم مشرقی طرز کے سخت پابند تھے اسلئے اس کے بعد مجھ پر جو گزرا، جو لڑکپن کی حرکتوں کے سدباب کیلئے ضروری تھا۔

مہاراجہ بہادر کے ان سب کمالات کے سوا، ان کے حسن خلق، نیک دلی، اور ہر فرد واحد کے ساتھ (جب کبھی کہ وہ ان کے آستانہ پر پہنچتا) سچی ہمدردی، دریا دلی نے خلائق کے دلوں میں گھر پیدا کرلیا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بڑھیا درخواست لیکر حاضر ہوئی کہ سرکار میرا لڑکا فلاں محکمہ میں نوکر ہے، آپ وہاں اس کی سفارش فرمادیں۔ حاکم کا نام معلوم ہونیکے بعد فرمایا کہ افسوس ہے مجھ میں اور ان میں اتفاق سے آج کل صفائی نہیں، ورنہ میں تمھارے لڑکے کی ضرور سفارش کردیتا۔ تو بڑھیا نے مایوس ہوکر پھر اصرار کیا تو وہی جواب مرحمت ہوا، اسپر اس نے یہ عرض کیا کہ سرکار اگر سفارش نہیں فرما سکتے تو کم از کم اپنے قلم مبارک سے اسی درخواست کو لکھدیں میں وہاں کے افسر کو دیدونگی، اور میرا کام یقیناً بنجائیگا۔ مہاراجہ، یہ عجیب و غریب فرمائش کو سنکر حیران ہوگئے، مسرت فرمایا کہ بڑی بی تمھیں کس نے یہ ترکیب بتائی، اسپر بڑھیا نے کہا کہ سرکار کسی نے مجھے یہ ترکیب نہیں بتائی، بلکہ میرا دل یہ کہتا ہے کہ میں سرکار کے قلم مبارک سے اس درخواست کو لکھالوں، اتنے بڑے آدمی کے خط کو دیکھکر افسر کیسے میرا کام نہیں نکالیگا۔ یہ ایسی فرمائش تھی، جو سو سفارشوں سے بڑھکر تھی، نیک دل راجہ نے کاغذ طلب فرمایا، اور اس کے منشا کے مطابق درخواست لکھ کر کے اسیوقت مرحمت فرمادی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سارے صفات انکے تصوف سے لگاؤ کی بدولت درجۂ کمال پر پہنچ گئے تھے اور بڑے بڑے صوفیا کی خدمت کرکے انھوں نے اپنے میں یہ بات پیدا کی تھی۔ متعدد بزرگوں سے تصوف کی کتابیں بھی پڑھی تھیں چنانچہ مولوی حکیم مقصود علیخاں صاحب جالل ناظم سررشتۂ طبابت یونانی کے والد بزرگوار مولانا حکیم منصور علیخاں صاحب (علیہ الرحمہ) سے حضرت شیخ اکبر کا ایک رسالہ وحدت الوجود پڑھا تھا۔ اور انکی کمال عزت فرمایا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی سے بیعت تھی اور انھوں نے مہاراجہ کو ۱۳۳۲ھ میں خماری شاہ کا لقب عطا کیا تھا۔ راقم الحروف کے والد کو جو انکے فیملی سرجن تھے اکثر تحریر کیذریعہ اور کبھی زبانی حکم ہوتا کہ آج فلاں صوفی صاحب کو دیکھ آئیں، اور مجھے اطلاع دیں کہ انکے حالات کیا ہیں، ذکر و شغل کیا ہے اور وہ کس رنگ میں رہتے ہیں۔ ان معلومات کے بعد وہ اکثر راتوں میں بھیس بدلکر یا یونہی ان فقراء کے پاس پہنچتے اور ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ دن میں تشریف لیجاتے ہوئے تو بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے۔ ان کی وفات کے متعلق میں نے ایک مادۂ تاریخ لکھا ہے، جو شاید بلاتکلف زبانوں پر آسانی سے چڑھ جائے۔ اس میں ہمزہ کا ایک عدد شریک ہے۔

آہ راجۂ راجایان کشن پرشاد

۱۳۵۹ھ

معین الدین رہبر فاروقی

خواب بیداری

وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی تھی جہاں مغربی اور مشرقی تعلیم و تہذیب نے مل جل کر ایک بالکل جداگانہ طرز زندگی کی بنیاد قائم کر دی تھی۔ پردے کی بے جا بندشیں ختم ہو چکی تھیں۔ اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم عام تھی۔ مخلوط پارٹیاں کوئی عجیب بات نہ سمجھی جاتی تھیں۔ موسیقی اور ساز نوازی کو پسند کیا جاتا تھا۔ بے جا تکلف اور غیر ضروری جھجک خلاف تہذیب و شائستگی خیال کی جاتی تھی۔ آزادیٔ خیال اور آزادیٔ رائے کو سراہا جاتا تھا۔ لباس میں زیادہ سے زیادہ سادگی و مناسبت اور اس کی قطع و برید میں ضرورت سے زیادہ نزاکت کو دخل ہو گیا تھا۔ چال ڈھال میں ایک بے پرواسبک خرامی پیدا ہو چکی تھی۔ گفتگو میں مذاق کے لطیف پہلو اور مذاق میں سنجیدگی کے ہلکے نقوش بار بار نمایاں ہو جاتے تھے۔ طبیعتوں پر مہربانی اور ہمدردی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ برتاؤ میں خوش مزاجی جھلکتی تھی۔ قوتِ فیصلہ نے بڑھ کر کردار کو ایک انفرادی شان بخش دی تھی۔ اور اس مثالی ماحول کی مکمل تخلیق نوعمر اور خوبصورت فرزانہ تھی۔ جو اپنی کشتیٔ حیات میں تنہا بیٹھی موجوں سے کھیل رہی تھی۔ جو جذبہ اس کی تمام دوسری خصوصیات پر حاوی تھا وہ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسرت کے خزانوں پر کامل قبضہ کر لینے کا پُرجوش جذبہ تھا۔

آج اس کی بیسویں سال گرہ کا خوش آئند دن تھا۔ وہ صبح سے مسرتوں کی فراوانیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شام ہوئی تو اس کی ڈاک اس کے لئے بہت سارے دعائیے اور مسرت بخش خطوط لائی۔ اور اب وقت وہ اپنے خط پڑھنے کے بعد لباس خانے میں کھڑی اپنے طویل اور سنہرے بالوں کی آرائش میں مصروف تھی۔ اس کا سارا دن نہایت رنگین اور خوش گوار مشاغل میں گزر گیا تھا اور اب کہ رات قریب تھی اپنے دوست احباب کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ طمانیت کے دیرپا اثر سے اس کے گال تمتما رہے تھے اور آنے والی مسرتوں کا احساس اس کی آنکھوں میں شرارے بن کر تیر رہا تھا۔ اس کے احساس ہونٹوں پر ایک بے جانی بوجھی مسکراہٹ اپنا پرتو ڈال رہی تھی۔

جب وہ دیوان خانے میں پہنچی تو بہت سارے مہمان جمع ہو چکے تھے۔ جیسے ہوائیں درخت کے پتوں کو یکساں چھوتی ہوئی گزرتی ہیں، اسی طرح وہ ہر ایک سے نہایت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ ملتی ملاتی اپنی عزیز سہیلیوں میں جا بیٹھی۔ ہر شخص نے اپنی جگہ یہی سمجھا کہ فرزانہ کو صرف اسی سے مل کر سب سے زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ مغالطہ آمیز برتاؤ کا یکساں جادو تہذیب جدید کا وہ کارنامہ ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

کمرے میں ہر طرف غیر اہم لیکن دل خوش کن گفتگو کا آغاز ہو چکا تھا۔

"فرزانہ کا اصرار ہے" شیلا نے کہا "کہ آج ایسے خوش گوار موقع پر کسی دلچسپ پکچر کا آخری شو ضرور دیکھ ڈالا جائے"۔ اور یہ کہہ کر شیلا نے مسکرا کر فرزانہ کی طرف دیکھا۔ ظاہر تھا کہ یہ تجویز فرزانہ کی نہ تھی۔

"یہ ایک نہایت ہی شاندار خیال ہے" ایک گورے چٹے لیکن ضرورت سے زیادہ دبلے پتلے نوجوان نے زور دے کر کہا۔ فرزانہ کا ابن عم شمیم بول اٹھا "آج کل ایک پکچر [illegible] چل رہا ہے۔ میرے خیال میں اس خاص موقعہ کے لئے وہ بہت زیادہ موزوں ثابت ہوگا"۔ سب مسکرا دئے۔ فرزانہ بھی مسکرائی پھر ایک دم مصنوعی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اس نے کہا "مگر بھائی جان آپ کو ہر ایک کی پسند کا خیال رکھنا چاہئے۔ آپ لوگ تو خیر ظاہر ہے کہ اس پکچر سے فطرتاً خوب لطف اندوز ہوں گے

لیکن میں اللہ میاں کیا کریں گے؟ اس سوال پر سب لوگ ہنسی میں لوٹ پوٹ ہو گئے
کسی نے رفعت سے (فرزانہ کی ہم جماعت) سے کہا "کیوں بہن
یہ پوچارم تو بڑا اچھا مقام معلوم ہوتا ہے چند ہی دنوں میں بھائی کی
صحت نکھر گئی ہے۔ آخر وہ ہے کدھر؟"
اتنے میں ایک طرف سے آواز آئی کہ "سب دم بخود کھڑے ہو جاؤ
سمیع بھائی تشریف لا رہے ہیں" فرزانہ نے سب کے ساتھ مسکراتے
ہوئے دروازے کی طرف نظر ڈالی۔ دیکھا کہ واقعی سمیع بھائی اپنے
خاص انداز میں بڑھے چلے آ رہے تھے۔

ان کے متعلق یہ روایت مشہور تھی کہ اللہ میاں نے جب
تمام آدمیوں کو بنا ڈالا تو ان کے پاس کچھ مٹی بچ رہی۔ مٹی کی
مقدار اتنی تھی کہ اگر اس سے دو آدمی بنائے جاتے تو عام سائز سے
ذرا کم ہو جاتے تھے چنانچہ اللہ میاں نے سوچا کہ لاؤ اس کا ایک ہی
آدمی بنا ڈالوں بیٹھے بٹھائے لوگوں کو میری قدرت کا نمونہ بھی
نظر آ جائے گا اور یہ مٹی بھی ٹھکانے لگ جائے گی۔ یہ سوچ کر
اس مٹی سے اللہ میاں نے سمیع بھائی کی تخلیق کا کام شروع کر دیا۔
جب سمیع بھائی بن کر تیار ہو گئے تو اللہ میاں نے انھیں ٹھوک بجا کر
زمین پر چھوڑ دیا۔ اس وقت سے سمیع بھائی چلتے پھرتے نظر آتے
ہیں اور ایک مدرسے میں لڑکوں کو موسم، جگہ اور زمین کی خصوصیات
سمجھایا کرتے ہیں یعنی جغرافیہ پڑھاتے ہیں۔ جب وہ کمرے میں داخل
ہوئے تو ایک شور محشر نے ان کا استقبال کیا۔ رفعت کو موقع ہاتھ
آیا کہنے لگی "لیجئے اب تو ہمارے سمیع بھائی تشریف لے آئے۔
ان سے دریافت کر لیجئے کہ پوچارم حیدرآباد میں کس طرف واقع
ہوا ہے۔" سمیع بھائی کو خیال ہوا کہ مذاق کرنے کا یہ بہترین موقع ہے،
بولے "حیدرآباد کے جغرافیہ سے آپ اس قدر ناواقفیت کیوں ظاہر
کر رہی ہیں۔ آپ کو تو شاید یاد ہو گا کیونکہ ہوئے کچھ زیادہ دن نہ گزرے
ہوں گے آپ ہی بتلا دیجئے۔"

رفعت بولی "جانے کو تو خیر میں بتا دوں گی مگر میں نے خیال کیا
کہ آپ بھی ضرور حیدرآباد کے جغرافیہ سے واقف ہوں گے معاف کیجئے
کو معاف فرمائیے گا۔" اس پر ایک قہقہہ پڑا اور سمیع بھائی کچھ مسکراتے
اور ہنسنے کی کوشش کرتے کرتے بری طرح خرا گئے۔ کسی نے کہا "سمیع بھائی
سنا ہے کہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے آپ بمبئی جانے والے ہیں۔ پانی
کی تو وہاں کمی ہو گی نہیں۔" ایک دوسری آواز آئی "سمیع بھائی
کو تمہاری طرح کوئی گھوڑوں پانی کی ضرورت تھوڑی ہے انھیں تو
چلو بھر ہی کافی ہو جائے گا۔ کیوں سمیع بھائی" سب بظاہر سنجیدگی
کے ساتھ سمیع بھائی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سمیع بھائی بولے "بھئی
تم لوگوں کی زبان خوب چلتی ہے۔ اب میں کیا کہوں" فرزانہ کا بھائی
ریاض بول اٹھا "جانے بھی دیجئے سمیع بھائی۔ یہ لوگ بڑے
نامعقول ہیں۔ اپنے کو بڑا ہمہ دان سمجھتے ہیں حالانکہ میں کہتا ہوں کہ
اگر گدھوں کے کان کاٹ کر انھیں سوٹ پہنا دیا جائے تو ان لوگوں
میں اور آپ میں مطلق کوئی فرق نہ کر سکے۔" سب لوگ پھر ہنسنے لگے اور
سمیع بھائی کو خیال گزرا کہ ان کی مفروضہ بزرگی اور برتری معرض
خطر میں ہے اس لئے انھوں نے پہلو بدل کر کسی قدر برا مانتے ہوئے
کہا "بس اب ختم کرو۔ ذرا تم لوگوں کو موقعہ دیا کہ چل نکلتے ہو۔ اسی
لئے میں کسی کو منہ نہیں لگاتا۔" شمیم بولا "آپ سب حضرات کو
سمیع بھائی کی بات پر کامل یقین ہونا چاہئے یہ واقعہ ہے کہ وہ
کسی شخص کو کیا کسی چیز کو بھی منہ نہیں لگاتے۔ لیکن کھانے کی
میز پر وہ اپنا یہ اصول بڑی شد و مد سے تبدیل کر دیتے ہیں اور یہ
کہتا کہ وہ کھانے کی میز کے علاوہ بھی کہیں اپنا اصول بدلتے ہوں گے
سمیع بھائی پر بہتان لگانا ہے۔" سمیع بھائی آمادۂ فساد نظر آنے لگے
اس وقت ایک خدمتگار نے ایک لفافہ لا کر ریاض کو دیا۔ پڑھنے کے
بعد ریاض نے تحریر فرزانہ کو دے دی۔ یہ ریاض کے ایک پرانے
دوست ممتاز کی تحریر تھی۔

ڈیر ریاض :-

نہیں بتا سکتا کہ مجھے آج بہن فرزانہ کی سالگرہ میں شریک نہ ہو سکنے کا کس قدر سخت افسوس ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میرا دوست سلیمان آج ہی دہلی سے آیا ہے اور میں اسے چھوڑ کر نہیں آسکتا۔ تم کہو گے کہ میں اسے ساتھ لا سکتا ہوں کا ندست ہے۔ مگر وہ بھی تو ملنے پر آمادہ ہو۔ حضرت نے عجیب دماغ پایا ہے۔ تم تو غالباً انھیں کسی قدر جانتے ہو۔ خیر۔ بہن فرزانہ کو میری طرف سے بہت بہت سلام اور مبارکباد پہونچا دینا اور نہ آسکنے کے لئے معذرت کر دینا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں ان کی اور تمھاری مسرتوں میں شریک نہیں ہوں۔ تمھارا

ممتاز

فرزانہ یہ تحریر پڑھ کر چند لمحوں کے لئے خاموش رہ گئی۔ اس نے سوچا یہ سلیمان صاحب بھی عجیب آدمی ہے۔ نہ جانے انھیں اور کیا دلچسپ مصروفیتیں ہیں۔ اور لوگ تو ہمارے تعارف کو باعث فخر خیال کرتے ہیں۔ ان سے اصرار بھی کیا گیا تو یہاں آنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ خوب گروہ ہمیں جانتے بھی تو نہیں ہیں۔ نئے آدمی ہیں۔ فرزانہ نے خط اپنے بھائی کو واپس دے دیا اور پھر گفتگو کی دلچسپیوں میں کھو گئی۔ اتنے میں فرزانہ کے والدین کمرے میں داخل ہوئے۔ سب خاموش ہوگئے اور اٹھ کر استقبال کیا۔ فرزانہ کے والدین کمرے میں داخل ہوئے۔ سب خاموش ہوگئے اور اٹھ کر استقبال کیا۔ فرزانہ کے والدین بے حد خوش نظر آرہے تھے اور بڑے تپاک سے مہمانوں سے ملے۔

کھانے کے بعد مہمان ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔

سب سے آخر میں ریاض نے اجازت چاہی۔ اور ٹھیک اس وقت جب فرزانہ اسے خدا حافظ کہہ کر اندر جا رہی تھی۔ ایک موٹر مکان کے احاطے میں داخل ہوا اور اس کے سامنے ہی آکر ٹھیر گیا۔

ممتاز ہنستا ہوا موٹر سے اترا۔ "ہلو۔ فرزانہ بہن" اس نے کہا، "ادھر سے جاتے جاتے میں نے ضروری سمجھا کہ چند منٹ ٹھیر کر آپ کی مسرتوں میں شرکت کا حق پیدا کروں۔ امید کہ بہت کامیاب اور پر لطف پارٹی رہی ہوگی"۔ فرزانہ نے مسکرا کر اس کا اقرار کیا پھر وہ ممتاز کو اپنے بھائی کے پاس اندر لے گئی۔ جاتے جاتے اس نے دیکھا کہ ممتاز کی موٹر میں کوئی اور شخص بھی تھا جو اندر کی سیٹ پر خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا۔ نہ تو وہ ان لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور نہ ہی ان کی باتیں سنتا معلوم ہوتا تھا روشنی کی کمی کی وجہ سے وہ صاف طور پر نہ دیکھ سکی کہ وہ کون تھا۔

ریاض سے ممتاز نے کہا "بھئی سلیمان بھی ساتھ آیا ہے۔ دراصل ہم لوگ اس طرف سے گزر رہے تھے اور بڑے اصرار سے میں نے سلیمان سے یہ اجازت لی ہے کہ گھوڑے کھڑے تم لوگوں سے مل لوں۔ وہ خود اترنے پر کسی طرح تیار نہ ہوا عجیب شخص ہے"۔ ریاض نے کہا "واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ چلو وہ نہیں اترتے تو میں ہی ان سے مل لوں"۔ ریاض اور ممتاز باہر چلے گئے۔ فرزانہ کمرے میں تنہا رہ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی جاکر سلیمان سے ملے۔ دیکھو وہ کیسا آدمی ہے۔ لیکن وہ نہیں گئی۔ اسے اچھا نہ معلوم ہوا کہ سلیمان پر ظاہر ہو جائے کہ وہ بہت ہی متجسس اور بے باک لڑکی ہے۔ اس نے سوچا یہ سلیمان کوئی بہت ہی شرمیلا سا لڑکا ہوگا۔ جب ہی وہ مجھ سے ملتے ہچکچاتا ہے۔ خیر ہوگا۔ مجھے اس سے کیا۔

فرزانہ سونے کے لئے چلی گئی۔ سونے سے پہلے وہ پھر سوچنے لگی۔ میں بھی کس قدر بے وقوف ہوں۔ بھائی جان تو کہہ رہے تھے کہ ممتاز صاحب کے دوست کئی سال تک انگلینڈ وغیرہ میں بغرض تعلیم قیام کرچکے ہیں۔ بھلا وہ مجھ سے ملتے ہوئے جھجکانے اور شرمانے کیوں لگے۔ شاید وہ کوئی مغرور آدمی ہیں اور جب تک ان سے خاص کام نہ ہو کسی سے ملنا پسند نہ کرتے ہوں۔ کچھ ہوگا۔ وہ نہیں ملنا چاہتے

تو کیا ہم ان سے ملنے کے لئے بے قرار ہیں۔ یہ سوچتے سوچتے فرزانہ سو گئی۔

ایک مرتبہ فرزانہ اپنے بھائی کے ساتھ شہر کے باہر ایک پر فضا مقام پر تفریح کی غرض سے گئی ہوئی تھی۔ وہیں شام کے وقت اتفاق سے ممتاز اور سلیمان بھی پہونچ گئے۔ ریاض نے بڑھ کر دونوں سے ہاتھ ملایا۔ ممتاز نے فرزانہ اور سلیمان کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ سلیمان نے مسکراتے ہوئے اس تعارف کو قبول کیا۔

سلیمان ایک خوبصورت شخص تھا۔ صرف اس لئے نہیں کہ اس کا رنگ بہت گورا اور اس کا ناک نقشہ نہایت سجل اور موزوں تھا بلکہ اس لئے کہ وہ ایک پر اثر شخصیت کا مالک تھا۔ وہ ایک مضبوط، تندرست، طویل القامت اور شاندار نوجوان تھا، اور اس کی آواز میں ایک دلفریب بلندی و عظمت پائی جاتی تھی۔ فرزانہ نے حسب عادت بے باکی سے ہنستے ہوئے سلیمان سے باتیں کیں۔ مگر کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلیمان فطرتاً سنجیدہ مزاج ہے۔ اور کسی موقعہ پر بھی اپنی فطرت کو بہت زیادہ تبدیل کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت زیادہ ہنسی کی بات پر بھی صرف مسکرا دیتا تھا۔ تاہم جب وہ ایک دوسرے سے علٰحدہ ہوتے تو دوست کہے جا سکتے تھے۔

فرزانہ نے ممتاز سے کہا "ممتاز صاحب کل شام کی چائے پر ہم آپ کا انتظار کریں گے اور سنئے اگر سلیمان صاحب ہمارے ہاں آنا پسند نہ کریں تو کوئی بات نہیں میں ان کی چائے موٹر تک پہونچا دوں گی۔ کیوں سلیمان صاحب آپ کو اس انتظام میں کچھ خرابی تو نظر نہیں آتی۔" سلیمان مسکرانے لگا۔ اس نے کہا "آپ کی نوازش ہے۔ سنا کرتا تھا کنواں پیاسے کے پاس نہیں آیا کرتا۔ مگر بیسویں صدی ہے۔ بہت سے اصول تبدیل ہو چکے ہیں اور آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔"

تعجب کی گنجائش ہی کیا ہے۔" فرزانہ اس مذاق پر غیر معمولی طور پر شرما گئی۔

سلیمان کبھی کبھی آ جایا کرتا تھا۔ اور جب کبھی آتا تھا کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہہ دیتا تھا کہ فرزانہ اس کا کوئی مناسب جواب نہ دے پاتی تھی۔ سلیمان اس کے بے پرواہ قہقہوں کو سنجیدہ مسکراہٹوں میں تبدیل کر دیتا تھا۔ فرزانہ کی سمجھ بوجھ حیران تھی۔ اس کا دل و دماغ ہچکولے لے رہا تھا۔ اور اس کی روح ناقابل قیاس رفعتوں پر پرواز کر رہی تھی۔

ایک دن بارش ہو رہی تھی۔ سلیمان کئی روز سے نہ آیا تھا۔ فرزانہ عجیب بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سوچا یہ بارش کا موسم بھی عجیب فضول موسم ہوتا ہے۔ دن میں برس لے تو کچھ ہرج نہیں۔ یہ کم بخت پانی شام میں کیوں برستا ہے۔ کچھ نہیں تو انسان کا دل چاہتا ہی ہے کہ باغ میں گشت لگائے۔ اب کوئی تنہا اس اداس کمرے میں کب تک بیٹھا رہے، پھر وہ اپنے کمرے میں چلی۔ اور وہاں اپنے دریچے کے سامنے رات گئے تک طرح طرح کے تصورات میں کھوئی ہوئی خاموش بیٹھی رہی۔

فرزانہ تیزی سے دوڑی چلی جا رہی تھی۔ کسی نے اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر اسے روک لیا۔ فرزانہ اپنی کشتی آپ چلا رہی تھی۔ کسی نے اس کے ہاتھ سے چپو چھین لیا۔ اور عجیب بات تو یہ تھی کہ اسے اپنی آزادی کے چھن جانے کا مطلق غم نہ تھا۔ اپنی خود مختاریوں کے ختم ہو جانے کی ذرہ برابر پروا نہ تھی۔ وہ اپنی گرفتاری اور مجبوری ہی میں مسرت تلاش کر رہی تھی۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد جب اس نے اپنے آس پاس نظر ڈالی تو مسرت اور سکون اس کے پاس سے پرواز کر چکے تھے اور ایک دل دکھا دینے والا اندوہ اسے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔

فرزانہ بہت کچھ بدل گئی تھی۔ یوں دیکھنے میں کچھ نہیں بدلا تھا۔ نہ ماحول، نہ زمانہ، نہ حالات۔ دوست احباب بھی تھے۔ کالج کی مصروفیتیں اور سہیلیوں کی خوش گپیاں بھی تھیں۔ دعوتیں بھی تھیں۔ تفریحی مشاغل سے بھی دل بہلایا جاتا تھا۔ خود فرزانہ ہنستی بھی تھی مذاق بھی کرتی تھی۔ بہت کم خاموش نظر آتی تھی۔ دیکھنے والوں کو اس میں کوئی فرق محسوس نہ ہوتا تھا۔ مگر دراصل فرزانہ بدل گئی تھی۔ وہ جانتی تھی اور اس کی تنہائیاں جانتی تھیں کہ وہ بالکل بدل گئی ہے۔ ایک رات وہ بستر پر لیٹے لیٹے سوچ رہی تھی۔ زندگی بھی کیسے کیسے دھوکے دیتی ہے بہت دن نہیں ہوئے مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حیات اور مسرت کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا۔ مجھے خوشی اور طمانیت کا کبھی انتظار ہی نہ کرنا پڑتا تھا۔ ہر وقت یہ چیزیں میرے اندر موجود رہتی تھیں۔ میری دنیا کس قدر وسیع تھی۔ زمین سے لے کر آسمان تک مجھے اپنی حکومت نظر آتی تھی۔ آسمان کے اس طرف بھی میرا ہی سکہ چلتا تھا۔ کم از کم مجھے ایسا ہی معلوم ہوتا تھا، اب مجھے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے بہت کم باتوں سے خوشی ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ ہوتی ہی نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ مجھ میں کتنا تغیر ہو گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے عمل پر قادر ہوں۔ سب پر ظاہر کر سکتی ہوں کہ میں ویسی ہی ہوں جیسی پہلے تھی۔ انھیں کچھ پتہ نہ چلے کہ میں کیا سے کیا ہو گئی ہوں۔ ان آئے دن کے ہنگامہ آفریں جلسوں سے میں کس قدر تنگ ہوں، پر تکلف دعوتوں کی شرکت سے میں گھبراتی ہوں۔ کسی تفریحی مشغلے میں میرا جی نہیں لگتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب بالکل سطحی اور فضول چیزیں ہیں۔ زندگی کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔ بہت ہی اہم اور بہت ہی مقدس۔ اب تک میں نے اس کے متعلق سوچا تک نہ تھا اب سوچتی ہوں تو میری تمام دوسری مصروفیتیں میرا مذاق اڑاتی معلوم ہوتی ہیں۔ مسرتوں کے گرداب میں پھنس کر میں بھول گئی تھی کہ زندگی کی تعمیر محبت سے ہوئی ہے اور محبت کے فرائض میں جینا، رونا اور سوچنا سب ہی شامل ہے۔ بھائی بہنوں تک کو معلوم نہیں۔ امی جان کو بھی خبر نہیں۔

البتہ مجھے معلوم ہے۔ میں جانتی ہوں کہ جب سلیمان آجاتا ہے تو میری مصنوعی مسکراہٹوں میں حقیقت کی جھلک کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔ سلیمان کو بھی پتہ نہیں۔ وہ تو یہ سمجھتا ہے کہ میں ایک نہایت ہی خوش گفتار، خوش مزاج اور خوش پوش لڑکی ہوں۔ سوچتا ہو گا کہ تہذیب جدید کی ہر ادا اور ہر انداز پر میں بری طرح مفتوں ہوں۔ میرے اندر میرا اپنا کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے بس طنزیہ باتیں کرنا اور میرا دل دکھانا آتا ہے۔ میرے ساتھ اسے ذرا سی ہمدردی تک نہیں ہے۔ وہ مجھ سے ایسی ایسی باتیں کہہ دیتا ہے جس پر میرا دل گھنٹوں اداس رہتا ہے۔ وہ میری اصلیت سے ناواقف ہے۔ وہ اکثر اشارتاً مثالی لڑکیوں کے متعلق اپنی رائے دے چکا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اسے شریر اور بے باک لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔ تو میں کیا کروں۔ سلیمان کو میری پروا ہوتی تو بتاتی کہ میں دراصل وہ نہیں ہوں جو وہ سمجھتا ہے۔ اب اگر میں ایک دم سے اپنے طور طریقوں کی بے باکیوں کو کم کر دوں تو کیا ہو گا سلیمان یہی خیال کرے گا کہ میں نے اسی کی خاطر یہ رنگ اختیار کیا ہے۔ وہ یہ کبھی نہ سمجھ سکے گا کہ میں ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ پھر جب وہ مجھے نہیں چاہتا تو میں کیوں ظاہر کروں کہ میں اسے چاہتی ہوں۔ یہ تو میرا راز ہے۔ اس کے اظہار سے سوائے اس کے کہ میں اپنے آپ کو گرا دوں اور کیا مل جائے گا۔ سلیمان بڑا مغرور اور خود پسند ہے۔ میری روح اور میرا دل مغرور نہیں ہے تو کیا ہوا، تعلیم اور تربیت نے مجھے استغنا اور بے نیازی سکھائی ہے۔ محبت اور چاہت نے مجھے وقار اور سربلندی کا سبق پڑھایا ہے۔ محبت کچھ مجبوری کا سودا تو ہے نہیں۔ وہ تو آزادی اور خود مختاری کی فضاؤں میں سانس لیتی ہے۔ اگر سلیمان کو معلوم ہو جائے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں تو کیا وہ مجھ سے محبت کرنے لگا؟ محبت کچھ کرنے سے تھوڑی ہوتی ہے۔ اگر اسے مجھ سے محبت ہو سکتی تھی تو اب تک ضرور ہو چکی ہوتی۔ یہ سوچتے سوچتے فرزانہ کے آنسو بہنے لگے۔ تنہا محبت کرنا بھی کس قدر دشوار ہے جہ کوئی امید نہ

کوئی صلہ — کہتے ہیں کہ حقیقی محبت صرف وہی ہوتی ہے جس میں صلہ کا خیال نہ ہو۔ مگر مجھے سلیمان سے کچھ عشق حقیقی تو ہے نہیں۔ میں اسے چاہتی اس لئے ہوں کہ اس کے خیالات اور تصورات مجھے اچھے لگتے ہیں۔ اس کی شخصیت مجھے لبھاتی ہے، اس کی آواز مجھے دلکش معلوم ہوتی ہے۔ اس کی باتیں میرے دل میں اتر جاتی ہیں۔ اس کی نگاہیں میرے قلب کے پار ہو جاتی ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ وہ ہر وقت میرے ساتھ رہے۔ وہ اپنے ہر ارادے اور ہر خواہش میں مجھے اپنا شریک بنائے۔ کبھی میں اس سے علحدہ نہ ہوں۔ اس کا فائدہ میرا فائدہ ہو جائے اور میرا نقصان اسے اپنا معلوم ہو۔ مختصر یہ کہ میں جو کچھ چاہتی ہوں اس میں خوش گفتار ادیبوں اور شعلہ بیان شاعروں کے دور از کار اقوال کا دور دور تک پتہ نہیں ہے۔

میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں صرف اسی وقت خوش ہو سکتی ہوں کہ وہ میرا ہو اور میں اس کی ہو جاؤں اور جتنی محبتیں میں اسے دوں اتنی ہی مجھے واپس بھی ملیں۔ یہ نہیں ہو سکتا اس لئے یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں اپنا رویہ بدل دوں۔ میری نسوانیت کے بھی تو آخر مجھ پر کچھ حقوق ہیں۔ میں اپنی خودداری اور وقار سے کیسے بے پروا ہو جاؤں میری قسمت میں تاریکی ہے تو یونہی سہی۔ میری دنیا مجھ پر تنگ ہو رہی ہے تو ہوا کرے۔ ان تاریکیوں اور تنگیوں پر ماتم کرنے کی تھوڑی سی فرصتیں تو کم از کم میری اپنی ہیں۔ شاید وہ وقت بھی آئے کہ میرا دکھ حد سے گزر جانے پر میرے لئے دوا ہو جائے ابھی تو میرے پاس رونے کے لئے آنکھیں اور دل دونوں موجود ہیں۔" فرزانہ کے رخسار جو خشک ہو گئے تھے پھر بھیگ گئے۔

عجیب دلفریب موسم تھا۔ بارش ہو چکی تھی اور اب مطلع بالکل صاف تھا۔ شام کا وقت تھا اور فرزانہ دیوان خانے میں ایک دریچے کے سامنے کھڑی باغ کے سرسبز درختوں پر نظر جمائے ہوئے تھی۔ اور غیر معمولی طور پر خیالات میں غرق تھی ریاض اپنے والد کے ساتھ باہر گیا ہوا تھا۔ آج کوئی ملاقاتی بھی دیوان خانے میں نظر نہ آتا تھا۔ فرزانہ تنہا کھڑی ہوئی نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔

"ہلو مس فرزانہ۔ آج آپ بہت خاموش ہیں آخر بات کیا ہے؟" سلیمان نے غیر متوقع طور پر خاموشی سے داخل ہوتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دوستوں نے آج آپ کے خلاف کوئی سازش کر رکھی ہے۔ دیکھئے تو آپ کا دیوان خانہ کس قدر خالی پڑا ہے" اور یہ کہتے کہتے سلیمان عجب طرح سے مسکرایا۔ فرزانہ نے اپنے غمگین تصورات کو جھٹک کر علحدہ کر دیا۔ بولی "ہاں دیکھئے تو ایسے لطیف موسم میں سب کے سب مجھے تنہا چھوڑ کر چل دیئے۔ اچھا ہوا آپ آ گئے۔ تشریف رکھئے۔ کہئے مزاج تو اچھا ہے؟"

"بالکل — شکریہ —" سلیمان ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ فرزانہ دریچے ہی میں بیٹھ گئی۔ سلیمان نے کہا "کہئے آپ کی آئندہ دعوت کی فہرست میں میرا نام بھی ہے کہ نہیں — ریاض کہہ رہے تھے کہ آپ موسم بہار کی آمد کے سلسلے میں ایک جشن ترتیب دے رہی ہیں۔"

"جی ہاں — اور آپ کا نام کیسے نہ ہوگا۔ آپ ضرور آئیے گا لیکن پچھلی دفعہ کی طرح عین وقت پر باہر نہ چلے جائیے گا۔" سلیمان پھر مسکرانے لگے "نہیں انشاءاللہ اب کے ایسی غلطی نہ ہو گی۔ سوچتا ہوں تو یہ مجھے اپنی مکمل بدقسمتی معلوم ہوتی ہے کہ میں نے ایک ایسی دعوت کا لطف کھو دیا۔ سنا ہے آپ نے اپنی شیریں آواز سے لوگوں کو بہت محظوظ کیا۔ ممتاز بے انتہا تعریف کر رہے تھے۔ مجھے اب تک نہیں معلوم تھا کہ آپ کو فن موسیقی سے بھی اس قدر لگاؤ ہے۔"

فرزانہ نے محسوس کیا کہ سلیمان کے لہجے میں ایک چھپا ہوا طنز ہے۔ اس نے اس سے پہلے بھی اکثر اس کو محسوس کیا تھا لیکن اس نے کبھی

جواب دینے کی کوشش نہ کی تھی ۔ کیونکہ وہ سلیمان پر کبھی یہ ظاہر کرنا نہ چاہتی تھی کہ وہ اس کی گفتگو کی اصلی روح کو سمجھ گئی ہے ۔ لیکن آج وہ بے اختیار ہو گئی ۔ اس نے کہا " فن موسیقی سے مجھے جیسا کچھ لگاؤ ہے اس کا تو خیر آپ کو کسی آئندہ موقعہ پر اندازہ ہو ہی جائے گا ۔ رہ گیا یہ کہ میری شیریں آواز سے لوگوں نے بہت لطف اٹھایا تو ممکن ہے یہ بھی درست ہو ۔ لوگوں کو خوش کرنا جتنا آپ سمجھتے ہیں اس سے بہت زیادہ آسان ہے ۔" وہ باوجود کوشش کے اپنے لہجے سے طعن آمیز سنجیدگی کے عنصر کو دور نہ کر سکی ۔

" تو آپ کا خیال ہے کہ لوگوں کو خوش کرنے کے معاملے میں میں بہت سست رفتار ہوں ؟" سلیمان نے ہنستے ہوئے کہا " آپ بڑی ذہین ہیں ۔ یعنی اگر آپ مجھے نہ بتائیں تو مجھے اپنی فطرت کا یہ راز ایک طویل عرصے تک نہ معلوم ہوتا ۔" فرزانہ کو غصہ آ رہا تھا کہ آخر اس نے ایسی بات کیوں کہہ دی کہ سلیمان کو اپنی شخصیت سے بحث کرنے کا موقع مل گیا ۔ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے سلیمان نے کہا ۔ " یہ تو بڑی بری بات ہوئی کہ آپ کو میری کمزوریوں کا پتہ لگ گیا اب تو میرے لئے آپ کو خوش کرنا اور بھی دشوار ہو جائے گا ۔" اس آخری فقرے پر فرزانہ کا چہرا سرخ ہو گیا ۔ تاہم اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا ۔ " تو کیا ہوا ۔ میری طرح آپ بھی ایک ساتھ بہت سارے دلوں کو خوش کیا کیجئے ۔ بہت دنوں کے تجربے کے بعد میں نے یہ بات معلوم کی ہے کہ یہ کام نسبتاً ... زیادہ آسان ہے ۔"

فرزانہ نے یہ کہنے کو تو کہہ دیا لیکن اس کی آواز اس قدر خشک تھی کہ بعد میں اسے افسوس ہونے لگا ۔ پھر جب کچھ دیر تک اس نے اپنی بات کا کوئی جواب نہ پایا تو نظر اٹھا کر سلیمان کی طرف دیکھا سلیمان اس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرزانہ کا چہرا ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جسے وہ پڑھنا چاہتا ہے ۔ اس کے چہرے پر اس کی مخصوص طنزیہ مسکراہٹ کے بجائے ایک سنجیدہ تعمق چھایا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک والہانہ جوش چمک رہا تھا ۔ فرزانہ چونک پڑی ۔ گھبرا گئی ۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے اور کیا کرے ۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد اس نے کہا " چائے کا وقت ہو گیا ہے میں آپ کے لئے چائے لے آؤں ۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے اٹھی کہ سلیمان نے اپنی باعظمت اور پروقار آواز میں اسے مخاطب کیا " فرزانہ ۔ ٹھیرو ۔ ابھی نہ جاؤ ۔" فرزانہ رک گئی ۔ لیکن اس نے نہ کچھ کہا اور نہ سلیمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا ۔ وہ بالکل خاموش کھڑی دریچے سے باہر باغ کو دیکھتی رہی پھر اس نے محسوس کیا کہ سلیمان اس کے قریب ہی کھڑا ہے ۔ " فرزانہ " سلیمان نے کہا اور اس کی آواز میں بڑا گداز اور بڑی مٹھاس تھی ۔ " اگر میں تم سے کہوں کہ اس جشن کا خیال ترک کر دو تو تم کیا کرو گی ؟" دھیمی آواز میں فرزانہ نے کہا

" میں آپ سے پوچھوں گی کہ آخر میں ایسا کیوں کروں ؟"

" اور اگر میں تم سے التجا کروں کہ تم میری خاطر جشن کا خیال چھوڑ دو اس وقت تم کیا کرو گی ؟"

" میں پوچھوں گی کہ آپ مجھ سے کیوں التجا کرتے ہیں ؟"

" تو میں کہوں گا ۔ اس لئے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں ' پھر تم کیا کرو گی ؟"

ایک طویل وقفے تک کوئی جواب سنائی نہیں دیا پھر طوفانِ مسرت میں کانپتی ہوئی ایک شیریں آواز بلند ہوئی ۔

" پھر آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گی ۔"

رابعہ اکبر حسن

غزل

دل دیا دل کو غمِ عشق سے آباد کیا — تم سمجھتے ہو کہ تم نے مجھے برباد کیا

مہرباں! حسنِ نوازش نہ سہی جور سہی — کچھ تو ہو جس سے میں سمجھوں کہ مجھے یاد کیا

آج ہے محویتِ شوق کا عالم کچھ اور — جانے کیا شمع نے پروانے سے ارشاد کیا

دل بہلنے کے ہوئے دہر میں سامان بہت — میں نے ہر رنگ میں اے درد تجھے یاد کیا

کچھ اِس انداز سے اس شوخ نے انگڑائی لی — میں یہ سمجھا کہ مری روح کو آزاد کیا

ہر گھڑی دل میں رہا جس کا تصور کاوش

مری تقدیر کہ اس نے نہ مجھے یاد کیا

کاوش

یاسمن

آج ڈیڑھ سال بعد ــــ خواب گاہ کی کھڑکی کے نیچے یاسمن میں آج کلیاں پھوٹی تھیں۔ ہر روز صبح حسینہ ۔ یادِ محبوب میں آنسوؤں کے چند قطرے یاسمن پر ٹپکا دیتی ۔ اور ــــ ہر روز یاسمن کی محبت حسینہ سے بڑھتی ہی جاتی ــــ ناکام محبت وہ کلی سے پھول میں تبدیل ہو گئی ــــ نارسا محبت ــــ لیکن حسینہ نے نہ کبھی اپنی نازک انگلیوں سے اسے چھوا اور نہ ہی ایک پھول توڑ کر اپنے سینے پر آویزاں کیا ــــ آخرکار ــــ ایک دن مالی نے اپنے سخت ہاتھوں سے اسے توڑ لیا ۔ وہ بازار میں جا کر نیلام ہوئی ۔ عطار نے اس کی روح کشید کی ــــ شاعر نے کہا "میں محبوب کی مشام جان تک پہنچنا چاہتا ہوں ــــ" عطار نے کہا "روح یاسمن سے بڑھ کر کوئی وسیلہ نہیں ــــ" شاعر نے کہا "میں محبوب کی شفاف جلد میں خوشبو بن کر سما جانا چاہتا ہوں ــــ" عطار نے کہا "روح یاسمن سے عمدہ کوئی خوشبو نہیں۔" شاعر نے کہا "میں محبوب کو بالکل مدہوش بنا دینا چاہتا ہوں۔" عطار نے کہا "روح یاسمن سے زیادہ کوئی مدہوش کن نہیں۔" عشق کارگر ہوا ــــ یاسمن کی روح زندگی ایک خوبصورت اور نازک شیشے کے ملبوس میں حسینہ کے سنگھار میز پر جا پہنچی ۔ مشام جان تک پہنچنے کے لئے ۔ ضم ہو جانے کے لئے ــــ مدہوش کرنے کے لئے ۔ اور ایک شام ــــ حسینہ نے خوشبوئے محبت سے بے تاب ہو کر کہا

"میں تجھ سے محبت کرتی ہوں" یاسمن کی روح کھل کھلا کر ہواؤں میں بکھر گئی ۔ پپیہے نے کہا ــــ پیہو ۔ پیہو ــــ

(ماخوذ)

شمیم

تصنیف و تالیف

پیشے کے مفہوم میں عام طور پر ایسے تمام مشاغل داخل کئے جاتے ہیں جو انسان سوچ سمجھ کر اپنی فطری مناسبت کے لحاظ سے عمر بھر کے لئے اختیار کرتا ہے ۔ اور اس سے اس کا مقصد اپنی بسر اوقات کے لئے معاش پیدا کرنا ہوتا ہے ۔ پیشے میں یہ دوسرا جز اس قدر اہم ہے کہ اگر اس کو خارج کر دیجئے تو کسی مشغلے کو پیشہ کہنے میں تامل ہوگا ۔ چنانچہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے ایک ایسا پیشہ اختیار کیا ہے جس کو روپے پیسے سے کوئی تعلق نہیں اور کوئی مادی مفاد نہیں رکھتا تو شاید آپ اس کے خبط پر زہر خند کریں ۔ ایسی چیزوں کو " ہابی " یعنے دلچسپی کے مشاغل سے موسوم کیا جاتا ہے ۔

یہ سچ ہے کہ تمام پیشے خواہ وہ نجاری ہو کہ لوہاری کفش دوزی ہو کہ تجارت، معلمی ہو کہ تعلقداری یا نظامت سب کسی نہ کسی مادی فائدے کو پیش نظر رکھتے ہیں اس کے باوجود ہماری ذہنی کیفیت یہ ہے کہ جس مشغلے کا تعلق براہ راست روپیہ پیدا کرنے سے ہو اس کی اہمیت ہماری نظر میں گھٹ جاتی ہے ۔ اس کے برخلاف ایسے تمام مشغلے جو علمی اور عقلی ہوتے ہیں یا جن کا مقصد براہ راست روپیہ پیدا کرنا نہیں معلوم ہوتا، زیادہ وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں ۔ ایسے مشغلوں کے ساتھ "پیشہ" کی اصطلاح استعمال کرنے میں بھی اکثر تامل ہوتا ہے ۔ مثلاً کوئی یہ نہیں کہتا کہ فلاں شخص کا پیشہ شاعری ہے ۔ یا اس نے تصنیف و تالیف کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے ۔ اسی طرح ہم پروفیسری، نظامت، معتمدی یا وزارت کا ذکر بھی پیشہ کی اصطلاح میں عام طور پر نہیں کرتے ۔ اگر کسی ماہر موسیقی مصور یا شاعر کے ساتھ آپ پیشے کے لفظ کا استعمال کریں تو اس سے آپ کا مقصد اس کے فن کی قدر کو گھٹانا ہوتا ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں شاعری اس کا پیشہ ہوگیا ہے یعنے وہ شاعری کے ذریعہ کچھ پیدا کرنا چاہتا ہے ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام ذہنی اور علمی مشغلے جن کے متعلق کسی نہ کسی وجہ سے ہمارے ذہنوں میں یہ عقیدہ قایم ہوگیا ہے کہ "مادی فائدہ کے حاصل کرنے سے انھیں کوئی واسطہ نہیں ہے"، پیشہ کے مفہوم سے اونچے ہیں ۔ نجاری، لوہاری، کفش دوزی وغیرہ جن کا کوئی علمی رشتہ نہیں انھیں ہم جرات کے ساتھ پیشہ کہہ دیتے ہیں ۔ گویا ہماری نظر میں پیشے بھی اسی اصول کے تحت جنچتے ہیں جس اصول سے فنون لطیفہ کے مدارج طے کئے جاتے ہیں ۔ وہ اصول یہ ہے کہ " جو فن جس قدر زیادہ ٹھوس اور مادی ہوگا فنون لطیفہ میں اس کا درجہ اسی قدر ادنیٰ ہوگا " اسی طرح پیشوں کے متعلق ہم یہ اصول وضع کرسکتے ہیں کہ جو پیشہ جس قدر زیادہ ٹھوس اور مادی ہوگا، پیشوں میں اس کا رتبہ اسی قدر گھٹیا ہوگا " ۔

اسی طرح کا کوئی اصول ضرور ہمارے ذہن میں موجود ہوتا ہے جس کی بنا پر ہم ایک معمار کے مشغلے پر معلم کے مشغلے کو ترجیح دیتے ہیں اور شاعر اور مصنف کے مشاغل کو ہم سب پر فضیلت دیتے ہیں کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا مقصد اس کا کارنامہ ہی ہے ۔ اور اسے مادی فائدوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر زمانے میں ہمارے خیال کے مطابق کچھ نہ کچھ مصنف موجود رہے لیکن عام طور پر بڑے بڑے مصنفین کا مقصد بھی کوئی نہ کوئی مادی فائدہ رہا ہے، شکسپیر جس کے ڈرامے مجسم الہام سمجھے جاتے ہیں،

خاص کاروباری شخص تھا۔ ڈرامے لکھنا اور انھیں اسٹیج پر پیش کرنا اس کا پیشہ ہوگیا تھا۔ اس سے اس کی بُرائی مقصود نہیں۔ اگر مصنفین اور مولفین کے حالات ٹٹولے جائیں تو اسی طرح کے واقعات ملیں گے۔ مثلاً انگریزی زبان کا مشہور شاعر اور ناول نویس سر والٹر اسکاٹ ویورلی ناولوں سے اپنے اہلِ عیال کی پرورش کا سامان فراہم کرنا چاہتا تھا۔ شاعر کی حیثیت سے جب اسکاٹ کو کافی شہرت حاصل ہوگئی اور اس کا پہلا قصہ بھی عام طور پر مقبول ہوا تو اس نے آئندہ ناول نگاری پر ساری توجہ صرف کرنے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ معاش کے ذریعے وسیع نہ تھے اس لئے اس نے اپنے ایک سابق ہم جماعت جیمس بیلنٹائین کی مدد سے ایک چھاپہ خانہ کھولنا چاہا بعد میں اس میں اشاعت خانے اور کتب فروشی کی دکان کا بھی اضافہ ہوا۔ لیکن ناتجربہ کاری کی وجہ سے یہ کاروبار بیٹھ گیا اور حصہ داروں پر کئی ہزار کا قرضہ عائد ہوگیا۔ اسکاٹ نے اپنے احساس فرض کی وجہ سے اس قرضے کو پائی پائی ادا کرنے کی ٹھان لی اور اپنے قصوں کی تکمیل شروع کی۔ اس زمانے میں وہ جس بے جلری کے ساتھ کام کرتا تھا اس کا نقشہ اسکاٹ کے سوانح نگار نے نہایت لفیس کھینچا ہے۔ اسکاٹ کو کھڑکی کے پاس بیٹھے اور کام کرتے دیکھ کر ایک شخص کہتا ہے "جب سے ہم یہاں بیٹھے ہیں میں غور سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ ہاتھ چلا ہی جارہا ہے اور کبھی نہیں رکتا صفحہ کے بعد صفحہ ختم ہوتا ہے اور مسودوں کے ڈھیر پر پھینک دیا جاتا ہے پھر بھی وہ بے تکان چلا ہی جاتا ہے۔ اور اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک چراغ روشن نہ ہولیں۔ اور اس کے بعد خدا جانے کب تک یہی حال ہر رات کا ہے۔"

اس محنتِ شاقہ نے اسکاٹ کو لبِ گور پہنچا دیا اور اور مرنے ہی کے بعد اس سے پیچھا چھوٹا۔ ادھر کے اسکاٹ عبدالحلیم شرر کو بھی اس کاروبار کے تمام رازوں کی [illegible] حاصل تھا۔ ان کا اپنا چھاپہ خانہ تھا اشاعت خانہ اور کتب خانہ تھا اور رسالہ دلگداز تھا۔

عوام کی دلچسپی کو قابو میں رکھنے کے لئے وہ دلگداز میں کسی نہ کسی قصے کا سلسلہ جاری رکھتے۔ اور جب وہ ختم ہو جاتے تو علٰحدہ کتاب کی شکل میں شایع کر دیتے۔ ان کے جیسے کثیر تصنیف دنیا کی اور زبانوں میں بھی کم ہی ہوں گے۔

شاہ نصیر دہلوی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ غزلیں لکھتے اور معاوضے پر لوگوں کو فروخت کرتے تھے۔ یہ معاوضہ روپیہ کی شکل میں ہو یا تحفے کی شکل میں شاگردوں سے بھی وہ فرمائشیں کیا کرتے تھے۔ کسی نے ان پر اعتراض کیا تو انھوں نے جواب دیا ... . اس فرمائش کا اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ روز کے آنے والے چوتھے دن غزل لاتے ہیں اس کے علاوہ انسان جس کام کو خرچ کرکے سیکھتا ہے اس کی قدر بھی ہوتی ہے اور شوق بھی پکا ہوتا ہے۔ اور جو کچھ لکھتا ہے جانکاہی سے لکھتا ہے اس کا تو ادھر وہ فائدہ ہوا میرا یہ فائدہ ہوا کہ لے آیا تو چیز آگئی نہ لایا تو میرا پیچھا چھوٹا۔"

غالب نہایت فراخ حوصلہ انسان تھے ان کی آمدنی ان کی داد و دہش سے روبراہ نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لئے انھیں ہمیشہ تنگی کی شکایت رہتی۔ لیکن روپیہ آئے تو کس طرح ؟ شاعری تجارت تو نہیں تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا تھا کہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں رسائی ہو جائے اور کچھ مشاہرہ مقرر ہو جائے۔ لیکن ان کی ٹیڑھی ترچھی چالوں کی شہرت ان کا تیکھا پن، خود داری اور سب سے بڑھ کر یہ کہ استاد ذوق سے چشمک اس میں حارج تھی۔ بہ ہزار دقت رسائی ہوئی بھی تو

سو بار سے کچھ بیٹے ملانے کا وہ انداز تھا جس کا نقشہ غالب نے
اپنے قطعہ میں کھینچا ہے۔

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر   نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

لیکن تنخواہ کا کیا حال ہے۔ فرماتے ہیں۔

میری تنخواہ جو مقرر ہے   اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک   خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات   اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

آخر میں درخواست کرتے ہیں۔

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ   تا نہ ہو مجھ پہ زندگی دشوار

میر تقی میر سنتے آئے تھے ہر زمانے میں بادشاہ اور امرا، شعرا
کی بڑی قدر کرتے تھے کسی امیر نے ایک شاعر کو اشرفیوں میں تلوا دیا
تو کسی بادشاہ نے اپنے ملک الشعراء کا منہ موتی سے بھر دیا۔
لیکن خود ان کے کمال فن کی کیا قدر تھی۔ کوئی اس کا باعزت
خریدار نظر نہیں آتا تھا۔ جیسا کہ فرماتے ہیں۔

حرف و سخن سے مطلق یاں گفتگو نہیں ہے
پیارے سوا ہم کو آئے نظر نفر سب!

اس لئے وہ ریختہ کو پیشہ بنا کر ہمیشہ پچھتاتے رہے چنانچہ ایک
شعر میں کہتے ہیں۔

کسب اور کیا ہوتا عوض ریختہ کے کاش
پچھتائے بہت میر ہم اس کام کو کر کر

اسی طرح کی مثالوں نے اہل قلم اور شاعروں کے افلاس کو
ضرب المثل بنا دیا ہے، ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص کسی فن میں
کمال حاصل کرے اور وہ اس کی وجہ معاش کا براہ راست
ذریعہ نہ بن سکتا ہو تو اس کی زندگی بڑے عذاب میں پڑ جائے گی۔
تنگی اور عسرت کی یہ شکایت اردو یا فارسی زبان کے
شاعروں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ انگریزی کے بڑے بڑے
شاعر اور مصنف بھی اکثر اس کا شکار رہے۔ چنانچہ ڈاکٹر
جانسن، گولڈ اسمتھ اور ان کے اکثر معاصرین مالی پریشانیوں
کی وجہ سے زندگی بھر تکلیفوں میں رہے جانسن نہایت ضابط
آدمی تھا تاہم لارڈ چیسٹر فیلڈ کو اس نے جو خط لکھا ہے اس سے
تصنیف و تالیف کی بے قدری کا بھی پتہ چل سکتا ہے۔ گولڈ اسمتھ
نے انگریزی ادیبوں کی کس مپرسی کا ایک نہایت نفیس خاکہ
اپنے ناول "دی وکار آف ویکفیلڈ" میں کھینچا ہے۔ وکار کا
بیٹا جارج جو ایک نوجوان فلسفی ہے لندن میں تصنیف و تالیف
کے ذریعہ نام پیدا کرنے کا خیال خام لیتا ہوا وہاں وارد
ہوتا ہے اس کا ایک عزیز اس کو مشورہ دیتا ہے۔

"تم ہمت والے اور پڑھے لکھے نوجوان ہو میری طرح
تصنیف کا پیشہ کیوں نہیں اختیار کر لیتے۔ اس میں شک نہیں
کہ تم نے کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ بڑے بڑے ذہین لوگ اس
پیشے میں قدم رکھنے کے بعد بھوکوں مر گئے۔ لیکن اس وقت
میں تم کو بتا سکتا ہوں کہ شہر میں کوئی چالیس کے قریب نہایت
غبی لوگ ایسے ہیں جو تاریخ اور سیاست پر لکھتے ہیں اور نہایت
خوش حالی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر موچی
کے گھر پیدا ہوتے تو تمام عمر جوتے درست کرتے رہتے لیکن انھیں
جوتا بنانا نہ آسکتا۔"

یہ سن کر جارج تصنیف و تالیف کی طرف ڈھل جاتا ہے
اور سب سے پہلی کتاب جو وہ لکھتا ہے اسے کوئی نہیں پوچھتا۔
اس کی بے قدری کی شکایت وہ ان الفاظ میں کرتا ہے "ہر شخص
اپنے دوستوں کی اور اپنی تعریف میں اور اپنے دشمنوں کی مذمت
میں مصروف تھا اور چونکہ میں نہ دوست تھا اور نہ دشمن اس لئے
سب سے زیادہ تکلیف دہ عذاب یعنے کس مپرسی میں مبتلا ہوا"
ایک فہم پسند شخص جارج سے "ایک کافی ہوز" میں

ملتا ہے اور اسے علم وفضل سے آراستہ پاکر اس سے امداد چاہتا ہے اور اپنی تجویزیں سناتا ہے کہ کس طرح وہ کتابیں لکھ کر زندگی بسر کرسکتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

تم شہر سے ناواقف معلوم ہوتے ہو ان تجویزوں کو سنو۔ ان کی بدولت میں نے اپنی عمر کے بارہ سال آرام سے بسر کئے ہیں۔ جونہی کہ کوئی نواب سفر سے واپس آیا میں چندہ کے لئے پیچھا کرتا ہوں پہلے میں خوشامد سے اس کے دل کا محاصرہ کرتا ہوں اور جو رخنہ پڑتا ہے اس میں اپنی تجویزوں کو داخل کرتا ہوں۔ اگر وہ پہلی دفعہ امداد کردے تو دوسری دفعہ میں کتاب کے ڈیڈیکیشن کے نام سے کچھ اور اینٹھ لیتا ہوں۔ اگر یہ بھی مل جائے تو پھر تیسری دفعہ اس کے نشان کو سرنامے پر چھاپنے کے لئے رقم وصول کرتا ہوں۔ اس طرح مزے سے زندگی گذارتا ہوں اور رہتا ہوں۔ ابھی ابھی اٹلی سے ایک امیر آدمی وارد ہوئے ہیں وہ میری تجویزوں سے واقف ہیں اس لئے تمھاری مدد چاہتا ہوں۔ اگر ہم کامیاب ہوئے تو مال غنیمت کو آپس میں تقسیم کرلیں گے"۔

تصنیف وتالیف کی یہ کس مپرسی ڈکنز کے زمانہ تک جاری رہی۔ اور اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ اس وقت تک اس پیشے کا انحصار زیادہ تر دربار اور امیروں کی امداد پر تھا۔ احتیاج زندگی فراہم کرنے کے لئے بعض وقت مصنفین کو طرح طرح کی چالیں چلنی پڑتی تھیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ بلند حوصلہ مصنف ایسی رکیک حرکتیں نہیں کرسکتا تھا اس لئے مالی حیثیت سے پریشانیوں میں گھرا رہتا تھا خواہ اس کے کارناموں کا رتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔

مصنفین کی ان مشکلات میں بڑی کمی طباعت اور اشاعت کی آسانیوں کی وجہ سے پیدا ہونے لگی۔ اس کی بدولت تصنیف وتالیف کا کام اپنے بل بوتے پر جاری رکھنے کے قابل بن سکا۔ اب اس کاروبار کو نہ سلاطین کی سرپرستی کی اتنی ضرورت باقی رہی اور نہ امرا کی امداد کی۔ اس کی بڑی قوت اس کا وہ اثر ہوگیا جو وہ عوام پر پیدا کرسکتا تھا۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مصنفین کا رخ اعلیٰ طبقوں سے عوام کی طرف پھر گیا۔ وہی دراصل ان کے موضوع اور ان کے مخاطب بننے لگے۔ چنانچہ ڈکنز کے اکثر ناول اس رجحان کی ابتدا کو ظاہر کرتے ہیں۔

اردو کی ابتدائی تصنیف وتالیف کا انحصار بھی تمام تر سلاطین اور امرا کی سرپرستی پر رہا۔ متوسط دور میں جب سرپرستوں کے مواقع محدود ہونے لگے تو بڑے بڑے شاعروں نے زحمتیں اٹھائیں۔ رفتہ رفتہ تصنیف وتالیف کا رخ دربار سے پھر کر مخصوص علمی طبقوں کی طرف ہوگیا۔ اس زمانے میں مسجع اور مرصع عبارتوں کے قصے اور اخلاقی کتابیں لکھی گئیں لیکن طباعت اور اشاعت کے کاروبار کو جب سے ترقی ہونے لگی ہمارے مصنفین بھی عوام کی طرف رجوع ہوتے گئے اور اپنی کامیابی کے لئے انھیں کو اپنا سہارا سمجھنے لگے۔ چنانچہ شرر، حالی نذیر احمد، شبلی، اقبال، پریم چند، راشد الخیری، رتن ناتھ سرشار سرور جہاں آبادی غرض موجودہ زمانے کے تمام مصنفین مولفین اور شاعروں کا بھروسہ اپنی ذات اور اپنے قلم پر رہا اور اسی کی بدولت بعضوں نے تھوڑی بہت آرام کی زندگی بسر کی۔ یورپ کے مشہور مصنفین یا خود ہندوستان کے بعض لکھنے والوں جیسے رابندرناتھ ٹیگور کی سی خوش نصیب زندگی ہمارے ہاں کم مصنفین کو حاصل ہوسکی اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے عوام میں پڑھنے کا چسکا ابھی تک پیدا نہیں ہوا یہی چیز کسی مصنف کی کامیاب زندگی کی ضامن ہوتی ہے۔ اگر یہ

نہ ہو تو کوئی اور چیز نہیں جو مصنفین اور مولفین کے شوق کار کا باعث ہوسکے ۔ لامحالہ اوپری جن کی کوششیں روز بروز منظر عام پر آتی رہتی ہیں عوام میں پڑھنے کا شوق نہ ہونے کی وجہ سے ان کا ذوق بھی اونچا نہیں ہوسکتا ورنہ ایسے کارنامے زیادہ سے زیادہ لکھے جانے شروع ہو جاتے جو ہر حیثیت سے بلند پایہ ہوں اشاعت خانوں کی تنظیم نے تصنیف و تالیف کے کام کی خاطر خواہ خدمت انجام دی ۔ اس میں شک نہیں کہ ناشر کی وجہ سے مصنف کے منافع کا ایک حصہ مارا جاتا ہے، لیکن سچ پوچھو تو بہت سے مصنفین جو اپنی کتاب کو چھاپنے کی استطاعت نہیں رکھتے ان کے کارنامے گمنامی میں پڑے رہنے کے خطرے سے محفوظ ہو گئے ۔ بعض وقت یہ کہا جاتا ہے کہ ناشر کے شامل ہو جانے کی وجہ سے مصنف کی خود ارادیت متاثر ہورہی ہے ۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو ۔ لیکن بڑے مصنفین اور سمجھ دار ناشر ایسی چیزوں کو تصنیف و تالیف میں داخل ہونے نہیں دیتے جن سے ان کی عظمت میں فرق آئے ۔ اس کے برخلاف بعض وقت ناشر ہونہار مصنفین کی بڑی اچھی رہبری بھی کر سکتے ہیں ۔

اردو اشاعت خانوں کی تعداد یوں بھی بہت محدود ہے جو کچھ موجود ہیں ان کا دائرۂ عمل وسیع نہیں ہے ۔ بعض کے حساب کتاب اور معاملات قابل بھروسہ نہیں ہیں ۔ اس لئے اہل تصنیف و تالیف کو اس تقسیم کار اور امداد باہمی کے مفید اصول سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے ۔ اس زمانے میں تصنیف و تالیف کے کاروبار کی اگر صحیح مدد ہوسکتی ہے تو وہ اچھے اشاعت خانوں کی تنظیم سے ۔ اسی کی ہمارے مصنفین اور ہمارے ملک کو سخت ضرورت ہے ۔ اس کے بغیر موجودہ زمانے میں تصنیف و تالیف کے پیشے کی کامیابی مشکل ہے ۔

عبدالقادر سروری

صدائے نشور

اسرار عشق نے مرا ایماں بنا دیا　　اللہ رے کفر، جس نے مسلماں بنا دیا

پھیلا کے ایک خرمن گل ہائے آرزو　　مجھ کو اسیر تنگیٔ داماں بنا دیا

اللہ رے التفات کہ اندازِ شرم نے　　ہر جنبشِ نگاہ کو ارماں بنا دیا

فکرِ معاملات نہ اندیشۂ حساب　　اچھا ہوا کہ سوختہ ساماں بنا دیا

کیا بات ہے ترے لئے تکمیلِ آرزو　　اے وہ کہ تو نے خاک سے انساں بنا دیا

تیرے تخیلات نے محفل کو اے نشور
آئینہ رکھ کے سامنے حیراں بنا دیا

نشور واحدی (گورکھپوری)

قطعات

۱

ولولوں کا نقیب، عہدِ شباب
اور یہ پیری ہے، منبر و محراب
یہ جہاں ہے تغیرات کا نام
زندگانی ہے، رعشۂ سیماب

۲

تجھ سے کس کو گلا ہے میرے رفیق
مدتوں سے ہے یہ جہاں کا طریق
فاش کر کے فریبِ زندیقی
بن گیا ہوں میں کافر و زندیق

۳

میرے ہونے میں کیا زیاں تیرا
روندتا ہے مجھے جہاں تیرا
مجھ سے دوری تجھے نہیں پھبتی
میں تو ہوں ایک ترجماں تیرا

۴

قطرہ ہوں مجھ کو بے کنار نہ کر
رہنے دے مجھ کو شرمسار نہ کر
اور اگر تو یہ کھیل کھیلے گا!
حشر میں میرا انتظار نہ کر

۵

دل جو اک دن تھا گرمیٔ محفل
کب کا ہے منتظرِ لبِ ساحل
جب کوئی موج سر اٹھاتی ہے
آہ بھرتا ہے اک بصد مشکل

۶

چار جانب ہے شورِ رستا خیز
سوچ میں غرق ہے دلِ پرویز
اور افلاس کے ستائے ہوئے
کرتے پھرتے ہیں نوکِ خنجر تیز

۷

کس قدر ہے بلند میرا مقام
نقشِ پا ہے مرا یہ ماہِ تمام
عرش کے اس طرف ہے میرا وطن
میرے مذہب میں بے لبسی ہے حرام

احمد ندیم قاسمی

مدیریات

ادارت ایک ایسا مستقل فن ہے جسے صرف مدیر ہی بہ حسن و خوبی انجام دے سکتے ہیں، اگر خدانخواستہ کوئی تاجر اس فن کو ہاتھ لگائے تو نہ صرف فن کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے بلکہ خود تاجر صاحب کو بھی سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور اگر کوئی کاریگر اس میں دخل دے تو سمجھئے کہ بس خیر ہی خیر ہے، کیونکہ ایک طرف تو اس کو خود منہ کی کھانی پڑے گی دوسری طرف اس کے اوزار بیکار پڑے پڑے یا تو زنگ آلود ہو جائیں گے یا کند۔ اسی طرح ہر اس شخص کا حال ہوگا جو غیر مدیر ہو کر بھی مدیر بننا چاہتا ہے، چنانچہ ایسا ہی کچھ حال ہمارا بھی ہوا کہ اس میدان کارزار میں قدم رکھتے ہی ہمیں بھی ایک رسالہ نکال کر رنگ برنگ کی آفتیں مولنی پڑیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ناظرین کو یاد ہوگا کہ ایک عرصہ پہلے ہم نے خاص کر ناظرین ہی کے مطالعہ کے لئے "چلم گزٹ" کے نام سے ایک رسالہ نکالا تھا، مگر وہ مسلسل اس لئے نہیں چل سکا کہ جیسا کہ ہم ابھی عرض کر چکے ہیں، ہم مدیر نہیں ہیں، اس لئے نمونتہً ایک رسالہ نکال کے اب تک خریداروں کا انتظار کرتے بیٹھے ہوئے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اس جنگ کے زمانے میں بھی ہمارے رسالے کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہا ہے حالانکہ جنگ کے زمانہ میں رسالہ سے زیادہ توجہ کا مستحق اور کون ہو سکتا ہے، لہٰذا توقع ہے کہ ناظرین جلد سے جلد ہم غریبوں کی مدد کر کے ہمارے دکھے ہوئے دل کی دعا لیں گے اور ثواب دارین حاصل کریں گے۔

مدد کا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ جو رسالہ ہم نے غلطی سے نکال دیا ہے، حضرات اس کے صفحات کو "وار بانڈز" (War bonds) کے طور پر خرید لیں۔ ناظرین کی سہولت کے مدنظر ہم نے ایک صفحہ کی قیمت پچیس روپے اور ایک ورق کی قیمت پچاس روپے تجویز کی ہے۔ جو حضرات اس سے زیادہ دینا چاہیں خوشی سے دے سکتے ہیں۔ مدد کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ تنخواہ یاب حضرات آدھی تنخواہ خود رکھ لیں اور آدھی ہمارے پاس بھیج دیا کریں، اس سے دونوں کو سہولت ہو گی۔ ساتھ ہی ساتھ قربانی کے وقت بھی ہم غریبوں کو نہ بھولیں، گوشت، چمڑا، ہڈی، کھر جو بھی آپ روانہ فرما دیں قبول کر لیا جائے گا۔ بس اس سے زیادہ اور کیا عرض کریں، یاد رکھئے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں آپ ہی کے لئے کر رہے ہیں کیونکہ رسالہ آپ ہی کے لئے تو ہو گا۔ اور پھر جس معیار کا وہ رسالہ ہوگا اس کا اندازہ تو آپ دیکھ کر ہی بخوبی لگا سکیں گے۔

افسوس ہے کہ آج کل ادب کی حالت اس قدر تباہ ہو رہی ہے کہ اس کی صحیح حالت کا نقشہ کھینچنا آپ اپنے منہ میاں مٹھو بننا ہے، لیکن پھر بھی ایک مقدمۂ کتاب کے طور پر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کا نقشہ کھینچ کر ہی رہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شہروں اور ملکوں کی آب و ہوا کا اثر وہاں کی معاشرت و اخلاق شعر و ادب پر بھی پڑتا ہے۔ اس لئے کسی ملک کا نقشہ کھینچنا گویا وہاں کے شعر و ادب کا بھی نقشہ کھینچنا ہے۔ پس ہم ہندستان کا ادب معلوم کرنے کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندستان کا نقشہ کھینچ دیں۔

چنانچہ ہندستان ایک وسیع جزیرہ نما ہے، جس کے تین طرف پانی اور ایک طرف پہاڑ ہے یعنے شمال میں کوہ ہمالیہ کا سر بہ فلک پہاڑی سلسلہ ہے، جنوب میں بحر ہند، مشرق میں خلیج بنگال اور مغرب میں بحیرۂ عرب واقع ہے۔

چونکہ ہندستان خط استوا سے قریب واقع ہوا ہے، یہاں کی آب و ہوا اگرم سمجھی جاتی ہے، اور جہاں گرمی زیادہ ہوتی ہے وہاں کے لوگ عموماً فسادی، بدطینت اور خود غرض واقع ہوتے ہیں، لیکن یہ بات کچھ غلط سی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ ہندستان میں عموماً لیڈر اس کام کو انجام دیتے ہیں، اور لیڈروں کی قوم پرستی، سیاسی جوش، باہمی رواداری، معاشی ترقی، اور ابنائے وطن سے ہمدردی کے جذبات ان کی زبان کے ہر ہر لفظ سے ٹپکے پڑتے ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ یہاں کے جھگڑے فساد اور قتل و خون وغیرہ کو ان کے نام نامی سے معنون کرنے کی عزت حاصل کی جائے، جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

حدود اربعہ، موقعہ محل اور آب و ہوا کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی پیداوار کا بھی سرسری طور پر ذکر کر دیا جائے۔

پیداوار میں یہاں کئی چیزیں قابل ذکر ہیں، مثلاً باجرہ، مکئی، جوار، چاول، گیہوں، روئی، آم، انگور، میتھی کی بھاجی سویا، پالک، اروی، ترئی، بھنڈی وغیرہ۔ ان میں بھی چاول، گیہوں، روئی وغیرہ بہ کثرت ہوتے ہیں اور ان سے بڑھ کر آدمیوں کی پیداوار کے لئے ہندستان خاص طور پر مشہور ہے، آدمیوں کی کثرت معاشی خوش حالی کی مانع ہے، اور معاشی بدحالی خوبیٔ دماغ میں حارج اور قصور دماغ ارتقائے ادب میں حائل۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل جتنے رسالے نکل رہے ہیں، ان سب کا معیار گرا ہوا ہے، اگرچہ رسالے والوں کو دعویٰ ہے کہ وہ ادب کی بہت بڑی خدمت کر رہے ہیں، مگر صحیح معنے میں تو کسی کا بھی زر پرستی، سطحی شہرت، خود غرضی اور چند لچر چیزیں پیش کر کے پیسے کمانے کے سوا اور کوئی مقصد نہیں۔

البتہ بعض ایسے بھی ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ادب میں بھی کافی حصہ لے رہے ہیں مگر ان کی حالت بھی اس معیار پر نہیں پہنچی جس پر کہ پہنچنی چاہیے۔

غرض ان ہی خامیوں کو محسوس کر کے قومی جوش اور ادبی خروش نے ہمیں مجبور کر دیا کہ علم و ادب کا ایک ایسا رسالہ جاری کیا جائے جو اپنی نظیر آپ سمجھے۔

پس ناظرین میں یہ خبر وحشت اثر مسرت سے سنی جائے گی کہ ہم بھی ایک رسالہ نکال رہے ہیں۔ نکال کیا رہے ہیں، یوں سمجھ لیجئے کہ نکال چکے ہیں، لیکن صحیح معنے میں ابھی منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ پھر بھی اس کی مانگ اور ہر دلعزیزی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف پہلی اشاعت کے متعلق دنیا کے گوشہ گوشہ سے اتنے تعریفی خطوط آ رہے ہیں کہ یہاں ان کی تشریح کو ہم خلاف تہذیب سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ گنجائش اتنی کھپ جائے گی کہ مفید مضامین نہ دئے جا سکیں گے، البتہ اگر ان آنے والے خطوط کی رفتار یہی رہی تو ہم آئندہ سے ان خطوط کا بھی ایک ماہوار رسالہ نکالنا شروع کر دیں گے، اور یقین ہے کہ ایسے خطوط تو ضرور ہی آیا کریں گے کیونکہ یہ ہر ایڈیٹر کا طریقہ رہا ہے کہ جب کبھی وہ رسالہ نکالتا ہے تو فوراً پہلی ہی اشاعت سے۔ بلکہ بسا اوقات تو اشاعت کے خیال ہی سے ـــــ اس کے پاس تعریفی خطوط آنے شروع ہو جاتے ہیں، البتہ خریدار نہیں ملتے۔ پس، اگر ہمارے رسالہ کو بھی خطوط آئیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

غرض، ان حالات کے تحت آپ ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارا رسالہ کتنی آسانی اور تیزی سے لوگوں کے دلوں پر چڑھ جائے گا۔ فی الحال تو اس کے ہاتھ، پاؤں اور کھر، پنجے پیدا ہوتے جا رہے ہیں تاکہ جو حضرات نرم دل ہیں ان کے دلوں پر ہاتھ پاؤں ہی سے چڑھنے میں آسانی رہے، اور جو سخت دل ہیں ان کے دلوں پر چڑھنے کے لئے کھر، پنجوں کا استعمال کیا جا سکے

مخفی مباد کہ یہ کھڑ پنچوں سے چڑھنے کا تخیل ہمارے رسالے نے کری اور بلی سے لیا ہے۔

یوں تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر مدیر اپنے رسالہ کے متعلق یہی لکھتا ہے کہ اس کے پاس تعریفی خطوط آرہے ہیں، لیکن جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ لوگوں کے لکھنے اور ہمارے لکھنے میں کتنا بڑا فرق ہے۔

اس کے ثبوت کے لئے ہم یہاں چند مشاہیر عالم کے خطوط پیش کر دینا چاہتے ہیں تاکہ آپ کو تصفیہ کرنے میں آسانی ہو، لیکن چونکہ اصلی خطوط پیش نہیں کئے جا سکتے، مجبوراً ذیل میں ان کی نقل لکھ دینے کی کوشش کی جاتی ہے:۔

غور کیجئے کیا لکھتے ہیں، عالی جناب نواب "عماد البیگ" صاحب چیچک برار آف تعلقہ آرمور:۔

"حضرت ایڈیٹر صاحب!

میں سن رہا ہوں کہ آج کل آپ ایک رسالہ نکال رہے ہیں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ وہ رسالہ بہت اچھا ہوگا۔ براہِ کرم میرے نام پر ایک سال کے لئے جاری کر کے ممنون فرمائیے گا ۔ چندہ کے متعلق آپ اطمینان رکھیں کہ جب میں وہاں آؤں گا تو آپ کو اور آپ کے بچوں کو چیچک کے ٹیکے لگا دوں گا۔ ٹیکوں کی فیس میں سے رسالہ کا چندہ نکال کر جو کچھ بچ رہے خاکسار کو دیدیجئے گا۔ فقط

آپ کے رسالہ کا منتظر

"عماد البیگ"

مولانا انتشار الدین خاں صاحب سینیٹری انسپکٹر موضع کھام گاؤں:۔

گرامی مدیر!

پس از ادائے آداب و تسلیم، بندہ عرض پرداز ہے کہ آپ کا مکتوب گرامی پہنچا، کوائف مندرجہ سے آگاہی بخشا۔

دیگر کیفیت یہ ہے کہ بندہ یہاں بفضل خدا مع خورد و کلاں خیریت سے رہ کر خیریت آپ جمیع خورد و کلاں کی بہ درگاہِ کریم و کارساز سے شب و روز، ہمیشہ نیک چاہتا ہوں۔

دیگر کیفیت یہ ہے کہ آپ کے رسالے کا نمونہ پہنچا۔ بہت بہت شکریہ۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اسی طرح آتا رہے گا۔

آج کل مصروفیت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ میں آپ کا رسالہ نہیں دیکھ سکا۔ آپ نے مجھ ناچیز سے اس کے متعلق رائے طلب کی ہے۔ بجا میں کیا، اور میری رائے کیا۔ بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ اچھا ہی ہوگا، کیونکہ آپ جیسا قابل شخص نکال رہا ہے۔

شروع میں مشاہیر کی رائے اور تقریظ بھی لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بہت اچھا اقدام ہے، کیونکہ اس سے ہم جیسے سیدھے سادے لوگوں پر اچھا اثر پڑنے کا امکان ہے۔ باقی خیریت۔

خیراندیش

فدوی "انتشار الدین خاں"

مولوی اعتبار میاں صاحب ہیزم فروش کمیلہ قصاباں، بوندی مکرنی!

آپ کا رسالہ ملا۔ پسند آیا۔ خصوصاً اس میں لکڑی کے کرتب، تجارت اور نرخ کا جو خاص باب رکھا ہے، وہ غیر معمولی طور پر مفید ہے، نہ صرف شعر و ادب کے لحاظ سے، بلکہ فنون سپہ گری اور امور خانہ داری کے اعتبار سے بھی۔ میں آپ کو اس قابلانہ کوشش پر مبارک باد دیتا ہوں۔

آپ کی حسب خواہش ہمارے کھاتے میں ایک رسالہ ہمارے نام جاری کر کے ممنون فرمائیے۔

افسوس ہے کہ ہیمہ سوختنی کی بہت سی ہنڈیاں

آئی ہوئی ہیں، اس لئے کوئی تفصیلی جواب نہیں لکھ سکتا معاف فرمائیے گا۔

یہ سن کر مسرت ہوئی کہ آپ کا رسالہ پہلے ہفتہ وار تھا پھر نیم ماہی ہوا اور اب ماہانہ۔ خدا کرے کہ اسی طرح ترقی کرتے کرتے سہ ماہی، ششماہی بلکہ سالانہ تک پہنچ جائے۔

خاکسار
"اعتبار"

ان مشاہیر مقامی کے علاوہ حسب ذیل مشاہیر عالم نے بھی سنا ہے، ہمارے رسالہ کے متعلق اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار فرمایا ہے:۔

اقبال "رسالہ اچھا ہو تو اچھا ہے"
ٹیگور "رسالہ کافی ہے"
جناح "ادب میں رسالہ اور رسالہ میں ادب ہے" (وغیرہ)

ان آراء کے اظہار کے بعد ہم ذیل میں اس رسالہ کے چند اہم مقاصد گنا دینا چاہتے ہیں، تاکہ لوگوں پر اس کی اہمیت واضح ہو جائے:۔

(۱) ادب میں ایک غیر معمولی اضافہ کرنا (۲) بہترین معیاری نظم و نثر شایع کرنا (۳) ہندی اردو کے جھگڑے کو ہندستان کی سرحد سے بڑھانا (۴) تمام سادہ لوح حضرات سے کسی نہ کسی طرح چندہ وصول کرنا (۵) قوم اور لیڈروں کی خدمت کرنا۔ (۶) اضلاع کے خریداروں کو ٹپہ کے ذریعہ بھیجنا۔ (۷) ہر قسم کی دواؤں، کتب فروشوں اور کوک شاستروں کے اشتہارات شایع کرنا (۸) مضامین شایع کرنے کے لئے معاوضہ لینا۔ (۹) ٹائیٹل پر نہایت دلکش اور جاذب نظر تصویریں کھینچنا۔ (۱۰) ملک کے مشاہیر کی اموات کی خبریں شایع کرنا، تعزیتی قرارداد منظور کرنا، اور مرحوم کے لئے "صبر جمیل" اور اس کے پس ماندوں کے لئے دعائے مغفرت مانگنا (۱۱) اگر کبھی بارش نہ ہو تو امساک باراں کے لئے دعا کرنا (۱۲) ہندو مسلم اتحاد کے لئے بے جا کوشش کرنا (وغیرہ)

وہ مقامات جہاں یہ رسالہ جاتا ہے:۔ امریکہ، آفریقہ آسٹریلیا، یورپ، ایشیا، بھاگل پور، جاپان، وزیرستان انگلستان، بلجیم، اٹلی، جرمنی وغیرہ۔

اس سے بھی رسالہ کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ملکی رسالہ ہونے کے باوجود غیر ممالک میں اس کی اس قدر مانگ ہے اور ہندستان میں کوئی پوچھ کر بھی نہیں دیکھتا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ناظرین کرام بہت جلد اس کی طرف توجہ فرمائیں گے۔

سالانہ چندہ ممالک یگانہ سے پچیس روپے اور ممالک بیگانہ سے پچاس شلنگ۔

اور جو حضرات بہ یک وقت دو رسالے منگائیں انھیں محصول ڈاک معاف کر دیا جائے گا، اور جو تین منگائیں انھیں رسالے کے خاص نمبروں کے علاوہ سالانہ ایک نسخہ "قیومی جنتری" اور ایک لکس (LUX) صابن کی ٹکیہ بہ طور انعام دی جائے گی، اور جو حضرات انعام کے نام سے نہیں لینا چاہتے، انھیں "مدیر کے تبرک" کے نام سے پیش کی جائے گی۔ باقی خیریت البتہ آرڈر کا انتظار بے چینی کے ساتھ رہے گا

خاکسار
"مدیر رسالہ"

سید علی شاکر

عید کے دن

بندرگاہ عدن کے مشرقی ساحل پر بنے ہوئے، دور تک
ملاحوں اور ماہی گیروں کے جھونپڑے بڑا دلکش منظر پیش کرتے ہیں
طلوع آفتاب کے وقت کنارے پر بسنے والے ملاحوں کے لڑکے ریتی سے
کھیلتے یا پانی میں ڈبکی لگاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، ان کے گندمی
جسم پر ایک ہی قسم کا موٹا تہمد بندھا ہوتا ہے، جو ہر لحاظ سے
ان کے لئے موزوں سمجھا جاتا ہے۔ ان دلفریب قدرتی نظاروں کی سیر
میں اپنے دوست مسعود کے ساتھ کئی دنوں تک کرتا رہا مسعود کے والد
الیاس محمود نے ایک عرصے سے عدن اور اس کے نواح میں موٹریں
چلانے کا ٹھیکہ حکومت سے لے رکھا تھا۔ وہاں ان کا کاروبار نہایت
سرگرمی اور بہترین طریقے کے ساتھ چل رہا تھا۔ اب انھوں نے عدن میں
ایک عالیشان جرمنی وضع کی کوٹھی بھی تیار کرلی تھی، انھیں ہندستان
چھوڑے دس بارہ سال گذر گئے لیکن مسعود اپنی تعلیم کے سلسلے میں
الہ آباد ہی میں اپنے چچا کے یہاں مقیم رہا۔ اب جب کہ وہ اپنی بہن کی
شادی میں شرکت کی غرض سے گھر جا رہا تھا۔ مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے
پر مجبور کیا، کالج کو موسمی چھٹیاں مل چکی تھیں، اس لئے مجھے اس کا ساتھ
دینے میں کوئی عذر نہ تھا۔

ہم دونوں اس کے والد کی موٹر میں بہت دور دور تک
ریتیلے میدانوں اور سمندری ساحل پر گھوما کرتے، یا بعض وقت چھوٹی چھوٹی
کشتیوں پر بیٹھ کر سمندر کی سیر کیا کرتے، اور رات گئے تک ان دلچسپ مناظر
سے لطف اندوز ہوتے۔

مسعود جدہ جا رہا تھا، جہاں اس کی بہن بیاہی گئی تھی،
میں اپنی ناسازیٔ مزاج کی وجہ سے اس کے ساتھ نہ جا سکا، دوسرے
دن میں تنہا موٹر لئے گھر سے نکلا دوپہر ہو چکی تھی، لیکن سورج کی تیز روشنی
میں ریت کے ذرات ابھی تک چمک رہے تھے، مختلف مقامات کی سیر کرتا ہوا
میں ان ملاحوں کے جھونپڑوں کے قریب پہونچا، جہاں ساکن سمندر حدِ نگاہ
تک تختۂ نور بنا ہوا تھا۔ سورج ساحل سمندر پر غروب ہو رہا تھا۔ اس کی
زرپاش کرنوں سے ساری فضا رنگینیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس دلکش
نظر فریب نظارے نے میرے جذبات کو ابھارا اور مجبور کیا کہ ایسے سنہری
موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دوں،

ایک چھوٹی سی کشتی میں نے کرایہ پر لی، اور سیر کی ٹھانی،
اف، کس قدر ولولہ خیز منظر تھا وہ، ہر طرف کیف و نور کی بارش
ہو رہی تھی، آبی پرندے میری کشتی کا طواف کر رہے تھے، سورج
آدھے سے زیادہ پانی میں ڈوب چکا تھا اک بےخودی کے عالم میں
میں اپنی کشتی کو تیزی کے ساتھ کھینے لگا، تنہائی کا خیال بالکل
میرے دل سے مٹ چکا تھا یہاں تک کہ میں ساحل سے ایک
فرلانگ آگے نکل گیا۔ شام کی سیاہی آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی۔ پانی
میں بھیگی ہوئیں خنک ہوائیں میرے دل میں ایک گدگدی سی پیدا کر
رہی تھیں میں اب گا رہا تھا شاید ع

آشوخ سنہری موجوں سے — ہم دل کی نیا کھیویں گے

چند لمحوں کے اندر اندر ہواؤں نے اپنا رخ بدلا، اور موجوں میں ایک
اضطراب سا پیدا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے میری کشتی میں بھی ہلچل پیدا ہو
گئی، میں گھبرا سا گیا، معاً کئی خوفناک خیالات نے میرے سکون و
مسرت کی دنیا کا شیرازہ بکھیر دیا، اتنی تاریک رات ان طوفانی
ہواؤں کے تھپیڑوں میں ان سیل تن موجوں کے زد میں۔ اف خدا
میرا دل کانپ اٹھا۔ فوراً میں نے کشتی کا رخ ساحل کی طرف پھیر لیا
اور تیز تیز چپو گھمانے لگا، ہواؤں کا زور بدستور بڑھ رہا تھا۔
اور پانی کی موجیں خود بخود درندوں کی طرح خوفناک آواز کے ساتھ
میری کشتی پر حملہ کرنے کے لئے جھپٹ رہی تھیں، جتنا بھی جلد ممکن ہو سکا
میں نے کنارے پر پہونچنے کی کوشش کی، سردی کی شدت سے میرا

سارا بدن تھر تھرا رہا تھا۔ اور چپو چلانے والے ہاتھ کسی قدر شل ہو گئے تھے، لیکن میں نے ہمت و استقلال کو کام میں لاکر دل کو ڈھارس دی، اور جوں توں کر کے ساحل کے قریب تک پہونچا لیکن تاریکی میں میری کشتی طوفانی موجوں کی زد میں آکر ساحل سے ٹکرا گئی اور میں بے تحاشا کنارے پر آگرا، ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے مجھے زبردست گھونسے کے ساتھ نیچے گرا دیا ہو میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا اور نہ معلوم اس کے بعد کیا ہوا لیکن صبح جب آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ایک جھونپڑے میں لیٹا ہوا پایا، اس وقت میرے تمام اعضا میں شدت کے ساتھ درد ہو رہا تھا، مری حیرت و استعجاب میں ڈوبی ہوئی نگاہیں، جھونپڑے کے کونے کونے کا جائزہ لے رہی تھیں، میرے قریب ایک سن رسیدہ شخص کھڑا ہوا تھا، میں یہاں کہاں ؟ مجھے کیا ہو گیا تھا، تم کون ہو ؟ میری کار کہاں ہے، بدحواسی کے عالم میں میں نے متواتر سوالات اس سے کئے، آپ بے فکر رہیں بڈھے نے ہمدردی کے لہجے میں کہا، آپ میرے مہمان ہیں لیکن یہ بتاؤ مجھے کیا ہو گیا تھا، میں نے پھر اس سے سوال کیا۔

رات آپ ہمارے جھونپڑے کے قریب بے ہوش پڑے ہوئے تھے شاید آپ کی کشتی ساحل سے ٹکرا گئی ہو گی۔ آپ مطمئن رہئے، جناب آپ کی گاڑی بالکل محفوظ حالت میں ہے، آپ بڑے مہربان ہیں میں نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا، میں آپ کا ممنون ہوں آپ نے میری جان بچائی،

یہ ہمارا فرض ہے جناب، میں نے اپنی عمر میں کئی ڈوبنے والوں کی جانیں بچائی ہیں، بڈھے کی دھنسی ہوئی مگر دور آنکھیں غرور و تمکنت سے چمک اٹھیں، ایک دفعہ تو ــــ خیر ان باتوں کو چھوڑیئے آپ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، آرام کیجئے۔ نہیں، میں بالکل اچھا ہوں، آپ مجھے گھر جانے کی اجازت دیجئے۔ یہ کیسے ہو گا حضور، آپ بغیر کھائے پیئے ہمارے گھر سے نہیں جاسکتے۔ میری لڑکی بھی کچھ دیر میں آپ کے لئے تازہ غذا لے آئے گی اور وہ اب آتی ہی ہوگی، جناب آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گے، وہ بہت اچھے اخلاق کی خوبصورت لڑکی ہے اس کی ماں اسے تین سال کی عمر میں میرے سپرد کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی بڈھے کی آنکھیں بھولی ہوئی باتوں کو دہراتے ہوئے نم آلود ہو گئیں۔

یہی لڑکی میرے اندھیرے گھر کا اجالا ہے، اس نے اپنے سکڑے ہوئے گالوں پر ڈھلکنے والے آنسو پونچھے۔

' دیکھو! وہ آرہی ہے بڈھے نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کے قریب جا کر کہا، میں نے دیکھا، واقعی وہ آنے والی لڑکی حسین ہے اس کی چال میں غضب کی شوخی تھی، بے پروائی کے ساتھ اس نے اپنے بال دونوں شانوں پر بکھیر رکھے تھے، لڑکی نے دور سے مجھے اپنے جھونپڑے میں کھڑے ہوئے دیکھا، اس کی ادھر ادھر گھومنے والی نگاہیں زمین کے ذرات کا جائزہ لینے لگیں اس کی رفتار میں قدرے کمی آگئی تھی "آؤ سمیہ" بڈھے باپ نے محبت بھرے لہجہ میں کہا، ہمارے مہمان بڑے اچھے آدمی ہیں، لڑکی اندر داخل ہوئی، اور دلربایانہ انداز کے ساتھ اپنی ٹوکری کو باپ کے سامنے لا رکھا، آپ نے فضول تکلیف کی، میں نے اخلاقاً بڈھے سے کہا، بڈھے ماہی گیر نے شاید میرے جملے کو نہ سنا ہو، لڑکی پانی لینے کے لئے باہر گئی ہوئی تھی، انجیر بہت زیادہ لذیذ ہوتے ہیں، اور یہ کھجور بھی، ہاں، یہ نعمت تو صرف خدا نے آپ لوگوں کو دی ہے۔ کھائیے حضور، لیکن اتنے زیادہ میں کیسے کھا سکتا ہوں، آپ لوگ بھی۔ میں نے لڑکی کی طرف نگاہ کی جو پانی کا برتن لئے کھڑی تھی۔ ہم لوگ یہ نہیں کھاتے، لڑکی نے دبی ہوئی آواز میں شوخی کے ساتھ کہا، باپ مسکرا دیا، اس کے بے ترتیب دانت باہر نکل کر بدنما دکھائی دینے لگے، ہاں جناب ہم غریب ہیں، ایسی چیزیں روز کہاں سے کھائیں، یہاں امیر غریب کی بات ہی کیا ہے، بڈھے نے کچھ نہیں کہا،

اور لڑکی کی نگاہیں جھک گئیں۔ میں آپ کے بغیر ایک پھل بھی نہیں کھاؤں گا، لیکن ہم اتنے سویرے کھانے کے عادی نہیں، اور مجھ سے بھی اتنے سویرے نہ کھایا جائے گا آپ نے فضول زحمت کی، مجبوراً بڈھا اور اس کی بیٹی راضی ہوئے، ناشتہ ختم کرکے میں اپنے عزیز محسنوں کا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوا، میں ان کے بلند اور پاکیزہ اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ تقریباً میں ہر روز ان سے ملنے کے لئے سمندر کے کنارے آتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان کی پرلطف صحبت میں گذار کر واپس ہوتا،

بڈھا ابراہیم اور اس کی بیٹی سمیہ دونوں دن بھر مچھلیوں کا شکار کرتے، اور شام کو انھیں بازار میں فروخت کرکے اپنی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرتے۔ مسعود چار دن جدہ میں گذار کر واپس آیا میں نے اس سے اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے والے واقعات بیان کئے، وہ بھی ابراہیم اور اس کی بیٹی سمیہ سے ملنے کے لئے مشتاق تھا مسعود کے گھر اس سال عید کی تیاریاں بڑے شاندار طریقے سے کی جارہی تھیں، اس کے والد نے اس سلسلے میں اپنے کئی ایک احباب کو بھی مدعو کیا تھا، جن سے میرا تعارف کرانا چاہتے تھے۔ عید کے ایک دن پہلے میں اور مسعود سمیہ سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے، ہماری موٹر اس کے جھونپڑے کے قریب جا رکی، سمیہ موٹر کی ہارن کی آواز سن کر دوڑی ہوئی آئی لیکن مسعود کی موجودگی سے قدرے جھجک گئی۔

سمیہ، یہ میرے دوست مسٹر مسعود ہیں، ان کے والد یہاں کی موٹر کمپنی کے مالک ہیں، مختصر سے تعارف کے بعد سمیہ ہم دونوں کو اندر جھونپڑے میں لے گئی، اس کا باپ سو رہا تھا اس نے مسعود سے تعارف کروانے کی خاطر جگانا چاہا۔ لیکن میں نے اسے منع کیا کہ پھر کبھی وہ ان سے مل لیں گے، پھر سمیہ نے ہمارے آگے مچھلی کے بھونے ہوئے کباب اور قہوہ پیش کیا، ہم نے نہایت مسرت کے ساتھ اس کی دعوت قبول کی، کھانے سے فارغ ہو کر ہم تینوں پانی کے قریب کی چٹان پر بیٹھ گئے۔

شاید کل ہم نہ آسکیں گے سمیہ، کیوں؟ کل آپ کہاں جارہے ہیں سمیہ نے دریافت کیا، کل ہمارے یہاں عید ہے۔ اوں، کیا آپ کے یہاں عید میں کسی سے ملنے کی اجازت نہیں، اس کے پیر پانی کی سنہری موجوں سے کھیل رہے تھے نہیں یہ بات نہیں مسعود نے کہا 'کل دن بھر ابا کے دوستوں سے ملنا ہوگا وہ سب ہمارے گھر بلائے گئے ہیں، اور تم نہیں آؤ گی سمیہ میں نے اس سے دریافت کیا'؟ ہم آکر کیا کریں' سمیہ نے معصومانہ انداز میں کہا' مل لوگی' اور کیا؟ یہاں ابا اکیلے رہیں گے اس نے مغموم چہرہ بنا کر کہا' آپ نہیں آئیں گے کیا؟ ہمارے یہاں بھی عید ہے' کیوں نہیں ضرور آئیں گے، مسعود نے جواب دیا' ہم تین چار بجے مہمانوں سے نبٹ کر تم سے ملنے آئیں گے، ہم اس سے رخصت ہو کر موٹر میں آبیٹھے' دور تک سمیہ اپنا ہاتھ ہلاتی رہی۔

نماز کے بعد جو مہمانوں کا تانتا لگا رہا تو مشکل سے چار بجے رہائی ملی۔ مسعود کے والد الیاس محمود آج بڑے مصروف اور خوش نظر آرہے تھے انھوں نے ہر ایک سے میرا تعارف کروایا۔ میں اور مسعود، سمیہ سے ملنے کے لئے بے چین تھے' اور موقع کے متلاشی تھے کہ کسی طرح کوئی بہانہ تراش کر رفوچکر ہو جائیں۔ آج ہم شکار کھیلنے جائیں گے،' مسعود نے اپنے ابا سے ڈرتے ڈرتے کہا،' دن بھر تھکنے کے بعد،' اس کی والدہ نے ڈانٹ کر کہا' نہیں چچی ہم شکار نہیں کھیلیں گے۔ میں نے موقع کا لحاظ کرتے ہوئے پہلو بدل کر کہا' ویسے ہی سمندر کی سیر کرنے جائیں گے۔ ذرا جلدی چلے آنا بیٹا' ہمیں اجازت مل گئی۔ ہم خوش خوش سمیہ سے عید ملنے کے لئے روانہ ہوئے' نہ جانے سمیہ کب سے ہمارے لئے اپنے مکان کے سامنے والی چٹان پر مجسمہ انتظار بنی بیٹھی تھی' دور سے اس نے ہماری موٹر کو آتے دیکھا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی' دوڑی ہوئی وہ موٹر تک آئی وہ بے حد حسین معلوم ہو رہی تھی' عربی ملبوس اس کے جسم پر کھلا جا رہا تھا'

بے ساختہ وہ مجھ سے چمٹ گئی، اس کی بڑی بڑی آنکھیں غیر معمولی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں، سمیہ عید مبارک، مسعود نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا، آپ نے بہت دیر لگائی، اس نے شکایتی لہجہ میں کہا، میں نے خیال کیا شاید آج آپ نہیں آئیں گے، چلئے، ابا آپ کا کب سے انتظار کر رہے ہیں۔ ہم تینوں جھونپڑے میں داخل ہوئے، بڈھا ماہی گیر کھجور کی چٹائی پر بیٹھا ہوا والہانہ جذبات میں عربی گیت گا رہا تھا، اس کی آواز سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی رقت آمیز تھی، اور آنکھیں نم آلود ابا جعفری آگئے، لڑکی نے اپنے باپ کے گلے میں باہیں حمائل کرتے ہوئے کہا، بڈھا فرط مسرت سے میری طرف بڑھا، قبل اس کے کہ میں اس کے سامنے سر کو خم کروں اس نے مجھے چمٹا لیا، اس کے سینے کے اتار چڑھاؤ سے میں نے محسوس کیا کہ وہ سسکیاں بھر رہا ہے، سمیہ اس منظر کی تاب نہ لاسکی، اس نے آنسوؤں کے چند قطرے اپنے دامن میں جذب کرلئے مسعود بھی ہماری محبت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا

ان سے ملئے ابا، آپ جعفری صاحب کے دوست مسٹر مسعود ہیں، سمیہ نے تعارفی لہجہ میں باپ سے کہا، ابراہیم مسعود سے بغلگیر ہوا، بیٹھ جاؤ بیٹا، اس نے کہا، سمیہ آج بے انتہا خوش تھی، اس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ، غیر معمولی مسرت کا اظہار کر رہی تھی، اس نے ہمارے آگے مچھلی کے کباب، روٹی اور دودھ میں بھیگے ہوئے کھجور اور کچھ تازہ پھل لا رکھے، آج آپ کی دعوت ہے، اس نے سادگی کے لہجہ میں کہا، دوشیزگی کی رعنائیاں اس پر نثار ہو رہی تھیں بے پروائی کے ساتھ اس نے اپنے بالوں کو سینے پر لا ڈالا تھا، بہت خوب، ہم ضرور کھائیں گے، بڈھا ابراہیم بھی آج ہمارے شریک طعام رہا۔ یقین مانئے ایسی پر لطف دعوت ہم نے کبھی نہیں کھائی، ایک غیر معمولی خوشی ہم اس دعوت میں محسوس کر رہے تھے، سمیہ کے باپ نے معدے کا عذر کر کے صرف دودھ ہی پر اکتفا کی کھانے کے بعد سمیہ نے کہا، ابا آج ہم سمندر کی سیر کریں گے۔

نہیں سمندر کی فضا کچھ خراب سی معلوم ہوتی ہے، کچھ ہو ہم سمندر کی سیر ضرور کریں گے۔ نادان لڑکی اس کے باپ نے ذرا تند لہجے میں کہا، تو اپنے ساتھ دوسروں کو بھی پریشان کرنا چاہتی ہے، میں نے کہا اچھا سمیہ ہم پھر کبھی سمندر کی سیر کریں گے اب جانے دو، پھر کبھی کب؟ اس نے منہ بنا کر کہا، اور آج کیا کریں گے ہم، آج گائیں اور بجائیں گے مسعود نے کہا، بھولی سمیہ کھلکھلا اٹھی۔ کون آپ؟ نہیں آپ کے دوست جعفری: یہ شاعر ہیں اور گاتے بھی خوب ہیں، لیکن انصاف کی بات اگر پوچھی جائے، بڈھے ماہی گیر نے کہا، سمیہ گانے بجانے میں آپ حضرات سے کم نہیں، اچھا تو سمیہ سناؤ پھر ہمیں، ابا جھوٹ کہتے ہیں، مجھے گانا وانا کچھ نہیں آتا، باپ نے مجبور کیا، بیٹا اب نہیں تو پھر کب؟ ان سے شرم ہی کیا ہے، آپ کہیں تو میں باہر چلا جاؤں مسعود نے طنزاً اٹھتے ہوئے کہا، نہ نہ آپ تشریف رکھئے، سمیہ ضرور آپ کو اپنا گانا سنائے گی۔ سمیہ جھونپڑے کے کونے میں رکھا ہوا گرد آلود بربط اٹھا لائی اور ہمارے مقابل بیٹھ گئی: تاروں کو آہستہ آہستہ جنبش دیتے ہوئے اس نے ایک راگ چھیڑا، اس کی آواز میں ایک قسم کا درد اور ارتعاش پنہاں تھا۔ اس نے گانا شروع کیا، کسی نظم کے چند شعر جن کا مطلب یہ تھا، عید کی صبح کیف و نور کی بارش ہو رہی ہے، بچے، جوان اور بڈھے سب کے سب بادۂ مسرت سے جھوم رہے ہیں، ان کے قیمتی رنگین ملبوسات ان کی خوشیوں میں مزید اضافہ کر رہے ہیں، اور دنیائے مسرت کا ذرہ ذرہ انھیں نغمہ مسرت سنا رہا ہے، اور خوبصورت مقدس حوریں ان کی خدمت میں مبارک بادی کے پر مسرت تحفے پیش کر رہی ہیں۔ یہ اشعار بے حد متاثر کن اور دلچسپ پیرایہ میں گائے گئے تھے، ہم میں سے ہر ایک متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ آفتاب افق مغرب سے ڈھلک چکا تھا، اور تاریکی آہستہ آہستہ روئے زمین پر مسلط ہو رہی تھی ہم دونوں سمیہ اور اس کے باپ سے رخصت ہو کر گھر چلے آئے۔

دو۲ دن تک ہم باہر نہ نکل سکے، کیونکہ عید کے دوسرے دن سے مسعود بخار میں مبتلا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ کچھ کمزور سا ہو گیا تھا، جیسے وہ کئی دنوں کا بیمار رہا ہو، تیسرے دن مسعود کے نام ہندستان سے تار آیا کہ کالج ۱۶، ستمبر کو کھلنے والا ہے، فوراً چلے آؤ، ہندستان جانے سے ایک دن پہلے میں سمیہ سے ملنے کے لئے گیا، مسعود میرے ساتھ نہ آیا وہ سفر کی تیاری میں لگا رہا۔ کل ہم جا رہے ہیں سمیہ، میں نے اس کے نازک سے ہاتھوں کو تھام کر کہا، جب کہ ہم دونوں سمندر کے کنارے والی چٹان پر بیٹھ گئے تھے۔ کل کہاں ؟ ہندستان، اس نے غمگین لہجے میں کہا، ہاں اپنے وطن، دو۲ ہفتے کے بعد ہمارا کالج کھلنے والا ہے، کاش آپ مجھ سے نہ ملے ہوتے! اس نے حسرت و یاس کے ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ سمیہ تم تردد نہ کرو، ہم یقیناً پھر ملیں گے۔ شاید حشر کے دن، اس کا لہجہ مایوسی لئے ہوئے تھا، سمیہ کے یہ الفاظ مجھے متاثر کئے بغیر نہ رہے وہ مجھ سے بے اختیار چمٹ گئی، اس کی آنکھوں سے محبت کے چشمے پھوٹ نکلے آہ کیا معلوم تھا کہ آپ اس قدر جلد جدا ہوں گے، میں نے آپ سے کیوں محبت کی، آپ پردیسی ہیں دور سمندر پار کے رہنے والے، لیکن پیارے جعفری میں مجبور تھی، تمہارے بلند اخلاق نے مجھے گرویدہ بنا لیا۔ ابا کو آپ کی جدائی شاق گذرے گی، آہ اب کیا ہوگا، مسلسل آنسو بہہ بہہ کر اسے نڈھال کر رہے تھے۔ سمیہ خدا کے لئے صبر کرو، جانتی ہو صبر کا پھل کتنا میٹھا ہوتا ہے، میرا ضمیر گواہی دے رہا ہے کہ ہم پھر ضرور ملیں گے۔ آپ نہیں جانتے جعفری! دنیا میں کیسے کیسے انقلاب ہوتے ہیں۔ لیکن سمیہ ہر حال میں خدا کی قدرت پر بھروسہ رکھو، امید بڑی چیز ہے، آہ پیارے جعفری آپ میرے دل کو ڈھارس دے کر زندہ رکھنا چاہتے ہیں، میں مجبور ہوں، میرا دل اندر ہی اندر سینے میں بیٹھا جا رہا ہے، مجھے تو یہ معلوم ہو رہا ہے، کہ ہم عمر بھر کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں، کوئی زبردست طاقت ہمیں جدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ صبر اور شکر سے کام لو سمیہ، تم زیادہ رو کر ہلکان نہ ہو، یقین مانو، تمہاری محبت میرے دل سے کبھی نہیں مٹ سکتی، آہ کیا معلوم تھا کہ ہماری محبت اس قدر ادھوری رہ جائے گی۔ سمیہ اٹھو، اب یہاں سے، مجھے تمہارے ابا سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔ للّٰہ بیٹھئے خدا معلوم آپ کب ملیں گے، آپ مجھ سے خوب باتیں کیجئے، مجھے اپنے سینے سے لگا رکھئے، اف اتنی طویل مدت عمر کا نامعلوم حصہ، یہ نہ کٹنے والی جدائی کی پہاڑ سی راتیں، میں کیسے برداشت کر سکوں گی آہ میرا ضعیف باپ مجھے اس حالت میں کیسے دیکھ سکے گا، خدا اس پر رحمت کے پھول برسائے۔ میں بڈھے ماہی گیر سے جا ملا اور اس سے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ بڈھا کسی خیال کے تحت بہت زیادہ متفکر نظر آ رہا تھا۔ خدا تمھیں خوش رکھے، اس نے یاس آمیز لہجے میں کہا، لیکن بیٹا، ہمیں بھولنا نہیں میرے بعد سمیہ ـــ تمھاری . بڈھا آگے کہہ نہ سکا، اس پر رقت سی طاری تھی ـــ بے ساختہ میں اس سے چمٹ گیا اور بچوں کی طرح سسکیاں بھر کر رونے لگا، زیادہ نہ رو بیٹا، خیر سے اپنے وطن سدھارو، کبھی کبھی اپنی خیریت کی چٹھی بھیجا کرنا، سمیہ تمھارے لئے پریشان رہے گی، اسے تم سے محبت ہے، آہ! غریب لڑکی، بڈھا ابراہیم مجھے وداع کرنے کے لئے دروازے تک آیا، ایک بار پھر وہ مجھ سے چمٹ گیا، جاؤ بیٹا خدا حافظ آپ بزرگ ہیں دعا کیجئے، میں نے آنسو بہاتے ہوئے کہا، خدا کارساز ہے وہ بچھڑوں کو ملاتا ہے۔ سمیہ دور تک میرے ساتھ چلتی رہی، اس کی محبت نواز آنکھیں اب بھی دریا بہا رہی تھیں اس نے ہچکیاں بھر بھر کر کہا اچھے جعفری مجھے بھولنا مت، میں تمھارا انتظار کروں گی، عید کے دن اسی چٹان پر بیٹھی ہوئی۔ میں اس سے وداع ہو کر موٹر میں بیٹھ گیا میں نے دیکھا سمیہ موٹر کے نظروں سے اوجھل ہونے تک اپنے رومال کو جنبش دیتی رہی۔ دل پر درد و غم کا بار لئے ہوئے گھر پہنچا۔ اور صبح جانے والے جہاز سے میں اور مسعود ہندستان روانہ ہو گئے۔

ہندستان آ کر میں نے دو۲ خطوط سمیہ کے یہاں روانہ کئے، اور اس کے جواب میں مجھے اس کا ایک خط ملا۔ جس میں اس نے اپنی مسلسل

پریشانیوں اور اپنے باپ کی طویل علالت کا ذکر کیا تھا کہ اس کا باپ دن بھر گھر میں پڑا رہتا ہے اور وہ تمام دن محنت کر کے روزی حاصل کرتی ہے' میں نے اس کے لئے یہاں سے کچھ روپے روانہ کئے اور ہفتے میں ایک مرتبہ خط لکھنے کی تاکید کی' دو ماہ کے بعد سمیہ نے میرے پاس ایک پریشان کن خط لکھا :۔

"باپ اپنی طویل علالت کے بعد مجھے اس دنیا میں اکیلی چھوڑ کر چلا گیا۔ سمندر کے اس پار سنہری ساحل کے قریب' فرشتوں کی نورانی بستی میں' آہ جعفری مجھے اس دنیا میں تنہا مصائب کی کڑیاں جھیلنے کے لئے زندہ درگور کر کے ۔ بتاؤ جعفری اس دنیا میں میرا کون ہے۔ ایک تم' بہت دور جہاں سے آنے کے لئے پندرہ دن کی مدت درکار ہے بتاؤ پیارے تم کب آؤ گے؟ شاید عید کے دن' میں تمھارا انتظار کروں گی یہیں سمندر کے کنارے والی چٹان پر"۔

میں نے اس کے جواب میں بہت کچھ تشفی آمیز جملے لکھے' یہ کہ مسعود ہر سال اپنے والدین سے ملنے کے لئے عید کو آیا کرتا ہے۔ میں بھی ضرور اس کے ساتھ تم سے ملنے کے لئے آؤں گا۔ مسعود گھر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا' ایک ہفتہ پیشتر میں اپنی والدہ کی علالت کے سلسلے میں وطن چلا آیا تھا' اس نے مجھے لکھا' آج رمضان کی بارہ تاریخ ہے تم مجھ سے سولہ تاریخ کو بمبئی میں ڈپٹی صاحب کے گھر پر ملو۔ دن بہت کم رہ گئے ہیں' عید کے دن ہمیں ملان پہونچنا ہے۔ والدہ کا مزاج بہت زیادہ خراب تھا' ڈاکٹر نے انھیں پہاڑی مقام پر لے جانے کی رائے دی تھی' والد نے اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے یہ کام میرے ہی ذمہ رکھ چھوڑا' اور مجبوراً مجھے اس اہم فرض کو انجام دینا پڑا۔ میں نے مسعود کو اپنا حال لکھ بھیجا' اور یہ بھی لکھا کہ تم ضرور جاؤ' میری مجبوریوں سے تم اچھی طرح واقف ہو' سمیہ کو میرا پیام پہونچا دینا میں بہت جلد اس سے ملنے کی کوشش کروں گا مسعود گیا اور آیا بھی' اس نے اپنے سفر کے واقعات بیان کئے اور سمیہ کے بھی' عید کے ایک دن پہلے وہ اپنے گھر پہونچا' اس کے گھر والوں نے اب کی دفعہ میرے نہ آنے پر اظہار افسوس کیا۔ عید کی شام مسعود سمیہ سے ملنے کے لئے گیا' دور سے اس نے سمندر کے کنارے چٹان پر ایک لڑکی کو بیٹھے ہوئے دیکھا' وہ اسے پہچان نہ سکا' گویا کچھ بیماری سی دکھائی دے رہی تھی' اس کے گلابی گال خزاں دیدہ پتوں کی طرح زرد پڑ گئے تھے' اور آنکھوں کے گرد سیاہ گھیرے حلقے' قریب جا کر اس نے پہچانا وہ سمیہ ہے۔ سمیہ نے غور سے مسعود کو دیکھا' اس کی زبان سے بے ساختہ نکل پڑا' جعفری۔ جعفری ہندستان میں ہیں وہ نہ آسکے' ان کی والدہ بہت سخت بیمار ہیں' آہ ۔ وہ نہ آسکے۔ اس عید کے دن بھی ۔ سمیہ تم زیادہ رنج نہ کرو' وہ آئیں گے ضرور آئیں گے وہ تم سے ملنے کے لئے بہت زیادہ بے چین ہیں ۔ ہاں آئیں گے مسعود بھیا میرے مرنے کے بعد' وہ ضرور آئیں گے' جعفری تم آؤ گے' ضرور آؤ گے۔ میری نعش پر آنسو بہانے کے لئے' وہ چپ ہو گئی ۔ شدت غم سے اس کی عجیب حالت ہو گئی تھی' عید کے دن اس نے کوئی اچھا لباس بھی نہ پہنا تھا ہچکیوں سے اس کا دم گھٹتا جا رہا تھا' بے تابانہ وہ ریت پر گر پڑی۔ مسعود بھیا' اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ میرا آخری پیام ان تک پہونچا دو"

سمیہ نے تمھارا انتظار کیا' اس سمندر کے کنارے چٹان پر' عید کے دن وہ تمھاری محبت میں جان سے گذر گئی' تم اسے معاف کر دو گے نا اب زیادہ انتظار کی تاب اس میں باقی نہ تھی' اس کی دلی آرزو ہے کہ تم اسے بھول جاؤ' اس نے خوشی خوشی اپنی جان دی' اس لئے کہ حشر کے دن وہ تم سے ضرور ملے گی'

غم نے اسے بالکل نڈھال کر دیا تھا' اس کا نازک سا دل پیہم حوادث کی تاب نہ لا سکا اور وہ ...... ہمیشہ کے لئے روٹھ کر چلی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ آج تک اس شہر میں اس طرح کا شاندار جنازہ کسی کا نہیں نکلا' سمندر کے کنارے جہاں بیسیوں جہاز اس کے قریب سے گذرتے ہیں' ہر شخص کی آنکھیں اس کے مزار کے قریب کی تختی پر لکھے ہوئے حروف دیکھ کر نم آلود ہو جاتی ہیں"۔ اس نے عید کے دن اپنی جان دی اس سمندر کے کنارے چٹان پر اس کی پاک روح خوبصورت حوروں کے ساتھ کھیل میں مصروف ہے' وہ اب بہت خوش ہے کیونکہ وہ یہ جانتی ہے کہ حشر کے دن اپنے محبوب سے ضرور ملے گی"

صابر کوسگی

چھاپہ خانہ

ایک فرانسیسی ماہر کا قول ہے کہ کسی ملک کی دماغی پیمایش خیالات کے ارتقا اور علوم و فنون کا صحیح اندازہ لوگوں کی زرق برق پوشاکوں اور عالی شان عمارتوں سے نہیں بلکہ وہاں کی تصنیف و تالیف اعلیٰ طباعت اور دیدہ زیب تصویروں اور اشکال سے کیا جاتا ہے۔

متمدن ممالک میں روزنامے، قدیم تصویریں اور نئے علوم کے انکشافات پر روز آنہ بیسیوں کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں، جن کی طباعت دیکھ کر آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوجاتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ نقشہ ہر تصویر اور ہر شکل اپنی نوعیت اور خصوصیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف کاغذ پر اور ایک دوسرے سے مختلف طریقوں پر چھپی ہوتی ہے؛ ہر ایک کا رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے مگر بہ حیثیت مجموعی دیکھو تو ان میں یکسانی، ہم رنگی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

جب چھاپے خانے نہیں تھے تو کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ وہ بہت قیمتی ہوتی تھیں۔ اس لئے ان سے صرف دولت مند لوگ ہی فائدہ اٹھاتے اور بے چارے غریب محروم رہ جاتے تھے ٹائپ ایجاد ہونے کے بعد ہزاروں چھاپے خانے کھل گئے، ہر جگہ طباعت ہونے لگی، گھنٹوں کا کام منٹوں میں انجام پانے لگا اور چھوٹا بڑا، امیر و غریب غرض یہ کہ ہر شخص علم کی دولت سے مالا مال ہوگیا اس قسم کے چھاپے خانوں نے دوسرا بڑا احسان یہ بھی کیا کہ مصنفوں کو کاتبوں کے پنجے سے نجات دلا دی اور کتابوں کو غلطیوں سے پاک و صاف کر دیا۔

کاتبوں کی غلطیاں ضرب المثل ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کاتب ہی نہیں جو غلطی ہی نہیں بلکہ فاش غلطی نہ کرے۔ ان کے بعض واقعات نے تو لطیفوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ شیخ آذری کا مشہور واقعہ ہے کہ اس نے اپنا دیوان، امینائے کاتب سے لکھوایا۔ مکمل ہونے کے بعد دیکھا تو ہر جگہ غلطیاں پائیں۔ یہ دیکھ کر اسے بہت رنج ہوا اور یہ قطعہ کہہ کر اپنے دیوان کے آخر میں لکھ دیا۔

دیوان بندہ راکہ امینا سواد کرد — تنہا درونہ شعر مجدد نوشتہ است
در نظم و نثر ہر چہ بطبعش خوش آمدہ — دیوان بندہ پر ز خوش آمد نوشتہ است
ہر جا کہ لفظ نیک، مثلاً و بد در سخن — دست تصرفش ہمہ را بد نوشتہ است
اکنوں شریک بہتر دیوان بندہ است — زیرا کہ بیشتر سخن خود نوشتہ است

یعنی میرا دیوان امینائے کاتب نے لکھا ہے اس میں نہ صرف اس نے اپنی طرف سے اشعار گھڑ کر لکھ دیئے ہیں بلکہ نظم و نثر میں سے جو کچھ اس کو اچھا معلوم ہوا میرے دیوان میں بے تکلف داخل کر دیا۔ مثلاً جس جگہ لفظ نیک لکھا دیکھا اس کو ہر جگہ بد لکھ دیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اب وہ میرے دیوان کا شریک غالب ہے کیونکہ اس میں زیادہ کلام اس کا ہی ہے۔

غرض یہ کہ کاتب اپنی دھن میں کچھ کا کچھ لکھ جاتا ہے۔ اگر کہیں شہر بڑا ہے تو وہ شیر ببر لکھتا ہے اور اگر کہیں استغاثہ کا ذبہ لکھا ہے تو وہ اسے استغاثہ کا ذبہ لکھ دیتا ہے۔ اسی طرح آلو کی جگہ "الو" بابو کی جگہ "بابو" متھو کی جگہ "ٹٹو" اور انڈسٹیریل کی جگہ "اینڈ سٹریل" لکھنا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ بعض اوقات تو یہ لوگ

جوش میں آکر بڑے بڑے لوگوں کے نام بھی غلط لکھ جاتے ہیں، چنانچہ ایک جگہ لکھا تھا " مولانا شبلی " تو کاتب صاحب نے لکھا مولانا شُستلی اور لطف یہ ہے کہ وہی کتاب میں بھی چھپ گیا اور بعض حلقوں میں یہ بحث چھڑ گئی کہ حقیقت میں مولانا کا اصلی نام مولانا شبلی تھا یا مولانا شُستلی۔ اسی طرح ایک صاحب اپنی کتاب میں مولوی علی حیدر صاحب طبا طبائی کی اصطلاح سازی کی خدمات کا ذکر کرنا چاہتے تھے۔ کاتب نے اصطلاح سازی کو اصلاح سازی بنا دیا۔

مختصر یہ ہے کہ جہاں ٹائپ یا اس قسم کی دوسری طباعت رائج ہے وہاں یہ غلطیاں ہونا ناممکن ہیں۔ اگر کوئی انگریزی قسم کا چھاپہ خانہ دیکھو تو حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ اس میں بیسیوں شعبے ہیں، بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے مختلف چھاپہ خانے لاکر یہاں جمع کر دیے ہیں۔ آرٹسٹ، ایچر، انگریور، پروف ریڈر، کمپوزیٹر سب کے سب اپنے اپنے شعبوں میں سر جھکائے کام میں مصروف ہیں۔ آگے چلو تو لیتھو سکشن ہے۔ اس میں فوٹو لیتھو، زنکو گرافی، ہیلیو زنکو، وینڈایک سسٹم اور کولو سسٹم پر کام ہو رہا ہے۔ دوسری طرف دیکھو تو ٹائپ کا شعبہ ہے، لائنو ٹائپ، انٹر ٹائپ اور مونو ٹائپ پر آپریٹر کام کر رہے ہیں۔ کہیں لائن بلاک، ہاف ٹون بلاک اور سہ رنگی بلاک تیار ہو رہے ہیں، کہیں فوٹو گریور (Photogravure) اور روٹو گریور (Rotogravure) کی پلیٹیں تیار کی جا رہی ہیں، کہیں چاک پلیٹ پروسس سے کارٹون اور نقشے تیار ہو رہے ہیں، کہیں ویکس انگریونگ سے فوٹو کی پلیٹیں بنائی جا رہی ہیں، کہیں اسٹیریو ٹائپنگ ہو رہا ہے تو کہیں الیکٹرو ٹائپنگ سے بلاک تیار کئے جا رہے ہیں۔ یہ تمام پلیٹیں تیار ہوتی ہیں اور مشین روم میں طباعت کے لیے بھیج دی جاتی ہیں۔

اب ذرا مشین روم کی سیر کیجئے تو ہر نمونے کی مشینیں دیکھ لیجئے۔ پروف پریس، جابرس (Hand press)، پلیٹن (Platen) اور ٹریڈل مشینیں برقی قوت سے چل رہی ہیں اور ان کی آواز سے کمرہ گونج رہا ہے۔ کہیں فلیٹ بیڈ مشین پر طباعت ہو رہی ہے تو کہیں آفسیٹ مشینوں پر کام ہو رہا ہے۔ ایک طرف زبردست ملٹی کلر روٹری پریس ہے جہاں وقت واحد میں پورا کا پورا رسالہ چھپ جاتا ہے، وہیں مڑتا ہے، وہیں جزو بندی ہوتی ہے، وہیں کٹتا ہے اور وہیں سے سل کر مکمل حالت میں نکلتا ہے یہ سب کام مشینوں کے ذریعے انجام پاتا ہے اور کسی کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

مختصر یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جدید ترین آلات اور مشینوں سے بیحد تیزی اور کثرت سے طباعت ہو رہی ہے۔ کاغذ کی فراہمی کے لئے رات دن جنگل پر جنگل کٹتے چلے جا رہے ہیں، روزآنہ سیکڑوں اخبار میگزین اور رسالے کروڑوں کی تعداد میں چھپتے ہیں، چھوٹے سے چھوٹے ٹکٹ سے لےکر بڑے سے بڑے پوسٹر ہماری نظر سے گزرتے ہیں مگر ہمیں خیال تک نہیں ہوتا کہ وہ کس طرح چھپتے ہیں۔ اس لئے طباعت کے مختلف طریقے اور ان کی تدریجی ترقی پر ایک سرسری نظر ڈالنی نہایت ضروری ہے جس سے چھاپہ خانوں کی طباعت اور ان کے کاروبار کا ایک دھندلا سا خاکہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے گا۔

عام طور پر طباعت تین قسم کی ہوتی ہے ایک تو ریلیف
پرنٹنگ (Relief printing) یعنی
ابھری ہوئی طباعت، دوسری انٹیلیو پرنٹنگ یعنی گہری طباعت
اور تیسری سرفیس پرنٹنگ یعنی سطح سطح پر طباعت۔

ریلیف پرنٹنگ میں تحریر سطح سے ابھری ہوئی ہوتی
ہے اور اس ابھری تحریر پر سیاہی لگا کر داب دیتے ہیں جس سے
وہ تحریر چھپ جاتی ہے۔ اس میں متحرک ٹائپ، وڈ بلاک
(Wood Block) لائن بلاک اور ہاف ٹون
بلاک وغیرہ شامل ہیں۔ متحرک ٹائپ سے عام طور پر لوگ
واقف ہیں۔ یہ چوکور ٹکڑے لکڑی کے ہوتے ہیں یا ایک
خاص قسم کی دھات کے ہوتے ہیں جو سیسا، سرمہ، ٹین
اور کچھ تانبا ملا کر بنائی جاتی ہے۔ ان کے سروں پر
حروف یا ڈیزائن ڈھال لیا جاتا ہے یا کسی نوک دار
چیز سے کاٹ کر ابھار لیا جاتا ہے۔ انگریزی اور نسخ ٹائپ
کے نمونے عموماً اوسط درجوں کے چھاپے خانوں میں ہوتے
ہیں اور فاؤنڈریوں میں ڈھالے جاتے ہیں۔ یہی وہ ٹائپ
ہے جو متحرک ٹائپ کے نام سے مشہور ہے۔

کہتے ہیں کہ متحرک ٹائپ چینیوں نے ایجاد کیا تھا
اور چھٹی صدی عیسوی میں وہ لوگ عام طور پر اسی ٹائپ
سے طباعت کرتے تھے مگر چند روز کے بعد اس طریقہ
طباعت کو انھوں نے ترک کر دیا اور بھول گئے۔ اب
حالیہ دریافت سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۴۵۰ء میں جان گٹنبرگ
نے بلا کسی علم و اطلاع کے از خود متحرک ٹائپ بنایا۔ یہ جرمنی
کا مشہور و معروف کاریگر تھا۔ ابتدا میں اس نے لکڑی پر
حروف کھود کر طباعت کی، پھر لکڑی کے ٹکڑوں پر حروف
تراشے اور اس کے بعد کسی خاص دھات کا ٹائپ بنا کر پہلی
مرتبہ انجیل چھاپی۔ چند روز کے بعد یہ ٹائپ عام ہو گیا۔ کچھ
عرصہ کے بعد کیکسٹن (Caxton) نامی شخص نے
انگریزی ٹائپ بنا کر ایک چھاپہ خانہ کھولا اور پھر سیکڑوں
چھاپے خانے کھل گئے اور ہر جگہ ٹائپ کے ذریعے طباعت
ہونے لگی۔

دوسرا طریقہ انٹیلیو پرنٹنگ یعنی گہری طباعت کے نام
سے مشہور ہے یہ ریلیف پرنٹنگ کے بالکل برعکس ہے۔ اس
میں تانبے یا فولاد کی سطح پر گریور کے ذریعہ تحریر یا نقش کھودتے
ہیں۔ ان نقوش میں سیاہی بھر کر سطح کو بالکل صاف کر دیتے
ہیں۔ پھر اس پر کاغذ رکھ کر دونوں کو لوہے کے بھاری
سلنڈروں کے بیچ میں سے گزارتے ہیں۔ جب ان کھودے
ہوئے مقاموں پر داب پڑتی ہے تو سیاہی اندر سے نکل کر
کاغذ کی سطح پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس طریقہ سے طباعت کرنے
میں وقت بہت صرف ہوتا ہے اور اخراجات بھی زیادہ بیٹھتے
ہیں۔ اس لئے بعض لوگ اسے فضول خرچی میں شمار کرتے
ہیں مگر واقعہ ہے کہ انٹیلیو پرنٹنگ دورِ حاضرہ کی تہذیب
میں داخل ہو گئی ہے۔ جو خوبصورتی اور نزاکت اس میں
پائی جاتی ہے وہ کسی اور طریقے سے لاؤ غیر ممکن ہے۔ حروف
سطح سے اس طرح ابھرے رہتے ہیں کہ گویا کاغذ پر موتی
جڑ دیئے ہیں۔

انٹیلیو پرنٹنگ سے صرف وزیٹنگ کارڈ اور
مونوگرام ہی نہیں چھاپے جاتے بلکہ تقریباً تمام جمالیاتی طباعت
فنی اور نمائشی کام آج کل اسی طریقے سے چھاپا جا رہا ہے۔ چنانچہ
شادی کے رقعے، دعوتی کارڈ، شاہی فرمان، سرکاری اعلان

ایٹ ہوم کے کارڈ، بنک نوٹس، چیک، مراسلات کی پیشانیاں ٹائٹیل پیج اور کرسمس کارڈ وغیرہ کی اسی طریقے سے طباعت کی جا رہی ہے۔

ابتدا میں تصویریں وغیرہ بھی تانبے پر کھود کھود کر چھاپتے تھے مگر ۱۸۲۴ء میں اور نیفور (Neacephore) نے میکانی طور پر پلیٹ بنانے کی کوشش کی پھر تیس سال کے بعد ٹالیبٹ (Tallbott) نے جیلٹین اور پٹاشیم بائی کرومیٹ کے خواص معلوم کر کے تصویر، راست پلیٹ پر منتقل کی اور آئرن پر کلورائڈ سے کھود کر پلیٹ تیار کر لی۔ یہ طریقہ فوٹو گریور (Photogravure) کے نام سے مشہور ہے اور بعض چھاپے خانوں میں اب تک بجنسہٖ اسی طرح رائج ہے۔

فوٹو گریور سے چھپی ہوئی تصویروں میں حسن کا اثرات اور مصورانہ شان پائی جاتی ہے۔ تصویر کے خد و خال اور ہائی لائٹ اور شیڈ کی کیفیت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ مندرجۂ بالا طریقہ پر پلیٹ تو بہت جلد تیار ہو جاتی تھی مگر اس کے چھاپنے میں بڑی دقتیں اٹھانی پڑتی تھیں یعنی دن بھر میں تقریباً تین سو یا چار سو کاپیاں طبع ہوتی تھیں اس لئے اسے تجارتی اصول پر چلانے کے لئے ایک اور طریقہ ایجاد کیا گیا جس سے اب چار ہزار کاپیاں فی گھنٹہ طبع ہو جاتی ہیں، یہ طریقہ روٹے گریور (Rotagravure) کے نام سے مشہور ہے۔

اسی طریقے سے اخبار، میگزین، مصور ماہنامے، پوسٹر، فہرستیں، اشتہارات، پوسٹ کارڈ، سادے کام، رنگین کام غرض یہ کہ جو کچھ فوٹو گریور اور ہاف ٹون وغیرہ کے ذریعہ طبع ہو سکتا ہے وہ تمام کام نہایت حسن و خوبی کے ساتھ، جلد، اور سستے اصول میں طبع کیا جا سکتا ہے۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ ٹائپ میٹر، تصویریں اور اشکال سب کے سب ایک ہی سلنڈر پر منتقل کر کے ایک ساتھ ہی چھپ جاتی ہیں۔

تیسرا طریقہ سرفیس میتھڈ یا پلینو گرافی کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں لیتھو گرافی، ہیلیو ٹیپو گرافی اور کولو ٹائپ وغیرہ شامل ہیں۔

لیتھو گرافی سے مطلب پتھر پر لکھنے یا پتھر کے ذریعہ چھاپنے کے ہیں اس طریقہ طباعت کو ۱۷۹۶ء میں الائے سنیفلڈر نے معلوم کیا تھا۔ الائے سنیفلڈر بوہیما کے پایۂ تخت پراگ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی طبیعت کا رجحان زیادہ تر علم موسیقی کی جانب تھا۔ وہ ہمیشہ اس جستجو میں رہتا تھا کہ اپنی نظموں کو کسی آسان طریقہ سے چھاپ کر پبلک میں پیش کرے۔ چنانچہ اس نے بجائے جست کے پتھر پر طباعت کا کام شروع کیا۔

پہلے اس نے تحریر کو پتھر کی سطح پر کھودی جس طرح مہریں یا ڈائیاں کھودتے ہیں۔ پھر اس نے تیزاب کی مدد سے اس طرح کھودا جس طرح لکڑی کے چھاپوں پر نقش ابھرے ہوئے رہتے ہیں۔ اور چند روز کے بعد اسے یہ پتا چل گیا کہ تحریر پتھر کی ہموار سطح پر بھی چھپ سکتی ہے نہ تو حرفوں کو کھودنے کی ضرورت ہے اور نہ انھیں ابھارنے کی حاجت۔

اب دیکھو تو پتھر کی سطح پر حرف لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ چھاپتے وقت ایک شخص پتھر کی سطح کو پانی کا پچارا دے کر تر کر دیتا ہے، دوسرا سیاہی کا بیلن پھیر دیتا ہے۔ تیسرا کاغذ جما کر پریس چلا دیتا ہے اور اس طرح کھٹا کھٹ چھاپا چلا جاتا ہے۔

جب چھاپے کی کامیابی اس نوبت پر پہنچی تو سنیفلڈر نے سنہ ۱۸۰۳ء میں جرمنی، آسٹریلیا اور انگلینڈ میں اپنے حقوق محفوظ کرادئے، پھر تو دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ انیسویں صدی کے آخری دور میں فوٹو لیتھوگرافی کے ذریعے طباعت ہونے لگی، رنگین تصویریں چھپنے لگیں، حجری دور ختم ہوا اور چھاپے خانوں میں بجائے پتھر کے جست اور ایلیومنیم کی چادریں استعمال ہونے لگیں، لکڑی کے پریس جلا دیے گئے، اور اسٹیم سلنڈر پرنٹنگ پریس نے طباعت کی دنیا میں ایک بجلی کی لہر دوڑا دی۔

آج کل ہر قسم کی طباعت میں یورپ کے چھاپہ خانے برابر ترقی کرتے چلے جارہے ہیں اگر کسی طریقے سے ان مختلف طباعتوں کے موجد یعنی گٹنبرگ، کیکسٹن، نیسی فر، البرٹ اور سنیفلڈر وغیرہ آجائیں اور کسی اچھے چھاپے خانے کا معاینہ کریں تو یقین ہے کہ وہ خود اپنی ایجادوں کو بھول جائیں گے اور جن طریقوں سے آج کل چھپائی ہو رہی ہے اس کو نئی ایجاد تصور کرنے لگیں گے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

(لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے نشر کیا گیا)

اقبال نمبر۔ اس نمبر میں شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم کی حیات اور کلام کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے۔ اقبال کی شاعری اور فلسفہ کو مختلف اہل قلم نے نہایت تحقیق اور محنت سے واضح کیا ہے۔ بڑے بڑے شاعروں کی نظمیں اقبال سے متعلق شایع کی گئی ہیں بین الاقوامی شہرت رکھنے والے حضرت کے بیانات بھی شامل ہیں۔ حیدرآباد میں یوم اقبال کے مضامین کا اقتباس بھی دیا گیا ہے۔

اقبال کے بعض اشعار کو مصور بھی کیا گیا ہے۔ خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی نے اقبال کی ایک رباعی کو اپنے مخصوص انداز حسن کاری میں مصور کیا ہے۔ خاص کر اقبال کی ایک نایاب تصویر شایع کی گئی ہے جس میں اقبال اپنے اصلی رنگ میں جلوہ گر ہیں۔ اس تصویر کی سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی۔ اکثر رسائل نے سب رس سے مستعار لے کر اس کو شایع کیا ہے۔

کتابت طباعت وغیرہ نہایت نفیس اور علامہ اقبال کے شایان شان۔

تعداد صفحات (۱۶۸) تعداد تصاویر (۶) قیمت عـہ

گل بوٹے

ایک دن ہمارے ایک پڑوسی کچھ عجب صورت بنائے، منہ لٹکائے، آنکھوں میں آنسو بھرے، وحشت زدہ ادھر اُدھر دیکھتے

"حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں"

گنگناتے ہوئے ہمارے گھر قدم رنجہ ہوئے اور اپنی "پریشانی خاطر" سنا کر ہم سے مشورہ مانگنے لگے۔

واقعات یہ ہیں کہ موصوف کا بیاہ ہو کر پونے نو سال ہوتے ہیں، اس مدت میں آپ کو صرف پون درجن بچے ہوئے جن میں دو لڑکے اور سات لڑکیاں ہیں، یہ سب کے سب بفضلہ تعالیٰ زندہ ہیں۔ آپ کی آمدنی کی تفصیل یہ ہے کہ تنخواہ تو دو ڈھائی سو روپے سے زیادہ نہیں ہے مگر "بالائی آمدنی" معقول ہوا کرتی ہے، افسوس ہے کہ اِس آمدنی میں کچھ عرصہ سے غیر معمولی کمی ہوتی جا رہی ہے، یہ غالباً ملک کی اقتصادی پستی کا سبب ہے، جہاں کسی معاملہ میں ہزاروں ملا کرتے تھے اب سیکڑوں پر نوبت آگئی ہے، اس کمی کا آپ کے بجٹ پر خاص اثر پڑا ہے اور آمد و خرچ کا توازن بگڑ گیا ہے اس سلسلہ میں آپ کی بیگم کے مزاج کا توازن بھی بگڑتا جا رہا ہے، اور وہ بہت تلون مزاج ہوتی جا رہی ہیں، ان کے غصہ کا پارہ ایک سو دس ڈگری تک پہنچ گیا ہے، کبھی آپ کو دفتر [illegible] ہو جائے یا راستہ میں کسی دوست کے پاس ٹھیر کر دیر سے گھر آئیں تو ایسی موسلا دھار برس پڑتی ہیں کہ ساون بھادوں کا مینہ بھی مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہے، گرجنے کڑکنے اور برسنے کے علاوہ آپ کے آستین و گریبان کی بھی خیر نہیں! اس تقریب میں آپ کے ایک دو قمیص ہر ہفتہ شوز صاف کرنے اور برتن پونچھنے کے کام آتے ہیں آپ کے جسم پر بعض جگہ زخموں کو دیکھ کر بیساختہ زبان پر آتا ہے۔

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو!

خیر آپ کی "تواضع" تو اسی طرح ہوتی رہے گی کیونکہ آں محترمہ کی عادت تو چھوٹنے سے رہی! مگر اب سوال موصوف کے آمد و خرچ کے توازن کو برابر کرنے کا ہے!! خرچ جو اب تک ہوتا رہا ہے وہ تو کم ہونے سے رہا! اور "وضعداری" بھی یہی ہے کہ خرچ کو گھٹا کر اپنے ہم چشموں میں ذلیل نہ ہوں۔ اس کے علاوہ جیسے جیسے بچے بڑے ہوں گے خرچ بھی اللہ رکھے بڑھتا جائے گا اس لئے بڑے سوچ بچار کے بعد ہم نے موصوف کی خدمت میں یہ رائے پیش کی ہے کہ آپ کسی ایسے دفتر میں اپنا تبادلہ کرالیں جہاں "بالائی آمدنی" آپ کے بڑھتے ہوئے اخراجات کی کفیل ہو سکے تاکہ آمد و خرچ کے توازن کے ساتھ آپ کی بیگم صاحبہ کے مزاج کا توازن بھی برقرار رہے، تبادلہ کی کارروائی میں دو چار ہزار صرف کرنے پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں، برس چھ مہینے میں اتنی رقم آپ مع سود حاصل کر سکتے ہیں۔

موصوف قسم کھا کر کہتے ہیں کہ آں محترمہ کے گلے پڑنے سے پہلے "بالائی آمدنی" کو آپ حرام کی کمائی سمجھتے تھے اور اب بیگم کی نت نئی خواہشوں اور آپ کی فرماں برداریوں نے حلال و حرام میں امتیاز باقی نہیں رکھا،

اس کے ساتھ ساتھ آپ کا یہ بھی خیال ہے کہ گھر کی "برکت" اور دل کا "چین" دونوں رفو چکر ہو گئے ہیں۔

بیاہ کے بعد دو چار مہینے تک آپ کا بیان ہے کہ آپ کا غریب خانہ ان کے دم قدم سے رشک ارم بنا رہا اور آپ کے گھر میں واقعی "بہار" آئی ہوئی تھی مگر بے تکلفی شروع ہوتے ہی آپ کی "شامت" آگئی اور وہ اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر ہوگئیں! جس طرح "لال مرچ" دیکھنے میں نہایت حسین ہوتی ہے مگر ذرا منہ لگائیے تو بس خدا یاد آجاتا ہے!! بالکل اسی طرح وہ بھی نکلیں!!! دیکھنے میں نہایت بھولی بھالی، صورت دیکھ کر فرشتے یاد آتے تھے اور جی چاہتا تھا۔

اس کو بٹھا کے سامنے یاد خدا کروں!!!

مگر ضد اور ہٹ کی اس قدر پکی کہ خدا کی پناہ! موصوف کو اپنا "بچپن" جب یاد آتا ہے تو فرماتے ہیں کہ سینہ پر لاکھوں سانپ لوٹ جاتے ہیں، اس وقت وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کسی دن آپ کا بھی بیاہ ہوگا اور ایسی "لال مرچ" صفت بیوی سے پالا پڑے گا! جب آپ کو اسی عہد میمنت عہد کا خیال آتا ہے تو زبان سے بے اختیار نکل جاتا ہے!

"وہ بھی کیا دن تھے کہ بیوی گھر میں جب آئی نہ تھی
رنج سے واقف نہ تھے غم سے شناسائی نہ تھی"!!

باغباں

فن تقریر

ادارہ نے فن تقریر سے متعلق ایک نہایت مفید کتاب شائع کی ہے جو چند ابواب اور تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں جگہ جگہ تصویریں بھی شامل ہیں جن کی مدد سے تقریر کرتے وقت ٹھیک طور پر کھڑے ہونے اور حرکات و سکنات کے سلسلے میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔ طلباء کے فائدے کے لئے اس کی قیمت بہت ہی کم رکھی گئی ہے۔

قیمت ۸/

نئی کتابیں

۱۔ مضامین نہرو مرتبہ آنند نرائن ۲۵۴ صفحات قیمت عالہ۔ انڈین پریس۔ الہ آباد۔

۲۔ مختصر تاریخ ادب اردو (دوسرا ایڈیشن) مرتبہ پروفیسر اعجاز حسین ۴۰۰ صفحات قیمت عالہ انڈین پریس الہ آباد۔

۳۔ اسلام کا اقتصادی نظام از محمد حفیظ الرحمٰن ۲۶۴ صفحات قیمت عہ ندوۃ المصنفین۔ دہلی۔

۴۔ باغ دلکش (مجموعۂ کلام) از سید مسعود حسن مسعود ۲۰۰ صفحات حشر بکڈپو۔ ملتان

۵۔ گلبانگ آزادی (رباعیات) از نہال سیوہاروی ۵۷ صفحات قیمت ۸ر مکتبہ برہان۔ دہلی۔

۶۔ پیام کیف (مجموعۂ کلام) از مرزا احسان احمد احسان وکیل قیمت عیہ از مصنف۔ اعظم گڑھ۔

۷۔ رہنمائے تاریخ اردو (تاریخ گوئی کے اصول) از محمد عبدالقادر وکیل قیمت ۱۲ر از مصنف بنارس۔

۸۔ تحفہ ربیع الاول (اسلامی تعلیم) از محمد بدرالدین خاں ۱۰۰ صفحات قیمت ۸ر حکیم بدرالدین خاں سب رجسٹرار۔ دربھنگہ۔ بہار

۹۔ ہندوستانی تہذیب کی تکمیل (مجموعہ تقاریر) از کالیداس کپور قیمت ۸ر نولکشور پریس۔ لکھنؤ۔

۱۰۔ انمول رتن (تجارت کے اصول) از لالہ نرنجن داس قیمت ۵ر از مصنف گوجرانوالہ۔ پنجاب

۱۱۔ آفتاب رسالت (منظوم سیرت) از راؤ بہادر حاجی عبدالحمید خاں منظر ۱۳۰ صفحات قیمت ۸ر حشر بکڈپو۔ ملتان

۱۲۔ سنکلپ درشن (صحت کے سوال) از پروفیسر جگدیش متر ۲۰۸ صفحات قیمت عہ سنموہنی آشرم۔ لاہور

۱۳۔ خیال المنیر (احوال سید البشیر) مرتبہ ہمدرد بکڈپو ۵۵۲ صفحات قیمت سے ہمدرد بکڈپو۔ نیومارکٹ۔ بنگلور سٹی۔

۱۴۔ شہنشاہیت (شہنشاہی کا آغاز اور اس کا ارتقا) از مظفر شاہ خاں ظفر ۲۰۰ صفحات قیمت عہ ندوۃ المصنفین دہلی

۱۵۔ اخلاق اور فلسفہ اخلاق از حفیظ الرحمٰن ۵۴۳ صفحات قیمت للعہ ندوۃ المصنفین۔ دہلی۔

۱۶۔ چار فن (کپڑوں کی دھلائی اور صفائی وغیرہ) مرتبہ راجستان ٹریڈنگ کمپنی قیمت عہ از مرتب فرنگ۔ لاہور۔

۱۷۔ نازیت (نازیت کی تشریح) از شاہد حسین رزاقی قیمت عہ۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

۱۸۔ نئے افسانے از سید حسن ریاض قیمت عہ " " " "

۱۹۔ درد انبساط (مجموعۂ کلام) از عبدالودود درد بریلوی قیمت عہ " "

۲۰۔ آسمانی گھڑی (سورج اور چاند سے وقت معلوم کرنے کے طریقے) قیمت ۴ر ۶ر مکتبہ جامعہ دہلی۔

۲۱۔ لیدسب، مہابھارت (موجودہ جنگ کے حالات) از حامد علی ایم اے ۴۸ صفحات قیمت عہ از مصنف اردو کلب جامع مسجد دہلی۔

ترقی کی پہلی سیڑھی (تجارت کے اصول) از ایس اے خالق ۴۲ صفحات از مصنف اردو کلب۔ دہلی

۲۳۔ تعلیمات اقبال از یوسف خاں سلیم ۱۲۶ صفحات قیمت عہ۔ اقبال اکیڈیمی لاہور

۲۴۔ رہنمائے مداشت از قاضی میراں بخش قیمت ۲ر از مولف۔ نائب تحصیلدار۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں

۲۵۔ نئی بود (کہانیاں) از ازہر قدوائی۔ شرکت ادبیہ۔ دہلی۔

مرزا سیف علیخاں

ادارہ کی خبریں

شعبے اس اثنا میں ادارہ کے حسب ذیل شعبوں کے جلسے ہوئے۔

شعبۂ طلبہ اس شعبے کا ایک جلسہ بتاریخ ۱۰/ اپریل شام میں پانچ بجے ڈاکٹر زور صاحب صدر شعبہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سب سے پہلے اراکین شعبہ اور کارکنان ادارہ نے ایستادہ ہوکر حضرت والدہ سلطانہ بڑی بیگم صاحبہ مرحومہ کی وفات حسرت آیات کے سلسلہ میں قرارداد تعزیت منظور کی۔ جو اس صفحہ کے وسط میں درج ہے۔

> "شعبہ طلبہ ادارۂ ادبیات اردو کا یہ جلسہ اعلیٰ حضرت جلالۃ الملک سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں خلد اللہ ملکہ و سلطنتہٗ کی والدہ ماجدہ حضرت بڑی بیگم صاحبہ مرحومہ و مغفورہ کے انتقال پر ملال پر اپنے انتہائی رنج و الم کا اظہار کرتا ہے اور دست بدعا ہے کہ مرحومہ و مغفورہ کو خداوند تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور اعلیٰ حضرت شاہ ذیجاہ اور خانوادۂ آصفی کو صبر جمیل عطا ہو۔"
>
> آمین

اس کے بعد نئے سال کے لیے عہدہ داران و اراکین مجلس عاملہ کا انتخاب کیا گیا جو درج ذیل ہے۔

نائب صدر ... محمود علی

معتمد .... مرغوب الدین

نائب معتمد ..... منظفر علی خاں

اراکین ... شیخ رحیم الدین ظہیرآبادی

معین الدین احمد انصاری

مسیح الدین خاں متین

محمود علی اکبر مشیر

حشمت اللہ خاں

عبدالمنعم صدیقی

عارف علی خاں

شعبۂ شعرا و مصنفین دکن اس شعبہ کی طرف سے اس ماہ اخبارات میں حسب ذیل اطلاع شایع کی گئی

مرقع سخن جلد اول و دوم میں جن شاعروں کا ذکر درج نہیں ہوا ان کے متعلق ایک ساتھ جلد زیر ترتیب ہے۔ اس میں جن شاعروں کا تذکرہ درج رہے گا ان میں ایسے شعرا کے نام ذیل میں لکھے جاتے ہیں جن کی نسبت معلومات درکار ہیں۔ اگر کوئی صاحب ضروری معلومات اور کلام وغیرہ سے کارکنان ادارہ کا ہاتھ بٹائیں تو ادارہ نہایت ممنون ہوگا۔

محمد باہ محرم۔ نورالدین علی خاں رنگین۔ بخشی میر عاشق علی خاں آیا۔ میر مرتضیٰ مہدی۔ کنہیا لال مہا سنگ حقیر۔ مہر علی مہر۔ مرزا عطا ضیا۔ شاہ فضل اللہ فضلی۔ منور الدولہ یار۔ خواجہ ابوالبرکات خاں عشرت۔ معتبر خاں عمر۔ میر حفیظ الدین قاصد۔ میر فخرالدین فخر۔ میر عبدالحی خاں صمصام الملک صارم۔ شیخ احمد مظفر مظفر۔ لال چند رنگین۔ سرو بھی رائے لالہ۔ الفت خاں مبتلا۔ محمدی بیگ مرزا شیخ ظہورالدین نامد۔ موہن لال مہتاب۔ عنایت اللہ فتوت۔ لالہ مہ کشن بے جان محمد بیگ رضا علی مردان خاں یکدل۔ محمد علی نیاز۔ نیانا محمد خاں نیاز۔ میر ہاشم فقیر مرزا محمد جان نثار۔ نجف علی خاں ندرت۔ مرزا داؤد ہنر۔ میر حسین علی خاں آیا۔ بہاؤالدین حسین خاں عروج۔ میر عباس علی خاں احسان میر عباس علی خاں کافی۔ سجاد علی خاں سجاد۔ حافظ غلام محمود محمود۔ قربان علی بیگ سالک۔ انقا علی شاہ وطن۔ محمد محسن محسن۔ چھو لال تمکین۔ سیتل پرشاد خرم۔ میر احمد علی قاضی۔ حیدر علی حیدر۔ میر غلام حسین فرق۔ میر تراب علی نعمہ۔ محمد مظفرالدین معلی۔ اقبال یار جنگ اقبال

غلام محمد عرب شوق۔ غلام علی بحوش۔ میر حسین علی خاں آمیرو سید مخدوم حسینی رفعت۔ سید احمد آفسر۔ محمد منیر الدین مہر۔ صاحبزادہ خیرات علی خاں تمنی۔ میر محمد علی نخشبی امداد حسین حازم۔ میر عباس حسین خاں شُشدر۔ میر محمود علی تیغ۔ منتخب الدین تجلی۔ سید شاہ ابراہیم عفو۔ محی الدین محفوظ۔ اعظم علی شایق۔ وحید الدین عالی۔ میر وزیر علی خاں بحوش۔ شہاب الدین توقیر۔ سید محمد حسینی عقیل۔ عبدالحی بازغ نسین بخش نشین۔ مجاہد الدین مجاہد۔ احتشام الدین تجلی۔ عبدالحارث خاں وارث۔ محمد علی خاں ناظم۔ صولت جنگ عابد۔ عبدالولی فروغ شایق حسین صفیر۔ محب اللہ خاں عالی۔ عظمت اللہ خاں سرمد۔ اعجاز علی شہرت۔ خواجہ غلام غوث خشق۔ عبدالوہاب عندلیب۔ ریاض الدین ریاض۔ محترم شاہ آمید۔ ڈاکٹر احمد علی۔ اکرام الدین خاں اکرام۔ راجہ راجیشور راؤ اصغر۔ نصیر الدین اصغر۔ نواب ضیغم جنگ سرفراز۔ سید ضمیر الحسن ششدہ۔ میر عابد علی قدرت۔ حکیم میر عابد علی غیور۔ میر اسماعیل تمکین۔ مرزا علی جواد جواد۔ مرزا بہادر علی صفی۔

شعبۂ نسواں

شعبہ نسواں کی مجلسِ عاملہ کا سترہواں اجلاس بمقام جوبلی ہلز بروز یکشنبہ ۲۰ر اپریل شام کے ساڑھے پانچ بجے منعقد ہوا جس میں حسب ذیل خواتین موجود تھیں۔

محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ
" سارہ بیگم صاحبہ
" جہاں بانو بیگم صاحبہ
" بشیر النساء بیگم صاحبہ
" تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ
معتمد شعبہ

لطیف النساء بیگم صاحبہ نے بوجہ دیگر مصروفیت کے شرکت سے معذرت چاہی۔

سابقہ اجلاس کی روئداد کی تصدیق کے بعد حسب ذیل ایجنڈا زیر غور رہا۔

۱۔ انتخاب کتب برائے مطبوعات ادارہ
۲۔ جدید مدارس بالغات کا قیام
۳۔ پچھلے اجلاس کے متعلق گفت وشنید
۴۔ دیگر امور۔

ف ۱۔ مطبوعات ادارہ کے سلسلہ میں جو مسودے ادارہ سے بغرض انتخاب ورائے شعبہ کو بھجوائے گئے تھے وہ دیکھے گئے اور یہ طے پایا کہ ان کے متعلق اراکین کی رائے حاصل کرنے کے بعد جواب دیا جائے۔

ف ۲۔ جدید مدارس بالغات کے قیام کے بارے میں گفت وشنید ہوئی اور خیرت آباد اور لال ٹیکری پر مدرسے قایم کرنے کا تصفیہ ہوا۔ لیکن موسم گرما کے فوراً ہی بعد ان کا افتتاح کرنا مناسب خیال کیا گیا۔

ف ۳۔ پچھلے اجلاس میں مدرسہ بالغات اڈیکمیٹ کے متعلق یہ تصفیہ ہوا تھا کہ

(الف) جدید مدارس کے قیام کے بعد اس کو بند کردینا چاہیے۔
اس دفعہ اتنا اور اضافہ کیا گیا کہ چونکہ دس طالبات اردو دانی کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہیں اور امتحان جنوری میں ہوگا اس لئے مدرسہ امتحان کے بعد ہی بند کرنا ٹھیک ہوگا۔

(ب) مسز باقر علی خاں صاحب نے از راہ عنایت وقتاً فوقتاً مدرسہ کا معاینہ کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور مسز حسن لطیف صاحب نے بوجہ مصروفیت سوزن کاری سکھانے سے معذرت کی۔

(ج) بشیر النساء بیگم صاحبہ نے بنگلور میں شعبہ کی شاخ کے قیام سے متعلق قریب قریب تمام انتظام کرلیا ہے

شعبہ کے بڑھتے ہوئے کاموں کے پیش نظر مجلس عاملہ کی رکنیت میں اضافہ کی رائے ہوئی۔ محترمہ بلقیس بانو صاحبہ کا نام رکنیت کے لئے تجویز ہوا اور یہ طے پایا کہ ان سے استدعا، کی جائے۔

شاخ کلیانی

کلیانی کی شاخ کے معتمد صاحب نے حسب ذیل روئداد روانہ کی ہے:

صدر ادارہ کے منشاء کے مطابق عالیجناب نواب صاحب بہادر کلیانی کے زیر صدارت تقسیم اسناد کا جلسہ منانے کا خیال ایک عرصہ سے تھا مگر چونکہ نواب صاحب ممدوح کلیانی میں تشریف نہیں رکھتے تھے اس لئے یہ خیال جلد عملی جامہ نہ پہن سکا، یہ مبارک ساعت آگئی۔ شاخ کے معروضہ کو جو جلسہ کی صدارت سے متعلق تھا نواب صاحب بہادر نے شرف قبول بخشا، یہ جلسہ بتاریخ ۲۸ مارچ ۱۹۴۱ء یوم جمعہ بوقت ۵ ساعت شام بمقام مدرسہ وسطانیہ منایا گیا جس میں شرکاء کا خاصہ اجتماع تھا ابتداء تلاوت کلام مجید سے کی گئی اس کے بعد معتمد شاخ نے رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ گلپوشی کے بعد نظموں کا سلسلہ شروع ہوا جس میں مولوی مرزا محمد بیگ صاحب مرزا، مولوی سجاد حسین صاحب جاہل، مولوی غلام معین الدین صاحب معین اور شیخ صالح صاحب صبیح نے اردو کے عنوان پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ مولوی خیر الدین صاحب نے تاریخ اردو پر ایک مضمون سنایا اور حمید الدین صاحب متعلم اردو عالم نے خوش الحانی سے ایک نظم پڑھی۔ آخر میں معتمد شاخ نے بطور عقیدت عالی جناب نواب صاحب بہادر کی شان میں ایک قصیدہ سنایا۔ نواب صاحب بہادر نے بہ نفس نفیس اسناد تقسیم فرما کر کامیاب طلبہ کو سرفراز فرمایا، چائے نوشی کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

شاخ ادارۂ ادبیات کلیانی کا یہ جلسہ ہر طرح کامیاب رہا۔ اس کو کامیاب بنانے میں مولوی غلام معین الدین صاحب معین، مولوی خیر الدین صاحب، مولوی قاضی الدین صاحب، مولوی تمیز الدین صاحب اور مولوی محسن علی صاحب نے بطور خاص حصہ لیا۔ رپورٹ کا اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔

محترم صدر و حاضرین جلسہ!

آج کا دن ادارۂ ادبیات اردو شاخ کلیانی کی زندگی میں ایک یادگار اور مسعود دن ہے کہ اس کے جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت ہمارے آقائے محترم عالیجناب نواب سید محمد جمال الدین حسین خاں بہادر دام اقبالہٗ والیٔ اسٹیٹ کلیانی فرما رہے ہیں جن کی ذات مرکز کمالات و مصدر فیوض و برکات ہے۔

قبل اس کے کہ میں شاخ کلیانی کی کارگزاریوں کا اجمالی تذکرہ آپ کے گوش گزار کروں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صدر ادارۂ ادبیات اردو سے بھی آپ کو متعارف کرایا جائے کہ وہ کیوں اور کب عالم وجود میں آیا اور اس کے قیام کے اغراض و مقاصد کیا ہیں! اور اس نے اب تک کیا کام کئے۔ اگرچہ یہ داستان طویل ہے مگر یہاں صرف اشارتاً چند اہم واقعات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ بمصداق ع

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۳۱ء میں عالم وجود میں آیا اور اس کا قیام جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی لنڈن کا رہین منت ہے آپ نے چند دردمند علم دوست اور اردو پرست حضرات کے تعاون سے اس کی طرح اندازی کی جن کے اسماء درج ذیل ہیں۔

(۱) مولوی عبد المجید صدیقی ایم اے۔ ال ال بی

(۲) مولوی عبد القادر صاحب سروری ایم اے۔ ال۔ ال۔ بی

(۳) مولوی عبد القادر صاحب صدیقی ایم اے شعبہ دینیات۔

(۴) مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل۔

(۵) ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ۔ ایم اے پی ایچ ڈی لنڈن معتمد اعزازی۔

یہ ادارہ بالکل غیر سیاسی اور خالص علمی و ادبی اغراض لے کر میدان عمل میں آیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے سرپرستوں میں ملک کی

جلیل القدر ہستیاں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادارہ نے صرف دس سال کی قلیل مدت میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور وہ علمی خدمت کی ہے کہ کسی اور قومی ادارہ کو یہ سعادت حاصل نہ ہو سکی۔

اس کے سرپرست اعلیٰ ہز ہائنس والاشان نواب میر حمایت علی خاں اعظم جاہ بہادر شہزادہ برار و سپہ سالار افواج آصفی ولیعہد سلطنت آصفیہ ہیں۔ دیگر سرپرستوں میں حسب ذیل مقتدر ہستیوں کے اسماء شامل ہیں۔

(۱) رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم باب حکومت۔

(۲) عالیجناب نواب میر یوسف علیخاں بہادر سالار جنگ ثالث سابق صدر المہام سلطنت آصفیہ

(۳) عالیجناب نواب معین الدین خاں اعانت جنگ معین الدولہ بہادر امیر پائیگاہ۔

(۴) عالیجناب راجہ شام راج راجونت بہادر سابق صدر المہام میرات دولت آصفیہ۔

ادارہ کی مجلس انتظامی، معاونین و رفقاء وغیرہ میں ایسے ایسے صاحبان علم و فضل شریک ہیں جن سے ادارہ کا دامن ادبی دولت سے مالا مال ہو رہا ہے ان کے اسماء کی فہرست باعث تطویل ہے اس لئے نظر انداز کی جاتی ہے۔

ادارہ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں۔

(۱) اردو زبان اور ادب کی توسیع و حفاظت۔

(۲) سرزمین دکن میں اردو زبان اور ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنا۔

(۳) نوجوانان ملک میں انشاء پردازی اور شاعری کا صحیح ذوق پیدا کر کے تصنیف و تالیف میں رہبری اور مدد کرنا۔

(۴) عوام میں اردو کی تعلیم اور مطالعہ کا شوق پیدا کرنا اور اس کے لئے ضروری وسائل اختیار کرنا۔

(۵) اردو کو مختلف علوم و فنون سے روشناس کرنا۔

(۶) تاریخ دکن کی خدمت اور ملک کے تاریخی و ادبی آثار کی حفاظت۔

(۷) ایک ایسا مکمل کتب خانہ قایم کرنا جس میں اردو کی بالعموم اور خاص طور پر دکن کی تمام تحریریں اور آثار محفوظ ہو سکیں۔

ادارہ نے اپنے کام کو بہ نظر سہولت مختلف شعبہ جات میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر شعبہ ایک معتمد اور چند اراکین پر مشتمل ہے۔ فی الوقت ۱۲ شعبے قایم ہیں اور ہر شعبہ برابر مصروف عمل ہے اور اپنے مفوضہ کام کو دلچسپی سے انجام دیتے ہوئے ٹھوس اور علمی سرمایہ فراہم کرتا جا رہا ہے۔

میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا صرف شعبۂ امتحانات کی حد تک مختصراً بحث کروں گا۔ کیونکہ آج کا جلسہ انہی امتحانات کے نتائج کے سلسلہ میں انعقاد پذیر ہوا ہے۔

"اردو زبان اور ادب کی حفاظت، بقا اور ترقی کے سلسلہ میں ضروری ہے کہ اردو مطالعہ کا ذوق عام کیا جائے اور ان مسن لوگوں یا نوجوانوں کے لئے جو کسی جامعہ یا سرکاری ادارہ کی زبان اردو کی تعلیم سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے ایسے نصاب اور امتحانات مقرر کئے جائیں جن کی پابندی اور شرکت سے وہ اپنی اردو قابلیت اور ادبی ذوق کی تکمیل ایک باضابطہ معیار کے مطابق کر سکیں۔"

اسی مقصد کے تحت ادارہ ادبیات نے دیگر شعبوں کے ساتھ امتحانات کا شعبہ بھی قایم کر رکھا ہے جو بلا تفریق مذہب و ملت امیدواروں کا امتحان لیتا اور کامیابوں کو اسناد عطا کرتا ہے۔ اس شعبہ کے تحت فی الحال حسب ذیل امتحانات قایم کئے گئے ہیں۔

(۱) اردو دانی (۲) اردو عالم (۳) اردو فاضل (۴) خوشنویسی (۵) خطاطی و کتابت۔

ادارہ کی جانب سے جب امتحانات کا اعلان ہوا تو ملک نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ طلبا نے اس میں شرکت کی اخبارات نے اس پر حوصلہ افزا مقالات سپرد قلم کئے اور دیگر اکابرین ملک نے اس کی افادی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے زرین آرا کا اظہار کیا۔

صدر ادارہ کی اس مختصر روداد کے بعد اب شاخ کلیانی کی مجملاً آپ بیتی بیان کی جاتی ہے۔ اس شاخ کی اساس کا سہرا مولوی عبدالکریم صاحب مدرس کے سر ہے جنھوں نے اپنے رفقائے کار مولوی غلام محی الدین صاحب معین اور مولوی تاج الدین صاحب مدرس انجمن اور مولوی خیر الدین صاحب وغیرہ کی معیت میں اس کی داغ بیل ماہ دے ۱۳۴۹ف میں ڈالی یہ حضرات حتی المقدور شاخ کی خدمت کر رہے ہیں اور اس کی ترقی کا بے پناہ جذبہ اپنے سینہ میں موجزن پاتے ہیں۔ چنانچہ یہی جذبۂ عمل اور اردو پرستی تھی کہ یہاں آج ایک مدرسۂ شبینہ اور ایک دار المطالعہ شاخ کی جانب سے قایم ہے۔

الغرض امیدواروں کو امتحانات ۱۳۵۰ف میں شریک کیا گیا اور انھیں مفت تعلیم دی گئی چنانچہ امتحان اردو عالم میں (۹) شریک اور (۵) امیدوار کامیاب ہوئے امتحان اردو دانی میں (۳۲) شریک اور (۲۷) کامیاب ہوئے۔

چونکہ امیدواروں کو کافی تعداد میں شریک امتحان کیا گیا تھا اس لئے کلیانی کو ہی مرکز امتحان قرار دیا گیا جس کی وجہ سے امیدوار سفر حیدرآباد کے مصارف سے بچ گئے سال حال بھی یہی سلسلہ بدستور جاری ہے علم دوست حضرات سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے متعلقین کو اس میں شریک کرا کر اردو کی توسیع و ترقی میں تعاون کریں اور ملک سے بے علمی کی جہالت کو دور کرتے ہوئے خواندہ اشخاص کی تعداد میں اضافہ کا موجب بنیں۔

یہ امر شاخ ہذا کے لئے موجب طمانیت ہے کہ اس کے انتظام پر پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے جو بہ حیثیت صدر نگران امتحانات کلیانی تشریف لائے تھے اظہار استحسان فرمایا ہے چنانچہ موصوف کی سفارش پر صدر ادارہ نے شاخ کے مطالعہ گھر کے لئے اپنی مطبوعات کی ایک کثیر تعداد بلا قیمت مرحمت فرمائی یہ کتب دارالمطالعہ میں رکھی گئی ہیں۔

آخر میں میں شاخ ہذا کی جانب سے حضرت سرکار فیض آثار نواب صاحب بہادر کی بارگاہ علم پرور میں صدارت کی قبولیت اور کارکنان شاخ کی عزت افزائی کا بہ صمیم قلب شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے ورود مسعود سے یہ جلسہ بہمہ وجوہ کامیاب ثابت ہوا جناب مولوی احمد حسین صاحب تعلقدار صدر شاخ ہذا اور جناب مولوی سید سبط نبی صاحب منصف عدالت و دیگر عہدہ دار بھی مستحق تشکر ہیں جن کی نگاہ الطاف سے شاخ بہرہ مند ہو رہی ہے۔

رپورٹ کے اختتام سے قبل میں پھر باشندگان کلیانی کی خدمت میں التماس کرونگا کہ وہ اس شاخ کی امداد و تعاون سے دریغ نہ فرمائیں گے کیونکہ یہ انہی کے فلاح و بہبود کے لئے قایم کی گئی ہے۔

شاخ پربھنی | پربھنی کی شاخ کے معتمد صاحب نے حسب ذیل روداد روانہ کی ہے

ادارۂ ادبیات اردو شاخ پربھنی کا ایک جلسہ زیر صدارت مولوی عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری ضلع پربھنی مارکٹ پولیس ہال میں منعقد ہوا۔

حمید اللہ خاں صاحب شیدا معتمد شاخ پربھنی نے ایک مختصر تقریر کے بعد یہ تحریک پیش کی کہ ادارہ ادبیات اردو شاخ پربھنی کے جملہ طلبا و اراکین اپنے لئے ایک خاص قسم کا یونیفارم تشکیل

شیروانی تیار کرالیں۔

مولوی عبدالرزاق صاحب فاروقی نے اس کی پرزور تائید کرتے ہوئے کہا کہ اس کو عملی جامہ پہنانا چاہیے۔ جس کی تائید مولوی وجاہت علی صاحب نے فرمائی۔ اور کہا کہ اگر ہماری شاخ سے اس کی بنا ہوگی تو اس کا سہرا شاخ پربھنی کے سر ہوگا۔ آخر میں جناب صدر مولوی عارف الدین حسن صاحب نے طلبا کے جذبات اور جوش کی ستایش کرتے ہوئے اس تحریک کو منظور فرمایا۔ اور کہا کہ اس تحریک کو صدر ادارہ میں روانہ کیا جائے۔ تاکہ وہ ایک ایسا نمونہ تجویز کرے کہ جس کو ہر شاخ کے طلبہ اختیار کریں۔ اس کے بعد جناب صدر نے نصیحت کی کہ علمی کام میں زیادہ حصہ لو۔ اور طلبہ کو زیادہ تعداد میں شریک کرو۔ ساڑھے نو بجے شب جلسہ برخواست ہوا۔

شاخ کشتگی کا جلسۂ تقسیم اسناد

ادارۂ ادبیات اردو شاخ کشتگی کا ایک غیر معمولی جلسہ

تقسیم اسناد بہ صدارت عالیجناب پنڈت بلونت راؤ صاحب گھاٹے بی اے ایل ایل۔ بی منصف تعلقہ کشتگی بتاریخ ۱۰ خورداد سنہ ۱۳۵۰ف بمقام جوبلی ہال منعقد ہوا۔ ۴ بجے سے لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ تقریباً تمام عہدہ داران مقامی نے شرکت کی جن میں سے جناب تحصیلدار صاحب، جناب ڈاکٹر صاحب، جناب صدر مدرس صاحب و منتظم صاحب پولیس بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ نیز جملہ وکلا صاحبان و مقامی خوش باش ساہوکاروں کا کثیر مجمع شریک جلسہ رہا۔ ان کے علاوہ تعلقہ ہذا کے قصبات مثلاً نادرگیرہ، دوئی ہال، چلکیرہ و دیگر مواضعات سے باوجود سخت گرمی و دوری مسافت کے حصول اسناد کے شوق میں کامیاب طلبہ کی کئی جماعتیں آئیں۔ جو سب کی سب جوبلی ہال کے میدان میں جمع ہوئیں میدان میں بنچوں اور کرسیوں کا کافی انتظام کرنے کے باوجود بیشتر شرکاء جلسہ کھڑے ہی رہے۔ ان کامیاب طلبا میں سب کی نظریں ایک سن رسیدہ طالب علم پر بطور خاص پڑ رہی تھیں۔ جو ہر شخص کا مرکز نظر بنا ہوا تھا۔ یہ وہ تشنۂ علم تھا جس نے اپنی زندگی کی تقریباً ۶۰۔ ۶۵ منزلیں طے کرنے کے باوجود اس کے ذوق علم نے اس کو امتحان اردو دانی میں شریک ہونے پر مجبور کیا تھا۔ آفریں اور صد آفریں ہے۔ اس کی ہمت اور ذوق علمی پر کہ اس نے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اور آج وہ سند لینے کے لئے ۶۵ سالہ عمر ضعیف کو دس میل اپنے ساتھ کھینچ لایا تھا۔ اس ضعیف اور کامیاب طالب علم کو جلسہ کا ہر شخص بڑی حیرت اور حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

غرض ٹھیک ½۵ بجے سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے تحریک صدارت پر ایک قرارداد تعزیتی منظور کی گئی۔ جس میں علیا حضرتہ بڑی بیگم صاحبہ کے سانحہ ارتحال و صدمۂ جانکاہ پر گہرے رنج و ملال کا اظہار کیا گیا۔ اور دعا کی گئی کہ خدائے قدوس مرحومہ کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ نیز اعلیٰ حضرت بندگان عالی و خانوادۂ آصفی کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

حاضرین نے قرارداد کو ایستادہ ہو کر سنا اور منظور کیا۔ اس کے بعد جلسہ کا آغاز جناب محمد اکبر صاحب ڈرائنگ ماسٹر کی نظم سے ہوا۔ نظم نہایت سلیس سادہ و برمحل تھی۔ جس میں زبان اردو کی تعریف اور اس کی ہمہ گیر وسعت کا تذکرہ تھا۔ حاضرین نے اس نظم کو بے حد پسند کیا۔ مسٹر بھیم سین آچاری صاحب وکیل نے مولوی سید علی اکبر صاحب صدر شعبہ امتحانات اردو کا پر مغز خطبہ پڑھ کر سنایا۔ قابل صدر نے اس خطبہ میں اردو امتحانات کی ابتدائی زندگی اور اس کے ترقی منازل کا مفصل حال بیان فرمایا ہے۔ بعد ازاں معتمد ادارہ نے اپنی سالانہ رپورٹ سنائی جس میں

صدر ادارہ حیدر آباد کی بنیاد کا حال اور بانی ادارہ جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کی بار آور کوشش اور اہل ذوق اصحاب کا ادارہ کے ساتھ تعاون عمل اور اس قلیل عرصہ میں ادارہ کے درخشاں کارناموں کا مفصل ذکر درج تھا۔ نیز شاخ کشتگی کے قیام اور اس کی سرگرمیوں میں جن علم دوست اور ادب نواز حضرات نے اپنی قیمتی امداد و اعانت سے معتمد کا ہاتھ بٹایا تھا۔ ان سب کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ اختتام رپورٹ پر جناب صدر نے تالیوں کی گونج میں کامیاب طلبا کو انعامات و اسناد تقسیم فرمائے۔

اس کے بعد جناب مولوی واجد علی صاحب و مدد سب رجسٹرار مولوی خواجہ قمرالدین صاحب، مولوی نور اللہ بیگ صاحب، مولوی محمد حسین صاحب منشی فاضل نے علم و ادب پر بڑی دلچسپ تقریریں کیں۔

آخر میں جناب صدر نے اپنا معلومات آفریں خطبہ صدارت پڑھا۔ جس کے ہر ہر جملہ میں موصوف کے علمی و ادبی خدمت کے جذبات موجزن تھے۔ صاحب ممدوح نے تعلیم بالغاں کی اہلیت اور اس کی ابتدائی عملی دشواریوں پر کافی روشنی ڈالتے ہوئے حاضرین جلسہ پر اس امر کی سخت ضرورت کا اظہار فرمایا کہ ہر پڑھے لکھے کا یہ فریضہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے فرصتی اوقات بجائے لغویات اور فضولیات میں گزارنے کے صرف پڑھنے یا پڑھانے میں گزارے۔ نیز علم و فن کی برکتوں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اور اس کے حصول کے کئی مختلف اور آسان ذرایع بتلائے۔ اور ریاست ابد مدت میں علم و ہنر کی دن دونی رات چوگنی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے سلطان العلوم کی عدیم النظیر علم نوازی اور علم و ہنر پر فیاضانہ بذل و نوال و توجہات کو خاص انداز میں پیش فرمایا۔ اس طرح اپنے بصیرت افروز خطبۂ صدارت کو حضرت سلطان العلوم و خانوادۂ آصفی کی صحت و سلامتی کی دعا پر ختم فرمایا۔ حاضرین جلسہ نے خطبہ بڑی گرمجوشی سے سنا۔ اس موقع پر ہر فرد یہ محسوس کر رہا تھا کہ تعلقہ کشتگی کی تاریخ میں یہ پہلا جلسہ ہے جو خالص علمی و ادبی مقاصد کا حامل ہونے کے اعتبار سے اپنی آپ نظیر ہے۔ تعلقہ کشتگی زمانہ ماضی میں ایسی کوئی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔ مختصر یہ کہ جلسہ بیحد کامیاب رہا۔ یہاں کی عام پبلک اور عام عہدہ داران نے کارکنان جلسہ کی دل کھول کر داد دی۔ آخر میں جناب صدر مدرس صاحب نے اپنی تقریر کے بعد حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ اور خسرو دکن خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ و خانوادۂ آصفی کے لئے دعائے صحت و سلامتی پر جلسہ برخاست ہوا۔

بسنتپا
معتمد ادارۂ ادبیات اردو شاخ کشتگی

اردو انسائیکلوپیڈیا

معتمد صاحب اردو انسائیکلوپیڈیا نے حسب ذیل اطلاع اشاعت کے لئے روانہ کی ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو جس کو ملک کے ذی علم حضرات کی علمی اعانت اور ذی مرتبہ امراء کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے کم و بیش دس سال سے زبان و ملک کی مسلسل خدمت کر رہا ہے اس کا کام مختلف علوم و فنون کے بارہ شعبوں میں پھیلا رہا ہے جس کے زیر نگرانی اب تک بہتر (۷۲) سے زیادہ کتابیں شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔

بہت غور اور متعدد صاحبان علم و فضل سے تبادلۂ خیال کے بعد اس نے گزشتہ اردو انسائیکلوپیڈیا شائع کرنے کا تصفیہ کیا۔

چونکہ اس کی ترتیب و تالیف کے لئے متعدد علوم و فنون کے ماہرین کے اشتراک عمل کی ضرورت تھی اس لئے سب سے پہلے اس نے ہندوستان کے متعدد ماہرین علوم و فنون کو قلمی اعانت پر آمادہ کیا۔ انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب و تالیف میں اس کا خاص طور پر خیال رکھا جا رہا ہے کہ مختلف علوم و فنون کے الفاظ ماہرین ہی سے لکھوائے جائیں اس سلسلہ میں ساری انسائیکلو پیڈیا کو مختلف علوم و فنون کے متعدد شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ہر شعبہ کی نگرانی ایک ماہر کے تفویض کر دی گئی ہے جو معاونین کی مدد اور مجلس انتظامی کی عام نگرانی میں شعبے کے جملہ الفاظ پر نوٹ مرتب کر رہا ہے۔ فی الوقت حسب ذیل ماہرین اور علماء اپنی نگرانی میں مضامین متعلقہ کا کام شروع کر چکے ہیں۔

معاشیات۔ ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی ایم اے آکسن بار ایٹ لا صدر شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ۔ تاریخ۔ پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی ایم اے آکسن بار ایٹ لا صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ تہذیب و ثقافت۔ ڈاکٹر ایشور ناتھ صاحب ٹوپا ایم اے پی ایچ ڈی، پروفیسر انڈین کلچر جامعہ عثمانیہ۔ ریاضی۔ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ایم اے، پی ایچ۔ ڈی۔

سائنس۔ ڈاکٹر قاضی معین الدین ایم ایس، سی پی ایچ، ڈی۔ پروفیسر نظام کالج و ڈاکٹر رام لال ایم ایس، سی پی ایچ، ڈی۔ السنہ قدیم و جدید ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب ایم اے، ڈی فل مہتمم کتب خانہ آصفیہ۔ فلسفہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی، ایچ، ڈی۔

تعلیمات و تدریسات مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے پرنسپل ٹریننگ کالج۔ طب ڈاکٹر منور علی صاحب ایف، آر سی ایس، ڈاکٹر قاسم حسین صاحب صدیقی ایم آر، سی، ایس، ایل آر سی پی (لندن) کارونر بلدہ۔

نباتیات مس جیسی سندی بی اے، آنرز آکسن۔ کھیل۔ یس، ایم ہادی، بی اے کیمبرج۔ اردو زبان و ادب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ، ڈی (لندن)، و پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے، ایل ایل بی۔ ہندی ادب اور دیگر پنڈت ونشی دھر ودیا النکار۔ کنڑی و مرہٹی وغیرہ۔ رگھناتھ راؤ بھساری ایم اے، و ڈی، کے بھیم سین راؤ ایم اے، انڈکس کی ترتیب اور مقالے لکھوائے جانے کا انتظام تیزی کے ساتھ جاری ہے ان کے علاوہ بہت سے مشاہیر علماء و فضلاء ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے دوسرے علوم و فنون کے ضمن میں قلمی اعانت فرما رہے ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد باقر ایم اے، پی ایچ، ڈی، لاہور۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ایم اے، لکھنؤ۔ احمد شاہ بخاری پطرس ایم اے، دہلی۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی پونا اور پروفیسر ودوا الہ آباد وغیرہ۔ ترتیب و تالیف کی نوعیت اور معیار کا صحیح اندازہ پیش کرنے کے لئے زیر اشاعت انسائیکلو پیڈیا کے چند اوراق بطور نمونہ الگ شائع کر کے ہفتہ عشرہ میں صاحبان ذوق و نظر کی خدمت میں بغرض تبصرہ بھیجے جائیں گے۔

اردو انسائیکلو پیڈیا جیسی علوم و فنون کی ضخیم کتاب کی ترتیب و تدوین کے لئے ہمیں بیسیوں ماہرین کی قلمی اعانت درکار ہے اس لئے ہم بے حد ممنون ہوں گے اگر وہ علماء و فضلاء جن کا اب تک ہمیں تعاون حاصل نہیں رہا اور جو از راہ علم دوستی ہمارا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں مطلع فرمائیں کہ انہیں کن خاص علوم و فنون سے دلچسپی ہے تاکہ ہم ان کی قابلیتوں سے استفادہ کر سکیں۔

وقت کی دو اہم چیزیں

نازیت ۔ مصنفہ شاہد حسین رزاقی ۔ مصنف نے بتایا ہے کہ نازیت اور ہٹلر یہم معنی لفظ نہیں ہیں۔ یہ سمجھنا کہ نازیت کا تخیل ہٹلر کی دماغی پیداوار ہے اور ہٹلر نہ رہے تو نازیت خود بخود دفنا ہو جائے گی بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہٹلر نازیت کی پیداوار ہے اور یہ نظریہ در اصل ایک جدید ارتقاء کا نتیجہ ہے جسے ہٹلر نے پروان چڑھایا۔

مصنف نے آخر میں نازیت کے اچھے اور برے پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نازیت کا موجودہ ارتقاء ایک بحرانی کیفیت میں ہوا ہے اس لئے ہٹلر کے وجود سے قطع نظر بھی اس کا دیرپا ہونا مشکل ہے قیمت (۱عہ)

اسلامی ممالک کی سیاست ۔ مصنفہ عشرت علی صدیقی ۔ مصنف نے اس کتاب میں مختلف اسلامی ملکوں کے سیاسی اور تاریخی ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ جنگ عظیم سے پہلے مصر، ٹرکی، عراق، عرب، ایران وغیرہ کی کیا حالت تھی جنگ عظیم کے اختتام پر ان کی سیاسی اہمیت کیا باقی رہ گئی۔

مصنف نے یہ بھی بتایا ہے کہ جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد ان ملکوں میں کس قسم کی سیاسی تحریکیں اٹھیں ان کا کیا حشر ہوا اور موجودہ وقت میں ان کی سیاسی اور جنگی پوزیشن کیا ہے۔

اسلامی ملکوں کی موجودہ سیاست اس وقت کا نہایت اہم مسئلہ ہے اور ایسے وقت میں جب کہ ہر شخص اسلامی ممالک کی موجودہ سیاست کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے یہ کتاب بہت اہم ہے۔ قیمت عہ۸

قومیت اور بین الاقوامیت (زیر طبع)، **بحر الکاہل کی سیاست** (زیر طبع)

صدر دفتر ۔ مکتبہ جامعہ قرول باغ نئی دہلی

شاخیں ۔ (۱) مکتبہ جامعہ جامع مسجد دہلی (۲) مکتبہ جامعہ امین آباد پارک لکھنو (۳) مکتبہ جامعہ بیرون لوہاری دروازہ لاہور (۴) مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

ایجنسیاں

۱ کتاب خانہ عابد شاپ حیدرآباد دکن ۔ ۲ سرحد بک ایجنسی بازار قصہ خوانی پشاور

(پتہ میں ایشیا میرٹھ (یو پی) لکھنا نہایت ضروری ہے)

نئے ہندستانی ادب کا آئینہ

ذہنی اور دماغی آزادی کا واحد پیامی

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہانہ رسالہ

ایشیا

میرٹھ

تیس صفحات

"جو ادب زندگی اور قوم کو کوئی خاص خیال نہ دے سکے وہ ادب نہیں محض تمسخر ہے اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کی موجودگی میں تمسخر کی فرصت نہیں" "ایشیا" نے اس بھید کو معلوم کر لیا ہے اس کا ادب ذہنی اور دماغی آزادی کا واحد پیامی ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ انسان کی سوئی ہوئی خود مختاریت کو بیدار کر دے اور اس شمع کو روشن کر دے جسے اوہام اور غلامی کے تند و تیز جھونکوں نے بجھا دیا ہے۔

وہ ہندستانیوں کو سیاسی، معاشرتی اور مدنی طور پر دنیا کی مہذب قوموں کے دوش بدوش کھڑا کر دینے کے لئے داغ بیل ڈالتا ہے اور نہ صرف ملکی آزادی کا پجاری ہے بلکہ ممکن طور پر ایک عالمگیر برادری بنانے کے خیال کو بھی پیش کرتا ہے، آزادی اور اس سے پیدا ہونے والی مساوی راحت و عزت اس کا مقصود ہے۔

ایشیا کو ملک کے اعلیٰ ترین نقاد و مفکرین، مدبر، فلسفی اور مشاہیر شعراء کی پشت پناہی کا فخر حاصل ہے اور وجدان و عمل کے عناصر کو یکساں رکھنے کے لئے زندگی کے نازک اور اعلیٰ ترین مسائل کے ساتھ ساتھ بہترین ترقی یافتہ ادب اس کی خصوصیت ہے۔

انقلابی و قومی نظمیں، نفسیاتی افسانے، بہترین سیاسی و علمی مقالے جو ماد دینے والی اعلیٰ ترین شاعری اور دنیا کی تمام سیاسی فضا پر مدبرانہ شذرات اس کا طرۂ امتیاز ہیں۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت سالانہ پیشگی صرف پانچ روپے نمونے کا پرچہ ۸ر وصول ہونے پر روانہ ہوگا۔

نوٹ

چونکہ ایشیا کثیر الاشاعت ہے، اور ہندستان کے گوشے گوشے میں پہونچتا ہے اس لئے تجارت کو ترقی دینے کا بہترین ذریعہ ہے۔ تاجروں کے لئے نرخ اشتہارات مناسب اور مقابلتہً کم مقرر کئے گئے ہیں۔

منیجر ایشیا ادبی مرکز میرٹھ

(ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں)

نام کتاب	صفحات	روپیہ	آنہ	پائی
من کی بینا	۸۰	۰	۸	۰
سرگذشت غالب	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
دکن نمبر (۷۸ تصاویر) ...	۱۶۸	۲	۰	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں	۱۶	۰	۲	۰
سر سالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم .	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اعمال نمبر	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی ...	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب ..	۵۶	۰	۲	۶
" دوسری کتاب ...	۵۶	۰	۴	۶
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر	۹۶	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴	۱	۰	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰
رسائل طب	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہر	۴۰	۰	۴	۰

نام کتاب	صفحات	روپیہ	آنہ	پائی
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈ سورتھ اور اسکی شاعری...	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی مد مرنگ مس ...	۸۹	۱	۰	۰
ٹیگور اور ان کی شاعری ...	۱۲۸	۱	۴	۰
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۲۰	۰	۱۲	۰
نبض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر...	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) " ...	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن ...	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۰۵	۱	۰	۰
مدارس میں اردو ...	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ	۱۱۳	۱	۰	۰
نذر دکن	۱۰۴	۱	۴	۰
روح غالب	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء ...	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی	۲۱۲	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہد
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M 3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
جون سنہ ۱۹۴۱ع

جلد ۴	بابت جون سنہ ۱۹۴۱ع	شمارہ ۶

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ ادارہ ادبیات اردو کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں اردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں کے پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابلِ اشاعت متصور نہ ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بےلاگ تنقید کرکے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کرکے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۴۸) صفحات اور زیادہ سے زیادہ ۹۶ صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کریگا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے۔

(۷) جواب طلب امور کے لیے جوابی پوسٹ کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وہ ہر یا دی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر خیریت آباد سے شایع ہوا۔

وفا مجھ سے ہوگی!؟

نہیں مجھ سے ہوگی ——— وفا اس جہاں میں!!

افق کی طرف تک رہی ہو ابھی تک　　　　پریشان و حیراں کھڑی ہو ابھی تک
مرا راستہ دیکھتی ہو ابھی تک　　　　تم اشکوں کی یکسر لڑی ہو ابھی تک
نگاہوں میں برق و شرارِ محبت
سراپائے صد انتظارِ محبت
گماں بھی نہیں ہے خطا مجھ سے ہوگی!　　　　وفا مجھ سے ہوگی؟ نہیں مجھ سے ہوگی
وفا اس جہاں میں!؟

(۲)

جہاں خیر و شر میں نہاں ہے مشیت　　　　جہاں خود مناظر ہیں اذنِ بغاوت
جہاں گھات میں خود ہے صیادِ فطرت　　　　جہاں دام بردوش بیٹھی ہے قدرت
وہاں مجھ سے عہدِ وفا چاہتی ہے
یہ کیا کہہ رہی ہے، یہ کیا چاہتی ہے
تمنا کی تکمیل کیا مجھ سے ہوگی!؟　　　　وفا مجھ سے ہوگی؟ نہیں مجھ سے ہوگی
وفا اس جہاں میں!؟

(۳)

یہ پھولوں میں جگنو فلک پر ستارے　　　　یہ دہکے ہوئے آرزو کے شرارے
یہ ہر کو بہارے یہ ہر سو نگارے　　　　یہ بہکی جوانی کے پیہم اشارے
گناہوں کے سیلاب، مستی کے طوفاں
یہ ہر اک نفس میں تباہی کے ارماں
بتاؤ برائے خدا مجھ سے ہوگی!؟　　　　وفا مجھ سے ہوگی؟ نہیں مجھ سے ہوگی
وفا اس جہاں میں!؟

یہ ہر موڑ پر حسن کی مسکراہٹ　　　　یہ ہر گام اک مستقل جگمگاہٹ
یہ ہر آن احساس کی کسمساہٹ　　　　نئی اک قیامت کے آنے کی آہٹ

تمھارے تصور پہ ہنستی ہوئی سی
محبت پہ آوازہ کستی ہوئی سی
یہ فطرت کی توہین کیا مجھ سے ہوگی وفا مجھ سے ہوگی، نہیں مجھ سے ہوگی
وفا اس جہاں میں!؟

(۴)

یہ گلشن، یہ بھونرے، یہ کلیاں یہ کانٹوں کی مٹھی میں مالن کا دامن
یہ ڈھلکا سا آنچل کھلا سا گریباں گجردم ہوا، جیسے باب خمستاں
نفس در نفس یہ گلابی تقاضے
مری تشنگی اور شرابی تقاضے
یہ پینے کی عادت فنا مجھ سے ہوگی وفا مجھ سے ہوگی نہیں مجھ سے ہوگی
وفا اس جہاں میں!؟

(۵)

یہ دنیا، یہ دنیا کی جہد مسلسل دل و جاں ہیں کیف و درد و پیہم
یہ سر پر فلاکت کے گھنگور بادل یہ تپتا کا صحرا، تباہی کا جنگل
یہ بھوکی محبت، یہ پیاسی جوانی
مٹا دے مجھے اے غم زندگانی!!
اس افلاس و غم میں بھلا مجھ سے ہوگی وفا مجھ سے ہوگی، نہیں مجھ سے ہوگی
وفا اس جہاں میں!؟

(۶)

جہاں اب بھی جاری ہے بردہ فروشی بنام ترقی، بہ طرز غلامی
جہاں مفلسوں کی محبت ہے تلتی بر اندازۂ ذوقِ سرمایہ داری
یہ گونگی تمنا، یہ ارمان بہرے
محبت پہ بیٹھے ہیں سکوں کے پہرے
محبت کی قیمت ادا مجھ سے ہوگی وفا مجھ سے ہوگی، نہیں مجھ سے ہوگی
وفا اس جہاں میں!؟

(۷)

درختوں پہ یہ چاندنی کا مچلنا اندھیرے میں یہ مستی کا مچلنا
خودی کی تڑپ، بے خودی کا مچلنا یہ ہر موڑ پر زندگی کا مچلنا
یہ گنگا کی گودی، یہ جمنا کے دھارے
ہجوم حسیناں، کنارے کنارے
نہ دیکھوں انھیں یہ خطا مجھ سے ہوگی وفا مجھ سے ہوگی، نہیں مجھ سے ہوگی
وفا اس جہاں میں!!

(۸)

میں خود بھی تو ہوں نیکی و شر کی دنیا معاصی کا گھر، وعظ و منبر کی دنیا
تمنا کا بت خانہ، آذر کی دنیا مئے و جام و مینا و ساغر کی دنیا
بزرگوں کی بدیوں نے پالا ہے مجھ کو
تو نیکی کے سانچے میں ڈھالا ہے مجھ کو
یہ خلقی صفت کیا جدا مجھ سے ہوگی وفا مجھ سے ہوگی، نہیں مجھ سے ہوگی
وفا اس جہاں میں!!

(۹)

جہاں شمع روشن ہے بجھنے کی خاطر جہاں کے نوا سی ہیں مٹنے میں ماہر
جہاں زندگی جبر ہے موت جابر جہاں بے وفائی ہے اک امر ظاہر
جہاں موت عہدِ وفا توڑتی ہے
محبت کو بے آسرا چھوڑتی ہے
یہ سنگیں حقیقت جدا مجھ سے ہوگی وفا مجھ سے ہوگی نہیں مجھ سے ہوگی
وفا اس جہاں میں!!

(باجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ) ساغرؔ (نظامی)

بھابی جان کی سہیلیاں

دوست احباب کس کے نہیں ہوتے. آپ کی بھی سہیلیاں ہوں گی. مگر گستاخی معاف ـــــ ایسی بے تکی نہ ہوں گی ـــــ ان کی سہیلیوں کا تو کچھ باوا آدم ہی نرالا ہے. ان میں سے کوئی بھی تو سلیقہ کی نہیں. یعنی ایسی کہ جن کے ہم مرید ہو جائیں کونسا وقت کسی سے ملنے کا ہوتا ہے. کب کسی کو ملنے لانے میں سہولت ہوتی ہے، آدابِ محفل میں کون کون سی باتیں شریک ہیں، آمد و رفت کا مفہوم کیا ہے، غرض یہ اور ایسی بہت سی باتیں ہیں جن کو ان کی بے ڈھنگی سہیلیوں نے کہیں سیکھا ہی نہیں وقت بے وقت آندھی کے آموں کی طرح نازل ہو جاتی ہیں. جی جل کر خاک ہو جاتا ہے. ہمارے جی کا کیا ہے. یہ تو آئے دن جلتا رہتا ہے. ان کی کسی کو کیا پروا. وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ مزے لے لے کر گفتگو کرنے میں مصروف ہو جاتی ہیں اور آفت ہم غریبوں پر آتی ہے. میں اور نجمہ ان کی بے جا ناز برداریوں اور خاطر داریوں میں لگ جاتے ہیں. پھر ذرا اگر چونے سے پان کھسک جائے تو پھر پھوہڑ، بدسلیقہ، بے گتے ہونے کی صلواتیں تو ہمارے گلے کا ہار بنے رکھی ہوئی ہیں. کچھ نہ کرو. کسی بات میں دخل نہ دو. تو پھر اس کا صلہ اور طریقے سے ملتا ہے "ہماری قدر ہوتی تو ہماری سہیلیوں کی بھی خاطر کی جاتی آج ہماری اپنی بہنیں ہوتیں تو تم دیکھتیں. پھر نجمہ بہتر ہے. فریدہ کو اکمل کھری جگ میں بری. آدم بیزار. اس کو تو انسان کی صحبت سے جیسے ڈر لگتا ہے. اس نے غزالوں کے طرز سیکھے ہیں. کسی کا اپنے گھر آنا اسے پسند ہی نہیں. یہ اپنے ملنے والوں سے کب ملتی ہے. فریدہ جو نام ہے!"

بھابی جان ذاتیات پر خوب حملے کرتی ہیں. یہ ان کی فطری کمزوری ہے. اور یوں بھی ان کا دماغی توازن ذرا کے خدا میں خراب ہو جاتا ہے. کسی کی ذرا سی بات ان سے نہیں اٹھتی. بلا کی نازک مزاج ہیں. ہیں نا بڑے اللون تللوں کی. ماں باپ کی اکلوتی ایک ہیں. مگر اس ددتیم کو یہ بھی تو سزاوار نہیں کہ وہ اوروں کے دل اس طرح توڑے. ناز نخروں میں پلنے والے بچے زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے. وہ ہر جگہ اس کی توقع رکھتے ہیں کہ ان کی بیجا ناز برداریاں کی جائیں. اور جب ان کی یہ امید بر نہیں آتی تو پھر انسانیت کے جامے سے باہر ہو جاتے ہیں یہ وہ دن ہمیشہ کہاں رہیں گے کہ وہ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیں. زمانہ ایک روش پر نہیں رہتا. یوں بھی ان کی سب ہی ہر ممکنہ خاطر کرتے ہیں جن کو وہ ظاہر داریوں پر محمول کرتی ہیں. ان کو کسی کے خلوص پر بھروسہ ہی نہیں. سوائے اپنی چہیتی سہیلیوں کے جن میں ایک بھی ڈھنگ کی نہیں!!

ان کی ایک سہیلی ہیں صفیہ. ان کے آنے کا تو کوئی وقت ہی معین نہیں. خصوصاً دوپہر کے وقت یہ آئیں گی ہمارے گھر کے آرام و اطمینان کو درہم برہم کرنے. بارہ سے چار بجے تک. یہ گرمیوں کی طویل دوپہر، جب کہ ساہرن بھی کالا ہو جاتا ہے ایسے شیطانی وقت میں ان کا پھیرا ہوتا ہے. پھر بچوں کی بھی خیر سے، ساتھ خاصی پلٹن رہتی ہے جو ادھر ادھر مچا کر ناک میں دم کر دیتے ہیں. بہن کے بچے، بھائی کے بچے

محلے کے بچے ان کے دُم چھلے بنے رہتے ہیں۔ موٹر خاصی مرغیوں کا ڈربہ بن جاتی ہے۔ کوئی اپنا بچہ ہو تو بھی یہ وقت ساتھ لانے کا نہیں ــــ دوسرے سہیلی ہیں غزالہ ــــ بڑی روشن خیال۔ نئی روشنی کی زد میں آئی ہوئی جس چراغ کے نیچے اندھیرا نہیں ایسی فضا میں پلی ہوئی۔ یہ بڑی فیشن پرست ہیں۔ جدید فیشن کی ہر اچھی چیز کا ایک جیتا جاگتا اشتہار۔ موٹر خود چلاتی ہیں ۱۱ بجے رات تفریح کو نکلتی ہوئی آجاتی ہیں۔ پھاٹک عموماً ۱۰ بجے کے بعد بند رہتی ہے تو اس کو خوب زور زور سے پیٹا جاتا ہے۔ اس وقت عام طور پر گھر کے لوگ سوتے یا سونے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور یہ رحمانی فرشتہ نازل ہو کر چین و آرام میں خلل انداز ہوتا ہے۔ نیند جو بڑی خوشامدوں سے آرہی تھی وہ ایسی غائب ہو جاتی ہے کہ پھر ہزار کچھ کرو ــــ نہیں آتی ــــ ان کی تفریح ہو جاتی ہے اور ہم کو اذیت ــــ

تیسری جو ہیں محمودہ ــــ ان کو تو ٹپکنے کا مرض ہے۔ جب کبھی گھر پر سے کہیں جائیں گی منہ پر ٹپک جائیں گی۔ آتے ہوئے بھی اور جاتے ہوئے بھی۔

بھابی جان سے میں نے ایک روز کہا "اتنی ہر دل عزیزی وبال جان نہیں ہو جاتی؟" تو وہ منہ چڑا کر کہتی ہیں "نہیں تو شاید تیرے جیسے سنیاسی۔ خدا نہ کرے کوئی ہو۔ ملنے کے نام سے بھاگتی ہے۔ جیسے ملک الموت روح قبض کرنے آتے ہیں"۔ میں بھی اکڑ کر کہنے لگی "ہم میں فرشتوں کی ارواح ہے ہم انسانوں میں نہیں مل سکتے ــــ " "بس بہت آپ اپنے کو سمجھنے لگی ہیں۔ اُفوہ ــــ اب تو فرشتوں سے ساز باز ہے۔ خدا خیر کرے۔"

گر نوج میں ڈھائی ایسی دوست نوازی ہے۔

میرا تو ناطقہ بند ہو گیا۔ نیند اور چین تو جب سے یہ گھر آئی ہیں مفقود ہو گیا ہے۔ ہم جانتے ہی نہیں اطمینانِ قلب کس چڑیا کا نام ہے۔ بھائی جان کے بھی اتنے دوست نہ ہوں گے جتنی ان کی سہیلیاں ہیں۔ وہ تو بچارے کلب کی حد تک ان کی دوڑ ہے۔ ان سے پیچھا کون چھڑائے۔ ذرا آپ ہی کوئی حل بتائیے ؎

فلک ہم تو تیرا بھی شکوہ نہ کرتے
مگر تجھ کو ڈھب ہی نہ آیا جفا کا

ایک دن ان کے پاس کوئی خاص پارٹی تھی۔ بہت سی سہیلیاں شہد کی مکھیوں کی طرح بھن بھنا رہی تھیں۔ سینما کے گیت اور نقرئی قہقہوں سے ان کا خوبصورت، جرمن اسٹائل سجا ہوا برآمدہ معمور تھا۔ خوبصورت رنگین خوش وضع ساڑیوں سے اس کی رونق بڑھ گئی تھی۔ بھابی جان ایک پھول تھیں جن کے اطراف اتنی تتلیاں گھوم رہی تھیں۔ ایک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ جیسے دس دس برس کی لڑکیاں۔ ذرا سنجیدگی، متانت، حلم و بردباری نہیں۔ بالکل کچھ عجیب و غریب طبیعتیں۔ والدہ ادھر کسی کام پر آنکلیں تو نہ ان کا ادب نہ قاعدہ۔

ایک ایسا سلام جیسے کوئی منہ پر سے مکھی اڑا دے۔ اور پھر بیٹھ جانا۔ ان کے اٹھنے کا انتظار بھی نہیں نہ ان کو بیٹھنے کے لئے کہنا۔ یہ ہے ادھوری تعلیم کا اثر۔ انسانی فطرت پر ماحول کے جو اثرات پڑتے ہیں وہ تو رہے الگ۔

امّاں تو تھوڑی دیر ٹھہر کر وہاں سے چلی گئیں۔ میں اور نجمہ گانے کی آواز سن کر بے چین ہو گئے۔ سامنے وہاں جانے کی ہمیں سوجھی۔ مگر میری تو حسرت سے نکل بھول پھڑ جاتی ہیں۔ نورہ تو بہار بیان کے رخسار مجھے دیکھ کر تمتمانے لگے۔ خفگی سے ان کا چہرہ پھول گیا — صرف نجمہ ہوتی تو وہ اتنی برہم نہ ہوتیں۔ کیونکہ اس کے منہ میں تو زبان ہی نہیں۔ لیکن — میں جو وہاں موجود تھی آنکھوں کا ٹھیکرا —!

جہاں بانو بیگم

محسوساتِ ماہر

جگر میں درد پایا جا رہا ہے　　مجھے شاید بلایا جا رہا ہے

نقابِ رُخ اٹھایا جا رہا ہے　　وہ نکلی دھوپ سایا[1] جا رہا ہے

مریضِ غم کو آ کر دیکھ جاؤ　　کہ تم پر حرف آیا جا رہا ہے

یہ روز و شب، یہ برق و ماہ و انجم!　　تماشا سا دکھایا جا رہا ہے

الٰہی خیر! میری حسرتوں کی　　نشیمن پھر بنایا جا رہا ہے

وہ آئے موت کا پیغام بن کر　　کشاکش سے چھڑایا جا رہا ہے

نگاہیں بھی رہیں کچھ بہکی ہوئی سی　　قدم بھی لڑکھڑایا جا رہا ہے

وہ خاکِ دل سے بچ کر چل رہے ہیں　　ابھی تک آزمایا جا رہا ہے

اجل ہے زندگی کا دورِ ثانی　　قدم آگے بڑھایا جا رہا ہے

ستارے سسکیاں سی لے رہے ہیں　　کسی کا دل دکھایا جا رہا ہے

سناتے ہو کسے روداد ماہر
وہاں تو مسکرایا جا رہا ہے

ماہر القادری

[1] سایہ

مہاراجہ بہادر کی یاد

مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کو انتقال کئے ہوئے ایک سال گزر گیا۔ وہ اردو کے ایک بہت بڑے سرپرست اور دلدادہ تھے اس لئے یہ مضمون سب رس میں خاص طور پر شریک کیا جا رہا ہے۔ ذیل کا مضمون مولوی غلام علمبردار صاحب کا ہے جو مہاراجہ کے معتمد علیہ تھے ان کو مہاراجہ سے جو تعلق اور عقیدت تھی اس کا اندازہ اس مضمون سے ہو سکتا ہے۔

مہاراجہ بہادر کی پیشی میں بارہ سال سے زیادہ رہنے کی بدولت مجھے مرحوم کی شخصیت و کردار کے مطالعہ کا جو موقع ملا ہے اسی کی بنا پر میں چند واقعات کا ذکر مہاراجہ کے بے شمار دوستوں میں ان کی یاد تازہ کرنے کے لئے سپرد قلم کرتا ہوں۔

راجہ راجایاں راجہ سرکشن پرشاد مہاراجہ آنجہانی یمین السلطنۃ اس ریاست ابد مدت کے نہ صرف ایک بڑے امیر، بڑے مدبر اور عالی مرتبت شخصیت تھے، بلکہ انھوں نے جو وقار خانوادۂ آصفیہ کے سایۂ عاطفت میں حاصل کیا وہ ان کے خاندان میں تو کیا سلطنت آصفیہ میں بھی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے۔ ملک و مالک کے ساتھ غیر متزلزل وفاداری و جاں نثاری مہاراجہ آنجہانی کا شعار تھا۔ انھوں نے رفاہ عام کے نمایاں کام انجام دئے، جن کے صلے میں حکومت نے ان کو متعدد اعزاز اور بڑے بڑے خطابوں سے سرفراز فرمایا۔ اگر ایک طرف مالک مجازی نے ان کی عزت کو انتہائی عروج پر پہنچایا تو دوسری طرف سرکار عظمت مدار سے بھی وہ اپنی کارگزاری کے اعتراف میں برابر خراج تحسین حاصل کرتے رہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۳ء میں کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ اور سنہ ۱۹۱۱ء میں جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ کے خطابات حاصل کئے۔ آخر الذکر خطاب عام طور پر ہندستان کے حکمران رئیسوں کو عطا کیا جاتا ہے۔

مہاراجہ آنجہانی کی سخاوت، ہر دلعزیزی، اخلاق، فقیر دوستی، مذہبی مساوات، مروت، نیک نفسی، علم نوازی اور انسانی ہمدردی کے پورے واقعات تحریر میں لانا ممکن نہیں لیکن ان کی ہمہ جہتی شخصیت کو ظاہر کرنے کے لئے چند سبق آموز واقعات کا ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا۔

مہاراجہ بہادر چند سال قبل دہلی سے براہ بمبئی حیدرآباد تشریف لا رہے تھے یورپ کے ایک اسلامی شاہی خاندان کے رکن جو گردش زمانہ کے ہاتھوں مصیبتوں کا شکار تھے، مہاراجہ بہادر سے بمبئی میں ملاقات کے لئے آئے اور اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے مہاراجہ نے اپنی پیشی کا صندوق طلب فرمایا۔ طویل سفر کے اخراجات کے بعد صندوق میں سَو سَو کے گیارہ نوٹ باقی رہ گئے تھے۔ مہاراجہ نے پوری رقم لفافے میں بند کر کے شاہزادے کے حوالے کر دی اور پھر مجھے تحریر فرمایا کہ

"آپ لوگ جو کچھ چاہیں خیال کریں مگر میں ایک شاہی
خاندان کے فرد کی آنکھوں میں آنسوؤں کی تاب
نہ لا سکتا تھا اس لئے جو میرے پاس تھا میں نے
ان کو دے دیا حیدرآباد واپس جانے کا انتظام
کسی طرح کر لیجئے۔"

اسی روز حیدرآباد سے ذریعہ تار رقم طلب کی گئی اور رقم
وصول ہونے پر جب مہاراجہ سے عرض کیا گیا تو ارشاد فرمایا کہ

"قربان میرے مالک کے کہ اس نے حاجت مندوں
کی حاجت روائی کے لئے کبھی میرے ہاتھ کو نہ
روکا اور جو جس کے نصیب کا ہے اس کو ان
ہاتھوں سے پہونچاتا ہے۔"

مہاراجہ ممدوح کی سخاوت کی ایک اور دل فریب مثال ان کا
یہ قول تھا کہ

"جب کبھی میرے صندوق میں کافی روپیہ ہوتا
ہے تو مجھے چین سے نیند نہیں آتی۔"

ملک والوں کے دلوں میں مہاراجہ کی جو محبت تھی اور وہ جس قدر
ہر دلعزیز تھے اس کا ثبوت ایک معمولی واقعہ سے پایا جا سکتا
ہے۔ جب صدارت عظمیٰ پر تقرر کے بعد مہاراجہ آنجہانی پہلی
مرتبہ محبوب نگر کے دورہ پر تشریف لے گئے تو وہاں پبلک
کی جانب سے عبدالحفیظ صاحب وکیل نے یہ رباعی سنائی
جو پبلک جذبات کی صحیح ترجمان تھی۔

مہاراجہ مسرت سے یہاں پھر شاد شاد آئے
پھر اپنوں کا خیال آیا انھیں پھر اپنے یاد آئے
یمین السلطنۃ اب صدر اعظم ہو کے آئے ہیں
مبارک ہو یہ آنا با حکومت بامراد آئے

اسی طرح اخلاق کی ایک معمولی مثال ہے کہ سرکاری مصروفیت
کے باوجود وہ تقریباً روزانہ متعدد دعوتیں قبول فرما لیتے
تھے اور ہر ایک سے یہی کہتے تھے۔

"جب آپ اس قدر محبت سے مجھے بلاتے ہیں
تو میرا فرض ہے کہ میں بھی آپ کی خوشی میں
شریک ہوں۔"

یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ مہاراجہ بہادر باوجود کبر سنی جوانوں
سے زیادہ ہمت و استقلال رکھتے تھے اور محض لوگوں کا دل
رکھنے کی خاطر بعض اوقات پانچ پانچ چھ چھ جگہ تھوڑی تھوڑی
دیر کے لئے تشریف لیجاتے تھے۔

اکثر فرصت کے اوقات میں برگزیدہ اور خدا رسیدہ
فقیروں اور درویشوں کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ اور
ارشاد ہوتا کہ

"گو نئی روشنی والے فقرا کی پروا نہ کریں
لیکن مجھے بعض ایسے ایسے کامل فقیروں کی
صحبت کا نیاز حاصل رہا ہے جن کی دعاؤں
نے فقیر شاد کی پریشانیوں کے وقت اپنا
پورا پورا اثر دکھایا۔"

فقیروں کی عزت و وقعت کا ہمیشہ خیال فرماتے اور یہی وجہ
تھی کہ ہر بزرگ اور فقیر کی دعائیں ہمیشہ مہاراجہ بہادر کے
ساتھ تھیں۔

ہر مذہب و ملت کی عزت و احترام کرنا مہاراجہ کا
شعار تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ مہاراجہ کی ڈیوڑھی میں نہ
صرف ہولی اور دسہرہ اعلیٰ پیمانہ پر منایا جاتا تھا بلکہ ہر
عید کے موقع پر بھی تزک و احتشام کے ساتھ خوشیاں
منائی جاتی تھیں۔ ممدوح ہر مذہب کے ہر تہوار کا پورا
احترام فرماتے تھے اور ایک سچے صوفی کی طرح انھیں

ہر مذہب سے مخلصانہ عقیدت تھی" پریم درپن " کے نام سے
مہاراجہ نے جو مثنوی لکھی ہے اس میں کیا خوب فرمایا ہے۔

میں ہوں ہندو میں ہوں مسلماں
ہر مذہب ہے میرا ایماں
شاد کا مذہب شاد ہی جانے
آزادی آزاد ہی جانے

مروت کی یہ کیفیت تھی کہ ایک معمولی تھیٹر کے منیجر کی استدعا و اصرار پر ایک تماشے کی سرپرستی قبول فرمائی اور شب میں جب چند احباب اور اسٹاف کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے تو یہ دیکھا گیا کہ تھیٹر کا ساز و سامان نہایت بوسیدہ اور ایکٹر بھی بالکل معمولی تھے۔ وقفہ میں بعض ساتھیوں سے تماشے کے متعلق دریافت فرمایا تو ہر شخص نے یہی عرض کیا کہ ڈریس اور تماشا دونوں بیکار ہے اگرچہ مہاراجہ کا بھی یہی خیال تھا لیکن مروت کا پاس کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

" میرے آنے سے منیجر کو جس قدر مسرت ہوئی ہے وہ میرے چلے جانے سے رنج میں مبدل ہو جائے گی "۔

چنانچہ تماشے کے ختم ہونے تک قیام فرمایا۔

مہاراجہ کے ایک دوست نے ولایت سے واپسی کے وقت ایک معمولی تحفہ لاکر پیش کیا جس کو مہاراجہ نے خندہ پیشانی کے ساتھ قبول فرمایا۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد ہی ایک صاحب نے عرض کیا

" آپ کی پوزیشن کے لحاظ سے انہیں تحفہ لاکر پیش کرنا چاہیے تھا۔"

جس پر برجستہ ارشاد ہوا کہ

" ہر چہ از دوست می رسد نیکوست ! "

چند سال قبل مولوی عبدالحق صاحب کے ہمراہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ملنے آئے تھے۔ مولوی صاحب نے مہاراجہ بہادر سے درخواست کی کہ وہ ایک مشاعرہ کی صدارت فرمائیں اور مصرعہ طرح تجویز کریں۔ ایک مہمان شاعر اور ممتاز ادیب کا لحاظ کرتے ہوئے مہاراجہ نے فرمایا کہ

" مصرعہ طرح کیفی صاحب تجویز کریں "

چنانچہ اصرار کے بعد کیفی صاحب نے مہاراجہ بہادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ

" اگر مجھ پر مصرعہ طرح چھوڑا گیا ہے تو میں غالب کا یہ مصرعہ تجویز کرتا ہوں"۔

" ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے "

یہ سنتے ہی مہاراجہ بہادر نے فی البدیہہ فرمایا۔

" کہتا ہے شاد بھی یہی کیفی سے با خلوص
ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے "

ایک مرتبہ بنگلور سے حیدرآباد کی واپسی کے وقت گدوال اسٹیشن سے چند میل گزرنے کے بعد جب کہ ریل تیز رفتار سے جا رہی تھی ایک ملازمہ کی لڑکی جو کھڑکی سے جھانک رہی تھی اتفاق سے گر پڑی ایک ہمراہی نے فوراً زنجیر کھینچی اور تھوڑی دیر بعد ریل ٹھیر گئی مہاراجہ بہادر بھی سیلون سے اتر کر تشریف لائے اور اس خون آلود بچی کو اٹھالیا اپنے سیلون تک لے آئے اور مرہم پٹی کروائی۔ مہاراجہ بہادر کی نیک نفسی اور خدا ترسی کا مزید ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ خود مہاراجہ اس بچی کی بیوہ ماں کو تسکین اور تشفی دیتے رہے۔ سالہا سال بعد بھی یہ غریب ماں مہاراجہ کی مہربانی کو یاد کرتی تھی اور ان کے حق میں دل سے دعائیں دیتی تھی۔

مہاراجہ آنجہانی ہمیشہ اس اصول پر مضبوطی سے کاربند تھے کہ خواہ کوئی شخص کتنی ہی برائی اور دشمنی کرے لیکن اس کے ساتھ ہمیشہ اس قدر نیکی کرو کہ وہ آخرش شرمندہ ہو جائے۔

مہاراجہ بہادر ایسی خوبیاں رکھتے تھے کہ ان کی یاد اہلِ ملک کے دلوں میں عرصہ تک برقرار رہے گی اور ان کا ذکر ہمیشہ عزت و محبت سے کیا جائے گا۔

غلام علمبردار

شالامار

سیاہ ابر سے تھم تھم کے پڑ رہی ہے پھوار — سرور و کیف کا منبع ہے صحنِ شالامار
چمن کی خاک سے رنگینیاں ہویدا ہیں — ہر ایک ذرے کے رخ پر جھلک رہی ہے بہار
برس رہے ہیں ہواؤں سے نغمۂ عشرت — ہجومِ کیف میں رقصاں ہے نرگسِ بیمار
نگاہِ شوق کو درسِ سرور دیتا ہے — مچل رہا ہے جو سبزے پہ سایۂ اشجار
فضا میں بادۂ سرجوش کی ہیں تاثیریں — جنوں کی زد پہ سنبھلنا ہے عقل کو دشوار

خزاں کا نام بھی مفقود ہے گلستاں سے — پیامِ عشرت و راحت سنا رہی ہے بہار
ضیا فروش ہے ہر سمت جلوۂ فطرت — جہاں تہاں میں گل و برگ و غنچہ کے انبار
بجا ہے کہیے اگر اس کو جنتِ ارضی — نظر پہ نشہ سا طاری ہے قلب ہے بیدار
یہ ایک خوابِ جناں تھا کہ خوابِ شاہجہاں — کہ ہو سکی نہ کہیں اس کمال کی تکرار
مگر ہیں دیدۂ عبرت میں اشکِ مایوسی — کہ بزمِ دہر میں ممکن نہیں کسی کو قرار

نویدِ زیست میں پنہاں ہے مرگ کی تلخی
نہ شاہجہاں ہے نہ اک دن رہے گا شالامار

اختر ہوشیارپوری

تعطیل کا دن

تعطیل کا دن تھا، میں کمرہ میں بیٹھی اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھی..... شام کو ایک جگہ دعوت میں بھی جانا تھا، اور پھر ایک زمانہ سے الماری بند کی بند پڑی تھی۔ پہلی ہی ساڑی کو دیکھتی ہوں تو دل دھک سے ہو کر رہ گیا..... کیڑوں نے اچھا خاصا سوراخ بنا دیا تھا..... میں دوسرے کپڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ غنیمت ہوا کہ دوسرے کپڑے محفوظ تھے۔ سب سے نیچے میری شادی کا جوڑا رکھا ہوا تھا..... اسے اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے غور سے دیکھتی رہی، وہ دن..... جب دارز پسینہ پسینہ ہو گئی تھی اسے پہن کر..... پلٹ کر آئینہ میں دیکھتی ہوں تو میری نظریں خود بخود جھک گئیں..... دن گزر جاتے ہیں اور باتیں یاد رہ جاتی ہیں..... اسی طرح آئینہ میں خود کو دیکھتی کھڑی تھی کہ..... آتے ہی کہنے لگے..... "کیا اندر سبھا، کو جانے کی تیاریاں ہیں"..... میں نے پوچھا تھا..... اندر سبھا، کو..... میں..... بھلا کیوں؟" "پریاں نہیں تو پھر کون جاتا ہے"..... اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ہوا کے جھونکوں کے سہارے آسمان پر اڑی چلی جا رہی ہوں..... مجھے اس آواز کی گونج میں ہزاروں ساز چھڑتے سنائی دے رہے ہیں..... اور میں بادل کی طرح بہتی چلی جا رہی ہوں..... اس دن کو یاد کرتی ہوں تو آج بھی زندگی جھوم جاتی ہے..... اور مسرت لہرانے لگتی ہے..... صحن میں سے کونڈے کے ٹوٹنے کی آواز آئی تو میرے تصورات کی رنگین دنیا دھندلی پڑ گئی..... میں نے اس جوڑے کو تہہ کرتے ہوئے پوچھا "آخر یہ ہو کیا رہا ہے"؟

"تکلیف نہ ہو تو یہیں آ کر دیکھ لیجیے نا"...

"جی ابھی آئی"....

میں نے الماری بند کر دی، اور تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے کے باہر نکل گئی.... کہاں ہیں آپ؟ میں نے صحن میں چوطرف نگاہ دوڑاتے ہوئے پکارا..."جی یہاں اس پودے کے پیچھے" میں نے دیکھا پودوں کی دیکھ بھال ہو رہی ہے، سوکھی پتیاں توڑی جا رہی ہیں.... کونڈوں کو قرینے سے جمایا جا رہا ہے اور اس توجہ سے کام ہو رہا ہے کہ بالوں میں جالے الجھ گئے ہیں، اور پیشانی پر پسینہ کے قطرے ٹھہر گئے ہیں.... میں نے ہنستے ہوئے کہا "آج ان بیچاروں کی شامت آئی ہے جو آپ کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی.... کیوں مالی سے یہ کام نہیں ہو گا کیا؟" "جی مالی کو باہر بھیجا گیا ہے"...."تو اس کے آنے تک کیا یہ پودے سوکھ جائیں گے؟"...."مگر اس میں ہرج ہی کیا ہے" "اور یہ دھوپ جو ہے"....

اتنے میں مالی بھی آ گیا.... اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا.. ..میں نے بڑھ کر لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا.... دیکھتی کیا ہوں کہ میرے نام کا ہے .. "کس کا خط ہے" "جی میرے نام کا ہے....."...."نام تو اس پر میرا بھی ہو گا..." .... ہے... اور ضرور ہے... لیکن آپ اٹھئے یہاں سے" "اور پھر کہاں چلے"..... میں نے اپنے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے.... "وہاں".... ان پودوں کے کونڈوں کو جمائیے چلیے...."...

میں اپنے کمرے میں چلی آئی..... اور وہ ان چھوٹے چھوٹے پودوں کو پانی ڈالنے اور ان کی جڑوں کو کریدنے میں مصروف ہو گئے.... میں نے لفافہ چاک کیا....

تھوڑی دیر بعد آواز آئی "یہ کس کا خط ہے؟" ــــ میں نے جواب دیا ــــ "میری سہیلی کا..." .... "کون سہیلی؟" .... "بڑی مشکل ہے آپ سے کون سہیلی؟... کیسی سہیلی؟.... کہدیا کہ ایک ہے سہیلی، اور بس اسی کا خط ہے" پھر پوچھا جاتا ہے "نہیں بھئی آخر کون؟ میں نے دیکھا ہے اسے؟" ... "یہ خواب میں بھی تو نہ دیکھے ہوں" میں نے خط پڑھنا شروع کر دیا۔ "تو آپ نہیں کہیں گی یہ سہیلی آخر ہے کون بلا.... کوئی خوبصورت بلا ہے کیا...." "جی ہاں ہے تو پھر..." میں نے بناوٹی غصہ سے کہا.... اس پر وہ خاموش ہو رہے.... اور میں نے پورا خط پڑھ ڈالا دھیمے لہجہ میں کہنے لگے "اگر اس کونڈے کو اور ذرا آگے بڑھا دیا جائے تو...." "میرے سر پر ہی رکھ دیجے نا...." "اچھا اب کو آپ تکلیف نہ ہو تو اندر تشریف لائیے...." میں نے بڑی متانت سے کہا... وہ اندر آئے تو میں نے خط ان کے آگے بڑھا دیا.... "لیجئے ذرا پڑھئے اسے" انھوں نے خط کو اٹھالیا اور پڑھنے لگے.....

"پیاری بہن" "اچھا آپ عورتیں بھی ایک دوسرے کو پیاری کہہ لیتی ہیں..." "آپ نہیں پڑھیں گے میں جانتی ہوں" کہہ کر میں نے خط ان کے ہاتھ سے لے لیا....

"ہاں تو" "ہاں تو کیا۔ آپ بڑے وہ ہیں..." .... "اچھا لائیے خط" "نہیں دیتے اب...." .. "تو ہم چلے اپنے پیارے کونڈوں کے پاس" "جائیے روکا کس نے ہے".... اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے... اور پھر شروع ہوگئی کھٹ پٹ..... تھوڑی دیر بعد میں بھی قریب ہی جا بیٹھی.... "تو وہ تصویر دیکھی تھی نا آپ نے" "کیرکسی" انھوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا.... "وہی جو میری ایک سہیلی کی ہے؟" .... "بھئی آخر کیسی ہے وہ" ... "یہ مغل شہزادی کے لباس میں جو ہے" "اچھا وہ مگر وہ تو عجب گاؤدم ہے۔" "رہنے دیجے گاؤدم.... تو اس نے یہ خط بھیجا ہے۔ لکھا ہے کہ اب اس کی شادی ہونے والی ہے۔" "چلئے مبارک۔ ایک دعوت تو یقینی ہوگی....." "آپ سے میں نے کہا نہیں شاید..... بڑی اچھی لکھنے والی ہے..." "تو پھر سنائیے.... دیکھیں کتنے پانی میں ہے" "سنئے.. لکھتی ہے.... میری زندگی میں کچھ عجب انقلاب محسوس کر رہی ہوں، دل کا یہ حال ہے کہ ارمانوں کے ہجوم سے اُمڈا اُمڈ پڑتا ہے.... لیکن ساتھ ہی ایک نئی اور انوکھی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے جھجک رہی ہوں... اندیشوں اور دہشتوں کے بھیانک سائے بھی بڑھے چلے آ رہے ہیں.. لیکن.... تم سے چھپاؤں گی نہیں... آنے والی زندگی کے خیال نے میری کائنات ہی بدل ڈالی.... ایسا محسوس کرتی ہوں.... جیسے... جذباتِ مسرت کے ہیجان سے گھٹ کے رہ جاؤں گی... پرسوں وہ لوگ مجھے دیکھنے آئے تھے۔ کون لوگ؟ یہ نہ پوچھو.... ان کے آنے سے پہلے اماں نے مجھ سے کہا "ذرا کپڑے تو بدل ڈالو...." میں ان کا مطلب سمجھ گئی، اسی طرح آنکھیں نیچی کئے کہنے لگی.... "نہیں میں نہیں" اور دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی.... اندر سے زنجیر بھی چڑھا لی.... "کیا پہنوں" میں سوچنے لگی... اتنے میں دروازہ پر کھٹکا ہوا... "کون ہے" میری آپا آئی تھی۔ میں نے کمرہ کا دروازہ کھول دیا.... "کیا ہے؟" میں نے لسوتے ہوئے پوچھا... "کیا ہے کچھ نہیں...." اس نے اندر داخل ہوکر کہا... اور مجھے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے کہنے لگی.... "ارے آپ تو

ابھی۔۔۔" "میں نہیں پہنتی کپڑے وپڑے۔۔۔۔ بس جیسی اب ہوں ویسی ہی دیکھ لیں" مگر وہ تو ایک زمانہ کی باتونی کہنے لگی "میری بیگم ہو کر ایسی باتیں کرتی ہو۔۔۔۔ چلو ذرا مجھے اپنے کپڑے دکھاؤ"۔۔۔" نہیں دکھاتی" میں نے بناوٹی غصہ سے کہا۔۔۔۔ "ارے وہ لوگ کیا کہیں گے۔۔۔" "کیا کہیں وہ لوگ" "یہی کہیں گے کہ بچی کے پاس کپڑے ہی نہیں۔۔۔" میں بھولی بھالی۔۔۔ اس کے اس جملے کو سن کر اپنے سارے کپڑے اس کے سامنے پھیلا دیئے۔۔۔ "لے دیکھ"۔۔۔ "ہاں" اس نے اطمینان سے کہا۔۔۔ "تو اس میں سے کونسی ساڑی" "جو بھی تجھے پسند ہو۔۔۔" "یہ دھانی رنگ کی ساڑی کیسی رہے گی؟" اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا "مجھے پسند ہے۔۔۔۔" "تو پھر تیار ہو جاؤ، وہ لوگ بھی اب آتے ہی ہوں گے۔۔۔۔" میں نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ "سچ کہنا یہ لوگ مجھے دیکھ کر کیا کریں گے۔ ان کے دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟" وہ کمبخت میرے دل کی بات تاڑ گئی۔۔۔۔ "دیکھنا تو انہیں چاہیئے۔۔۔ کیوں"۔۔۔۔ اس کے اس جملہ پر میں کٹ کے رہ گئی۔۔۔۔ "ہاں اور نہیں تو کیا دیکھنا تو ہم دونوں کو چاہیئے۔۔۔" "ہم دونوں کون؟" "چل چپ بڑی آئی ہے بکواس کرنے" یکایک "ادھر آؤ" "ادھر لے جاؤ" کی گڑبڑ شروع ہو گئی "ارے" میرے منہ سے نکلا۔۔۔۔ "آ گئے" آپا بولی۔۔۔۔ اور بڑی پھرتی سے مجھے سنوارنے لگی۔ مجھ سے چپ نہ رہا گیا۔ پوچھی۔ "کون ہیں یہ جو۔۔۔" "اپنے محلے میں رہتے ہیں" "تو نے دیکھا ہے انہیں" "ہوں"۔۔۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر میں نے آہستہ سے پوچھا۔ "کیسے ہیں۔۔۔" "بس ہیں۔۔۔" "مگر کیسے ہیں"۔۔۔ "مجھے کیا معلوم؟" "بول تجھے میری قسم ہے" "تم نے دیکھا مجھے کیا ستا رہی تھی۔۔۔" "اچھے ہیں۔۔۔۔"۔۔۔۔ "اچھے کیسے" "اب یہ مجھے نہیں معلوم۔۔۔۔"۔۔۔۔ دالان میں عورتوں کی گفتگو کی آواز آ رہی تھی اماں نے آپا کو پکارا۔۔۔۔ وہ گئی اور تھوڑی دیر بعد واپس آ گئی۔۔۔۔ آنکھوں کے اشارے سے کہنے لگی "چلیئے"۔۔۔۔ جس کو دیکھتی تھی، مجھے ستانے اور چھیڑنے کے در پے تھا۔۔۔ اور یہ آپا تو سب سے زیادہ دق کر رہی تھی۔۔۔ تم دیکھتی رہنا۔۔۔ ایک دن انہیں کے ہاتھ سے نہ پٹوا دوں تو کہنا میرا حال بھی سنو۔۔۔ کھڑے ہونا چاہتی ہوں تو پاؤں لرز رہے تھے۔۔۔۔ پیشانی پر پسینہ کی موج بھی بہہ رہی تھی۔۔۔۔ اور سارے جسم میں کپکپی سی دوڑ رہی تھی۔ خدا جانے ان عورتوں کو پسند بھی آتی ہوں یا نہیں۔۔۔ کیا کیا باتیں کریں گی۔۔۔ کیسی درگت بنتی ہے۔ دیکھئے تم پر بھی یہ آفت گزر چکی ہے۔۔۔ تمہارا حال بھی یہی ہوا ہو گا۔۔۔۔

بڑی مشکل سے دالان تک پہنچی۔۔۔۔ مجھ کو دیکھتے ہی سب چپ ہو گئیں۔۔۔ ایک بوڑھی عورت نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے قریب بٹھایا۔۔۔ ایک عورت نے اپنے بازو بیٹھنے والی عورت سے کہا "لڑکی کا قد برا نہیں۔۔۔" اس عورت نے جواب دیا۔۔۔ "اور ناک نقشہ کی بھی ٹھیک ہے۔۔۔" اس بوڑھی عورت نے میرے چہرے سے آنچل ہٹایا۔۔۔ اور بڑے غور سے میرے چہرہ کو دیکھنے لگی۔۔۔ لاکھ کوشش کر رہی تھی کہ آنکھیں اٹھاؤں۔۔۔ لیکن جیسے کسی نے ان پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ہو۔۔۔۔ "اچھا بیٹی اب تم جاؤ" اماں نے مجھ سے کہا۔۔۔۔ میں سنبھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔ تم وہاں ہوتیں تو دیکھتیں کہ اچھی خاصی "جاترا" سی جمی ہوئی تھی۔۔۔۔ میں مورتی کی طرح بیچ میں۔۔۔ اور میرے اطراف مجھے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے والی عورتیں۔۔۔۔ اور ہاں

تم سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے ... ڈیڑھ مہینے کے بعد شادی ہونے والی ہے ... آؤ گی نا !! اور تم یہ خط اپنے "چہیتے خاوند" کو نہ دکھاؤ .... تم تو جب سے بیاہی گئی ہو بس سب کو بھول بیٹھی ہو .... ایسا کونسا جادو انہوں نے تم پر کر دیا ہے ؟ مجھے تو ان پر غصہ آتا ہے ... میری سہیلی کو مجھ سے چھین لے گئے .... یہ مرد بھی عجیب ہوتے ہیں ... کسی کو اپنا کر لینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ... مگر میں تم سے بھی شکایت کروں گی .... شادی سے پہلے کس "زور وشور سے کہتی تھیں کہ" ایسا کروں گی .... ویسا کروں گی ... کبھی سیدھے منہ بات نہیں کروں گی .... خوب ستاؤں گی " .... ساری شیخی کرکری ہو گئی نا .... اب تو بس انہیں کا کلمہ پڑھتی پھر رہی ہو .... میں تو .... ہاں میں تو .... ایسا نہ کروں گی ... ان کے دوست ہیں تو میری بھی سہیلیاں ہیں ... میں روز ان سے ملا کروں گی .... تم ایک دو دن کے لئے میرے ہاں آ جاؤ تو بہت سی باتیں کہنی ہیں تم سے ... اور اپنے میاں سے کہہ دو کہ میں بہت غصیلی ہوں .... ذری بھی شکایت سنوں گی تو ایسی خبر لوں گی کہ .... مگر تم بیچ میں نہ آنا .... "

" لیجئے ختم ہو گیا خط " میں نے ہنستے ہوئے کہا ....
" تو اسی لئے آپ ہنس رہی تھیں .... یہ تو آپ سے بھی زیادہ شریر نکلی " .... " اب دیکھنا یہ ہے اس کے بیچارے دولہے میاں کیسے نکلتے ہیں ؟ .... "

" مرد سب شریف اور نیک ہوتے ہیں " .... " جی .... مگر یہ لڑکی مجھ سے کیوں اللہ واسطے کی دشمنی رکھتی ہے ... ارے صاحب میں نے تو آج تک اس کی صورت بھی نہیں دیکھی ... کبھی یہاں بلائیے اسے میں بھی خبر لیتا ہوں اس کی ... " .... " بلاتی ہوں ... دیکھیں گے کون کس کی خبر لیتا ہے . ... آپ کی ساری باتیں اس سے کہہ دوں گی ... " ... " ساری باتیں کیا ؟ ... " " یہی کہ آپ میری بات نہیں سنتے فقط زبان سے کہتے رہتے ہیں کہ " محبت کرتا ہوں اور ... " " اور یہ کہ محبت آپ کو دوسروں سے ہے ... " " مثلاً ان جھاڑوں سے " میں نے ہنستے ہوئے کہا ... " تو ... جل جائیں یہ جھاڑ ... میری بلا سے " اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے ، میں اندر چلی آئی ... " اچھا بس رہنے دیجئے آپ کی محبت ... دیکھئے وہ مالی آ رہا ہے .... " —

رشید قریشی
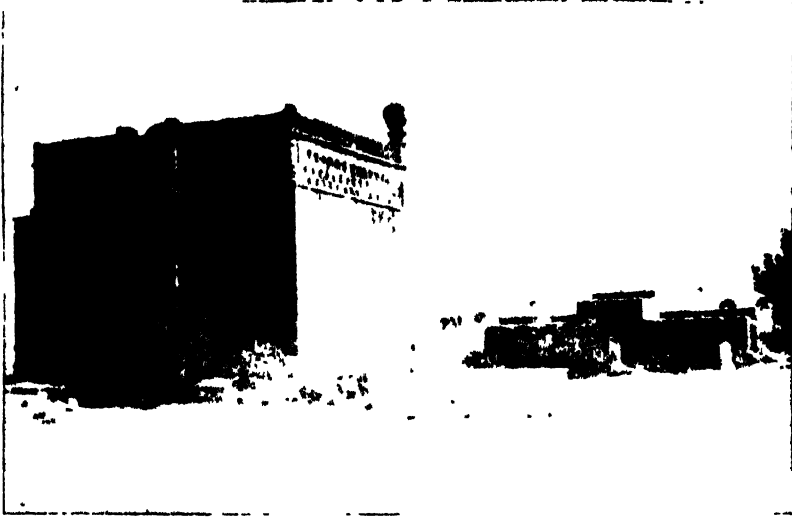
میر محمد مومن کا ذوقِ تعمیر

میر محمد مومن چاہتے تھے کہ دکن کے اندرونی حصوں میں بھی ثقافتی ترقی ہو اور دیہات کے باشندے بھی اسلام سے روشناس ہوسکیں۔ اِس لئے انھوں نے شہر حیدرآباد سے باہر کئی زمینات اور گاؤں خریدے اور ان میں تالاب، مسجدیں، عاشورخانے، سرائیں اور دیگر عمارتیں بنوائیں جن کے اطراف ثمرہ دار[1] درختوں کے باغ لگائے اور طرح طرح کی ترغیب و تحریص سے[2] لوگوں کو آباد کیا

جیسا کہ ابھی کہا گیا دیہات بسانے اور ان میں عالی شان مسجدیں اور عاشورخانے بنانے میں میر صاحب کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ سرزمین دکن میں دور دور تک اسلام کی روشنی پھیل جائے۔ اور شہر کے علاوہ چھوٹے چھوٹے گاؤں کے رہنے بسنے والے بھی اسلام کی شان و شوکت اور اسلامی رسوم و تمدن سے واقف ہوسکیں۔ چنانچہ ان کی مسجدیں اور عاشورخانے اندرون ملک کے پہاڑوں، چٹیل میدانوں، اور سنسان جنگلوں میں دیہاتی زندگی بسر کرنے والوں میں اب تک ایک خاص عظمت و عقیدت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور مسلمانوں سے زیادہ ہندو ان مسجدوں اور عاشورخانوں کا احترام کرتے ہیں جس کا تفصیلی حال میر صاحب کے تعمیرات کے بیان میں درج ہے۔ غیر مسلموں کے علاوہ میر صاحب خود عام مسلمانوں کے دلوں میں بھی حبِ اہل بیت نبی اور ائمۂ معصومین و سادات کے احترام و اہتمام کا خیال غیر ارادی طور پر پیدا کر دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اپنے اس مقصد کا ذکر انھوں نے اس خط میں کیا ہے جو شاہ عباس صفوی والی ایران کے فرمان کے جواب میں سلطان محمد قطب شاہ کے ابتدائی عہد حکومت میں حیدرآباد سے روانہ کیا گیا تھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں :-

" و تسلی خاطر باین ست کہ درین حدود و کشور مساجد و منبر بعد از تزئین بذکر اسامی مبارکۂ حضرات عالیات چہاردہ معصوم مزین و مشرف بنام نامی و القاب گرامی آں شہنشاہ والاگہر دین پناہ عدالت گستر و آبا و کرام قدسی مقام آں نور بخش ہفت کشور است[1] "

اس حقیقت حال سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علموں اور تعزیوں کے رائج کرنے میں مذہبی کے ساتھ ساتھ میر صاحب کا سیاسی مسلک بھی کام کر رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ دکن کے عام مسلمانوں کے علاوہ یہاں کی بت پرست اقوام کو علموں اور تعزیوں کے ذریعہ سے اسلام سے مانوس کریں تاکہ وہ رفتہ رفتہ اپنے بتوں اور رتھوں کو چھوڑ کر علموں اور تعزیوں اور تابوتوں کی طرف مائل ہو جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس مقصد میں بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ چنانچہ میر صاحب نے اپنے گاؤں میر پیٹھ میں جو عاشورخانہ بنایا تھا اس کے منہدمہ آثار میں اب بھی ہر سال ہندو ہی بڑے اعتقاد کے ساتھ علم بٹھاتے ہیں۔ اسی طرح اطراف و اکناف کے

---

[1] عبداللہ قطب شاہ نے بھی اپنے فرمان میں میر صاحب کے تالابوں اور ثمردار درختوں کے باغوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ فرمان میر صاحب کی اولاد کے بیان میں نقل کیا گیا ہے

[2] چنانچہ ملا تمیمی کو پچیس بیگے زمین بطور انعام دے کر سیتا باد میں آباد کرنے کا ذکر آئندہ صفحات میں ملاحظہ ہو۔

---

[1] حدائق السلاطین ورق ۱۹۳

اکثر دیہات میں بھی مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم لوگ ہی ایام عاشورہ کا احترام کرتے ہیں۔

سید آباد میر صاحب کی بسائی ہوئی آبادیوں میں سب سے پہلے موضع سید آباد کا ذکر ضروری ہے کیونکہ یہ شہر سے قریب تر واقع ہے۔ یہ گاؤں میر صاحب نے حیدرآباد کی جانب مشرق خود اپنے دولت خانہ سے صرف تین چار میل کے فاصلہ پر بسایا تھا۔ اس کا نام مرورِ ایام کی وجہ سے مسخ ہوتے ہوتے اب سعدا باغ پڑ گیا ہے۔ میر صاحب کے مکان سے اس آبادی تک سیدھی سڑک بنائی گئی تھی اور اس سڑک پر اور چند میل آگے بعد کو سلطان محمد قطب شاہ نے قلعہ سلطان نگر اور اس کی ملکہ حیات بخشی بیگم نے شہر حیات نگر بنایا تھا اول الذکر تو نامکمل رہا لیکن موخرالذکر اب تک آباد ہے۔

سید آباد کی مسجد اور سرائے سید آباد میں میر صاحب نے ایک پختہ اور بلند مسجد اور اس کے اطراف ایک عالی شان سرائے بھی بنائی تھی۔ مسجد تو ایک حد تک اب بھی محفوظ ہے لیکن سرائے بہت شکستہ ہو گئی ہے اور اب صرف اس کا وہ حصّہ باقی ہے جو مسجد کے عقب میں واقع ہے۔ پہلوؤں کی طرف کی عمارتیں منہدم ہو گئیں۔ البتہ شمالی سمت کے چند کمرے بچ گئے ہیں۔ اگر چہ بعد کو قدیمی راستے وغیرہ باقی نہ رہے لیکن اب بھی مسجد تک موٹر جا سکتی ہے۔ یعنے نواب سَرامین جنگ کے مکان کے مقابل جو راستہ جنوب کی طرف جاتا ہے اس پر تھوڑی دور جانے کے بعد اگر جانب مشرق مڑیں تو پہلے میر صاحب کی سرائے اور پھر مسجد نظر آجاتی ہے۔ یہ مسجد اب بھی آباد ہے اور اس میں متعدد نل ہیں جن سے دن بھر آبادی کی ہند و مسلم مستورات پانی لے جاتی رہتی ہیں۔

میر صاحب نے مسجد اور سرائے کی تعمیر کے ساتھ ساتھ ان کی حفاظت اور خدمت وغیرہ کے لئے اخراجات کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔ انھوں نے اِس مسجد کی نگرانی کی خدمت ملا تیمی کے سپرد کی تھی جو غالباً ایک بڑے عالم یا شاعر تھے کیونکہ قطب شاہی عہد میں صرف ممتاز لوگوں کے نام کے ساتھ ملا کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً ملا وجہی اور ملا غواصی وغیرہ۔ یہ دونوں بھی حضرت میر مومن کے ہم عصر اور بڑے شاعر تھے۔ غرض ملا تیمی کو مسجد و سرائے کی خدمت سپرد کر کے اِسی موضع سید آباد میں پچیس بیگھے زمین انعام میں دی گئی تھی تاکہ وہ اور ان کی اولاد اس معاش کی وجہ سے ہمیشہ وہاں قیام پذیر رہیں اور مسجد اور خانقاہ کی خدمت کرتے رہیں۔ چنانچہ میر صاحب کی وفات کے ڈیڑھ سو سال بعد کی ایک تحریر راقم کی نظر سے گزری جس سے پتہ چلتا ہے کہ ملا تیمی کی اولاد اس وقت تک برابر یہ خدمت انجام دے رہی تھی۔ اس میں لکھا ہے:۔

"من کہ سید حسین ولد سید جلال داماد سید محمد بن سید لار محمد بن شاہ محمد بن ملا تیمی انعام دار تعلقہ سعدا باغ سیوار موضع انوام[1] پرگنہ حویلی فرخندہ بنیاد سرکار محمد نگر اقرار معتبر می کنم و نوین می دہم برین وجہ کہ موازی بست و پنج بیگہ خارج جمع بہ شرط خدمت و صرف ضروریات مسجد پختہ و مکا کین بناساختہٗ میر محمد مومن صاحب مغفور واقع تعلقہ سعدا باغ مذکور سیوار ذبور

لے اسکو اب گڈی اانام کہتے ہیں۔

بموجب اسناد قدیم و جدید و پروانہ جات ناظمان

و دیوانیان، و صدور صوبہ، مقرر بہ نام من و

بزرگان من تا الی الآن از اراضی مذکور قابض

و متصرف بودہ خدمت مسجد مذکور بجا می آرم

........" الی آخرہ[1]

یہ تحریر غرہ جمادی الاول ۱۱۸۷ھ کو لکھی گئی تھی اور اس پر حسب ذیل حضرات کے دستخط اور مہریں بھی ثبت ہیں۔

محمد علی — سید حسین ولد سید جلال

حاجت روا محمد مشکل کشا علی — ۱۱۷۸ھ

محمد شاکر بیگ ۱۱۱۶ھ — محمد باقر — سید مرتضیٰ

۱۱۸۳ھ — ۱۱۶۲ھ — ۱۱۸۳ھ

معانی حسین خواجہ محمد عظیم حسینی سید یوسف علی خاں میر ابو طالب

اور کاغذ کے سرلوح پر حکیم محمد معصوم خاں فدوی نظام الملک آصفجاہ ۱۱۴۵ھ کی مہر بھی ثبت ہے۔

اس اقرار نامہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک موضع سید آباد یا سعد اباغ خود میر محمد مومن کے ورثا کے قبضہ سے نکل چکا تھا۔ اور اب وہ (یعنے "میر محمد حسین و میر کاظم علی ابنان میر سید محمد مرحوم و مساۃ خدیجہ بیگم ورثۂ میر محمد مومن") کم از کم اس مسجد سرائے اور اس سے متعلقہ مکانوں پر قبضہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

یہ گاؤں کس وقت اور کیوں حضرت میر مومن کی اولاد سے لے لیا گیا تھا ٹھیک طور پر معلوم نہ ہو سکا البتہ ۱۱۶۰ھ کے ایک محضر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خود قطب شاہی دور میں میر مومن صاحب کی جملہ جاگیرات اور زمینات ان کی اولاد سے چھین لی گئی تھیں اور یہ ابوالحسن تاناشاہ کے آخری زمانہ کا واقعہ ہے جب کہ مادنا اور اکنا کی عملداری تھی۔ چنانچہ ہمارے پیش نظر اس وقت ایک قدیم محضر ہے جس میں لکھا ہے:-

سوال می کند و استدعائے ادائے شہادت

می نماید اقل العباد اللہ سید محمد و مساۃ شاہ بیگم

و مساۃ زہرا شاہ و مساۃ فخر النسا بیگم و مساۃ

خیر النسا وغیرہ نبیرہائے جنت مکانی فردوس

آشیانی میر محمد مومن پیشوائے قطب الملک . .

بعد از پدرم ماہائے مفقرین طفلان و یتیماں

بیوہائے بے کس و بے وسیلہ دیدہ مادھو زنار

دار از راہ تعدی ظلم صریح نمودہ ہمہ دیہات

انعام را متعلق بت خانۂ خود کردہ و مساجد

آں جد بزرگوار مطلق بے چراغ نمودہ .

جمع کثیر سادات بیوہائے ذریۂ طیبۂ طاہرۂ

میر محمد مومن از قوت لایموت محتاج اند۔ حق

ایں سادات مستحقین دستبند تا لا بہا و محصول

اشجار از راہ تعدی کافراں می خورند چنانچہ

اسناد قدیم و حال بدست داریم حق بحقدار

نمی رسد۔ مساجد آں جدم بزرگوار را بے چراغ کردند"

یہ محضر ۵ رمضان ۱۱۶۰ھ کو لکھا گیا تھا اور اس پر متعدد اصحاب کے دستخط اور مہریں ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

---

[1] یہ اقرار نامہ مولوی میر عباس علی صاحب نبیرہ حضرت میر محمد مومن کے یہاں اب بھی محفوظ ہے۔

[2] یہ محضر بھی مولوی میر عباس علی صاحب کے یہاں محفوظ ہے۔ اور اس میں مادھو زنار دار سے مراد یقیناً دیوان مادنا ہے۔

سید احمد بن سید رحمت اللہ	بندہ درگاہ یوسف بن ایوب
۱۰۹۰ھ	۱۰۹۰ھ
عبداللطیف بن محمود	صدرالدین سید محمد محمود
۱۱۱۳ھ	۱۱۱۰ھ
رفیع الدین منشی عالمگیر شاہ	علی بیگ ولد حسین بیگ
ہدایت اللہ ولد نعمت اللہ	خان زماں بندہ عالمگیر بادشاہ
۱۱۱۵ھ	۱۰۷۳ھ

غرض اس محضر نے ظاہر کر دیا کہ میر صاحب کی وفات کے صرف اٹھاون سال بعد ہی ان کے بسائے ہوئے گاؤں اور خریدی ہوئی زمینات دوسروں کے قبضے میں چلی گئیں۔ یہ واقعہ ۱۰۹۲ھ کے بعد وقوع پذیر ہوا ہے۔ اس لئے کہ اس سنہ میں ان کے پوتے میر محمد جعفر ابن میر مجدالدین محمد زندہ تھے جن کی نسبت علی ابن طیفور بسطامی نے اپنی تاریخ حدائق السلاطین (مولفہ ۱۰۹۲ھ) میں لکھا ہے :۔

"پسراو (یعنے مجدالدین محمد) سید حمیدہ سیر فضیلت گستر سید جعفر[1]"

اور ان سید جعفر کے نام اس تاریخ کی ترتیب سے صرف ۲۴ سال قبل میر محمد مومن کی جملہ جاگیرات اور زمینات کی بحالی کا فرمان سلطان عبداللہ قطب شاہ نے ان الفاظ میں جاری کیا تھا:۔

"سال بسال در وجہ انعام باولاد و احفاد
میر مرحوم الی ماتوالد و تناسل مرحمت فرمودیم۔
دبارز مواضع مذبور را در وجہ انعام نبیرہائے
میر مذکور مجری دانستہ و ملک و میراث و مواضع
مسطور بتصرف میر محمد جعفر و غیرہ نبیرہائے میر مرحوم
واگذارند۔ واز کل تکلیفات دیوانی و کل قانون
قدیمی و جدیدی اسمی و رسمی معاف دانستہ متعرض
و مزاحم حال نگردند۔ و ہر کس از راہ طمع بخلاف
مضمون ایں فرمان عنایت عنوان تبدیل و
تحریف جائز دانستہ بمواضع مذبورہ انعام
میر سابق الذکر مزاحم شود بغضب و سخط آفریدگار
گرفتار آید...... الی آخرہ[2]"

سلطان عبداللہ قطب شاہ کے یہ آخری الفاظ بالکل صحیح ثابت ہوئے اور نادیوان پر غضب الہٰی نازل ہوا کیونکہ اس نے صریح فرمان کے خلاف سید محمد جعفر کی وفات کے بعد ہی میر صاحب کی تمام جاگیرات اور زمینات چھین لیں۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہر طرح کے انقلابات اور گردش ایام کے باوجود سید آباد میں میر صاحب کی بنائی ہوئی مسجد اب تک سر بلند ہے اور اپنے بنانے والے کی اولوالعزمی کا ثبوت دے رہی ہے۔ اس کی شاندار محراب سنگ موسیٰ سے بنائی گئی ہے جس پر ایک اعلیٰ درجہ کا کتبہ بھی نصب ہے۔ یہ نفیس اور خوش نما خط ثلث میں لکھا گیا ہے اور سر زمین دکن کے بہترین کتبوں میں شمار پا سکتا ہے۔

میر صاحب کا کتبہ اس کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب نے یہ مسجد اور سرائے ۱۰۲۱ھ میں بنائی تھی۔ یہ ان کے پہلے دور پیشوائی کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس کی تعمیر سے دو تین سال قبل ہی انھوں نے مرزا محمد امین کو میر جملگی دلائی تھی جس کی دلچسپی اور مستعدی کی وجہ سے میر صاحب کو مہمات سلطنت سے کچھ فرصت مل گئی تھی۔ اور وہ اب شہر سے باہر اسلامی یادگاروں کی تعمیر کے لئے وقت نکال سکے تھے۔

---

[1] ورق ۱۹۱ ا۔

[2] یہ فرمان بھی موجود ہے اور اس کا فوٹو اس کتاب میں شریک کیا گیا ہے۔

اس مسجد کا مسقف حصہ ۳۰ فیٹ طویل اور ۲۱ فیٹ عریض ہے۔ اس میں تین کمانیں ہیں۔ اور اس کی محراب پر جو سنگ موسیٰ میں بنائی گئی ہے مولانا حسین ابن محمود شیرازی کا ایک نفیس کتبہ درج ہے جس کی تفصیل یہ ہے[1]۔

محراب کی انتہائی بلندی پر قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالیٰ اور اس کے نیچے ایک سیدھی سطر میں قرآن شریف کے سترہویں سورہ الاسریٰ کی بیسویں آیتہ یعنے

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَھَا سَعْیَھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰئِکَ کَانَ سَعْیُھُمْ مَشْکُوْرًا کندہ کیا گیا ہے۔ اور اس کتبے کے درمیان میں اوپر کی طرف اٹھا کر وھو مومن لکھا گیا ہے جس سے شاید مسجد کے بانی کا نام ظاہر کرنا بھی مقصود تھا۔ میر مومن صاحب نے محراب میں اپنا نام و نشان صریحی طور پر کندہ کرانا مناسب خیال نہ کیا کیونکہ ایک تو وہ غالباً نام و نمود نہیں چاہتے تھے اور دوسرے یہ کہ ایسی جگہ جس کی طرف تمام مصلیوں کو نماز کے وقت رخ کرنا پڑتا تھا کسی شخص کا نام مندرج ہونا احترام مسجد اور آداب نماز کے خلاف بھی تھا۔

اس آیتہ کے نیچے محراب کے بالکل اوپری حصہ کو تین حصوں یا تختیوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلی تختی میں لکھا ہے عجلو بالصلواۃ قبل الفوت

درمیانی تختی میں لکھا ہے۔ ربنا تقبل منا بآل النبیٔ

تیسری تختی میں لکھا ہے۔ وعجلوا بالتوبۃ قبل الموت

محراب کے دونوں پہلوؤں میں درود شریف کندہ کیا گیا ہے[2]۔

درمیانی کمان کی دائیں طرف نیچے سے اوپر لکھا ہے :۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی الْمُصْطَفٰی مُحَمَّدٍ وَالْمُرْتَضٰی عَلِیٍّ وَالْبَتُوْلِ فَاطِمَۃَ وَالسِّبْطَیْنِ الْحَسَنِ وَالْحُسَیْنِ وَصَلِّ عَلٰی زَیْنِ الْعِبَادِ عَلِیٍّ وَالْبَاقِرِ مُحَمَّدٍ وَالصَّادِقِ جَعْفَرٍ وَالْکَاظِمِ مُوْسٰی وَالرِّضَا عَلِیٍّ وَالتَّقِیِّ مُحَمَّدٍ وَالنَّقِیِّ عَلِیٍّ وَالزَّکِیِّ الْعَسْکَرِیِّ الْحَسَنِ۔

کمان کی بائیں طرف اوپر سے نیچے :۔

وَصَلِّ عَلٰی الْحُجَّۃِ الْقَائِمِ الْخَلَفِ الصَّالِحِ الْاِمَامِ الْھُمَامِ وَالْمُنْتَظَرِ الْمُظَفَّرِ مُحَمَّدٍ الْمَھْدِیِّ الْھَادِیْ صَاحِبِ الْعَصْرِ وَالزَّمَانِ وَخَلِیْفَۃِ الرَّحْمٰنِ سَیِّدِ الْاِنْسِ وَالْجَانِّ وَالْمُظْھِرِ لِلْاِیْمَانِ صَلَوَاتُ اللّٰہِ وَسَلَامُہٗ عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ اَجْمَعِیْنَ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ نمقہ عبدہ حسین شیرازی۔

سید محی الدین قادری زور

(نوٹ ۔ یہ مضمون حیات میر محمد مومن کا ایک حصہ ہے)

---

[1] اس کتبے کے صحیح پڑھنے میں مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری ناظم تعلیمات نے مولف کی خاص مدد فرمائی۔

[2] اس درود اور سلطان قلی قطب شاہ والی سلطنت گولکنڈہ کی قبر کے مندرجہ درود کے الفاظ تقریباً ایک ہی ہیں لیکن سلطان محمد قلی قطب شاہ کے سنگ مزار پر جو درود کندہ کرایا گیا ہے اس کے آخری حصے کے الفاظ میں کچھ تبدیلی کردی گئی ہے یعنے اس پر لکھا ہے :۔

"الامام الھمام المنتظر المرتضیٰ محمد بن الحسن صاحب الزمان وقاطع البرہان ومظھر الایمان وسید الانس والجان صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلیھم اجمعین"

مرہٹی زبان میں افسانوی لٹریچر

مادکھولکر۔ نجانن ترمبک مادکھولکر مہاراشٹر کے مشہور و معروف ناول نگار اور افسانہ نویس ہیں، ان کے ناولوں میں مکتا، کانتا، نیا سنسار، دوہ اجیون اور ڈاک بنگلہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ مادکھولکر کے افسانے ابتدا میں "منورنجن" میں شائع ہوتے تھے۔ پہلا مجموعہ "شکراچے چاند نے" شائع ہوتے ہی ملک میں ان کی افسانہ نگاری کی دھاک بیٹھ گئی۔ دوسرے مجموعے کا نام "رات رانی کے پھول" ہے ان میں کشش، آخری آرزو، پیپل کا درخت، اس کا سفر، قصور کس کا؟ رات رانی کے پھول، صحن رقص اور ڈاکٹر اجیت پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں قصور کس کا میں مادکھولکر نے یہ دکھایا ہے کہ ہمارا سماج ہم پر کس طرح ظلم و ستم کرتا ہے، صحن رقص میں ایک طوائف کی دکھبھری زندگی کے واقعات ہیں۔ رات رانی کے پھول اور ڈاکٹر اجیت مادکھولکر کے شاہکار ہیں، اس میں انھوں نے ڈاکٹر اجیت کے کردار کا نہایت عمدگی سے تجزیہ کیا ہے اور عورت کی محبت کی بدحواسیوں کی تصویر نہایت عمدگی سے کھینچی ہے۔ مادکھولکر کی زبان کھانڈے کر اور پھڑکے سے کسی قدر زیادہ مشکل ہوتی ہے، تشبیہات اور استعارے کم ہوتے ہیں، ان کا آرٹ ان بلندیوں تک نہیں پہونچتا جہاں کھانڈے کر اور پھڑکے کی نظریں پہنچتی ہیں۔

کوٹھے کر۔ رگو ناتھ کوٹھے کر مرہٹی زبان کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ناول بھی عمدہ لکھتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں، امتناز محبت، نقش جذبات، اور بادل کے قریب، بہت مشہور ہیں۔ کوٹھے کر کے افسانے بہت دلکش ہوتے ہیں، پلاٹ نہایت دلچسپ ہوتا ہے، عوام کی توجہ کو اپنی جانب خوب مبذول رکھتے ہیں۔

(بسلسلۂ پیوستہ)

ان کے افسانوں کے مجموعہ "ناد وینا د" "گلاب کی پتیاں" "روشنی میں تاریکی" اور "چاندنی" بہت مشہور ہیں، ان میں سے اکثر افسانوں میں سماج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا گیا ہے، 'تاریکی میں' بیواؤں کی سسکیوں اور ان کی تڑپ کو دکھلایا ہے۔ 'تو دیوانہ یا میں' سماج کے جور و تعدی کی ایک نہایت دردناک تصویر ہے، دیگر افسانوں میں بوسہ، سہارا، اور اگر ماتاجی ہوتیں، خاص طور سے پڑھنے کے قابل ہیں، طرز بیان نہایت شگفتہ اور دلآویز ہے۔

ماما وریرکر۔ ماما وریرکر مرہٹی کے مشہور ڈراما نگار ہیں، ڈراما نگاری کا جو تخم کھاڈیلکر نے بویا تھا اس کی نشو و نما ماما وریرکر نے ہی کی، اب تک آپ کے انیس[۱۹] ڈرامے، آٹھ ناول اور دو[۲] افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ڈراموں میں "کنج بہاری" اور "دل چاہے سو کرے گا" "حکومت کے غلام" اور "سونے کا کلس" بہت مشہور ہیں، دل چاہے سو کرے گا، تاریخی ڈراما ہے اور حکومت کے غلام اور سونے کا کلس سماجک ناٹک ہیں۔

ناولوں میں "ودھوا کماری" "نہ پوجا ہوا دیوتا" اور "لہریں ارتا ہوا ساگر" بہت مشہور ہیں۔ وریرکر کے افسانے نفسیاتی ہوتے ہیں اور وہ افسانوی ادب سے سماج کو درست کرنا چاہتے ہیں، انسان یا خدا اور متفکر فقیر اس کی عمدہ مثالیں ہیں فی الحال آپ 'پورنیما' ہفتہ وار کے ایڈیٹر ہیں۔

۱۹۳۰ء سے مرہٹی افسانوی ادب میں ایک انقلاب شروع ہوا، کئی ماہ نامے مثلاً چترمے جگت، جیوتسنا، منوہر، استری سہیا دری وغیرہ اور سیتہ کتھا وغیرہ جاری ہوئے، جن میں عمدہ افسانے اور دیگر زبانوں کے چیدہ چیدہ افسانوں کے

تراجم شائع ہوتے ہیں، "سیتہ کتھا" کہانیوں کا ماہ نامہ ہے۔
اس عرصے میں کئی جدید افسانہ نگاروں نے میدانِ ادب میں
قدم رکھا جن میں سہجانند، بھاگوت، وِدوانس، ڈھگے، دیدھے
اشونت گوپال جوشی، گوکھلے اور بھاوے بہت مشہور ہیں۔
پروفیسر گورے اور کارنک نے تھوڑے ہی عرصہ میں
کافی شہرت حاصل کرلی ہے اور مرہٹی افسانہ نگاری کے
میدان میں اپنے لئے خاص مقام پیدا کرلیا ہے۔ کارنک
کے افسانوں میں زینت کس کی ہوئی اور جامن پڑھنے
سے تعلق رکھتے ہیں۔ پروفیسر گورے کا فتح کا جھولا نہایت
دلچسپ افسانہ ہے۔

مزاحیہ نگاری ۔ مرہٹی افسانے کے دوش بدوش مزاحی افسانوں
نے بھی کافی ترقی کی جن میں ممتاز لکھنے والے پروفیسر چنتامن
ونائک جوشی، پروفیسر اترے، ستا مھن کر وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

چنتامن ونایک جوشی ۔ پروفیسر جوشی مرہٹی کے مشہور
مزاحیہ نگار ہیں، مزاحیہ نقشہ بہت کامیابی سے کھینچتے ہیں، ان
کی کتاب چمن راو چے چیرہاٹ اور سمشا چین جالیس واتر گوشٹی،
ان کی مزاحیہ نگاری کے شاہکار ہیں، پلاٹ عظیم بیگ چغتائی
کی طرح بہت اچھا ہوتا ہے، عام واقعات کو مزاحی پیرایہ میں
اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے،
ان کے قصوں میں میرے محترم بزرگ، اس نے شادی کیوں
نہیں کی، لڑکا ہو یا لڑکی اور گوپال چچا بڑے مزے دار ہیں،
طرز بیان نہایت شگفتہ اور زبان بہت فصیح ہوتی ہے، ان کے
افسانے پڑھتے وقت فرحت اللہ بیگ یاد آجاتے ہیں۔

پرلھاد راکو اترے ۔ پروفیسر اترے کا شمار مرہٹی زبان کے
چوٹی کے ادیبوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ بہت بڑے ڈراماٹسٹ ہیں
مہاراشٹر میں سرسوتی کمار اور گڈکری کے بعد سے اتنا بڑا
ڈراماٹسٹ کوئی پیدا نہیں ہوا، ان کے ڈرامے اور افسانے
سب مزاحی ہیں، ان کا مزاح محض تفریح کی خاطر نہیں ہوتا۔
بلکہ وہ ایک ایسی لطیف طنز کا حامل ہوتا ہے جو ہماری اندرونی
خامیوں کو اجاگر کرکے ہم کو اصلاح پر مجبور کردیتا ہے، چنانچہ
اردھانگی میں مشرقی اور مغربی تہذیب کا نہایت عمدگی سے
مزاحیہ پیرایہ میں مقابلہ کیا ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ مشرقی تہذیب
مغربی تہذیب پر فائق ہے، اترے بہت بڑا نقاد ہے اور
زندگی کے ہر شعبہ پر تنقید کرتا ہے۔ ان کے ڈراموں میں
"بھرم کا کدو" "نمسکار" "وندے ماترم" اور "بیاہ کی بیڑی"
ان کے شاہکار کہلائے جانے کے مستحق ہیں، نرسہون چنتامن
کیلکر نے جو اس وقت مرہٹی کے سب سے بڑے ادیب اور
نقاد خیال کئے جاتے ہیں؛ ان کے متعلق کہا ہے کہ یہ مزاحیہ
نگاری کے شاہکار ہیں، اترے کے افسانوں کا ایک مجموعہ
برانڈی کی بوتل اور دیگر کہانیاں، کے نام سے شائع ہوا ہے،
جن میں برانڈی کی بوتل اور پونے کا تانگہ والا بہت عمدہ ہیں۔
اترے آج کل نویگ، ہفتہ وار کے ایڈیٹر ہیں۔

کینتن ملئے بھی مرہٹی کے مشہور مزاحیہ نگار ہیں
ان کے مزاحی افسانوں کا ایک مجموعہ سکو کا بھائی، بہت
مشہور ہے۔ "تا تھمن کرکی" بی کو مہاراشٹر میں وہی مقبولیت
حاصل ہے جو شوکت تھانوی کی سودیشی ریل
کو ہوئی، ان کے افسانوں کو پڑھتے ہی بے اختیار ہنسی آنے
لگتی ہے۔ پروفیسر وامن ملھار جوشی کی، لوپشپ کرڈک، نہایت
عمدہ کتاب ہے، پوشیدہ حملے، اننت انترکر کے مزاحیہ
افسانوں کا عمدہ مجموعہ ہے۔ پٹوردھن نے جیتی رہو جیوا
کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے
ان کے علاوہ سردیسائی، کھانولکر اور پروفیسر کردے بھی

اپنی مزاحیہ نگاری کی وجہ سے مہاراشٹر میں کافی مقبول ہیں۔
خواتین کا حصہ۔ گذشتہ پچیس تیس برس سے کئی خواتین نے افسانوی ادب کے ارتقاء میں حصہ لیا ہے، اور نہایت مسرت کا مقام ہے کہ ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے، چنانچہ ان کا ماہ نامہ، استری' ان کے ذوق و شوق کا مرقع ہے۔ قدیم افسانہ نگاروں میں 'کاشی بائی کانٹیکر' اور 'گیربج بائی کیٹیکر' وغیرہ بہت ممتاز ہیں۔ کانٹیکر کی کہانیاں "چاندنی" اور "شلوبیاجاگی" کے نام سے مشہور ہیں' ان میں زبان بول چال کی ہے پلاٹ دلچسپ اور منظر نگاری دلکش ہے، ان کی تحریر میں ہری بھاؤ آپٹے آنجہانی کے طرز تحریر کی جھلک ہے۔

گیربج بائی کیٹیکر نے خواتین کی ترقی میں بہت حصہ لیا انجاتین کے مطالبات کی پرزور تائید کی۔ چنانچہ پنپ ہار می کتا میں آپ نے عورتوں کو ابھارنے کے لئے مختلف مضامین لکھے۔ ان کی افسانہ نگاری میں انہی باتوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان میں سماج کی خرابیاں، خواتین کے مطالبات اور تعلیم نسواں وغیرہ پر زور دیا گیا ہے۔ ان کے دو مجموعے سماج کی تصویریں اور کیول وشواتی' ان کے خیالات کا مرقع ہیں، اس کے بعد کے لکھنے والیوں میں کشما بائی، آنندی بائی شرکے، شانتا بائی ناسکر، کملا بائی بمبئی والی اور مس کمودنی پربھولکر کے نام قابل ذکر ہیں۔

آنندی بائی شرکے مرہٹی کی مشہور و معروف افسانہ نگار خیال کی جاتی ہیں عورت کے جذبات و احساسات کی تصویر کھینچنے ہیں وہ اپنا جواب نہیں رکھتیں، چنانچہ 'تلاطم جذبات'، 'بیگم دل آرا'، 'قسمت کا کھیل' اس کے شاہد ہیں' ان کا ایک مجموعہ 'جوہی کی پنیاں' بہت مشہور ہے جس میں 'بہت دیر کی' اور 'سانپ' بہت عمدہ ہیں۔

شانتا بائی ناسکر مہاراشٹر کی ایک دوسری مشہور افسانہ اور ناول لکھنے والی ہیں ان کی ناولوں میں میری گوری ہولی اور کیچڑ میں کا کنول بہت مشہور ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ' کا دلربا' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ افسانوں کی زبان شستہ اور زوردار ہے۔

جدید لکھنے والیوں میں انندی بائی کرلوسکر، مالتی بائی دانڈے کر، سوشیلا شندے اور کماری ہیروج آنند کر کے نام قابل ذکر ہیں' آنندی بائی سماج کی دردناک تصویر کھینچنے میں یکتا ہیں۔ مالتی بائی گھریلو زندگی کے متعلق کہانیاں لکھتی ہیں، سوشیلا شندے رومانی افسانے لکھتی ہیں' ان کی طرز تحریر ہندی کی مشہور افسانہ نگارہ' کماری تیج ہوکو' سے بہت ملتی جلتی ہے' تشبیہات کثرت سے استعمال کرتی ہیں' منظر نگاری حد درجہ دلکش ہوتی ہے۔ کماری ہیروج آنند کر کا ایک مجموعہ' رشتا' پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

مرہٹی افسانہ نگاری کا مستقبل نہایت روشن ہے۔ افسانوں میں عام طور پر سماج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جاتا ہے، سرمایہ داروں کو برا بھلا کہا جاتا ہے مزدوروں اور غریبوں کی ہمت افزائی کی جاتی ہے' پرانے رسم ورواج کے قلع قمع کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اشتراکی اثر غالب ہے اور ان میں سب سے پیش پیش کھانڈے کر ہے وہ جہالت' مفلسی اور سماج کے مظالم کو دور کردینا چاہتا ہے' اس کا خیال ہے کہ دنیا میں حقیقی سپاہی' مزدور ہیں اور آئندہ مزدور ہی حکومت کریں گے۔ چنانچہ اس کا ایک افسانہ' نئی دنیا' اسی تخیل کی پیداوار ہے۔ وہ برکر سماج کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔

اثرے مزاح بغرضِ اصلاح کے قائل ہیں، گو کھلے دیہاتی افسانے لکھتے ہیں ان کی طرز معاشرت، ان کے تہذیب و تمدن کا صحیح عکس پیش کرتے ہیں۔ ایشورا کی نیا اور چڑیا کا گھونسلا اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

ہندستان کی زبانوں میں زیادہ تر بنگالی اور گجراتی اثر غالب معلوم ہوتا ہے شارت چندر چٹوپادھیا اور ٹیگور کا مرہٹی افسانہ نگاری پر گہرا اثر دکھائی دیتا ہے گجراتی کے مشہور و معروف افسانہ نگار دھرم کیتو اور کنھیالال سے بھی یہ بہت حد تک متاثر ہے، ہندی کے افسانہ نگاروں میں صرف منشی پریم چند کا کچھ اثر معلوم ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک اردو افسانوں سے مرہٹی اب تک بالکل ناآشنا ہے۔ بہرحال مرہٹی زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو ہری نارائن آپٹے آنجہانی اور پھڑکے جیسے ناول نگار اور کھانڈیکر جیسا افسانہ نویس ملا جن کو ہندستان کے کسی زبان کے بڑے ناول نگار اور افسانہ نویس کے بالمقابل کھڑا کیا جاسکتا ہے۔

امجد علی خان یوسف زئی

"——— کے نام"

میں تیرے واسطے دیوانہ وار آیا تھا
متاعِ عشق و جوانی نثار کرنے کو!
ہر ایک ذرّے کو مستِ شباب کرنے کو
بہار و کیف کے دریا میں غرق ہونے کو

ترے تصور، بہت بے قرار آیا تھا
کمالِ ذوق نظر، استوار کرنے کو
کلی کلی کو تبسم مآب کرنے کو
شباب و شعر کی سرمستیوں میں کھونے کو

میں بدنصیب ہوں شاید کہ تجھ کو پا نہ سکا
نثار ہو نہ سکا، تیرے حسنِ رنگیں پر
اٹھا سکا نہ سجودِ نیاز کے الطاف
جو آرزوئیں مرے دل میں تھیں، دبی ہی رہیں

میں اپنے درد کی بے تابیاں دکھا نہ سکا
عطا ہوا نہ ترا زانوئے سکوں پرور
ترے تبسمِ رنگینِ ناز کے الطاف
نگاہِ شوق و تجسس کی سوز شیں نہ گئیں

یہ التجا ہے مری جانِ آرزو تجھ سے
خدا کے واسطے یوں مجھ کو بے قرار نہ کر
مری حیات کو یوں مرکزِ الم نہ بنا
میں بے قرار ہوں تجھ پر نثار ہونے کو

کہ پست ہوں نہ کہیں حوصلے مرے دل کے
مری نگاہ کو یوں وقفِ انتظار نہ کر
قسم ہے تجھ کو ترے حسن کی، کہ یوں نہ ستا

تحسین سروری

حیدرآباد کے نوخیز شاعر

آپ غالباً بھولے نہ ہوں گے کہ آج سے پچیس تیس سال قبل حیدرآباد میں شعر و سخن کی وہی فضاء تھی جو عام طور پر ہندستان کے دوسرے حصوں میں پائی جاتی تھی۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اس وقت شاعری چند مخصوص اور مرتب اصولوں کو سامنے رکھ کر گنے چنے الفاظ کو قافیہ دے دینے کا نام تھا۔ شاعری کے دو اسکول سارے ہندستان پر چھائے ہوئے تھے۔ ایک وہ جس کا سلسلہ شیخ امام بخش ناسخ سے ملتا تھا اور دوسرا آتش اور شیخ ابراہیم ذوق کے واسطہ سے مصحفی پر ختم ہوتا تھا۔ ہر شاعر کے لئے ضرورت تھی کہ وہ ان اسکولوں میں سے کسی اسکول کا متبع ہو اور جو اساتذۂ فن اس عہد میں موجود تھے۔ ان میں سے کسی کے ساتھ نسبتِ شاگردی پیدا کرے شاعر کا کمال یہ تھا کہ وہ اپنے مکتبِ شاعری اور اپنے استاد کی پیروی میں گم ہو کر رہ جائے۔ اپنے نام کے ساتھ متبع میر و غالب، یادگارِ ذوق و نصیر کی قسم کے جملے لکھنا فخر سمجھا جاتا تھا۔ شاعروں میں جب کسی نئے شاعر کے تعارف کی ضرورت ہوتی تو یہ کہہ دینا کافی خیال کیا جاتا تھا کہ "آپ مولنا حالی کے شاگرد ہیں" یا "آپ نے جناب اشک کا فیض صحبت حاصل کیا ہے۔" مقصد یہ ہے کہ کسی بڑے اور مشہور استاد کا شاگرد ہونا شاعر کے کمالِ فن کی ضمانت ہوتا تھا۔ استادوں کا یہ حال تھا کہ خداوندِ نعمت کی طرح مسندِ علم و کمال پر جلوہ افروز ہوتے۔ اور شاگرد خدامِ ادب کی نمائش کے ساتھ دست بستہ ان کے سامنے بیٹھتے۔ غزلیں ادب سے پیش کی جاتیں اور جو ایک آدھ لفظ یا اکا دکا مصرع بنا دیا جاتا اس پر عمر بھر ناز کرتے۔ اور آنکھوں سے لگاتے تھے۔ کسی کو یہ مجال نہ تھی کہ وہ استاد کے بنائے ہوئے یا بنائے ہوئے الفاظ پر اشارتاً بھی کسی اختلاف کی جرأت کرے۔ غرض یہ عالم تھا اور شاعری کا وہ مقدس فن جس نے حیاتِ انسانی پر اپنے عمیق اثرات ہر زمانے میں چھوڑے ہیں اک راز سینہ بہ سینہ بن کر رہ گیا تھا یا پھر مذاق عام کے اتباع میں شاعرانہ لطافتیں اور فطرت انسانی کے گہرے راز بولی ٹھولی اور عامیانہ زبان و محاورات میں تبدیل ہوتے چلے جا رہے تھے کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ زندگی کے وہ حقائق بھی جنھیں کبھی عرفانیات اور سریات کا مرتبہ حاصل تھا۔ عہد حاضر کی علمی اور عقلی کاوشوں نے بے نقاب کر کے رکھ دیئے ہیں اور شاعر پسند عام کی سطح سے بہت بلند ایک ایسی ہستی کا نام ہے جو تھکی تھکائی زندگی کی مرجھائی اور سمٹی ہوئی نبضوں میں چمکیلے، تازہ اور سریع السیر خون کی لہریں دوڑا سکتا ہے، جو بیداری کے اس خواب میں ان حقائق کو چلتی پھرتی صورتیں دے کر پیش کرتا ہے جن کے سامنے علم اور حکمت کی گردنیں جھک جاتی ہیں اور جن سے ہماری روحوں میں زندگی کے احساس کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔

اِس بے کسی کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ ارباب علم و عقل نے شاعری کی جانب سے آنکھیں بند کرلیں اور شاعر سوسائٹی کا ایک غیر ضروری بلکہ مضر عنصر سمجھا جانے لگا۔ اب بھی کبھی کبھی شاعری اور شاعر کے خلاف ایک آدھ آواز بلند ہو جاتی ہے۔ یہ بھی اِس بدگمانی کا مآل ہے جس کی بنیاد خود اہلِ شعر نے رکھی تھی۔ بہر حال حیدرآباد بھی اس وبائے عام سے اپنا دامن نہ بچا سکا اور باوجود اِس کے کہ یہاں علم و ادب کی ایک خاص فضاء ہمیشہ مرتب رہی ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط

نہ ہوگا کہ بعض مشہور شعرا اور اہل کمال کی ذہنی تربیت یہیں ہوئی۔ یہیں ان کی فطرت کے پنہاں جوہر چمکے اور یہیں ان کے ذوق کو وہ مقام حاصل ہوا جو آگے چل کر ان کی ادبی زندگی اور کامیابی کا راز بن گیا۔ بایں ہم شاعری کا مقام تبدیل نہ ہو سکا۔ کیونکر ہوتا یہ فخر تو قدرت نے پنجاب کے لئے رکھا تھا۔ دہلی اور لکھنؤ کے وہ اسکول بھی جنھیں اپنی زبان وادب پر بڑا ناز ہے لفظ پرستی کے گورکھ دھندوں میں الجھ کر منہ دیکھتے رہ گئے۔ اور خاک پنجاب نے صدیوں کی گردش کے بعد ایک ایسے صاحب کمال کی تخلیق کر ہی لی جس نے ایک ہلکی سی جنبش میں شعر وادب کی اس بساط کو جو بڑے اہتمام اور احتیاط سے بچھائی گئی تھی الٹ کر رکھ دیا۔ اور جس کے نفس کی آگ نے اس ویرانہ میں نئی زندگی کے آثار پیدا کردئے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس سے میری مراد ڈاکٹر اقبال مرحوم ومغفور ہیں جنھوں نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ شاعری بازیچۂ اطفال اور بولی ٹھولی کا نام نہیں ہے یہ مجذوب کی بڑ نہیں بلکہ جزو پیغمبری ہے۔ انھوں نے شاعری کو تفریح کے لئے نہیں بلکہ ایک خاص مقصد کے لئے من حیث الفن اختیار کیا۔ اور مستقبل بتائے گا کہ عہد حاضر کی قومی تعمیر میں ان کی فکر وعمل کا کس قدر حصہ تھا۔

مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ حالی اور آزاد کی کوششوں نے شاعری کی راہوں کے پیچ وخم کو بڑی حد تک درست کیا۔ اور اقبال سے پہلے یا ان کے ساتھ ساتھ نادر کاکوروی، پنڈت چکبست وغیرہ ایسے شاعر ہندستان کی بساط ادب پر نظر آنے لگے تھے جن کی نظر حقائق کی جستجو میں مصروف تھی۔ لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس کی فکر اتنی بلند، جس کی نظر اتنی وسیع ہو کہ وہ مشرق کی ادبی لطافتوں اور مغرب کی فطرت پرستیوں کو ایک نقطہ پر سمیٹ کر شاعری کا ایک پیکر تیار کرے جس میں پھولوں کی شگفتگی بھی ہو اور آگ کی تیزی بھی۔ جس میں موجوں کی سبک سیری بھی ہو اور طوفان کا جلال بھی۔ یہ کام اقبال ہی کا تھا۔ اور انھوں نے اپنے اس فرض کو اس خوبی سے انجام دیا کہ جب تک کوئی جدید تہذیب دنیا کے موجودہ حقائق وآثار کو مٹا نہ دے نہ اقبال مٹ سکتے ہیں نہ ان کی آواز کی گونج دب سکتی ہے۔

پنجاب نے ان کی سرپرستی کی۔ انہیں اپنی آنکھوں پر بٹھایا اور اپنے کاندھوں پر چڑھا کر نعرے لگائے کہ دیکھو صاحب کمال ایسے ہوتے ہیں اور یوں ان کے جوہروں کو چمکایا جاتا ہے۔ کاش ہندستان کا ہر حصہ اپنے اہل فن کو پہچاننے میں پنجاب کی نظر پیدا کرے۔

غرض اقبال کی آواز زبان وادب کے اجارہ داروں کی نکتہ چینی کے باوجود بڑھتی گئی وہ پہلے کالج کی دیواروں سے ٹکرائی اور پھر سارے ہندستان کی بسیط فضا پر چھا گئی اور اب وہ زمانہ آ گیا کہ شاعری کی صحیح حدود متعین کی جا سکیں اور شاعر کا منتہا یہ نہ ہو کہ وہ کیا کہتا ہے بلکہ یہ ہو کہ اس کے بیان کی شاعرانہ لطافتیں دلوں کی گہرائیوں میں کن تاثرات اور ارادات کو پیدا اور بیدار کرتی ہیں۔

حیدرآباد میں بھی بہ سلسلہ برکات عہد عثمانی یونیورسٹی کی بنیاد پڑ چکی تھی اور نوجوانوں کی نئی جماعتیں دل و دماغ کی تازگی اور فکر ونظر کی گہرائی کے ساتھ بیدار ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ ان کے سینوں میں تازہ امنگیں تھیں اور نئے نئے ولولوں کا ایک طوفان امڈ رہا تھا اور ان کے بلند ذوق کی وسعتوں کو کسی وسیع تر میدان عمل کی جستجو تھی۔ اس لئے

انھوں نے جہان اور علوم وفنون میں کمالات حاصل کئے وہاں
ادب وشعر میں ایک جدید اسکول کی بنیاد رکھ دی اور اپنے
شیریں نغموں سے سارے ہندستان کو مسحور کرکے چھوڑا۔
ان جدید شعرا میں وہ بھی ہیں جنھوں نے قومی تعمیر کو جدید
نقطۂ نظر کے لحاظ سے اپنا نصب العین قرار دیا ہے اور وہ بھی
جو حیاتِ انسانی کی نفسیاتی تنقید اور استعار کا فرض ادا کر رہے
ہیں۔ غزل سرا بھی ہیں جن کی لطافتِ نغمہ روحوں کو تازگی
اور بیداری عطا کرتی ہے اور نظم گو بھی جن کی عمیق نظر فطرت
کے چہرے کی رعنائیوں کو دیکھ سکتی ہے۔

مجھے بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ حیدرآباد نے
بہت تھوڑی مدت میں ایک ایسا مقام حاصل کرلیا جو
برسوں کی کاوشوں کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اور
باوجود ان قدرناشناسیوں کے جو اُن کے راستے میں حائل
ہیں یہاں کے شاعر اپنا فرض ادا کرنے میں ہندستان کے
کسی حصے سے پیچھے نہیں ہیں۔ جدید شعرا جن مشکلوں میں گھرے
ہوئے ہیں ان میں یہ دو بہت صبر آزما ہیں ایک تو اُن کا
کوئی مقام ابھی تک تسلیم نہیں کیا جاتا وہ پرانے سلسلے کی
مختلف کڑیاں سمجھے لئے گئے ہیں اور اس لئے اس سرپرستی
سے محروم ہیں جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

دوسرے قدیم اسکولوں کے وہ شاعر جو اگرچہ خود کوئی
شاعرانہ بصیرت نہیں رکھتے شعر کہتے ہیں لیکن تفریح کے
لئے ان کے سامنے شاعری کا کوئی مقصد نہیں ہوتا اور نہ
انھیں اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ مشرق و مغرب
کے ادب و شعر کا مطالعہ کریں اور یہ سمجھیں کہ سوسائٹی کا
طبعی رجحان ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ادب و
شعر میں بھی تغیر لازم ہے۔ اس لئے وہ ان شعراء کو شاعر
سمجھنا بھی مشکل سے گوارا کرتے ہیں۔ وہ صرف یہ چاہتے
ہیں کہ آج سے سو برس قبل کے انداز میں فکر کی جائے۔ وہی
الفاظ ہوں اور وہی سوچنے کا طریقہ۔
اور عام بول چال کے چند محاورات نظم کر لئے جائیں۔
ان کے نزدیک کوئی شعر مستند نہیں اگر کسی قدیم استاد کی
سند اس کے لئے موجود نہ ہو۔ اور کوئی شاعر شاعر نہیں اگر
مقررہ زبان و بیان سے تجاوز کرے۔ ان حالات میں
عہدِ جدید کا وہ شاعر جو ان "رسوم و قیود" کو توڑنے کا
عزم لے کر اٹھا ہے اور جس نے ایک غیر فانی نظم کی بنیاد
رکھی ہے اور جسے اپنی بصیرت اور اپنے ذوق کی سلامتی پر
اعتماد ہے کیونکر کامیاب ہو سکتا ہے۔

بہرحال وقت آرہا ہے کہ یہ حجاب ٹوٹ جائیں گے
اور ہندستان کے دوسرے اقطاع کی طرح یہاں بھی عہد
جدید کے شاعرانہ اور حکیمانہ کمال کے اعتراف پر مجبور
ہونا پڑے گا۔

مجھے اس کا یقین ہے کہ ہمارے جدید شعرا اسے
خوب جانتے ہیں کہ کام کا صلہ خود کام ہے اور انھیں
اس کا خیال بھی نہ ہوگا کہ زمانہ ان کے ساتھ کس طرح
پیش آرہا ہے۔

غرض حیدرآباد کی شاعری کا عہد جدید اپنے اندر
علم و ادب کی ان تمام رعنائیوں کو لئے ہوئے ہے
جن پر ہم ناز کر سکتے ہیں۔ اور میں بلاخوفِ تردید کہتا ہوں
کہ اب وہ زمانہ قریب تر ہوتا جا رہا ہے جب حیدرآباد کے
افق سے کوئی ایسا آفتاب طلوع ہوگا جس کے سامنے
ہندستانی ادب کے موجودہ ستارے ماند ہو کر رہ جائیں گے۔
اس کی ایک خاص وجہ یہی ہے اگر آپ حیدرآبادی نوجوان کا

قریب سے مطالعہ کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ اس کی بنضوں میں ترقی اور تعمیر کی بجلیاں رقص کر رہی ہیں ۔ میں نے اس قدر عمیق ذوقِ علمی ایسی ان تھک محنت اور اس قدر غور و فکر کسی خطہ کے نوجوان میں نہیں دیکھی جو یہاں نظر آتی ہے ۔ اسی کے ساتھ اس کی فطرت کی سادگی اس کا حسن ظن اور بے اندازہ رواداریاں اپنا جواب نہیں رکھتیں ۔

میرے نزدیک بدرؔ، وفا فانیؔ، باقیؔ، مخدومؔ، سازؔ، میکشؔ وجدؔ، نظرؔ، خسروؔ، کاوشؔ اور ظفرؔ ایسے شاعر ہیں جن کی منزل متعین ہو چکی ہے اور اگر یہ صحیح ہے کہ ادبی برادری زمان و مکان کی ساری قیدوں سے آزاد ہے تو آج بھی حیدرآباد کیا سارے ہندستان کے لئے یہ نوجوان شعراء مایۂ ناز ہیں ۔ اور ان کے مستقبل کا تو کیا پوچھنا ۔

علی اختر

(لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے پڑھا گیا)

قطعات

(۱)

ارادہ تیرا میری زندگی ہے
مرا مجبور رہنا ـــــ بندگی ہے
غلامی اور مجبوری کا جینا
ظفرؔ اپنی بھی کوئی زندگی ہے

(۲)

فلک والوں کی کوئی زندگی ہے
فرشتوں کی بھی کوئی بندگی ہے
مری ہر سرکشی گویا اطاعت
عبادت کیا فقط شرمندگی ہے

(۳)

یہ اک احساس ہے شرمندگی ہے
مرا احساسِ پستی ـــــ بندگی ہے
مری ہستی ہے شرحِ کبریائی
مجھی سے خیر و شر ہیں زندگی ہے

(۴)

یہ کوئی زندگی ہے بے کسی کی
یہ کوئی بندگی ہے بے بسی کی
ترا عکسِ صحیح اور اتنا مجبور
بنا کر مجھ کو خود اپنی ہنسی کی

مظفر الدین ظفرؔ

ایک خط کا جواب

تو تم نے خط یہ منصوری کے کہساروں سے بھیجا ہے
اثر لے کر طرب افروز نظاروں سے بھیجا ہے
بہت ہی کیف ساماں ہیں
پہاڑوں کے وہ نظارے
ہر اک جانب خراماں ہیں
وہاں رقصندہ مہ پارے
ہواؤں ہی میں رقصاں ہیں
وہاں کیوپڈ کے گہوارے —————— ؟؟؟ (CUPID)

"ڈیر منظر!" میں اس حسنِ نظر کی داد دیتا ہوں (DEAR)
تمہاری خوش نصیبی پر مبارک باد دیتا ہوں
پہاڑوں میں چمن کی طرح — سب انسان پلتے ہیں
حسینوں کے بدن کی طرح — واں سکے بھی ڈھلتے ہیں
پہاڑوں میں دلہن کی طرح — موٹر کار چلتے ہیں
تو تم یہ دیکھ کر کس درجہ شاداں ہو رہے ہوگے
مسوری میں خود اپنے پر بھی نازاں ہو رہے ہوگے!
یہاں میں لکھنؤ میں گھر سے کچھ اکتا کے آیا ہوں
تمہارے خط کو پڑھ کر زندگی پر تلملایا ہوں
اسی دم جب کہ تم کھوئے ہو کیف افزا نظاروں میں
مسوری کی بہاروں، آبشاروں، جوئے باروں میں
میں تم کو لکھ رہا ہوں اور پسینے آئے جاتے ہیں
فسردہ اور خشک احساس دل میں پائے جاتے ہیں
گر نیچے سڑک کو دیکھ کر — لکھتا ہی جاتا ہوں
اٹھاتا ہوں یونہی اپنی نظر — اور گنگناتا ہوں

یہ جو انساں ہی کے روپ میں سڑکوں پہ پھرتے ہیں
جہنم سے بھی بڑھ کر دھوپ میں سڑکوں پہ پھرتے ہیں
اگر احساس والے ہیں
اگر دنیا کے پالے ہیں
تو ننگ حوصلہ ہے بے کس و مجبور ہو جانا
تو جرم زندگی ہے آپ ہی مسرور ہو جانا ــــــــ!!!
نہ جانے آج کیا کیا خط میں تم کو لکھ رہا ہوں میں
تمہاری غیر دلچسپی کا ساماں ہو گیا ہوں میں
مگر تم کو ہماروں میں
ہوا کھاتے رہو اب بھی
مسوری کی بہاروں میں
یونہی گاتے رہو اب بھی
حسینوں، ماہ پاروں میں
سکوں پاتے رہو اب بھی
کبھی فرصت جو مل جائے، کبھی جب "موڈ" میں آنا (MOOD)
ذرا تم خاص منصوری سے تھوڑی دور بھی جانا
مسوری سے کہیں ٹھنڈے مگر اجڑے دیہاتوں میں
کسانوں اور مزدوروں کی سونی کائناتوں میں
وہاں وادی بھی ہو گی اور کیف افزا نظارے بھی
وہاں کلیاں بھی ہوں گی اور رنگیں چاند تارے بھی
غریبوں کی زمینوں میں بھی یہ حسن آفریں ہوں گے
انھیں وہ دیکھتے ہوں گے ولیکن خوش نہیں ہوں گے ــــــــ!!!
زمانے کے نظامِ کہنہ کو برباد ہونے دو! ــــــــ!
سنورنے دو جہاں کو زندگی کو شاد ہونے دو!
تو پھر خوشیاں منائیں گے
مسرت کی بہاروں میں

تو پھر ہم گیت گائیں گے
طرب افزا نظاروں میں
تو پھر ہم جھوم جائیں گے
حسینوں، ماہ پاروں میں
تو پھر ہم سکھ بھی پائیں گے
پہاڑوں، کوہساروں میں ———— !!!
تو تم نے خط یہ منصوری کے کہساروں سے بھیجا ہے !!

سلام مچھلی شہری

دیری کا سبب

(نوٹ - یہ سطریں شائع تو ہو رہی ہیں لیکن ان کا لکھنے والا اس دنیا سے چل بسا۔ اس کی روح شاید اس سے مسرور ہو۔ ادارہ)

کلرک نے دبے پاؤں کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ افسر اس پر ٹوٹ پڑا " آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ آپ ایک ہفتہ سے برابر دیر سے آرہے ہیں۔ کبھی آدھ گھنٹہ کبھی گھنٹہ۔ میں ان حرکات کو برداشت نہیں کر سکتا۔ نوکری کرنی ہے تو وقت پر آنا ہوگا ورنہ استعفیٰ دے کر گھر چلے جائیے۔"

کلرک نے مودبانہ عرض کیا۔ " سرکار! کئی دنوں سے میری بیوی بیمار ہے، گھر پر میرے سوا اور کوئی نہیں۔ دوا وغیرہ کے انتظام میں دیر ہو جاتی ہے۔ ———— اور آج تو اس کی حالت بہت زیادہ خراب ہے۔ میں آپ سے ادباً درخواست کرتا ہوں کہ آج ایک یوم کی رخصت عطا فرمائیے۔

"کیا؟ رخصت! رخصت!! نوکری نہ ہوئی مذاق ہوا۔ ہر دوسرے دن آپ کو رخصت چاہئے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی بہانہ موجود۔ کبھی خود بیمار ہیں کبھی بیوی بیمار ...."

اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا " نہیں سرکار۔ بہانہ نہیں وہ حقیقتاً بیمار ہے۔

" غلط۔ بالکل غلط۔ سراسر جھوٹ۔ میں ایک نہیں سن سکتا۔ آپ کو رخصت نہیں ملے گی۔

اس نے ایک دفعہ افسر کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر آکر اپنے متعلقہ کام میں مشغول ہو گیا۔

دوسرے دن کامل تین گھنٹے دیر سے وہ دفتر پہونچا۔ افسر اسے دیکھتے ہی آگ بگولہ ہو گیا۔

اس نے معذرت کے لہجہ میں عرض کیا " سرکار۔ کل گھر پہونچنے پر بیمار بیوی کی جگہ اس کی لاش ملی۔ ابھی ابھی قبرستان سے لوٹا ہوں۔ معاف فرمائیے۔ اب آئندہ دیر نہ ہوگی" اور کمرے سے باہر آکر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

کرشنا نارائن واگھرے ضمیر

"تیج" کی حویلی میں ہولی

دلّی کا اخبار "تیج" اپنی جدت طرازیوں اور نت نئی اعجوبہ زا اداؤں میں ایک خاص شہرت حاصل کرچکا ہے۔ خلاف واقعہ مضحکہ خیز ریویو اس کے یہاں کے تیج تہوار سمجھے جاتے ہیں۔ مفروضات کی ہولی کھیلنے میں یہ اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ عصبیت اور حرف گیری کی تاریک عینک کبھی اس کی آنکھوں سے الگ نہیں ہوتی جس سے تابناکیاں بھی ڈراونی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ابھی حال میں صحافت کی شاہ راہ پر ہولی سے پہلے ڈنکے کی چوٹ اس نے نقد وتبصرہ کی ہولی مناکر دور از کار باتوں کا جو' ابیر گلال اڑایا اور اپنے رنگ تحقیق کی جس نرالے ڈھنگ سے پچکاریاں چھوڑیں یہ پورا سماں دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

حیرت خیز بات یہ ہے کہ نئی ہندی کے متوالوں کے منہ سے شکتنا' رکچھا' سمبندھ' کلیور' سمپتی' کلاہل' پرارتھنا' تتھا' ہودے جیسے ان گھڑ اور نامانوس لفظوں کی پوری کتھا سن کر تو تیج کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور رگِ احساس کو جنبش بھی نہ ہوئی۔ لیکن وہ طرز تحریر جو ہندی نوازوں کو بہلانے' منانے اور سمجھانے کے لئے بہ مجبوری اختیار کیا گیا تھا' اور جو ہندی کے کٹھن اشلوکوں کے مقابلے میں کہیں اچھا تھا' مدت دراز کے بعد اس نہج تحریر کو دیکھ کر اردو کی مامتا کے جوش نے ایسا آپے سے باہر کردیا کہ تیج بیٹھے بیٹھے ہنکارنے لگا۔ پھر تعجب بالائے تعجب اس امر پر کہ جس روش تحریر سے برافروختہ ہوکر غیظ وغضب کا سیلاب امنڈ آیا یہ آج کی بات نہیں اسے کئی سال ہو چکے۔ بڑی مدت تک چپ سادھے رہنا

اور کافی عرصہ گزر جانے پر ایکا ایکی باسی کڑھی میں اُبال آجانا ایک نیا ٹوٹکا اور انوکھا شعبدہ ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں اس آڑ میں کوئی اور پیکر فضائل ضمیر مستتر کی طرح پوشیدہ ہو۔ خیر' کسے باشد۔ چونکہ:-

بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

اس لئے اصل واقعے کی تفصیل سے پہلے اظہار واقعہ کے طور پر چند ضروری باتوں کی توضیح مناسب معلوم ہوتی ہے تاکہ صحیح واقعے کے خط وخال ارباب نظر کے پیش نظر ہوسکیں۔ کئی سال ادھر جب ہندی نوازی کی لے رہ رہ کے آگے بڑھنے لگی اور یہ دھن اردو میں عربی' فارسی کے نثرِ دشکر الفاظ کی جگہ سنسکرت کے بوجھل اور نامانوس لفظوں کی لگاتار بھرمار کرنے پر تل گئی تو اس ناروا جھگڑے کو دبانے اور اس بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے کا خیال پیدا ہوا۔ مذاق عام کے لحاظ سے اس کی رسمی' سطحی اور معمولی یہی دو صورتیں ہوسکتی تھیں کہ یا بحث زبان کی تو تو میں میں سن کے کان میں تیل ڈال کر بیٹھ جاتا اور یا متعارف طرز تحریر میں اس کی تردید کرکے دل کی بھڑاس نکالی جاتی۔ پہلی صورت تو تقریباً ناممکن سی تھی اس لئے کہ بے حس بھی اپنی مادری زبان کی تخریب کبھی گوارا نہیں کرسکتا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ زبان کا مسئلہ نہایت پیچیدہ اور اہم معاملہ ہے۔

جسٹس محمود مرحوم کا یہ واقعہ غالباً ارباب ہوش کے گوش زد ہوا ہوگا کہ صوبہ یو' پی کے سابق گورنر سر انتھونی میکڈانلڈ نے جب ہندی نوازی پر کمر باندھی تو اسے عروج و ترقی دینے کے لئے بہ جا بےجا کمیٹیوں پہ کمیٹیاں کرکے رائے عامہ کی جانچ [illegible] کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں علی گڑھ [illegible] خاص مہمان کی حیثیت سے تھے

یہیں ایک کمیٹی معین کی گئی اور عین وقت پر اُن کے اصرار نے جسٹس محمود کو بھی تخریب اردو کی کمیٹی میں شریک ہونا پڑا۔ گورنر بہادر نے بھرے جلسے میں نہایت بے باکی سے اردو کی بے بضاعتی و بے مایگی پر زہر اگلا اور ہندی کی بلندی و برتری پر اپنا زور تقریر ختم کر کے دم لیا۔

یہ سنتے ہی جسٹس محمود مرحوم خشمگیں انداز سے اٹھے اور تیز و تند لہجے میں کہنے لگے:۔ سر انتھونی! چونکہ تم میرے والد کے مہمان ہو اس بناء پر اخلاقاً مجبور ہوں۔ ورنہ ابھی معلوم ہو جاتا کہ رُو در رُو کسی کی مادری زبان کی تحقیر و توہین کرنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ بپھرے ہوئے شیر کو دیکھ کر ہاں ہاں کر کے سر سید بیچ میں نہ آجاتے تو نہیں معلوم بحثِ لسان میں جنبش زبان اور کیا گل کھلاتی۔

رہی دوسری صورت تو وہ نہایت مایوس کن تھی اور اس میں تضیع اوقات کے سوا اور کوئی فائدہ ہی نہ تھا اس لئے کہ عربی، فارسی الفاظ سے لاگ اور نفرت کی وجہ سے متعارف روش تحریر دیکھنے کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ اسی بناء پر کافی غور و خوض کی زحمت برداشت کی گئی اور مسلسل صعوبت جستجو کے بعد اس وقت ایک نئی کارگر تدبیر یہی نظر آئی کہ نئی ہندی کے جوشیلے پجاریوں سے جو کچھ کہنا ہے عربی، فارسی کو چھوڑ کر وہ اس ڈھب سے کہا جائے جسے یہ لوگ کم سے کم سن تو لیں۔

کسی بڑھتے ہوئے ہنگامے میں ٹھیر یئے تو 'سنئے' تو دیکھئے تو سے کام نہیں چلتا۔ ایسے محل پر تھوڑی دیر کے لئے ہاں میں ہاں ملانا ہی چلتا ہوا جادو سمجھا جاتا ہے۔ یہی سوچ کر الہ آباد اکیڈیمی کے صدر ڈاکٹر تارا چند صاحب، گاندھی صاحب پنڈت جواہر لال صاحب نہرو کو چھوٹی بڑی سب چھپے بتیاں

اس طرز سے لکھیں جن کا دامن تحریر عربی، فارسی لفظوں کے شگفتہ پھولوں سے بالکل خالی رہا۔ جس طرح متاع عرب و عجم سے یہ روش تہی دست رہی اسی طرح برج بھاشا کی نئی نئی سوغات سے بھی۔

پھر اسی آڑ میں اردو کے شیر و شکر عربی، فارسی الفاظ کی حقیقی منزلت اور صحیح اہمیت، گھلے ملے اور بے جلے لفظوں کی کاٹ چھانٹ کے نقائص، زبان کی ساخت اور اس کا تدریجی نشو و نما دیہات اور شہروں کی زبان، بول چال اور بات چیت میں فرق شیر و شکر الفاظ کی اصلی قدر و قیمت اور سچی جانچ پرتال کا صحیح معیار، نئے نئے الفاظ بنانے کے مقامات، زبان کے خالص بنانے کے معنے اور ترقی پذیر زبان کے خالص نہ ہو سکنے کی اہم اور دلچسپ بحث، مذہب اور زبان کی جداگانہ سرحدیں، ان دونوں کے ڈانڈے ملانے اور انھیں گڈمڈ کرنے کے نقصانات، بوجھل، ثقیل، فصیح اور شستہ الفاظ میں باہمی مابہ الامتیاز، نیز تاریخی، مذہبی، سیاسی اور ادبی بحثیں چھیڑ کر نہایت محدود اور تنگ دائرے میں جتنی گنجائش نکل سکتی تھی ان اہم بحثوں کے لئے جگہ نکالی گئی اور ابتدا سے لے کر آخر تک استدلال کی استواری و استحکام "اردوئے معلیٰ" کی حمایت کا پورا فرض ادا کرتا ہوا چلا گیا۔

گویا:۔ شمع ہماں است لگن دیگر است۔ لگن ضرور بدلی لیکن شمع ذوق افروز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، مذاق بزم سے شیشہ و ساغر بدل دینا پڑے مگر پر کیف آتش سیال وہی رہی، بھیس بدلا ہوا بھی لیکن انداز قامت نہ بدلا۔ گلہائے تحریر کا رنگ پھیکا تو پڑا مگر ان کی نکہت انگیزیاں بدستور ہیں۔ محفل کے بے مغزوں کو رجھانے کے لئے "چوبولے" گانا پڑے لیکن سُر اور لے تال کا معیار وہی برقرار رہا۔ اس پر بھی اگر کچھ نہ دکھائی دے:۔

چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

زیر تذکرہ نہج تحریر میں عربی، فارسی کے ذخیرۂ کثیر لفظوں کو اردو میں سے نکالنے اور ان کی جگہ سنسکرت کے بھولے بسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس پر جا بجا اظہار افسوس و نفرت سے کیا یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ یہ طرز ملک کی تقلید کے لئے نہیں بلکہ بے وجہ روٹھے ہوؤں کو منانے اور ان کا دھیان بٹانے کے لئے مجبوراً اختیار کرنا پڑا۔

اس طرز کو پورے ملک کے لئے صلائے عام اور معیار تقلید سمجھ لینا نہایت فاحش غلطی ہے۔ حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ میرا خطاب نہ مسلمانوں سے تھا اور نہ ان مسالمت پسند ہندوؤں سے جو اس ہنگامہ آرائی پر بھی اپنے اسلاف کی طرح بدستور "اردوئے معلّیٰ" کو عینک کے مثل آنکھوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ اُردو کے مربی و سرپرست ہندو مسلمانوں کو الگ کر دینے کے بعد اب صرف وہی "شبد ساگر" میں ڈبکی لگانے والا جتھا رہ گیا جسے نئی ہندی کا متوالا کہا جاتا ہے۔

بس اسی کی طرف میرا روئے سخن تھا اور صرف اسی سے میری بات چیت تھی۔ میں نے جو کچھ کہا وہ اسی مجمع کے تیور دیکھ کر اور جتنا لکھا وہ اسی جماعت کی ذہنیت پہچان کر۔

ہندی نوازوں کو نیا رنگ دکھانے سے مقصد یہی تھا کہ کسی طرح سنسکرت کی کھلی ہوئی نئی نئی ڈکشنریاں بند ہوں اور نت نئے نامانوس الفاظ کا جوش جستجو رک رکا کے رہ جائے۔ ذوق تجسس کا ٹھیراؤ دھیان بٹنے ہی سے ہو سکتا تھا اور دھیان بٹتے ہی بازی جیت لینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ کیونکہ اس نہج تحریر میں معمولی بات چیت سے آگے بڑھنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ اس لئے کسی علم و فن کے چھڑ جانے پر بھلا یہ کیا ساتھ دے سکتی۔ ایسی صورت میں عربی، فارسی لفظوں کا استعمال خود بخود لازمی قرار پاتا۔ اس روش کے اختیار کرنے میں یہی سب باتیں پیش نظر تھیں جن پر پانچ چھ برس کے بعد آج ناواقفیت آوازے کسنے اور ایڑی چوٹی کا زور لگا کے تردید کرنے کے لئے اٹھی ہے۔

جن چٹھیوں کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے۔ ان میں سے پنڈت جواہر لال صاحب نہرو کی موسومہ چٹھی کے سوا اور سب چٹھیاں یکے بعد دیگرے دلّی، لاہور کے مختلف ماہ ناموں میں شائع ہوئیں۔ اِن سب کے چھپ چکنے پر بھی جب فضا بدستور گرد آلود رہی تو اس طرز کو بے سود سمجھ کے خاموشی اختیار کی گئی گر ذہن اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا کہ اب کونسی ایسی کارگر تدبیر کی جائے جس سے یہ ہماہمی کا ادھم تھمے اور تیرہ خیالی کا جھگڑا رکے۔ اسی فکر میں تھا کہ اسی کا بے سود کی بلا سے پھر دھیڑ ہوئی یہاں کے ایک بزرگ منش خلیق و متواضع مولوی سید خورشید علی صاحب نے شائع شدہ خطوط کو کتابی صورت میں لانے کی اس شرط کے ساتھ فرمائش کی کہ طبع شدہ خطوط کے لئے اسی رنگ میں ایک ایسا مقدمہ لکھا جائے جس میں چٹھیوں کی ادھوری بحثیں پوری ہو سکیں۔ چونکہ دل بجھ چکا تھا اس لئے اس فرمائش کو بہت ٹالنا چاہا مگر نہ ٹل سکی اور موصوف ہی کی شعاع اللغات کے اجالے میں "سوجھ بوجھ کے ڈھائی انچھر" کے عنوان سے ایک مبسوط مقدمہ لکھنا ہی پڑا جو تقریباً سال بھر تک دلی کے ماہ نامہ "ساقی" میں بہ اقساط شائع ہوتا رہا۔ اسی مقدمے کے آخر میں "ٹھیٹ اردو" کی نسبت جو اظہار خیال کیا گیا ہے۔ آنے والی باتوں کے لئے قبل از قبل درج ذیل عبارت لائق ملاحظہ ہے:۔

میری بھول اس ڈھب سے لکھنے لکھانے میں مجھ سے بھی یونہی سی ایک اک چوک ہوگئی۔ یہاں تک کی لکھت میں نہیں پھر کہاں؟ اسی ڈھیر کی چٹھیوں میں جو کئی برس ادھر دلی کے

"ساقی" اور "جامعہ" لاہور کے "شاہکار" "ہمایوں" اور "ادبی دنیا" میں چھپ چھپا کے نہ جانے کہاں کہاں پہنچیں۔ یہ مانی ہوئی بات ہے وہ ڈگر جو بیروں نکلے دبی نہ ہو، پہلے پہل اس نئی ڈگر پر چلنے میں ادھر اُدھر نہیں دیکھا جاتا اور ناک کی سیدھ ہی پر چلنا پڑتا ہے۔ دھیان کی ٹکٹکی ادھر بندھ جانے سے دوسری سائڈ کی چھوٹی بڑی کوئی بات بھی دکھائی نہیں دتی۔ نئے ڈھنگ سے اردو، ہندی جھگڑا چکانے میں ایسا لگا اور ایسا دھیان بٹا جو نہ لکھنا چاہئے تھا وہی لکھ گیا ایک آدھ پر نہیں سب چٹھیوں پر بے دھیانی ہی لکھوانی چلی گئی جیسے: ۔گاندھی جی سے بات چیت، ٹھیٹ اردو میں، پنڈت جواہر لال نہرو سے دو ڈھائی باتیں ٹھیٹ اردو میں، تارا چند جی سے دو دو باتیں ٹھیٹ اردو میں۔

یہ جو بھی لکھا وہ چھپ چھپا گیا اور چھپنا چاہئے تھا۔ چھاپے کے سانچے میں ڈھل ڈھلا کے اپنا کیا دھرا جب سامنے آیا تو ایسا اچنبا ہوا جیسے کسی دوسرے نے یہ بول بڑھا دیئے ہیں۔ چھپ چکنے پر بھلا کاٹ چھانٹ کی جگہ کہاں؟ جو ہونا تھا ہو چکا یہ سوچ کے چپ ہو گیا۔ پر جی کی پھانس نہ نکلی اور یہ کھٹک نہ گئی۔ اس پر کچھ الگ لکھنا چاہتا تھا پر ادھر ادھر کے جھمیلوں نے نہ چھوڑا اور اس میں پھنس کے ایک بول بھی نہ لکھا جا سکا۔

اب جو پھر بات چھڑی تو وہ دبی ہوئی جھٹ ابھر آئی۔ نہ جاننے والے کہیں ٹھوکر نہ کھائیں اور لکھنے کے اس ڈھب کو ٹھیٹ اردو نہ سمجھنے لگیں۔ اس ڈر سے یہ لکھنا اور جتانا پڑا۔ وہ چٹھیاں جو "ٹھیٹ اردو" کے نام سے چھپ چکیں ان کے لکھنے کا ڈھب اردو تو ہے۔ پر ٹھیٹ اردو نہیں۔ پھر ٹھیٹ اردو کسے کہتے ہیں اور اس کی پہچان کیا ہے؟ اس کی ہندی کی چندی آگے آتی ہے۔

اب تک کی لکھت کئی برس ادھر کی چھپی ہوئی چٹھیوں کا وہ پہلا ٹکڑا ہے جسے فارسی میں "دیباچہ" کہتے ہیں۔ اس ٹکڑے اور اس کے پیچھے والی چٹھیوں کے لکھنے کا ڈھچر بھی ایسا ایک سا ہے جس میں نہ کہیں ال جل ہے اور نہ کہیں یونہی سی بھی کوئی گھٹ بڑھ۔ جو ڈول اس کا ہے وہی ڈھنگ ان کا۔

رہی "ٹھیٹ اردو" تو اس کا ڈھب اس ڈھچر سے پورا الگ ہے۔ اس میں عربی، فارسی کا ایک آدھ بول ڈھونڈے سے بھی کہیں آپ کو نہیں مل سکتا اور ٹھیٹ اردو میں سب بولیوں کے ملے جلے اور گھلے ملے بول دھڑلے سے برتے جاتے ہیں۔ ٹھیٹ اردو کے سامنے لکھنے کا یہ ڈھنگ ایسا ہی ہے جیسے کسی ہری بھری مہکتی ہوئی بڑی پھلواری کے سامنے کچھ مرجھائی ہوئی ٹہنیاں۔ ٹھیٹ اردو کی بانگیاں دکھانے کے لئے اب کون ڈھونڈ ڈھانڈ کے جنجال میں پھنسے اور دوڑ دھوپ کر کے ادھر ادھر سے مانگے تانگے کی لکھتیں اکھٹی کرتا پھرے۔ اس دیس کے مانے ہوئے بڑے بوڑھوں کی چار پانچ لکھتیں جو اپنے پاس ہیں انہی میں سے کچھ ٹکڑے لکھنے سے پہلے سر سید کی سبھا میں آپ کو لئے چلتے ہیں"۔

(ساقی۔ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء)

اس عبارت کی خط کشیدہ سطریں اور اسی طرح کی آگے آنے والی خط زدہ عبارتیں ملحوظ خاطر رہیں اس لئے کہ آئندہ کی بساط استدلال

یہی سب قومی بہروں کا کام دیں گی۔ ڈاکٹر تارا چند صاحب کی موسومہ چٹھی جس صنعت میں لکھی گئی۔ اس کی وقعت و منزلت خود میری نظر میں کیا تھی؟ اس کے تفصیلی جواب کے لئے اسی چٹھی کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:۔

"میرے لکھنے کا یہ ڈھنگ نہیں جو آپ نے دیکھا۔ آپ کی انوکھی لکھت دیکھ کر یہ دھیان آیا۔ آپ سے اردو ہی میں بات چیت کروں اور ہو سکے تو عربی فارسی کو ہاتھ نہ لگاؤں اور دکھا دوں:۔ کلا، ہل، سمپتی، ابھیاس، نشچے جیسے بھولے بسرے کڈھب بولوں کو چھوڑ کے اردو یوں لکھی جا سکتی ہے۔ اس میں عربی، فارسی کے بول جن سے آپ کو چڑ ہے اتنے بھی نہیں جتنا نون آٹے میں۔ عربی، فارسی کو ہاتھ نہ لگانے سے دیکھئے ساری لکھت کیسی روکھی پھیکی ہو کر رہ گئی۔ جس تھوڑی سی جگہ میں دب دبا کے اور سمٹ سمٹا کے بھی بیٹھنا دو بھر ہو۔ وہاں پھیل کے بیٹھنے کی جگہ کہاں؟ گنتی کے کچھ بولوں کی الٹ پلٹ اور ہیر پھیر سے جو ہو سکتا تھا وہ کیا۔

کوئی ان پڑھ، سمجھ کا میٹھا ہی ایسا ہوگا جو ہندی کی گھلاوٹ اور مٹھاس کو نہ مانے۔ پر نری مٹھاس ہی مٹھاس کھائی بھی تو نہیں جا سکتی۔ اس کا جوڑ چٹ پٹا بن ہو۔ چٹ پٹے پن کے ساتھ مٹھاس بھی ہو تو پھر اس کا کیا کہنا سونے پہ سہاگا ہے۔ جیسے ہندی کی مٹھاس مانی ہوئی ہے۔ ایسے ہی عربی، فارسی کا چٹ پٹا پن بھی۔ یہ دونوں ساتھ ساتھ ہوں تو پھر ان کا کیا پوچھنا اسی لکھت میں کہیں کہیں بھی عربی، فارسی کا جوڑ لگا دیا جاتا تو ان پھولوں کی مہک اور ان کا روپ دیکھنے کا ہوتا بیچ میں بھی سمجھ لیجئے یہ ڈھب ایسا نہیں ہے جو سب جگہ نبھ سکے۔

سرکس کا گھوڑا تھوڑی سی جگہ میں لیٹ کے بیٹھ کے، کھڑے ہو کر نت نئے کرتب دکھاتا ہے۔ پر جب کوئی بھاری بوجھ لاد کے کسی لمبی چوڑی سڑک پر اسے دوڑایا جائے تو وہ گھڑی گھڑی اڑتا اور بدکتا ہے مارنے پیٹنے چمکارنے کسی ڈھب سے بھی وہ نہیں سدھرتا اور گھڑی بھر بھی وہ اس سڑک پر نہیں چل سکتا۔

اس لکھت کا بھی یہی رنگ ہے۔ یوں تو کچھ کانا پھوسی اور کچھ کھلی ڈلی باتیں بنا سکتی ہے۔ پر جب کٹھن باتیں چھڑ جائیں اور ان کا گہرا پن جوں کا توں دکھانا ہو تو پھر اپاہج بن جاتی ہے اور اپاہج بھی ایسی جیسے ان تلوں تیل ہی نہیں تھا کبھی اس کے اپاہج ہونے سے عربی، فارسی کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے اور یہ دونوں مل ملا کے کیسی ہی الجھی ہوئی گتھیاں کیوں نہ ہوں گھڑی بھر میں انھیں سلجھا دیتی ہیں اور پھر کوئی الجھاؤ ہی نہیں رہتا۔ کٹھن سے کٹھن بھید کھل کھل کر ایسے دکھائی دینے لگتے ہیں جیسے ہاتھوں کی لکیریں"

(جامعہ۔ دہلی۔ اگست ۱۹۳۶ء)

گاندھی صاحب کی موسومہ چٹھی کے یہ اختتامی فقرے بھی ملاحظہ ہوں:۔

"آپ سے باتیں کرنا تھیں اور آپ کو بدیسی بولیوں سے چڑ، تو پھر لکھنے کا یہ ڈھب نہ رکھتا تو کیا کرتا؟ عربی فارسی، ہندی بولوں کو سمو کے لکھتا جیسا لکھا کرتا ہوں تو اس کے دو بول بھی آپ نہ دیکھتے"

(الٰہ آباد اکیڈیمی کا ماہی "ہندستانی" ۱۹۳۶ء)

ڈاکٹر تارا چند صاحب کی آخری موسومہ چٹھی کا درج ذیل اختتامی حصہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں:۔

"اب تک یہ جھگڑا چکانے اور روٹھے ہوئے ہندوؤں کو منانے کے لئے اس ڈھب پر لکھتا رہا اور اس ڈھب کے کواڑ میں نے ہی کھولے تھے اور اب میں ہی انھیں بھیڑے دیتا ہوں۔ انھیں کیوں کھولا تھا اور کس لئے بھیڑا جا رہا ہے؟ یہ کوئی بھید نہیں جو آپ سے چھپا ہوا ہو۔ تو اب جو لکھنا لکھانا ہو گا عربی، فارسی، ہندی ان سب کو ملا جلا کے اسی ڈھنگ سے لکھوں گا جیسے اس سے پہلے لکھا کرتا تھا"

(ادبی دنیا۔ لاہور ۱۹۳۷ء)

سلسلۂ واقعات کی یہ چھوٹی بڑی کڑیاں گویا نیچی اونچی ایسی سنگین سیڑھیاں ہیں جو بام نتائج تک پہنچا دیتی ہیں۔ زیر بحث صنعت میں چٹھیوں سے لے کر "سوجھ بوجھ کے ڈھائی اکھر" تک جتنی خامہ فرسائی کی گئی اس کے لفظ لفظ اور نقطے نقطے سے "اردوئے معلیٰ" کی تائید و حمایت کا آب حیات ٹپک رہا ہے اور اس کی کسی عبارت، کسی جملے اور کسی فقرے سے اس کے خلاف ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس باب میں تحریر جدید کی نوعیت استدلال اور اس کی استواری و استحکام ہی وہ قوی شہادت ہے جسے ارباب خرد کی ناقدانہ نگاہیں ہی پرتال سکتی ہیں۔ یہاں تک مسلسل واقعات کے خط و خال کا جو مختصر سا خاکہ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد اب "نتیجہ" کا ہیج کرم گستری "ہماری زبان" کے توسط سے لائق دید ہے "ہندستانی کا نمونہ ٹھیٹ اردو" اس عنوان کے تحت ڈاکٹر تاراچند صاحب کی موسومہ چٹھی کا درج ذیل حصہ نقل کر کے داد نکتہ سنجی دی گئی ہے۔

"اردو کو پنچ میل مٹھائی سمجھئے۔ کئی مٹھائیوں میں سے ایک مٹھائی کو الگ کر لینے سے مٹھاس بڑھے گی کیا۔ گھٹ گھٹا کے رہ جائے گی۔ ایک چینی ہوئی مٹھائی میں اور کئی مٹھائیوں کی مٹھاس نہیں آ سکتی۔ کسی ہرے بھرے پودے کی جڑ کھود کے کسی سوکھے ہوئے پیڑ کے لئے جگہ نکالنے سے یہ ٹھنٹھ تو بھلا کیا پھلے پھولے گا۔ وہ ہرا بھرا پودا ہی مرجھا کے رہ جائے گا۔ جیتی جاگتی بھاشا میں مٹی ہوئی بولی کے ٹھونسنے سے مری ہوئی بولی تو جی اٹھنے سے رہی۔ جیتی جاگتی بھاشا ہی اس کے ملنے سے ادھ موی ہو جائے گی۔

اردو کی نیو ڈالنے والوں میں کوئی ایک آدھ جتھا تو نہ تھا۔ دیس والے سبھی تھے۔ سب نے مل کر اس کی جیسی نیو ڈالی ویسا ہی اس کا آشرم بن بنا گیا۔ اب آپ کیا پورے آشرم کو ڈھا کے پھر اس کی نئی نیو رکھنا چاہتے ہیں۔ نئی نیو کوئی پودا تو نہیں جو آج لگایا کل پھل لے آیا۔ برسوں کی دوڑ دھوپ سے اب کہیں جا کر اردو ایسی نکھر چلی ہے جیسے آج ہم آپ ہی نہیں اونچے اونچے گھرانے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں اور جب اس کا یہ نکھار ہی نہ رہا تو پھر رہا کیا۔ نیا کنواں کھود کے پانی پینا ایک دو دن کی تو بات نہیں، پھر جب تک کیا کیجئے گا؟ کیا چپ چاپ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی ٹھانی ہے۔ اردو اب تک جس سانچے میں ڈھل چکی ہے اسے یونہی رہنے دیجئے۔ اب رہیں اس کی اور بناؤ سنگار کی باتیں تو وہ گھاتیں کچھ کٹھن نہیں۔ اسے بے ٹھیس لگے ایک ایک کر کے وہ سب کی سب ہو سکتی ہیں۔ اردو کا پیار، پریم جو چاہے کہئے وہ اب یہی ہے۔

پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے والی بولیوں میں سے جونسی بولی بھی لیجے اس میں آپس کے میل جول، ساتھ رہنے سہنے، راج کا دباؤ اور ایسے ہی اور سہاروں سے پہلے پہل ایک بھاشا کے بول دوسری بولی میں کچھ کچھ آتے ہیں۔

باہر والی اور یہاں کی بھاشا میں لوچ اور لچک ہوئی، ملنے جلنے میں کوئی رکاوٹ نہ دکھائی دی اور نئی بھاشا کے بول یہاں کی بات چیت میں پھیلنے لگے تو پھر ان کا تانتا بندھ جاتا ہے اور ان کی کھپت پہ کھپت ہوتی چلی جاتی ہے۔ پر۔ کہیں کی بولی راج واج کا دباؤ وباؤ کچھ مانتی ہی نہیں۔ جیسے تاتاریوں اور ترکوں کی راج دھانی برسوں ایران رہا۔ پر فارسی نے راج واج کی بھاشا کو منہ بھی نہ لگایا۔

ہلاکو سے سلطان حسین میرزا تک برسوں راج کے ساتھ ساتھ رہنے پر بھی ترکی بول فارسی میں آگے بڑھ کے جگہ نہ لے سکے۔ انھیں گنا جائے تو سیکڑے میں بہت سے بہت دس بول نکلیں تو نکلیں۔ اسی ایران میں کبھی عربوں کا بھی راج پاٹ پھیلا ہوا تھا جو بہت نہ رہا۔ پر۔ جب تک بھی رہا پڑھے لکھوں کی لکھت پڑھت فارسی ہی میں رہی۔ اس پر بھی دیکھتے ہی دیکھتے عربی ایسی بڑھی اور پھیلی جیسے بن میں آگ لگے۔ اس کا گر یہی ہے :۔ ترکی بھاشا کی بناوٹ فارسی سے میل نہیں کھا سکتی تھی۔ اس لئے ملنے پر بھی یہ دونوں آپس میں رکی رکی رہیں۔ عربوں کا لوچ اور فارسی کی لچک، ان دونوں کے ملنے میں کوئی رکاوٹ ہی نہ تھی۔ اس لئے عربی، فارسی دونوں کی دونوں آپس میں مل جل گئیں۔

کوئی باہر والا کسی کے یہاں آ کے ٹھیرے اور گھر والوں کی آؤ بھگت، آنکھیں بچھانے سے وہ اسی گھر میں رہ پڑے۔ آپس کے میل ملاپ سے وہ اور گھر والے مل ملا کے ایک ہو جائیں تو پھر وہ باہر والا نہیں رہتا۔ گھر ہی کا کہلاتا ہے۔ پر۔ جب اس کھوج لگانے کی دھن ہو:۔ یہ کہاں کا تھا؟ یہاں کب آیا؟ تو گھڑی بھر کے لئے اس کے باہر والا ہونے کا دھیان آئے تو آئے نہیں تو پھر کبھی نہیں آتا۔ عربی، فارسی کو ایسا ہی سمجھئے ان دونوں کے بولوں کی اردو میں کیسی ریل پیل ہے۔ جسے دیکھئے بے سوچے سمجھے انھیں بولتا ہے۔ تو اب یہ کہنا ہی ٹھیک نہیں :۔ یہ عربی کے بول ہیں اور یہ فارسی کے۔ عربی، فارسی اب کہاں رہے۔ اب تو اردو میں یہ ایسے سما گئے ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ وہ اور یہ دونوں کے دونوں ایک ہو کے رہ گئے ہیں جب دونوں ایک ہو گئے تو پھر انھیں عربی، فارسی آپ کیوں کہتے ہیں؟ انھیں اردو کے گھر کی پونجی کہئے نا اس میں آپ کا کیا بگڑتا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا ایسے جتن کئے جاتے جن سے پرائے بھی اپنے بن سکتے۔ پر یہاں تو اپنوں کو بھی پرایا بنانے کا ڈول ڈالا جا رہا ہے"

("ہماری زبان" ۱۶ فروری ۱۹۴۱ء)

یہ اس چٹھی کا ابتدائی کچھ حصہ ہے جو الہ آباد اکیڈیمی کے "تماہی ہندستانی" میں ڈاکٹر تاراچند صاحب کے جواب کے ساتھ کئی برس ادھر چھپ چکی ہے۔ واقعہ نگاری کا فرض اتنا ہی ہے کہ جو کچھ ہو چکا اسے جوں کا توں دہرا دیا جائے۔ اس بناء پر ڈاکٹر صاحب کے جواب کی یہ آخری سطریں یہاں نقل کر دینا ضروری ہیں :۔

"اس آپس کی بول چال کی جو بولی ہے اس کا آپ کیا نام رکھیں گے۔ میں تو اسے اردو، ہندی یا ہندستانی کسی بھی نام سے پکارنے کو تیار ہوں۔ یہی وہ بولی ہے جس کا کچھ نکھار رنگ مولوی سید ابوالقاسم نے اپنی چٹھی میں دکھایا ہے"

(ہندستانی، اکتوبر ۱۹۳۶ء)

ڈاکٹر صاحب نے یہ فرمایا اور تیج نے جو گہر ریزی فرمائی وہ آگے آتی ہے۔ میں اس باب میں اپنی کوئی رائے پیش کرنے کا اس لئے

استحقاق نہیں رکھتا کہ درونِ خانہ کا راز اہلِ خانہ ہی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ کتاب پہ کتاب عذاب نہ ثواب کے لحاظ سے الہ آباد اکیڈمی کے صدر اور مسٹر تبیج اب آپس ہی میں سمجھ لیں۔ اس کے معاً بعد تبیج کی یہ گل افشانی دیدنی ہے:۔

"ہندستانی یا ٹھیٹ اردو کا یہ نمونہ آپ نے دیکھ لیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ پتنے تلے اور پھونک پھونک کے رکھے ہوئے شبد روزمرہ کی بول چال اور آئے دن کے واقعات کے بیان کے لئے کافی ہو سکتے ہیں؟ کیا کاغذ کی یہ ناؤ سائنس کی نئی تحقیقاتوں اور سیاسیات و معاشیات کی نئی نئی اصطلاحوں کا بوجھ اٹھا سکے گی؟ ہمیں تو اس میں بھی شبہہ ہے کہ لفظ کی جگہ ہر موقع پر "شبد" اور "بول" اور زبان کے لئے ہر جگہ بھاشا کا استعمال ہندستانی یا ٹھیٹ اردو کی اس قسم کو زندہ بھی رہنے دے گا یا نہیں! اردو میں عموماً "بول" گیت کے ٹکڑے کو اور "بھاشا" "برج بھاشا" کو کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو ایسی دو غلی کوششوں کے لئے ایک نیا قومی "عجائب خانہ" اس بھاشا کے علم برداروں کو تعمیر کرانا پڑے گا اور ہمیں یقین ہے تعمیر کے اخراجات پر قوم میں پھر اختلاف واقع ہو گا کہ چندے کا تناسب کیا رہے اور یہ جھگڑا اتنا طول پکڑے گا کہ بھاشا کے یہ نمونے دریا برد ہو جائیں گے۔ ایڈیٹر"

("ہماری زبان" ۱۶ فروری ۱۹۴۱ء)

تبیج کی یہ کرم فرمائی کسی کے اس شعر کی پوری مصداق ہے:۔

تغافل سے جو باز آیا جفا کی ۔۔۔ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

تقریباً پانچ چھے سال کے خواب تغافل سے چونکا بھی تو اس شان سے کہ ۔

لڑتا ہے اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
شاید ابھی نیند بھری نہ تھی اور کسی نے جھنجھوڑ کے کچی نیند سے اسے جگا دیا!

جب ہی تو بے سوچے سمجھے جو منہ میں آیا وہ کہہ گزرا۔ اپنے ذوق بیداد کے لحاظ سے تبیج کی یہ خدنگ افگنی اور ناوک اندازی محض مشقِ ناز کے لئے ہے۔ تو بسم اللہ۔

تومشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

اور اگر کسی کے کہنے سننے اور پٹی پڑھانے سے آنکھیں بند کر لی گئی ہیں تو کچھ تھوڑا بہت دماغ سے بھی کام لے کر آنکھیں کھول کے دیکھنا چاہئے تھا۔ کیونکہ چشم نظارہ طلب کی ودیعت اسی لئے ہے۔ یوں تو جس کے منہ میں زبان اور ہاتھ میں قلم ہے وہ جو منہ میں آئے کہے اور جو چاہے لکھے کوئی روکنے والا نہیں۔ لیکن صرف کہنے اور لکھ دینے کو اعتراض نہیں کہتے۔ .... حقیقی اعتراض وہی ہے جس میں کہنے والے کی باتوں اور لکھنے والے کی تحریر سے دقت نظر ایسی متناقض باتیں نکالے اور ان کی ایسی نمایاں حد بندی کرے کہ فریق مخالف کے لئے کوئی جائے گریز نہ رہے۔ مگر اس طرح کا اعتراض کہ بغیر کسی دلیل کے جو چاہا وہ کہہ دیا۔ اہل نظر اسے سوقیانہ روش کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

سید ابوالقاسم سرور

خطابیات

فن تقریر پر شیخ رحیم الدین صاحب کمال ظہیر آبادی نے یہ کتاب لکھی ہے جس کو ادارۂ ادبیات اردو نے شائع کیا ہے۔ سلیس اور عام فہم انداز میں تقریر کی تقریباً تمام اصناف پر بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ نواب بہادر یار جنگ بہادر نے تحریر فرمایا ہے۔ یہ کتاب (۱۱۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت ۱۲ سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد سے مل سکتی ہے۔

تلاشِ سکون

وہ اسی دھن میں لگا ہوا تھا کہ کہیں سکونِ قلب مل جائے۔ ایسا سکون جو اس کو دنیائے ہنگامہ کے اضطرابِ پیہم سے متاثر نہ ہونے دے۔ وہ چاہتا تھا کہ جب وہ اپنی زمین بوس جھونپڑی کے مٹی کے چراغ کا مقابلہ فلک بوس قصر کے جگمگاتے ہوئے برقی قمقمے سے کرلے، تو وہ ایک نامعلوم ضرب اپنے دل پر محسوس نہ کرے۔

تلاشِ سکون اس کو ایک فاقہ کش کسان کی جھونپڑی میں لے گئی۔ وہ سمجھا کہ شائد سکونِ قلب غریب کی پھونس کی کٹیا میں میسر آجائے۔ لیکن اسے ناامیدی ہوئی۔ جب اس نے کسان کا دھوپ سے جھلسا ہوا چہرہ پیلا پڑتے دیکھا۔ کیونکہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے اس کا ہرا بھرا کھیت بھی شدید تر دھوپ کی تاب نہ لاکر پیلا پڑ رہا تھا ..... وہ اور زیادہ ناامید ہوا جب اس نے کسان کی بیوی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے دیکھے۔ کیونکہ ساہوکار اپنی واجب الادا رقم کے عوض میں اس کے مویشی کھونٹے سے کھول رہا تھا۔ سکونِ قلب کا یہاں بھی نشان نہ پاکر وہ واپس ہوا۔ وہ ایک نامعلوم سمت کی طرف چل دیا۔

وہ جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا تیز قدم جارہا تھا۔ پژمردگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ سورج پہاڑ کے عقب میں دم توڑ رہا تھا۔ اور چاروں طرف اداسی حکمراں تھی۔ دور بیری پر ایک پرند زمزمہ آرائی میں مصروف تھا۔ شاید اپنی تمام دن کی کامیاب پرواز پر خوشی کے گیت گا رہا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر کہ شاید اس معصوم آواز میں اطمینان پنہاں ہو، بیری کے نیچے پہنچا۔ اور لگا اس سے آنکھیں لڑانے ...... پرند نے اپنا زمزمہ ختم کیا۔ اس کی طرف بغور اپنی گول گول آنکھوں سے دیکھا۔ فضا میں اپنے بازو کھولے۔ اور سکون کو پھاڑ کر اڑ گیا۔ تھوڑی دیر تک اس کی نظروں نے پرند کی پرواز کا ساتھ دیا۔ لیکن .... وہ دیکھتے دیکھتے نظروں سے غائب ہوگیا۔

اب وہ جھیل کے کنارے کنارے جارہا تھا۔ جھیل کی موجیں اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ چاند اوپر سے نور برسا رہا تھا۔ اور ہر سمت خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس دلفریب منظر نے اس کے پاؤں پکڑ لئے اس کی رفتار سست ہوگئی اور بالآخر وہ ٹھیر گیا۔ اس کی نظریں سطحِ قمر پر جم گئیں۔ اور وہ اس کی گہرائیوں میں پہنچنے کی کوشش کرنے لگا ...... اس کی محویت ختم ہوگئی۔ جب اس کی متجسس نگاہوں نے ایک بدنما سیاہ داغ کے وجود کا پتہ قمر کے گورے گورے سینہ پر لگالیا... ..چاند نے اب اپنی کشش کھودی اس کی نظریں اس مقام سے ہٹیں اور سطحِ آب پر مجنونانہ انداز سے رقص کرنے لگیں۔ جہاں چاند سیماب کے مانند تڑپ رہا تھا۔ اس نے سیاہ داغ اور تڑپ کا کچھ مفہوم پیدا کیا۔ اور کچھ سمجھ کر آگے چلنے لگا..... پیچھے مضطرب موجیں ساحل کی آغوش میں اس متلاشی انسان پر قہقہہ لگا رہی تھیں۔ اس نے اپنے قدم جلد جلد اٹھانے شروع کئے تاکہ قہقہوں کی گونج کے احاطے سے باہر ہوجائے۔

وہ جس کے قفسِ خاکی میں طائرِ روح مضطرب تھا۔ اس شدتِ اضطراب سے تنگ آکر اس شے کے حصول کی کوشش کر رہا تھا۔ جو اس اضطراب کو سکون میں تبدیل کردے۔ یہی تلاش اس کو ایک بڑی آبادی میں لے گئی۔ جہاں اس کی

نظر ایک خوش نما محل پر پڑی جس کے اطراف اس نے ایک چمن دیکھا۔ چمن میں فرش سبز دیکھا۔ فرش سبز پر روشیں لیٹی دیکھیں۔ جا بجا دائری اشکال میں سرو کھڑے دیکھے۔ ہر دائرہ کے مرکز پر فوارہ اچھلتا دیکھا ..... آگے بڑھا تو خوش نما موٹر کھڑی دیکھا۔ سفید پوش انسان دست بستہ کھڑے دیکھے سامنے کمرہ کے اندرونی حصہ پر نظر پڑی۔ تو چھت سے جھاڑ فانوس لٹکے دیکھے۔ فرش پر ایرانی قالین بچھے دیکھے اس پر مخملی صوفے رکھے دیکھے۔ الغرض اس نے دولت کو مختلف بھیس بدلتے دیکھا..... طلسم زندگی نے اس پر اپنا کام کیا۔ اور وہ سمجھا کہ سکون ضرور امراء کے عیش و آرام میں پوشیدہ ہے۔ اس کو روحانی اضطراب کی دوا دولت میں نظر آنے لگی۔ اس نے اس شہر میں قیام کیا تاکہ عشرت کدہ میں عیش منانے والے کی ذات کا مطالعہ کرکے اپنے خیال کی تصدیق کرے چند ماہ کے وسیع مطالعہ نے اسکو بتایا۔ کہ وہ امیرانہ ٹھاٹ سے زندگی بسر کرنے والا جب اپنے سے زیادہ حیثیت کے انسان پر نظر ڈالتا ہے تو حسد کی آگ میں جل اٹھتا ہے۔ جب اس کی نظر فاقہ کش خرقہ پوش پر پڑتی ہے تو اس پر غرور اور تکبر کا بھوت سوار ہوجاتا ہے۔ پہلی صورت میں وہ اندر ہی اندر کڑھتا رہتا ہے۔ کڑھنے والا کبھی اطمینان سے نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کی برق رفتار موٹریں، اور چمن میں شام کے وقت کی تازگی اس کو درس قناعت نہیں دے سکتیں۔ اس کا قلب فواروں کی طرح مضطرب رہتا ہے۔ دوسری صورت میں تکبر اس کو دائرہ انسانیت سے خارج کردیتا ہے۔ حدود انسانیت سے باہر ایک شخص کبھی خوش اور مطمئن نہیں رہ سکتا۔ یہ مقام جانوروں کے لئے موزوں ہے..... اس نے روحانی اضطراب کو اس عشرت کدہ میں سابقہ مشاہدات سے زیادہ پھیلتے دیکھا۔

سورج اپنی اعظم بلندی سے ساکنان ارض پر اپنا پوری قوت سے آتشیں تیر برسا رہا تھا۔ جن کی تاب نہ لاکر درخت اپنی چھوٹی چھوٹی ڈھالوں سے دست بردار ہوچکے تھے۔ تالاب پیاس کی تاب نہ لاکر منہ کھولے ہوئے آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے خاموش تک رہے تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ پرند چرند نہ معلوم کہاں چھپے پڑے تھے۔

وہ تپتی ہوئی زمین پر آہستہ آہستہ گردن جھکائے ہوئے جا رہا تھا۔ امید کامل طور پر اس کو نفی میں جواب دے چکی تھی۔ اور یقین دلا چکی کہ انسان اس دنیا میں صرف اس لئے آیا ہے کہ اس کے دل میں مضطرب سمندر کی طرح ہر وقت طرح طرح کی بے صبری کی موجیں اٹھتی رہیں اور بس۔

وہ جا رہا تھا کہ قدموں کی آواز نے اس کو چونکا دیا۔ اس نے دیکھا کہ سامنے ایک جنازہ آرہا ہے۔ آدمیوں کی ایک بڑی تعداد اس کے پیچھے ہے۔ وہ سب خاموش ہیں۔ ان میں سے چند اپنے لبوں کو بے آواز جنبش دے رہے ہیں.....وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے ہولیا........ وہ قدم اٹھا رہا تھا اور نظر اس مجبور خاکی پتلے پر جمی ہوئی تھی۔ جو چار کندھوں پر سوار ہوکر خاک میں ملنے جا رہا تھا........ شاید اس کے خیالات مرحوم کی دنیا میں پرواز کر رہے تھے..... وہ سب منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ آخری بستر استراحت دراز تھا۔ اس نے سب کو واپس جاتے دیکھا اور آنسو آنکھوں سے ڈھلکتے دیکھے۔ وہ قبر کے قریب آیا۔ کتبہ پر نظر پڑی "تاریخ پیدائش ۱۳۰۰ھ تاریخ وفات ۱۳۵۵ھ"........ اس نے مرنے والے کے متعلق ابتدا اور انتہا کے دو حوالے دیکھے اور درمیان میں صرف تاریکی ...... اس تاریکی سے اس نے وہ چیز حاصل کی جس کی کہ اس کو ضرورت تھی۔ اس نے خود کو چپکے سے کہا "سکون قلب ہر جگہ موجود ہے۔ جھونپڑی میں بھی اور ایوان میں بھی، بشرطیکہ

خواہش مند انجام حیات کی یاد دہانی کرتا رہے۔ یادِ انجام روح کی غذا ہے، یہ نہ ملنے پر اس کا بے چین ہونا یقین ہے۔ چل اپنی کٹیا کو، اور اپنے چراغ کو صاف کر۔ اس پر گرد جم گئی ہوگی۔"

عبد الباقی کیرانوی

بادۂ شباب

ہوش و خرد شکار کئے جا رہا ہوں میں — دل کو گنہگار کئے جا رہا ہوں میں

اُن کی نظر میں اشک کی قیمت نہیں تو ہو — شرحِ دلِ فگار کئے جا رہا ہوں میں

کتنا لطیف جرم ہے، ساقی خطا معاف! — نظروں کو بادہ خوار کئے جا رہا ہوں میں

کیا اہلِ بزم! جوشِ جنوں کو خدا رکھے — خود ان کو بیقرار کئے جا رہا ہوں میں

اپنے گناہِ عشق کا دے دے کے واسطہ — رحمت کو سازگار کئے جا رہا ہوں میں

مجھ سا زمانہ ساز بھی دنیا میں کم ہوا — ان کو امیدوار کئے جا رہا ہوں میں

ایسی بہار حشر تک آئے نہ اے خدا — دامن کو تار تار کئے جا رہا ہوں میں

بربادیوں میں ان کی رضا کا بھی دخل ہے — ہر عہد استوار کئے جا رہا ہوں میں

اے جورِ دوست! چھین لے اب قوتِ بیان — دنیا کو ہوشیار کئے جا رہا ہوں میں

تکمیلِ ضبطِ درد تو نورِ سحر نے کی — تفسیرِ انتظار کئے جا رہا ہوں میں

سوچو تو تم نے ہائے مجھے کیا بنا دیا — دشمن پہ اعتبار کئے جا رہا ہوں میں

ساتھی تو خیر! دنگ ہیں منزل نشینِ شوق — وہ راہ اختیار کئے جا رہا ہوں میں

پھر ان کے جور حد سے سوا ہو گئے نظر — پھر شکرِ کردگار کئے جا رہا ہوں میں

نظر

مولی والی !

جھونپڑی سے باہر نکلتے وقت اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں لیکن وہ بیحد مجبور تھی! اسے جانا ضروری تھا۔ ورنہ اس کے چاند کو روٹی اور دوا کہاں سے ملی ہوتی؟ کون لا دیا ہوتا؟ اپنی میلی ساری کے پلو سے آنکھیں صاف کرتی ہوئی اس نے ایک دفعہ اپنے لکڑی کی طرح سوکھے ہوئے بچے کو دیکھا اور جھونپڑی سے باہر نکل گئی ـــــ

گزرے ہوئے دنوں کے خیالات اس کے دماغ میں آندھی کی طرح اٹھ رہے تھے، جمو سے شادی ہونے کے بعد ہی سے اس کی زندگی کے سکھ کی کمان چڑھنی شروع ہوئی۔ چندے سے تو اس کے مندر کا کلس چڑھایا گیا تھا۔ لیکن ـــــ

سکھ کا کلس زیادہ دن قایم نہ رہ سکا۔ آرام و آسایش گیا سکھ اور اطمینان کی کمان چڑھی نہ رہ سکی۔ اس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ـــــ پلیگ کی منحوس وبا آئی اور اس غریب کے مندر کے دیوا کو بھگا لے گئی۔ !

اس کی تمناؤں کے پھول ابھی پوری طرح کھلنے بھی نہ پائے تھے ـــــ مرجھا بھی گئے!

لیکن اس کے دکھ کی کمائی ـــــ اس کے سکھ کا باعث، دل کا ٹکڑا! چاند ـــــ

شوہر کے انتقال کے بعد اس نے اپنے شوہر کی اس تصویر ـــ میں رنگ بھرنا شروع کیا تھا ـــــ

پہلے جمو اور وہ مل کر کام کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ اسے تکلیف کا احساس نہ تھا، لیکن اب تو اس کی حالت مشین کی سی ہوگئی تھی۔ اس کا پروگرام بالکل مقررہ تھا۔ اس کا سارا وقت جنگل میں لکڑی کاٹنے میں صرف ہوتا تھا!

شام کے وقت مولی بیچ کر گھر آنے پر اپنے لعل کو دیکھنے سے اس کا دل باغ باغ ہو جاتا تھا ـــــ

لیکن پرسوں سے اس پر ایک نئی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔

اس کا چاند بیمار تھا ـــــ

روزانہ کی طرح اس دن بھی وہ گھر آئی ـــــ لیکن صحن میں چاند دکھائی نہ دیا ـــــ اس نے کچھ گھبرا کر آواز دی ـــــ "چاند! ارے چندوا!" جھونپڑی سے کمزور آواز سنائی دی۔ وہ دوڑتی ہوئی جھونپڑی میں گئی ـــــ

اس کا چاند بخار میں پھنک رہا تھا۔ اس کے چاند کا چہرہ سرما کے چاند کی طرح زرد اور چمپا کی طرح اداس تھا ـــــ!

اس کا کلیجہ چرمرا گیا ـــــ

کام میں دل نہ لگتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ چاند کی دوا ـــــ دوا کے لئے پیسوں کی ضرورت تھی اس لئے اس نے معمول سے زیادہ بڑا گٹھا باندھا تھا۔

شام سے پہلے اپنے گھر لوٹنا نہایت ضروری تھا۔

اسے توقع تھی کہ اس کا جگر گوشہ اس کی راہ میں آنکھیں لگائے بیٹھا ہوگا۔ جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی وہ گاؤں کے راستہ پر آگئی۔ سر پر مولی کا بوجھ تو تھا ہی!

پانچ بجے کے انداز میں وہ گاؤں میں آئی۔

جتنا جلد ہو سکے مولی بیچ کر اسے اپنے گھر جانا تھا ـــــ

لیکن، دوسروں کو اس کے دل کا حال کیا معلوم؟

مولی معمول سے ڈیڑھ گنی زیادہ ہونے پر بھی ہر شخص اسے روزانہ کی قیمت دینا چاہتا تھا۔

اور اسے تو چاند کی دوا کے لئے زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی۔

بازار میں بالکل اس کے سامنے ہی ایک نجومی بیٹھا تھا۔
پانچ آنے میں پوری ــــ قسمت کا حال وہ کہہ رہا تھا۔
صرف پانچ آنے ــــ پانچ آنے میں اپنی قسمت معلوم کرو۔
اس کے آس پاس لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے!
ــ اور بہت سے خوش قسمت اپنی قسمت کی جانچ کروا رہے تھے!
تھوڑے سے وقت میں، اوٹ پٹانگ باتوں سے نجومی پانچ آنے کما لیتا تھا ــــ لیکن دن بھر خون پسینہ ایک کر کے جنگل جنگل چھان مار کر کاٹی ہوئی لکڑیوں کے ایک بھاری گٹھے کے عوض اسے کوئی آٹھ آنے سے ایک پیسہ بھی زیادہ دینے تیار نہ تھا!
اس نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا۔
نجومی فرفر تقدیر کے نوشتے بیان کر رہا تھا۔
اسے محسوس ہوا کہ وہ بھی اپنے بچے کی قسمت کا نوشتہ معلوم کرالے ــــ
لیکن پیسہ!
وہ پھر مولی کی طرف دیکھنے لگی۔
لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ اور بڑی دیر کے بعد اس کی مولی دس آنے میں بک گئی۔
کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بھی اس بھیڑ میں گھس گئی۔ پانچ آنے نجومی کے سامنے رکھتے ہوئے سوال کیا۔
تھوڑی دیر سر کھجانے کے بعد وہ بولا "بیماری بہت سخت ہے"۔
اس کا کلیجہ دہل گیا۔

لیکن نجومی کے سامنے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے وہ پھر بولی۔
"حکیم صاحب کے علاج سے کوئی فائدہ ہوگا یا نہیں؟"۔
نجومی نے کہا۔ ارے ہٹا حکیم کو، میرا تعویذ کافی ہے۔
اس نے یہ سب بڑے ہی غور سے سنا!۔
اس نے سوچا۔ بچے کے لئے تعویذ لے لوں گی، پانچ آنے تو موجود ہیں! خیر میں بھوکی رہوں گی!ــــ
"پھر کیا چاہیئے"؟ بڈھے نجومی نے لاپروائی سے پوچھا۔
اس نے باقی پیسے بھی بڈھے کو دیدیئے۔ بڈھے نے صندوق سے ایک تعویذ نکال کر اسے دیا اور کہا "سیدھے بازو باندھ دو!" وہ تعویذ لے کر فوراً گھر گئی ــــ
جھونپڑی کے اندر داخل ہوئی ــــ کراہ سنائی دیتی تھی ــــ فوراً اس نے چاند کو چھاتی سے لگا لیا۔ وہ بے حد ملول تھا، اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا!
اس کے دل کو ٹٹول کر اس نے ایک دفعہ "ماں" کہہ کر آواز دی۔
اور دوسرے لمحہ تعویذ اس کے بازو پر باندھے جانے سے پہلے ہی اس پر موت کی دیوی نے اپنا آنچل ڈال دیا ــــ
وہ دھڑ سے نیچے بیٹھ گئی!
اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے!!
اس کی روح کی لطیف کلیاں مرجھا گئیں ــــ!!!
باہر رات کی دیوی کی عملداری تھی، ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور اس کے دل کی دنیا میں بھی مسرتوں اور تمناؤں کے چراغ گُل ہو جانے سے باہر کے اندھیارے کی طرح بھیانک تاریکی پھیل گئی تھی ــــ

عبدالقادر فاروقی

گل بوٹے

ایک بزرگوار نے اپنے صاحبزادے کو انٹرنس پاس کرتے ہی بیرسٹری کی ڈگری لانے یورپ بھیجا، دس بارہ سال کے بعد صاحبزادے "بیرسٹر" ہوکر وطن لوٹے، بمبئی سے پدر بزرگوار کو گھر پہنچنے کے دن اور وقت کی ذریعہ تار اطلاع دی، بڑے میاں خوش خوش بیٹے کو لینے اپنے عزیز اور احباب کے ساتھ اسٹیشن پہنچے، ٹرین آئی مگر بیرسٹر صاحب کا پتہ نہیں! ایک ایک کرکے سارے ڈبوں کی تلاشی لی مگر صاحبزادے نہ ملنا تھا نہ ملے!! ابا جان کے دوستوں اور عزیزوں کی یہ "برات" بغیر "نوشہ میاں" کو لئے بیرنگ واپس ہوئی۔ بڑے میاں ہر روز بیٹے کی تلاش میں اسٹیشن جاتے، ریل کے ڈبوں میں جھانکتے، عینک کے اندر سے ہر مسافر کو غور سے دیکھتے اور بیٹے کے دیدار کو ترس ترس کر واپس ہوتے۔

اس طرح کوئی دو ہفتے گزر گئے، ایک دن آپ کے ایک دوست نے بیرسٹر صاحب کو منہ میں چرٹ دبائے، کتاب بغل میں لئے میم صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی "پارک" میں چہل قدمی کرتے دیکھا اور آپ سے ذکر کیا، بڑے میاں ابھی یہ گتھی سلجھا ہی رہے تھے کہ ایک اور صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے یہ خبر لائی کہ آپ کے صاحبزادے کو وطن پہنچ کر کوئی دو ہفتے ہوتے ہیں اور وہ کسی ہوٹل میں مقیم ہیں ان کو یہ شکایت ہے کہ تار بھیجنے کے باوجود نہ آپ اسٹیشن آئے نہ بیرسٹر صاحب کو لینے کسی کو بھیجا۔

واقعہ یہ ہوا کہ بیرسٹر صاحب نے اپنے آنے کی جو تاریخ تار میں بتائی تھی اسی دن وہ تشریف لائے ٹرین سے نکل کر ادھر ادھر دیکھا کوئی آپ کے استقبال کو آتا نظر نہ آیا، ٹیکسی لی اور ایک ہوٹل میں اتر پڑے۔ اب جو بڑے میاں نے یہ خبر سنی تو بے چارے اگلے وقتوں کے بھولے بھالے آدمی پریشان ہوئے کہ آخر یہ کونسی خفگی کی بات تھی کہ پندرہ دن ہوگئے ماں باپ کی صورت تک دیکھنا پسند نہیں کیا! اولاد کی محبت بری ہوتی ہے، فوراً ہوٹل پہنچے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آپ کے صاحبزادے کے نام کے ایک صاحب سامنے کے کمرے میں کئی دن سے ٹھیرے ہوئے ہیں، کمرے کے اندر جانا چاہا تو خانساماں نے کارڈ مانگا۔ یہ پرانی وضع کے آدمی کارڈ کیا جانیں، پریشان ہوکر پوچھا

"بھائی تم کیا مانگتے ہو"؟

خانساماں سمجھ گیا کہ بڑے میاں آج کل کی تہذیب سے بالکل کورے ہیں! وہ خود ہی ایک سادہ کارڈ اٹھا لایا اور اس پر نام لکھنے کو کہا اور بولا "یہ کارڈ ہم صاحب کو دیں گے اگر وہ آپ کو بلائیں تو آپ کمرے میں جا سکتے ہیں"!

انھوں نے کہا "بھائی میں کسی صاحب بہادر سے ملنے نہیں آیا ہوں میں تو اپنے بیٹے سے ملنے آیا ہوں جو ولایت سے بیرسٹر ہوکر آیا ہے"!

خانساماں نے کہا "جی ہاں! آپ نے جو نام بتایا ہے اس نام کے ایک صاحب اس کمرے میں ٹھیرے ہوئے ہیں، خواہ وہ آپ کے بیٹے ہوں یا کوئی اور یہاں کا یہی قاعدہ ہے"!

بڑے میاں نے کانپتے ہاتھوں سے کارڈ پر اپنا نام لکھ کر خانساماں کو دیا وہ لے کر کمرے کے اندر گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آکر کہا "اس وقت صاحب تاش کھیل رہے ہیں آپ کچھ دیر انتظار کریں"!

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد گھنٹی بجی اور آپ کی طلبی ہوئی۔

پدر بزرگوار کو دیکھ کر صاحبزادے نے بیٹھے بیٹھے "گڈ مارننگ" کہہ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ بڑے میاں مصافحہ کرکے بیٹھ تو گئے مگر لگے صاحبزادے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کہ وہ ان کا پیارا بیٹا ہی ہے یا کوئی "صاحب بہادر" ہیں۔

اس پریشانی میں سامنے تپائی پر جو نظر پڑی تو ایک شیشہ ارغوانی رنگ کے شربت سے آدھا بھرا رکھا دیکھا، شیشہ کے آس پاس کانچ کے دو چار خوبصورت جام دھرے تھے، ایک تپائی پر تاش کے پتے بکھرے پڑے تھے اور وہیں کچھ ریزگاری بھی موجود تھی۔ بڑے میاں ان چیزوں کو غور سے دیکھ رہے تھے اور بیرسٹر صاحب "تین پتیوں" کے کھیل میں مشغول تھے۔ بڑے میاں نے آخر تنگ آکر کہا "بیٹا گھر کیوں نہیں آئے! یہاں ٹھیرنے کی کیا ضرورت تھی"؟

بیرسٹر صاحب کے ایک دوست نے بڑے میاں کی طرف غور سے دیکھ کر پوچھا "آپ کی تعریف"؟

برخوردار صاحبزادے نے انگریزی میں جواب دیا "یہ ہمارے قدیم پڑوسی اور والد کے دوست ہیں"!

اتنے میں بڑے میاں نے ان ہی صاحب سے کہا "دیکھئے جناب میرا لڑکا تعلیم کے لئے ولایت گیا تھا خدا جانے کیا ہو گیا کہ ہم سب کو بھول بھال کر یہاں ہوٹل میں آبیٹھا ہے ماں ادھر انتظار میں مری جارہی ہے خدا کے لئے آپ اسے کچھ سمجھائیے"۔

یہ سن کر انھوں نے بیرسٹر صاحب کو خوب لتاڑا آخر خدا خدا کرکے ماں سے ملنے آپ گھر آئے۔

ماں بیچاری ماتا کی ماری بیٹے کے دیدار کو ترس رہی تھی، جب آپ اندر آئے ماں کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے اندھی ہو رہی تھیں اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر بلائیں لینی چاہیں، بڑی بی کے دونوں ہاتھ اپنے منہ کی طرف آتے دیکھ کر بیرسٹر صاحب گھبرائے کہ بڑھیا منہ نوچنا چاہتی ہے جھٹ اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر روکنا چاہا۔ جب ماں بیٹے کے ہاتھ چار ہوئے تو بڑی بی کا توازن قایم نہ رہ سکا اور وہ بیچاری چاروں خانے چت ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اس کو اٹھا کر پلنگ پر لٹایا گیا تو بیرسٹر صاحب قریب آئے اور پوچھا "ول اماں!! تم کیا ہے"؟

ماں مزاج پرسی کے "یہ مہذب بول" سن کر بہت پریشان ہوئی آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو ایک صاحب بہادر کھڑے ہیں سر پر تنکوں کی ٹوکری الٹی رکھی ہوئی ہے، ایک بے ڈھنگا شلوکہ زیب بدن ہے جس میں نیچے اوپر کئی تھیلیاں لگی ہیں، منہ میں موٹی سی اگربتی سلگ رہی ہے، چھلے دار دھواں نکل رہا ہے مگر اگر کی سی خوشبو نہیں، ایک سرخ دھجی نیچی اونچی گرہ دی ہوئی بل کھاتی ہوئی گلے میں لپٹی ہے۔ جلدی سے بڑی بی نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور کہا۔

"ارے یہ موا کہاں سے گھس آیا، اے صاحب کیا میں ایسی بیمار ہو گئی تھی کہ بڑے ڈاکٹر کو بلوایا اور مجھ کو بے پردہ کر دیا میرا بچہ کہاں ہے"! بڑے میاں نے کہا "یہی تو تمہارا لڑکا ہے ولایت جاکر بڑا صاحب بن گیا ہے"!! ماں کی محبت کو جوش ہوا بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔ ماں پوچھتی کچھ ہے اور بیرسٹر صاحب جواب کچھ دیتے ہیں، چند ہی سال میں اپنی زبان بھول گئے!! آپکے رگ و ریشہ میں مغربیت کچھ ایسی بس گئی کہ اپنے وطن کی ہر چیز سے نفرت ہو گئی۔ خوراک، لباس، مکان غرضکہ ہر چیز میں مغربیت رچ گئی تو تیج جاگتے، اٹھتے بیٹھتے مغرب کا کلمہ پڑھنے لگے۔ دماغ میں کچھ ایسی فرعونیت سما گئی کہ ہندوستانیوں سے سیدھے منہ بات کرنا کسر شان سمجھنے لگے۔ آپ کچھ ایسے "صاحب بہادر" بن گئے کہ پانی کی جگہ کبھی "شربت ارغوانی" اور کبھی کا خنڈ (ٹمبلیٹ) میں استعمال بخوبی کا باوجود اس حد تک "یوروپین" ہونے کے سخت تعجب اور افسوس ہے کہ اہل ہندوستانیوں نے آپکی کچھ قدر نہیں کی کیونکہ آپکی آمدنی صرف اسقدر ہوتی ہے کہ آپکے "آفس" کا کرایہ نکل جاتا ہے، دوسرے اخراجات وہی آپکے "قدیم پڑوسی" کے شرمندۂ منت ہیں۔

"باغبان"

چلی گئی

دم بھر کو وہ جو آنکھ ملاتی چلی گئی
بیتاب اور مجھ کو بناتی چلی گئی

میں ہر ادا پہ ہوش لٹاتا چلا گیا
وہ ہر قدم پہ گیت سناتی چلی گئی

دیکھا مجھے تو نیچی نگاہیں کئے ہوئے
یعنی بقدر ظرف پلاتی چلی گئی

میں سلسلہ سکوں کا جماتا چلا گیا
وہ کیف بن کے زیست پہ چھاتی چلی گئی

زلفوں کے بادلوں کو ہوا میں بکھیرتی
ہونٹوں سے جیسے برق گراتی چلی گئی

میں اس کو چھیڑ چھیڑ کے گاتا چلا گیا
وہ میرے سازِ دل کو بجاتی چلی گئی

آنچل کی دھاریوں کو نمایاں کئے ہوئے
طوفان رنگ و بو کا اٹھاتی چلی گئی

کھلتے گئے رموز شباب و حیات کے
یعنی وہ ہر حجاب اٹھاتی چلی گئی

میں ہوش کھو کے ہوش میں آتا چلا گیا
وہ رقص کرتی، جھومتی، گاتی چلی گئی

علی احمد

حدیث امروز

پھر اس کی یاد قلب کو تڑپا رہی ہے آج
پھر کائناتِ صبر لٹی جا رہی ہے آج

پھر ہو رہا ہے درہم و برہم نظام ہوش
پھر بے خودی سی دل پہ مرے چھا رہی ہے آج

پھر ہو رہا ہوں بزم جنوں میں میں باریاب!!
پھر عقل میرے سامنے تھرا رہی ہے آج

پھر ہو رہی ہے قلب میں تجدید آرزو
ہر آرزو دراز ہوئی جا رہی ہے آج

وحشت نے پھر جلائے ہیں دل میں نئے چراغ
"لو" شمع اختیار کی تھرا رہی ہے آج

پھر نغمہ ہائے شوق چھڑے بزم عشق میں
ہر سانس دل کے ساز سے ٹکرا رہی ہے آج

مضطر دھڑک رہا ہے پھر اس طرح میرا دل
پہلو سے گویا اس کی صدا آ رہی ہے آج

سید خورشید حسین مضطر رضوی

سلطان محمد قلی قطب شاہ

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج یک تل جیا جائے نا
کہے تھے پیا بن صبوری کروں
کہا جائے اما کیا جائے نا
قطب شہ نہ دو مجھ دوانے کو پند
دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

یہ اشعار ایک ایسی شخصیت کے ہیں جس کا نام ہندستان کے بادشاہوں، عاشقوں اور شاعروں میں بہت عرصے تک زندہ رہے گا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ اور دکن کے موجودہ دارالسلطنت حیدرآباد کا بانی تھا اور قطب شاہیہ خاندان کا پانچواں حکمران تھا۔ اس کی ہمہ گیر طبیعت کا اندازہ صرف اسی بات سے ہوسکتا ہے کہ اس نے صرف اُردو میں تقریباً پچاس ہزار اشعار کہے اور ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی بلکہ اُردو کے علاوہ فارسی اور تلنگی میں بھی شاعری کی۔ شعر و ادب میں عاشقانہ مضامین اس کی نمایاں خصوصیات ہیں اور اس کا خاص میدان، اور اس کی وجہ زیادہ تر اس کی ذاتی زندگی ہے۔ اس کے حالات کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانہ اقتدار و حکومت میں حیدرآباد برندابن اور رود موسیٰ، جمنا کا کنارہ بن گیا تھا جس میں اس کی حرمیں گوپیاں اور اس کی مشہور رقاصہ بھاگ متی عرف حیدر محل، رادھا کا عکس نظر آتی تھی۔ لیکن قدیم ہند کی اس مشہور روایت اور محمد قلی کی حکایت میں ایک ہی فرق تھا۔ برندابن کے شام کی بنسی پر تو رادھا اور گوپیاں موہت ہوا کرتی تھیں۔ لیکن یہاں یہ رسیا راجہ پریم کی بنسی کا متوالا تھا۔ اور عشق و عاشقی کے سلسلے میں بھی اس کی طبیعت کی ہمہ گیری اس کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے مطابقت رکھتی تھی۔ موجودہ تالیف بھی جس میں دکن کے اس جوہر خداداد کے سوانح حیات اور اُردو اور فارسی کے نمونے شامل ہیں اس ہمہ گیر زندگی کا صحیح عکس ہے۔ قابل مرتب کا ذوق و جستجوئے علمی اس ایک بات سے ظاہر ہے کہ اس نے ہر اس کتاب کو دیکھا ہے جس میں سلطان مذکور کا ذرا سا بھی تذکرہ موجود تھا۔ اور ان تاریخ اور تذکرے کی بے شمار کتابوں کے علاوہ خود محمد قلی کا کلام بھی ایک خزانہ تھا جس سے اس کے ذاتی حالات پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔

ترتیب کے لحاظ سے مرتب نے تمام کتاب کے دس حصے کئے ہیں۔ پہلے حصے میں خاندانی حالات، اجداد کا تذکرہ، جشن ولادت، جشن آغاز شباب اور اوائل شباب کی صحبتوں کا بیان ہے۔ جس کے بعد تخت نشینی کا ذکر کرکے محمد قلی قطب شاہ کے طبعی رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اسی سلسلے میں اس کی بارہ پیاریوں کے علاوہ بھاگ متی یعنی اس مشہور رقاصہ کا ذکر بھی ہے، جس کے نام پر اس ذی شان حکمران نے حیدرآباد جیسے شہر کی بنیاد رکھی۔ اس حصے سے جہاں محمد قلی کی ابتدائی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ وہاں اس زمانے کے دکنی ہندستان کا بھی ایک نقشہ سا آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔

دوسرے حصے میں دو فصلیں ہیں۔ پہلی فصل محمد قلی کے مذہبی میلانات اور ان کی وجہ سے اس کی جو

مخالفتیں ہوئیں ان کا تذکرہ ہے اور دوسری فصل حیدرآباد (بھاگ نگر) کے تاریخی اور جغرافیائی حالات پر مشتمل ہے۔

تیسرے حصّے میں اس زمانے کے تہواروں میں شاہی مزاج کو کہاں تک دخل تھا اور کہاں تک شاہی سرپرستی سے ان مختلف مواقع کی رونق میں اضافہ ہوتا تھا۔ ان سب باتوں کا بیان ہے۔

چوتھا حصہ ایک طرح سے تیسرے حصّے سے ملحق ہے۔ اور اس کی مزید تفصیل۔ لیکن اس میں زیادہ تر مذہبی کی بجائے دوسری قسم کے تہواروں اور اجتماعات کا تذکرہ ہے نیز وقت کے رسوم اور بادشاہ کی دیگر مصروفیات کا ذکر بھی وضاحت سے کیا گیا ہے۔ جو لوگ پرانے بادشاہوں کے متعلق یہی تصور رکھتے ہیں کہ وہ عیش و عشرت یا جنگ و جدال ہی تک اپنی کارفرمائیوں کو محدود رکھتے تھے، ان کے لئے کتاب کے اس حصے میں غور کا مواد موجود ہے۔ اس حصے کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل ملک کی حکومت جن مختلف کارگذاریوں کی بناء پر اپنے زمانے کو پہلے زمانے سے بہتر تصور کرتی ہے، وہی باتیں قدیم زمانے میں بھی اپنے وقتی رنگ میں ہوا کرتی تھیں۔

پانچواں حصہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اب تک جس قدر حالات بیان ہوئے تھے ان کا ماخذ اکثر کلام محمد قلی قطب شاہ تھا۔ لیکن اس حصے میں ان معرکہ آرائیوں کا تذکرہ ہے جن سے محمد قلی کو اپنے دورِ حکومت میں روبرو ہونا پڑا۔ اس حصے کے مطالعے سے ہم سلطان مذکور کی ذہنی وسعت کے بھی معترف ہو جاتے ہیں کہ وہ بادشاہ جو ذاتی زندگی میں ایک عاشق اور شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہے، نظم و نسق سلطنت کے سلسلے میں بھی کس قدر مختلف صورتوں سے اسے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

چھٹا حصہ بھی حکومت ہی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس بیرونی تعلقات کے علاوہ ہند و رعایا کی سرپرستی کے عنوان سے جو باتیں تحریر میں آئی ہیں وہ پرانے زمانے کی مفاہمت پسندی اور انصاف پروری کے ناقابل تردید دلائل ہیں۔ یہ وسیع القلب بادشاہ نہ صرف اپنی رعایا کے ہر فرقہ کو ایک ہی نظر سے دیکھتا تھا۔ بلکہ دوسرے ممالک سے آئے ہوئے اجنبی لوگوں کی آسایش اور آرام کا خیال بھی اپنا فرض گردانتا تھا۔

ساتویں حصے میں محمد قلی کی بیگمات اور اولاد کا تذکرہ ہے اور اسی سلسلے میں اس کی دوسری رشتہ داریوں کا بیان بھی آگیا ہے۔ اور آخر میں اس کی علالت اور وفات کا ذکر ہے۔

آٹھویں حصے میں اس کے اردو کلام کے مختلف موجودہ نسخوں کا جائزہ لینے کے بعد اس کے کلام کی خصوصیات کا ذکر ہے اور پھر انتخاب کلام اردو اور اسی طرح نویں حصے میں فارسی شاعری کا تذکرہ اور منتخب کلام۔

دسویں حصّے میں محمد قلی قطب شاہ کے زمانے کی اہم تاریخیں۔ ماخذ اور حوالے اور اشاریہ، کتاب کی ترتیب کے سلیقے کو ظاہر کر رہا ہے۔ اور قاری کی آسانی اور حوالے کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ اس کتاب کی دلچسپی میں انیس ۱۹ عکسی تصاویر ایک دلکش اضافہ ہیں۔ قابل مرتب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مبارک و تحسین کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایسی جامع

کتاب تالیف کر کے بہت عرصے تک محمد قلی کی زندگی کے محققوں کو بے کار ثابت کر دیا ہے۔ نیز کلیات محمد قلی کے لئے بھی ایک مناسب اور بیش قیمت ابتدائی مطالعہ ہمارے لئے مہیا کیا ہے۔ جس سے کلام محمد قلی کے سمجھنے اور اسے سراہنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

امید ہے کہ ادب و شعر اور تاریخ کے شائقین اس کتاب کی پوری قدر کریں گے کیونکہ یہ ایک ایسی خیال افروز چیز ہے کہ اسے جب کبھی بھی اٹھا کر دیکھا جائے اس میں ضرور کوئی نہ کوئی نئی دلچسپی دکھائی دے جائے گی۔

میراجی (ادبی دنیا)

نئی کتابیں

۱۔ شمس المعارف (شاہ سلیمان مرحوم کے مکتوبات کا چوتھا حصہ) مرتبہ منظور الحق حکیم ۲۴۲ صفحات از مرتب گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ جہان پور

۲۔ تفہیمات۔ حصۂ اول (مجموعہ مضامین) از سید ابوالاعلیٰ مودودی ۳۵۰ صفحات قیمت عہ۔ دفتر رسالہ ترجمان القرآن۔ لاہور

۳۔ روسی ادب حصہ اول و دوم۔ از پروفیسر محمد مجیب ۴۷۰ صفحات قیمت للعہ۔ انجمن ترقی اردو۔ دہلی

۴۔ فہم قرآن (قرآن مجید کے آسان ہونے کی حقیقت) مرتبہ سعید احمد۔ ۱۹۴ صفحات۔ قیمت عہ۔ ندوۃ المصنفین دہلی

۵۔ بت تراش (ڈراما) از ڈاکٹر اشتیاق حسین۔ ۴۲ صفحات قیمت ۴ر۔ مکتبۂ جامعہ۔ دہلی

۶۔ سائنس کی روشنی میں ہندوستانی جڑی بوٹیاں از صوفی لچھمن پرشاد۔ ۲۵۰ صفحات۔ قیمت (ستے) مینیجر رسالہ مستانہ جوگی۔ شاہی محلہ۔ لاہور

۷۔ رہنمائے عقاقیر (رسالہ الحکم کا خاص نمبر) جڑی بوٹیوں کے اوصاف و خواص) از حکیم غلام محی الدین چغتائی۔ صفحات ۵۸۴۔ قیمت (صہ) مینیجر رسالہ الحکم موچی دروازہ۔ لاہور

۸۔ شمیم کے تلو شعر۔ از مظفر حسن شمیم ۴۰ صفحات۔ قیمت ۴ر عثمانیہ بک ڈپو۔ محمد علی بلڈنگ۔ بمبئی۔

۹۔ الہامات سلیمانی (مجموعۂ کلام سید شاہ سلیمان مرحوم) مرتبہ منظور الحق حکیم ۱۵۰ صفحات از مرتب۔ گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ جہاں پور

۱۰۔ ادبی تاثرات۔ از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ ۱۴۴ صفحات قیمت (عہ) سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد

۱۱۔ نقش ناتمام (مجموعۂ کلام) از سحر رام پوری ۷۰ صفحات۔ قیمت (۱۲) مرزا عباس علی بیگ۔ باغیچہ مظفر خاں۔ رام پور۔

۱۲۔ تبویب حیدری (جدید اصولوں پر کتابوں کی ترتیب) از فضل اللہ احمد بی اے۔ ۴۰ صفحات۔ قیمت ۸ر حیدری گشتی کتب خانہ۔ حیدر آباد

۱۳۔ اسلامی ممالک کی سیاست۔ از عشرت حسین صدیقی۔ قیمت عہ مکتبۂ جامعہ دہلی۔

۱۴۔ پیام شوق۔ از پنڈت جگ موہن ناتھ ۱۸۴ صفحات۔ قیمت ۱ہ نظامی پریس۔ بدایون

۱۵۔ بادۂ سر جوش (مجموعۂ کلام) از پنڈت لبھو رام جوش۔ ۱۴۰ صفحات قیمت ۱ہ۔ مرکز تصنیف و تالیف نکدور۔ جالندھر

۱۶۔ اسلامی نظام تعلیم (فن تعلیم کے متعلق علماء کے نظریے) از سید ریاست علی ندوی ۱۵۶ صفحات دار المصنفین اعظم گڑھ

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

تعلیمیاتی نفسیات
از ملک سردار علی صاحب بی اے۔ بی ٹی ریڈر جامعہ عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدرآباد

اردو زبان میں تعلیم و تدریس کے اصولوں سے متعلق کتابوں کی بے حد کمی ہے اور ضرورت ہے کہ اس فن کے ماہرین دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادب سے مستفید ہو کر اردو میں اس قسم کی کتابیں پیش کریں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ عثمانیہ ٹریننگ کالج کے پرنسپل مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے نے اس کمی کو دور کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ چنانچہ ان کی تحریک سے اس کالج کے اساتذہ میں ایک طرح کی سرگرمی پیدا ہو گئی ہے۔ زیر نظر کتاب بھی انہی کی تحریک اور مشوروں سے عالم وجود میں آئی ہے۔ اس میں پچیس باب ہیں اور ہر باب میں تعلیم و تدریس کے کسی نفسیاتی پہلو پر بحث کی گئی ہے۔ پڑھانے والے کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئیے کہ پڑھنے والوں کی نفسی خصوصیتیں کیا ہیں اور جب تک کوئی استاد اپنے طلبہ کی نفسیات سے واقف نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی تعلیم جیسا چاہئے فائدہ نہیں پہونچا سکتی۔ یہ کتاب چھ سو سے زیادہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کی ترتیب و تالیف میں مصنف نے اس فن کے ماہرین اور اساتذہ کی اکثر و بیشتر تصنیفوں سے استفادہ کیا ہے، ہر باب کے خاتمہ پر حوالے درج کر دئے گئے ہیں۔ اور جگہ جگہ ذاتی تجربوں سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ زبان اور اسلوب بھی ایسا سلیس اور سادہ استعمال کیا گیا ہے کہ اکثر مدرسین اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات نے قلمبند کیا ہے اور انھوں نے اپنے اس دیباچہ میں بالکل سچ لکھا ہے کہ:۔

> معلمی کا پیشہ دوسرے پیشوں سے اشرف و اعلیٰ ہے کیونکہ معلم کا کام ملک کی نو خیز نسل کی تعلیم و تربیت ہے۔ یہ گویا ان کو ایک عمدہ قالب میں ڈھالتا ہے۔

جن اصحاب کو فن تعلیم سے کوئی تعلق ہے انھیں چاہیئے کہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ اس کتاب میں تصویروں اور نقشوں کی کمی نظر آتی ہے اگر اس کا خیال رکھا جاتا تو پڑھنے والوں کے لئے اور بھی دلچسپی پیدا ہو سکتی تھی۔

سوگ وار شباب
از مجنوں گورکھپوری ایوان اشاعت گورکھپور۔

مجنوں گورکھپوری اُردو کے مشہور افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ اس سے پہلے ان کے افسانوں کے تین مجموعے شایع ہو چکے ہیں انھوں نے گزشتہ آٹھ دس سال سے افسانہ نگاری کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی ہے لیکن اس سے قبل ہی انھوں نے جو کچھ لکھا اس کی وجہ سے وہ اردو کے اچھے افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہو چکے ہیں ان کے اکثر و بیشتر افسانے مغربی قصوں اور ناولوں سے ماخوذ ہیں اور زیر نظر افسانہ بھی مشہور انگریزی ناول نگار ٹامس ہارڈی کے ایک ناول "ٹو اِن اے ٹاور" سے ماخوذ ہے۔ مجنوں صاحب ہارڈی کے خاص معتقد ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے دو ناول "ٹس آف ڈربرویل" اور "جیوڈ دی ابسکیور" انگریزی کے مشہور اور مقبول ناولوں میں سے ہیں۔

زیر نظر افسانے میں اگرچہ پلاٹ ہارڈی سے لیا گیا ہے،

لیکن واقعات مقامات اور ماحول سب مجنوں صاحب نے اپنے گردوپیش کی دنیا سے لیئے ہیں۔ کتاب کی لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے۔ جو اصحاب اردو میں انگریزی طرز کی کتابیں اور ترقی یافتہ ادب کے نمونے دیکھنا چاہتے ہوں وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ قیمت مجلد عا۱ غیر مجلد عہ۱

یاد اقبال حصہ اوّل۔ یہ کتاب اقبال اکیڈیمی تاج پورہ لاہور کے سلسلہ مطبوعات کی پہلی کڑی ہے۔ اس میں ہندستان کے مقتدر شعراء کی ان چالیس عقیدت مندانہ نظموں کو ایک جا کر دیا گیا ہے جو علامہ سر اقبال کی وفات پر لکھی گئی تھیں۔ حسرت موہانی اور حفیظ جالندھری کی نظمیں خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ تعجب ہے کہ اس مجموعہ میں وہ نظمیں موجود نہیں ہیں جو علامہ اقبال کی وفات پر حیدرآباد میں مختلف جلسوں میں سنائی گئیں اور جن میں سے علی اختر، ماہر القادری، وجد میکش اور نظر کی نظمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر بعد کو مختلف رسائل میں شایع بھی ہو چکی ہیں۔ توقع ہے کہ اگر اقبال اکیڈیمی کی طرف سے یاد اقبال کا دوسرا حصہ شایع ہو تو ان نظموں کو ضرور شریک کیا جائے گا۔ قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ

تعلیمات اقبال از پروفیسر یوسف خاں سلیم چشتی بی اے (آنرز) یہ کتاب سلسلہ مطبوعات اقبال اکیڈیمی کی تیسری کڑی ہے۔ اس میں علامہ اقبال کی تعلیمات کا نچوڑ اور ان کی اسلامی خدمات کا مرقع پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن کتاب کا زیادہ حصہ اقبال کے کلام کے نمونوں سے معمور ہے۔ یہ کتاب بھی دیدہ زیب ہے اور تصنیفات اقبال کی وضع قطع رکھتی ہے۔ قیمت عہ

پیام حق مرتبہ سید محمد شاہ ایم اے و غلام سرور فگار اقبال اکیڈیمی کی طرف سے ایک ماہ نامہ شایع ہوا کرتا ہے جس کا ایک شمارہ بابت مارچ ۱۹۴۱ء اس وقت پیش نظر ہے۔ اس میں ماہر القادری اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے مضامین اقبال کے "شاعرانہ تصورات" اور "موت اور حیات اقبال کے کلام میں" بہت اچھے مضمون ہیں۔ رسالہ کا غذ اور کتابت و طباعت کے لحاظ سے نہایت دیدہ زیب اور مقاصد کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔ قیمت سالانہ عا۱ فی پرچہ ۴؍

دیر و حرم چودھری منظور احمد منظور بی اے۔ ایل ایل بی کی نظموں کا مجموعہ ہے جس کا دیباچہ پنڈت کیفی نے لکھا ہے۔ منظور پنجاب کے ایک نوجوان شاعر ہیں جن کی یہ کوشش مستحسن ہے کہ وہ اپنے جذبات اور تخیلات کو سادہ اور سلیس اردو کا جامہ پہناتے ہیں۔ لیکن اس کوشش میں وہ بعض دفعہ اتنی دور نکل گئے ہیں کہ ان کی نظمیں اردو سے زیادہ ہندی کہلانے کی مستحق ہو گئی ہیں۔ ہر کام اور ہر بات میں اعتدال کی ضرورت ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جس کی نوجوانوں میں کمی نظر آتی ہے۔ قیمت مجلد عا۱ غیر مجلد عہ

آفتاب رسالت یعنی آنحضرت سرور کائنات کی منظوم سیرت جس کے مصنف راؤ بہادر حاجی محمد عبد الحمید خاں صاحب منظر باغپتی ہیں حضور سرور کائنات کی زندگی کے حالات اردو نثر میں تو کئی اصحاب نے لکھے ہیں لیکن نظم میں سوائے حفیظ جالندھری کے کسی اور نے کما حقہ توجہ نہیں کی۔ اور پھر حفیظ نے بھی

صرف غزوات کا حصہ نظم کیا ہے۔ اس کے برخلاف منظر صاحب نے ولادت سے وفات تک جملہ حالات کو سلیس اور سادہ نظم کے پیرایہ میں بیان کیا ہے اور خوبی یہ ہے کہ پوری کتاب میں نظم اور شاعری کی شان باقی ہے۔ قیمت ۸/

رہنمائے تاریخ اردو

مولفہ حاجی محمد عبد القادر۔ اس کتاب کے عنوان سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شاید یہ کتاب اردو زبان کی تاریخ سے بحث کرتی ہے۔ لیکن دراصل اس کا مقصد یہ ہے کہ اُردو شعرا نے جو قطعات تاریخی لکھے یا مصرعوں میں تاریخیں نکالیں ان کا ایک مختصر سا تذکرہ پیش کر دیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بھی بجائے خود ایک دلچسپ موضوع ہے مصنف نے تاریخ نکالنے کے متفرق طریقوں اور اصولوں پر بڑے سلیقہ اور محنت سے روشنی ڈالی ہے۔ اور ساتھ ہی اردو کے اکثر شاعروں کی نکالی ہوئی تاریخیں اور خود شاعروں کے مختصر سے حالات بھی درج کر دئے گئے ہیں۔ تاریخ گوئی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا قیمت ۱۲/

تحفۂ ربیع الاول

مولفہ ابو ظفر محمد بدر الدین خاں بی اے اس کتاب میں حضور سرور کائنات کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب گیارہ حصوں میں منقسم ہے۔ اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ لیکن کتابت و طباعت موضوع کے شایان شان نہیں ہے۔ قیمت (عہ)

غم احباب شاد

راجہ نرسنگھ راج بہادر عالی دکن کے ایک مشہور کایستھ خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور تہذیب و شائستگی کا نمونہ ہونے کے علاوہ اُردو، فارسی شعر کے بڑے دلدادہ ہیں۔ زیر نظر کتاب انہی کی ان رباعیوں قطعوں اور مرثیہ کا مجموعہ ہے جو مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کی وفات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں۔ عالی کو شاد سے خاص عقیدت اور محبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مرثیہ دل سے نکلا ہے اور دلوں تک پہنچتا ہے۔

بلّی حج کو چلی

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی کی طرف سے بچوں کے مطالعہ کے لئے جو چھوٹی چھوٹی کتابیں چھاپی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ کتاب ہے جس میں حکیم اللہ صدیقی بی اے نے بلی کے حج کو جانے کا مشہور پرانا قصہ دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ قیمت ۲/

فسانۂ عجائب

یہ کتاب بھی حالی پبلشنگ ہاؤس کی طرف سے چھپی ہے۔ یہ اصل میں رجب علی بیگ سرور کی مشہور کتاب کا خلاصہ ہے جس کو بشیر احمد انصاری صاحب بی اے نے قلمبند کیا ہے اب یہ کتاب بچوں اور طلبہ کے مطالعہ کے قابل ہوگئی ہے۔ قیمت ۳/

حبشہ کا تفصیلی نقشہ

حبش کی سلطنت دنیا کی ان قدیم بادشاہتوں میں سے ہے جن میں سے اکثر قانون فطرت کے مطابق آج نیست و نابود ہو گئی ہیں۔ اور یہ سلطنت بھی چند سال قبل اطالیہ کے ہاتھوں ختم ہو چکی تھی۔ لیکن چند روز سے برطانیہ کی مدد سے اس کو پھر آزادی ملنے کی توقع پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ اس طرح یہ نقشہ وقت کی ایک ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اس کے دیکھنے سے حبشہ کے اکثر چھوٹے چھوٹے گاؤں اور پہاڑیاں اور دوسری خصوصیتیں صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اتنا تفصیلی نقشہ اب تک شایع نہیں ہوا ہوگا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ بھی جو عبد القادر صاحب کا مرتبہ اور خالد کمپنی دہلی کا مطبوعہ ہے۔ انگریزی ہی میں چھاپا گیا ہے۔ قیمت ۱۲/

روسی ادب حصہ اول و دوم ۔ یہ ضخیم کتاب پروفیسر محمد مجیب بی اے استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی تالیف ہے ۔ جس کے بعض حصے آج سے دس سال قبل رسالہ اردو میں شایع ہوئے تھے ۔ اس میں انقلاب سے قبل کے روسی ادب کی تاریخ پختہ کارانہ انداز میں بیان کی گئی ہے ۔ پہلا حصہ روسی شاعری اور روسی ڈرامے پر مشتمل ہے اور دوسرے میں روسی ناول پر وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے ۔

بہتر ہوتا کہ مجیب صاحب اس کتاب کا ایک اور حصہ لکھ کر جدید روسی ادب کی تاریخ بھی اردو میں پیش کر دیتے ۔ اردو میں کچھ عرصے سے روسی ادب اور تخیلات کو شوق کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے ۔ اور جو لوگ اسی اشتیاق کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کریں گے ، انھیں بڑی مایوسی ہوگی کیونکہ وہ جس روسی ادب کے دلدادہ ہیں اس کا اس کتاب میں ذکر ہی نہیں ہے ۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجیب صاحب انقلابی خیالات اور تصورات کے مخالف ہیں بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ :-

اس کا سبب صرف میری معذوری ہے ۔ میں
اس زبان کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جو
روس میں اچانک انقلابی تحریک کے ساتھ
رائج ہو گئی اور اس زمانے کی تصانیف اصل
زبان میں حاصل کرنا خاصا دشوار بھی تھا ۔

لیکن بغیر جدید روسی ادب کے تذکرہ کے یہ کتاب تقویم پارینہ کی حیثیت رکھتی ہے ، ہمیں یقین ہے کہ مجیب صاحب وقت نکال کر اس کا تیسرا حصہ ضرور تحریر فرما دیں گے ۔ ورنہ بقول ان کے جو شخص اس کتاب کو پڑھے گا مایوس ہوگا ۔ انھوں نے لکھا ہے :-

سب سے زیادہ اندیشہ مجھے ان دوستوں سے
ہے جنھیں روس کی قدر کرنا انقلاب کی تعلیم نے
سکھایا ہے اور جنھیں صرف روسی ادب کے
اس حصے سے مطلب ہے جو انقلاب کی طرح
تازہ اور انقلاب کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے
یہ حضرت شاید اس کتاب کو ایک صریحی دھوکا
سمجھیں اس لئے کہ انقلاب کے زمانہ کے
نئے مصنفوں کا اس میں ذکر ہی نہیں ۔

بہر حال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اہل ذوق کو دعوت تو دی لیکن کھانا بے نمک کھلایا ۔ ہمیں توقع ہے کہ مجیب صاحب عہد انقلاب کے روسی ادب کی تاریخ لکھ کر اس کتاب کو مکمل کر دیں گے (دونوں حصوں پر قیمت درج نہیں صفحات حصہ اول ۳۸۱ حصہ دوم ۳۵۹)

ابو الحسن تانا شاہ یہ ان مطبوعات کی ایک کڑی ہے جو خدیجہ بیگم معلمہ ماڈل پرائمری اسکول بچوں کے لئے ڈراموں کی شکل میں شایع کر رہی ہیں ۔ اس میں گولکنڈہ کے آخری تاجدار ابو الحسن قطب شاہ کی زندگی کی جھلکیں بڑی شائستگی کے ساتھ دکھائی گئی ہیں ۔ اس کا مطالعہ بچوں اور بوڑھوں دونوں کے لئے مفید ثابت ہوگا (۵۲ صفحات قیمت ۸ /)

شاہ جہاں یہ بھی ابو الحسن تانا شاہ کی طرز کا ایک ڈراما ہے جس میں جہاں گیر ، نور جہاں ، شاہ جہاں ، ممتاز محل اور آصف خاں جیسی ہستیوں کے کردار افسانوی رنگ میں پیش کئے گئے ہیں ۔ زبان اور اسلوب بھی دلچسپ ہے ۔ تاریخی مضامین کو افسانوں کی شکل میں پیش کرنے کی وجہ سے عوام میں تاریخ کا جتنا وسیع ذوق پیدا

سکتا ہے کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں ۔ اور جب تک کسی علم کا ذوق پیدا نہ ہو اس سے متعلقہ بڑی بڑی محققانہ کتابیں بھی بے کار ثابت ہوتی ہیں۔

خدیجہ بیگم صاحبہ کی یہ کوشش قابل قدر ہے اور توقع ہے کہ وہ اس طرح تاریخی ڈرامے قلمبند کرتی رہیں گی تاکہ ملک کے نونہال ان کے ذریعہ سے بچپن ہی سے اپنی قدیم تاریخ سے واقف ہوسکیں (۲۴ صفحات قیمت ۳)

مسافر کی ڈائری یہ دیدہ زیب کتاب حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی کی طرف سے چھپی ہے اس میں خواجہ عباس صاحب کے صرف پانچ مہینوں کے اس سفر کے حالات درج ہیں جو دنیا کے گرد سترہ ملکوں میں پچیس ہزار میل کی مسافت میں کیا گیا ۔

یہ کتاب اگرچہ نہ کوئی تفصیلی سفرنامہ ہے اور نہ سیاح کی ڈائری ۔لیکن احمد عباس صاحب کو صحافت اور انشا پردازی کا بڑا اچھا سلیقہ حاصل ہے ۔ انھوں نے ایک آزاد خیال سوشلسٹ نوجوان کی نظر سے تمام دنیا کا روا روی میں مطالعہ کیا اور ہر جگہ غریب مزدور اور کسان کی ہمدردی کے جذبات ان کے ساتھ رہے ۔

آزادی کے دلدادہ اور ترقی پسند نقطۂ نظر سے دنیا کی تاریخ اور حالات کو دیکھنے والے اس کتاب کو شوق سے پڑھیں گے ۔سیاح نے دنیا کو اپنی نظر سے دیکھا ہے اور ہر شہر اور ہر ملک کو دیکھنے کے بعد اس نے جو اثر لیا ہے اسی کو انشا پردازانہ انداز میں قلمبند کرتا گیا ہے ۔اس طرح سے یہ کتاب بہت دلچسپ اور اچھی ہوگئی ہے ۔ اور مصنف بھی سفرنامہ نگاری کی بہت سی ذمہ داریوں سے بچ گیا ۔ کتاب میں بعض دلچسپ تصویریں بھی ہیں ۔

(۱۹۲ صفحات قیمت عہ)

بزم مہدویہ حیدرآباد میں مہدوتی اعتقاد رکھنے والے ہزاروں مسلمان آباد ہیں ۔ جن میں بڑے بڑے علماء و شعراء اور مشہور بزرگ بھی گذرے ہیں ۔یہ مجموعۂ مضامین اسی فرقہ کا ترجمان معلوم ہوتا ہے جس کو کاوش صاحب نے بڑی محنت اور سلیقہ سے مرتب کیا ہے ۔اس میں نواب بہادر یار جنگ بہادر کی بھی ایک نظم چھپی ہے ۔ دیگر مضامین نظم و نثر بھی اپنی اپنی جگہ مفید اور قابل مطالعہ ہیں۔ کاوش صاحب کو تصنیف و تالیف کا اچھا ذوق حاصل ہے اور وہ اس بزم مہدویہ کی اشاعت پر قابل مبارک باد ہیں ۔ (۸۰ صفحے قیمت درج نہیں)

مقدمۂ تاریخ دکن یہ کتاب پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کی ہے ۔اس میں انھوں نے سرزمین دکن کے پچیس ۲۵ حکمران خاندانوں کے آغاز، ارتقاء، عروج اور زوال کے متعلق تعارفی معلومات کے علاوہ حکمرانوں کا پورا شجرۂ نسب اور حکمرانوں کی تاریخیں بھی قلمبند کردی ہیں اس طرح مختلف خاندانوں کے سات سو افراد اس کتاب کے ذریعہ سے روشناس ہوگئے ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں ایک مبسوط اشاریہ بھی ہے ۔

کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ پہلے حصے میں قدیم دور کے دکنی حکمران خاندانوں کے شجرے اور ان کے متعلق معلومات ہیں۔ دوسرے حصے میں دور وسطیٰ کے آٹھ ہندو اور مسلمان حکمرانوں کا تذکرہ ہے ۔تیسرے میں دور حالیہ کے تین خاندانوں کا اور چوتھے میں نوابان کرناٹک، سدھوٹ اور ساونور کا تذکرہ ہے ابتدا میں ایک مقدمہ ہے جو بجائے خود دکن کی ایک مختصر سی تاریخ ہے ۔یہ کتاب پروفیسر مرزا حسین علی خاں صاحب تمنا کی تحریک پر لکھی گئی ہے متوسط تقطیع ۴۴ صفحات قیمت (عہ)

ادارہ کی خبریں

شعبۂ سائنس

شعبہ سائنس کا ایک جلسہ ۱۱ر مارچ ۱۹۴۲ء شام کے ساڑھے پانچ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔

حاضرین:۔ ڈاکٹر حاجی غلام محمد صاحب ایم ایس سی ڈی ایس سی۔ مولوی حیدر حسن صاحب ایم اے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ ڈاکٹر قاضی معین الدین صاحب ایم ایس سی پی ایچ ڈی۔ معتمد

پروفیسر محمد سعید الدین صاحب ایم ایس سی نے بوجہ علالت شرکت سے معذرت کی اطلاع دی۔

طے پایا کہ شعبہ کی جدید تنظیم کی جائے تاکہ یہ شعبہ بھی ادارہ کے دوسرے شعبوں کی طرح سرگرمی کے ساتھ مصروف رہے۔ اس سلسلہ میں شعبہ کے لئے ایک صدر کے انتخاب کی ضرورت محسوس کی گئی۔

(۲) آیندہ اجلاس میں جن اصحاب کو مدعو کیا جائے گا ان کی ایک فہرست مرتب کی گئی۔

(۳) طے پایا کہ مجلۂ عثمانیہ کے گزشتہ شماروں میں سے ایسے مضامین کا انتخاب کیا جائے جو عام فہم سائنس سے متعلق ہوں اور جن کے مجموعے عوام کے فائدے کے لئے اس شعبے کی طرف سے مرتب کرکے شایع کئے جائیں۔ یہ کام معتمد صاحب شعبہ انجام دیں گے۔

(۴) ادارہ کی طرف سے جو اردو انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا جا رہا ہے اس کے لئے سائنس سے متعلق موضوعوں پر اس شعبے کے ارکان سے مضامین لکھنے کی درخواست کی جائے۔

(۵) ڈاکٹر حاجی غلام محمد صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ شعبے کو ایک کتاب "مسائل طبیعیات" لکھ کر بغرض اشاعت دیں گے۔

شعبۂ طلبہ

اپریل میں شعبہ طلبہ (بلدہ) کے دو جلسے ایک تعزیتی جلسہ اور دوسرا انتخابات کا جلسہ ہوا تھا جس کی روئداد گزشتہ مہینہ کے سب رس میں شایع ہوگئی اس شعبہ کی طرف سے ایک تحریری مقابلہ بہت جلد ہونے والا ہے جس کی اطلاع سب رس میں اور مقامی اخباروں میں چھپ جائے گی۔ گزشتہ بھی اس شعبہ کی جانب سے تحریری اور تقریری مقابلے ہوئے تھے جن میں طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی تھی۔ سب ہی بھائیوں اور بہنوں اور اراکین اور شعبہ طلبہ کے رفقاء سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس مقابلہ میں ضرور شرکت کرکے اسے کامیاب بنائیں گے۔

اس مرتبہ شعبہ کے اراکین میں کافی اضافہ ہوا۔ اس مہینہ ہمارے پاس جو درخواستیں وصول ہوئیں ان کے چند نام یہاں درج ہیں۔

محمد قطب الدین، محمد عبد الوحید، قاضی حمید الدین، عبد الصمد، سید خواجہ معین الدین ارشد، محمد عبد الباری، عمر خیام، وی۔ یم ریڈی، محمود احمد انصاری، سید خواجہ معین الدین فائز، نور الحسن انور شاہ آبادی وغیرہ۔

اس عرصہ میں شعبہ طلبہ کا قیام بعض اضلاع میں بھی ہوگیا۔ مثلاً کلیانی، گلبرگہ وغیرہ گلبرگہ کی شاخ کا افتتاحی جلسہ ۲۶ر خرداد ۱۳۵۱ف کو ہوا جس میں انور شاہ آبادی صاحب نے ایک تقریر کی جس میں طلبہ کو ادارہ کے کاموں اور شعبہ طلبہ کے قیام کی ضرورت کو بتلایا اور پھر سال رواں کے لئے حسب ذیل عہدہ داروں اور اراکین شعبۂ طلبہ گلبرگہ کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر۔ محمد نیاز علی خاں، نائب صدر محمود احمد انصاری، معتمد سید محمد نور الحسن شاہ آبادی، نائب معتمد محمد عبد المجید خاں۔

اراکین:۔ محمد قمر زماں، عبد الرشید سہروردی، خواجہ معین الدین فائز، منظور احمد، عبد الرشید، معین الدین، عبد الحمید، خواجہ معین الدین۔

امید ہے کہ یہ شعبہ گلبرگہ میں بہت کام کرے گا اور یہ ثابت کر دکھائے گا کہ اضلاع پر بھی طلبہ ایسے ہی کام کر سکتے ہیں جیسا کہ یہاں کے طلبہ کرتے ہیں۔ انور شاہ آبادی قابل مبارکباد ہیں کہ کامیابی سے چلا رہے ہیں

کوشش کر رہے ہیں۔ اس جلسہ میں اراکین شعبہ کے علاوہ اور طلبہ نے بھی شرکت کی اور حصہ لیا۔

بہرحال ہم کو دوسرے اضلاع کے طلبہ سے امید ہے کہ وہ بھی اپنے پاس شعبہ کے قیام کی کوشش کریں گے۔ شعبہ طلبہ (بلدہ) کے نئے عہدہ داروں اور اراکین کو ہم مبارکباد دیتے ہوئے ان سے یہ قوی توقع رکھتے ہیں کہ گزشتہ کی طرح یہ بھی اپنے اس شعبہ کو کامیابی سے چلانے کی کوشش کریں گے۔

معین الدین احمد انصاری

تحریری مقابلہ | اس مقابلہ میں اضلاع اور بلدہ کے طلبہ حصہ لے سکتے ہیں۔ مضامین کا ۱۵ر جون سنہ ۱۹۴۱ء م ۱۰ر امرداد سنہ ۱۳۵۰ف تک وصول ہو جانا ضروری ہے۔ مضمون صفحہ کے ایک ہی جانب خوش خط لکھا ہوا ہو۔ نتیجہ کا اعلان مقامی اخبارات و سب رس میں کیا جائے گا۔ انعام میں کتابیں دی جائیں گی۔ ضروری مراسلت حسب ذیل پتہ پر معتمد شعبہ طلبہ کے نام کی جاسکتی ہے۔

عنوانات :- (۱) سائنس اور دنیا کا مستقبل (۲) ضرورت ایجاد کی ماں ہے (۳) میرا مستقبل (۴) میرا محبوب مشغلہ۔

مرغوب الدین
معتمد شعبہ طلبہ ادارۂ ادبیات اردو رفعت منزل خیریت آباد

شعبۂ طلبہ (شاخ گلبرگہ) | **پہلا جلسہ** :- ۴ر مئی سنہ ۱۹۴۱ء

۴½ ساعت شام ایک معمولی جلسہ صدر صاحب شاخ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ تقریر کا عنوان "جنگ امن کے لیے ضروری ہے" تھا۔ عمر خاں صاحب خیام محرک تھے۔ جنھوں نے اپنے موضوع سے متعلق نہایت اچھی تقریر کی اور یہ کہا کہ بغیر جنگ کی دنیا میں امن کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اور بتایا کہ جنگ و امن کا ساتھ فطری ہے۔ اس کی مخالفت منظور احمد صاحب نے کی جنھوں نے یہ ثابت کیا کہ جنگ ایک وحشیانہ حرکت ہے۔ ان کے علاوہ اور چند مقررین مثلاً حسرت انصاری، قطب الدین محمد عبدالوحید، پانچا سارتھی، اور عبدالقادر صاحبان نے بھی موافقت اور مخالفت میں اچھی تقریریں کیں۔ اس کے بعد سید محمد فدا الحسن معتمد شاخ نے بھی مخالف پہلو پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور بلحاظ آراء یہ طے پایا کہ جنگ امن کے لیے ضروری نہیں ہے۔ اس طرح اس شعبہ کا پہلا تقریری جلسہ ۶½ بجے شام ختم ہوا۔

دوسرا جلسہ :- ۹ر مئی سنہ ۱۹۴۱ء دوسرا جلسہ ٹھیک ۴½ بجے نیاز علی خاں صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں افسانے، نظمیں اور مقالے سنائے گئے۔ عبدالقادر صاحب نے ایک محققانہ مقالہ سنایا۔ جس کا عنوان "جنگ کے عالمگیر اثرات" تھا اور چند خود ساختہ لطائف بھی سنائے۔ جن سے حاضرین بہت لطف اندوز ہوئے۔ مہدی صاحب نے ایک معاشرتی افسانہ معتمد صاحب نے دو نظمیں اور چند رباعیات اور معین الدین صاحب نے چند مزاحیہ اشعار سنائے صدارتی تقریر کے بعد جناب صدر نے ایک غزل سنائی جو پسند کی گئی۔

شاخ کلیانی | محمد عطاء اللہ صاحب عطا معتمد شاخ کلیانی نے اطلاع دی ہے کہ شاخ کا کام عمدگی سے چل رہا ہے۔ دارالمطالعہ بازار میں شارع عام پر کھولا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اکثر اصحاب کتابوں اور رسالوں کے مطالعہ سے استفادہ کر رہے ہیں۔ مولوی غلام معین الدین صاحب رکن تشہیر اور مولوی عبدالکریم صاحب شریک معتمد امتحانات کے لئے امیدواروں کو تعلیم دے رہے ہیں۔ مدرسہ قصبہ میں پابندی سے تعلیم ہو رہی ہے۔ عالیجناب مولوی احمد حسین صاحب تعلقدار و صدر شاخ کلیانی بطور خاص شاخ کی سرگرمیوں میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

اردو کی اشاعت کے لئے چار اصحاب کی ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جو مواضعات کا دورہ کرکے اہل دیہات کو اردو زبان کی اہمیت سے واقف کرانے اور امتحانات کے لئے

امیدوار فراہم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ سال حال امتحان اردو دانی میں خواتین زیادہ تعداد میں شریک ہو رہی ہیں۔

مجلس داعیان شعبہ جات

ادارۂ ادبیات اردو کے داعیان شعبہ جات کا تیسرا اجلاس پنجشنبہ ۲۰ مارچ ۱۹۴۱ء شام کے ساڑھے چار بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔

حاضرین:۔ ۱۔ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ ۲۔ مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب ۳۔ مولوی سید محمد صاحب ۴۔ عبدالقادر صاحب سروری ۵۔ مولوی سید بادشاہ حسین صاحب ۶۔ مولوی معین الدین احمد انصاری۔ ۷۔ نواب مرزا سیف علی خاں صاحب ۸۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور۔

(۱) طے پایا کہ شعبہ طلبہ کی مجلس انتظامی کا نیا انتخاب ماہ امرداد تک کر لیا جائے۔

(۲) شعبہ تالیف و ترجمہ و شعبہ شعراء و مصنفین کے حدود کار کے تعین سے متعلق تبادلۂ خیال کیا گیا۔ اور اس تصفیہ کی توثیق کی گئی کہ شعبہ شعراء و مصنفین دکن میں صرف دکن کے شاعروں اور ادیبوں کی طبع زاد کتابوں اور دکنی ادب کی تاریخ و تحقیق سے متعلق کام انجام پائے گا۔

(۳) شعبہ سائنس اور شعبہ اطفال سے متعلق معتمد عمومی نے بتایا کہ کام کی رفتار دوسرے شعبوں کے مقابلہ میں سست ہے۔ اس بارے میں تصفیہ پایا کہ معتمد عمومی شعبوں کے معتمدین اور اراکین سے تبادلۂ خیال کر کے اس کے اعضا میں ضروری تبدیلی کا مشورہ دے۔

(۴) طے پایا کہ اس مجلس کے جلسے سال میں دو بار ہوں تو مناسب ہے۔

(۵) پروفیسر سروری صاحب نے شعبہ تنقید کی معتمدی سے معذرت چاہی کیونکہ وہ شعبہ امتحانات کی معتمدی میں زیادہ مصروف ہیں۔ اس لئے اس مجلس نے سفارش کی کہ یہ کام نواب میر سعادت علی صاحب رضوی کے سپرد کیا جائے۔ اور صاحب موصوف نے اس خدمت کو قبول کر لیا۔ پروفیسر سروری صاحب اس شعبہ کے رکن رہیں گے۔

مجلس رفقاء

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس رفقاء کا ایک جلسہ بتاریخ ۲۰ مارچ ۱۹۴۱ء دفتر ادارہ میں شام کے ساڑھے پانچ بجے منعقد ہوا۔

حاضرین:۔ ۱۔ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ ۲۔ مولوی سید محمد صاحب۔ ۳۔ نواب میر سعادت علی صاحب ۴۔ مولوی میر حسن صاحب ۵۔ مولوی مخدوم محی الدین صاحب ۶۔ مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ۷۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ۸۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی ۹۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔

محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ۔ محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ مولوی ظہیر الدین احمد صاحب۔ نواب محمد ظہیر الدین خاں بہادر۔ مسٹر مہندر راج صاحب سکسینہ۔ صاحبزادہ محمد علی خاں صاحب میکش نے شرکت سے معذرت کی اطلاع دی اور مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری نے وقت سے کچھ قبل تشریف لا کر بوجہ مصروفیت خانگی شرکت سے معافی چاہی۔

حسب ذیل امور طے پائے۔

(۱) ایسے اصحاب ادارہ کے رفیق باقی نہیں رہیں گے جو۔

الف۔ ادارے کی نیک نامی اور اس کے اغراض و مقاصد کے خلاف عمل پیرا ہوں اور جس کی بناء پر مجلس رفقاء ان کی علیحدگی کی تحریک کرے گی۔

ب۔ خود اس سے دست بردار ہونا چاہیں۔

(۲) ادارہ کے معتمد عمومی نے اس اجلاس کے انعقاد کے مقاصد

بیان کئے کہ

الف ۔ رفقاء کے آپس میں تبادلۂ خیال اور تعاون عمل پیدا ہو۔

ب ۔ رفقاء ادارے کے علمی و ادبی کاموں میں مشورہ دیں۔

ج ۔ انسائیکلوپیڈیا کے کام میں رفقاء سے اعانت کی استدعا کی جائے۔

(۳) محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کی یہ تحریک باتفاق آرا منظور کی گئی۔

"میں تحریک کرتی ہوں کہ بشیر النساء بیگم صاحبہ و رابعہ بیگم صاحبہ کے نام مجلس رفقاء کی رکنیت کے لئے مجلس موسسین میں پیش کئے جائیں کیونکہ ہر دو کو ادارہ اور ادارے کے کاموں سے بیحد دلچسپی ہے۔"

(۴) مولوی مخدوم محی الدین صاحب کی یہ تحریک منظور کی گئی کہ ادارے کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کو جن موضوعات پر کتابیں لکھوانی یا مرتب کروانی ہوں یا وہ جن کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے۔ ان کے متعلق اگر رفقاء سے بھی فہرست طلب کرے تو مناسب ہے۔

(۵) طے پایا کہ مجلس رفقاء سال میں کم از کم دو مرتبہ منعقد ہو۔

(۶) مولوی مخدوم محی الدین صاحب کی یہ تحریک منظور کی گئی کہ رسالہ سب رس کے مضامین کے معیار میں اضافہ کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اور اس بارے میں رفقاء سے مدد حاصل کی جا سکتی ہے۔

(۷) انسائیکلوپیڈیا کے لئے رفقاء نے ہر طرح کی امداد کرنے کی آمادگی ظاہر کی۔

(۸) طے پایا کہ اس مجلس کی رائے میں ادارے کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کی طرف سے اگر سال بھر کی بہترین اردو نظموں اور افسانوں کے مجموعے منتخب کرا کے شائع کئے جائیں تو بہتر ہے۔

مجلس موسسین

ادارہ کی مجلس موسسین کا ایک جلسہ ۱۱ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔

حاضرین :- پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

گزشتہ جلسہ کی روئداد کی توثیق کے بعد ادارہ کے دستور کے صیغہ کی آخری خواندگی عمل میں آئی اور اس کو چند اضافوں کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔

(۲) طے پایا کہ مجلس رفقاء و مجلس داعیان شعبہ جات کے جلسے آئندہ ہفتے میں منعقد کئے جائیں۔

(۳) پروفیسر صدیقی صاحب نے تحریک کی کہ ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب اور مولوی فیض محمد صاحب صدیقی چونکہ ادارے کے شعبوں کے معاونین کی حیثیت سے خاص طور پر ادارے کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ اس لئے ان کو ادارے کا رفیق منتخب کرنے کی مجلس انتظامی میں سفارش کی جائے۔ پروفیسر سروری صاحب کی تائید سے یہ تحریک منظور کی گئی۔

مجلس انتظامی

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا ایک جلسہ ۳۰ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء شام کے ساڑھے چار بجے منعقد ہوا۔ مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب ایچ سی ایس نے صدارت اور حسب ذیل اصحاب نے شرکت کی۔

مولوی سید محمد اعظم صاحب ایم اے بی ایس سی آنرز۔ مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور (معتمد)

مولوی خواجہ معین الدین صاحب انصاری ایچ۔ سی ایس اور مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے نے بذریعہ ٹیلیفون اور مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی ایم اے نے بذریعہ تحریر شرکت سے معذرت کی اطلاع دی۔

(۱) معتمد نے گزشتہ جلسہ کی روئداد سنائی جس کی توثیق کی گئی۔ اس روئداد سے متعلق اس اثناء میں جو کام ہوئے ان سے مجلس کو مطلع کیا گیا۔

(۲) جلسہ کے آغاز سے قبل جناب صدر کی تحریک سے سر شاہ محمد سلیمان کی وفات پر حسب ذیل قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔

> ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی ہندوستان کی مایۂ ناز شخصیت اور اردو کے صاحبِ ذوق محسن سر شاہ محمد سلیمان کی وفات پر اپنے دلی رنج و ملال کا اظہار کرتی ہے۔ اور ان کی بے وقت موت کو اردو زبان و ادب کا ایک ناقابل تلافی نقصان سمجھتی ہے۔

(۳) نائب صدر کی منظورہ اور گشتی کارروائیوں کی توثیق کی گئی۔

(۴) ادارہ کے شعبۂ اردو انسائکلو پیڈیا۔ شعبۂ تالیف و ترجمہ شعبۂ سائنس اور شعبۂ شعراء و مصنفین دکن اور مجلس موسسین رفقاء اور مجلس داعیان شعبہ جات کی تجویزیں برائے توثیق و تصفیہ پیش ہوئیں اور ان کے متعلق بعد غور و فکر ضروری تصفیے کئے گئے۔

(۵) طے پایا کہ مولوی سید محمد اعظم صاحب سے شعبۂ سائنس کی صدارت اور مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی ایم اے سے شعبۂ تنقید کی معتمدی قبول کرنے کی استدعا کی جائے۔

(۶) طے پایا کہ جلال الدین توفیق اور لقمان الدولہ دل کی قبروں کے علاوہ غلام مصطفیٰ ذہین کی قبر پر بھی شعبۂ شعراء و مصنفین دکن کی طرف سے کتبہ لگایا جائے۔

(۷) مجلس موسسین و مجلس شعبۂ نسواں کی تحریک پر ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب معتمد شعبۂ زبان۔ مولوی فیض محمد صاحب صدیقی معتمد شعبۂ اردو انسائکلو پیڈیا۔ محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ صدر شعبۂ نسواں۔ اور محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ کو ادارہ کا رفیق منتخب کیا گیا۔

(۸) جناب صدر کی یہ تحریک منظور کی گئی کہ محترمہ سروجنی نائیڈو کو بھی ادارہ کا رفیق بننے کی دعوت دی جائے۔

(۹) بلارم۔ کلپاک اور کپل میں ادارہ کی شاخوں کے قیام سے متعلق جو کارروائی کی جا رہی ہے اس کی توثیق کی گئی۔

(۱۰) ادارہ کے دستور کی خواندگی عمل میں آئی اور اس کو بعد ترمیم منظور کیا گیا۔

اردو امتحانات کے مرکز اور روانگی فیس و درخواست شرکت امتحان کی تاریخ

سالحال ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات

(اردو عالم۔ اردو فاضل۔ اردو دانی۔ خوشنویسی۔ اور خطاطی و کتابت) کے مرکز (زنانہ و مردانہ) بلدہ حیدرآباد کے علاوہ گلبرگہ۔ پربھنی۔ کلیانی۔ کشتگی۔ کاماریڈی۔ نرسی تعلقہ ہنگولی۔ خانہ پور گدوال۔ اور کپل وغیرہ مقامات پر مقرر ہو رہے ہیں۔ دوسرے مقامات مثلاً اورنگ آباد۔ بیدر۔ ورنگل۔ محبوب نگر۔ میدک اور عثمان آباد میں جو اصحاب ان امتحانات کا کام کر رہے ہیں وہ جلد دفتر ادارہ کو مطلع کریں تاکہ وہاں بھی مرکز قایم کرنے کے

امکانات پر غور کیا جائے۔

یہ امتحانات ۱۵-۱۶ اور ۱۷ مہر ۱۳۵۰ف کو ہوں گے اور شرکت امتحان کی درخواستیں اور فیس ۱۰ امرداد ۱۳۵۰ف تک وصول ہونی چاہئیں۔ (معتمد ارود امتحانات)

امتحانات کی تقریریں

ادارے کے امتحانات کے سلسلے میں امیدواروں کے استفادے کے لئے ادارہ کی طرف سے کواپریٹو ہال توپ کا سانچہ میں ہر جمعہ کو شام میں ۶ بجے ایک ایک ماہر فن سے تقریر کرائی جاتی ہے چنانچہ اب تک حسب ذیل اصحاب نے تقریریں کی ہیں۔

(۱) ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور۔ اردو ادب کا قدیم دور
(۲) مولوی سید محمد صاحب ایم اے۔ اردو ادب کا درمیانی دور
(۳) مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی۔ جدید اردو ادب
(۴) مولوی سید بادشاہ حسین صاحب۔ اردو کے ڈرامے
(۵) مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی۔ اجتماعی زندگی
(۶) مولوی میر ناصر علی صاحب ایم اے۔ معاشیات کے ابتدائی مسائل
(۷) مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ۔ روز مرہ کی سائنس
(۸) مولوی صلاح الدین صاحب ایم اے۔ جذبات و حسیات
(۹) مولوی عبدالقیوم خاں صاحب باقی ایم اے۔ ادبی تنقید

آئندہ حسب تفصیل ذیل تقریریں ہوں گی۔ امید ہے کہ اہل ذوق اصحاب شرکت فرمائیں گے۔

(۱) اردو کے عناصر اربعہ۔ مولوی سید محمد صاحب ایم اے۔ ۳۰ مئی ۲۹ ار تیر
(۲) فن شعر۔ مولوی ابو ظفر عبدالواحد صاحب ایم اے۔ ۶ جون م یکم امرداد
(۳) " " " " " " " ۱۳ جون م ۸ امرداد
(۴) " " " " " " " ۲۰ جون م ۱۵ امرداد
(۵) آجکل کے ادبی رجحانات۔ مولوی میر حسن صاحب ایم اے۔ ۲۷ جون م ۲۲ امرداد

(۶) اردو کے ناول اور افسانے۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی ۴ جولائی

اردو انسائیکلو پیڈیا

کام کی رفتار

سہولت کار کی خاطر اردو انسائیکلو پیڈیا کو مختلف علوم و فنون کے شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور حیدر آباد اور بیرون حیدر آباد کے علماء و فضلاء کی نگرانی اور مختلف انسائیکلو پیڈیا اور دیگر حوالے کی مستند کتابوں کی مدد سے اشاریہ مرتب کرنے کا کام جو کئی مہینوں سے جاری تھا اب بفضلہ مکمل ہوا۔ فی الحال مختلف علوم و فنون کے تیس اور چالیس ہزار کے درمیان الفاظ کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ ان الفاظ کے پورے کارڈ بھی لکھے جا چکے ہیں اور ان پر نظر ثانی بھی ہو رہی ہے۔

معاونین کی ایک مختصر سی فہرست گزشتہ ماہ سب رس کے علاوہ بہت سے ہندوستان کے اخباروں اور رسالوں میں شایع ہو چکی ہے اور ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ ہم نے علماء و فضلاء سے قلمی اعانت کی جو درخواست اس اعلان کے ذریعہ سے کی تھی وہ رائیگاں نہ گئی اور متعدد اہل علم حضرات نے اشتراک عمل کی فوراً ہی خواہش کی۔

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

دہلی کا مشہور رسالہ "ساقی" مئی کے اداریہ میں لکھا۔

"ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن' اردو کی بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے ..... اردو انسائیکلو پیڈیا کی جلدوں میں شایع کرنے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ ملک کے مشہور ماہرین فن اور باکمال اساتذہ کی مستقل خدمات حاصل کی جا چکی ہیں ....."

لکھنؤ کا معتبر جریدہ "صدق" لکھتا ہے :-

"اردو انسائیکلو پیڈیا کا ذکر ایک بار قبل بھی ان صفحات میں آچکا ہے۔ اب تجویز محض تجویز نہیں رہی بلکہ ادارہ ادبیات کے باہمت و مستعد کارکنوں کی سرگرمیاں اپنا کام شروع کر چکی ہیں۔......"

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدیر "معارف" جو اردو انسائیکلو پیڈیا کے شعبہ اسلامیات پر کام کر رہے ہیں اپنے ایک تازہ خط میں لکھتے ہیں :-

"مجھے آپ کی اس تجویز سے اس لئے بھی مسرت ہے کہ ۱۹۱۶ء میں سب سے پہلی دفعہ یہ تجویز ہم ہی نے پیش کی تھی...... اس اہم کام کے لئے حیدر آباد اصلی مقام ہے جہاں امراء کی سرپرستی اور علم کی دولت دونوں موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کی توجہ اور آپ صاحبان کی ہمت سے یہ کام بآسانی انجام پاسکتا ہے...... مجھ سے جو مدد ممکن ہو میں اس کے لئے حاضر ہوں......"

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی پرنسپل جامعہ ملیہ، ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی ایم ایس سی، پی ایچ ڈی کی مرتب کردہ معاشی مضامین کی فہرست پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"میرے نزدیک ڈاکٹر اقبال صاحب کی مرتب کی ہوئی فہرست مضامین دیکھی بہت اچھی ہے۔ ان عنوانات پر اردو انسائیکلو پیڈیا میں اچھے مستند مضامین شامل ہو جائیں تو سمجھنا چاہیے کہ معاشیات کے اہم مضامین آگئے۔"

مولوی مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے پروفیسر اردو لکھنؤ یونیورسٹی اردو ادب کے بعض شعبوں میں ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں اپنے ایک حالیہ خط میں تحریر فرماتے ہیں :-

"اردو انسائیکلو پیڈیا کے سلسلہ میں جو خدمت آپ نے میرے متعلق کی ہے اس کو انجام دینے کے لئے میں بخوشی تیار ہوں......"

بمبئی یونیورسٹی کے پروفیسر معاشیات ڈاکٹر احمد مختار اردو انسائیکلو پیڈیا کے شعبہ معاشیات کی علمی اعانت کا وعدہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"آپ نے ڈاکٹر انور اقبال صاحب کی مرتب کی ہوئی معاشیات کی فہرست میرے پاس بھیجی وصول ہوئی۔ میرا تبادلہ احمد آباد سے اندھیری کالج ہو گیا ہے اس لئے میں خود الجھن میں ہوں جب میں بمبئی میں قدم جما چکوں گا تو یقیناً آپ کی اعانت کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔"

پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر محمد باقر صاحب ایم اے پی ایچ ڈی۔ انسائیکلو پیڈیا کی کامیابی کے متعلق امید ظاہر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"...... مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کوشش کریں تو اس میں ضرور کامیاب ہوں گے اور اس کوشش میں میں کسی طرح خدمت کر سکوں تو مجھے خوشی ہوگی۔"

پنجاب کے مشہور اخبار "نوائے وقت" لاہور کے ایڈیٹر مولوی حمید نظامی صاحب ایم اے تحریر فرماتے ہیں۔

"اگر آپ مجھے رفیق کی حیثیت سے خدمت کا موقع دیں تو جو خدمت مجھ سے ہو سکے خوشی سے بجا لاؤں گا......"

ڈاکٹر محمد دین تاثیر ایم اے پی ایچ ڈی (کیمبرج) پرنسپل ایم اے او کالج، امرتسر ادبیات اور فنون لطیفہ کے سلسلہ میں اشتراک عمل فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"... آپ کا ادارہ بہت مبارک ہے۔ آپ لوگوں سے اردو داں ایک خاص طرح کی توقع رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا یہ عمل ان توقعات میں اضافہ کرے گا...۔"

اخبار و رسائل کے تبصرے اور مشاہیر علماء کے آرا جو اوپر شائع کئے گئے ان کو مشتی نمونہ از خروارے سمجھنا چاہیے کیونکہ دفتر میں اس قسم کے تبصرے اور آرا کافی سے زیادہ وصول ہو چکے ہیں اور آئے دن وصول ہوتے ہی جا رہے ہیں جس سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان بھر کے علم دوست اصحاب ہماری اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بطیب خاطر آمادہ ہیں اور انشاء اللہ اشتراک عمل اور جوش تعاون کا یہی حال رہا تو کل کا ہونا کام آج ہی مکمل ہو جائے گا۔

انوار | ادارہ کی ایک کتاب انوار پر رائیں

مولوی علی اختر صاحب کی غزلوں اور مختصر نظموں کا یہ مجموعہ ایک نظر نواز صورت میں شائع ہوا ہے۔ اختر ایک جانے پہچانے شاعر ہیں اور محفل سخن میں ان کا مرتبہ پیشہ ور شعرائے کرام سے بہت زیادہ بلند ہے۔ وہ سوچتے بھی ہیں اور لکھتے بھی ہیں۔ چونکہ زندگی کے کوائف سے آشنا ہیں اور طبیعت شاعر پائی ہے۔ اس لئے ان کے کلام میں اثر ہے۔ چونکہ وہ زیادہ تر نظمیں کہتے ہیں اس لئے ان کے تغزل سے عام طور پر لوگ آشنا نہیں ہیں۔ لیکن ہم جو رائج الوقت شاعری سے بہت دور جا پڑنے والے لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ہم اب بھی غزل ہی کو شاعری کی روح سمجھتے ہیں اور اس لئے شاعر کے معیار فکر کو اس کے تغزل ہی سے جانچتے ہیں۔ جدید ادبیات اور شاعری کی جو بدنظمی تمام ملک میں رونما ہے اس نے شاعر علی اور دیوانوں کے اندر خیالات کی بلندی کو شاعرانہ الفاظ اور ترکیبات کی نشست میں کچھ اس طرح فنا کر دیا ہے کہ آج کل کا شاعر بھی اخباروں کی طرح سوچتا کم اور لکھتا زیادہ ہے۔ حضرت علی اختر کا کلام اس عیب سے پاک ہے اور وہ ہر رنگ میں جو کچھ لکھتے ہیں صرف اپنے دیوان کی ضخامت میں اضافہ کرنے کے لئے نہیں لکھتے۔ ان کی زندگی اس لحاظ سے بھی شاعرانہ ہے کہ وہ فکر معاش سے فارغ نہیں۔ اس لئے ان کی شاعری پر تفریح طبع کا گمان بیجا ہے۔ جب وہ لکھتے ہیں تو اپنی طبیعت کے تقاضہ سے مجبور ہو کر لکھتے ہیں۔ یہی چیز عین شاعری ہے۔ اس مجموعے کی بعض غزلوں میں نظموں کا رنگ پیدا ہو گیا ہے اور بعض مقامات پر الفاظ کی روانی محاورات سے بے پروا ہو گئی ہے لیکن نظر کی گہرائی اور زبان کا لطف ہر صفحہ پر موجود ہے۔ ہم شاعر کی شاعری کو صرف عروض کے قاعدوں اور محاوروں اور استعارات کی بندشوں سے دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ شاعری کا یہ صرف لباس ہے روح نہیں ہے اصل چیز شاعر کی فکر اور اس کا جذبۂ بے اختیار ہے۔ اس لئے یہ ظلم ہے اگر شاعر کے ہر شعر کو اس کانٹے اور ترازو میں تولا جائے۔ حضرت اختر اپنے رنگ میں بہت پختہ کہہ رہے ہیں۔ اور ان کے کلام کی اشاعت ہماری ادبیات میں اچھا اور نظر نواز اضافہ ہے۔"

پیام

۲ر مئی ۱۹۳۱ء

(ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں)

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	
من کی دنیا ...	۸۰ ...	۰	۸	۰
سرگذشت غالب ...	۶۴ ...	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰ .	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰ ...	۳	۸	۰
دکن نمبر (۷۸ تصاویر)	۱۶۸ ...	۲	۰	۰
ارمغان حدث ...	۱۲۰ ...	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸ ...	۰	۴	۰
سرسید احمد خاں ...	۱۶ ..	۰	۲	۰
سرسالار جنگ ...	۴۸ ..	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں ..	۱۳۲ ...	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۶۸ ..		۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲ ..	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ ..	۲۲۰ ...	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰ ..	۲	۸	۰
دادا بھائی ..	۱۶ ..	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰ ...	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵ ...	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰ ...	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب .	۵۶	۰	۲	۶
" دوسری کتاب .	۵۶	۰	۴	۶
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰ ...	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰ ...	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۶ ...	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴ ...	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸ ...	۰	۶	۰
رسائل طبیہ ...	۳۱۲ ...	۲	۸	۰
سالک گوہرس ...	۴۰ ...	۰	۴	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	
تاریخ ادب اردو ...	۷۶ ...			۰
ورڈ سورتھ اور اسکی شاعری...	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴ ...	۱	۰	۰
یوسف ہندی عہد فرنگ میں .		۱	۰	۰
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱۲۸ ...	۱	۴	۰
متاع سخن ...	۱۲۴ ...	۰	۱۲	۰
صدف سخن ...	۱۲۲ ..	۰	۱۲	۰
دادِ سخن ...	۱۲۷ ...	۰	۱۲	۰
سراج سخن ...	۱۵۲ ...	۰	۱۲	[illegible]
ایمان سخن ...	۱۲۰ ..	۰	۱۲	۰
رقص سخن ...	۱۴۴ ...	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر...	۵۰۰	۵	[illegible]	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲ ...	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵ ...	۱	۰	۰
اندرولی ...	۲۴۸ ...	۲	۸	۰
گرنہ و نسیم ...	۱۹۲ ...	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴ ...	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵ ...	۱	۰	۰
مدارس میں اردو	۱۹۶ ...	۱	۸	۰
محرم نامہ ...	۱۱[illegible] ...	۱	۰	۰
ندر دکن ...	۱[illegible]۴ ...	۱	۴	۰
روح غالب ...	۴۰ ...	۲	۸	۰
عاصم ...	۲۰۰ ...	۱	۴	۰
دیہی معلومات ...	۵۶ ...	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸ ...	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳ ...	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۲ ..	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۲ ...	۰	۱۲	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

جولائی

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۴
نشان ٹپہ برطانیہ M3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

جلد (۴) | جولائی سنہ ۱۹۴۱ء | شمارہ (۷)

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ

یہ خبر علمی حلقوں میں نہایت مسرت سے سنی جائے گی کہ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی طرف سے نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی میں اردو کا پہلا دیوان یعنی کلیات محمد قلی قطب شاہ شایع ہوکر منظرِ عام پر آچکا ہے۔

یہ ایک نہایت ضخیم مجلد اور باتصویر کتاب ہے جو تقریباً ایک ہزار ایک سو (۱۱۰۰) صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کو عالیجناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ نے دس (۱۰) سال کی مسلسل سعی و تلاش اور اعلیٰ تحقیق و ترتیب کے بعد اشاعت کے قابل بنایا ہے۔

اس میں ہر صنف سخن یعنی غزل، قصیدہ، رباعی، مرثیہ، ریختی، مثنوی وغیرہ کے وافر نمونے موجود ہیں جن میں غزلوں کیلئے تین سو اور مختلف نظموں کے لئے سوا تین سو صفحات وقف ہیں۔

اردو کے کسی شاعر کا دیوان اس اہتمام اور شان سے نہیں شایع ہوا تھا۔ جو لوگ اردو ادب کی تاریخ اور شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے یہ ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔

یہ کتاب سب رس کتاب گھر خیریت آباد سے پندرہ (۱۵) روپے قیمت میں حاصل کیجا سکتی ہے

ہزاکسلنسی رائٹ انریبل نواب سرحیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم و سرپرست ادارۂ ادبیات اردو ادارہ کے مختلف شعبوں کا معاینہ فرمارہے ہیں

(تصویر نمبر ۱) ادارہ کی گذشتہ دس سال کی (۵۰) مطبوعات جو نواب مرزا سیف علی خان صاحب ناظم اعزازی کتب خانہ کے اجلاس میں آراستہ ہیں ۔

(۲)

تاریخی و ادبی اہمیت کی تصاویر کی نمایش گاہ میں صدر اعظم بہادر تاریخی تصویروں اور کروپوں کا شوق سے ملاحظہ کررہے ہیں ۔

(۳)

ادارہ کے مرتبہ ان نقشوں کا معاینہ جن میں حیدرآباد میں اردو بولنے والوں کا تناسب ، دنیا کی جملہ زبانوں سے اردو کا تعلق ، اور ادارے کے شعبوں کی تقسیم کار وغیرہ درج ہے ۔

(۱)

(۲)

(۳)

(۴)
ادارے کے شعبۂ سوان کے کرے میں
هندستان کے اس نقشے کا معائنه حس مس
اردو کے آغاز و ارتقا اور مختلف مرکروں
کو تاریخی اندراج کے ساتھ واضح
کیا گیا ھے -

(۵)
ادارے کے هال میں زیر ترتیب اردو
انسائیکلو پیڈیا کے کام اور قدیم قلمی نسخوں
اور مرقعوں کا معاینه -

(۴)

(۵)

حیدرآباد پرنٹنگ ورکس

ہز اکسلنسی رائٹ آنریبل نواب سرحیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم و سرپرست ادارۂ ادبیات اردو

سرپناتھ کا کتبہ

اکثر مقامات کے جغرافیائی حالات کے معلوم کرنے کا مجھ کو شوق رہا ہے اور اس تجسس میں سروے آف انڈیا کے نقشہ جات عموماً میرے نصب العین رہتے ہیں۔ مستقر تعلقہ کنٹر ضلع اورنگ آباد کے اطراف بہت سے پہاڑی سلسلے ہیں مگر ان میں سے ایک پہاڑ سرپناتھ نامی کنٹر سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جس کی بلندی سطح سمندر سے (۳۱۴۴) فیٹ ہے۔ چونکہ یہ پہاڑ ہماری ریاست ابد مدت کے پہاڑی مقامات میں سب سے بلندترین ہے اس لئے مجھ کو اس کے دیکھنے کا شوق ہوا۔ بتقریب دورہ مستقر کنٹر گیا ہوا تھا۔ ۳ اپریل سنہ ۱۹۴۱ء کی صبح کو میں نے اس کا ارادہ کیا۔ اس پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹا سا قریہ "ریل" کنٹر کے رخ میں ہے اور ایک دوسرا قریہ "ناوڑی" کنٹر چالیس گاؤں کی سڑک کے جانب واقع ہے۔

اس پہاڑ کے دو حصے بیضوی شکل میں ایک مستطیل خط کے ذریعے ملے ہوئے ہیں اور ان دونوں میں جنوبی پہاڑ وہ ہے جس کے اوپر ٹرگنامیٹیکل سروے اسٹیشن (۳۱۴۴) فیٹ قایم ہے۔ دوسرا پہاڑ جو شمال میں واقع ہے اس کی بلندی تقریباً (۲۹۰۰) فیٹ ہے۔ ان پہاڑوں کے اوپر جانے کے لئے کوئی ٹھیک راستہ نہیں ہے۔ چرائی کے لئے جانوروں کے چڑھنے اترنے کے کچھ نشانات ملتے ہیں اور ان کے ذریعہ موضع ناوڑی کے رخ سے میں پہلے چھوٹے پہاڑی حصہ پر چڑھا اس پہاڑ کی چوٹی سے ۳۰۔۴۰ فیٹ نیچے چٹان میں کاٹی ہوئی ایک ٹاکی ملی جو اس وقت خشک تھی اور معلوم ہوا کہ بارش اور جاڑے میں اس میں پانی کا کافی ذخیرہ رہتا ہے۔ اس پہاڑ کی عین چوٹی پر جانے کے بعد ایک تعمیر ۶×۶ فیٹ اور ۸ فیٹ بلند ملی جس کے شمال اور جنوب کی دیواروں پر ایک کمانی چھت قایم ہے۔ مشرقی رخ بالکل کھلا ہوا ہے اور مغرب کی جانب کی دیوار جو کسی زمانہ میں پوری بند ہوگی اس کا بالائی حصہ گر چکا ہے اور صرف ڈیڑھ دو فیٹ دیوار نیچے باقی رہ گئی ہے یہ تعمیر چونے اور پتھر کی ہے۔ میں اس تعمیر کی نوعیت کے متعلق غور کر رہا تھا کہ اس میں ایک پتھر ڈیڑھ فیٹ طویل اور چھ فیٹ عریض پڑا ہوا نظر آیا جس پر سرخ گیرو کے ڈل جمے ہوئے تھے اور اس کے اطراف ناریل کے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ اطراف کے مواضعات کے بھیل اس پتھر کی نسبت حسن اعتقاد رکھتے ہیں اور اس پر گیرو چڑھاتے اور ناریل پھوڑتے ہیں اور غالباً یہی وجہ تھی کہ یہ پتھر اب تک محفوظ رہ سکا۔ غور سے دیکھنے پر اس پتھر پر ابھرے ہوئے عربی حروف میں ایک تحریر نظر آئی۔ گیرو کے رنگ کو صاف کر کے اس عبارت کو پڑھا گیا تو پارہ تبارک (۲۹) کے سورۂ جن کی آیت ذیل برآمد ہوئی۔

وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۝

اور یہ کہ مسجدیں اللہ کی یاد کے واسطے ہیں سو مت پکارو اللہ کے ساتھ کسی کو۔

چونکہ اس آیت میں مساجد کا ذکر ہے اس لئے میں قیاس کرتا ہوں کہ یہ چھوٹی سی عمارت ایک مسجد کی ہے جس کا یہ کتبہ ہے۔ اور اس عمارت سے قریب نیچے جو پانی کی ٹاکی ہے وہ بھی مسجد کے مصلیوں کی سہولت کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں میں نے اس آیت کے حروف کے ہندسے بھی جمع کئے تو ان کی میزان (۱۰۴۳) برآمد ہوئی اور بلحاظ سنہ ہجری نبوی تین سو سال قبل کی یہ تعمیر قرار پاتی ہے۔

اس پہاڑ سے ملا ہوا دوسرا پہاڑ ہے اور دونوں کے درمیان تقریباً دو فرلانگ کا پتلا راستہ سڑک کی طرح چلا گیا ہے۔ اور اس دوسرے پہاڑ کی بلندی پر ایک مختصر مرتفع سطح سو گز قطر کی ہوگی۔ اور اس کے وسط میں ٹرگنا میٹیکل اسٹیشن کا بنایا ہوا پتھروں کا چبوترہ ہے جس کی بلندی سطح سمندر سے (۴۱۴۴) بتائی گئی ہے۔

اس ضمن میں ایک اور دلچسپ تاریخی واقعہ ظاہر ہوا۔ اس پہاڑ کا نام سرپاناتھ ہے اور تاریخ دکن مولفہ نواب اختر یار جنگ بہادر اختر مینائی و نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل کے صفحہ (۲۹) کا اقتباس یہ ہے کہ :-

"جب اجودھیا سے جلاوطن ہونے کے بعد رام اور ان کی پیاری بیوی سیتا دنڈکا کے جنگل میں پہنچے اور کچھ مدت تک یہاں پھرنے کے بعد ان کا قیام پنچوٹی (ناسک) میں ہوا تو رام پر ایک راکش عورت جس کا نام سرپنکھا تھا دل و جان سے عاشق ہوگئی اور اس نے سیتا کو اپنے سوتیا جلاپے سے ہلاک کرنا چاہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سرپنکھا کی سکونت سرپاناتھ پہاڑ پر تھی جو کنتر ضلع اورنگ آباد کے قریب ہے۔"

ایک تاریخی واقعہ کے ساتھ ساتھ اتفاقاً میں نے ایک خبر بھی سنی کہ اس بڑے پہاڑ کے کسی سمت میں ایک غار ایلورہ وغیرہ کی طرح دیکھا گیا ہے۔ اطراف کے بھیلوں اور رعایا سے اس غار کے متعلق دریافت کرنے میں دو روز نہایت دلچسپ گزرے۔ ایک دوکان دار نے اولاً اس غار کو دیکھنے کا اقبال کیا لیکن جب تحقیق شروع ہوئی تو مختلف طرح سے پہلو تہی کرنے لگا اور بالآخر اس کی صداقت مشتبہ پائی گئی۔ بھیلوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔ اس تاریخی واقعہ اور اس مقامی روایت نے ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا مگر اصلیت کے متعلق اطمینان نہ ہونے کی وجہ سے میں نے دوبارہ زحمت گوارا نہیں کی۔

احمد اللہ

تلوار کا نغمہ

نغمے مستور جو تلوار کی جھنکار میں ہیں
وہ نہ بربط، نہ مرے دکھ بھرے اشعار میں ہیں
لبِ ساحل کا سکوں موت ہے دیوانوں کی
وہی اچھے ہیں جو الجھے ہوئے منجدھار میں ہیں
جن کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر کی باگ
بے خطر سوئے ہوئے قصرِ طلاء کار میں ہیں
جن ارادوں پہ ہے جمہور کی قوت کا مدار
وہ اناالحق میں نہ پنہاں رسن و دار میں ہیں
پھونک ڈالیں گے یہ باطل کی صفیں اک پل میں
مضطرب ایسے شرارے مری للکار میں ہیں
دیکھنے والے نہیں ہیں، ترے جلوے [illegible] نہ
وسعتِ دشت میں ہیں، رفعتِ کہسار میں ہیں
یہی قانونِ ازل سے ہے جہاں میں جاری
ساتھ پھولوں کے اگر خار بھی گلزار میں ہیں
ان کی پھنکار سے بے کار ہے سارا گلشن
چند اژدر ترے سینچے ہوئے اشجار میں ہیں
اک ذرا ان کو بھڑکنے کا اشارا کر دے
کچھ شرر زندہ ابھی راکھ کے انبار میں ہیں

احمد ندیم قاسمی

فریسہ کے نام[1]

اچھی فریسہ ۔

یہ باتیں تم سمجھ نہ سکوگی ۔۔۔ ابھی تمہیں سمجھنا بھی نہیں چاہیئے ۔۔۔ زندگی کی یہ پہلی فرصت جس کو بچپن کہتے ہیں تلخ بنانے کے لئے نہیں ہے ۔ تم ابھی فرشتوں کا تبسّم ہو ۔ انسان کے مجروح قہقہوں کو نہ سنو ۔۔۔ لیکن جب تمہیں معلوم ہوگا کہ دنیا صرف " ہنسنے کھیلنے " کی جگہ نہیں تو تم میری ان باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرنا ۔

ایک بچہ کا حال کچھ بھی نہیں جو کچھ ہے مستقبل ہے ۔ میں حال کے لئے " کھلونا " نہیں دیتا مستقبل کیلئے ایک تحفہ دیتا ہوں اور اس تحفہ کا نام ہے :۔

" آوازِ حیات "

یہ نہ سن کب تک تبسم آفریں ہے کائنات
یہ نہ سن کس تلخ مستقبل کو کہتے ہیں حیات

تو ابھی معصوم امیدوں کے گہوارے میں ہے
ایک نامعلوم سی دنیا کے نظارے میں ہے

یہ تبسم یہ اشارے یہ اور صوری گفتگو
تیری دنیا آب و گل میں بھی ہے بزمِ رنگ و بو

تیرے رخ پر ہے خزاں ناآشنا پھولوں کا رنگ
کھیل ہے تیرے لئے اب تک یہ خیر و شر کی جنگ

ہنستے ہنستے جانے پھر کس بات پر روتی ہے تو
کیا نظر آتا ہے جو بے تاب سی ہوتی ہے تو
میں سمجھتا ہوں کہ تو سنتی ہے آوازِ حیات
تجھ پہ کھل جاتے ہیں دم بھر کے لئے رازِ حیات
رات کی پرچھائیاں بہتی ہیں دن کی دھوپ میں
تجھ کو یہ دنیا نظر آتی ہے اصلی روپ میں

تیری دنیا رات میں جیسے ستاروں کی چمک
میری دنیا خار و خس پر جیسے شعلہ کی چمک

تیری دنیا رقصِ انجم چاند کی کرنوں کا راگ
میری دنیا سوزِ ہستی میری دنیا دل کی آگ

---

[1] مولوی میر حسن صاحب کی ایک سالہ دختر [illegible] جس کی پہلی سالگرہ کے موقع پر صاحبزادہ میکش نے یہ نظم لکھی ہے ۔

تیری دنیا فکر سے محروم دنیا کا شباب　　میری دنیا سرگرانی میری دنیا اضطراب
تیری دنیا شمعِ روشن تیری دنیا مہر و ماہ　　میری دنیا کی جبیں پر ہر شکن داغِ سیاہ
تیری دنیا ایک فردوسِ مکمل کی جھلک　　میری دنیا میں اسی دنیا کے کانٹوں کی کھٹک
تیری دنیا اک تجلی تیری دنیا اک نمود　　میری دنیا قطرۂ شبنم میں عکسِ ہست و بود

تو مگر مجبور میں پامالِ جبر و اختیار
تیری دنیا اک قدم اور میری دنیا رہ گزار
تیری کلیوں کی دبی آواز پابندِ بہار
میرے طوفانوں کی دھڑکن گردشِ لیل و نہار
تیری آنکھوں کی چمک ناآشنائے بیش و کم
میری آنکھیں آنسوؤں کی شعلہ دامانی سے نم

تیری دنیا اک سکون اور میری دنیا ناشکیب　　تیری دنیا اک کھلونا میری دنیا اک فریب

تیری یہ دنیا مگر کھو جائے گی کھو جائے گی
تیری دنیا اک نئی دنیا میں گم ہو جائے گی
ہر قدم پر اک نئی دنیا بنانا ہے تجھے
اپنی دنیا سے مری دنیا میں آنا ہے تجھے
زندگی بچپن کو ٹھکراتی ہے جینے کے لئے
دم بہ دم طوفان اٹھتے ہیں سفینے کے لئے
اس جہنم کو اگر جنت بنا سکتی ہے تو
زندگی کے ہر قدم پر مسکرا سکتی ہے تو

میکش

تنقید و تبصرہ

ہفت اورنگ یہ کتاب اقبال انصاری صاحب ایم اے ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی کے ان سات مقالوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے بی اے آنرز کی تعلیم کے دوران میں فارسی زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر لکھے تھے۔ یہ اصل میں ان کے اکیس مقالوں کی پہلی قسط ہے۔ اس میں زردشت۔ فردوسی، طوسی، جہاں مقالہ نظامی۔ لسان الغیب۔ شیخ علی حزیں کے علاوہ ایران میں ادب و شاعری اور صوفیانہ لٹریچر جیسے موضوعوں پر تحقیقی اور تنقیدی بحث کی گئی ہے۔ فارسی ادبیات کی نسبت اردو میں عرصہ سے اس قسم کے مضامین کی کمی محسوس ہو رہی تھی توقع ہے کہ اقبال انصاری صاحب کی کوشش سے پھر اہل اردو فارسی ادب کے سمجھنے کی طرف متوجہ ہوں گے۔

الہامات سلیمانی یہ کتاب فارسی شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی کے فارسی، عربی اور اردو کلام کا مجموعہ ہے جس کو منظور الحق صاحب کلیم نے مرتب کرکے شایع کیا ہے۔ ابتدا میں شاہ سلیمان مرحوم کے حالات زندگی درج ہیں جن کے مرتب شاہ محمد عاقل صاحب ہیں۔ شاہ سلیمان صاحب کوئی مشاق یا پیشہ ور شاعر نہ تھے البتہ طبیعت کی موزونی کے باعث کبھی کبھی عربی۔ فارسی یا اردو میں نظمیں غزلیں یا قطعات تاریخی قلم بند کردیا کرتے تھے۔ اس خیال سے کہ کہیں ایک مشہور عالم اور بزرگ کے یہ نتائج طبع ضایع نہ ہوجائیں ان کو اس مجموعہ کی شکل میں شایع کردیا ہے اس کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہی نظر آتی ہے کہ اس میں صوفیانہ اور اصلاحی مضامین بیان کئے گئے ہیں جن کا مطالعہ موصوف کے معتقدین کے لئے خاص دلچسپی کا باعث ہوگا۔

لاسلکی ترسیل و تحصیل یہ کتاب سید محمد محمود صاحب جعفری بی ایس سی عثمانیہ کی ان معلومات اور تجربوں کا نتیجہ ہے جو ان کو نشرگاہ لاسلکی میں کام کرنے اور موضوع سے دلچسپی رکھنے کی وجہ سے حاصل ہوئی ہیں۔ یہ ان کی پہلی کوشش ہے اور اس میں انھوں نے لاسلکی کے تحصیلی آلات استعمال کرنے والوں کے استفادہ کے لئے ضروری معلومات کو قلمبند کردیا ہے۔

کتاب کی زبان سلیس ترتیب علمی اور کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے سائنسی اور فنی مضامین کو سمجھانے کے لئے نقشوں کی بیحد ضرورت ہے اور خوشی کی بات ہے کہ جعفری صاحب نے اس کتاب میں بیسیوں مفید نقشے بھی شامل کردیئے ہیں۔

شعر العرب یہ کتاب ادارۂ ترقی تعلیم اسلامی حیدرآباد دکن کی چوتھی کڑی ہے اس کے مصنف مولوی فاضل حکیم ہبتہ اللہ صاحب استاد نظامیہ طبی کالج ایک مشہور علم دوست ہیں۔ جن کو شاعری اور تصنیف و تالیف کا اچھا ذوق ہے۔ زیر نظر کتاب میں انھوں نے عربی شاعری سے اہل اردو کو واقف کرانے کی کوشش کی ہے۔ ایک عرصہ قبل وحید الدین سلیم مرحوم نے بھی عربی شعرا و مصنفین کے تخیلات و رجحانات سے اہل اردو کو مانوس کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہبتہ اللہ صاحب نے عربی شاعری کے مختلف دوروں کی تاریخی

اہمیت اور خصوصیات کے بیان کے ساتھ ساتھ اچھے شعراء کے کلام کے نمونے اور ان کے ترجمے بھی پیش کئے ہیں۔ یہ ایک مستحسن کوشش ہے اور ضرورت ہے کہ اس موضوع پر زیادہ شرح و بسط کے ساتھ لکھا جائے۔

درس قرآن مرکزی سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور کی طرف سے ایک پرچہ ایمان شائع ہوتا ہے۔ جس میں صرف درس قرآن کی ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں اور قرآن کا مقصد اور پیغام کی تشہیر کے لئے ان رسالوں سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ رسالے چھوٹی کتابی تختی پر شائع کئے جاتے ہیں تاکہ جو لوگ جلد بنانا چاہیں ان کو کتابی صورت میں منتقل کر سکیں۔

ایضاح سخن از تمنا عمادی پھلواروی یہ کتاب احمد علی شوق سندیلوی کی مشہور کتاب اصلاح سخن کی شرح ہے۔ اصلاح سخن میں وہ سولہ غزلیں (اور ان کے متعلق چالیس اساتذہ کی اصلاحیں اور خانگی تحریریں) شائع کی گئی تھیں جو جناب شوق نے مختلف اصحاب کے یہاں بغرض اصلاح روانہ کی تھیں اور ہر شخص یہی سمجھتا رہا کہ یہ غزل صرف میرے ہی پاس آئی ہے۔ اس طرح اس مجموعہ سے مختلف اساتذہ کی طبیعتوں کی افتاد اور انداز غور و فکر کی نسبت اہم معلومات شائع ہو گئیں۔ اور جب وہ مجموعہ شائع ہوا تو ادبی دنیا میں ایک دھوم مچ گئی چنانچہ سر علی امام مرحوم نے تمنا صاحب عمادی سے خواہش کی کہ وہ اس مجموعہ کی ایک مکمل شرح لکھ ڈالیں یہی شرح ایضاح سخن کے عنوان سے شائع ہوئی ہے اور ان لوگوں کے لئے قابل مطالعہ ہے جو شعر و سخن کا ناقدانہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

تبویب حیدری جدید اصولوں پر کتابوں کی ترتیب اور فہرست سازی کے لئے اردو میں علوم و فنون کو تقسیم کرنے کی خاطر مولانا فضل اللہ احمد صاحب بی اے نے یہ رسالہ شائع کیا ہے۔ وہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد کے بانی و مہتمم ہیں اور یہ تبویب ان کے دیرینہ تجربات کا نتیجہ ہے۔ اس کے مقدمہ میں مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ناظم سررشتہ معلومات عامہ نے لکھا ہے کہ "یہ تبویب اتنی مفصل اور جامع معلوم ہوتی ہے کہ اردو زبان اور اس کا روز افزوں اور وسیع ذخیرہ اس میں بآسانی سما سکتا ہے۔"

توقع ہے کہ فضل اللہ صاحب کی اس کوشش سے اردو کے جملہ کتب خانے فائدہ اٹھائیں گے۔

ملا عبد القیوم یہ مجلۂ نظامیہ کا خصوصی شمارہ ہے جو مشہور عالم و فاضل اور قومی مصلح ملا عبد القیوم کی یادگار کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ اس کے ابتدائی اشعار مضامین نظم و نثر میں سے اکثر اس قابل ہیں کہ ان کا غور سے مطالعہ کیا جائے اور ان کے توسط سے حیدرآباد کی علمی و ادبی تاریخ کے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ملا عبد القیوم کے مفصل سوانح حیات کی ترتیب میں یہ یادگار نمبر بڑے اچھے مواد کا کام دیگا۔ اس کے مرتب مولوی ابوالخیر صاحب کنج نشین حیدرآباد کے ایک اچھے ادیب اور ذوق عمل کے متوالے ہیں توقع ہے کہ وہ اسی طرح علم کی ٹھوس خدمت انجام دیتے رہیں گے۔ مضامین کے انتخاب میں ہمیشہ احتیاط اور نکتہ رس ذوق سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ کا آخری مضمون کئی وجوہات سے اس قابل نہ تھا کہ ملا عبد القیوم جیسے محترم بزرگ کے یادگار نمبر میں شائع کیا جاتا۔ ۔ یہ مضمون [illegible] کی [illegible] اور پریشان دماغی کا بدترین نمونہ ہے۔ [illegible]

تمیج کی حویلی میں ہولی (بسلسلہ گزشتہ)

میں نے اردو کے لیے جو کچھ بھی کیا اسے جنگل کاٹنے اور علمبردار بننے سے تمیج نے تعبیر کیا۔ اچھا یونہی سہی۔ مگر اس جنگل کو کاٹنے اور علمبردار بننے کی کوئی دلیل بھی ہے یا یونہی۔ زیر بحث خامہ فرسائی کے جس حصے سے ذہن ادھر منتقل ہوا اصولاً اس کا حوالہ دینا تو لازمی تھا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور نہ کیا جا سکتا تھا اس واسطے کہ اس سرمائے میں کہیں اس کا شائبہ تک نہیں۔ تو اعتراض کیا ہوا علت و معلول کا ایک من گھڑت سلسلہ بن کے رہ گیا۔ ایسے ہی محل کے لئے کوئی سرپھرا شاعر کہہ گیا ہے:۔

جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

لیکن وہاں جسارت سوال پر لب لعلیں کی سرکار سے تلخی جواب کا جواہر از نصیب ہوا تھا۔ یہاں بیٹھے بٹھائے زحمت سوال کے بغیر ہی وہ دولت بے پایاں ہاتھ آگئی۔ زہے نصیب۔

یہ دولت صوب اگر علمبرداری کے لئے کی جاتی تو نوعیت تحریر اور طرز استدلال یہ نہ ہوتا بلکہ علمبرداری کے بلند آہنگ نعرے سے میدان سخن گونج اٹھتا۔ جا بجا اسی پندار کی برتری دکھائی جاتی اور جگہ جگہ اسی جذبہ خود نمائی کی توضیح کی جاتی۔ دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ جس کام میں تھوڑی بہت محنت اٹھانا پڑتی ہے انسان اسے بہت عزیز رکھتا ہے اور موقع بے موقع اس کی تحسین و ستائش سے کبھی نہیں چوکتا۔ نئے نئے ڈھب سے اس کی خوبیاں ذہن نشین کرانے کی سعی کرتا اور کبھی بھولے بھٹکے بھی ہر جانب سے اپنے اس کارنامے کی برتری و خوبی کے خلاف ایک حرف تک نہیں سن سکتا۔ لیکن جہاں کوئی حرف بیجا بھی [illegible] کی خامیاں اور اس کے نقائص کا باب

اعلان کیا جا چکا ہو۔ کھلم کھلا اس طرز کی ناکارگی، بے بضاعتی اور بے سر و پائی کی تفصیلی داستان گوش زد کی جا چکی ہو۔ اس پر بھی کوئی نافہمی سے ہمارا روش تحریر کو علمبرداری اور مستقبل میں کسی جلب منفعت کی خود ساختہ علت قرار دے کر لفاظی اور حرف گیری کی ہولی کھیلنے لگے تو یہ بگڑا ہوا رنگ دیکھ کر بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے:۔

سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

بھلا اس ناتواں بینی کا کیا ٹھکانا ہے کہ پوری سعی و کوشش سے کوئی تمام ملک کے لئے ایک طرز جدید کا سرمایہ تقلید منظر عام پر پیش بھی کرے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی فرسودگی اور ناکارگی کا افسانہ بھی۔ متوسط تو متوسط کوئی معمولی سے معمولی دماغ بھی اسے کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ طرز جدید کی خامیوں کا اظہار ہی اس بات کی نمایاں دلیل ہے کہ اسے تقلید ملک سے کچھ واسطہ نہیں بلکہ اس آڑ میں کچھ اور ہی الم ہے جس کی توجہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ملک کو اسی راستے پر چلانا اگر مد نظر ہوتا تو اس کا اک رام کے سنسان اور بھیانک مناظر کو قوت بیان اور زور استدلال سے فردوس نظر بنا کے پیش کیا جاتا۔ حالانکہ معاملہ بالعکس ہے۔

زیر تذکرہ تحریر کے متعلق مختلف ماہناموں کے مدیران محترم اور احباب کرم گستر نے کئی سال ادھر جس طرح اظہار خیال کیا بخوف طوالت اس پوری بضاعت ستائش کا قلم انداز کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ناقدین اردو میں سے دو بڑے نقادوں کی رائیں یہاں نقل کئے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اس سے دیدہ ور مبالغہ انتزاع تحریر کی نوعیت کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ بزم علم و ادب کے مستند رکن ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی (صدر شعبہ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی) ۲۰ مارچ سنہ کے اپنے گرامی نامے میں اسی روش جدید کی نسبت جسے تمیج "دو علی کوشش"

سے تعبیر کرتا ہے، اس طرح رقمطراز ہیں :۔

۲۲ (الف) میور روڈ الہ آباد ۲۵ مارچ ۱۹۴۳ء

"جناب والا تسلیم .... شعر میں آرزو لکھنوی نے اپنی "خالص اردو" میں یہ التزام کیا ہے، نثر میں مولوی فدا علیخاں رام پوری نے ایک بنگالی قصے کے ترجمے "بس کا روکھ" میں اور آپ نے اپنی چٹھیوں میں کہ عربی، فارسی کا کوئی لفظ نہ آنے پائے اور سنسکرت یا کسی اور زبان کے بھی نامانوس لفظ نہ آئیں۔ یہ ایک خاص صنعت اردو ادب میں ہو گئی۔ اگرچہ تکلف سے خالی نہیں، پھر بھی بہت مفید ہے اور لکھنے والوں کے کمال اور زبان پر قدرت کا پورا ثبوت ہے۔ اس قسم کی تحریروں کو پڑھ کر اردو لکھنے والوں کو ترغیب ہو گی کہ وہ عام فہم لفظوں اور سہل ترکیبوں کو زیادہ کام میں لائیں، پڑھنے والوں کو دکھائی دے گا کہ ہماری زبان کیسی وسیع ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے جس بات کی توضیح فرمائی، سچ تو یہ ہے کہ مراسلہ طرازی اختیار کرتے وقت رفع نزاع کے سوا اور کوئی چیز چشم خیال کے سامنے رہی نہ تھی۔

جناب محترم مولوی محمد عنایت اللہ صاحب دہلوی (سابق ناظم سررشتہ تالیف و ترجمہ، حیدرآباد دکن) جن کی ذات گرامی ایوان علم و ادب کی منزلت صدارت پر فائز ہے اور تربیت و فروغ اردو کے لحاظ سے موصوف کی،۔

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

ان سے بڑھ کر زبان و بیان کا نبض شناس اور کون ہو سکتا ہے۔ ۱۴ مارچ ۴۳ء کے ایک الطاف نامہ میں تحریر فرماتے ہیں :۔

نیمی روڈ، ڈیرا دون ۱۴ مارچ ۱۹۴۳ء

"جناب مکرمی تسلیم ....

....

مارچ کے "ساقی" میں آپ کا مضمون دراصل ساقی کی جان تھا۔ چونکہ آپ نے اپنے نام کے ساتھ اپنا تخلص سرود نہ تحریر کیا تھا اس لئے ذہن آپ تک منتقل نہ ہو سکا۔ گو کہیں کہیں نکہت حیدرآباد محسوس ہوئی۔

آپ کا مضمون بالخصوص الفاظ کی وہ فہرستیں جو اپنے دعووں کے ثبوت میں پیش کی ہیں ایک مدت کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ ایسے سرمائے کہیں لکھے لکھائے یکجا نہیں ملا کرتے۔ مضمون میں آورد کی شان کہیں کہیں معلوم ہوئی۔ مگر خود میرے کان ترجمے کرتے کرتے اور پڑھتے پڑھتے ایسے نہ رہے کہ میں مانوس اور غیر مانوس کو مانوس سمجھنے میں صحیح صحیح تمیز کر سکوں۔ یہ مضمون آپ کا ہر لحاظ سے بے مثل ہے۔ اگر اس کو ہندی میں لکھوا کر اور چھپوا کر شایع کریں تو ممکن ہے ہندوؤں کی نظر اس پر پڑے اور گاندھی مہاراج تک اس کی نوبت آئے۔ ورنہ یہ بزرگ کب متوجہ ہوتے ہیں۔

میرے ایک دوست سید سجاد حیدر صاحب جو مجھ سے کہیں زیادہ اردو زبان کے پرکھنے والے ہیں وہ بھی آپ کے اس مضمون کی بہت تعریف کرتے تھے۔"

پھر ۱۶ جنوری ۳۶ء کے ایک نوازش نامہ میں یہ تحریر فرمایا۔

"مانوس فارسی اور عربی الفاظ کو ترک کر کے کچھ لکھنا اردو والوں کے لئے ایک مصیبت ہے۔ آپ نے اپنی تحریر کا زور اسی طرح دکھایا ہے۔ اور ثابت کر دیا کہ اردو میں اتنی طاقت ہے کہ وہ عربی، فارسی الفاظ سے اور غیر مانوس سنسکرت الفاظ سے بچ کر بھی اپنا مطلب ہر قسم کا ادا کر سکتی ہے۔ آپ کی محنت اور مہارت اور قدرتِ کلام پر جو معترض ہو وہ کافر رہے وہ لوگ جن کو آپ نے اپنا مخاطب بنایا ہے ان سے اس وقت بحث نہیں۔ کیونکہ وہ ان چیزوں کو محض اپنے سیاسی خیالات کی ترویج کا ایک آلہ سمجھتے ہیں۔ جیسے اردو زبان کی بحث سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔

مجھے تو آپ کی محنت پر حیرت ہوتی ہے کہ کیسے کیسے چیدہ الفاظ لائے ہیں اور پھر بھی مطلب کے ادا کرنے میں فرق نہیں ہونے دیا۔ اردو کی اس طاقت کا ثابت کرنا ہر شخص کے لئے آسان نہ تھا۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ سوائے آپ کے دوسرے کے لئے ناممکن تھا۔"

اس کے بعد کے ایک اور التفات نامہ میں تحریر فرمایا کہ:۔

"ساقی میں میں نے آپ کا مضمون از اول تا آخر پڑھا۔ بغیر آپ کا نام دیکھے مضمون پڑھنا شروع کر دیا کہ دفعتاً خیال آیا کہ مضمون آپ کا ہے۔ نام دیکھا تو خیال صحیح نکلا۔ نہایت خوب مضمون لکھا ہے اور بڑی تحقیق سے لکھا ہے۔ اسے پڑھ کر نئی معلومات پیدا ہوئیں ارادہ تھا کہ پھر ایک مرتبہ پڑھوں گا۔ لیکن کوئی صاحب میز پر سے پرچہ اٹھا لے گئے اور محروم رہا۔

آپ کا جدید طرزِ تحریر ایسا ہے کہ اس کی تقلید کسی دوسرے سے قطعی ممکن نہیں۔ مگر پھر بھی ڈر لگتا رہتا ہے کہ کہیں لوگوں میں اس طرزِ تحریر کی نقل اتارنے کا شوق نہ پیدا ہو جائے۔ کیونکہ میری ناقص رائے میں اگر ایسا ہوا تو اردو کو نقصان پہنچے گا۔ گو اس کی قوت ادا مسلم ہے۔ مگر وہ عام پسندیدہ طرز جو دل کو بھاتا ہے، اس میں فرق آجائے گا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اردو نہیں ہے۔ میں ذاتی طور پر اس خیال کو غلط سمجھتا ہوں۔ اردو ہے اور لاکھ میں اردو ہے۔ مگر انوکھے طریقے کی ہے۔

میں نے آپ کا مضمون ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ پڑھا اور ہر مرتبہ تعجب کیا کہ اردو میں ایسی وسعت، پھر دلائل میں اتنی مضبوطی ایسی زبان میں کیونکر پیدا کر لی۔"

ایسے ہی کئی اشفاق نامے اور بھی ہیں جن کے اقتباسات کی اس مختصر مضمون میں گنجایش نہیں۔ اس امر کی تصریح بھی نہیں مناسب معلوم ہوتی ہے کہ "ٹھیٹ اردو" کی نسبت پہلے پہل جناب موصوف ہی کے ٹوکنے سے مجھے اپنے خیال میں ترمیم کرنا پڑی۔ بہر طور مسلسل کئی برس تک میری سابقہ خامہ فرسائی کے خلاف ملک کے کسی گوشے سے کبھی کوئی صدا گوش زد نہ ہوئی۔ لیکن آج کافی مدت گزر جانے کے بعد ایک نئی بھنک کان میں پڑی اور اس لئے وہ عجیب تر معلوم ہوئی کہ جو کچھ کہا اسے ثابت نہ کیا جا سکا۔ علمی اور ادبی بحثیں مذہبی احکام خداوندی تو ہیں نہیں کہ انھیں ماننے بغیر

کوئی چارہ ہی نہ ہو اور ان کے خلاف یونہی سی لب کشائی بھی کفر و الحاد کے قائل قرار دی جائے۔ اس بزم میں بے روک ٹوک ہر ایک آزادی سے اظہار خیال کر سکتا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ کچھ استدلال سے نابلد نہ ہو۔ برہان و دلیل کے معیار پر زر سخن کے کسنے اور پرکھنے کی مہارت رکھتا ہو۔ جو بات زبان سے نکلے وہ جچی تلی اور جو کہے اسے ثابت کر کے چھوڑے۔

نکتہ رس لوگ کوئی بات ایسی نہیں کہتے جس کے مطالبۂ ثبوت پر وہ دم بخود ہو کے رہ جائیں اور بر وقت کوئی دلنشیں توجیہ نہ کر سکیں۔ کسی بحث کے لئے اس وقت تک لب کشائی زیبا نہیں، جب تک اس سے عہدہ برآ ہونے کی قوت و قدرت نہ ہو۔ اس راہ میں قدم قدم پر دلیل و برہان سے کام پڑتا ہے۔ استواری استدلال کی بضاعت اگر پاس ہو تو گھڑی بھر میں خارزار کی پُرپیچ راہیں بھی بسہولت طے ہو جاتی ہیں اور اگر یہی سرمایہ پورا نہیں تو پھر دو قدم چلنا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ بحث کے معیار برتری کی نسبت استفسار کرنے پر کسی حکیم نے کہا تھا کہ صحیح استدلال کا استحکام ہی اس کی اصلی کسوٹی ہے۔ آداب بحث کے اصول معین کرنے والوں نے اس باب میں بڑی موشگافی اور کافی نکتہ آفرینی سے کام لیا۔ یہاں تک کہ راست بازی کی کم گوئی و کم سخنی کے سامنے چرب زبانی اور طلاقت لسانی کا زور بے بس ہو کے رہ گیا اور حساس طبیعتیں خصم سے غلط بات منوا کر بھی اطمینان حاصل نہ کر سکیں۔ عرفی شیرازی کی ندرت تخیل کا نتیجہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے :-

ستم زدۂ بقبولِ غلط وے　　　ورنہ بام از شکنجۂ طبع سلیم خویش

یعنی چرب زبانی کی بدولت غلط بات منوا کے حریف سے پیچھا چھڑا تو لیا لیکن طبع سلیم کے شکنجے کی وجہ سے طرفہ پیچ و تاب میں پھنس گیا۔ گویا ایک بلا سے بڑھ کر دوسری جان پر نازل ہو گئی۔ بحث کی مدت گھڑی بھر سے زیادہ نہ تھی مگر طبع سلیم کا شکنجہ قیام احساس تک عذاب جان بن کے رہ گیا۔ زیر بحث سرمایۂ تحریر کوئی راز مخفی نہیں۔ یہ سب کا سب کب کا منظر عام پر آ چکا۔ از سر نو اسے بہر وقت نظر کی عینک سے دیکھ لیا جائے اس لئے کہ نوعیت اعتراض سے سراسر لاعلمی اور ناواقفیت ہویدا ہے۔

جس طرح تکمیل تصویر کے لئے اس کے دونوں رخ ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح تقریر و تحریر کے واسطے بھی اس کے لفظی اور معنوی دونوں رخ نہایت اہم تسلیم کئے گئے ہیں۔ صحت الفاظ اور ان کی محل شناسی وغیرہ کی رنگ آمیزی تصویر تحریر کا پہلا رخ ہے اور دوسرا استدلال کی استواری و معنی خیزی۔ مگر جہاں ان دونوں میں سے کسی ایک کا بھی نشان تک نہ ہو تو اسے تحریر کہنا ہی کسی طرح درست نہیں۔ تبیج نے گنتی کی چند سطریں لکھیں لیکن تھوڑی سی جگہ میں بھی قدم قدم پر نقص محاورہ اور سقم لفظی کی ٹھوکریں کھائیں۔

ماہرین لسان بخوبی واقف ہیں کہ شاہراہ زبان ہمیشہ تقلید کے قدموں سے طے کی جاتی ہے اور اس راستے پر اگلوں ہی کے نقش قدم دلیل راہ کا کام دیتے ہیں۔ قیاس اور استدلال کے اوزار یہاں کچھ کارآمد نہیں۔ روز مرہ ہو یا محاورات اہل زبان انہیں استعمال کے سانچوں میں جس طرح ڈھال چکے اس سے اب سر مو تجاوز نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر " محاورات " ہی کو دیکھئے۔ جن کی بنیاد اکثر و بیشتر استعارے کی سرزمین پر رکھی جاتی اور الفاظ کے مجازی معنوں سے یہ جادو جگایا جاتا ہے۔ جیسے :-

قسم کھانا، پچھاڑیں کھانا، جی اٹھنا، جی بٹنا، تین پانچ کرنا، کان ہلانا، پھونک پھونک کر قدم رکھنا وغیرہ یہ سب محاورے

ہیں اور ان میں کسی قسم کا تصرف نہیں کیا جا سکتا۔

اصول زبان سے ناواقف قیاس کو دخل دے کر قسم کھانا کے محل پر قسم چبانا، پچھاڑیں کھانا کے موقع پر پچھاڑیں نکلنا، جی اچٹنا کی جگہ جی پھسلنا، جی ٹنگا کے مقام پر جی پھیلنا، تین پانچ کرنا کے بجائے دس بارہ کرنا، کان نہ ہلانا کے محل پر کان نہ چھونا، پھونک پھونک کے قدم رکھنا کی جگہ پھونک پھونک کے پنڈلی رکھنا لکھنے لگے تو اس ناواقفیت پر جاننے والے کیا کہیں گے؟ تو یہ امر مسلم ہے کہ محاورات میں کسی طرح کی تبدیلی اہل ادب کو پسند نہیں۔ "پھونک پھونک کے قدم رکھنا" بندھا ہوا محاورہ ہے جس میں کسی ترمیم کی گنجایش ہی نہیں نکل سکتی۔ مگر تیج کی ناشناسی، محاورے کو مسخ کر کے "پھونک پھونک کے رکھے ہوئے شبد" لکھوا رہی ہے۔

اردو میں جمع کے عربی اوزان یا اس کی خود بنائی ہوئی جمعیں روزمرہ کی بات چیت اور لکھنے لکھانے میں برابر استعمال کی جاتی ہیں۔ تحقیق سے "تحقیقات" "مسلمات" کے وزن پر عربی جمع ہے۔ اسی لفظ کی اردو جمعیں جیسے تحقیقوں، تحقیقیں بھی عام طور پر اردو میں مستعمل ہیں۔ لیکن عربی جمع پر اردو جمع کے واؤ، نون کا اضافہ کر کے جمع الجمع بنانا نہایت مضحکہ خیز بات ہے۔ تیج کی جدت پسندی اور اس کی تحقیق کی اعجوبہ زائی عربی جمع میں اردو جمع کا واؤ، نون بڑھا کر صحیح لفظ "تحقیقات" کو "تحقیقاتوں" بنانے بھی نہیں چوکتی۔ اس معیار سے تو سیکڑوں، ہزاروں الفاظ بن کر حشرات الارض کی طرح پھیل سکتے ہیں جیسے واقعات سے واقعاتوں، حادثات سے حادثاتوں، اصطلاحات سے اصطلاحاتوں، حالات سے حالاتوں اور سیاسیات سے سیاسیاتوں وغیرہ۔

اس ہمہ دانی پر پندار تحقیق کا یہ عالم ہے کہ سبحان اللہ۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:-

"اردو میں عموماً "بول" گیت کے ٹکڑے اور بھاشا برج بھاشا کو کہتے ہیں۔"

دیکھیے ایک سانس میں دو باتیں کہیں مگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اصلیت و واقعیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اردوئے معلیٰ نے اس لفظ کو ایک ہی معنیٰ میں محدود نہیں کیا بلکہ اس کی وسعت اور پھیلاؤ کو بہت آگے بڑھایا۔ ناواقفیت سے اس کی وسعت لفظی کبھی گھٹ نہیں سکتی۔ اہل زبان کے نزدیک "بول" کے معنے ہیں:-

۱۔ بات، قول، کلمہ، کلام ۲۔ گیت کا ٹکڑا، ۳۔ انترہ، طعن وطنز وغیرہ کے اب یہ لفظ اور اس کے مشتقات ملاحظہ طلب ہیں:

بول، بول اٹھنا، بول جانا، بول نہ سکنا، بول پڑھنا، بول بول کے تھکنا، بول چال، بول بالا ہونا، بول بالا رہنا، بولنے پر آنا، بولنا چالنا، بڑا بول، بڑا بول بولنا، دھاوا بولنا، ایک ایک بول نقش ہونا، دو بول پڑھانا، دو بول آنا، دو بول دینا، طبلے کے بول، ستار کے بول وغیرہ وغیرہ۔

بول:- (رشک)　باتیں وہ کر رہا ہے کہ سارنگیوں کے بول
　　یہ ساز میں صدا ہے نہ یہ لطف راگ میں

بول اٹھنا:- (امیر)　امیر اس ناز سے ظالم نے دیکھا
　　نگاہیں بول اٹھیں وہ لے گیا دل

بول جانا:- (صبا)　بحث گریہ میں ابر بول گیا
　　دیدۂ اشکبار کیا کہنا

بول نکلنا:- (ناسخ)　اس طرح بول نکلتے نہ سنے تھے ہم نے
　　کرتی ہے صاف صنم تیری ستاری باتیں

بول نہ سکنا:- خوف یا لحاظ سے کچھ کہہ نہ سکنا۔ جیسے یوں تو خوب باتیں بناتے ہو مگر وہاں کچھ بول نہ سکے۔

بول پڑھنا:- تمھاری تحریر کا تو ایک بول بھی پڑھا نہیں جاتا۔

بول بول کے تھکنا:۔ ہم بول بول کے تھک گئے مگر اسے خبر بھی نہیں۔
بول چال:۔ اس کی بول چال کا کیا کہنا۔
بول بالا رہنا:۔ بول بالا رہا سدا اپنا۔
بولنے پر آنا:۔ لحاظ اٹھا دینا، بیباکی سے گفتگو کرنا۔ جیسے
دیکھو اسے نہ چھیڑو، وہ بولنے پر آیا تو قیامت
برپا کر دے گا۔
بولنا چالنا:۔ تم نے تو بولنا چالنا بھی چھوڑ دیا۔
بڑا بول:۔ شیخی، غرور کا کلمہ، نخوت و تکبر جیسے بڑا بول نہ بولو۔
بڑا بول بولنا:۔ جیسے بڑا نوالہ کھائے اور بڑا بول نہ بولے۔
دھاوا بولنا:۔ اس نے اچانک دھاوا بول دیا۔
ایک ایک بول نقش ہونا:۔ تمھاری باتوں کا ایک ایک بول
دل پر نقش ہے۔
دو بول پڑھانا:۔ اس نے شربت کے پیالے پر دو بول پڑھوا دیے۔
دو بول آنا:۔ تمھیں دو بول کیا آ گئے کہ اب کوئی تمھاری ٹکر
ہی کا نہیں۔
دو بول دینا:۔ بڑا بد شوق ہے۔ آج کا سبق کیسا؟ کل گنتی کے
فقط دو بول دیے تھے وہ بھی ابھی تک یاد نہیں۔
طبلے کے بول:۔ تمھارے ہاتھ سے ابھی طبلے کے بول صاف
نہیں نکلتے۔

آپ نے دیکھ لیا ایک بول میں سے کتنے بول نکلتے چلے آئے۔
کیا اب بھی "بول" کے معنی گیت کے ٹکڑے ہی میں محدود رہیں گے؟

سچ تو یہ ہے کہ تبیج کی بولی کا ایک ایک بول زعفران
زار کشمیر سے کسی طرح کم نہیں۔ "بول" کی ناپ تول کے بعد اب
"بھاشا" کی باری ہے۔ ارشاد ہو چکا ہے کہ:۔ "بھاشا برج
بھاشا کو کہتے ہیں" بھلا کہاں بھاشا اور کہاں برج بھاشا۔
دونوں میں عام خاص کی نسبت نے امتیاز تمام کی حد کھینچ دی
ہے۔ "برج" کا لفظ خود اسی حد بندی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔
"برج بھاشا" کہتے ہی صرف برج کی بولی، متھرا، گوکل اور
بندرا بن وغیرہ ہی کی زبان مراد لی جاتی ہے۔ مگر بادۂ اعتراض
کے نشے میں اس حد بندی کو دیکھنے اور اصل بات کی تحقیق
کا ہوش کسے۔ اسی بے ہوشی میں بھاشا کو برج بھاشا سمجھ
لیا گیا۔ حالانکہ بھاشا عام ہے جہاں کی بھی ہو اور برج بھاشا
خاص اور مخصوص ہے برج ہی کے لئے۔ سنسکرت سے نکلی
ہوئی ہندی، بھاشا کہلائی جاتی ہے اور عام طور پر بھاشا
کے معنی مطلق زبان اور عام بولی کے لئے جاتے ہیں۔

برج کی قید لگانے سے بھاشا عام نہیں رہتی بلکہ متھرا
کے اس ضلع میں (جو ایک سو اڑسٹھ میل کے گھیرے میں گوکل،
بندرا بن وغیرہ کو گھیرے ہوئے کرشن جی کے جنم بھوم ہونے کا
شرف رکھتا ہے اور جہاں کی سلاست و فصاحت زبان تمام
ملک میں امتیازی درجہ رکھتی تھی) مقید ہو کے رہ جاتی ہے اور
یہ قید کچھ اسی کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ ابتدا سے ہر ایک متمدن
ملک کی زبان اپنی لطافت و شیرینی، سلاست و فصاحت کی
شہرت کے لئے سارے ملک میں سے کسی ایک مقام کو منتخب
کرتی رہی ہے۔ تو اس مختصر توضیح کو پیش نظر رکھنے سے بھاشا
برج بھاشا نہیں ہو سکتی۔ بھاشا عام رہے گی اور برج
بھاشا خاص۔ ناواقفیت عام، خاص کو ملا کر ایک کر دینا چاہتی
ہے۔ مگر اس کے چاہنے سے باہمی امتیاز کی حد بندی کیسے
ٹوٹ سکتی ہے۔

ابھی اسی تبیج کی کرم فرمائی کا کچھ ضمیمہ بھی باقی ہے۔
جیسے چاہیے:۔ سعدی از دست خویشتن فریاد، کی
روداد تصور فرمائیے یا اونچی دکان اور پھیکا پکوان۔ چونکہ
یہ بحث ایک دلچسپ حیثیت رکھتی ہے اس بنا پر نظر انداز نہیں کی

جاسکتی۔ چمن زار اردو کی بالیدگی و نکہت انگیزی کے لئے تمام ملک میں
انفرادی و اجتماعی جتنی بھی کوششیں ہوئیں۔ ان میں "انجمن ترقی اردو"
سب سے پیش پیش ہے۔ سنہ ۱۹۰۳ء اس لئے ایک امتیازی حیثیت
رکھتا ہے کہ اسی سال انجمن کی داغ بیل پڑی اور اس کا سنگ بنیاد
رکھا گیا۔ پہلے پہل اس نوخیز انجمن کے فرائض معتمدی کا قرعۂ فال
شمس العلما مولنا شبلی نعمانی کے نام پر نکلا۔ ان کے مستعفی ہوجانے سے
کچھ دنوں تک مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی اس کے
نگران کار رہے۔ پھر اختیار معتمدی کی باگ مولوی عزیز مرزا صاحب کے
ہاتھ آئی۔ اور ان کے بعد حالیہ دور معتمدی کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے
نواب عماد الملک نے اس بزم کی کرسی صدارت کو زینت دی۔
پھر نواب مسعود جنگ مرحوم تا قید حیات نہایت انہماک سے فرائض
صدر نشینی ادا کرتے رہے اور اب اس صدارت کی زیب و
زینت ملک کے مایۂ ناز فرزند سر تیج بہادر سپرو کی ذات مجسمہ
صفات سے وابستہ ہے۔ گویا یہ ایوان علم و ادب نئے نئے
رنگ کی سات قد آدم تصویروں سے رشک نگارخانۂ چین بن
گیا ہے اور مختلف تصاویر کے خط و خال سے شاہد اردو کا الغائی
رنگ رعنائی و زیبائی ٹپکا پڑتا ہے۔

اگرچہ نکتہ چین طبیعتیں موجودہ دور معتمدی کو انفرادی
اغراض کی ریشہ دوانیوں اور شخصی پندار کی آلودگیوں سے
پاک و صاف نہیں سمجھتیں۔ لیکن بایں ہمہ اس ادارے کی عمومی
حیثیت بلحاظ نوعیت کار کافی اہمیت رکھتی ہے اور انصاف
یہ ہے کہ موجودہ دور معتمدی میں جو سرمایۂ فروغ اسے نصیب
ہوا۔ اس سے پہلے انجمن ترقی اردو نے کبھی اس کا خواب بھی
نہیں دیکھا تھا۔ بہرنہج اس ترقی پذیر انجمن کی آغوش تربیت
میں اس کے چھوٹے بڑے جتنے کچھ بچے کھیل کود رہے ہیں ان
میں "اخبار زبان" بلحاظ سن و سال سب سے چھوٹا اور نہایت
خرد سال شمار کیا جاتا ہے۔ مہینے میں یہ دو مرتبہ ذوق کی گلیاں
چھانتا ہوا ادھر سے ادھر جگہ جگہ سپاٹے لگاتا پڑا پھرتا ہے۔
نہ جانے پہلے ہی سے آپس میں کچھ ملی بھگت ہوگئی تھی۔
یا جیسے شوخ اور شریر بچوں کو نقل اتارنے کی لت پڑ جاتی ہے۔
اس نے بھی وہی تیج کی بولی بولی اور اسی کی دیکھا دیکھی پانچ
چھ برس ادھر کی روش تحریر پر جو محض نئی ہندی بنانے والوں
کی روک تھام کے لئے عارضی طور پر اختیار کی گئی تھی۔ تتلا تتلا کے
وہی راگ الاپا اور توتے کی سی آنکھیں پھیر کر ایک ہی سانس
میں یہ سب کہہ ڈالا:۔

"مولنا ابوالقاسم کی زبان سے ہندستانی کے جو نمونے
ہمارا معاصر پیش کر رہا ہے وہ نہایت عجیب و غریب
ہیں۔ ان کی بے عنوانیوں کا کچھ تذکرہ "ہماری زبان"
(۱۶ فروری) میں لاحظہ ہوا ہوگا۔ جو غرض اس کشمکش
کے اندر چھپی ہوئی ہے اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت
نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مولنا موصوف ایسی زبان
کبھی کبھی تفنن طبع کے طور پر یا وقتی ضرورت سے
لکھا کرتے ہیں۔"

("ہماری زبان" یکم مارچ سنہ ۱۹۴۱ء)

دیکھئے وہی تیج کے سے ہتھکنڈے ہیں اور وہی انداز کہ
نہ کوئی دعوی اور نہ دلیل بے سوچے سمجھے جو جی چاہا کہہ دیا۔ حداثت
سن سے یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ اس طرح کی خامہ فرسائی سے بات
آگے بڑھ کر کہاں تک پہنچے گی! سچ ہے لڑکپن میں ایسی اونچ
نیچ دیکھنے کا ہوش کہاں! اس کی پیدائش سے بہت پہلے اسی
کے مربی و خداوند مجازی کا نتیجۂ دست و قلم جو منظر عام کے کتب خانے
میں کب کا محفوظ ہوچکا ہے، شاید ابھی اس کے فرشتوں کو بھی
اس کی خبر تک نہیں۔ "رانی کیتکی اور کنور اودے بھان" کی

داستان چھپے چھپے ہوئے مدت ہو چکی، اسی داستان کے دیباچے
میں سیّد انشا کی ذہانت و ذکاوت کی روداد لکھتے لکھتے انجمن
ترقی اردو کے "قائدِ اعظم" اس کہانی کی روشِ تحریر کی نسبت
اس طرح دادِ سخن سنجی دے چکے ہیں :-

"یہ کہانی بھی ان کی جدت طبع کا نتیجہ ہے۔ اس میں
یہ التزام کیا ہے کہ فارسی عربی کا ایک لفظ بھی نہ
آنے پائے۔ جو دعویٰ انھوں نے کیا وہ پورا کر دکھایا۔
عربی فارسی کا ایک لفظ تک نہیں آیا اور پھر لطف
یہ ہے کہ آج کل کی سی ایسی ہندی نہیں کہ نہ سمجھنے
والا سمجھے اور نہ پڑھنے والا۔ اردو والا بھی سمجھتا
ہے اور ہندی والا بھی۔ زبان اور بیان دونوں
صاف ہیں اسی کا نام ہندستانی ہے۔"

(دیباچہ "رانی کیتکی" مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

اخبار زبان کو اپنے خانوادۂ اردو کی اس مربی و
محترم ہستی کے ملاحظہ میں یہی ناقدانہ تحریر پیش کر کے فوراً دریافت
کر لینا لازم ہے کہ اس رائے میں مرورِ ایام کی وجہ سے کسی
ترمیم یا حک و اصلاح کی گنجایش تو باقی نہیں۔ اگر ہے تو ممکنہ
عجلت سے رائے سابق میں تبدیلی کا اعلان کر دیا جائے تاکہ
بھولے بھٹکے ہوئے راہ راست پر آ سکیں اور اگر کوئی رائے
میں ضرورت ترمیم نہیں تو پھر سید انشا کے ایجادی طرز پر عقیدت
و احترام کے سہرے چڑھانا اور اسی طرز اختیار کرنے کے جرم
میں کسی متبع کو مورد نفوس قرار دینا کیا آئین دانشوری کا
حاصل یہی ہے۔ جب ایک ہی رنگ میں دونوں رنگے ہوئے ہوں
تو پھر اس یک رنگی میں دو رنگی کیسی۔

سید انشا نے اپنی شمشیر زبان و بیان کے جوہر دکھانے کے
لئے سوچوں کو تاؤ دے کر نئے ڈھب سے رانی کیتکی کی داستان
لکھ دکھا ڈالی۔ جسے حسن قبول نے سر پر رکھا اور عقیدت نے
آنکھوں سے لگایا اور میں نے اردو، ہندی جھگڑے کے شور و غل
سے عاجز آ کر ہندی کے صرف انیلے پچاریوں کا دھیان بٹانے
اور انھیں باتوں میں لگانے کے لئے وہی شاہراہ بمجبوری
اختیار کی جس کی داغ بیل تقریباً سو سوا سو برس ادھر ڈالی
جا چکی تھی۔ پھر، قدم قدم پر اس راہ کے نشیب و فراز، پیچ و خم،
حد بندی و ناکارگی وغیرہ کی آمیزش سے بھی کہیں زبان نہ رُکی۔
اور اس بارے میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔ حیرت ہے کہ اس پر
بھی بے شعوری کی تیوری چڑھی رہی اور ناواقفیت کی پیشانی کا
بل نہ گیا۔

اصولاً تو موجد اور متبع دونوں پر یکساں فرد جرم لگانا چاہیے
کیونکہ نوعیت کار کی یکسانی دونوں کو برابر کا مجرم بنا چکی۔ گر یہ برابری
بھی اس لئے درست نہیں ہو سکتی کہ موجد کے مرتبے سے متبع کا درجہ
ہمیشہ پست و فروتر مانا جاتا ہے۔ عظمت ایجاد کی برتری موجد کا
وہ مخصوص کارنامہ ہے جس میں مقلد اور متبع کا کوئی حصہ نہیں۔
البادی اظلم کا صحیح مصداق ذات موجد ہی قرار پا سکتی
ہے اور جدت طرازی کی بدعت کا سہرا اسی کے سر زیب دے سکتا
ہے۔ اور اگر کارنامۂ قدامت بدستور لائق پرستش و احترام ہے
تو پھر کیا "جرم ہمعصری" کی یہی سزا ہے؟ اور کیا شریعت دانشوری
میں اس گناہِ کبیرہ کی یہی پاداش رکھی گئی ہے؟

مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

اس موقع نے شاہجہاں آباد کا ایک عبرت خیز واقعہ یاد
دلا دیا۔ تمدن دہلی کا جان بلب بیمار جب سنبھالا لے رہا تھا
تو وہاں کی رونق اور چہل پہل ایسی ہی روز افزوں ہو چلی
تھی جیسے بجھنے سے پہلے چراغ بھڑک اٹھتا ہے۔ جا بجا
ارباب خرد کی نورانی صحبتیں، جگہ جگہ اہل کمال کی پر لطف

ہم بزمی، ان کی بذلہ سنجی و دقیقہ رسی، خودداری و وضعداری آپ اپنی نظیر تھی۔ بزم کملا میں سے ایک ایک فرد ندرتِ تخیل، لطافت و پاکیزہ خیالی کا سرچشمہ، دانش و فرہنگ کا مجسمہ، تہذیب و شائستگی سے گل بداماں، خوش طبعی و زندہ دلی میں بہار رنگ و بو کا کارواں، اور لٹتی ہوئی دلی کا دو بآخر مٹتی ہوئی عظمتِ تیموری کا دم واپسیں ایک ایسا بے نظیر سلسلہ تھا جس کے انمول جواہر کی چھوٹ آج تک کاشانۂ عقل و فرہنگ کے بام و در پر پڑ رہی ہے۔

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب، مولنا فضلِ حق خیرآبادی، مولنا مفتی محمد صدر الدین خاں آزردہ، مولوی عبد اللہ خاں علوی، مولوی امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن، شیخ ابراہیم ذوق، نواب مصطفیٰ خاں حسرتی، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر، سید غلام علی خاں وحشت وغیرہ وغیرہ یہی وہ لوگ تھے جن سے دلی دلی تھی اور انہی کی موشگافی رنگین نوائی اور سحر طرازی سے عروس دہلی کا سہاگ اور سنگار تھا۔ انہی کے دم تک یہ سہاگن رہی اور ان کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کا سہاگ اجڑ گیا اور رنڈاپے کی مصیبتیں اور نئی نئی آفتیں سر پر آ پڑیں۔

بزم تحقیق کی زیب و زینت جن باکمالوں کے دم سے وابستہ تھی۔ اُن میں مولنا آزردہ بڑے پائے کے لوگوں میں گنے جاتے تھے۔ ان کی سخن سنجی و سخن گستری مسلم تھی۔ لیکن پابندی وضع کا خیال جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ ایک دفعہ جو زبان سے کہہ دیا وہ کہہ دیا اب اس سے ہٹنا وضع داری اور خود داری کے منافی جانتے تھے۔ غالب مرحوم کا رنگ سخن ابتدا سے انہیں پسند نہ تھا۔ اس وضع داری کی یہ ادا دیکھنے کی ہے کہ مرتے دم تک کبھی بھولے سے مرزا صاحب کے نتیجۂ تخیل کی توصیف سے ان کی زبان آشنا نہ ہوئی۔ حالانکہ اکثر نادانستگی میں مولنا کو مرحوم کے کیفِ سخن نے خود رفتہ و بسمل بنا دیا۔ لیکن جب ہوش آیا تو روئے سخن بدل کر کہہ دیا کہ "اس میں مرزا کا کیا کمال ہے یہ تو ہماری پسند کے شعر ہیں"۔ مرزا صاحب کی سحر طرازی ناواقفیت میں انہیں مسحور کر کے جب خراجِ تحسین وصول کر چکی اس وقت الفاظ بالا مولنا کے منہ سے نکلتے تھے۔ تو غالب مرحوم کی جادو بیانی چپکے بیٹھے سنتے رہتے تھے۔ اگر اہل بزم میں سے کسی نے اظہار خیال کے لئے مجبور کیا تو یہ کہہ کے پھر خاموش ہو جاتے "کلام مربوط ہے مگر نوآموز کا معلوم ہوتا ہے" پھر اس سخن شناس کا یہ سکوت کسی عناد پر مبنی نہ تھا۔ مرزا غالب کے ساتھ آئے دن مولنا کا اٹھنا بیٹھنا ہنسنا بولنا رہتا ہی تھا۔ باہمی مراسم کی استواری کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ مرزا صاحب نے ان کی تعریف و توصیف میں ایک فارسی قصیدہ سپرد قرطاس کر دیا۔

ایک دن کسی تقریب میں نواب مصطفیٰ خاں حسرتی کا آستانہ سخن سنج باکمالوں سے معمور تھا۔ مرزا صاحب اور مولنا آزردہ بھی شریک بزم تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں میں اپنے فارسی دیوان کے چند اوراق پر کہیں غالب مرحوم کی نظر پڑ گئی۔ یہ تو بہتے دریا تھے ہی، وہ اوراق اٹھا کر مولنا آزردہ کی طرف دیکھا اور انکے چھیڑنے کے لئے سنجیدہ لہجے میں مولنا سے کہنے لگے۔ "دیکھئے کسی ایرانی سخن طراز نے کیا زبردست غزل کہی ہے" مولنا اس وقت اس چال کو نہ سمجھ سکے اور نئی غزل سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئے مرزا صاحب نے خاص انداز میں یہ مطلع پڑھا۔ شاہدِ معنویاں از شرع [illegible] جُست [illegible]
اس غزل کی ابتدائی کئی شعروں کی مولنا نے بہت تعریف کی۔ مگر پھر بعض قرائن سے تاڑ گئے کہ یہ متاعِ سخن مرزا کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ یہ خیال آتے ہی انھوں نے فوراً اپنا رنگ بدل دیا اور مسکرا کر فرمانے لگے "کلام مربوط ہے مگر نوآموز کا کلام معلوم ہوتا ہے" ابھی توصیف دور ابھی منقصت۔ اہل بزم اس دو رنگی پر بے اختیار ہنس پڑے۔ مرزا صاحب نے رنگ محفل دیکھا اور مولنا سے مخاطب ہو کے بہ آواز تعظیم یہ پڑھا۔

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

اس [illegible] نے تمام بزم تڑپ گئی اور مولنا آزردہ [illegible] منہ بند کر کے رہ گئے۔

سید ابوالقاسم سرور

سب رس کے دکن نمبر کو دیکھنے کے بعد

پندارِ حقیقت ہے جن کو دھوکے میں ہیں یاد نہیں افسانے — ہستی سے عدم کی منزل تک کچھ خواب ہیں کچھ افسانے ہیں
ماضی کی زباں سے سن ناداں، روداد حیاتِ فانی کی — یہ شہر یہ ایواں اور یہ چمن، آباد نہیں ویرانے ہیں
اگلے سے نہ اب آئینِ جنوں، پہلے سے نہ اب اندازِ سکوں — وہ بزم نہ وہ احساسِ دروں، وہ شمع نہ وہ پروانے ہیں
میخانہ کا در ہے آج بھی وا، اب بھی ہے چمن میں قہرِ ہوا — وہ پھول نہ وہ مستانہ ادا، ساقی ہے نہ وہ پیمانے ہیں
گردش میں ہیں اب بھی ساغرِ مئے، بیدار ہیں اب بھی نغمۂ نے — وہ مطربِ خوش گل ہے نہ وہ لَے، وہ رند نہ وہ میخانے ہیں

قانونِ تغیر جاری ہے ہر پست و بلندِ دنیا پر
تعمیرِ حیاتِ فانی ہے مبنی متلون اجزا پر
موجوں میں نمایاں ہے جنبش، اک جوش ہے سیلِ دریا میں
کچھ لوگ کھڑے ہیں ساحل پر، کچھ ڈوب رہے ہیں دریا میں

اب جن پہ اداسی چھائی ہے، ان کے بھی کبھی افسانے تھے — چلتے تھے طرب کے جام یہاں، آباد یہی ویرانے تھے
دنیا نے انھیں سناٹوں کو سرگرمِ تکلم دیکھا ہے — ان سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ کبھی اک نورِ تبسم دیکھا ہے
اک عمر یہیں، ہر بن برساتی گھنگور گھٹائیں چھائی ہیں — گایا ہے پپیہوں نے ساون، کوئل کی صدائیں آئی ہیں
خاشاک کے ان ڈھیروں میں کبھی کھلتی ہوئی کلیاں ہنستی تھیں — نغموں سے بھری راتیں تجھ پر! اے گردشِ دوراں ہنستی تھیں
اس خاکِ پریشاں سے برسوں، خورشید و قمر شرمائے ہیں — کچھ یاد ہے ان ویرانوں پر ایسے بھی زمانے آئے ہیں
اٹھی ہیں صدائیں نغموں کی، دن رات انھیں ایوانوں سے — آباد رہے ہیں یہ صدیوں عشرت کی رسیلی تانوں سے
موتی کی دمک تھی ذروں میں، پھولوں کی لچک تھی خاروں میں — انساں کے تصور کی جنت ملتی تھی یہاں گلزاروں میں
صدیوں سے ابھی تک دہرائے جاتے ہیں اسی کے افسانے! — جو خوابِ مکمل دیکھا تھا یہاں اس عبرتِ غم کی دنیا نے

اک نور سا تھا پیمانوں میں، اک حسن سا تھا میخانوں پر
لہراتے تھے عشرت کے پرچم ان اجڑے ہوئے ایوانوں پر

معمارِ قصرِ ہستی کے سوتے ہیں جو ان ویرانوں میں — اب جن کی حقیقت شامل ہے بھولے ہوئے کچھ افسانوں میں
کلمے سے ان ساونتوں کی گردوں کا جگر تھراتا تھا — یہ بڑھ کے قدم رکھتے تھے جہاں طوفانوں کا دل ہل جاتا تھا
اربابِ نظر بھی تھے ان میں، سرآمد عز و جاہ بھی تھے — ہاتھوں میں کھنچی تلواریں بھی، سینوں میں دلِ آگاہ بھی تھے

اٹھتی تھیں گھٹائیں باطل کی، گھر گھر کے گر چھٹ جاتی تھیں		اشرار کی ٹڈی دل فوجیں کائی کی طرح پھٹ جاتی تھیں
جب انکی نگاہیں اٹھتی تھیں، دنیا کی جبیں جھک جاتی تھی		پڑتی تھی اگر ابرو پہ شکن ہر فوجِ رواں رک جاتی تھی

ان کو بھی نہ چھوڑا گردش نے پیشانی ماہی بن کے رہے
جو لوگ طرازِ ہستی تھے وہ عبرتِ ہستی بن کے رہے

ہستی کا یہی آئین مگر خود رنگِ رخ ایام بھی ہے!		اس سعیٔ و عمل کی دنیا میں فطرت کا یہی انعام بھی ہے
گردش کے سہارے پر ملتی ہے ہر عہد کی شرح بے خبری		تکمیل کی جانب بڑھ جاتی ہے چندقدم، عقلِ بشری
اقوام میں جب ہوتا ہے بپا، ہنگامۂ جہل و نادانی		ہوتی ہے تغیر کے ہاتھوں، تعمیرِ حیاتِ انسانی

خود بینوں کے افسانے ہوں یا تذکرہ ہو فیاضی کا
اک درس ہے، اک ٹکڑا لیکن روداد حیاتِ ماضی کا

علی اختر

سوز و ساز

تکمیل سوز و ساز کئے جا رہا ہوں میں		دنیا کو درسِ شوق دیئے جا رہا ہوں میں
یوں عشق میں کسی کے جئے جا رہا ہوں میں		ہر اک نفس اک آہ کئے جا رہا ہوں میں
اللہ رے پردہ داریٔ وحشت کا اہتمام		دامن بہ قدر ہوش لئے جا رہا ہوں میں
تم بزم سے اٹھا تو رہے ہو مجھے مگر		تم کو بھی اپنے دل میں لئے جا رہا ہوں میں
دنیا اسیرِ وہم ہے اور زندگی فریب		حیران ہوں کہ پھر بھی جئے جا رہا ہوں میں
یہ ہے مآلِ شوق کہ دنیا سے اے ظفر		کچھ داغ، چند زخم لئے جا رہا ہوں میں

محمد مظفر الدین ظفر

حُبّ کا عمل

کہتے ہیں اثر اور ہر دل عزیزی خداداد یا خداساز ہوتی ہے اور یہ ہے بھی سچ. اس کی زندہ مثال میری زندگی ہے. بعض مرتبہ میں پہروں سوچتی ہوں لیکن یہ بھید سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر عزیزوں اور ملنے جلنے والیوں کے ساتھ میرے برتاؤ میں وہ کیا خاص بات کہ جس کو دیکھو میری صلاح کا متمنی اور اس پر عمل کرنے کا خواہش مند۔ میری سہیلیوں کا یہ حال کہ شام ہوئی اور جمع ہوگئیں۔ ذرا کچھ مشکل پیش آئی اور صلاح لینے کے لئے آن موجود ہوئیں۔ میرا سینہ سیکڑوں رازوں کا گنجینہ تھا۔ یہ سب کچھ میرے لئے تو دفع الوقتی اور دلچسپی کا بڑا ذریعہ تھا۔ رہا صائب الرائے ہونا تو حالت یہ تھی کہ کوئی صلاح پوچھے بلا سوچے سمجھے ایک رائے دیدیتی اب یہ کہ میری رائے کیوں ٹھیک ہوتی اور کس لئے صائب سمجھی جاتی تھی یہ مجھے خود نہیں معلوم اس کا فیصلہ تو وہی کریں جنھوں نے زبردستی مجھے ناصح مشفق بنا ڈالا۔

اس سلسلے میں ایک بڑا لطیف واقعہ یاد آگیا۔ اسے سن کر آپ کے لبوں پر اگر خفیف سی مسکراہٹ بھی آگئی تو میں سمجھوں گی کہ میری محنت ٹھکانے لگی. جن سہیلی کا تعلق اس واقعہ سے ہے وہ تو اپنی حماقت کی داستان کا یوں دہرایا جانا ہرگز پسند نہ کریں گی . بہت جلیں گی. خوب گالیاں دیں گی. خیر تو ہوا یہ کہ والد صاحب مرحوم کو میلاد شریف سننے اور منعقد کرانے کا بڑا شوق تھا۔ ہر سال ربیع الاول میں تو خاص اہتمام ہوتا تھا۔ میں بھی اس موقع پر بلائی جاتی تھی. اس سال بھی میلاد شریف دھوم دھام سے ہوا. نزہت نے اپنے خاص طرز میں پڑھا بھی کچھ اس طرح کہ سننے والے تڑپ اٹھے نزہت کی آواز کیا ایک جادو تھی جو دلوں کو مسحور کر لیا کرتی تھی سا تک اس کی ظاہری صورت. بس پڑھتے وقت بالکل جادوگرنی معلوم ہوتی تھی۔

بزم میلاد میں بہت سی نئی بیبیاں تھیں ان سب کے سامنے میری سہیلیوں نے میرا اتنا ذکر کر رکھا تھا کہ مزید تعارف کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ انھیں بیبیوں میں ایک جو بہت ہی کم سن تھیں اور حسین بھی، بڑے ہی غور سے بار بار میری طرف دیکھ رہی تھیں محفل کے ختم ہوتے ہی وہ میرے نزدیک آئیں بڑے تپاک سے ملیں گویا برسوں کی ملاقات تھی. مجھے بتایا گیا کہ ایک نئے ڈپٹی کلکٹر آئے ہیں یہ ان کی بیوی ہیں جنھیں مجھ سے ملنے کا غائبانہ بڑا اشتیاق تھا. چلو اس طرح ہماری اور عذرا کی دوستی ہوگئی۔ بہت ہی جلد گھل مل گئیں. اکثر اپنے گھر بلاتیں خود بھی بار بار ملنے آتیں اور کہا کرتیں کہ "آپ کی باتوں سے میرا غم غلط ہوتا ہے." یہ غم غلط ہونے کے فقرے پر میں بہت چونکتی. یہ صورت' یہ سن اور "غم" خدا کی پناہ. بھلا کوئی بھی یقین کرے گا. بعد میں نزہت' ثروت اور شکیلہ نے بتایا کہ بیچاری کی خانگی زندگی اچھی نہیں ــــ مجھ سے صلاح لینے کی متمنی ہیں.

یہ پہلا موقع تھا کہ میں سوچ میں پڑ گئی اور اپنی سہیلیوں سے کہا کہ خدا کے لئے تم ہی انصاف کرو. میاں بیوی کا جھگڑا اور صلاح. بھلا میں کیا صلاح بتاؤں گی مگر یہ تینوں ایسی شیطان. بھلا ماننے والی تھیں. ان کو تو ہنسنے ہنسانے کے لئے ایک نیا مشغلہ روز چاہیئے تھا. بھولی عذرا سے کرید کرید کر ایک ایک بات پوچھتیں اور پہروں ہنستیں. اب جو قریب ایک سال بعد مجھ سے ملی تھیں تو شرارت اور نزہت و سعل پر تھی. روز کچھ نہ کچھ کرتی رہتیں. ایسی شرارت کہ شیطان کو بھی نہ سوجھے.

الغرض ہوا یہ کہ ایک روز اپنی مصیبتوں کا حال عذرا نے رو رو کر سنا ہی ڈالا اور بڑی مسکین صورت بنا کر صلاح پوچھی۔ سب لڑکیاں اصلاح اور وہ بھی ایسے نازک معاملے میں۔ نہ کبھی پہلے کی ملاقات نہ طبیعتوں سے واقف نہ حالات سے آگاہ۔ الٰہی میں کیا صلاح بتاؤں اور کیسے صلح کراؤں۔

"بہن راستہ چلتوں سے ایسے نازک معاملات میں صلاح نہیں لیا کرتے" تھوڑے توقف کے بعد میں نے کہا۔

"نہیں عذرا۔ یہ ضرور صلاح دیں گی۔ ان کی تو عادت پہلے ذرا خوشامد کرانے کی ہے ہی" نزہت نے شرارت سے کہا۔

شکیلہ بولی "عذرا تم ہمت نہ ہارو صلاح تو ان کو بتانا ہی پڑے گی۔" "بہت دنوں کے بعد آئی ہیں تو ذرا غمزے کرنے لگی ہیں" ثروت نے ایک اور چرکا دیا۔

ان تیر و نشتر جیسے فقروں کی تاب نہ لا کر میں نے آخر آٹھ روز کی مہلت مانگی لیکن کثرتِ رائے سے تین روز غور کرنے کے لئے ملے۔ بھلا جس کے سر پر نزہت، ثروت اور شکیلہ جیسی تین جن پریوں کی صورت میں مسلط ہوں اسے کہاں نجات مل سکتی ہے۔ کم سے کم تمام دن تو ان سے نجات نہ تھی۔ صبح ہوئی اور وہ اپنے اپنے گھر کے ضروری کاموں سے فارغ ہو وارد ہو جاتیں۔ یا تو میرے ہی پاس تمام دن کے لئے جم جاتیں یا پھر کہیں پک نک، ٹی پارٹی کے لئے نکل کھڑی ہوتیں اور مجھے بھی پکڑ لے جاتیں۔ اس طرح یہ تینوں جب شرارت پر اتر آتیں تو شوہر سے بچوں سے گھر سے بلکہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو جاتیں اور اب تو شرارت یوں بھی نعدوں پر تھی کہ انھوں نے بے وقوف بنانے کے لئے اپنے ساتھ بھولی عذرا کو بھی لگا لیا تھا۔ یادش بخیر! وہ بھی کیا زمانہ تھا کیا دن تھے۔ کیا راتیں ــــ

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہیں کی یاد میری زندگی ہے

کہنے کو تین دن تھے۔ اتنے عرصے میں اگر انسان کا دماغ صحیح ہو تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اتفاق کہ ہر چند دماغ پر زور ڈالا۔ رات دن سوچتی رہی مگر کوئی تدبیر سمجھ ہی میں نہ آئی۔

واقعہ یہ تھا کہ عذرا اور اس کا شوہر دونوں بیجا ضد اور ہٹ دھرمی کی بدولت ایک دوسرے کو تباہ کر رہے تھے۔ دونوں تکلیف میں تھے اور اس تکلیف کا ازالہ "اس مشکل کا حل" "خود کردہ را علاجے نیست" کے مصداق ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ تھا۔ تریاہٹ کے ساتھ مردہٹ بھی مل گئی تھی۔ ڈپٹی صاحب کو غرور تھا شوہر ہونے کا، خدائے مجازی ہونے کا، اپنی اعلیٰ ملازمت کا، دولت کا۔ عذرا کو ناز تھا اپنے حسن پر، مذہبی تعلیم پر، اپنے حافظ قرآنی ہونے پر دونوں کی ضد جہالت کی ضد تھی اور اس وقت مجھے سابقہ کرنا تھا ہٹ دھرمی سے ضد سے پڑھی لکھی جہالت سے۔ صورت حالات میرے لئے سخت تھی اور بہت سخت تین شبانہ روز کی کاوشوں کا نتیجہ یہ الفاظ تھے جو میں نے عذرا سے کہے۔ "عذرا میں تمہارے لئے کچھ بھی رائے قائم نہ کر سکی۔"

بیچاری عذرا بڑی امیدوں سے آئی تھی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ سچ البتہ انسان جگنو کو شرارہ سمجھنے لگتا ہے اور اسی امید موہوم سے اپنے قلب حزیں کو تسکین دے لیتا ہے ــــ مگر ــــ جب اس کی یہ موہوم سی امید بھی اس کا ساتھ چھوڑ دے، جب اس پر جگنو کی اصلیت آشکار ہو جائے۔ اُف! قلب مضطر کے لئے اس سے برا وقت کوئی بھی نہ ہوگا۔

عذرا کی مایوسی کی انتہا نہ تھی ــــــــ

"آپا تم میرے لئے حبِ کا عمل کسی حال سے کرا دو۔"

اس نے انتہائی بے تکے پن سے بہت مجھ سے کہا۔

"ہاں! حُبّ کا عمل" میں نے نہایت اطمینان کے ساتھ اس تبرک سہ لفظی فقرے کی تکرار کی۔

اب میرا دماغ روشن تھا۔ میری نظروں میں ہر چیز صاف تھی۔ "حب کا عمل، واقعی یہ عمل مجھے بہت اچھا آتا ہے" میں نے عذرا کو اطمینان دلایا لیکن عذرا۔ یہ ہے بہت مشکل کام تمھیں میرے کہنے پر حرف بہ حرف عمل اور میری ہدایتوں پر قدم بہ قدم چلنا پڑے گا۔ تم سے یہ سب ہوتا نظر نہیں آتا۔

"آپا غم گھن کی طرح مجھے لگ چکا ہے۔ زندگی بے کیف ہوگئی، دنیا اور دنیا کی کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگتی۔ میں بدنصیب اس وقت بھی آپ کا کہنا نہ سنوں گی تو پھر کب سنوں گی" عذرا نے بسورتے ہوئے کہا۔

عذرا اپنی بربادیوں کی داستان رو رو کر سنا رہی تھی اور میرا دماغ اس کے لئے شاہ راہ عمل یا اسکیم بنانے میں مصروف تھا۔ بار بار وہ میرے خیالات کے دلچسپ سلسلہ کو اپنی باتوں سے توڑ توڑ دیتی تھی جس سے میرے دماغ پر بڑا بار پڑ رہا تھا۔ کیونکہ اس کی اس وقت کی باتوں میں سوائے حماقتوں کے دھرا ہی کیا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اسے اس وقت رخصت کردوں۔

"عذرا دیکھو تمھیں میرے پاس آئے خاصی دیر ہوگئی۔ ڈپٹی صاحب کے کچہری سے آنے کا وقت ہے۔ اب سدھارو۔ جاکر ان کے ناشتہ چاء وغیرہ کا بندوبست کرو" میں نے اس سے کہا۔

"اے آپا۔ میں کیا خاک "ان کے" لئے کچھ کروں۔ "وہ" میری صورت دیکھنے کے تو روادار نہیں۔ گھر میں قدم رکھتے ہی سرکاری کاموں کی جھنجلاہٹ۔ سارے دن کی تھکن کا غصہ آتا ہے تو غریب بیوی کی جان ہے۔ کوئی بات خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ میری تو ہر ایک بات "انھیں" بُری لگتی ہے۔ میرے لباس سے نفرت بات بات پر نکتہ چینی، گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے، بچے بُرے لگتے ہیں، نوکر تو ان کی صورت سے ڈرتے ہیں۔ کبھی ہنسنا بولنا تو جانتے ہی نہیں۔ بس صُمٌّ بُکمٌ کا مضمون ہے۔

"بس کرو عذرا" میں نے اکتا کر کہا۔ "اسی پر کہتی تھیں کہ کہنے پر عمل کروں گی"

"نہیں آپا۔ میں نے تو صرف واقعات کا اظہار کیا اور آپ کا کہنا تو میرے سر آنکھوں پر۔ آپ جیسا کہیں گی کروں گی۔ للہ بتائیے بھی کہ گھر جاکر کیا کروں" عذرا نے شرمندہ ہوکر کہا۔

"دیکھو عذرا۔ کل سے میرا عمل شروع ہوگا" میں نے جواب دیا۔ "اور کل ہی سے تمھیں میری ہدایات پر عمل بھی کرنا پڑے گا۔ آج کا دن تو خیر کسی طرح گزار لو۔ کل صبح اٹھ کر غسل کرکے صاف کپڑے پہننا خوشبو لگانا گھر صاف رکھنا۔ ایک دو کام ڈپٹی صاحب کے تم اپنے ہاتھ سے کرنا اور وہ بھی اس طرح کہ ان کی نظر تم پر پڑے اور وہ دیکھ لیں اور ہاں اگر تکلیف نہ ہو تو ایک آدھ چیز اپنے ہاتھ سے تم ان کے لئے پکا بھی لیا کرو اور جہاں تک ممکن ہو ہر وقت بشاش اور خاموش رہو۔

اتنے سخت احکامات سننے کے لئے عذرا بالکل تیار نہ تھی۔ اس کے غرور کو ٹھیس لگی اور اس نے اس طرح منہ کھولا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن میں نے فوراً یہ کہہ کر اس کی زبان بند کردی۔

"سنو عذرا۔ یہ سب ہدایتیں اس لئے ہیں کہ عمل کے نتائج

میں تم صاف ستھری رہو تاکہ موکل کو آسانی ہو۔ کھانا پکانے کی
ہدایت یوں کی ہے کہ اگر اس طرح کام نہ چلا تو شاید ڈپٹی صاحب
کی غذا میں کچھ ملانا پڑے اگر تم خود پکاؤ گی تو پڑھا ہوا نمک
یا شکر یا سانی ملا سکو گی اور نوکروں تک کو خبر نہ ہو گی۔ تم بڑی
واہیات ہو۔ تم نے تو میرا دماغ چاٹ لیا۔ اگر یہی حالت رہی
تو عمل کے ختم ہونے کے قبل ہی میرا خاتمہ ہو جائے گا۔"
"اے خدا نہ کرے آپا نصیب دشمناں" کہتی ہوئی
نئی امیدیں اور ذمہ داریوں کا بوجھ لئے ہوئے عذرا کچھ ہنستی
ہوئی کچھ گھبرائی ہوئی رخصت ہوئی ——

عذرا کے سر سے باپ کا سایہ بچپن ہی میں اُٹھ چکا تھا۔
دادا کو ابا جان کہتی تھی۔ دادا ہی نے پرورش، تعلیم و تربیت
کی اور اس طرح کی جیسی کہ سو برس پہلے کے بچوں کی ہوا کرتی
تھی۔ شوہر لباس میں 'گفتار میں'، رہائش میں طرز جدید کے
دلدادہ۔ بیوی ان سے ایک صدی پیچھے۔ دونوں میں
بعد المشرقین بھلا زندگی خوش گوار کیسے ہوئی۔ پھر اس پر
ضد اور ہٹ دونوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی۔ ڈپٹی
صاحب کی بڑی تمنا تھی کہ بیوی نئے طرز کے لباس میں ملبوس
نظر آئے لیکن تربیت کا اثر اور ابا جان (دادا) کا خوف'
عذرا اپنی پرانی وضع کو اب تک نباہ رہی تھی۔ شوہر کی تمناؤں
کا' آرزوؤں کا خون اس کے لئے پرکس سے زیادہ اہمیت
نہیں رکھتا تھا۔ ابا جان کو ناراض کر دینا البتہ ایسا گناہِ عظیم
تھا جو اس کے نزدیک خدا کے حضور میں قابلِ معافی نہیں
ہو سکتا تھا۔ قیمتی لباس ہفتہ میں ایک بار بدل لیا۔ اس بات
سے شاید اس کے دل کو تسکین رہتی تھی کہ لباس خواہ کتنا ہی
میلا کیوں نہ ہو' ہے تو ریشمی اور قابلِ قدر۔ اس پر طرہ'
سردی کے موسم میں وہ کمخواب کی روئی کی صدری' جو نہ
دھل سکے نہ صاف ہو سکے۔ بدستور شبانہ روز ہمدم و دمساز
خواہ وہ کتنی ہی میلی ہو جائے۔ گرگٹ کی طرح کتنے ہی رنگ
بدل ڈالے۔ ہے تو کمخواب کی۔ چوٹی کا نشان اس پر۔ گلے کے
میل کی تہ اس پر۔ کہیں جانے کے وقت اور کپڑے بدل لئے
لیکن یہ صدری اس وقت بھی ساتھ نہیں چھوڑتی۔ بہت
کیا اوپر سے ایک قیمتی کرتہ اور پہن لیا۔ ابا جان کے خوف سے
نہ تو وہ ساڑی پہن سکتی تھی نہ سوئٹر۔ ڈپٹی صاحب کو ان
باتوں سے سخت نفرت تھی۔ قصور وار وہ بھی ہیں۔ حکومت کے
زعم میں بیوی کو وہ راہ راست پر نہ لا سکے۔ بیوی میں اصلاح
کرنے کے متمنی ضرور تھے لیکن سختی کے ساتھ نفرت و حقارت کے
ساتھ۔ عذرا تو ایک حد تک بری الذمہ تھی کیونکہ وہ خوب سمجھتی تھی کہ
شوہر تو بفضل خدا عرصے تک دنیا میں رہیں گے لیکن ابا جان
جو کہ عنقریب اللہ میاں کے پاس جانے والے ہیں اور عزم سفر
بھی کر چکے ہیں۔ کہیں جا کر اس کی شکایت نہ کر دیں اور کہیں
ایسا نہ ہو کہ دوزخیوں کی فہرست میں اس کا نام درج ہو جائے
—— "وہ" بعد میں جا کر حضور خداوندی میں صفائی پیش
بھی کرتے رہے تو کیا۔ دوزخیوں کے رجسٹر میں ایک بار نام
داخل ہونا ہی انسان کے داخل جہنم کرنے کو کافی تھا۔ نہ اس
کی کوئی تلافی ممکن تھی نہ اپیل۔

چونکہ یہ معاملہ بیحد لطیف تھا اور انتہائی دلچسپ۔ بستر پر
لیٹی تو خود بخود ہنسی آنے لگی۔ رات کے دو بجے تھے۔ خیالات کا سلسلہ
کہیں سے کہیں پہنچ رہا تھا۔ عذرا کی۔ دکھتی ہوئی رگ میں نے پہچان
لی تھی۔ مذہبی پہلو کے سوا اس کی اصلاح کا اور کوئی طریقہ ممکن
ہی نہیں تھا۔ زاہد خشک عذرا کی اصلاح مذہبی پہلو سے کرنی مقصود
تھی۔ بس! یہ تھی میرے جُب کے عمل کی اصلیت۔ میرے اللہ!
یہ سب کیسے ہو گا؟ کیا یہ ضدی لڑکی میرے کہنے پر چلے گی؟

رب العزت! تو ہی میری مدد کرنا۔

اگلے روز میں نے عذرا کی بالکل خبر نہ لی۔ دوسرے روز نزہت، ثروت اور شکیلہ کو لے کر میں اس سے ملنے گئی۔ وہ کچھ سراسیمہ اور افسردہ تھی۔ اور میری تمام ہدایات پر نہایت سختی سے عمل کر رہی تھی۔ اس نے اپنی کاوشوں کی روئداد یوں بیان کی کہ شب گزشتہ جب وہ ڈپٹی صاحب کا بستر ٹھیک کرنے لگی تو جلالت مآب ڈپٹی صاحب کو غصہ آگیا۔ انھوں نے اس کے ہاتھ سے چادر چھین کر خود بچھا لی۔ صبح کے ناشتہ کے بعد جب عذرا نے ان کا پائپ کمرۂ خواب سے لاکر دیا تو اسے انھوں نے لے کر زمین پر پھینک دیا۔ صداقت کے طور پر عذرا نے پائپ کے ٹکڑوں کی طرف اشارہ کیا جو کمرے میں جابجا منتشر تھے۔

ناشتہ کے بعد دوپہر کے کھانے کی مہم یوں سر ہوئی کہ جب عذرا نے قورمہ کی ڈش یہ کہہ کر پیش کی کہ "یہ میں نے خاص طور پر آپ کے لئے پکایا ہے" تو ڈپٹی صاحب نے جوش میں آکر اسے اس زور سے ہٹایا کہ گرم قورمہ خود ان کے اوپر چھلک پڑا۔ دل بھی جلا اور جسم بھی۔ کپڑے تو بھلا خراب ہونے ہی تھے۔ بکتے جھکتے آفس میں چلے گئے۔

عذرا کے پاس آنے کے قبل نزہت، ثروت اور شکیلہ کو صورت حالات سمجھا کر خاموش رہنے کی تاکید کر دی تھی لیکن سنجیدگی ان شرارت کی پتلیوں میں کہاں۔ ہنستے ہنستے دیوانی ہوئی جا رہی تھیں اور میرا دل الجھ رہا تھا۔ آئی عقل گم ہوئی جا رہی تھی۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو عذرا کو ثابت قدم رہنے کی تاکید کر کے میں تو چلی آئی۔

مجھے اب عذرا سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ ہر روز اس کے حالات دریافت کر لینا اور اسے مناسب ہدایات دینا اب میرا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وہ میرے احکامات پر نہایت سختی سے عمل کر رہی تھی۔ تمام کام ڈپٹی صاحب کے اس نے اپنے ذمے لیئے تھے حتیٰ کہ ان کے کپڑے تہ کر کے رکھنا۔ دھلے کپڑے الماری سے نکال کر رکھنا، جوتہ صاف کرنا، ایسے بیسیوں کام تھے جن میں وہ تمام دن مصروف رہتی۔ نتیجہ صاف تھا پہلے روز جو وحشت ڈپٹی صاحب کے مزاج میں تھی دوسرے روز نہ رہی اور تیسرے چوتھے روز تو انھیں یقین ہو گیا کہ بیوی جو کچھ کر رہی ہے خدمت کرنے کی نیت سے کر رہی ہے۔ چڑانے یا دل جلانے کے لئے نہیں۔

اس احساس کے ساتھ جوں جوں ان کی وحشت کم ہوتی گئی صلح کی کڑی منزلیں طے ہوتی گئیں۔ عذرا اب خوش تھی۔ "بندگی کرنے سے کہتے ہیں خدا ملتا ہے" یہ میں نے اس وقت اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔ لیکن بھولی عذرا اب تک یہی سمجھے ہوئے تھی کہ یہ میرے خاص حُب کے عمل کا اثر ہے۔

میں مطمئن تھی۔ عذرا کے معاملات بتدریج سلجھ رہے تھے۔ یا یوں کہو کہ قریب قریب سلجھ چکے تھے صرف ضرورت تھی استحکام کی۔ میرا والد صاحب کے پاس کا زمانہ قیام اختتام پر تھا۔ مجھے اب گھر واپس جانا تھا۔ اپنی سہیلیوں کو لے کر عذرا سے رخصت ہونے جو گئی تو وہاں تو معاملہ ہی دگرگوں پایا۔ عذرا رو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں سارا چہرہ چقندر کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے جو دیکھا تو اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جوشش گریہ اگر خفیف ہو تو محبت، ہمدردی آنسوؤں کو جذب کر لیتی ہے لیکن جب سیلاب گریہ زوروں پر ہو تو محبت کا

خدا سا سہارا اس طوفان کو اور بھی تند و تیز کر دیتا ہے۔

عذرا آنسوؤں کے تلاطم میں بہی جا رہی تھی ہم اس اضطراب کا سبب دریافت کرنے کے لئے مضطرب تھے لیکن کثرتِ گریہ نے اس کی قوتِ گفتار سلب کر لی تھی۔

"تف ہے تمہارے اوپر اور تمہارے رونے پر" میں نے تھوڑے سے انتظار کے بعد ترشی سے کہا۔

میرا عقیدہ ہے کہ جہاں آنسو گرے اور اپنے ساتھ مصیبتوں کا پہاڑ لائے۔ آنسو نحوستوں کا پیش خیمہ ہیں۔ نیستی کا پیغام ہیں۔ جو لوگ کہ ذرا سی تکلیف سے گھبرا کر رونے بیٹھ جاتے ہیں ان کو سوچنا چاہیئے کہ اس طرح دماغ کو رو رو کر خراب کرنے کے بجائے اگر یہی دماغی قوت غور کرنے اپنی تکالیف کا چارہ کار اور نجات کا راستہ تلاش کرنے میں صرف کی جائے تو مصیبت کے دور ہونے کا امکان بھی ہے۔ گریہ و زاری سے کبھی بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہنسنے والے کا ساتھ سب دیتے ہیں۔ رونے والے کے ساتھ کوئی نہیں روتا۔

میں اس کو اس بے ڈھنگے پن سے روتا دیکھ کر بجائے متاثر ہونے کے بہت برافروختہ ہوئی۔ دراصل اس وقت مجھے غصہ آ بھی گیا تھا۔ میری ترش کلامی سے عذرا کو بہت فائدہ ہوا۔ اس کے آنسو رک گئے۔ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ دوپٹہ سے منہ صاف کر کے کہنے لگی۔

"آپا جب سے آپ نے دعا شروع کی" ان کی مہربانیاں روز بروز بڑھتی گئیں۔ سوائے پہلے دو چار روز کے "انھوں" نے اس کے بعد تو کبھی غصہ سے بات بھی نہیں کی۔ لڑنا تو دوسری چیز ہے۔ اب تو یہاں تک خوش تھے کہ جب بازار جاتے کوئی چیز میرے لئے ضرور خرید لاتے۔ کل ایک اونچی ایڑی کا جوتا اٹھا لائے۔ بھلا یہ میرے کس کام کا۔ ابا جان کو اگر خدا ابھی اس کی خبر ہو گئی تو میری "خسر الدنیا و الآخرۃ" کی مثل ہو جائے گی۔ اور آج تو کمبخت یہ ساڑی میرے لئے مصیبتوں کا پیش خیمہ بن کر آ گئی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک طرف کو اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک نہایت خوبصورت ساڑی بے ترتیبی سے قالین پر پڑی ہے۔

"ساڑی اور جوتے کا تحفہ! واقعی ہے بھی یہ رونے کی بات" میں نے طنزاً کہا۔ "نہیں آپا۔ پہلے آپ سن تو لیں" عذرا نے نہایت پست لہجہ میں بولنا شروع کیا۔ "جب وہ "ساڑی" لائے تو مجھ سے اس کے پہننے پر بہت اصرار کیا میں نے صرف اتنا کہا کہ بھلا میں اسے کیسے پہنوں۔ ابا جان خفا ہوں گے بس آپا اتنا سننا تھا کہ آپے سے باہر ہو گئے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے کہ "ابا جان ہی سے تم نے کیوں نہ شادی کر لی" عذرا نے رونے کی تیاری کرتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"یہ ایسی کونسی رونے کی بات تھی جس پر تم نے آنسوؤں کے دریا بہا دیئے اس سے تو الٹا ان کی حماقتوں کا ثبوت ملتا ہے۔ تم نہایت تحمل سے جواب یہ دیتیں کہ آپ کی نیک صلاح کا شکریہ لیکن اب تو یہ صلاح بعد از وقت ہے۔ شادی تو آپ سے ہو چکی ہے۔" میں نے ہمدردی کے لہجہ میں سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا تم نے تو میرا ناک میں دم کر دیا۔ ذرا آئینہ لے کر تو دیکھو۔ کتنی حسین معلوم ہو رہی ہو۔ بس اب اٹھو۔ منہ ہاتھ دھو کر انسان کی سی صورت بناؤ۔ ورنہ میں اب تم سے ہرگز بات نہ کروں گی۔"

عذرا کو حمام خانہ میں بھیج کر میں اس کی نئی ساڑی کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس میں سے بلاؤز کا ٹکڑا نکال کر قطع کیا۔

"لو اب بہت ہنس چکی۔ اس کو تینوں مل کر ذرا جلدی سے سی تو ڈالو۔" میں نے کہا۔ شکیلہ کو سلائی کا بہت

شوق تھا۔

اپنی آپا کو موٹر پر بھیج کر قاسم سیٹھ کی دوکان سے ساڑی کا ہم رنگ سوئٹر منگایا۔ بلاؤز سل کر تیار تھا۔ عذرا منہ دھو کر آگئی تھی۔ اس پر ایک عجیب سکوت طاری تھا۔ سکوت! ایک معنی خیز سکوت!!۔

ہم نے اس کے بال بہ طرزِ جدید سنوارے، ساڑی اور بلاؤز کے ساتھ اونچی ایڑی کا جوتا بھی اسے پہنا دیا۔ اور وہ فاصلہ جسے ڈپٹی صاحب "بعد المشرقین" کہا کرتے تھے ہم نے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں عذرا سے طے کرا دیا۔ ہم چاروں بلائے آسمانی بن کر اس پر چھا گئے تھے۔ رب الکرس کیا حب کا عمل اسی طرح کیا جاتا ہے؟ اس عمل کے موکل ایسے تو نہیں ہوتے!

نئے لباس کے ساتھ عذرا کے خیالات بھی بدل چکے تھے۔ اس کا غرور بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اس کی ضد پر میں نے فتح پائی تھی۔ یہ فتح میری نہ تھی بلکہ اس احترام اور محبت کی فتح تھی جو عذرا کے دل میں میری طرف سے قایم ہو چکی تھی۔

عذرا کی اصلاح کرنا بہ ظاہر پتھر کو جونک لگانا تھا۔ اس کی خشک اور مسموم طبیعت میں تبدیلی پیدا کرنا سنگلاخ زمین میں گل کاری کرنا تھا مگر محبت! پاک اور بے لوث محبت اور خلوص سے پتھر موم ہو چکا تھا۔ بنجر زمین میں سدا بہار پھولوں کے پودے لہلہا رہے تھے۔ کاش کہ ڈپٹی صاحب نے اس پر غور کیا ہوتا۔

عذرا نیا جوڑا پہنے آسمانی حور بنی بالکل ساکت و بے حس بیٹھی تھی۔ ڈپٹی صاحب کے کچہری سے آنے کا وقت نزدیک تھا۔ میں اسے الوداع کہنے کو اٹھی۔

"پیاری عذرا۔ میرا عمل کامیابی سے ختم ہو چکا۔ خدا تمہیں نت نئی خوشیاں دیکھنی نصیب کرے" عذرا سے گلے ملتے ہوئے میں نے کہنا شروع کیا۔ "اور ہاں عذرا۔ یہ روئی کی گڑیا تم مجھے دیدو۔ تمہاری حماقتوں کی اس یادگار کو بطور تبرک میں اپنے پاس رکھوں گی۔ تمہاری بدولت میرا یہ سفر نہایت کامیاب رہا۔ بڑی دلچسپی سے وقت گزرا۔ اس کے عوض میں یہ سوئٹر تمہاری نذر کرتی ہوں"۔ میں نے اسے سوئٹر پہناتے ہوئے کہا۔

عذرا اب بھی خاموش تھی۔ وہ اس طرح سر جھکائے کھڑی تھی جیسے کوئی مجرم اقبالِ جرم کے بعد جج کے سامنے کھڑا ہو۔ اس کو اپنے جرم کا احساس پورے طور پر ہو گیا تھا۔ یا شاید اب بھی وہ منتظر تھی کہ میں اسے کوئی نیا عمل سکھاؤں گی۔

اس واقعے کے چار سال بعد عذرا سے پھر ملاقات ہوئی۔ وہ خوش تھی اور بہت خوش۔ میرا حب کا عمل بہت ہی پُر تاثیر تھا۔ اس نے اور ساتھ ہی اس کے شوہر نے اسے سیکھ لیا تھا۔ یہ راز بھی ان کی سمجھ میں آگیا تھا کہ انسان یا تو کسی کو اپنا کر لے یا کسی کا ہو رہے۔ بغیر اس کے نہ تو دنیا میں اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے نہ مسرت۔

خیر گزری کہ عمل کرتے وقت میں نے عذرا سے وعدہ لے لیا تھا کہ میرے عامل ہونے کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ خدا کا شکر ہے!۔ ورنہ آج مجھے "حب کا عمل" کرنے سے کسی سے بات تک کرنے کی فرصت نہ ملتی۔

واقعی بڑی خیر گزری!!!

بلقیس بانو

(اردو فاضل)

میر محمد مومن کا ذوقِ تعمیر (سلسلۂ گزشتہ)

مولانا حسین شیرازی

میر محمد مومن صاحب کی مسجد میں جو کتبہ ہے وہ حسین شیرازی کا لکھا ہوا ہے۔ چونکہ میر صاحب کی دوسری مسجدوں کے کاتب بھی یہی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ کتبہ کے سلسلے میں ان کا کچھ حال درج کیا جائے۔ اس کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ ان کے لکھے ہوئے کتبے اور کہیں اب تک نظر سے نہیں گزرے اور دوسرے اس لئے کہ یہ میر صاحب کے خاص دست گرفتہ تھے اور انھوں نے اپنے اس محسن کی مہربانی اور سرپرستی کی وجہ سے حیدرآباد میں ایک بہت اچھا مرتبہ حاصل کیا تھا۔

سیدآباد کی مسجد کے کتبے میں انھوں نے اپنا نام صرف حسین شیرازی لکھا ہے لیکن میر پیٹھ کے کتبہ میں

"عبدہ حسین بن محمود الشیرازی ۱۰۲۰ھ"

درج ہے۔ جس سے ظاہر ہوا کہ ان کے والد کا نام محمود شیرازی تھا۔ ان کے حالات اور کتبوں کی تلاش کے سلسلے میں حدیقۃ السلاطین اور حدیقۃ العالم میں منتشر سی معلومات حاصل ہوئیں۔ جن کو تسلسل کے ساتھ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

مولانا حسین تقریباً ۹۵۵ھ میں شیراز میں پیدا ہوئے تھے کیونکہ ۱۰۳۵ھ کے اوائل میں جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی عمر ۸۰ سال کی تھی۔ حدیقۃ العالم میں لکھا ہے۔

"مشارٌالیہ کہ ہشتاد مرحلہ از مراحل زندگانی طے نمودہ بود رخت اقامت ازیں سرائے فانی بربست[1]"

یہ تقریباً پینتالیسؔ سال کی عمر میں حیدرآباد آئے اور ان ایرانیوں میں سے ہیں جو میر صاحب کے توسط سے محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں بار یاب ہوئے۔ ایسی ہی مثالوں کو پیش نظر رکھ کر مصنف عالم آرائے عباسی نے ۱۰۱۵ھ میں میر صاحب کے متعلق لکھا تھا۔

"مستحقین ہر دیار بوسیلۂ جناب میر از سلسلۂ علیہ انتفاع می یابند[2]"

غرض میر محمد مومن بڑے جوہر شناس تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس جوہر قابل کو بھی پرکھ لیا اور محمد قلی قطب شاہ کے دارالانشاء اور کتب خانہ میں مامور کرا دیا۔ حدیقۃ السلاطین میں لکھا ہے۔

"در سلک کتاب ایں دولت خانۂ عالیہ منتظم بود[3]"

یہ خدمت اور میر صاحب کی مسجدوں کے خوبصورت کتبے ظاہر کرتے ہیں کہ مولنا حسین اعلیٰ درجہ کے خطاط اور خوشنویس تھے لیکن تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ محض خوشنویس ہی نہ تھے بلکہ نہایت متقی، پرہیزگار، سلیم الطبع اور نیک خو بھی تھے۔ چنانچہ لکھا ہے۔

"بصلاح جبلی و سلامت نفس اتصاف داشت[4]"

یہی وجہ تھی کہ اس عہد کے دوسرے مشہور خطاطوں مثلاً محمد اصفہانی، اسمٰعیل بن عرب شیرازی، تقی الدین، محمد صالح البحرینی اور کلب علی بن محمد صادق وغیرہ کو چھوڑ کر میر صاحب نے اپنے کتبوں کے لئے ان کو منتخب کیا تھا۔

مولنا حسین عہد محمد قلی میں حیدرآباد ہی میں رہے اور

---

[1] دیکھو حدیقۃ العالم صفحہ ۲۷۰

[2] دیکھو مطبوعہ صفحہ ۱۵۹۔ لیکن اس کے ایک قلمی نسخے میں جو مولوی قاسم علی بیگ صاحب انگر کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس عبارت میں کچھ اختلاف ہے۔ اس میں لکھا ہے "مستحقین ہر دیار بوسیلۂ او از سلسلۂ قطب شاہیہ تمتع می یابند" [3] حدیقہ صفحہ ۱۰۔ [4] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۰ و حدیقۃ العالم صفحہ ۲۷۶۔

اس کی وفات سے متاثر ہوکر نوجوان شہزادہ محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد جیسے اور بہت سے ایرانی علماء و امراء مثلاً شیخ محمد ابن خاتون اور مرزا محمد امین میر جملہ وغیرہ حج و زیارت کی رخصت لیکر یا کوئی اور ضرورت پیش کرکے یا ہمیشہ کے لئے حیدرآباد سے ایران وغیرہ کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ مولنا حسین نے بھی حج اور زیارتوں کی غرض سے سفر کی اجازت حاصل کی۔ اور سنہ ۱۰۳۰ھ کے قریب اس وقت حیدرآباد واپس ہوئے[1] جب میر مومن صاحب عبداللہ قطب شاہ کی تعلیم اور اتالیقی کے لئے کسی لایق اور بزرگ سیرت عالم کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ ان کے واپس ہوتے ہی میر صاحب نے ان کو سلطان محمد کی بارگاہ میں پیش کرکے شہزادہ کی تعلیم پر مامور کرا دیا۔ نظام الدین احمد شیرازی نے لکھا ہے :-

"رخصت گرفتن بہ مکہ معظمہ حاصل نمودہ بشرف طواف بیت اللہ الحرام وسعادت زیارت مرقد مطہر خیر الانام و سایر عتبات طاہرات ائمہ کرام علیہم الصلوات اللہ الملک العلام مشرف و مستسعد گردیدہ درین وقت مراجعت نمودہ بود بجہت صلاح جبلی وسلامت نفس موصوف بود. نواب مرتضےٰ ممالک اسلام میر محمد مومن مولوی را بجہت این خدمت پسندیدہ مجدد و بشرف ملاقات خاقان زمان مشرف ساختہ خلعت این خدمت عالی بہ قامت قابلیت مولوی مرتب داشتند[2]"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر صاحب حسین شیرازی پر کتنے مہربان تھے جس وقت (یعنے سنہ ۱۰۳۰ھ میں) حسین نے میر صاحب کی مسجد کا کتبہ لکھا تھا اس وقت ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ ہوگا کہ ایک روز ان خدمات کے صلہ میں میر صاحب ان کو اتنا بڑا اعزاز دلوائیں گے۔ غرض حسین شیرازی نے مبارک ساعت دیکھ کر اس خدمت جلیلہ کے کام کا آغاز کیا۔ اور شاہزادہ عبداللہ مرزا کے یہاں حاضر ہونے لگے۔

مولنا حسین کی تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کبھی شاہزادہ کو پڑھنے لکھنے کی طرف راغب دیکھتے تو قرآن مجید کی تلاوت کراتے اور مذہبی مسائل و احکام سے آگاہ کرتے رہتے۔ اس طرح دو سال کے عرصہ میں مولنا نے عبداللہ قطب شاہ کو قرآن مجید اور مذہب اسلام کا کافی مطالعہ کرا دیا۔

جب یہ شہزادہ دس سال کی عمر کو پہنچا تو اس کے اتالیق خواجہ مظفر علی تبریزی کا بھی انتقال ہوگیا۔ یہ تاریخ کا ایک عجیب واقعہ ہے کہ پیدائش سے بارہ سال کی عمر تک جو شخص بھی شہزادہ عبداللہ کی خدمت لگی یعنے نگرانی و اتالیقی وغیرہ کے لئے مقرر کیا گیا وہ بہت جلد انتقال کر گیا۔ اس طرح کئی اچھے اچھے لوگ مثلاً میر قطب الدین نعمت اللہ شیرازی، مرزا شریف شہرستانی، اور میر محمد مومن اسی شہزادہ کی قربت، تعلق، اور خدمت میں راہی جادۂ فنا ہو گئے۔ اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا خواجہ مظفر علی کے بعد خود مولنا حسین شیرازی کا بھی یہی حال ہوا۔

غرض خواجہ مظفر علی کے انتقال کے بعد شہزادہ عبداللہ کو بالکلیہ طور پر مولنا حسین شیرازی کی نگرانی میں دیدیا گیا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ کیونکہ ماہرین نجوم کی پیشین گوئی کے مطابق یہ ولیعہد سلطنت اپنے باپ سلطان محمد کی نظر وں سے اوجھل غیروں کے گھروں میں پرورش پا رہا تھا جو اس کی موت و زیست اور

---

[1] حسین شیرازی کی واپسی کی تاریخ کا صحیح اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ شہزادہ عبداللہ مرزا کی تعلیم کے لئے اسی سنہ میں ایک قابل اتالیق کی تلاش کی گئی۔ [2] حدیقہ صفحہ ۱۰۔

[3] حدیقہ صفحہ ۱۰۔

ابھی اور بری نشو و نما کے بالکلیہ ذمہ دار تھے اسی لئے شروع ہی سے جن جن لوگوں کے یہاں شہزادہ کو رکھا گیا وہ بادشاہ کے عمال معتمد علیہ اور دربار کے معتبر ارکین میں سے تھے۔ اور چونکہ ان میں سے اکثر حضرت میر محمد مومن کی سفارش پر متعین کئے گئے تھے اس لئے[1] ان کا تذکرہ اور اس خدمت کی اہمیت کا حال آئندہ فصل میں جو عہد محمد قطب شاہ کے لئے وقف ہے درج رہے گا۔

خواجہ مظفر علی کی وفات کے بعد مولنا حسین اپنا مکان چھوڑ کر مظفر علی ہی کے مکان میں آرہے تاکہ رات اور دن ہمہ وقت شہزادہ کے قریب رہیں۔ خواجہ کے مکان میں شہزادہ کے لئے ایک رفیع الشان قصر بنایا گیا تھا جس کو تکلفات گوناگوں اور تصرفات موزوں سے سجایا گیا تھا[2]۔ اور خود خواجہ نے شہزادہ کی تشریف آوری کے وقت اس قصر میں زربفت اور ابریشم کے پاانداز کر کے زر و جواہر نثار کیا تھا۔ اور شہزادہ کو خوش رکھنے اور اس کا دل بہلانے کی خاطر اپنے محل کو نگار خانۂ چین بنا دیا تھا۔

مولنا حسین شیرازی جیسے متقی بزرگ کے مکان میں یہ تکلفات کہاں۔ اس لئے وہ خود اس محل میں آرہے۔ اور شبانہ روز ایسی خدمت کی کہ سایہ کی طرح شہزادہ سے کبھی جدا نہ ہوتے تھے۔ ان کی اس توجہ اور شفقت کی وجہ سے شہزادہ عبداللہ مرزا بھی ان کا اتنا دلدادہ ہو گیا کہ ایک لمحہ کے لئے ان سے جدا نہ ہونا چاہتا تھا۔ تاریخ کے الفاظ ہیں:۔

"ازیں جہت شاہزادۂ عالم را کمال لطف و شفقت بحال مولوی بہم رسیدہ نمی خواستند کہ مولوی یک لحظہ از قدوم بہجت لزوم دوری نمایند۔ و علی الدوام مولوی بہر اسم بندگی و خدمت قیام داشت[2]:۔"

اسی اثناء میں شہزادہ نے گیارہویں سال ختم کر کے بارہویں میں قدم رکھا اور غالباً ذیقعدہ یا ذوالحجہ سنہ ۱۰۳۴ھ میں اس نے ایک خواب دیکھا کہ دروازوں میں سے گزر کر ایک عظیم الشان باغ میں داخل ہوا ہے جس کی سیر سے وہ محظوظ ہی ہو رہا تھا کہ یکایک تمام درخت اس کو سجدہ کرنے لگے۔ اس کے بعد جدھر وہ جاتا اس طرف کے درخت اس کے آگے سربسجود ہو جاتے۔

جب صبح کو شاہزادہ بیدار ہوا اور حسین شیرازی نماز صبح کے فرائض و نوافل اور اوراد و وظائف سے فارغ ہوتے ہی حسب عادت اس کے بستر پر آکر دعا و ثنا میں مشغول ہوا تو شہزادہ نے اپنے بوڑھے دوست سے رات کے خواب کا واقعہ بیان کیا۔ بوڑھا شفیق فوراً خواب کی تعبیر سمجھ گیا۔ تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد اس نے عرض کیا کہ یہ خواب شہزادہ کی بادشاہت و سلطنت کی بشارت دے رہا ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی تاکید کر دی کہ یہ خواب اور اس کی تعبیر کسی سے بیان نہ کی جائے۔ مولنا حسین شیرازی نے جس پُر خلوص انداز میں شہزادہ کو نصیحت کی تھی ذیل کے جملوں سے اس کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے:۔

"ایں پیر حقیر خدمت گار متوقع است کہ با حدے از ملازمان ایں خواب را اظہار نہ فرمایند۔ و ایں معنی را در ضمیر اقدس مستور دارند تا جمال حقیقت ایں معما از نقاب حجاب نہاں و ہیئات ایں صورت زیبا در مرات شہود عیاں جلوہ گر شدہ منظور انظار عالمیاں گردد[3]۔"

---

[1] دیکھو حدیقۃ السلاطین صفحہ ۹۔

[2] دیکھو حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۰ [3] دیکھو حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۲ و حدیقۃ العالم ۲۴۶

شہزادہ کو بھی اپنے اس مخلص استاد اور مشفق اتالیق کی بات کا اتنا خیال تھا کہ اس نے کسی سے بھی اس کا ذکر نہ کیا۔ یہاں تک کہ اس واقعہ کو چند ماہ گزر گئے اور خود مولانا حسین شیرازی کو بھی دنیا سے کوچ کرنا پڑا۔

حسین شیرازی کی صحیح تاریخ و روز وفات تو معلوم نہ ہو سکا لیکن اتنا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے میر مومن کے چند ہی ماہ بعد یعنے اوائل ۱۰۳۵ھ میں (قبل ماہ جمادی الاول) وفات پائی۔ کیونکہ ان کی وفات کے دو تین مہینوں کے بعد ہی ۱۳ر جمادی الاول ۱۰۳۵ھ میں سلطان محمد قطب شاہ کا بھی انتقال ہوا تھا۔

مولانا حسین کی وفات کا ان کے شاگرد اور معتقد شہزادہ عبداللہ پر اتنا اثر ہوا کہ وہ تنہائی سے گھبرا گیا اور اپنے نادیدہ باپ سلطان محمد قطب شاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے بار بار کہلا بھیجنا شروع کیا چنانچہ مورخین لکھتے ہیں:۔

"بعد ازیں قضیہ (یعنے وفات حسین شیرازی) شہزادۂ یوسف طلعت سکندر خصلت را تاب تنہائی نماند۔ و مترصد بودند کہ کلفت بعد و ہجر بالفت قرب و وصل مبدل و جمال باکمال والد ماجد فرشتہ خصال را بزودی مشاہدہ فرمایند[1]......"

سلطان محمد قطب شاہ بھی بارہ سال سے اپنے فرزند کے دیدار کا مشتاق تھا۔ وہ نجومیوں کے کہنے پر محض اس لئے عمل پیرا تھا۔[2] میر مومن صاحب نے بھی اپنے علم کے زور پر اس کی تصدیق کی تھی۔

لیکن اب تو میر صاحب بھی باقی نہ رہے تھے۔ اس نے ہمت کر کے دن تاریخ مقرر کر لی اور بیٹے کو غالباً ماہ ربیع الاول میں اپنے یہاں بلا لیا۔ حالانکہ اس وقت تک پورے بارہ سال گزرنے نہ پائے تھے کیونکہ شہزادہ عبداللہ بروز دوشنبہ ۲۹ر شوال ۱۰۲۳ھ کو پیدا ہوا تھا اور ۲۹ر شوال ۱۰۳۵ھ کو قمری مہینوں کے حساب سے بارہ سال پورے ہوتے تھے۔[3]

اس ملاقات کا مہینہ ربیع الاول اس لئے قرار پاتا ہے کہ ملاقات کے چند ماہ بعد تک سلطان محمد زندہ رہا کیونکہ مورخین لکھتے ہیں کہ باپ بیٹے چند مہینے ایک ساتھ رہے اور باپ نے اپنے ولیعہد سلطنت کو بہت سے امور سلطنت سکھائے۔ مورخ کے الفاظ ہیں:۔

(۱) "چندماہے بتاثیر قران نیرین آسمان سلطنت و شہریاری شادمانی و عالمیان عام و خوشحالی کہ جنس نایاب است فراواں گردید[4]"

(۲) "ہمگی اوقات بترتیب شاہزادۂ ہوشمند و اماد دل پرداختہ در تعلیم قواعد جہانداری و معدلت و آداب گیتی آرائی و نصفت و قانون مجلس و دیوان داری و مراسم پادشاہی و شہریاری و اہتمام عساکر و رعایت رعایا و مرحمت بر سائر خلائق و کافۂ برایا عمر عزیز را صرف می نمودند۔ و ہمیشہ گوش ہوش شاہزادۂ عالیہ را بہ دُرر نصائح و لآلی مواعظ کہ مشتمل بر آداب سلطنت و رسوم خلافت بود مزین ساختند۔

[1] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۳۔ [2] نجومیوں نے کہا تھا کہ: "چوں دوازدہ مرحلہ از مراحل عمر شہزادہ عالمیان طے شود باید کہ شہنشاہ دوران دیدہ بدیدار جمال شاہزادۂ جہانیان منور سازند و اتفاق قران نیرین بعد از انقضائے سنوات مذکورہ وقوع پذیرد۔" حدیقۃ السلاطین

[3] عجیب بات یہ ہے کہ نظام الدین احمد شیرازی نے اس قبل از وقت ملاقات کی نسبت لکھا ہے کہ "بعد از انقضائے سنوات موعود و مرور ایام معہود"۔ لیکن حساب کے لحاظ سے یہ بیان بالکل غلط ثابت ہوتا ہے۔ [4] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۶۔

وخزانۂ حافظہ اش را از جواہر و لآلی تواریخ و اخبار و

سیر سلاطین، و وقایع روزگار، و تجارب خواقین عالی

مقدار از منہ و اعصار کہ ہر یک بوقت خود در کائنات

مملو و مشمول می داشتند۔ و چندماہے بایں نوع می

گزرانیدند[1]۔

یہ ہم جانتے ہیں کہ سلطان محمد ۱۲ جمادی الاول کو انتقال کر گیا

تو اس سے چند ماہ پیشتر ماہ ربیع الاول ہی کا مہینہ ہو سکتا ہے۔

کیونکہ بادشاہ نے ملاقات کے لئے

"روز مبارک و ساعت مسعود اختیار فرمودہ[2]"

اور ربیع الاول کی ۱۲ یا ۱۷ سے بہتر کونسا مبارک و مسعود دن

ہو سکتا تھا۔

یہ ملاقات ربیع الاول سے پہلے ممکن نہ تھی کیونکہ شہزادہ نے

ذیقعدہ یا ذالحجہ ۱۰۳۴ھ میں (یعنے بارہویں سال میں قدم

رکھنے کے بعد) خواب دیکھا تھا اور اپنے بوڑھے استاد کو سنایا

تھا جس کے کچھ ماہ بعد یہ استاد فوت ہوا۔ کیونکہ لکھا ہے :۔

"و چوں چند ماہے بر ایں بگذشت مولوی کہ نہایت سن را

دریافتہ و ضعف شیخوخیت کمال قوت بہم رسانیدہ

بود مزاجش کاستہ و گداختہ بیش از ایں ادراک ساحت

حیات و فضائے کائنات استقامت و استدامت

نتوانست نمود بر فراش ناتوانی متقاعد گردیدہ

عزم ارتحال از این دار پر ملال جزم نمود۔ بالضرورۃ

وداع ملازمان و بندگان شاہزادۂ دوراں و

قطع تعلقات از حیات جسم و جان فرمودہ بہ بیت

السرور جاوداں رواں گردید[3]"

اس طرح مولانا حسین شیرازی کی وفات (۱۰۳۵ھ کے) صفر کے مہینے

میں کسی تاریخ قرار پاتی ہے۔ یعنے میر محمد مومن کے نو ماہ بعد اور سلطان محمد

قطب شاہ سے تین ماہ قبل حسین شیرازی نے وفات پائی۔ ان کی وفات کا

عبداللہ قطب شاہ پر جو اثر ہوا اور اس کے دل میں اپنے اس بوڑھے

استاد کی جو وقعت تھی اس کا اندازہ مورخ کے ان مندرجۂ بالا الفاظ سے

ہو سکتا ہے جو اس نے حسین شیرازی کی وفات کے متعلق استعمال کئے ہیں۔

سید محی الدین قادری زور

باقی آئندہ

[1] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۰۔ [2] دیکھو صفحہ ۱۲۔ [3] دیکھو حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۳۔

بادۂ شباب

کچھ ہم سے شکرِ لطفِ بہاراں نہ ہو سکا
اس فصل میں بھی چاکِ گریباں نہ ہو سکا

یا شامِ غم نے چھین لیں اندازِ جرأتیں
یا اہتمامِ صبحِ بہاراں نہ ہو سکا

خوش ہوں کہ اس ہجومِ کشاکش کے باوجود
میں شکوہ سنجِ تلخیٔ دوراں نہ ہو سکا

اس ایک دل پہ نعمتِ کون و مکاں نثار
جو انتہائے غم میں پریشاں نہ ہو سکا

ساحل کی زندگی میں نہیں لطفِ زندگی
انساں پھر بھی نغمۂ طوفاں نہ ہو سکا

ٹوٹے ہوئے دلوں کی دعائیں نہ لیں کبھی
جن سے کسی کے درد کا درماں نہ ہو سکا

تاروں کے ڈوبتے ہی دو آنسو ٹپک پڑے
داغِ فراق اور نمایاں نہ ہو سکا

خوش ہوں کہ ان کے دل میں بہرحال اے نظر
میرا خیال سلسلہ جنباں نہ ہو سکا

نظر

شاہدِ حیات سے

سحر کے تاروں کی انجمن میں ربابِ فطرت بجا رہے ہو
فضا کی رعنائیوں میں چھپ کر فضا کو رنگیں بنا رہے ہو

بھٹک رہے تھے جو ظلمتوں میں تمہارے آوارگانِ الفت
تو بھر کے یہ روپ چاندنی کا انہیں کو مشعل دکھا رہے ہو

تمہیں بہاروں کا رنگ بھی ہو تمہیں چمن کی امنگ بھی ہو
بس ایک تم ہو جو نور بن کر ضمیرِ ہستی پہ چھا رہے ہو

تمہاری یہ مست مست آنکھیں تمہارے یہ مئے فروش جلوے
الٹ رہے ہو بساطِ دانش جہاں کو بیخود بنا رہے ہو

کبھی سرِ خاک جلوہ آرا کبھی فلک پر ضیا فشاں ہو
تمہیں ستاروں میں ہنس رہے ہو گلوں میں تم مسکرا رہے ہو

جوہر فریادی

حادثہ

جاڑے کا ابتدائی موسم تھا۔ چاندنی راتوں کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ سورج پچھمی افق سے نیچے اتر چکا تھا۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ بھوراپارکا اسٹیشن چھوڑتے چھوڑتے ہر طرف ایک پُر اسرار اندھیرا چھا گیا۔ دو رویہ ساکھو کے جنگل تھے اس سے سماں کچھ اور بھیانک ہو گیا تھا۔ مگر ریل اس بڑھتے ہوئے اندھیرے اور سناٹے میں اس سہولت اور بے تکلفی کے ساتھ "زن زن" چلی جا رہی تھی گویا یہ اس کی اپنی قلمرو تھی جس کے ایک ایک پیچ و خم، ایک ایک کھنڈ اور تمام حدوں اور سمتوں سے نہ جانے کب کی مانوس تھی۔ ڈبوں کے اندر بجلی کے قمقمے روشن تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دہکتی ہوئی آگ یا کوندتی ہوئی بجلی کی کوئی ناگن ہے جو پھنکارتی بل کھاتی اور لامحدود تاریکی کو چیرتی ہوئی دشمن کا پیچھا کئے چلی جا رہی ہے۔

مسافروں پر سماں اور موسم کا اثر ہونے لگا تھا۔ اونچے درجوں میں کمبل اور دوشالے نکل آئے تھے۔ اور ہر شخص اپنے کو کچھ سمیٹتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اگرچہ گفتگوئیں، بحث و تکرار، اخباروں اور کتابوں کا مطالعہ، سگریٹ اور پان، نئی شناسائیاں اور اسی قسم کے دوسرے سفری مشغلے ابھی اسی طرح جاری تھے۔ تیسرے درجوں میں جو کچھ حیثیت والے تھے انھوں نے اونی چادریں اوڑھ لی تھیں لیکن اکثر اکہری سوتی چادر لپیٹے ہوئے تھے۔ ایسوں کی بھی تعداد کم نہ تھی جو صرف اپنے بدن سمیٹے ہوئے تھے اور رہ رہ کر پھریریاں لے رہے تھے۔ ایک ڈبے میں اور ڈبوں سے زیادہ بھیڑ تھی۔ اس لئے کہ تھوراپار کے میلے سے جو مسافر واپس آ رہے تھے وہ سب کے سب بھیڑوں کی طرح اسی میں گھس پڑے تھے۔ ایک پر ایک لدے ہوئے تھے۔ چیکٹے ہوئے کپڑوں کی مہک، بیڑی اور سلفہ کی مہک کے ساتھ مل کر ایک ناقابل برداشت عفونت پیدا کر رہی تھی۔ اتنے میں ایک مسافر نے اپنی جھولی سے ایک لمبی سی چلم نکالی۔ اس کے اندر کچھ رکھا اور ایک چنگاری آگ رکھ کر ایک ایسا دم لگایا کہ اس کی مہک کے آگے ہر مہک تلے پڑ گئی بہتیرے نازک دماغوں نے ناک پر کپڑے رکھ لئے۔ اس گانجے کے رسیا کے سامنے ایک نوجوان مسافر ایک سستی اونی چادر لپیٹے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس سے نہ رہا گیا اور اس نے منہ بنا کر کہا "چھی چھی سارے ڈبے میں سرانڈ پھیلا دی۔ یہ بھی کوئی بھلمنساہت ہے۔ بڑا سواد تھا تو منہ کھڑکی کے باہر کر کے پیتے" گنجیڑی کو اس کی تاب کہاں تھی۔ تن کر اور آنکھیں نکال کر بولا "تو کیا ڈبہ کوئی تم نے خرید لیا ہے جو ایسا مزاج دکھاتے ہو؟" نوجوان مسافر کو جس کا نام انور تھا غصہ آ گیا۔ لیکن کچھ تو بعض امن پسند مسافروں کے بیچ میں آ جانے سے اور کچھ اس لئے کہ خود وہ بہت خوش، مگن تھا اور اپنے کو بدمزہ کرنا نہیں چاہتا تھا اس نے اپنے غصے کو روک لیا اور بات بڑھنے نہیں پائی۔

انور سے ڈبے کے تمام مسافر واقف ہو چکے تھے اور اس کو اشتیاق اور دلچسپی کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ وہ ذات کا دھنیاں تھا۔ کلکتہ سے آ رہا تھا اور اب جو اسٹیشن آ رہا تھا اس پر اترنے والا تھا۔ وہاں سے دو میل اوتر ایک گاؤں تھا جو ماہ نگر کہلاتا تھا۔ انور وہیں کا رہنے والا تھا۔ روزگار سے تنگ ہو کر وہ بیوی اور ایک بچے کو چھوڑ کر کمانے کی غرض سے کلکتہ چلا گیا تھا۔ اور اب تین سال کے بعد گھر واپس آ رہا تھا۔ وہ اپنی چہیتی بیوی اور اپنے پیارے بیٹے سے اتنی مدت بعد ملنے کے خیال سے اس قدر خوش تھا کہ اس نے اپنے گنجیڑی ہم سفر کی بدزبانیوں کو بھی معاف کر دیا۔ وہ کلکتہ سے مصمم ارادہ کر کے چلا تھا کہ اب کے بیوی بچے کو اپنے ساتھ کلکتہ لے جائے گا۔ مزدوری کر کے ہی پیٹ پالنا ہے تو میاں بیوی ایک ہی جگہ رہ کر ساتھ مزدوری کریں گے اور ایک دوسرے کے

سچے، ہمدرد اور رفیق رہیں گے۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ نہ جانے کس پر کیا وقت آپڑے اور کب! ۔ اگر دونوں ساتھ رہیں گے تو آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کا دکھ نہ رہے گا۔ رفاقت اور پھر ایسی وفادار اور جاں نثار بیوی کی رفاقت بڑے سے بڑے دکھ کی شدت کو کم کردے گی۔

رحیم آباد کا اسٹیشن قریب تھا۔ کوئی تین چار میل کا اور سفر تھا جن لوگوں کو رحیم آباد اترنا تھا وہ اپنی گٹھڑیاں سنبھال رہے تھے۔ بعض گنواروں نے لاٹھیاں تک کندھے پر رکھ لیں تاکہ تیاری میں کوئی کسر رہ نہ جائے اور اسٹیشن پر اترنے میں لمحہ بھر کی بھی دیر نہ ہو۔ انور نے بھی اپنے اسباب کو سنبھال کر سامنے رکھ لیا تھا اور جس چھوٹے سے بکس میں بیوی اور بچے کے لئے نئے کپڑے وغیرہ تھے اس کو بڑی جتن کے ساتھ سب سے اوپر رکھا تھا۔

ملنے کی گھڑی قریب آرہی تھی۔ انور کے دل میں شوق اور محبت کی آگ بھرپور بھڑک چکی تھی اور اب وہ بے چین ہو رہا تھا۔ اتنے میں انجن نے ایک نہایت لمبی سیٹی دی۔ مسافروں نے سمجھا کہ اسٹیشن سے دور جو سگنل ہوتا ہے وہ شاید گرا نہیں ہے۔ سب کھڑکیوں سے باہر جھانکنے لگے۔ لیکن اس وقت کا صرف اندھیرا سہارا دینے کے لئے کافی تھا۔ کہیں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اور انجن جی چھوڑ کر چلا رہا تھا۔ ہر شخص کے دل میں ایک نامعلوم خطرہ کا ایک مبہم احساس پیدا ہونے لگا۔ اتنے میں کچھ ایسا معلوم ہوا کہ ایک ہی جگہ دو چیخیں اٹھ رہی ہیں۔ سب نے بے اختیار پھر گردنیں کھڑکیوں سے باہر نکال دیں۔ اور اتنا دیکھ سکے کہ پچھم کے موڑ سے ایک تیز اور پھیلتی ہوئی روشنی نمودار ہوئی اور پوری گاڑی کو نگل گئی۔ ابھی لوگ اچھی طرح سمجھنے بھی نہ پائے تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ ایک دھماکے کی آواز ہوئی۔ اور پھر ایک اور دھماکا جو قیامت کی گھڑی کی طرح طویل اور بے پایاں تھا۔ معلوم ہوتا تھا زمین اور آسمان ٹکرا رہے ہیں اور کائنات کے پرخچے اڑے جا رہے ہیں......

(۲)

رحیم آباد ایک چھوٹا سا قصبہ تھا مگر گرد و نواح میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔ آس پاس کے اکثر بڑے زمیندار اور بیوپاری اپنی مستقل سکونت یہیں رکھتے تھے۔ رحیم آباد ایک تجارتی مرکز سا بن گیا تھا۔ یہاں سے اوتر اور دکھن کی سمتوں میں ریلوے کی شاخیں بھی نکلی تھیں جو بعض اہم اور مشہور مضافاتی مقاموں تک جاتی تھیں۔

گزشتہ تین چار سال سے شکر کا ایک کارخانہ بھی کھل گیا تھا اس سے رحیم آباد کی رونق اور اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ کارخانہ اسٹیشن سے کوئی چار پانچ فرلانگ کے فاصلہ پر تھا لیکن وہاں کی آٹھوں پہر کی چہل پہل اور دوڑ دھوپ خاص کر شکر کے موسم میں اسٹیشن کو بھی ہر وقت آباد اور شگفتہ رکھتی تھی۔

آج شام کو سورج ڈوبنے سے کچھ پہلے کارخانہ کے مزدوروں کو جب چھٹی ملی تو سکینہ نے سوچا کہ آخر پھر مغرب بعد انور کو لینے اسٹیشن آنا ہی ہے۔ پھر کیوں نہ وہ سیدھی اسٹیشن ہی چلی جائے یہ سوچ کر اس نے اپنی ایک سہیلی سے جو ماہ نگر ہی کی رہنے والی تھی اور اس کے ساتھ رحیم آباد کارخانہ میں کام کرتی تھی گھر کہلا بھیجا کہ وہ اسٹیشن پر رک گئی ہے اور انور کے ساتھ آئے گی۔

پورب کی سواری گاڑی آنے میں ابھی کوئی سوا گھنٹے کی دیر تھی۔ مگر رحیم آباد کا پلیٹ فارم مسافروں سے بھر گیا تھا۔ سکینہ اتنی بڑی بھیڑ میں کچھ کھوئی ہوئی سی تھی۔ لیکن اس کی لَو اس گاڑی سے لگی ہوئی تھی جو اس کے شوہر کو اتنی مدت کے بعد لاکر اس سے ملانے والی تھی۔ اس کی رگ رگ میں ایک

بے صبری تھی اور وہ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ گھڑیاں خلاف معمول طویل ہوتی جا رہی ہیں۔ اتنے میں ایک پیٹ مین اسٹیشن کے اندر سے نکلا اور جلد جلد گھنٹی بجائی اور پچھم کی طرف تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا۔ سکینہ کے دل کی حرکت کچھ تیز ہو گئی۔ اس نے سمجھا کہ یہ اس کی قسمت ہے جو آج گاڑی اتنا سویرے آ رہی ہے۔ اس کو یقین تھا کہ یہ اسی گاڑی کے لئے گھنٹی بجائی گئی ہے جس کا اس کو انتظار تھا۔ مگر اپنے اطمینان کے لئے اس نے ایک قلی سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو پچھم سے مال گاڑی آ رہی ہے۔ "تو بابو پورب کی گاڑی کتنی دیر میں آئے گی؟" سکینہ نے کچھ مایوس ہو کر پوچھا۔ "یہ مال گاڑی کچھ دیر یہاں ٹھیرے گی اور پھر چھوٹ جائے گی۔ جب یہ بنوار پار پہنچ جائے گی تب سواری گاڑی بنوار پار سے چھوٹے گی۔ ابھی بڑی دیر ہے۔" قلی نے جواب دیا اور سکینہ کے حسن و شباب پر اپنی نگاہوں کا خزانہ لٹاتا ہوا اپنے کام پر چلا گیا۔ سکینہ خاموش ہو کر بیٹھ رہی۔ مگر اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر انور آئے گا ہی۔ پھر یہ بے چینی کیوں ہے؟

(۳)

پنڈت رام اوتار شرما بڑے کامیاب اور نیک نام اسٹیشن ماسٹروں میں سے تھے۔ افسر اور ماتحت دونوں ان کی دل سے قدر کرتے تھے۔ کمانے کا ڈھنگ تو اپنے اکثر رفیقوں کی طرح ان کو معلوم ہی تھا لیکن ہر شخص کو راضی رکھنا بھی وہ خوب جانتے تھے۔ پھر اپنے دھرم کے بھی بڑے پکے تھے۔ اتنی عمر ہو گئی تھی مگر صبح کی پوجا کبھی ناغہ نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ کوئی جاترا خالی گیا تھا۔ غرض کہ دین اور دنیا دونوں بنا رہے تھے۔ آج کل میلے کا زمانہ تھا اس لئے شام کو بھی جب کہ اسٹیشن عموماً اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کے سپرد کر دیا جاتا ہے خود ہی آ کر گاڑیاں نکال

جاتے تھے، مال گاڑی جس وقت رحیم آباد کے پلیٹ فارم پر آ کر کھڑی ہوئی اس وقت بنوار پار کے آگے ایک اسٹیشن تک پورب کی سواری گاڑی کا پتہ نہیں تھا۔ پنڈت رام اوتار شرما کو یقین تھا کہ وہ مال گاڑی کو نکال سکیں گے۔ لیکن آج رحیم آباد میں مال کے کئی ڈبے کٹ رہے تھے جس میں خاصی دیر ہو گئی۔ خدا خدا کر کے انجن گاڑی میں آ کر لگا اور پنڈت شرما نے اطمینان کی سانس لے کر جلدی سے پروانہ (لائن کلیر) بنایا اور دستخط کر کے اس کو کتاب سے پھاڑنے ہی جا رہے تھے کہ تار سے معلوم ہوا کہ سواری گاڑی بنوار پار پہنچنے والی ہے اور مال گاڑی رحیم آباد روک لی جائے۔ پنڈت شرما کچھ جھلا کر رہ گئے۔ اور لائن کلیر کتاب ہی میں رہنے دیا۔ اتفاق کی بات اسی وقت پنڈت شرما کے پیٹ میں کچھ مروڑ سی شروع ہوئی اور وہ بنگلہ پر جانے کے لئے مجبور ہو گئے۔ فارغ ہونے میں کچھ دیر لگی۔ ابھی وہ مٹی سے مل مل کر ہاتھ دھو ہی رہے تھے کہ ان کو احساس ہوا کہ پلیٹ فارم پر گاڑی نہیں فوراً جلدی سے کوٹ اوپر ڈالی اور ویسے ہی کان میں جنیو لپیٹے بھاگتے ہوئے اسٹیشن پہنچے۔ معلوم ہوا کہ گارڈ صاحب اسٹیشن کے اندر آئے اور دستخط کیا ہوا پروانہ لے کر چلے گئے۔ وہ یہ سمجھے کہ اسٹیشن ماسٹر صاحب ان کے لئے لائن کلیر لکھ کر رکھ گئے ہیں۔ پنڈت رام اوتار شرما کی آنکھوں میں دنیا اندھیری ہو گئی۔ بے اختیار ہو کر چیخنے لگے۔ "ہائے اب کیا کروں بڑا غضب ہو گیا۔" عین اسی وقت تار بولنے لگا۔ اسسٹنٹ ماسٹر نے سنا تو معلوم ہوا کہ بنوار پار سے سواری گاڑی چھوٹ چکی ہے۔ پنڈت شرما باؤلوں کی طرح باہر آئے۔ اور خود خطرہ کی گھنٹی بجانے لگے۔ سامنے ایک پیٹ مین تھا اس کو دو ہتڑ مار کر کہا "کم بخت دوڑ گارڈ صاحب سے پکار کر کہہ گاڑی روک لیں" پیٹ مین جی چھوڑ کر

پکار لگاتا ہوا دوڑا۔ بہت دور ایک سرخ دہکتا ہوا انگارہ
نظر آرہا تھا جو آگے کی طرف بڑھتا چلا جارہا تھا۔ بیٹ مین
چلاتا اور سرخ لالٹین دکھاتا چلا جارہا تھا۔ پنڈت شرما نے
فوراً پورب کی طرف کا دوسرا سگنل گرادیا تاکہ مال گاڑی کو
معلوم ہوجائے کہ دوسری طرف سے گاڑی آرہی ہے مگر مال گاڑی
سگنل سے کافی آگے نکل چکی تھی۔

اب خود پنڈت شرما پورے عملے کے ساتھ چیختے اور
سرخ لالٹین دکھاتے دوڑے۔ سارے اسٹیشن میں ہل چل
مچ گئی۔ سکینہ ایک ایک کا منہ تک رہی تھی اس کی سمجھ میں نہ
آتا تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ کچھ مسافر اسٹیشن والوں کے پیچھے بھاگے
چلے جارہے تھے۔ کچھ ڈر کر اپنے اپنے گھر بھاگے جارہے تھے۔
سکینہ ایک ایک سے پوچھ رہی تھی اور اگر کوئی اس کو صحیح جواب
بھی دے رہا تھا تو اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

پنڈت شرما اپنے ساتھیوں کو لئے ہوئے اندھیرے
میں ٹھوکریں کھاتے اور گر گر کر اٹھتے ہوئے کافی دور تک نکل آئے
تھے۔ ان کو اب بھی ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید ان کی
زندگی کے اوراق اس حادثہ سے خالی رہ جائیں۔ لیکن دور
ایک اس زور کا دھماکا ہوا کہ معلوم ہوا زمین اور آسمان
لرز اٹھے اور پھر سلسلہ وار دھماکے! ۔ جیسے بے شمار بادل
ایک ساتھ گرج رہے ہوں۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ زمین
کی میخیں ہل گئی ہیں اور چاروں سمتیں آپس میں ٹکرا رہی ہیں۔

پنڈت رام اوتار شرما کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہوگئے
اور وہ سر گرا کر بیٹھ گئے۔ ان کو ایسا محسوس ہورہا تھا کہ ہاتھ پاؤں
کے ساتھ آنکھ اور کان نے بھی جواب دے دیا ہے۔

(۴)

بات کی بات میں یہ خبر بجلی کی طرح چاروں طرف گئی کہ
رحیم آباد اور ہنوار پار کے درمیان گاڑیاں لڑ گئی ہیں۔ کارخانہ
سے بھی لوگ دوڑ پڑے۔ موقع واردات پر قیامت کا سماں تھا۔
کارخانے سے بے شمار لالٹینیں اور گیس کی روشنیاں پہنچ گئی تھیں
سکینہ کو اس تمام ہلچل کا مطلب سمجھنے میں دیر لگی کچھ
دیر کے لئے تو اس کو سکتہ سا ہوگیا۔ لیکن دھیرے دھیرے اس
کے دماغ نے کام شروع کیا اور اب اس کی سمجھ میں آیا کہ اس کو
کیا کرنا چاہئے۔

ابھی چند آدمیوں کا ایک گروہ دوڑتا ہوا اور شور کرتا ہوا
پورب کی طرف جارہا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ دوڑی۔ سب
شور اور واویلا مچا رہے تھے اور سکینہ چپ چاپ دوڑتی ہوئی
چلی جارہی تھی۔

گاڑیاں جھوم جھوم کر لڑی تھیں۔ ایک انجن دوسرے
انجن پر چڑھ گیا تھا اور اس کے اندر پیوست ہوگیا تھا۔ کوئی کہہ
نہیں سکتا تھا کہ یہ ریل گاڑیاں ہیں۔ ڈبے ایک دوسرے کے
اندر سما گئے تھے اور اس طرح پچک کر مسخ ہوگئے تھے جیسے
ٹین کے کھلونے ہوں جن کو کسی بچے نے کھیلتے کھیلتے کوچ کر رکھ
دیا ہو۔ مسافر اور ان کے سامان ایک ساتھ پس اٹھے تھے۔
صرف دونوں گارڈ اور ڈرائیور بچ گئے تھے جو تصادم سے پہلے ہی
کود پڑے تھے۔ یا پھر سب سے پیچھے دو ایک ڈبے کے مسافر شدید
چوٹیں کھا کر رہ گئے تھے اور زندگی کی امیدیں لئے ہوئے تھے۔
گاڑیوں کے دروازے اس طرح بیٹھ گئے تھے کہ کسی طرح کھلتے
نہ تھے اور زخمیوں اور لاشوں کو نکالنا دشوار ہورہا تھا۔

جس وقت سکینہ پہنچی ہے تو ڈبے خالی کئے جاچکے تھے
اور ریل کی پٹڑی کے دونوں طرف زخمیوں اور لاشوں کے
ڈھیر تھے۔ ہر طرف سے عجیب بھیانک کراہیں سنائی دے رہی تھیں
سکینہ بلبلا بلبلا کر کہنے لگی "بابوجی اسی میں ہمارا آدمی بھی تھا"

کسی نے ہنگامے میں اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ آخرکار سکینہ نے دل کڑا کیا اور خود جھک جھک کر لاشوں اور گھائلوں کو دیکھنے لگی۔ جتنوں کی صورتیں پہچانی جاسکتی تھیں ان میں انور نہیں ملا۔ باقی جتنی لاشیں تھیں وہ اس طرح ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں کہ سب ایک سی معلوم ہوتی تھیں۔ سکینہ کی نظر جس پر پڑتی وہ اس کو انور معلوم ہوتا تھا اور وہ اس سے لپٹ جاتی تھی۔ مگر پھر یکایک اجنبیت کے احساس کے ساتھ اس سے الگ ہو جاتی تھی۔

آدھی رات جاتے جاتے پچھم سے ایک انجن چند ڈبوں کے ساتھ اور کئی ٹھیلے پہنچ گئے اور کئی لاشوں اور مجروحوں کو بھرا جانے لگا۔ سب سے پہلے اونچے درجوں کے مسافروں کی طرف توجہ کی گئی اور ان کو آرام اور احتیاط کے ساتھ رکھا گیا باقی گھاس بھوسے کی طرح ڈبوں کے اندر ٹھوسے جانے لگے۔

پو پھٹ چلی تھی۔ میدان صاف ہو گیا تھا۔ صرف دو لاشیں پڑی رہ گئی تھیں جن کے پاس سکینہ بیٹھی بلک رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ریلوے کا ٹھیلہ آیا اور ان لاشوں کو بھی اٹھائے گیا۔

(۵)

سکینہ کا چیتا ٹل گیا ہے اور وہ اسی جگہ جا جا کر بیٹھتی ہے، جیسے اس کی روح وہاں بندھ گئی ہو۔ لوگ اس کو پکڑ کر گھر لے آتے ہیں، مگر وہ آنکھ بچا کر پھر وہیں پہنچ جاتی ہے اور چپ چاپ وہاں بیٹھی رہتی ہے یا آہستہ آہستہ روتی ہے۔

ریلوے سے جواب طلب کئے جارہے ہیں۔ وہ جو رُوداد بتا رہے ہیں اور لاشوں اور مجروحوں کی جو تعداد دے رہے ہیں عوام کا خیال ہے کہ وہ غلط ہے۔ مرنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔

پنڈت رام اوتار شرما اور مال گاڑی کے گارڈ پر مقدمے چل رہے ہیں اور یقین ہے دونوں کو سخت سزائیں ملیں گی۔ دونوں نے پہلے تو مل کر بڑی سازشیں کیں اور بہت چاہا کہ کسی پیٹ مین یا کسی اور ادنی ملازم کے سر بلا جائے لیکن معاملہ بہت صاف تھا اور کوئی سازش کارگر نہیں ہوئی۔ آخر میں ایک دوسرے کے سر الزام تھوپنے لگے ہیں۔ پنڈت رام اوتار شرما نے اپنی گزشتہ خدمات کا بہت واسطہ دلایا لیکن ان کی شنوائی نہیں ہوئی۔ اب وہ ایسی ملازمت کو صلواتیں سنا رہے ہیں جس میں آدمی پیخانہ پیشاب بھی نہ جاسکے اور سب سے کہتے پھرتے ہیں "بھیا سب نوکری کرے ریلوے کی نوکری نہ کرے"۔

(منشور افسانہ) **مجنوں گورکھپوری**

انوار جناب علی اختر صاحب کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شایع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پُرگو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر اُن کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوشؔ کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں ان کا کلام ہندستان کے بلند معیاری رسالوں مثلاً نگار، ہمایوں ادبی دنیا اور شاہکار وغیرہ میں شایع ہو کر کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اِس مجموعے کی اشاعت سے اردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے۔ قیمت مجلد عہ صفحات (۱۶۸)

غزل

دور ہم تم سے بھلا محفل میں کیونکر بیٹھتے　　جس کے دل میں تھی جگہ اس کے برابر بیٹھتے

آپ ہی انصاف کیجے آپ ہی فرمائیے　　غیر کی محفل میں ہم خاموش کیونکر بیٹھتے

یوں رہے برباد ہم تو کاروانِ عشق میں　　اکثر اٹھتے گرد کے مانند اکثر بیٹھتے

دیدۂ و دل خلوت و جلوت ہیں ان کے واسطے　　خواہ اندر بیٹھتے وہ خواہ باہر بیٹھتے

بیٹھے بیٹھے آگیا پھر تم کو یہ کس کا خیال　　آئے تھے ملنے تو میرے پاس دم بھر بیٹھتے

"چھوڑتے ساقی کا دامن حشر میں کیونکر بھلا؟　　خلد میں ہم تو قریبِ حوضِ کوثر بیٹھتے

خیر گذری ذکرِ دشمن پر وہ قایل ہو گئے　　ورنہ ہم بھی من چلے تھے کچھ نہ کچھ کر بیٹھتے

کس کی پروا کس سے پردہ شرم کیسی کس کا خوف　　کیا پڑی تھی ان کو ایسی کیوں وہ چھپ کر بیٹھتے

پھر صفائی سی صفائی اُن کے میرے ہو گئی　　کیوں مکدّر اب وہ رہتے کیوں مکدّر بیٹھتے

آئے تھے بہرِ عیادت وہ اگر اے ہمدمو!　　دم نکلتا دیکھتے بالیں پہ دم بھر بیٹھتے

تیر تھے نالے مرے تیرِ ہوائی یہ نہ تھے　　بیٹھتے بے شک نشانے پر مقرر بیٹھتے

بہتے بہتے تھم گئے آنسو خدا کا شکر ہے　　ورنہ اس طوفان میں تو سیکڑوں گھر بیٹھتے

شوخیٔ مضمون و بندش ختم ہے تجھ پر عزیز
لفظ کیا کیا ایک سے ہیں ایک بہتر بیٹھتے

نواب عزیز یار جنگ بہادر

افلاطون اور اُس کا فلسفہ

اس سے پیشتر کہ میں افلاطون کے متعلق کچھ لکھوں سرسری طور پر حکیم سقراط کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں جس کو "فلسفہ کا باوا آدم" کہا جاتا ہے اور جس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ "اس نے راست آسمان سے فلسفہ لایا تھا" ــــ غالباً یہی پہلا شخص ہے جس نے اس ربع بھری دنیا پر غور کیا اور مختلف نظریے قائم کئے ــــ فلسفے کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے ایک وہ جو کسی چیز کے "یقین" کے متعلق سوالات کرتا ہے اور دوسرا وہ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف دور میں کسی چیز کے متعلق فلسفیوں کا خیال کیوں اور کس طرح بدلتا رہا ہے۔ لیکن سقراط کا تعلق پہلے حصے سے تھا۔ اس کے دل میں سوالات کا ایک طوفان اٹھتا تھا اور ایک زبردست آندھی کی طرح یہ سوالات اس کے منہ سے باہر نکلتے تھے۔ ان نہ ختم ہونے والے سوالات نے لوگوں کو تنگ کر دیا ــــ وہ ہر ایک بات کے متعلق سوال کرتا "کیوں؟ ــــ یہ کس لئے؟ ــــ اس کا کیا مطلب ہے؟" وغیرہ ــــ غرض اس کا دل مختلف شکوک اور سوالات سے بھرا ہوا تھا ــــ اس کے زمانے کے لوگوں میں ابھی سوچنے کا مادہ نہیں پیدا ہوا تھا اور اس لئے ان کی زندگیاں خالی تھیں! اور یہی وجہ تھی کہ لوگ سقراط کے ان مختلف سوالات سے بیزار آ کر اس کی موت کا باعث ہوئے ــــ وہ چاہتا تھا کہ لوگ اپنے "خیال" کے متعلق خیال کریں ــــ وہ ہمیشہ یہی سوال کرتا کہ "آخر تم ان باتوں سے کس طرح زندگی اور موت کے مسئلہ کو حل کرتے ہو؟ ــــ تمہارے نزدیک "موت" ــــ پاکدامنی ــــ قومیت اور سچائی کے کیا معنی ہیں؟ ــــ"

غرض وہ اس قسم کے سوالات بغیر تھکے ہوئے کرتا چلا جاتا تھا۔ حکومت اس سے بیزار ہو کر آخر کار اس کی موت کا باعث ہوئی ــــ

فلسفے کے اس دوسرے رخ کے متعلق ہیگل اور مارکس نے اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "فلسفہ مختلف دور میں مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے" ــــ بیسویں صدی میں جس چیز کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اچھی ہے اور اس سے کوئی نقصان نہیں وہ آئندہ چل کر غلط ثابت ہوتا ہے "ہر چیز ایک خاص دور کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے اس کے بعد اغلب ہے کہ وہ ضرر رساں ثابت ہو ــــ انسانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس کا فلسفہ بھی بدلتا جاتا ہے۔

یونان فلسفیوں کے لئے مشہور ہے۔ فلسفیوں میں سقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ یونانیوں نے ہی سب سے پہلے قدرت اور اس کے قانون کے متعلق سوچ بچار کیا ــــ مگر قدیم یونانی یہ سمجھتے تھے کہ ہم سے کوئی اصلاح ناممکن ہے۔ قدرت جیسی ہے ویسی ہی رہے گی۔ اس میں ذرہ برابر رد و بدل نہیں کر سکتے ــــ وہ جانتے تھے کہ بہت سے نقائص ہیں لیکن وہ ان کو دور کرنے سے قاصر تھے برخلاف اس کے ان کا خیال تھا کہ ــــ ایک اور دنیا ہے جہاں ہر چیز اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہے اور اس میں کوئی نقص نہیں لیکن یہ دنیا ــــ خیالی دنیا ہے!

سقراط کے بعد افلاطون کا درجہ ہے۔ وہ ایک ایسے دور سے تعلق رکھتا ہے جس میں ایک خاص جماعت غور و خوض کے کے لئے مقرر تھی لیکن اس جماعت کے افراد کے خیالات ابھی پختہ نہیں تھے اور ہنوز بہت سے مسائل کے حل ان کے پاس موجود نہ تھے ــــ اور ان کے زمانے میں بعض سیاسی خامیاں ایسی تھیں کہ جن سے ان کے امن میں خلل پڑنے کا اندیشہ تھا

افلاطون اور بدھا میں کوئی فرق نہیں اس لئے کہ دونوں کے خیالات بڑی حد تک ملتے جلتے ہیں۔ افلاطون کو بھی "MYSTIC" کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ راست خدا سے باتیں کرتا تھا ـــــ یہاں پر خدا سے باتیں کرنے سے میری مراد یہ ہے کہ وہ اپنی دھن میں بہت دیر تک دنیا کے متعلق خیال کرتے ہوئے بیٹھ جاتا تھا ـــــ اس لئے اس کا فلسفہ عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اور چنانچہ اس کا ثبوت رافیل (RAPHAEL) کے مشہور کارٹون کے ذریعے ملتا ہے۔ اس میں افلاطون کو آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتلایا گیا ہے اور اس کے جانشین ارسطو کو زمین کی طرف ـ افلاطون نہ صرف ایک فلسفی تھا بلکہ ایک کامیاب سیاست داں بھی۔ چنانچہ جماعتی حکومت کے متعلق اس نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔

"میں نے خیال کیا تھا کہ یہ نئی حکومت (ایتھنز میں اسی کے زمانے میں جماعتی حکومت وجود میں آئی) نا انصافی کو دور کر کے انصاف کو عام کرے گی اس لئے میں نے اس کی حرکات کا بغور مطالعہ کرنا شروع کیا ـــــ اور کیا دیکھتا ہوں کہ ان لوگوں نے چند ہی دنوں میں اپنے اس دور کو سنہرا دور بنا دیا! ـــــ انھوں نے میرے ضعیف دوست (جس کے متعلق میں بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے زمانے کا مشہور فلسفی اور نیک طبیعت انسان ہے) کو حکم دیا کہ وہ ایک شہری کی گرفتاری میں حصہ لیں جس کو وہ ختم کر دینا چاہتے تھے ـــ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ آیا سقراط ان کی طرفداری میں ہے یا نہیں۔ لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ اور اسی لئے اس کو موت کے منہ میں جانے کی تیاریاں کرنی پڑیں۔

"جب میں نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تو مجھے سخت افسوس اور بے حد رنج ہوا ـــ اور میں نے طے کر لیا کہ اب اس طریق حکومت سے بالکل علحدہ ہو جاؤں گا۔

"جیسے جیسے میں ان واقعات پر غور کرنے لگتا ہوں ویسے ہی میرے رنج میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اور ایک اچھی حکومت کے قیام کا خیال مہمل سا نظر آتا ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ میں اس حکومت کے خلاف بغیر دوستوں کی مدد کے آواز بلند کروں ـــــ ایسے دوستوں کا ملنا بھی جو میرا ساتھ دے سکیں دشوار تھا۔ مگر آئے دن پیش آنے والے واقعات کا خیال کرتے ہوئے سیاسیات میں حصہ لینا میرے لئے ضروری تھا ـــــ لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کام میں بہت سی رکاوٹیں درپیش ہو رہی ہیں ـــــ میں اسی خیال میں گم رہنے لگا کہ کس طرح کوئی اصلاح اس حکومت میں ممکن ہے۔ لیکن اب میں حکومت کے راستے میں روڑے اٹکانے کے لئے موقع ڈھونڈنے لگا ـــــ لیکن بالآخر کار میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہر ایک ملک کی حکومت میں سوائے مستثنیات کے خرابیاں ہیں اور ہر حکومت میں کچھ ایسے قوانین ہیں کہ بغیر کسی زبردست انقلاب کے ان میں اصلاح ممکن نہیں۔ اور ساتھ ہی قسمت کا ساتھ دینا بھی ضروری ہے اور اسی لئے مجھے مجبور ہونا پڑا کہ میں فلسفے کی تعریف کروں اور یہ اعلان کروں کہ حقیقی انصاف صرف اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ انسان فلسفے سے کام لینا شروع کر دے۔ انسان اس وقت تک خرابیوں اور آفتوں سے نہیں بچ سکتا جب تک فلسفیوں کے ہاتھوں میں حکومت نہ آجائے یا حکومت کرنے والے فلسفی نہ بن جاسکیں ـــــ"

افلاطون کے اس بیان کے آخری الفاظ قابل لحاظ نہیں۔ یہ خیال اس کا اپنا ہے کہ فلسفی ہی حکومت اچھی طرح کر سکتا ہے۔ کیونکہ فلسفیوں کا دل بہت حساس اور نازک ہوتا ہے اور وہ بدی اور اچھائی میں آسانی سے تمیز کر لیتے ہیں۔

حق و انصاف کے قدر داں اور ظلم و تشدد کے دشمن ہوتے ہیں۔
ہر وہ شخص جس کے پاس انسان کا سا دل ہے اور اس دل میں
درد تو وہ فلسفی بن سکتا ہے۔ فلسفی بننے کے لئے خاص شرائط
نہیں ہیں ــــ چنانچہ ایک فلسفی کا خیال ہے کہ "ایک تین
سالہ بچہ بھی فلسفی بن سکتا ہے!ــــ فلسفے سے مراد غور و خوض
ہے اور جس میں غور و خوض کا مادہ ہو فلسفی بن سکتا ہے۔ افلاطون
کے فلسفیانہ اور سیاسی خیالات کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے لئے
"The Republic" پڑھنا کافی ہے۔

یہ کتاب اس فلسفی کے پورے خیالات کا نچوڑ ہے۔ امیر غریب
کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے ــــ امیر اپنی زندگی انہی غریبوں
کی مدد سے خوش حال بناتے ہیں اس لئے غریبوں کا خیال
رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اپنی زندگی کا ــــ ٹھیرو!
ــــ تم بھائی بھائی ہو۔ اگرچہ خدا نے تم کو مختلف بنایا ہے۔
تم میں سے بعض حکومت کرنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور
یہ سونے کے بنائے گئے ہیں اور دوسرے چاندی کے گر یاد رکھنا
چاہیئے کہ بعض اوقات سونے کے بنائے ہوئے باپ سے چاندی کا
بچہ پیدا ہو سکتا ہے! اور اسی طرح چاندی کا بنایا ہوا شخص اپنی
محنت سے تونگر یا سونے کا بن سکتا ہے! ــــ " مگر وہی
سونے کا باپ اپنے چاندی کے بچے کو نہیں دھتکارتا! ــــ
اس لئے کہ وہ اس کا بیٹا ہے لیکن برخلاف اس کے دوسروں کو
حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے۔ اس کو
دور کرنا چاہیے۔ ایسا انسان حقیقی معنوں میں انسان نہیں
کہا جا سکتا۔ انسانیت کے لئے اخلاق کی ضرورت ہے اور یہ اخلاق
صائب ہونے چاہئیں ــــ ایک دولتمند شخص اتنی آسانی
سے دوسروں کے دلوں کو موہ نہیں سکتا جتنا کہ ایک غریب
شخص اپنی نیک دلی اور حسنِ اخلاق کی وجہ سے موہ لیتا ہے۔
یہ کہنا کہ دنیا صرف دولت مندوں کے لئے ہے غلط ہے۔ دنیا
میں رہنے کا ہر شخص کو حق ہے خواہ وہ غریب ہی کیوں نہ ہو۔
افلاطون کا یہ نظریہ کہ حکمران فلسفی ہونا چاہیے بالکل درست
ہے اس لئے کہ ایک جابر اور ناعاقبت اندیش بادشاہ صرف ہمارے
جسم پر حکومت کر سکتا ہے۔ مگر برخلاف اس کے ایک فلسفی ہمارے
دلوں پر حکمران ہوتا ہے۔ چنانچہ راجا اور پرجا کے متعلق ٹالسٹائی
کے خیالات قابل قدر ہیں۔

افلاطون ایک ایسے دور میں گزرا ہے جب کہ ہر طرف
بدامنی پھیلی تھی اور ظلم و ستم کا راج تھا۔ اس کا یہ خیال کہ جماعتی
حکومت سے فائدہ ہوگا۔ غلط ثابت ہونے کی وجہ سے اسے بیحد
رنج پہنچا۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار ایک مصلح قوم و ملک کی
حیثیت سے نہیں کرتا بلکہ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے، جو ملک
و قوم اور گھر بار سے بے نیاز ہو کر امن اور شانتی کی تلاش میں
ہو۔ اس کی انقلاب پسند طبیعت ہی کی وجہ سے لوگ اس کے دشمن
ہو گئے ــــ حکومت کی نظروں میں وہ کھٹکنے لگا ــــ اور
آخر کار اس زبردست فلسفی کا بھی وہی انجام ہوا جو سقراط کا
ہوا تھا۔

جگناتھ راؤ دیسائی

اوٹی کا سفر

(یہ مضمون خورشید بیگم مرحومہ نے لکھا تھا جن کو ان کے شوہر بشیر حسین صاحب نے سب رس میں طباعت شائع کرنے کے لئے بھیجا ہے)

۱۴ر فروری ۶۱ء کو شام کی گاڑی سے اپنے شوہر کے ہمراہ مدراس سے اوٹی کے لیئے روانہ ہوئی۔ یہ گاڑی بلوماؤنٹین اکسپرس کہلاتی ہے۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ اوٹی کو جاتی ہے اور یہاں کے پہاڑ یوکلپٹس کے درختوں کی وجہ سے اودے نظر آتے ہیں۔ صبح کے وقت ریل بدل کر نیلگری ماؤنٹین میں بیٹھے۔ تھوڑی دور تک معمولی گاڑیوں کی طرح یہ گاڑی چلی صرف فرق اتنا تھا کہ انجن بجائے سامنے کے پیچھے کی جانب سے ڈھکیلتا ہوا اسے پہاڑ پر لے جاتا ہے۔ دو اسٹیشن جانے کے بعد دونوں پٹریوں کے بیچ میں ایک زنجیر نظر آئی اور ہر ڈبہ کے سامنے ایک ایک آدمی متعین تھا۔ اس لئے کہ اگر گاڑی پیچھے کی جانب پھسلنے لگے تو یہ بریک لگا دیں۔ گاڑی کی رفتار کم تھی اور ہر اسٹیشن کے قریب سیٹی دیتی اور بعض اوقات ٹھیر جاتی تھی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد پہاڑ شروع ہوگئے اور کچھ خنکی بھی ہونے لگی۔ دونوں جانب آبشار نظر آتے تھے۔ یوکلپٹس کے درخت اور چھالیا کے درختوں کے جھنڈ نظر آنے لگے۔ جوں جوں آگے بڑھے کھیتوں میں ایسے پودے نظر آئے جو پہاڑوں کے دامن میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے بعد میں دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ چائے کے کھیت ہیں۔ ایک اسٹیشن پر جب گاڑی کھڑی ہوئی تو ہم نے پہاڑی موز خریدے یہ نہایت لذیذ تھے اور نہایت سستے ملتے ہیں۔ جائفل بھی خریدے اور چونکہ پہلی مرتبہ یہ پھل خریدنے کا اتفاق ہوا تھا اس لئے میرے شوہر نے لاعلمی کی وجہ سے ایک پھل کو دانتوں سے چھیلنا شروع کیا دوسرے صاحب نے جو ساتھ بیٹھے ہوئے تھے انہیں منع کیا اور کہا کہ منہ کا مزہ خراب ہوجائے گا۔ دو تین روز رکھنے پر یہ خود بخود پھٹ گئے اور اندر جو تھی اور اس کے نیچے جائفل نظر آیا۔

جیسے جیسے گاڑی اوپر چلی تھی خنکی زیادہ ہوتی گئی۔ گیارہ بجے صبح اوٹی اسٹیشن پہونچ گئے۔ اسٹیشن دیکھ کر تعجب ہوا اس لئے کہ یہ بالکل معمولی ہے اور باوجود اس کے کہ بڑے بڑے آدمی اور گورنر یہاں اترتے ہیں یہ بالکل ہی خراب حالت میں رکھا گیا ہے۔ اسٹیشن سے فوراً ڈاک بنگلہ کو گئے جو تقریباً دو میل ہوگا۔ یہ بنگلہ (westmere) کہلاتا ہے اور اوٹی جھیل کے کنارے واقع ہے جگہ نہایت پُر فضا ہے۔ اس جھیل میں کشتیاں چلتی ہوئی تھیں اور ایک کلب بھی ہے جو موسم گرما میں کھلتا ہے۔ شام کو تھوڑی دیر کے لئے ٹہلتے ہوئے بازار تک گئے جو موسم نہ ہونے کی وجہ سے بالکل سنسان تھا صرف چند دوکانیں ضروریات کی موجود تھیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ موسم میں بڑی چہل پہل رہتی ہے۔ شام کو یوکلپٹس کی چند بوتلیں لوگوں کو تحفہ دینے کی غرض سے خریدیں اور واپس ہوئے۔ رات کا کھانا نہایت عمدہ تھا ایسا اچھا گوشت حیدرآباد یا کسی اور جگہ نصیب نہیں ہوا یہ غالباً یہاں کے انتظام کی خوبی ہے کہ کوئی خراب چیز نہیں رکھی جاتی۔

دوسرے دن صبح دس بجے اوٹی کے لئے روانہ ہوئے جو اوٹی سے تقریباً ۲۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں

مچھلیوں کے انڈوں میں سے بچے نکالے جاتے ہیں اور پھر بڑے کر کے ندی میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ طوالت کے خیال سے مختصراً اس کو بیان کرتی ہوں۔ کرتی جھیل جو اس جگہ سے تقریباً ۵۰ میل ہے وہاں نر اور مادہ دونوں کو پکڑتے ہیں پہلے مادہ کے انڈے اس کا پیٹ دبا کر نکالے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ نر کا مادہ ملایا جاتا ہے۔ باروری کے بعد انڈوں کو اس جگہ برف کے اندر رکھ کر لایا جاتا ہے اور یہ بڑے بڑے حوضوں میں رکھے جاتے ہیں۔ پانی ان کے اوپر سے بہتا ہے اور رفتہ رفتہ چھوٹے چھوٹے بچے انڈوں سے نکلتے ہیں۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب یہ غذا حاصل کرنے لگتے ہیں تو نہایت احتیاط کے ساتھ ان کی نگہداشت ہوتی ہے اور ان کو باہر حوض میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے مختلف حوض بنے ہوئے ہیں جن میں جسامت کے لحاظ سے ان کو رکھتے ہیں۔ بڑے ہونے کے بعد یہ مچھلیاں ندی میں چھوڑ دی جاتی ہیں۔ ان مچھلیوں کو ٹراؤٹ کہتے ہیں اور شروع میں یہ نیوزیلینڈ سے منگوائی گئی تھیں۔ ہر سال ان کو پکڑنے کے لیے شوقین لوگ آتے ہیں اور فیس دے کر ان کا شکار کرتے ہیں۔ مچھلیاں پکڑنے کا ایک کلب ہے جسے سرکاری امداد بھی ملتی ہے اور ممبروں کے چندے کی وجہ سے یہ نہایت اچھی حالت میں ہے۔ اولنج ایک وادی میں ہے جسے ہرا بھرا ہونے کی وجہ سے وادیٔ زمرد یں
(Emerald valley) کہتے ہیں۔ واپسی شام کو ہوئی۔ رات کو سردی کی وجہ سے آگ جلانی پڑی لیکن پھر بھی سردی معلوم ہوتی رہی۔

اوٹی ۷۶۰۰ فیٹ مدراس کے مقابلہ میں بلند ہے اور اسی وجہ سے سردی بہت ہوتی ہے لیکن ایسی نہیں کہ ناقابل برداشت۔ صبح کا منظر نہایت خوشنما ہوتا ہے اس لئے کہ کہر جھیل سے کھیلتی ہوئی جاتی ہے اور پہاڑوں پر سے بھی گزرتی ہے۔ سڑکیں نہایت عمدہ ہیں اور ہر جگہ موٹر جا سکتی ہے۔ یہاں کے موٹر والے بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہیں اور پرانے قصے ہمیشہ سناتے رہتے ہیں۔ ولیعہد بہادر اور شہزادی دُر شہوار کے نہایت مداح ہیں اس لئے کہ ہمیشہ ان سے خوب انعام اکرام پاتے رہتے ہیں۔

شام کو اوٹی کے باغ میں گئے اور وہاں سے پہاڑی باشندوں (ٹوڈاز) کی قیام گاہوں کو جا کر ان لوگوں کے فوٹو لئے۔ ان کی عورتوں کے بال بنانے کا فیشن ایسا ہے جس کی نقل آج کل یورپ اور امریکہ کی عورتیں کر رہی ہیں ان کی جھونپڑیاں بھی عجیب قسم کی بنی ہوئی ہیں۔ اوٹی کا باغ نہایت خوش نما ہے اور نہایت اچھی حالت میں رکھا گیا ہے۔ واپسی میں مارکٹ وغیرہ دیکھی معمولی ہے اور جگہ کے لحاظ سے زیادہ قابل ذکر نہیں۔

دوران قیام میں چائے کے کھیت دیکھنے کا اتفاق ہوا جو پہاڑوں کے دامن میں دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں سے پتیاں توڑنے کے بعد کو لمبٹور یا میٹوپیلم بھیجی جاتی ہیں اور یہاں خشک کرنے اور تیار کرنے کے بعد مختلف حصوں کو بھیج دی جاتی ہیں۔ دوسری خاص پیداوار یوکلپٹس کے تیل کی ہے جو یہاں سے تیار کرنے کے بعد بوتلوں میں بند کیا جاتا اور باہر بھیجا جاتا ہے۔

اوٹی سے واپس ہوتے ہوئے کونور میں بھی چند گھنٹے قیام رہا یہاں کی آبادی زیادہ ہے اور یہاں لوگ سال تمام قیام کرتے ہیں لیکن یہ اوٹی کی طرح خوبصورت

نہیں ہے۔ اوٹی میں حضور نظام کا محل ہے اور ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ عمارت معمولی ہے اور سنا گیا ہے کہ شہزادگان بلند اقبال کا یہاں قیام نہیں رہتا۔ دوسرے دو بڑے محل بڑودہ اور میسور کے ہیں۔ بڑودہ کا محل بند تھا اس دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ میسور کے محل میں باغ نہایت خوبصورتی کے ساتھ لگایا گیا ہے اور غالباً یہ اوٹی میں سب سے بہتر ہے۔ جے پور اور جودھپور کے محلات بھی دیکھے لیکن یہ معمولی تھے۔

اوٹی سے واپسی ۸ر فروری کو ہوئی اور مدراس دوسرے روز صبح میں پہونچ گئے۔ سرد جگہ سے یہاں آنے کے بعد کئی روز تک گرمی ہوتی رہی اس لئے کہ سرد مقام سے گرم مقام میں منتقل ہوئے تھے۔ آئندہ مضمون میں انشاءاللہ ملابار وغیرہ کے حالات قلمبند کروں گی۔

غوثیہ رحیم اللہ قریشی

روٹی

یہ خوں آلود آنسو اور آہیں
یہ غم کی اوس میں بھیگی نگاہیں
یہ زنجیروں کی زد میں سخت باہیں

امیرو! تم سے روٹی مانگتی ہیں

یہ چوراہوں میں سڑنے والی لاشیں
یہ مزدوروں کے دل کی زرد قاشیں
یہ رخساروں پہ بل کھاتی خراشیں

امیرو! تم سے روٹی مانگتی ہیں

یہ تقریریں جو خوں کھولا رہی ہیں
یہ تحریریں جو خوں کھولا رہی ہیں
یہ شمشیریں جو خوں کھولا رہی ہیں

امیرو! تم سے روٹی مانگتی ہیں

یہ سینوں میں ابھرتی سی بغاوت
دبانے سے ابھرنے والی فطرت
جو بازاروں میں بکتی ہے وہ عصمت

امیرو! تم سے روٹی مانگتی ہیں

(ناتمام)

الطاف مشہدی

ریزرو بنک

ہندوستان میں ۱۸۹۳ء سے قبل عوام سرکاری ٹکسال میں اجرت دے کر اپنا روپیہ مسکوک کراتے تھے۔ لیکن انڈیا ایکٹ بابتہ ۱۸۹۳ء جو ہرشل کمیشن کی رپورٹ پر نافذ ہوا تھا حکومت نے ٹکسال کو عوام کے لئے بند کر دیا۔ اور روپیہ سرکاری دار الضرب میں تیار ہونے لگا۔ چونکہ روپیہ میں ۱۶ آنے کی پوری چاندی نہیں ہوتی۔ اس لئے سرکار کو روپیہ مسکوک کرنے میں فائدہ ہوتا ہے۔ جب ۱۸۹۹ء میں سکہ کی مزید تحقیقات کے لئے فاؤلر کمیشن کا تقرر ہوا تو اس کمیشن نے اپنی سفارشات میں منجملہ دیگر امور کے ٹکسال کے منافع کا علحدہ خزانہ قایم کرنے کی بھی سفارش کی۔ تاکہ شرح تبادلہ قایم رکھنے میں اس خزانہ سے مدد لی جاسکے۔ "معیار طلا" قایم رکھنے کا یہ خزانہ گولڈ اسٹانڈرڈ ریزرو کہلاتا ہے۔ وزیر ہند نے اس کی منظوری ۱۹۰۰ء میں دیدی تھی لیکن طے یہ ہوا کہ یہ خزانہ لندن میں رکھا جائے۔ ہندوستان کے اعتراض پر یہ حکم ہوا کہ خزانہ کے زر نقد کا نصف حصہ ہندوستان میں رکھا جائے اور نصف انگلستان میں۔ البتہ سود پر رقم صرف انگلستان میں چلائی جائے لیکن بصورت نقد کبھی رقم خزانہ میں جمع نہیں رہی۔ اس لئے ہندوستان میں یہ خزانہ جمع نہ ہوا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد محکمہ مالیات علحدہ قایم کیا گیا۔ اور مسٹر ولسن کو جو ماہر مالیات تھے ولایت سے ہندوستان بلوایا گیا۔ جنھوں نے مالیات کی تحقیقات کے بعد کاروبار کی سہولت کے مدنظر کرنسی نوٹ جاری کرنے کی رائے دی جس کو حکومت نے ۱۸۶۱ء میں منظور کرلیا۔ اس وقت سے ہندوستان میں سرکاری نوٹ کا چلن شروع ہوا۔ اجرائی نوٹ کے قانون میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ جتنی رقم کے نوٹ جاری ہوں اتنا روپیہ خزانہ میں رکھا جائے۔ یا بصورت چاندی ۹۷۹ روپیہ کے مقابلہ میں ۱۰۰۰ تولہ چاندی رکھی جائے۔ نیز سونے کے سکے یا سونا خزانے میں جمع ہو جانے کی صورت میں اس کی قیمت کے نوٹ جاری کئے جائیں۔ اس خزانہ سے اولاً بقدر ۱۴ کروڑ روپیہ گورنمنٹ سکیوریٹیز میں سود پر چلانے کی اجازت تھی۔ یہ خزانہ ۱۸۹۸ء تک ہندوستان ہی میں تھا۔ گولڈ نوٹ ایکٹ کے تحت بعد میں اس خزانہ کی ایک شاخ انگلستان میں بھی قایم کردی گئی تھی۔ اس خزانہ کے قانون میں وقتاً فوقتاً ترمیم ہوتی رہی۔ ۲۵ر اگست ۱۹۲۵ء میں جو کمیشن موسومہ ہلٹن ینگ کرنسی کمیشن' بغرض تحقیقات مقرر ہوا تھا اس نے ۱۹۲۶ء میں اپنی رائے حکومت کے سامنے پیش کی کہ کرنسی نوٹ کے خزانہ اور معیار کے خزانہ کو ملا دیا جائے اور اس مشترک خزانہ کو وزیر ہند اور حکومت ہند کی بجائے ایک علحدہ مرکزی بنک کے سپرد کر دیا جائے جس کا نام ریزرو بنک ہے۔ اس کمیشن کے چار ہندوستانی اور چھ انگریز ارکان تھے۔ دونوں خزانوں کو مشترک کر دینے کے متعلق کمیشن نے یہ وجہ بیان کی کہ نوٹوں کے خزانہ کی غرض نوٹوں کی قیمت کا قائم رکھنا ہے اور طلائی خزانہ کی غرض روپیہ کی قیمت کا قایم رکھنا ہے۔ چونکہ نوٹ اور روپیہ آپس میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اس لئے دونوں خزانوں کا مقصد ایک ہی ہو جاتا ہے۔ لہذا دونوں خزانوں کو ایک کر دینا زیادہ مناسب ہے۔

ریزرو بنک کی یہ تجویز کوئی نئی نہ تھی۔ تاہم اس کمیشن نے اس مسئلہ پر پوری صراحت کے ساتھ روشنی ڈالی اور یہ بتایا کہ سکہ اور شرح تبادلہ اور لین دین کی پالیسی کی مستحکم بنیاد اسی طرح قایم ہو سکتی ہے کہ یہ سب امور ایک ہی

بنک کے سپرد کر دیئے جائیں۔ چونکہ اس کمیشن کے فرائض میں
شرح تبادلہ کی تحقیقات بھی شامل تھی، کمیشن نے ۱۸ پنس
فی روپیہ شرح تبادلہ قایم کرنے کی رائے دی۔ ۱۸ پنس شرح
تبادلہ قایم ہونے سے قبل پہلی مرتبہ ۱۶ پنس فی روپیہ پھر بعد
۲۴ پنس فی روپیہ شرح تبادلہ قایم کی گئی تھی۔ شرح تبادلہ کی
حدتک ۲۳ اگست ۱۹۲۶ء میں بل اسمبلی میں پیش کیا گیا جو دوسرے
اجلاس کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ اور اس اثنا میں حکومت نے
ایک نیا بل ریزرو بنک کے متعلق تیار کیا جس میں کمیشن مذکور
کی قریب قریب جملہ سفارشات کے مطابق دفعات رکھی گئی تھیں۔
اس بل کو جنوری ۱۹۲۷ء کے اجلاس اسمبلی میں پیش کیا گیا۔
جس پر کافی غور وخوض کی ضرورت تھی۔ اس لئے یہ بل بغرض
رپورٹ ایک کمیٹی کے سپرد کیا گیا۔ کمیٹی اسمبلی اور مجلس مملکت
(کونسل آف اسٹیٹ) کے ۲۸ مشترک ارکان پر مشتمل تھی۔ اس
کمیٹی نے بعد تحقیقات اپنی رپورٹ اوائل ۲۹ اگست ۱۹۲۷ء
کو اسمبلی میں پیش کی۔ سرکاری طور پر ریزرو بنک کے متعلق
جو بل تیار کیا گیا تھا وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) ہندوستان میں معیار طلا رقایم کیا جانا مقصود تھا۔
گر سونے کا سکہ رائج کرنے کی تجویز نہ تھی۔

(۲) ریزرو بنک کی جماعت انتظامی (گورننگ بورڈ)
کے پندرہ رکن مقرر کرنے کی تجویز تھی جن میں ایک سرکاری
ملازم ہونا درج تھا جس کو معاملات بنک پر ووٹ دینے کا
حق نہیں دیا گیا تھا۔

باقی چودہ ممبر ڈائرکٹر ہونا طے ہوا تھا جن میں سے
پانچ تو حکومت نامزد کرے گی۔ بورڈ کے ممبر جو ڈائرکٹر ہوں گے
ان کی حسب ذیل تفصیل تھی

(۱) ملازم سرکار جس کو ووٹ دینے کا حق نہ تھا۔ . . . ۱
(۲) گورنر } حکومت کے نامزد کردہ ۱
(۳) ڈپٹی گورنر } ۱
(۴) دوسرے ممبر } ۲
(۵) ممبر حصہ داروں کے منتخب کردہ ۹

بنک کا سرمایہ پندرہ کروڑ روپے مقرر کیا گیا تھا۔ جس کے تمام حصے
کی خرید سے پورے کئے جانے کی تجویز تھی۔ اور حکومت بھی اس
میں ایک حصہ دار تھی۔ اور یہی حصہ دار ممبروں کو منتخب کرنے
والے ہوں گے کمیٹی متذکرۂ بالا نے اکثریت کے ساتھ دو ترمیمیں
اس بل میں پیش کیں۔ پہلی ہندوستان میں سونے کا سکہ
جاری ہونے کے متعلق دوسری یہ کہ بنک سرکاری ہو نہ کہ نجی
یعنی حصہ داروں کا نہ ہو۔ اور ڈائرکٹر حسب تفصیل ذیل مقرر
کئے جائیں۔

۱۔ گورنر ۱ | ڈپٹی گورنر، گورنر کا نامزد کردہ ہے۔ اور گورنر یا ڈپٹی
۲۔ ڈپٹی گورنر ۱ | گورنر میں سے ایک لازمی طور سے ہندوستانی
۳۔ ڈائرکٹر ۲ | ہو اور دونوں ڈائرکٹر بھی ہندوستانی ہوں۔

صوبجاتی مجالس مقننہ کے منتخب رکن (۳) جن کو غیر سرکاری
رکن منتخب کریں گے۔
مرکزی حکومت کے منتخب رکن (۳) جن کو غیر سرکاری رکن منتخب
کریں گے۔
ہندوستانی ایوان تجارت کی مقننہ جماعت کے منتخب رکن (۳)
چیمبر آف کامرس کے منتخب رکن (۲)
صوبجاتی کوآپریٹیو بنکوں کا منتخب رکن (۱)
ملازم سرکار (۱) جسے ووٹ دینے کا حق نہ ہوگا۔

یہ رپورٹ جب اسمبلی میں پیش ہوئی تو اس پر ممبر مالیات سے کافی
بحث ہوئی اور بالآخر تصفیہ یہ ہوا کہ بنک سرکاری ہوگا۔ اور
ہندوستانی ممبر نے یہ تسلیم کر لیا کہ ڈائرکٹروں کے انتخاب کے لئے

حقیقت انقلاب بتائے دکھائی گئے۔ اور ابتدائی مرحلے طے ہوگئے
جب بل پر وقتاً فوقتاً غور ہوتا شروع ہوا۔ وقتاً فوقتاً غور کے سلسلہ
میں پھر اختلافات پیدا ہوگئے۔ اس لئے رکن مالیات نے
کو دوبارہ سکھ کے ۲۲ فروری ۱۹۲۳ء کو دہلی میں جب اسمبلی
کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا تو رکن مالیات نے جناب
سرکار سالانہ بل کا بجٹ دوسرا بل پیش کرنا چاہا۔ جس کے
متعلق اعتراض ہوا کہ جب تک پہلے بل کا تصفیہ نہ ہوجائے
قانوناً دوسرا بل پیش نہیں ہوسکتا۔ صدر اسمبلی مسٹر پٹیل نے
اعتراض کو تسلیم کرکے بل کو پیش کرنے سے روک دیا۔ اس طرح
ریزرو بنک کے قیام کا مسئلہ اس نوبت پر ختم ہوگیا۔ ہندوستان
کو جدید اصلاحات دینے کے سلسلہ میں جو آئینی کمیشن (سائمن
کمیشن) مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے ریزرو بنک کے مسئلہ پر بھی
اپنی رائے دی۔ نیز ۱۹۳۴ء میں انڈین لیجسلیچر نے ریزرو بنک
قایم کرنے کے لئے ایک ایکٹ منظور کر لیا تھا۔ جائنٹ پارلیمنٹری
کمیٹی نے ریزرو بنک پر بحث کرتے ہوئے تحریر کیا کہ "اس وقت
کرنسی اور تبادلہ براہِ راست حکومتِ ہند کے ہاتھ میں ہیں۔
لیکن کچھ عرصے سے یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ اس کے اختیارات
سنٹرل بنک کے سپرد کر دیئے جائیں جو اس کے ساتھ ساتھ ملک
کے قرضہ جات کی بھی نگرانی اور نگہداشت کرے گا۔ اس تجویز کا
جواز اس وقت اور زیادہ قوی ہوجاتا ہے جبکہ مرکزی حکومت
میں دستوری تغیرات رونما ہو رہے ہوں۔ ہم اس رائے
سے جو ملک معظم کی حکومت کے پیش نظر ہمیشہ سے رہی ہے
متفق ہیں کہ مرکز میں آئینی تغیرات کے رونما ہونے کے
پیش نظر ایک ریزرو بنک کے قیام کی ضرورت ہے جو سیاسی
اثرات سے محفوظ رہ کر مستحکم بنیادوں پر قایم ہو۔"

البتہ جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی نے آئینی کمیشن کی اس
سفارش میں جو اس نے کرنسی اور تبادلے کے نظم ونسق کے
سلسلہ میں بنک کے فرائض و اختیارات کے متعلق پیش
کی تھی، قدرے ترمیم کرنے کی رائے دی تھی۔ ان تمام انقلابات
و مباحث کے بعد جدید قانونِ ہند ۱۹۳۵ء کی رو سے ریزرو بنک
ہندوستان میں قایم ہوگیا۔ اور موجودہ قانون کے لحاظ
سے ریزرو بنک کا سرمایہ پانچ کروڑ روپے ہے اور ایک
حصہ سو روپے کا ہے۔ بنک کی شاخیں بمبئی۔ دہلی۔ کلکتہ
مدراس اور رنگون میں قایم ہیں۔ بنک کی نگرانی اور انتظام
کا کام ڈائرکٹروں کی ایک مرکزی مجلس کے سپرد ہے۔ اس میں
ایک گورنر اور دو ڈپٹی گورنر ہوتے ہیں۔ انھیں گورنر جنرل کے
کونسل کے مشورے سے مقرر کرتا ہے۔ چار ڈائرکٹر بھی گورنر
جنرل مع کونسل کی طرف سے نامزد کئے جاتے ہیں۔ آٹھ ڈائرکٹر
حصہ داروں کی طرف سے منتخب ہوتے ہیں اور گورنر جنرل مع
کونسل ایک سرکاری افسر مقرر کرتا ہے۔ گورنر جنرل سے اجازت
لئے بغیر کوئی ایسا مسودہ یا مسودہ کی ترمیم وفاقی جماعت قانون ساز
میں پیش نہیں ہوسکتی۔ جس کا سکہ سازی یا کرنسی یا بنک کے
فرائض پر اثر پڑتا ہو گورنر جنرل، گورنر اور ڈپٹی گورنروں
کے تقرر و علحدگی ان کی تنخواہوں، الاؤنس اور مدت ملازمت
کی منظوری اور ڈائرکٹروں کی نامزدگی و موقوفی وغیرہ
کے معاملات میں اختیار خصوصی سے کام لے گا۔ وہ مرکزی
بورڈ کو توڑ بھی سکتا ہے اور بنک کو دیوالیہ بھی قرار دے
سکتا ہے۔

محمد عیسیٰ خاں

نئی کتابیں

۱۔ مشرق و مغرب (افسانہ) از حمیدہ سلطان ۱۰۵ صفحات قیمت ۸؍
انیس نسواں دہلی۔

۲۔ معمارِ اعظم (ڈراما) مترجمہ عزیز احمد قیمت ۱۲؍ انجمن ترقی اردو۔ دہلی۔

۳۔ اضافیت از ڈاکٹر رضی الدین صدیقی قیمت ۱۲؍ انجمن ترقی اردو دہلی

۴۔ تاریخ یوسفِ دکن (سوانح نواب مختار الملک مرحوم) از مصطفائی بیگم
لیڈی کمشنر خزانہ عامرہ قیمت للعہ از کوشک نمبر مکان ۳۱۵۹ کاچی گوڑہ

۵۔ خطابیات (فنِ تقریر) از شیخ رحیم الدین ۱۱۲ صفحات قیمت ۱۲؍
سب رس کتاب گھر۔ حیدر آباد

۶۔ انوار (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ) از علی اختر ۱۹۸ صفحات
قیمت عہ۔ سب رس کتاب گھر حیدر آباد

۷۔ مبادی سیاسیات (دوسرا ایڈیشن) از ہارون خاں شروانی
۶۰۸ صفحات قیمت صہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

۸۔ خطوط محمد علی مرتبہ پروفیسر محمد سرور ۴۲۰ صفحات قیمت عاں۔
مکتبہ جامعہ دہلی۔

۹۔ ظالم محبت (ناول) از محترمہ حجاب امتیاز علی ۲۴۴ صفحات قیمت عاں
ساقی بکڈپو۔ دہلی

۱۰۔ سوگوار شباب (المیہ ناول) از پروفیسر مجنون گورکھپوری قیمت عہ
ایوان اشاعت گورکھپور۔

۱۱۔ آپ بیتیاں (افسانے) از منشی تیرتھ رام فیروز پوری قیمت عہ
دائرۂ ادبیہ۔ رام گلی۔ لاہور

۱۲۔ گناہ غربت (ناول) از لیو ٹالسٹائی قیمت عہ مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدر آباد۔

۱۳۔ شمع زندگی (ناول) از سرت چندر چڑجی قیمت ۱۲؍ " "

۱۴۔ آزمائش (افسانے) از منشی سدرشن قیمت ۸؍ " " "

۱۵۔ ٹالسٹائی کے افسانے مترجمہ شاکر میرٹھی قیمت ۱۲؍ " " "

۱۶۔ پاکیزہ افسانے از ٹیگور وغیرہ قیمت ۱۲؍ مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدر آباد۔

۱۷۔ درد کی تصویریں (افسانے) از تراب قیمت عہ " " "

۱۸۔ آدھے گھنٹہ میں ہندی (ہندی سیکھنے کے آسان طریقے) از عظیم بیگ
چغتائی قیمت ۴؍ دفتر کتابت۔ جودھپور۔

۱۹۔ پس پردہ (مجموعہ کلام) از اختر بریلوی ۴۸ صفحات قیمت ۱۲؍
میزان الادب۔ ذخیرہ اسٹریٹ۔ بریلی۔

۲۰۔ صنعت و حرفت کے قیمتی راز از مہانند ۲۰۰ صفحات قیمت عہ
سیوا ایک ڈپو۔ لاہور۔

۲۱۔ ۲۰۴ عورتیں (افسانے) از منشی تیرتھ رام فیروز پوری قیمت ۸؍
دائرۂ ادبیہ۔ رام گلی۔ لاہور

۲۲۔ قفس زریں (ناول) مترجمہ منشی تیرتھ رام فیروز پوری قیمت (ایضاً)
دائرۂ ادبیہ۔ رام گلی۔ لاہور۔

۲۳۔ کہکشاں (افسانے) از رفیق اجمیری ۴۸۴ صفحات قیمت عاں۔ ساقی بکڈپو دہلی

۲۴۔ بیوی اور بیسوا (ڈراما) از کشن چند زیبا قیمت ۱۲؍ لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور۔

۲۵۔ مرلی منوہر (ڈراما) " " " "

۲۶۔ حسین اور انقلاب (مسدس) از جوش ملیح آبادی ۴۸ صفحات قیمت سرفراز بکڈپو لکھنؤ

۲۷۔ ارشاد رسالت (احادیث کا منظوم ترجمہ) از محمد رمضان ۹۶ صفحات قیمت ۱۵؍
اسلامی دار الاشاعت۔ اقبال گنج۔ گجرات۔

۲۸۔ شہر خموشاں (افسانے) از سید محمود مضطر قیمت ۸؍ گلفروش پبلشنگ ہاؤس دہلی

۲۹۔ غلاموں کی بغاوت (انقلابی افسانے) از مرزا ادیب قیمت عہ۔ نرائن دت سہگل لاہور

۳۰۔ صبح نشاط (مجموعہ کلام) از اصغر حسین خان نظیر ۱۰۴ صفحات قیمت ۷
منیر اینڈ برادرز۔ لدھیانہ۔

۳۱۔ زبان دانی (اردو کی اصلاح) از فضل الٰہی عارف ۲۰۰ صفحات ۸؍ پنجابی اکیڈمی لاہور

۳۲۔ گنج پنہاں (مسدس) از اکبر الہ آبادی قیمت عہ۔ رضا کمال بکڈپو لاہور۔

۳۳۔ اردو انسائیکلوپیڈیا (نمونہ) مرتبہ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن (چار آنے کے اسٹامپ بھیج کر منگوا سکتے ہیں)

مرزا سیف علیخاں

ادارہ کی خبریں

شعبہ اردو انسائیکلوپیڈیا

تقسیم کار | اردو انسائیکلوپیڈیا چونکہ ماہرین علوم وفنون کی نگرانی میں مرتب ہو رہا ہے اس لئے تقسیم کار کرکے متعدد ماہرین کی الگ الگ کمیٹیاں علوم وفنون کے لحاظ سے بنائی گئی ہیں جن کی خاص ہدایات کے تحت الفاظ پر مقالات مرتب کئے جا رہے ہیں۔ علم انجنیری کی کمیٹی مولوی سید عارف الدین صاحب چیف انجنیر کی زیر نگرانی حسب ذیل انجنیروں کے تعاون سے سرگرم کار ہے۔

(۱) سول انجنیری..... داعی ۔ مولوی ولدار حسین صاحب و مولوی عبدالصمد صاحب سوداگر

شرکاء

الف عمارتیں...... ۱۔ مولوی صادق علی خاں صاحب
۲۔ مولوی محمد ابراہیم صاحب
ب سڑکیں اور پل..... ۳۔ مولوی عبدالصمد صاحب سوداگر
ج آبپاشی...... ۴۔ مولوی خواجہ عظیم الدین صاحب
د آبرسانی...... ۵ مولوی رحمت اللہ صاحب
۶ مولوی مہدی علی صاحب
ہ حفظانی انجنیرنگ ۷ مولوی عبدالصمد صاحب سوداگر
و اشیائے تعمیر...... ۸ مولوی عبدالصمد صاحب سوداگر
ز محکمہ کنکریٹ..... ۹ مولوی حفیظ اللہ صاحب
ح پیمائش...... ۱۰ مولوی محسن الدین صاحب حقانی

(۲) میکانی انجنیری..... داعی ۔ مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری

شرکاء

الف انجن...... ۱۔ مولوی عابد علی صاحب
ب مشینیں..... ۲۔ مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری
ج فلزیات اور ایندھن ۳۔ مولوی عبداللہ حسن صاحب
د شینوں اور انجنوں کے پُرزے ۴۔ مولوی عبدالقادر صاحب
ہ ہوائی جہاز ۵۔ مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری
۶۔ مسٹر پنگل مدھوسودن صاحب ریڈی

(۳) برقی انجنیری..... داعی ۔ مولوی افضل علی خاں صاحب

شرکاء

۱۔ مولوی مصطفیٰ بیگ صاحب
۲۔ مولوی مخدوم حسینی صاحب
۳۔ مولوی حبیب عثمان صاحب
۴۔ مولوی خطیب حید حسین صاحب

(۴) فن عمارت اور ٹاؤن پلاننگ..... داعی ۔ مولوی عزیز علی صاحب

شرکاء

۱۔ مولوی فیاض الدین صاحب
۲۔ مولوی حشمت رضا صاحب

(۵) معدنیات...... داعی ۔ مولوی سید کاظم صاحب
(۶) نقشہ کشی...... داعی ۔ مولوی حفیظ اللہ صاحب
(۷) ریلوے...... داعی ۔ مولوی یٰسین علی خاں صاحب

اسی طرح جغرافیہ کی کمیٹی مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے نائب ناظم تعلیمات کی نگرانی میں حسب ذیل اصحاب کے تعاون سے متعلقہ الفاظ پر مقالات مرتب کروا رہی ہے۔

—— طے پایا کہ ہر شعبہ حسب سہولت اپنے اراکین میں اضافہ کر سکے گا۔

—— طے پایا کہ جملہ اصحاب کے یہاں متعلقہ فہرستیں روانہ کی جائیں تاکہ آیندہ اجلاس تک وہ اپنے اپنے موضوعوں سے متعلق الفاظ کا اضافہ کریں۔

—— طے پایا کہ آیندہ اجلاس جمعہ ۸ شہریور ۱۳۵۰ف کو صبح میں ساڑھے نو بجے منعقد کیا جائے۔

۱۔ ممالک شمالی (یورپ، ایشیا، شمالی امریکہ وغیرہ۔) — قاسم علی سجن لال صاحب ایم اے ڈپٹی ہیڈ مددگار چادرگھاٹ ہائی اسکول؛ عشرت علی خاں صاحب ایم اے ڈپٹی ہیڈ مددگار چادرگھاٹ ہائی اسکول

۲۔ ممالک جنوبی (افریقہ، آسٹریلیا، جنوبی امریکہ، نیوزیلینڈ، جزائر شرق الہند، غرب الہند وغیرہ) — محمد یوسف صاحب بی اے بی ٹی، صدر مدرس کاچی گوڑہ۔؛ گنیش چند حسابی بی اے بی ٹی مددگار دارالعلوم

۳۔ دنیا کی خطہ واری تقسیم — غلام قادر صاحب بی اے وائس پرنسپل سٹی کالج۔؛ عبدالغفور صاحب بی اے بی ٹی مددگار مدرسہ نامپلی۔

۴ ریاضیاتی جغرافیہ...... — عبدالوکیل صاحب ایم اے ڈپٹی ایڈ صدر مدرس مدرسہ عالم پور

۵ سمندر اور اس کے متعلقات — عبدالجبار صاحب سبحانی بی اے بی ٹی ناظر تعلیمات ورنگل۔

۶ جغرافیہ اور اس کی تاریخ واہمیت واثرات وغیرہ — سید احمد صاحب ایم اے۔ ایف آر جی ایس

۷ کمرشیل اور اکنامک جغرافیہ...... ظہیر احسن صاحب صدر شعبۂ جغرافیہ جامعہ عثمانیہ

۸ ہندستان...... جی ایس بھان صاحب بی اے۔

۹ ہوا اور اس کے متعلقات۔ مولوی عبدالجبار صاحب سبحانی بی اے، بی ٹی۔

اسی طرح دوسرے علوم وفنون کے ماہرین کی بھی الگ الگ کمیٹیاں بنائی جاچکی ہیں جن کا تفصیلی ذکر سب رس کی آیندہ اشاعت میں شریک رہے گا۔

مولوی محمد سجاد مرزا صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج نے اپنی نگرانی میں تعلیمات سے متعلق کام شروع کرا دیا ہے اور کام کا ایک عمدہ خاکہ تیار کرلیا ہے۔

مختلف سرکاری محکمے مثلاً آبکاری، جنگلات، مالگزاری اور پٹہ وغیرہ بھی اس کام میں ہاتھ بٹا رہے ہیں اور اس کام کے اہل اصحاب کو متعین کر دیا ہے۔

تعاون عمل حسب ذیل اصحاب بھی ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

(۱) ظفر الاحسن صاحب آئی، سی، ایس۔ مسٹر ظفر الاحسن بی اے (آنرز) آئی سی ایس ڈیرہ غازی خاں سے تحریر فرماتے ہیں۔

"مجھے سیاسیات میں اور خاص کر کے سیاسیات کے اس شعبہ سے جس کا تعلق سیاسی اور شہری نظام سے ہے بہت دلچسپی ہے اور ہندستان میں اور یورپ میں اس کے مطالعہ کرنے کا موقع بھی ملا ہے۔ اگر اس سلسلہ میں میری خدمات کام آسکیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی"۔

(۲) ڈاکٹر بنل الرحمٰن۔ اسمٰعیل کالج بمبئی کے پرنسپل ڈاکٹر بنل الرحمٰن صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"اس دفعہ کے حیدرآباد کے مختصر قیام کے دوران میں

آپ کے لطف و کرم سے ادارہ کو تفصیلی طور پر دیکھنے کا موقع ملا۔ دکن از سر نو اردو کا مرکز بن گیا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت بہت بڑا کام ہے۔ اس سلسلہ میں اب تک جو کچھ آپ حضرات کر چکے ہیں اس کو دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی۔ میں انشاء اللہ اپنے وعدے پر قایم رہوں گا۔ جو خدمت میں کر سکوں گا اس سے ہرگز گریز نہ ہوگا۔"

(۳) پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی تحریر فرماتے ہیں۔

"اس سلسلہ میں جو کام بھی میرے سپرد ہوگا اس کو باعث عزت و افتخار سمجھ کر انشاء اللہ ضرور انجام دوں گا۔ گجراتی لٹریچر سے متعلق آپ کیا لکھوانا چاہتے ہیں تحریر فرمائیے یہاں وہ کام بہت اچھی طرح ہو جائیگا۔"

(۴) پروفیسر سراج حسین صاحب نقوی اسمٰعیل کالج تحریر فرماتے ہیں۔

"مجھ سے جو کچھ بھی خدمت ہو سکے گی میں کرنے کو تیار ہوں سائنس کے شعبہ طبیعیات سے مجھے خاص طور پر دلچسپی ہے اس شعبہ میں آپ مجھ سے بلا تکلف کام لے سکتے ہیں۔"

(۵) اردو کے مشہور ادیب مجنوں گورکھپوری تحریر فرماتے ہیں۔

"مجھے جو مسرت ہوئی ہے وہ معرض اظہار سے باہر ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ جو تصور سالہا سال سے پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اس کی تکمیل ہو گئی ہے۔ شکر ہے آپ لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں اور اس کام کو پورا کر رہے ہیں۔ میں اس کام میں آپ لوگوں کی مدد کرنے کیلئے تیار ہوں۔ مندرجہ عنوانات کے تحت اس انسائیکلوپیڈیا میں حصہ لے سکتا ہوں یہ وہ موضوعات ہیں جنہیں زندگی بھر مجھے دلچسپی رہی ہے اور جن کا میں مطالعہ کرتا رہا ہوں۔"

نمونہ کی اشاعت حسب صدر اردو انسائیکلوپیڈیا کی مجلس انتظامی نے چند روز پہلے ابتدائی نمونہ شائع کیا تاکہ اسکے ذریعہ ایک طرف تو عوام کو اس عظیم الشان کام کی نوعیت کا صحیح اندازہ ہو سکے اور دوسری طرف اردو انسائیکلوپیڈیا کے قلمی معاونین کے پیش نظر نمونہ کے چند مقالات رہیں تاکہ وہ زبان انداز بیان اور مواد کے متعلق معینہ معیار کی پیروی کر سکیں۔

حیدرآباد میں اور بیرون حیدرآباد سیکڑوں اہل علم و فضل اصحاب اور مدیران رسائل و اخبارات کے ہاں اس کی کاپیاں بھیجی گئیں۔ چونکہ یہ خواہش بھی کی گئی تھی کہ وہ اپنی آزادانہ رائے سے مطلع کریں اس لئے ہر ڈاک سے بیسیوں خطوط برابر آ رہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر علماء اور صاحبانِ نظر نے اس نمونہ کو بڑی اچھی نظر سے تفصیل کے ساتھ دیکھا ہے۔ اس سلسلہ میں منتظمین اردو انسائیکلوپیڈیا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ایسے سب اہل علم و کمال اصحاب کا "سب رس" کے ذریعے شکریہ ادا کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے ہی حضرات کی ہمت افزائی سے اتنا بڑا کام تکمیل کو پہنچ سکے گا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ فرداً فرداً سب کا شکریہ ادا کیا جاتا لیکن ہمارے سیکڑوں مخلص دوستوں کو الگ الگ لکھنا موجودہ مصروفیتوں کی وجہ سے بڑی حد تک ناممکن سا تھا اس لئے "سب رس" کو ترجمان بنایا گیا۔

نمونہ کے متعلق ہمیں جو خطوط وصول ہوئے ان میں سے چند کے اقتباس یہ ہیں:

پرنسپل محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب۔ مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب سابق پرنسپل جامعہ عثمانیہ اردو انسائیکلوپیڈیا کے ابتدائی نمونہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:-

"اردو زبان میں ایک ایسی کتاب کی سخت ضرورت ہے جو تعلیم یافتہ عوام کو دَورِ حاضر کی تیز رفتار ترقی کے لحاظ سے مختلف شعبہ جات علوم و فنون کے روزمرہ مسائل کی نسبت صحیح اور قابل اعتماد معلومات بہم پہنچا سکے۔ ادارۂ ادبیات اردو کی یہ کوشش قابل مبارکباد ہے۔ مجھے امید ہے کہ محققین اس کا خیر مقدم کریں گے۔ اور اپنے مساعیٔ جمیلہ سے اس کو کامیاب بنائیں گے۔"

مولٰنا عبدالماجد صاحب۔ مولٰنا عبدالماجد صاحب دریابادی ایڈیٹر صدق اردو انسائیکلو پیڈیا کے نمونہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :۔

" انسائیکلو پیڈیا کا نمونہ پہنچا۔ سبحان اللہ ماشاء اللہ اتنے بہتر کام کی کم از کم مجھے تو توقع نہ تھی خواب ہم لوگوں (یعنی حضرت سلیمان اور اس مور ضعیف) نے ۱۹۱۶ء میں دیکھا تھا۔ تعبیرہ ۲ سال بعد آپ لوگوں کے ہاتھوں پوری ہوئی۔ "این سعادت بہ زور بازو نیست" نمونہ کے اوراق میں مجھے تو کہیں بھی حرف گیری کی گنجایش نظر نہیں آتی :"

مولوی قاضی زین العابدین صاحب ایچ۔ سی۔ ایس ناظم آبکاری تحریر فرماتے ہیں :۔

"... اردو انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب اور اشاعت کا کام آغاز کر کے اردو ادب کی ایک بیش بہا خدمت کی ذمہ داری ادارہ نے قبول فرمائی ہے۔ خدا آپ کی مدد فرمائے اور اس کو انجام تک پہنچائے۔ ملک کے ہر فرد کا یہ فریضہ ہے کہ اس کار سترگ میں ادارہ کی مدد کرے۔

"... نمونہ میں سمجھتا ہوں کہ فی الجملہ بہت کامیاب ہے .... کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کی طباعت دار الطبع سرکار عالی کے جدید ٹائپ پر ہو جس کی وجہ اس کی صفائی اور شان دوبالا ہو جائے گی ...."

ڈاکٹر محمد باقر صاحب ایم اے پی ایچ ڈی اورنٹیل کالج لاہور تحریر فرماتے ہیں :۔

"....اردو انسائیکلو پیڈیا کا نمونہ ملا۔ آپ کی محنت اور کاوش کی داد دیتا ہوں۔ خدا کرے کہ یہ کام جلد از جلد سر انجام پائے۔"

شاخ کلیانی اس ماہ میں اس شاخ کو مولوی عبدالکریم صاحب شریک معتمد اور غلام معین الدین صاحب معتمد رکن تشہیر نے حسب ذیل کتب مرحمت کی ہیں۔

ورڈسورتھ اور اس کی شاعری۔ بغداد عہد عباسیہ میں۔ افصح الکلام۔ سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب۔ اشک ندامت کی حقیقت۔ فتح علم روح تنقید۔ خطبۂ صدارت صاحبزادہ آفتاب احمد صاحب۔ ہم اور ہمارے اعمال۔ کلام اکبر۔ بجری سانٹ۔ مسیح کی انجیل۔

کتب عطیہ مولوی غلام معین الدین صاحب۔ پھول گلدستہ عاشقوں کا۔ چٹکیاں و گدگدیاں۔ افسانہ۔ سبز گنبد کے مکیں۔ نصاب التعلیم۔ اس وقت تک دار المطالعہ کی کتب کی جملہ تعداد (۱۳۰) ہے۔ اس سے قبل کے عطیوں کی تفصیل یہ ہے۔

مولوی عبدالکریم صاحب مدرس و شریک معتمد شاخ ہذا۔ اسلامی عملی زندگی۔ مجلہ عثمانیہ۔ تاریخ ہند۔ زمزمۂ محبت۔ گلدستہ عزیزیہ انوار الاخلاق۔ ریلوے کا مختصر خاکہ۔ مختصر سرگذشت سررشتۂ ٹپہ۔ رپورٹ مجلس اتحاد المسلمین مع خطبۂ صدارت۔ مصباح القواعد۔ جنات فاضل۔ دیوان غالب۔ جیبی اطلس دنیا۔

مولوی خیر الدین صاحب منتظم دار المطالعہ۔ نغمۂ الہام۔ چار یار۔ سپاس جناب امیر

مولوی غلام معین الدین صاحب رکن تشہیر۔ سی پارۂ دل بدر النساء کی مصیبت۔ فن تقریر۔ علاج بذریعہ پانی بھاپ۔ دیہی منتقیں۔

مولوی شیخ محبوب صاحب بھونگے سوداگر۔ تاریخ مسلم لیگ۔

مولوی تاج الدین صاحب مدرس رکن مراسلات۔ فضائل و احکام نماز۔ شمع توحید۔ فلسفۂ ارکان اسلام۔

مسٹر وتو سنگھ صاحب داروغہ باغات۔ ہندوستان کو قرض دیجیے

مولوی محبوب حسن صاحب جگر - سو شلزم -

محمد عطاء اللہ عطا معتمد شاخ ہذا۔ سلسلۂ دینیات حصہ اول، سوم و ششم۔ ٹیپو سلطان کے ستر پاجی۔ بیکسی آمد دست پناہ۔ معیار الاخلاق۔ محفل خواجہ۔ ذخیرۂ حکمت۔ تذکرۂ پاک حصۂ اول۔ کلام فصیح۔ سحر سامری۔ افسانہ۔ چمن زار اردو۔ جیبی رہنما سررشتہ ٹپہ سرکار عالی۔ ہندوستان کی تاریخی کہانیاں۔ داسوخت ناظم۔ تارا گڑھ کی لڑائی۔ عروس جنت۔ تقاریر مولانا محمد علی جوہر۔ منتخب الحکایات۔ نور نامہ وغیرہ۔ اسلامی رسول۔ کریمہ۔ رسالہ نظام المشائخ۔ اردو کی چوتھی۔ سرمایۂ نجات۔ نغمۂ ذاکر۔ دکن کی تاریخی کہانیاں۔ بزم اردو۔ کلید تصوف۔ رقعات عنایت علی۔ چار آئینہ اردو۔

دار المطالعہ اوقات مقررہ پر برابر کھولا جا رہا ہے اس کے لئے ایک لڑکا مواجبی مالؔ ماہانہ کا مقرر کیا گیا ہے اور دوکان سے ماہانہ کرایہ کی حاصل کیگئی ہے ادارہ کی معطیہ کتب کے علاوہ دیگر کتب بھی جو مختلف حضرات نے مرحمت فرمائی ہیں مطالعہ کے لئے رکھی گئی ہیں۔

حسب ذیل اشخاص نے مندرجہ ذیل اخبارات ادارہ کو مرحمت فرمائے ہیں۔

۱۔ عالیجناب مولوی احمد حسین صاحب تعلقدار اسٹیٹ کلیانی۔ روزنامہ پیام حیدرآباد
۲۔ مولوی غلام معین الدین صاحب رکن تشہیر شاخ ہذا۔ ہفتہ وار پیسہ اخبار لاہور
۳۔ اسحاق علی صاحب سوداگر۔ ہفتہ وار دین و دنیا، دہلی
۴۔ معتمد شاخ ہذا ہفتہ وار خیام لاہور
۵۔ مولوی شیخ حضرت سوداگر اقبال بمبئی۔

مزید اخبارہ رسایل وکتب کی ضرورت ہے چونکہ ہنوز آمدنی کافی نہیں اس لئے جیسی جیسی آمدنی میں زیادتی ہوگی بنظر حالات اخبارات وغیرہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

چونکہ ادارہ میں ایک شعبۂ تاریخ دکن بھی قایم ہے اس لئے شاخ ہذا نے بھی مقامی تاریخی تحقیقات کو اپنے پروگرام میں شامل کرلیا ہے چنانچہ اس بات کو سن کر آپ ضرور خوش ہوں گے کہ میں نے کلیانی کی تاریخ لکھنی شروع کردی ہے جو ایک قدیم تاریخی مقام ہے یہاں ایک مستحکم قدیم قلعہ موجود ہے قلعہ سے متعلق میں نے ایک مضمون مرتب کرلیا ہے جس میں حوالجات کے ساتھ ساتھ میری ذاتی تحقیقات بھی شامل ہے۔ یہ مضمون قلعہ کے کتبات، فصیل و بروج اور محلات کے حالات پر مشتمل ہے جو نہایت غور و خوض اور فکر و تحقیق سے مرتب کیا گیا ہے۔

محمد عطاء اللہ عطا (معتمد شاخ کلیانی)

شعبۂ طلبہ گلبرگہ کا ایک جلسہ بتاریخ ۱۴؍ امرداد ۱۳۵۰ف زیر صدارت مولوی احمد عبد العزیز صاحب لکچرار منعقد ہوا۔

پہلے عبد الرشید نے فائز کی ایک نظم جس کا عنوان نغمۂ آزادی تھا سنائی پھر قاضی حمید الدین نے ایک تقریر (مقصد زندگی) پر کی۔ جس میں انھوں نے زندگی کے تقریباً جملہ مقاصد کو واضح طور پر بتایا بعد ازاں حامد بن احمد نے انور شاہ آبادی کی ایک نظم (استاد) سنائی جو پسند کی گئی۔ اس میں استاد کی عظمت کا نہایت اچھے الفاظ میں اظہار کیا گیا تھا۔ پھر معین الدین ارشد نے سائنس کی اچھائیاں اور برائیاں بیان کیں۔ اس کے بعد ضیاء علی خاں نے اردو کی تخلیق پر عمدہ تقریر کی انھوں نے تفصیلی طور پر بتایا کہ اردو ایک مقدس یادگار ہے ہندو مسلم اتحاد کی۔ اور اردو کی خصوصیات بھی بیان کیں۔ اس کے بعد سید محمد نور الحسن نے ادارۂ ادبیات کا تعارف کراتے ہوئے کہا "چونکہ ادارہ ایک نہایت اہم مقصد رکھتا ہے جو ہندو مسلم دونوں کے لئے فائدہ مند ہے لہذا ہم سب کو اسکی اعانت کرنی چاہیئے" ساتھ ہی ساتھ شعبۂ طلبہ کا بھی ذکر کیا اور اس شعبہ میں طلبہ کو شریک

ہونے کی ترغیب دی۔ چنانچہ مندرجۂ ذیل طلبہ نے نہایت خوشی کے ساتھ اپنا نام رکنیت میں لکھوا دیا۔

۱۔ عبدالغنی ۲۔ حبیب الرحمٰن ۳۔ سید حسن سجاد رزائی ۴۔ حامد بن احمد ۵۔ محمد فاروق حسین ۶۔ بدیع الدین ۷۔ محمد یوسف حسین ۸۔ محمد حسین مسعود ۹۔ محمد اسمٰعیل خاں ۱۰۔ منہاج الدین مجاہد۔

اس کے بعد عالیجناب صدر صاحب نے ایک عالمانہ تقریر "فنِ خطابت" پر کی۔ تقریر کے اصول کو نہایت سلیس طریقہ سے واضح کیا اور ایک اچھے مقرر بننے کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں بتلائیں۔ آپ نے بڑے بڑے مقرروں کی مثالیں دیں اور فرمایا کہ یہ سب پہلے تم ہی جیسے تھے۔ مگر بچپن ہی سے انھوں نے مشق کی اور ان اصول کے ذریعہ یہ رتبہ حاصل کیا۔ آپ نے فرمایا کہ طالب علموں کو تقریر کی مشق کرنی چاہیئے۔

معتمد شعبۂ طلبہ گلبرگہ نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا جو دور دور محلوں سے اس جلسہ میں شرکت کیلئے تشریف لائے تھے۔ اور کہا واقعی ان حوصلہ مند نوجوانوں کی وجہ سے ہمارا مستقبل شاندار ہوگا۔ بعد میں عالیجناب صدر صاحب جلسہ کا بھی شکریہ ادا کیا جنھوں نے اپنا قیمتی وقت اس جلسہ کیلئے دیا اور طالب علموں کو اپنی تقریر سے مستفید فرمایا۔

اس جلسہ میں اراکین شعبۂ طلبہ کے علاوہ اور کئی طالب علم شریک تھے۔ بہرحال جلسہ کامل دو گھنٹہ کے بعد کامیابی کے ساتھ برخاست ہوا۔

اس ماہ مندرجہ بالا طلبہ کے علاوہ ان طلبہ نے بھی رکنیت قبول کی۔ محمد مسعود انصاری۔ محمد منور حسین۔ عبدالحمید۔ عبدالقادر۔

جلسہ انتظامی شعبۂ طلبہ گلبرگہ کی مجلس انتظامی کا ایک جلسہ ۱۴ر امرداد ۱۳۵۰ف جناب نیاز علی خاں صاحب نیاز کی صدارت میں منعقد ہوا۔ تقریباً جملہ ارکان نے شرکت کی۔

۱۔ معتمد نے عبدالمجید خاں صاحب نائب معتمد کا روانہ کردہ استعفا پیش کیا اور وہ منظور کیا گیا۔

۲۔ طے پایا کہ نائب معتمد کی جگہ فی الحال خالی رہے۔ آیندہ اس کا انتخاب عمل میں آئے گا۔

۳۔ سید محمد نورالحسن (معتمد) نے یہ تحریک پیش کی کہ دیہات سدھار کے تحت گلبرگہ کے قریب کے دیہاتوں کو پہنچکر اردو دانوں میں اضافہ کرنے کے لئے وہاں کے کسی اردو داں شخص کو منتخب کیا جائے اور اسے ترغیب دی جائے کہ وہ اپنے دیہاتی بھائیوں کو کچھ نہ کچھ اردو سکھائے اور اس کام کی اہمیت سمجھائی جائے۔ اس تحریک کو منظور کیا گیا۔ اور آیندہ کسی تعطیلات میں بشرطیکہ کوئی تعلیمی حرج نہ ہو ضرور کسی قریبی دیہات کو ارکان اس کام کے سلسلہ میں جائیں گے۔

سید محمد نورالحسن معتمد شعبۂ طلبہ گلبرگہ۔

شعبۂ طلبہ کلیانی بتاریخ ۸ر جون ۱۹۴۱ء شعبہ طلبہ کی جانب سے ایک جلسہ بمقام رحمت منزل قرار پایا تھا جس میں منظور احمد صاحب معتمد شعبہ طلبہ اور شہاب الدین صاحب اور سید قادر صاحب اراکین شعبہ نے حبِ وطن پر تقاریر کیں آخر میں معتمد شاخ کلیانی نے اپنی تقریر میں شعبہ کی ترقی کے لئے حاضرین کو بطور خاص توجہ دلائی۔

اردو امتحانات جن امیدواروں کی درخواستیں اور فیس وصول ہو چکی ہے ان کے ہال ٹکٹ امتحان سے پندرہ روز قبل روانہ کر دیئے جائیں گے۔ اس بارے میں مزید مراسلت کی ضرورت نہیں ہے البتہ امیدوار حسب ذیل مرکزوں میں سے اپنی سہولت کے

مطابق کوئی ایک پسند کرکے اطلاع دیں۔

حیدرآباد، پربھنی، گلبرگہ، کلیانی، نرسی، کپل، پرینڈہ، شاہ پور، پرلی، کاماریڈی، کشتگی۔

اردو امتحانات کے لئے مفت تعلیم کا انتظام ادارے کے دفتر واقع خیریت آباد کے علاوہ درسگاہ علوم شرقیہ بیرون یاقوت پورہ میں بھی کیا گیا ہے۔

چونکہ تاریخ داخلہ گزرنے کے بعد بھی بعض دور دراز کے دیہات اور اضلاع سے شرکت امتحانات کی درخواستیں اس عذر کے ساتھ وصول ہو رہی تھیں کہ ان کے پاس شرکت کی آخری تاریخ کی اطلاع بروقت نہ پہنچ سکی کیونکہ بعض مقام طاعون اور ہیضے کی وجہ سے متاثر تھے اسلئے اس مسئلہ پر غور کرنے کی خاطر اردو امتحانات کی ذیلی مجلس زیر صدارت مولوی سجاد مرزا صاحب، ٹریننگ کالج میں منعقد ہوئی اور طے کیا کہ ایسی درخواستیں حسب شرح ذیل دیرانہ کے ساتھ ۵ ر شہریور تک قبول کرلی جائیں۔

اردو دانی چار آنے۔ اردو عالم ایک روپیہ۔ اردو فاضل ایک روپیہ آٹھ آنے اور خوش نویسی آٹھ آنے۔ لہٰذا ۵ر شہریور تک شرکت کی درخواستیں دیرانہ کے ساتھ روانہ کی جاسکتی ہیں۔ اس کے بعد کوئی درخواست قبول نہیں کیجائیگی۔

اردو انسائیکلوپیڈیا ایک عظیم الشان ادبی کارنامہ

"ادارۂ ادبیات اردو نے اپنی زندگی کی تھوڑی سی مدت میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر جامعہ عثمانیہ کی زیر صدارت اردو زبان کی جو خدمت مختلف زاویوں سے کی ہے وہ ایسی ہے کہ اس کو اسی قسم کے معمر اداروں کی صف میں بے چون و چرا کھڑا کرسکتی ہے۔ اب اس نے اردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و اشاعت کا اتنا بڑا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے کہ اس کی تکمیل کے بعد وہ سارے ہندوستان میں یقیناً عدیم النظیر ہو جائے گا۔

اردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و اشاعت کوئی آسان کام ہے اور نہ دو چار دس پانچ مخلصوں ہی کے اشتراکِ عمل سے انجام پا سکتا ہے۔ اس کے لئے ہر علم و فن کے متعدد قابل افراد کا نہایت ہی مخلصانہ تعاون ناگزیر ہے اور ہمیں اردو انسائیکلوپیڈیا کے اس نمونے سے جو دفتر پر وصول ہوا ہے اور جو مطبوعہ بھی ہے اور چوڑی تقطیع کے ۱۶ صفحوں پر خوشخط "حرف الف کے چند مختلف الفاظ" پر نمونہ کے مضامین کے ساتھ شائع ہوا ہے یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ اردو انسائیکلوپیڈیا کی مجلسِ انتظامی نے جس کے صدر ڈاکٹر زور صاحب اور معتمدین مولوی فیض محمد صدیقی صاحب اور مولوی سید بادشاہ حسین صاحب ہیں۔ ملک کے اندر اور باہر کے ان تمام علماء و فضلاء کی قلمی مخلصانہ اعانت حاصل کرلی ہے جو اس عظیم الشان کارنامہ کی تکمیل کے لئے ضروری ہے اور اس کا ابتدائی خاکہ بھی تیار کرلیا ہے جس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ یہ کام کم از کم بارہ جلدوں میں ختم ہو سکے گا اور ہر جلد ۵۰۰ صفحات سے کم پر مشتمل نہ ہوگی۔

مختلف ماہرین علوم و فنون کا انتخاب بڑی وسعت نظر سے کیا گیا ہے۔ ان میں ہر فرقہ اور ہندوستان کے ہر خطہ کے فضلاءٔ شامل ہیں۔

جس وسیع تخیل اور ہمہ گیری کے ساتھ اس کام کو شروع کیا گیا ہے اس میں ہمارے لئے کسی اضافہ کی فرمائش کی گنجائش نہیں چھوڑی گئی ہے۔

اتنا عظیم الشان کام، ہم حیران ہیں کہ ادارۂ ادبیات اردو بغیر ایک معتدبہ رقم کے کیسے انجام کو پہنچائے گا۔ بلاشبہ

اس نے ملک کے اندر اور باہر کے بڑے علماء اور ماہرین فن کی بے مزد خدمات حاصل کرلی ہیں مگر اتنی بڑی تالیف کی طباعت بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ اس نے ہماری علم پرور حکومت سے اپنے اس کارنامہ کے لئے جو مولوی عبدالحق صاحب کے "لغت اردو" سے بھی زیادہ اہم ہے کوئی امداد نہیں طلب کی۔ ہمیں امید ہے کہ اگر وہ اس خصوص میں حکومت سے درخواست کرے تو اس کی علم پروری ضرور اس کی امداد کو آگے بڑھے گی۔ وہ اس کام کے لئے نہ صرف ہماری بلکہ ساری دنیا کی مبارک باد کا مستحق ہے۔۔"

ادارےیہ رہبر دکن ۲۲ جون ۱۹۴۱ء

اردو کی ایک اہم ضرورت

"اردو انسائیکلو پیڈیا کا ذکر کئی ہفتہ ہوئے ان صفحات میں آچکا ہے۔ پچھلے ہفتہ نمونہ کے چند اوراق چھپے ہوئے مع متفرق معلومات کے وصول ہوگئے۔ یہ نمونہ بڑی اور چوڑی تقطیع کے ۱۵ صفحوں پر چھپا ہے۔ ہر صفحہ میں تین گنجان کالم ہیں، لیکن کتابت و طباعت صاف اور اتنی ضخامت میں چھوٹے بڑے ملا کر ۱۹ مقالے درج ہیں۔ زبان صاف، بیان واضح مضامین سب کے سب سنجیدہ، پُر معلومات مستند ایک انسائیکلو پیڈیا کے شایان شان۔

مجلس ادارت کے صدر، اردو کے مشہور خادم و کارکن ڈاکٹر زور ہیں، وہ معتمد ہیں، اور چھ ارکان (اراکین کا لفظ ترمیم طلب ہے) کی کمیٹی ان کے علاوہ کل فہرست مباحث ۲۶ ابواب میں تقسیم ہے۔

ہر شعبہ متعدد ماہرین فن کے ہاتھوں میں ہے۔ مثلاً شعبۂ اسلامیات میں مولانا سلیمان ندوی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالقدیر صدیقی حیدرآبادی وغیرہم ہیں۔

کم از کم یہ نمونہ جس معیار کو پیش کر رہا ہے، وہ ہماری توقعات سے بلند تر ہے۔ اندازہ ہے کہ پوری کتاب ۱۲ جلدوں میں تمام ہوگی، اور ہر جلد کم از کم پانچ سو صفحہ کی ضخامت کی ہوگی۔ اردو زبان کی ٹھوس، سنجیدہ اور قابل قدر خدمت اردو کے ہر ہواخواہ کی تائید اور عملی ہمدردی کی مستحق ہے۔ نمونہ کے یہ اوراق، دفتر اردو انسائیکلو پیڈیا خیرت آباد حیدرآباد دکن کے پتہ سے ۴ کے ٹکٹ میں حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر زور اور ان کے رفقاء یوں بھی سالہا سال سے اپنے کو خدمت اردو کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔ مگر ان کا یہ کارنامہ حقیقتاً ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے اور نسلوں بعد تک ان کی یادگار رہ جانے والا ہے۔۔"

ادارےیہ صدق ۲۳ جون ۱۹۴۱ء

رسالہ سہیل گیا۔ بابتہ جون ۱۹۴۱ء کے ادارےیہ میں لکھا ہے۔

جہاں تک اردو زبان کی خدمت و اشاعت کا تعلق ہے حیدرآباد ادارہ ادبیات اردو کی خدمتیں رہتی دنیا تک یادگار رہیں گی اب تک اس ادارہ سے مختلف علوم و فنون کی مستند اور جامع کتابیں شایع ہو کر ملک میں کافی مقبول ہو چکی ہیں اور آئے دن اسمیں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ بیجا نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ یہ انسائیکلو پیڈیا فنی اور معلوماتی لحاظ سے اردو میں نئی چیز ہوگی اور اس کی اولین اشاعت کا سہرا ادارہ ادبیات اردو کے ہی سر ہوگا اس کی ترتیب کیلئے ملک کے مستند ادبا اور ماہرین فن کی خدمات حاصل کرلی گئی ہیں اور سب سے زیادہ اطمینان اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کی ترتیب حیدرآباد کے مشہور محقق اور ادیب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی نگرانی میں ہو رہی ہے۔۔۔۔۔۔۔
اس کو ظاہری حیثیت سے بھی مکمل اور جاذب نظر بنانے کی حتی الامکان کوشش کیجارہی ہے چنانچہ سرورق کیلئے مشہور حسن کار خان بہادر عبدالرحمن چغتائی کی خدمتیں حاصل کرلی گئی ہیں۔۔۔۔۔۔ حامیان اردو سے ہماری پر زور اپیل ہے کہ وہ انسائیکلو پیڈیا کی اشاعت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں اور ادارہ ادبیات اردو کو موقع دیں کہ وہ اردو کی اس سے بھی زیادہ قیمتی خدمتیں انجام دے سکے۔

(ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں)

نام کتاب	ت صفحا	قیمت روپیہ	آنہ	
من کی بیتا	۸۰	۰	۸	۰
سرگذشت غالب	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
دکن نمبر (۷۸ تصاویر) ...	۱۶۸	۲	۰	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں	۴۸	۰	۴	۰
سرسید احمد خاں	۱۶	۰	۲	۰
سرسالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم ..	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی ...	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب ...	۵۶	۰	۲	۶
" دوسری کتاب ...	۵۶	۰	۴	۶
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر	۹۶	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴	۱	۰	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰
رسایل طبیہ	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں	۴۰	۰	۴	۰

نام کتاب	ت صفحا	قیمت روپیہ	آنہ	
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈ سورتھ اور اسکی شاعری...	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں ...	۸۹	۱	۰	۰
ٹیگور اور ان کی شاعری ...	۱۲۸	۱	۴	۰
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر...	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) " ...	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن ...	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۳۵	۱	۰	۰
مدارس میں اردو ...	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن	۱۰۴	۱	۴	۰
روح غالب	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصمہ	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۹	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء ...	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی	۲۱۲	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

اپریل ۱۹۸۱ء

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M 3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

جلد ۴ | بابت اپریل سنہ ۱۹۴۱ء | شمارہ ۴

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) "یہ ادارۂ ادبیات اُردو" کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی

(۲) مضامین متعلقۂ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابلِ اشاعت متصور نہ ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے۔

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وہ ویلیو پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

کارلائل کی "بلومین"

حیدرآباد میں رزیڈنسی کے قریب موٹربس کا ایک اسٹانڈ ہے جس کا نام "پتلی باؤلی" ہے کیونکہ یہاں اس نام کی ایک خوش نما باولی تھی جس میں لوگ سیڑھیوں کے ذریعہ سے اتر سکتے تھے۔ یہ باولی جو ایک صدی سے زیادہ عرصے تک لوگوں کو فائدہ پہنچاتی رہی، اب بند کردی گئی ہے اور آج کسی دیکھنے والے کے لئے اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ شہر سے آنے والی سڑک کا ایک حصہ اسی کے نام سے موسوم ہے ایک کتبے کے مطابق اس باولی کو حیدرآباد کے مشہور رزیڈنٹ میجر کلیس کرک پیٹرک نے ۱۸۰۳ء میں تعمیر کیا تھا اور یہ اس تقریب کی یادگار ہیں کہ اسے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ یہ بچی بعد کو اس قدر حسین نکلی کہ خود انگریزی ادب میں اس نے اپنے لئے جگہ پیدا کرلی چنانچہ اسے کارلائل نے اپنی مشہور ناول "ریپی ٹی ننس" میں "کٹی کرک پیٹرک" اور "سارٹر رسارٹس" میں "بلومین" کے نام سے پیش کیا ہے۔ مشہور مصنف اسکاٹ نے اس لڑکی کو ایک جگہ ان الفاظ میں یاد کیا ہے:۔ "وہ نصف بیگم تھی اور اس میں ایک تمثیلی انگریز عورت کا حسن بھی جھلکتا تھا" وہ کس طرح کارلائل کی دوست بن گئی اور کس طرح اس کردارنگار نے اس کی تصویر پیش کی، اس چیز کا مطالعہ آج بڑی دلچسپی رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہمارا ذہن اس زمانے تک پہنچ جاتا ہے جب کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اہل یورپ ہندوستان کے بڑے گھرانوں کی لڑکیوں سے آزادی کے ساتھ میل جول بڑھاتے تھے۔

خیرالنساء

اٹھارویں صدی عیسوی کے آواخر میں حیدرآباد کے رزیڈنٹ میجر جیمس کلیس کرک پیٹرک تھے اور یہ حضور نظام علی خاں کا عہد حکومت ہے ان کے لایق اور تجربہ کار مدارالمہام ارسطوجاہ بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان دونوں کے ساتھ میجر کرک پیٹرک نے بڑے اچھے تعلقات قایم کرلئے تھے چنانچہ انھوں نے اپنی آٹھ سال کی مدت ملازمت میں حیدرآباد کے ساتھ تین معاہدے بھی طے کئے۔ انہی میں ایک وہ معاہدہ بھی تھا جس کی رو سے حضور نظام نے فرانسیسی فوجی دستے کو اپنی ملازمت سے نکال دیا اور انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدۂ اتحاد طے کیا۔ میجر کرک پیٹرک جو حشمت جنگ کے خطاب سے سرفراز کئے گئے تھے، قدیم تزک و احتشام کے ساتھ رہتے تھے اور انھوں نے خیرالنساء نامی ایک مسلمان لڑکی سے شادی بھی کرلی تھی خیرالنساء سید گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور ایک اچھے ایرانی خاندان کی لڑکی تھی اور اس کے نانا انگریزی فوجی دستے کے بخشی تھے۔ اس عہدے کی وجہ سے بہت سے انگریز اُن کے گھر آیا کرتے اور ان کی دعوتیں بھی ہوتی رہتیں۔ میجر کرک پیٹرک بھی ان آنے جانے والوں میں شامل تھے اور چونکہ وہ نوجوان اور خوبرو تھے، ان کے مردانہ حسن کے چرچے گھر کی عورتوں میں بھی ہونے لگے تھے۔ جب خیرالنساء نے ان کو پہلی مرتبہ اپنے نانا کے گھر میں پردے کے پیچھے سے دیکھا تو وہ ان سے محبت کرنے لگی اور ایک بڑھیا کو پیام سلام کے لئے مقرر کیا۔ کرک پیٹرک نے اپنے بڑے بھائی کے نام جو خط لکھے ہیں ان میں اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ ایک مرتبہ اپنے مکان میں تنہا بیٹھا تھا کہ ایک بڑھیا آئی اور اس سے کہنے لگی کہ ایک مرتبہ خیرالنساء نے تمھیں دیکھ لیا ہے اور تم سے محبت کرنے لگی ہے بڑھیا نے اس سے یہ بھی التجا کی کہ تم اس کی درخواست کو منظور کرلو لیکن کرک پیٹرک نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا۔ بعد میں وہ ذہین

مرتبہ پھر آئی اور اسی طرح واپس کر دی گئی۔

بالآخر ایک رات کو خود خیر النساء کرک پیٹرک کے پاس آئی اور اس نے بذات خود اپنی درخواست پیش کی۔ کرک پیٹرک نے اس نوجوان حسینہ سے بحث و تمحیث کا سلسلہ شروع کیا مگر آخر میں اسے ناکام ہونا پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی اصول کے مطابق ایک معاہدہ نکاح طے پا گیا۔ حضور نظام نے بھی جنھوں نے اس شادی کی اجازت دی تھی، اپنی طرف سے نوشہ کو بہت سے قیمتی چڑھاوے دئے اور اسے "فرزند محبت پیوند" کے خطاب سے بھی سرفراز کیا۔ لیکن اس شادی کے بعد شہر حیدرآباد میں ایک ہلچل مچ گئی اصل میں کمپنی کی حکومت کو یہ پسند نہ تھا کہ اس کے ملازم ہندستانی عورتوں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کریں کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ ہندستانیوں کے زیر اثر نہ ہو جائیں۔ حیدرآباد میں میجر کرک پیٹرک کے بہت سے دشمن بھی تھے۔ انھوں نے گورنر جنرل کے پاس یہ رپورٹ کی کہ کرک پیٹرک بد اخلاقیوں کا مرتکب ہے۔ لیکن جب گورنر نے تحقیقات کی اور کرک پیٹرک کے خلاف جو الزامات لگائے گئے تھے انھیں بے بنیاد پایا تو اس نے کرک پیٹرک کو بحال کر دیا اور اس کی بہت ستائش بھی کی کہ وہ اس کے مسلک کے مطابق بہت کامیابی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔

اُن کے بیچے

حیدرآباد میں رزیڈنسی کی عالی شان عمارت کے نقشے کی ترتیب اور اس کی تعمیر کرک پیٹرک ہی کے زمانے میں ہوئی۔ اس وسیع رقبے میں اپنی بیوی کے لئے ایک زنانہ حصے کی بھی تعمیر کی تھی اور اس میں مصنوعی چشمے بنوا کر اسے بہت فرحت بخش بنا دیا تھا۔ عمارت کے اس زنانہ حصے کی دیواروں پر رنگ برنگ کے پھول، میوے، پودے، پرند اور دیگر جانور اتارے گئے تھے اور یہ حصہ اس قدر خوش رنگ ہو گیا تھا کہ اس کا نام "رنگ محل" رکھا گیا۔ مگر یہ عمارت ۱۸۶۰ء میں گرا دی گئی۔

خیر النساء سے کرک پیٹرک کو دو بچے ہوئے جن میں سے ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی۔ ان دونوں کو جب کہ ان کی عمریں ۴ اور ۳ سال کی تھیں ان کی ماں کی رضامندی سے انگلستان بھجوا دیا گیا تا کہ وہاں ان کی تعلیم و تربیت ہو۔ یہ بچے انگلستان میں اپنے دادا کے ساتھ رہنے لگے لیکن جب اس کا انتقال ہو گیا تو پھر یہ اپنی چچا زاد بہن کے زیر نگرانی رکھے گئے لیکن انگلستان جانے کے بعد ان بچوں کو پھر اپنے ماں باپ سے ملنا نصیب نہ ہوا کیونکہ ان کی روانگی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد یعنی ۱۸۰۵ء میں میجر کرک پیٹرک کا کلکتہ میں انتقال ہو گیا اور خیر النسا حیدرآباد واپس آ گئی ہندستانی ماں نے اپنی لاڈلی بچی کا نام صاحب بیگم بی بی صاحبہ رکھا تھا لیکن اب یہ نام بدل گیا اور وہ کیا تھرین آرورا یا جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے کٹی کرک پیٹرک کے نام سے موسوم ہو گئی۔ اس نے ۸۷ برس کی عمر پائی اور اس کے کئی بچے بھی ہوئے لیکن اس کا بھائی جوان مر گیا۔ اس کی ایک بیوہ اور تین لڑکیاں تھیں۔

کارلائل سے دوستی

جب کارلائل نے اپنی جامعہ کی زندگی ختم کی تو اس کے سامنے بہت سی مشکلیں تھیں۔ چنانچہ اسی کا اثر ہے کہ اس نے چرچ مدرسہ اور قانون سب کو چھوڑ دیا۔ ۱۸۲۲ء میں اس نے اپنے دوست ایڈورڈ ارونگ کے توسط سے مسٹر بلرتک رسائی حاصل کر لی اور ان کے بچوں کا اتالیق ہو گیا۔ موصوف جو بہت مالدار آدمی تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے محکمۂ مالگذاری میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے اور اب انھوں نے وظیفہ حاصل کر لیا تھا۔ بلر خاندان کی بدولت کارلائل سماج کے ایک ایسے دولتمند

مہذب اور متمدن طبقے سے روشناس ہوا جس کے ساتھ ملنے جلنے کا اسے اب تک اتفاق نہ ہوا تھا۔ جب وہ اپنے وارڈز کے ساتھ لندن آیا تو یہاں مسٹر بلر نے اس کو اپنی بہن مسز اسٹراچی سے ملا دیا اور یہی لڑکی ہے جس کے متعلق بعد میں کارلائل نے "عورتوں میں ہیرا" کے الفاظ استعمال کئے۔ یہ دونوں بہنیں ولیم کرک پیٹرک کی لڑکیاں تھیں جو کٹی کا چچا تھا۔ کارلائل نے کٹی سے پہلی مرتبہ ایڈورڈ ارونگ کے مکان پر ملاقات کی اور اس "نازک سیاہ آنکھوں اور بھورے بالوں والی ساحرہ" سے بہت متاثر ہوا۔

"کٹی اپنے دلفریب حسن کے لحاظ سے آپ اپنا جواب تھی اس کا لوٹا سا قد تھا سیاہ آنکھیں تھیں، بھورے بال تھے، گندمی رنگ تھا یہ پیکر محبت بہت خوش مزاج بھی تھی اور میرا خیال ہے کہ وہ زندگی بھر کسی دوسرے پر کبھی خفا نہ ہوئی تھی۔ وہ خود مختار تھی اور پچاس ہزار پونڈ کی دولت کے ساتھ دولت حسن کی بھی مالک تھی لیکن اس کے باوجود اس میں غرور و تمکنت نام کو نہ تھی بلکہ وہ بہت منکسر المزاج واقع ہوئی تھی"۔ چند روز بعد جب کارلائل اور کٹی زیادہ ملنے جلنے لگے تو یہ ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئے چنانچہ ۱۸۲۴ء میں یہ دونوں پندرہ دن کے لئے پیرس بھی ہو آئے۔ لیکن اسی زمانے میں کارلائل نے یہ سنا کہ مسز اسٹراچی اپنی اینگلو انڈین بہن کے لئے ایک اچھے بر کی تلاش کر رہی ہیں اس سے کارلائل بہت متاثر ہوا چنانچہ اپنی یادداشت میں اس نے لکھا ہے "مجھے یہ چیز اب زیادہ تکلیف دیتی ہے گو اس وقت بھی میں اس سے متاثر تھا۔ مسز اسٹراچی چاہتیں تو وہ آسانی سے اپنی بہن کے لئے میرا انتخاب کر سکتیں اور پھر ہم دونوں ہمیشہ انہی کے ساتھ رہتے" لیکن حالات ناموافق ہو گئے اور دونوں نے مختلف راہیں اختیار کیں۔ پیرس سے واپس آنے کے چند ہی مہینے بعد کارلائل کی شادی جین ولش سے ٹھیر گئی جو "ایک تیز نظر اور چرب زبان دوشیزہ تھی"۔ اسی طرح کٹی کے لئے بھی جیمس ونسلو فلپس کا انتخاب ہو گیا جو ساتویں مسلر کا کپتان تھا۔ کارلائل نے اس شادی کے بعد کٹی کے فوجی شوہر پر جس نے ہندستان میں اپنی خدمت انجام دی تھی، اس طرح چوٹ کی ہے "کٹی سپاہیوں کے کسی سابق کپتان کو انعام میں دے دی گئی"۔

کارلائل کی تصانیف میں اس کا تذکرہ

کٹی کا کوئی خاکہ پیش کرنے میں کہ اس کے مشرقی حسن و جمال کا کیا عالم تھا، ان الفاظ کا حوالہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے جن میں کارلائل نے اس کی تصویر کھینچی ہے۔ اس نے اس کی تصویر یوں پیش کی ہے "وہ ایک انوکھی رنگت کی دوشیزہ تھی۔ اس کی بھوری آنکھیں تھیں، وہ بہت خوبصورت تھی اور اس کے حسن میں ایک دلکشی تھی، اس کی آواز میں ترنم اور موسیقیت تھی اور وہ واقعی مسز اسٹراچی کی بہن معلوم ہوتی تھی" ایک جگہ یوں لکھا ہے "اس حسینہ کے چرچے ہر جگہ ہوتے تھے۔ اس کا حسن، اس کے اوصاف اور اس کی طبیعت کی رنگینیاں ہر محفل میں بار بار دہرائے جاتے تھے، اس کی آنکھوں میں نور تھا اور اس کے عارض گلگوں پر ایک طرف کاکل سیاہ سے پرچھائیں پڑتیں تو دوسری طرف نور کی متبسم شعاعیں امڈ آتی تھیں"۔ ایک اور موقع پر کارلائل کے جذبات ان الفاظ میں پھوٹ پڑتے ہیں "جب کبھی بلومین اپنی معصومیت کے ساتھ چھوٹی بڑی عورتوں کی صف میں کھڑی ہو جاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ دنیا کے ٹمٹمانی شمعوں میں ایک آسمانی تارا ٹوٹ آیا ہے" اپنی پرانی ملاقاتوں کی یاد میں کارلائل لکھتا ہے "اس کے تبسم میں ایک جادو تھا اور اس کی ہر بات ہنسی کا پہلو لئے ہوئے ہوتی تھی۔ اس کے لب نازک کا دہنا گوشہ خم کھایا ہوا تھا۔

اس کے سر اور آنکھوں کی حرکت میں ایک دلربائی تھی۔ جب وہ اپنے لب نازک کو جنبش دیتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ دھیمے سروں میں نغمے نکل رہے ہیں جو اپنے ساتھ تبسم لئے ہوئے ہیں۔ وہ بہت ملنسار اور محبت آگیں تھی۔ وہ ایک پیکر لطافت اور اس کے ساتھ ساتھ جاذب نظر بھی تھی۔ اس کی زیر لب سریلی آواز دل میں اتر جاتی تھی اور اس کی ہر آواز لطیف و معنی خیز ہوتی تھی۔"

غرض کارلائل نے اپنے خاص جوشیلے انداز میں ایک ایسی لڑکی کے متعلق اپنے اندرونی جذبات اور احساسات کا اظہار کیا ہے جس کی ماں حیدرآباد کی ایک مسلمان خاتون تھی وہ کبھی "بلومین" کی دلربا شکل اختیار کرتی ہے اور کبھی "کٹی کرک پیٹرک" کے نام سے ہمارے سامنے آتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں کے لئے جو انگریزی ادب کے دلدادہ ہیں بڑی دلچسپی کا سرمایہ ہے۔

نیلم راجہ رام

(ترجمہ حفیظ صدیقی)

تاریخ گولکنڈہ

فاضل مولف نے ہر حصہ کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے اور اس صورت میں تاریخ کا کوئی پہلو بھی نظر انداز نہیں ہوسکا ہے۔ قطب شاہی عمارات وسلاطین کی تصویروں نے اور بھی اس کی زینت بڑھادی ہے۔ کتاب ہر پہلو سے مفید اور دلچسپ ہے۔ زبان میں سلاست اور ادب کی چاشنی بھی موجود ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ اس کتاب کا ضرور ضرور مطالعہ فرمائیں اور اس کی موجودگی سے اپنی لائبریری کی قدر وقیمت بڑھائیں۔ جناب عبدالمجید صاحب صدیقی اور ادارۂ ادبیات اُردو اِس گراں قدر تصنیف کے لئے شکریہ کے مستحق ہیں۔ **"سہیل"** گیا۔ جون ۱۹۴۰ء

گولکنڈے کو جو تاریخی اہمیت حاصل ہے وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ گولکنڈہ دکن کا دل ہے اور اس کی تاریخ کے مطالعہ کے بغیر دکن کی سیاست و تمدن کو کماحقہ سمجھ لینا تقریباً امر ناممکن ہے۔ جناب عبدالمجید صدیقی نے یہ معرکہ آرا تاریخ لکھ کر نہ صرف گولکنڈے کے تاریخی حقایق بیان کئے ہیں بلکہ دکن کی تمام تاریخ بھی پیش کردی ہے۔ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے مستند مواد کی حیثیت رکھتا ہے۔ **"ادب لطیف"**۔ ستمبر ۱۹۴۰ء

کتاب بہت محنت اور تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے اور گولکنڈے سے متعلق غالباً اپنے پائے کی پہلی اور آخری کوشش ہے۔ قطب شاہی سلطنت کی تاسیس و بنیاد سے لے کر اس کے عروج و زوال تک کے تمام حالات پوری روشنی میں دکھائے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری حصے میں گولکنڈے کے تمدنی، سیاسی، معاشرتی و معاشی حالات، بادشاہوں کی علمی سرپرستی اور شہر و عمارت کی تاریخ بھی شامل ہے۔ کتاب مجلد ہے اور اس کی جاذبیت میں تصویروں نے بھی نمایاں حصہ لیا ہے۔ **"البیان"** مئی ۱۹۴۰ء

گولکنڈہ کا آخری بادشاہ ابوالحسن قطب شاہ ہوا ہے۔ جسے عرف عام میں تاناشاہ کہتے ہیں۔ مغل مورخین نے اس کی شخصیت اور کیرکٹر کو بہت مذموم رنگ میں پیش کیا ہے۔ لیکن فاضل مصنف نے مستند حوالوں سے کام لے کر مغل مورخین کے تمام الزامات رفع کرنے کی کوشش کی ہے اس کوشش میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا حال کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا۔ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے۔ **"زمانہ"**۔ جنوری ۱۹۴۱ء

نہایت جامع اور دلچسپ تاریخ اور اس عہد کے تمدن و معاشرت اور سیاسی حالات کا ایک نہایت کامل اور دیدہ زیب مرقع ہے۔ یہ بلند پایہ کتاب اہل ذوق کے پڑھنے کے قابل ہے۔ **"ہمایوں"** مارچ ۱۹۴۱ء

غزل

پوچھنا کیا اس کا جو دن رات میخانے میں ہے
ذوق و کیفِ زندگی بس ایک پیمانے میں ہے

اس کی دلچسپی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
کیسی دنیا بھر کی وحشت تیرے دیوانے میں ہے

لوگ میرے ساتھ ان کو بھی کیا کرتے ہیں یاد
ان کا افسانہ بھی شامل میرے افسانے میں ہے

موجِ مے کی لرزشیں ہیں دل کی بیتابی کا راز
مے نہیں ہے بلکہ میری جان پیمانے میں ہے

میکدے میں صرف اتنی سی ہے میری کائنات
تھوڑی شیشے میں ہے باقی تھوڑی پیمانے میں ہے

جان میری لے کے پچھتانا پڑے گا آپ کو
شمع کی رسوائی پروانے کے جل جانے میں ہے

یا اُدھر ہو یا اِدھر اِس کش مکش سے فائدہ
لب ہیں صرفِ توبہ دل لبریز پیمانے میں ہے

شمع اس سے کچھ جو واقف تھی تو جل کر رہ گئی
کس قدر سوز و گدازِ عشق پروانے میں ہے

ہوں وہ سرمستِ ازل میں کہہ نہیں سکتا معینؔ
کون میخانے کے باہر کون میخانے میں ہے

معین الدولہ بہادر معینؔ

مطربہ سے

اپنی دھن میں مست ہو کر جس گھڑی گاتی ہے تو
اک جہاں کو رودِ موسیقی بنا جاتی ہے تو

نشہ کے بادل سے چھا جاتے ہیں فرش و بام پر
دل مچل جاتا ہے اک کیفیتِ بے نام پر

آتے ہیں دوشِ فضا پر مستیوں کے کارواں
پیدا ہو جاتا ہے نشہ کا جہاں اندر جہاں

رقص کرنے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہے دل
پھول کی مانند کھل جاتا ہے قلبِ مضمحل

وجد ہو جاتا ہے طاری پر سکوں ذرات پر
خلد کا ہوتا ہے دھوکا بزمِ موجودات پر

ذرے ذرے سے ابل پڑتا ہے دریائے سرور
منجمد خاموشیوں کا ٹوٹ جاتا ہے غرور

وادیوں میں دل کی گاتے ہیں سریلے آبشار
کھلتے ہیں نغمات کے غنچے قطار اندر قطار

اک بہشتِ رنگ و بو میں جا کے کھو جاتا ہے دل
زمزموں کی نکہتوں میں جا کے سو جاتا ہے دل

یہ گماں ہوتا ہے گردوں پر اڑا جاتا ہوں میں
سیل اک جادو کا ہے جس میں بہا جاتا ہوں میں

خود بخود کھلتے ہیں دل پر رازہائے زندگی
دینے لگتے ہیں صدائیں سازہائے زندگی

آگ سے نغموں کی جل جاتا ہے جب وحوں کا زنگ
دل میں اک بیدار ہو جاتی ہے وجدانی امنگ

ایک کیفِ سرمدی کو ہر طرف پاتا ہوں میں
مجھ میں کھو جاتی ہے تو اور تجھ میں کھو جاتا ہوں میں

اخترؔ ہوشیارپوری

غزل

پیری میں اور قوتِ طبعِ رواں بڑھی — یعنی عزیزؔ تیزئ تیغِ زباں بڑھی

محمل کا اس غبار میں کیونکر پتہ چلے؟ — ہر ہر قدم پہ گردشِ کارواں بڑھی

کھلنے نہ پائے تھے ابھی غنچے کہ ہائے ہائے — اوراقِ گل اڑانے کو بادِ خزاں بڑھی

دم توڑنا فراق میں دشوار ہو گیا — کم طاقتی کچھ ایسی دلِ ناتواں بڑھی

تقدیر جب خراب ہو تدبیر کیا کرے؟ — اشکوں سے اور آتشِ سوزِ نہاں بڑھی

ملتا تھا بات بات پہ تکرار کا مزہ — عشق و ادا شناس کی یوں داستاں بڑھی

دروازہ میکدہ کا نہ کر بند ساقیا! — میخوار کیا کریں گے جو مے کی دوکاں بڑھی

صبحِ شبِ فراق بڑھی آن بان سے — آہِ شرر فشاں طرفِ آسماں بڑھی

بجلی بھی تیز گام گھٹائیں بھی بے لگام! — آندھی بھی ساتھ ساتھ سوئے آشیاں بڑھی

دل کے خمیر میں تھی محبت کی چاشنی! — ہمت اسی سے اپنی دمِ امتحاں بڑھی

کیونکر نہ اس کے نام پہ دل ہو فدا عزیزؔ — جس کے قدم سے رونقِ کون و مکاں بڑھی

عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

پھول

ہے پھول کہاں تو بھٹکا
کن کانٹوں میں آ اٹکا
ہیں سوکھی سوکھی ڈالیں
اپنے میں تجھے چھپالیں

(۲)

سندرتا ایسی دے کر (حسن)
پتوں کا دیا تجھے گھر
کیا الٹا ہوا ودھاتا (خدا)
جو جوڑا ایسا ناتا

(۳)

کیا تیری مدھر ہنسی ہے
کن کن میں شری بکھری ہے (ذرہ ذرہ — حسن)
جب ادھر ادھر تو ہلتا
آنکھوں کو جیون ملتا

(۴)

یہ رنگت اور کہاں ہے
جو تجھ میں بھری یہاں ہے

تو چپ ہو کر وہ کہتا
کوئی جسے نہ کہہ کہہ سکتا

(۵)

کیا ہے جادو تجھ میں
یہ آتا نہیں سمجھ میں
ہیں چیتن جڑ ہو جاتے
اور جڑ چیتن ہو جاتے (جاندار — بے جان)

(۶)

دیکھا ہے جب سے تجھ کو
کچھ نہیں سہاتا مجھ کو
بس ایسا مست ہوا ہوں
دنیا کو بھول گیا ہوں

(۷)

اب آتا ہے یہ جی میں
تیرے ہی پاس رہوں میں
نہیں ایک پلک بھی جھپکوں
تجھ کو ہی دیکھوں دیکھوں

پنڈت ونشی دھر ودیالنکار

جدید افسانہ

ادب زندگی کا عکس ہوتا ہے لیکن زندگی اس قدر وسیع اور پیچیدہ ہے کہ بعض وقت کسی زمانے کے ادیبوں کے کارناموں میں اس کے مظاہر کی تلاش دشوار ہوجاتی ہے حالی سے پہلے کے انشا پردازوں اور شاعروں کا یہی حال ہے۔ لیکن محض اسی بنا پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس زمانے کے ادب کو زندگی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

یہ صحیح ہے کہ اس زمانے کے صناعوں نے ایک نہایت رسمی اور استعارے کا طریقہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اختیار کرلیا تھا۔ تاہم وہ اپنے زمانے کے عملی خیالات اور معاشی اثرات سے بیگانہ نہیں تھے۔

جدید افسانوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کی پیدائش اور ان کے نشو و نما کے پیچھے حالات اور خیالات کا ایک وسیع پس منظر ہے۔ جب تک ہم ان حالات اور خیالات کو ذہن نشین نہ کرلیں اس زمانے کے افسانوں کو پورے طور پر سمجھ نہیں سکتے۔

لیکن ہم اس وقت صرف مختصر قصوں کا ذکر کریں گے کیونکہ افسانے کی اصطلاح عام اور وسیع ہے۔ اس میں داستان حکایت وناول مختصر قصے غرض ادب کا وہ تمام ذخیرہ شامل ہوجاتا ہے جس کو قصے سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق ہو۔ اس زمانے میں داستانیں اور حکایتیں نہیں لکھی جاتیں۔ یہ مختصر قصوں اور ڈراموں کا دور ہے۔ ناول کی طرف بھی اب بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔

مختصر قصے کے لئے انگریزی میں " " کی اصطلاح رائج ہے۔ اردو میں عام طور پر اسے مختصر افسانہ اور بعض وقت محض افسانہ کہتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں افسانہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس کو انگریزی اصطلاح " " کے ہم معنی سمجھنا چاہیے۔ افسانے کی ایک خاص شکل کے لئے عام اصطلاح استعمال کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اسی سے دقتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اسی سے بچنے کے لئے ہندی ادیبوں نے اس صنف کے لئے "کہانی" کا نام اختیار کیا ہے۔ کہانی " " کا ترجمہ ہے۔ لیکن مختصر قصہ نہ تو افسانہ ہے اور نہ کہانی۔ اس کا فن ان سب سے الگ اور اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ نئی ادبی شکل کا نیا نام ہونا چاہیے۔ اسی لئے اس کو مختصر قصہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مختصر قصہ ہماری زبان میں انگریزی کی توسط سے پہنچا۔ ایشیائی قوموں کی مخصوص ذکاوت کو قصہ گوئی سے بہت قدیم اور فنی تعلق رہا ہے۔ اسی لئے یورپ کی اس ادبی شکل سے ہم اس قدر جلد مانوس ہوگئے کہ وہ ہمارے ادب کا ایک مقبول جز بن گئی ہے۔

یورپ کی زبانوں میں بھی مختصر قصہ فنی حیثیت سے بہت بعد میں پیدا ہوا اس کی ترقی دراصل موجودہ زمانے کی مصروف اور میکانکی زندگی کے آغاز کے ساتھ ہوئی۔ یورپ کے اہم ملکوں جیسے انگلستان، فرانس، جرمنی، اطالیہ روس اور امریکہ میں صنعتی ترقیوں کے بعد سے عام زندگی کی کش مکش اس قدر بڑھ گئی کہ درمیانی اور ادنیٰ طبقوں کو قدیم زمانے کے لوگوں کی طرح بڑے بڑے ناول اور ڈرامے پڑھنے کا وقت کم ملتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ذہنی اور دماغی تفریح کی ضرورت گھٹی نہیں۔ بلکہ اور بڑھ گئی۔

اسی لئے ایک ایسی ادبی صنف کے نشو و نما کی ضرورت ہوئی جو مصروف لوگوں کی فرصت کے چند لمحات کو پُر کر سکے اور ایک مکمل تفریح ثابت ہو۔

یورپ کی گزشتہ جنگِ عظیم تک اس فن کو ناول اور ڈرامے کے ساتھ ساتھ ترقی ہوتی رہی۔ پہلے پہل اکثر ناول نگار اس کو ایک وقتی تفریح کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ تاہم ان کے سرانجام میں وہ بڑے قصوں کی طرح محنت کرتے اور اپنے مقصد کو نمایاں کرنے میں وہ قدیم قصہ گوئی کے سارے لوازم صرف کر دیتے تھے اسی لئے ان کے مختصر قصے بھی کافی طویل اور قصہ گوئی کے پورے لطف سے پُر ہوتے تھے۔ ان کے موضوع عموماً ادبی اور خیالی ہوتے تھے۔

لیکن جنگ کے بعد سے جو اہم تبدیلیاں یورپ کی سیاسی اور معاشی، سماجی اور علمی زندگی میں رونما ہوئیں ان کی وجہ سے یورپی ادب میں بہت بڑا انقلاب ہوگیا ہے۔

ان اثرات سے ہندوستان بھی نہ بچ سکا۔ اردو کے موجودہ مختصر قصوں میں بھی ہم وہ تمام ظاہری اور معنوی خصوصیات دیکھ سکتے ہیں جو یورپی قصوں میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ ہمارے قصوں کا بہت بڑا ذخیرہ ایسا ہے جو یورپی زبانوں سے ترجمہ کے ذریعہ منتقل ہوا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ حصہ ماخوذ ہے اور کچھ اسی نمونے پر ڈھالا گیا ہے۔ ملکی ذہنیت بھی اب اس پر اس قدر قابو پاچکی ہے کہ اپنی ذکاوت کے مناسب اس میں تصرف بھی کرنے لگی ہے اصلاح ہمارے مختصر قصوں میں ایک طرف مابعد جنگ اثرات موجود ہیں تو دوسری ان پر یورپ کے خاص خاص ملکوں جیسے انگلستان، فرانس، جرمنی اور خاص طور پر روس کے باکمال قصہ نگاروں کے مخصوص قومی اور شخصی رجحانات کے گہرے اثرات بھی کام کر رہے ہیں۔ یہ یورپی قصہ نگار زیادہ تر ایسے ہیں جو جنگ سے پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں گویا ہمارے قصے جنگ سے پہلے کے ادبی تخیلات اور اس کے بعد کے اثرات کا مجموعہ ہیں۔

روسی قصہ نگاروں میں تورگنیف، دوستووسکی، چیخوف، میکسم گورکی اور خاص طور پر ٹالسٹائی کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ کئی رسالے اور کتابیں ان کے قصوں اور ان کی صناعی کو سمجھانے کے لئے اردو میں شایع کی گئی ہیں۔ نوجوان انشا پردازوں کی ایک خاصی تعداد ایسی ہے جس کا مقصد روسی ادب اور خیالات کی اشاعت ہے۔ ان میں سعادت حسن منٹو کامریڈ فیروز الدین منصور، شاہد لطیف، وغیرہ بہت پیش پیش ہیں۔ پروفیسر محمد مجیب اور اختر حسین رائے پوری کے افسانے بھی روسی اثرات ہی کے مظہر ہیں۔

تورگنیف اور دوستووسکی روسی ادب میں حقیقت اس افسانہ نگار گروہ کے پیرو تھے جس کا نشو و نما گوگول اور فرانسیسی مختصر قصہ نگار ژورژ زر سان (؟) کے اثرات کے تحت ہوا۔ اسی دبستان کی خصوصیات ہم عصر روسی زندگی کے صحیح نقشے پیش کرنا سماجی مسئلوں سے دلچسپی اور ان پر تنقید اور عجائبات اور رومانیت کی افراط و تفریط سے کنارہ کشی ہے۔ یہ لوگ ایسے اسلوب بیان پر زور دیتے تھے جو سادہ اور واضح ہو اور چیزوں کی سچی تصویر پیش کرے۔ تورگنیف اس اسکول کی غیر فانی یادگار ہے۔ اس کے قصے سماجی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں اور کرداروں میں اس کے مرد عموماً کمزور اور عورتیں طاقتور ہوتی ہیں اس کا

اسلوب حقیقت پر مبنی ہونے کے باوجود تہذیب سے نہیں گرتا اور جوش کے بغیر شاعرانہ ہے۔ ڈوستووسکی غریب اور دیہاتی طبقوں کی زندگی پیش کرتا ہے۔ "غریب فنشی" اس کے مشہور کردار بن گئے ہیں۔

ٹالسٹائی اردو میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس کی عظمت کی بنیاد اس کے قصوں کا انسانی عنصر ہے۔ وہ بنی نوع انسان کی اخلاقی بہتری چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک نئی اخلاقی عیسائیت کا پرچار کیا۔ سب سے بڑھ کر اس کا بے مثل سادہ اندازِ بیان ہے جس میں لفاظی اور علمی نمائش کو بالکل دخل نہیں ہے۔

چیخوف کے کارنامے اس پستی کے مظہر ہیں جو ۱۸۸۰ء اور ۱۹۰۵ء کے درمیان روسی ادب پر طاری رہی۔ اس کے بہترین افسانے اس کے زمانے کے ذہین لوگوں کی فریب خوردگی اور بے کاری کے مرقعے ہیں۔

کارل مارکس کے عقائد کی نشر و اشاعت سے روس میں جو نئی روح پیدا ہوئی اس کی یادگار میکسیم گورکی ہے۔ وہ نہایت غریب گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور اس کی ابتدائی زندگی کا ایک بڑا حصہ بیکاری اور آوارہ گردی میں بسر ہوا تھا۔ اس نے اپنے قصوں میں آوارہ گردوں کی جو نفیس تصویریں کھینچی ہیں وہ حقیقی ہونے کے باوجود رومانیت سے پُر ہیں۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بدولت اس کے قصے ساری دنیا میں مقبول ہیں۔ جنگِ عظیم کا اثر روس میں بولشویک انقلاب کی صورت میں نمودار ہوا۔ اس عہد میں مملکتی سیاست کی جو پابندیاں ادیبوں پر عائد ہوگئی ہیں ان کے اثر سے ادب میں یکسانیت، میکانیت اور پروپگنڈے کی خصوصیت بڑھ گئی ہے۔ اسی لئے موجودہ زمانے میں عالمی شہرت کا کوئی قصہ نگار پیدا نہ ہو سکا۔

فرانس کے باکمال قصہ نگاروں میں یوں تو بلزاک سے لیکر رومین رولاں تک سب کے اچھے قصے اردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں لیکن موپساں کی سی مقبولیت کسی کو حاصل نہ ہوئی۔ موپساں فرانسیسی ادب میں حقیقت نگار گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔

اس نے اپنے زمانے کے عیش پسند فرانس کی سچی اور حسن کارانہ تصویریں پیش کی ہیں۔ اس کے اکثر قصے صنفی تعلقات کے وسیع پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں۔ اس کا اسلوب بیان حقیقت اور صناعی کی آمیزش کا دلنواز مجموعہ ہے۔ اردو کے بعض قصہ نگار جن میں جلیل قدوائی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اسی سے متاثر ہیں۔ اس کے بہترین قصوں کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

جنگِ عظیم سے فرانس کے نوجوان ادیبوں کی مصروفیتوں میں رخنہ پڑ گیا۔ ان میں سے بعض تو جنگ میں کام آئے جو بچ رہے ان میں جوشِ اظہار قابلِ دید ہے۔ اس زمانے کے کارنامے جذبات کی صداقت وطنی جوش اور قومی شجاعت کے ولولوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جنگ کا خطرہ دور ہو جانے پر وہ جوش تو کم ہو گیا لیکن نوجوان ادیبوں نے اس طرح کام شروع کیا گویا انہیں اگلے ادیبوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ انھوں نے ایک نئی دنیا بسانے کی کوشش کی لیکن انہیں جلد محسوس ہو گیا کہ وہ اگلے لوگوں کے اثر سے نہیں بچ سکتے۔ موجودہ قصہ نگاروں کے رجحانات قابلیتوں کے اختلافات اور ان کے مقصد اتنے ہی وسیع ہیں جتنے موجودہ اردو

قصہ نگاروں کے نظر آتے ہیں۔ ان کی فکر میں اتحاد کم ہے اور ہر شخص اپنے طبعی میلان کی پیروی کرتا ہے۔ اسی لئے ان کی گروہ بندی کی کوشش دشوار نظر آتی ہے۔ تاہم ایک چیز جو ان میں مشترک ہے وہ نفسیاتی تجسس ہے۔ یہ چیز بعض موجودہ اردو قصوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

اطالوی قصہ نگاروں کا اثر یورپی ادب پر کافی پڑا ہے۔ اردو میں بھی جستہ جستہ قصوں کے ترجمے ہو چکے ہیں جن میں بوکاچیو سے لے کر میکاویلی باندیلو کارلوگوزی اور گریزیاڈیلیڈا جیسے حال کے قصہ نگاروں کے قصے تک شامل ہیں۔ لیکن ان قصوں کا کوئی خاص اثر اردو لکھنے والوں پر نہیں پڑا۔ یہی حال جرمن قصوں کا بھی ہے۔

گرم پال ہائزشانزلر وغیرہ کے کچھ قصے اردو میں ترجمہ ہوئے ہیں لیکن ان میں کوئی نمونہ نہیں بن سکا۔ جرمنی کے صاحب فکر ادیبوں جیسے گوئٹے، شلر، ہیگل کانٹ اور شوپنہار کے اثرات فرانس، انگلستان، روس اور دنیا کی دوسری زبانوں کے ادیبوں پر وقتاً فوقتاً پڑتے رہے۔ لیکن اردو میں ان کا کوئی راست اثر سوائے اقبال کے کلام کے کسی اور جگہ کم نظر آتا ہے۔ گوئٹے کے شاہکار "فاوسٹ" جس کا ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین نے کیا ہے اس کا بھی کوئی معین اثر اردو میں ظاہر نہیں ہوا حالانکہ یہ کارنامہ نہایت معرکتہ الآرا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ یورپی قصوں کے اثرات اردو میں زیادہ تر انگریزی زبان کی توسط سے پہنچے لیکن یہ بات خاص طور پر دیکھنے کی ہے کہ انگریزی قصہ نگاروں مثلاً کپلنگ، ساقی چسٹرٹن، ایچ جی ویلز اور گالزوردی کا اثر بھی ہمارے قصہ نگاروں پر بہت زیادہ نمایاں نہیں ہے۔ کپلنگ، ایچ جی ویلز اور گالزوردی کے اکثر قصے اردو میں منتقل ہو چکے ہیں۔ انگریزی قصوں کے زیادہ مقبول نہ ہونے کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ انگریزوں کی مخصوص ذکاوت مزاح اور لطف گفتار کا ہم پورا حظ نہ اٹھا سکتے ہوں۔ اس کے برخلاف فرانسیسی اور روسی قصے جو انگریزی کی توسط سے ہم تک پہنچتے ہیں۔ ترجمے میں اپنی بہت سی انفرادی خصوصیات کھو دیتے ہیں۔ اسی کا ایک ثبوت امریکی قصے بھی ہیں۔ واشنگٹن ارونگ کے قصے ہمارے پاس او ہنری اڈگر ایلن پو، مارک ٹوین اور برٹ ہارٹ کے قصوں سے زیادہ مقبول ہوئے۔ اور ان میں زیادہ تر وہ قصے ہیں جو اسلامی اسپین سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو میں ترجمہ ہوتے ہوتے یہ مشرقی لباس اختیار کر لیتے ہیں اس کا اندازہ نیاز فتحپوری کی نگارستان کے قصوں کو پڑھنے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

اردو کے تمام موجودہ قصوں پر اس وقت تبصرہ کرنا ممکن نہیں اس لئے ہم صرف نمایاں دبستانوں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

سب سے پہلا اور نمایاں دبستان معاشرتی اور قومی قصہ نگاروں کا ہے۔ اس کی بنیاد منشی پریم چند نے رکھی تھی۔ سدرشن، علی عباس حسینی، اعظم کریوی اس طرز کے مشہور پیرو ہیں۔ ان کے قصے ہندوستان کی سادہ دیہاتی زندگی کے مرقعے ہوتے ہیں۔ زبان اور اسلوب میں بھی یہ بجا سادگی پسند کرتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار کا موضوع بھی معاشرت ہے۔ لیکن ان کے قصے زیادہ پیچیدہ اور ان کا اسلوب نفسیاتی ہوتا ہے۔

دوسرا گروہ رومانی اور نفسیاتی قصہ نگاروں کا ہے

جن کے موضوع عام زندگی سے ہٹے ہوئے اور شاعرانہ ہوتے ہیں اسلوب کے لحاظ سے یہ دبستان یورپ کے موجودہ ”...“ کے مماثل ہے۔ ان کا کمال تخیل کی مدد سے غیر محسوس کو محسوس بنانا ہے۔ اس طرز کے مشہور لکھنے والے سجاد حیدر یلدرم نیاز فتح پوری مجنوں گورکھپوری اور حجاب امتیاز علی ہیں۔ پروفیسر محمد مجیب اور اختر حسین رائے پوری کے قصے نفسیاتی تجزیہ کے ساتھ ساتھ صداقت اور سادگی کی طرف زیادہ مائل ہیں۔

تیسرا مکتب مزاحیہ قصہ نگاروں کا ہے جس میں عظیم بیگ چغتائی سب سے پیش پیش ہیں ان کے قصے مختصر قصوں کے تمام اجزا پر حاوی بھی ہوتے ہیں۔ دوسرے مزاحیہ نگار مثلاً مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، ایم اسلم اور ملا رموزی وغیرہ شکل یا صنعت کے پابند رہ کر نہیں لکھتے۔ لیکن ان کے مضامین کبھی کبھی مختصر قصے کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں۔

چوتھا اور آخری گروہ وہ ہے جس میں زیادہ تر مترجمین شامل ہیں۔ یہ جلیل قدوائی، منصور احمد مرحوم، عابد سلیماں، سعادت حسن منٹو اور ان کے ساتھیوں پر مشتمل ہے۔ منصور احمد نے دنیا کی مشہور زبانوں کے بعض قصوں کا ترجمہ دنیا کے بہترین افسانے کے نام سے شائع کیا تھا۔ جلیل قدوائی نے موپاساں کے کئی قصوں کا ترجمہ کیا اور سعادت حسن منٹو اور ان کے شریک کار روسی ادب اور مختصر قصوں کو اردو سے روشناس کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

جنگ سے پہلے کے قصوں کا ہمارے پاس بہت زیادہ ذخیرہ نہیں ہے لیکن جو کچھ موجود ہے یا پھر یورپ کے اگلے اساتذۂ فن سے حاصل ہوا ہے اس کا مقابلہ موجودہ زمانے کے قصوں سے کرنے پر یہ ظاہر ہوگا کہ قدیم قصہ نگاروں کا بڑا کمال ذوق قصہ گوئی میں ظاہر ہوتا تھا۔ لیکن بعد کے قصوں میں یہ چیز ان کے آرٹ یعنی صناعی کے مقابلہ میں کم نمایاں ہے۔ موجودہ قصہ نگار نہایت ایمائی اشاروں سے کام لیتا ہے۔ اس کا رجحان ایجاز یعنی اختصار کی طرف بھی زیادہ ہوگیا ہے۔ ہمارے زمانے میں حیاتیات، نفسیات اور سائنسی علوم کو جو ترقی ہوئی ہے اس کا ذخیرہ بھی موجودہ قصہ نگار کے پشتے کے طور پر موجود ہے۔ جدید قصوں میں اکثر ایسے ہیں جن میں نہایت مجمل طور پر نفسیاتی تجزیہ سے کام لیا گیا ہے۔ اس زمانے کے سماجی معیاروں اور صنفی خیالات میں جو بھاری انقلاب ہوگیا ہے اس کے اثرات بھی قصوں میں جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں۔ موجودہ لکھنے والے اپنے پیش رو اساتذہ کے مقابلہ میں بھی زیادہ غیر رسمی نظر آتے ہیں۔ ان کے موضوع پہلے سے زیادہ وسیع ہوگئے ہیں اور ان کے لئے کوئی چیز ناگفتنی نہیں رہی ہے۔ وہ ادب کا کمال صناعی سمجھتے ہیں موضوع خواہ کچھ بھی ہو۔ یہ وہ عام رجحانات ہیں جو یورپی قصوں کی طرح اردو قصوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

عبدالقادر سروری

سماج کے دلنشیں محل میں

ندی کے پورب میں، فاصلے پر "سماج کے دلنشیں محل میں"

بڑی عقیدت سے گا رہی ہو　　　ستار لے کر دعا کے گانے

خیال یہ ہے کہ پا رہی ہو　　　"پتی" کو اپنے اسی بہانے

سماج ہی کو سُنا رہی ہو　　　سماج کے ظلم کے فسانے

ہنسی میں مورت کی کھو نہ جائے تمہاری پوجا حسیں محل میں

پرستشوں کی ہر ایک شئے پر　　　تمہارے غم خوار ہنس رہے ہیں

بھجن کی اُس بااخلوص لَے پر　　　ستار کے تار ہنس رہے ہیں

کرشن جیسے تمہاری نَے پر　　　ندی کے اُس پار ہنس رہے ہیں

یہی کہ مذہب کے جھوٹے معنی کوئی بھی دیوتا نہیں سکھاتا

کسی کو دوشیزگی کے رنگیں دنوں میں "بیوا" نہیں بناتا!

کسی سے بچپن کے دن سے مانا　　　تمہاری شادی کا فیصلہ تھا

تمہاری معصومیت کا بدلہ　　　سماج کا ایک قہقہہ تھا

مگر تصور بھی اب نہیں ہے!

کہ کس سے باندھا تھا ماں نے رشتہ

تمھیں بتاؤ، تمھیں یقیں ہے

کہ "وہ" ہیں اس مورتی میں زندہ؟

قسم ہے تم خود سمجھ رہی ہو، قسم ہے تم کو یقیں نہیں ہے

میں جانتا ہوں تمہاری خاطر یہ مورتی دلنشیں نہیں ہے

مگر پرستش کی کوششوں میں خیال اپنا بٹا رہی ہو

سمجھ رہی ہو "دعا کے گانے" بڑی عقیدت سے گا رہی ہو

تمہارا کہنا کہ "یہ ہے مذہب"، تمہارا کہنا "سماج یہ ہے"

تمہارا کہنا کہ "عورتوں کے بلند رتبے کی لاج یہ ہے"

غلط ہے، دھوکا ہے، عورتوں پر یہ قہر ہے، ظلم ہے، ستم ہے

معاف جس کو نہ کرسکے گی کبھی بھی "انسانیت" قسم ہے!!

اگر ضروری ہے" ایسی صورت — اور اس پہ یہ گیروا دوشالہ"

اگر ضروری ہے" یہ نزاکت — اور اس پہ اتنی طویل مالا"

اگر ضروری ہے" ہو عبادت — تمھاری خواہش کا پاٹ شالا"

تو آؤ مالا یہ توڑ بھی دو

کہ "پھول کا ہار" آگیا ہے!

تو آؤ مندر کو چھوڑ بھی دو

تمھیں بتاؤ، دھرا ہی کیا ہے

ندی کے پورب میں، فاصلے پر "سماج کے دلنشیں محل میں"

سلام (مچھلی شہری)

فلسفی سے

تو عقل سے ہے طالبِ اسرار و معارف — اس راہ میں ہے پیکِ جنوں پختہ و چالاک

تو زیست کے اسرار سے واقف ہو تو کیونکر — گم کردۂ منزل ہے تری خامئ ادراک

ہر ذرہ ہے آسودۂ اسرارِ کم و کیف — وہ سرو و سمن ہوں کہ ہجومِ خس و خاشاک

گو اوجِ فلک پر ہیں چمکتے ہوئے تارے — ان تاروں سے خالی نہیں یہ انجمنِ خاک

ہر چند رہا صیدِ ستم ہائے زمانہ — پھر بھی مری فطرت رہی آشفتہ و بیباک

منزل مری احساس کی حد سے بھی ہے آگے — اور تو ہے ابھی گم شدۂ جادۂ ادراک

جینے کا مزہ غم سے ہے غم ڈھونڈ رہا ہوں — آنکھیں مری آلام کے اشکوں سے ہیں نمناک

اے کاش کہ آگاہ ہو تو لذتِ غم سے — فطرت تجھے دے اک دلِ گرم و نگہِ پاک

ظفر (عثمانیہ)

ایک گلاس پانی

ع وہ دن گئے کہ کہتے تھے شوہر نہیں ہوں میں۔

اس سال کے مسعود و مبارک ماہ ربیع الاول میں میری "شادی خانہ آبادی" رچادی گئی۔ میری منتوں کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ میرے عذرات اور دلائل اِس کان سن کر اُس کان اڑا دیئے گئے۔ کوئی ہرج نہیں اگر میں بے روزگار ہوں، زیرِ تعلیم ہوں، کمسن ہوں... کوئی ہرج نہیں... شادی بہرحال ہونی تھی۔ سرپرستوں کو میرے سر سہرا دیکھنے، اور بہو گھر لانے کی آرزو تھی...... اور وہ ہوگئی۔ آپ جانیئے ہندستانی نوجوان "شادی" کے معاملہ میں لڑکیوں سے کچھ کم مجبور نہیں... اس کی مرضی بھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جاتی.... ماں باپ راضی ہوجائیں تو گھر پر نوبت نقارے بجنے لگتے ہیں، اور ایک بیچارے طوطی کی "نہیں، نہیں.... ابھی نہیں" کی فریاد کو کوئی نہیں سنتا...

شادی میں عزیز اقربا، دوست احباب سب شریک تھے سب کو خوشی تھی۔ سہرے لکھے گئے۔ مبارک بادیاں دی گئیں... اور تناول طعام ماحضر سے داعی کو ممنون و مشکور فرماتے ہوئے، رقص و سرود کی محفل میں تھوڑی دیر "لوٹ پوٹ" کر کے سب اپنے اپنے گھروں کو سدھارے.... اور میں اکیلا اپنی دلہن کے پالے پڑا۔

میری قسمت جیسی بھی ہو۔ ان کی قسمت تو قابلِ رشک تھی۔ ایک اطاعت گزار، تعلیم یافتہ، رحم دل خاوند ان کے حصہ میں آیا تھا جس کے نزدیک دل دکھانا سب سے بڑا گناہ تھا..... چاہے گفتگو سے اپنی حرکات و سکنات سے... غرض کسی طریقہ سے بھی، ان نازک آبگینوں کو ٹھیس لگانا نہیں چاہتا تھا۔ چاہے اس احتیاط سے اس کی جان پر ہی کیوں نہ بن جائے....

قسمت کی ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ "گربہ کشتن روزِ اول" کے ہتیار کو میرے بدلے وہی سنبھال بیٹھیں اور حجلۂ عروسی سے باہر نکلتے ہی، انھوں نے پیٹ سے پاؤں نکالنے شروع کر دیے... حکم ہوا کہ دوست احباب سے ملنا کم کر دوں۔ اور ان کی تعداد کو بالکل گھٹا دوں... صرف شادی شدہ دوست احباب سے دوستی رکھوں، باقی کو جواب دے دوں کہ "گھر پہ نہیں ہوں"...... "ایک بات اور"...... وہ یہ کہ سگریٹ ایک دم نہیں تو رفتہ رفتہ ضرور ترک کر دوں۔ سینما بینی بھی موقوف کر دوں۔ اور راتوں کو دیر تک پڑھتا بھی نہ رہوں... اور... اور..... مختصر یہ کہ ع

گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

اور کسی کا کیا جائے گا، یہی حال رہا تو گھٹ گھٹ کے مرجاؤں گا ایک دن۔ لیکن کوئی ان سے بھی تو پوچھے کہ "شوہرِ محترم" کو "قید و بند" کی زنجیروں میں جکڑ کے آخر ان کا ارادہ کیا ہے۔ اور وہ کیا کرنے والی ہیں۔ کچھ نہیں کریں گی.... انھیں کرنا ہی کیا رہتا ہے..... صبح سے شام تک تکیے سے لگی بیٹھی رہیں گی۔ تکیہ بنی ہوئیں، نہ ہلنا نہ جلنا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ پاندان کھسکا لیا، چھالیہ کترنے لگیں پان لگایا، کھائیں، اگالدان اٹھایا، پیک تھوک دیا۔ اور زمانہ بھر کی باتیں۔ بلا سے چاہے گھر کا انتظام بھاڑ میں جائے۔ پروا نہیں اگر دھوبی ہر دھلائی میں کپڑے کم لاتا ہے۔ فکر نہیں جو ماما غلہ چرا چرا کر اپنا گھر بھر رہی ہے۔ خاوند کے کپڑے تار تار ہو رہے ہیں اختلاجِ قلب کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے... میرا کام تو فقط ان کی ہدایت کے مطابق صوم و صلوٰۃ کی پابندی اور ان کے آرام کا خیال

رکھنا ہے۔ میں اپنا دکھڑا کیسے روؤں؟ کبھی دبی زبان میں کچھ کہتا بھی ہوں تو جواب ملتا ہے کہ "یہ ہمارے خاندان کا طریقہ نہیں"۔ اب اُن سے کون کہے "منہ پھٹ" ہو کر کہ ہمارے پاس سو پشت سے یہی دستور چلا آتا ہے کہ بیوی گھر کی، اور گھر والے کی ذمہ دار ہوتی ہے.... دونوں کا خیال سب پر مقدم ہے..... مگر کون کہے؟"......

ان کے راج میں گھر کا نقشہ بھی دیکھ لیجئے کہ کس طرح کا ہے۔ جہیز کا سامان اس طرح منتشر پڑا ہے جیسے اب ان کا نیلام کیا جائے گا.... کوئی چیز قرینہ سے جمی ہوئی نہیں دیوانخانے کا سامان باورچی خانہ میں... میرے کمرے کا سامان کچھ گودام میں کچھ مودی خانے میں... ان کا مطلب شاید یہ ہو کہ میں آپ ہی جھک مار کر سب کچھ سلیقہ سے رکھ لوں گا..... مگر ع رگوں میں میرے خوں ہے پانی نہیں ہے گھر پھونک کر تماشہ دیکھوں لیکن وضع داری پر آنچ نہ آنے دوں.... گھر کل کا بگڑنے کا آج بگڑتا ہے... بگڑا کرے مجھے کیا.... سوچ لیا ہے کہ کسی نہ کسی دن وہ مجھے الزام دیں گی ضرور... اس وقت سمجھ لوں گا.... ایسی خبر لوں گا کہ یاد کرتی رہیں گی... فی الحال تو ہم دونوں خاموش ہیں۔ میں تو خیر اس لئے بھی خاموش ہوں کہ ابھی روزگار سے نہیں لگا.... اور شاید وہ بھی یہی سوچ کر خاموش ہوں کہ جب یہ کما کر لگائیں گے، تب ہم پیر پھیلائیں گے....

دنیا کا دستور ہے کہ چاہے کسی کی شادی ہو یا نہ ہو، دوست احباب، ملنے جلنے والے، اس کے گھر آتے ہیں... کچھ دیر بیٹھتے ہیں.... صاحب خانہ مقدرت رکھتا ہو تو، تواضع بھی کرتا ہے... اور خلوص کے رشتہ کو اور بھی مضبوط بناتا ہے.... خود ہم اپنے کئی دوستوں کے یہاں وقت بے وقت جا دھمکتے ہیں، خدا کے فضل سے وہ بھی شادی شدہ ہیں... ہمارے آنے کی خبر سن کر سو کام چھوڑ کر ملنے چلے آتے ہیں۔ خوش خوش نظر آتے ہیں۔ بیوی کی طرف سے کوئی اندیشہ دل میں نہیں رہتا... الٹا اس کی تعریف میں ان کے ہونٹ سوکھ جاتے ہیں.... پان آتے ہیں... کہلوایا جاتا ہے کہ دولہے میاں کے دوست آئے ہیں، تو سلام آتا ہے... کچھ مٹھائی بھی بھیج دی جاتی ہے.... اپنے خاوند کے دوستوں کی عزت اور تواضع بیوی کا اولین فریضہ ہے... لیکن یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ دوست تو دوست رشتہ دار بھی آجائیں تو چڑھی تیوری اترنے کا نام ہی نہیں لیتی.... لاکھ سمجھاتا ہوں کہ عزت اور وقار کا سوال ہے.... جھوٹے منہ تو ہنس بول لیا کرو۔ لیکن ایک "اونہہ" ہزار "اونہہ"... حسن کا میں پہلے ہی سے روا دار نہیں ہوں۔ میں تو سلیقہ شعاری اور حسن سیرت کا شیدا تھا... پردہ کا رواج نہ ہوتا تو شاید لوگ مجھے خوش قسمت سمجھتے کہ ایک حسین بیوی کا شوہر ہوں۔ اب تو رونا ہی رونا ہے گھر کا ڈھنگ ایسا بیوی کی طبیعت ایسی... جو بھی دیکھے گا نام رکھے گا۔ ... کوئی ملنے آتا ہے تو پہلے تو صاف چلے جانے کو کہا جاتا ہے۔ کوئی مارے خلوص کے ڈھیٹ بنا کھڑا ابھی رہے تو مجھے یہ تاکید کی جاتی ہے کہ "فوراً اس سے پیچھا چھڑا لو"... اب چاہے وہ شخص کتنی ہی دیر بیٹھا رہے۔ اندر سے نہ تو پان آتے ہیں نہ کچھ اور۔ الٹا بار بار ماما پکتی رہتی ہے کہ "اندر بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں...."... گھر چھوڑ کر ہی بھاگ جاؤں گا تب انھیں ہوش آئے گا۔

پرسوں کے واقعہ سے تو دل پر ایسا گھاؤ پڑا ہے کہ ڈوب مرنے کو جی چاہتا ہے... بچپن کا ایک دوست مجھ سے ملنے آیا۔ مجھے اس سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ جی چاہتا تھا کہ

اسے دو تین دن روک رکھوں، اور موقع سے اس کے گلے لپٹ کر
خوب جی بھر کر رؤں۔۔۔ خوب خاطر تواضع کروں، اور اس کا بھی
تقاضا تھا کہ "شادی کی دعوت دو۔۔۔" گر۔۔۔ خیر۔۔۔ باتوں
ہی باتوں میں کامل ایک گھنٹہ گزر گیا، اندر سے نہ تو پان آتے
ہیں اور نہ چائے۔۔۔ بے چارے نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا
"بھئی ذرا پانی تو منگا دو۔۔۔" میں نے ماما کو آواز دی۔۔۔
وہ باہر آئی۔ میں نے کہا "ایک گلاس میں پانی تو لا"۔۔۔ وہ
اندر گئی تو گویا بھاپ بن کر اڑ گئی۔۔۔ ہم دونوں کی نظریں
دروازہ پر لگی ہیں کہ اب آتا ہے پانی اور اب۔۔۔ آخر
مایوس ہو کر اس نے باتوں کا سلسلہ چھیڑا۔۔۔ "کہو یار مزے
میں تو ہو نا شادی کی زندگی واقعی بڑے مزے کی ہوتی ہے"
میں خون کے گھونٹ پی رہا تھا۔۔۔ دل میں تو آیا کہ چیخ چیخ کر
کہوں۔۔۔ "نہیں نہیں۔ شادی میرے لئے لعنت ثابت ہوئی۔
بیوی بلائے ناگہانی۔ اور شادی کی زندگی۔۔۔ سکرات سے
بڑھ کر تکلیف دہ۔۔۔۔ گر پھر یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ کہنے کو تو
کہہ دوں گا۔۔۔ لیکن نتیجہ کیا۔ جگ ہنسائی کے سوا اور ہوگا کیا!
۔۔۔ خود کو بڑے "احتیاط" سے ہشاش بشاش بنالیا۔ چہرہ پر
شرم آلود مسرت طاری کرلی۔۔۔ "ہاں بھئی۔ بڑی پرلطف زندگی
ہے شادی۔۔۔ خوشیوں اور مسرتوں کی کیاری ہے سمجھو۔۔۔
اور بیوی۔ کیا کہنے ہیں بیوی کے۔۔۔ سراپا دلہن۔۔۔ سراپا ناز
سراپا حسن۔۔۔ مجھے مبارکباد دو۔۔۔ قسمت کا دھنی ہوں۔۔۔"
اتنے میں ماما اندر سے پانی لے آئی۔ گر نہیں وہ تو چائے لا رہی
تھی۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔۔۔ کیا وہ اتنی سمجھدار ہو گئی
ہیں۔۔۔ چند گھنٹوں میں انھیں عقل سلیم نصیب ہو گئی۔ سلیقہ
شعاری پر کمر باندھ لیا ہے انھوں نے۔۔۔ میرا دوست پانی
منگائے۔۔۔ اف بھی چائے چائے۔۔۔ میں نے فرط مسرت سے
بے اختیار ہو کر کہا "لا۔ لا" لیکن ماما چہرہ کو سو سو جگہ سے بگاڑے۔
کچھوے کی رفتار سے آرہی تھی میرے دوست نے اپنی قلبی
کیفیت کو چھپاتے ہوئے از راہ تکلف کہا۔ "ارے یہ کیا،
بھئی یہ بھی کوئی وقت ہے چائے کا۔۔۔ اور پھر میں ابھی ابھی
گھر سے چاء پی کر آرہا ہوں۔۔۔" "نہیں صاحب یہ تو نہیں
ہو سکتا۔ چاء آپ کو پینا ہی پڑے گی۔۔۔ نہ جانے جلدی میں کیسی
بنی ہے۔ گر میاں چاء بنانے میں ہماری بیوی کمال کرتی ہیں
اور اس معاملہ میں تو وہ سب سے بڑھی چڑھی ہیں۔ یعنی وقت
بے وقت چاء سے تواضع کرتی رہتی ہیں۔ وہ تو کہو تمھاری قسمت
ذرا خراب ہے ورنہ خوان پر خوان خالی کرنے پڑتے۔ لاکھ سمجھاتا
ہوں کہ آخر اس "تواضع" سے مطلب کیا ہے تمھارا۔ لوگ آنا چھوڑ
دیں گے۔ گر وہ تو جیسے قسم کھا رکھی ہیں کہ میرے ہر دوست کو
بغیر کچھ کھلائے پلائے جانے ہی نہ دیں گی۔۔۔" "مجھے افسوس
ہے کہ تم اتنے دنوں بعد آئے۔ اور صرف چائے پر ٹالے جا رہے
ہو۔۔۔ اور دیکھنا چاء بھی کیسی نکلتی ہے۔ میں نے کہا نا جلدی
میں تیار ہوئی ہے۔۔۔" میرے دوست نے پھر کہا۔ "نہیں
صاحب مجھے معاف ہی کرو تو بہتر ہے۔۔۔ تمھارا۔۔۔ بھابی جان
۔۔۔ کا لاکھ شکریہ۔۔۔ پھر کبھی سہی۔" گر میرے دل میں تو خوشی
کا ایسا طوفان لہریں مار رہا تھا کہ دوست کو پچھاڑ کر اس کے
حلق میں چاء انڈیلنے کو تک تیار تھا۔۔۔ میرا حال اس فقیر کا
سا تھا جو صدا لگاتے ہی "لے جاؤ شاہ صاحب" کا جواب سنتا
ہے۔۔۔۔ "چاء نہیں پیں گے کیونکر نہیں پیں گے" پینا ہی پڑے
گی۔۔۔ اور لکھ دینا پڑے گا کہ "میں نے چاء پی۔" اور میں سب کو
دکھاتا پھروں گا کہ کیوں خواہ مخواہ میری بیوی کو بدنام کرتے

پھرتے ہو۔ دیکھو میرا ایک دوست کیا کھتا ہے۔۔۔" میں نے چائے پی۔ ہاں۔ ہاں۔۔۔ میری بیوی نے۔۔۔۔ میری شریک حیات نے میری وائف نے میرے دوست کے لئے چائے بھجوائی۔ اپنے ہی نازک نازک ہاتھوں سے بنا کر۔۔۔

ماما کے پیروں پر جیسے ریت کے تھیلے بندھ گئے۔۔۔۔ چل آرہی تھی جیسے ہوا اسے ڈھکیلتی لا رہی ہے۔۔ مگر اس کی یہ سست رفتاری بھی بارِ خاطر نہ تھی۔ وہ چائے لا رہی تھی۔ بس یہی کافی تھا۔۔۔ وہ اگر اسی طرح چائے کی پیالی دکھاتی دور ہی دور کھڑی رہتی تو بھی میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا۔۔۔ میں نے مسکراتے ہوئے اپنے دوست کی طرف دیکھا تو وہ خود کو چائے پینے کے لئے تیار کر رہا تھا۔۔ اور چہرہ پر اس کیفیت کو طاری کر رہا تھا جو چائے پینے سے پہلے طاری ہوا کرتی ہے۔ یعنی سراپا ممنونیت سراپا خلوص ۔۔۔ اور اس کے چہرے پر چائے کا لطف اور ذائقہ ابھی سے اپنی پرچھائیاں ڈال رہے تھے۔ ماما قریب آئی تو میں نے اس انداز سے کہا۔۔۔۔ جیسے ہر دوست کی آمد پر ایسی ہی خاطر تواضع ہوتی ہے اور یہ کہ یہ تو ایک بالکل معمولی بات ہے۔۔۔" دے صاحب کو دے" اور ماما پیالی کو میرے دوست کے ہاتھ میں پکڑا کر تیزی سے اندر چلی گئی۔۔۔ کچھ دیر ٹھیرتی تو میرا ارادہ۔ بغیر طشتری کے پیالی لانے پر اسے ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا تھا۔۔۔۔ لیکن وہ تو جا چکی تھی۔ اب میں اپنے دوست کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہوں تو دودھ کی طرح سفید۔۔۔۔ اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے غٹاغٹ پیالی کو خالی کر دیا اور اسے میز پر رکھ دیا۔۔۔۔ میں نے آگے جھک کر پیالی کے اندر دیکھا تو۔۔۔۔ خون خشک ہو گیا۔۔۔ چائے تو کسی حال اس میں نہ تھی چائے ہوتی تو وہ ایک ہی گھونٹ میں سب کی سب کیسے پی جاتا؟ پیالی کی تہہ میں چائے کا رنگ کیوں نہیں؟ میرا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔۔۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔۔۔ میری آنکھیں جھک گئیں۔۔۔ میرا دوست نہ جانے کس حال میں تھا۔ کافی دیر ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ جانے کے لئے اٹھا۔۔۔ اور جانے کی اجازت طلب کی۔ میں نے گردن اٹھانی چاہی تو ایسا محسوس ہوا جیسے کمرہ کی چھت کا سارا بوجھ میرے سر پر دھرا ہے۔۔۔ اسی طرح گردن جھکائے میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "خدا حافظ"۔۔۔۔۔ اور یہ تک نہ دیکھا کہ میرا دوست ہے بھی یا چلا گیا۔ میں وہاں سے پیچ و تاب کھاتا اٹھا۔۔۔۔ اور نیچی گردن کئے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا۔۔۔ اندر داخل ہوا غم و غصہ کی چنگاریاں میرے تن بدن میں چٹک رہی تھیں۔۔۔ "کہاں ہے وہ ماما کی بچی" میں نے داخل ہوتے ہی پوچھا وہ باورچی خانہ سے باہر آئی۔ "جی" اس نے مجھے سر سے پیر تک گھورتے ہوئے کہا۔۔ "جی۔۔۔ کیوں ری تو ہمارا نمک کھاتی ہے اور ہماری ہی عزت کے درپے ہے"۔۔۔"

" میں نے کیا کیا سرکار"۔۔۔۔

" تو نے کچھ نہیں کیا۔ ارے تو نے تو ہماری عزت پر پانی پھیر دیا۔ جی تو چاہتا ہے کہ تجھے گھر سے باہر کر دوں۔۔ تو کمبخت ۔۔۔ ماما ہے یا چڑیل۔۔۔" ماما میرے اس جملہ پر واقعی چڑیل کی طرح تیز ہو کر بولی۔ "آخر میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے جو آپ مجھے "غیر غلط" بول رہے ہیں۔۔۔ بیگم صاب بھی مجھے آج تک تم سے تو نہیں بولے۔۔۔۔" "اری تم کی بچی۔۔۔۔ پانی پلانے کا یہ کوئی طریقہ ہے"، پیالی میں پانی پلاتے ہیں شریف آدمیوں کو ۔۔۔ پیالی میں۔۔ اُف۔۔۔"۔۔ اتنے میں وہ بھی آگئیں۔۔۔ "کیا ہو رہا ہے۔۔ بے چاری پر خواہ مخواہ کیوں برس رہے ہو۔۔۔" ۔۔۔" آئیے آپ بھی کچھ سنیئے۔۔۔ میرے دوست نے پانی مانگا تو

اس... اس نے... چار پینے کی پیالی میں لا دیا... گھر میں ایک چھوڑ ہزار گلاس ہوں گے... مگر... اب تم ہی کہو اس نے ہمارے گھر کے متعلق کیا رائے قایم کی ہوگی۔ تمھارے متعلق انھوں نے کیا سوچا ہوگا...؟ میرے متعلق... مجال ہے کسی کی... میرے متعلق کوئی سوچے گا... کیا سوچے گا؟"... میں غصہ سے کانپنے لگا۔ ان کے اس سوال کا جواب حلق تک تھا کہ "وہ تم کو دنیا بھر کی سلیقہ شعار۔ گھر گرہستی۔ منتظم... اور جانے کیا کیا سمجھتا ہوگا" ... لیکن میرے منہ سے ان جملوں کو سن کر ان کا دل پاش پاش ہو جاتا۔ کلیجہ چھلنی ہو جاتا خموشی بہتر تھی.. اور یہی میں نے اختیار کی... انھوں نے ماما کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا...

"کیوں ری کیا گھر میں گلاس نہیں ہیں۔" ماما چھٹتے ہی بولی۔ "بیگم صاب ہوتے تو کیا میں نہ دیتی.. آپ ہی کے ہاتھ سے رات کو دو گلاس ٹوٹے ... گھر میں ایک گلاس بھی نہیں ہے... اس میں میرا کیا قصور ہے۔ بھلا... گلاس منگوا دیجیے ... گلاس ہی میں پانی جائے گا..."...

"چلو جانے دو، اتفاق کی بات ہے.... ہر گھر میں ایسے اتفاقات پیش آتے ہی رہتے ہیں..." "نہیں مجھے بجد رنج ہے.... وہاں تم ہوتیں تو میری حالت کو دیکھ کر تمھیں رونا آجاتا.. اتنی شرمندگی تو آج تک اٹھانی نہ پڑی۔"

"چلو بس جانے دو.. اری دیکھتی کیا ہے... جا سرکار غصہ میں ہیں، ذرا ٹھنڈا پانی تو لا۔ اور ہائے وہی کمبخت پیالی ..... دل نے کہا کہ چلو سے پانی پینا منظور لیکن اس نامراد پیالی کو دیکھنا گوارا نہیں.. پیالی کو زمین پر دے مارنا چاہتا تھا... چور چور کر دینا چاہتا تھا.. لیکن خود انھوں نے اپنے ہاتھ سے اسے میرے ہونٹوں تک پہنچایا... اور جب میں ایک دو گھونٹ اپنے کانٹوں بھرے حلق سے نیچے اتار چکا، تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگیں.. "مجھے آج بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی" میں نے بچہ کی طرح بسورتے ہوئے کہا۔ "دوستوں کو آنے ہی نہ دو... چلو جھگڑا ختم..." ...ع ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں.. دوستوں کے بغیر میری زندگی کیونکر گزرے گی.. اور بیوی کی "تحویل" میں میرا کیا حشر ہونے والا ہے... اس کا علم خدا ہی کو ہے... ایک دن اسی مسئلہ پر خفیف سی "تو تو میں میں" کا خیال ہے۔ پھر اس کے بعد بھی ان کا طرز عمل یہی رہا تو کوئی بھی ملاقاتی آئے... دروازہ پر جاؤں گا... سلام علیک کرکے اس دوست سے کہوں گا کہ "میں گھر پہ نہیں ہوں" وہ اس پر بھی نہ ٹلا تو "میں مرگیا ہوں" کہتا ہوا اندر چلا آؤں گا..

رشید قریشی

فانی

دورِ حاضر کے غزل گو شعرا میں فانی ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں. کیا بلحاظ تخیل اور کیا بلحاظ اسلوبِ بیان وہ ایک طرزِ خاص کے مالک ہیں. اس کے باوجود کہ ان کے ہاں میر کی قنوطیت ہے غالب کی دقت پسندی ہے. مومن کی نزاکت ہے پھر بھی ان کی انفرادیت گم نہیں ہوتی. اس لئے کہ فانی نے اپنے پیشروؤں سے اکتسابِ فیض ضرور کیا ہے لیکن اپنے کو کسی میں ضم کر دینے کی ذلت گوارا نہیں کی اور دنیائے ادب میں ایسے ہی لوگ زندہ رہتے ہیں جو خود اپنا ایک مستقل مقام رکھتے ہیں. جو خصوصیت فانی کو اور شعرا سے خاص طور پر ممتاز کرتی ہے ان کی غایت درجہ کی قنوطیت ہے. ان کا ہر شعر ایک دردمند دل کی آواز معلوم ہوتا ہے. خود انھیں کے الفاظ میں ان کے اشعار ان کے دل کے داغ ہیں. چنانچہ باقیات کے سرورق پر یہ شعر لکھا ہے کہ

کیوں اہلِ شہر ہے کوئی نقادِ سوزِ دل
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

اسی لئے رشید احمد صاحب نے فانی کو "یاسیات کا امام" اور عندلیب شادانی نے "مرگھٹ کا رونے والا" کہا ہے. ان خطابات سے فانی کی افتادِ طبع سے زیادہ صاحبانِ سخن کی شوخیٔ طبع جھلکتی ہے. فانی کے یہاں ایسی قنوطیت نہیں جو دل و دماغ کو مضمحل اور زندگی کو بے کیف کر دیتی ہے. ان کی قنوطیت میں کرب و اضطراب کی بجائے ایک اطمینان و سکون ہے اور یہ ایسی نعمتِ عظمیٰ ہے جو انھیں کے عقیدے کے مطابق صرف قسمت کے دھنی پاتے ہیں.

غم وہ راحت جسے قسمت کے دھنی پاتے ہیں

جب کسی پر تابڑ توڑ مصیبتیں پڑتی ہیں اور ایسی بے کسی کے عالم میں تنکے کا سہارا بھی نصیب نہیں ہوتا تو وہ (لا تقنطوا من رحمۃ اللہ) کے عہدِ محکم سے بھی مایوس ہو جاتا ہے. دوسرے الفاظ میں اس کی مایوسیاں اس کو کفر و الحاد کے حدود تک پہنچا دیتی ہیں چنانچہ مرزا غالب جو ممکن ہے اپنے بیان کے مطابق پوشیدہ ولی ہوں گے کیونکہ غیب کا حال تو خدا کو معلوم ہے لیکن ساتھ ہی جیسا کہ اپنے کھلے کافر ہونے کا بھی اعتراف کیا ہے آئے دن کی مصیبتوں سے تنگ آ کر کہہ اٹھے.

زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اسی طرح کی مصیبتیں جب فانی پر پڑتی ہیں تو ملول وہ بھی ہوتا ہے اور یہ انسانیت کا تقاضا ہے لیکن خدا سے مایوس نہیں ہوتا. کبھی پیمانۂ صبر چھلک بھی اٹھتا ہے تو زیادہ سے زیادہ یہی کہتا ہے کہ

یارب تری رحمت سے مایوس نہیں فانی
لیکن تری رحمت کی تاخیر کو کیا کہئے

جب اس کو اپنی تدبیر میں ناکامی ہوتی ہے تو وہ غم و غصہ کے جذبات کی رو میں بہہ نہیں جاتا بلکہ ٹھنڈے دل سے ناکامی کے اسباب پر غور کرتا ہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ انسان کی سعی و کوشش کیسی ہی مکمل کیوں نہ ہو کامیابی کی ضامن نہیں ہو سکتی کیونکہ تدبیر کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار محض اسباب و علل پر نہیں بلکہ اس قوت پر ہے جو نامعلوم طور پر اسباب و علل کے ساتھ ساتھ کارفرما ہے جس کو عرفِ عام

میں تقدیر الٰہی کہتے ہیں۔

حسن تدبیر نہ رسوا ہو جائے
راز تقدیر الٰہی کو، نہ پوچھ

لیکن اپنے کو اس طرح مجبور محض سمجھ لینے کے بعد معاً اس کا ذہن مسئلہ خیر و شر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کیونکہ مجبوری محض کو تسلیم کر لینے کے لئے جزا و سزا کا تخیل ایک واہمہ بن جاتا ہے۔ اب وہ پھر نئے سرے سے اپنے ارادہ 'عمل' اور ان کے نتائج کا جائزہ لیتا ہے تو اس مجبوری میں بھی ایک ایسا اختیار پاتا ہے جو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور کہتا ہے کہ

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی !!
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

ہر افتاد فانی کے لئے ایک دعوتِ فکر ہوتی ہے۔ اور جب یہ غور و فکر اس کو ایمان و ایقان کی بدولت سرفراز ہوتا ہے تو وہی مصیبتیں اور ناکامیاں جو کوتاہ ظرف انسانوں کو تشکیک و الحاد کی گمراہیوں کا شکار کر دیتی ہیں فانی کو خدا کے افضال و اکرام معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اب اس مقولہ کو " اپنے ارادوں کے فسخ ہونے سے میں نے خدا کو پہچانا " ذہن میں رکھ کر فانی کا یہ شعر سنئے۔

تیرا انعام سمجھتا ہوں ان ارمانوں کو
میری کوشش کا جو حاصل نہیں ہونے پاتے

یہی وجہ ہے کہ فانی کی قنوطیت سکون پرور ہے۔ قنوطیت تو میر پر بھی چھائی ہوئی ہے لیکن ایسی قنوطیت جو پڑھنے والے کو مضمحل اور افسردہ کر دے۔ برخلاف اس کے فانی کا پڑھنے والا متاثر ضرور ہوتا ہے لیکن اطمینانِ قلب نہیں کھوتا اس لئے کہ اس کے نظریے محض سلبی ہی نہیں بلکہ ایجابی بھی ہیں۔ جب اس کا دل دکھتا ہے تو فطرتِ انسانی کے تقاضا کے مطابق وہ آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن ساتھ ہی اس دکھے ہوئے دل کو دولت دو جہاں سے زیادہ قیمتی بھی سمجھتا ہے۔ اردو کا ایک اور بلند پایہ شاعر جن کا کلام غم و اندوہ کا مرقع ہے میر انیس ہیں لیکن ان کا رنج و غم محض اعتقادی ہے۔ وہ اس لئے روتے ہیں کہ ان کے آنسو میزانِ حشر میں موتیوں کے ساتھ تولے جائیں۔ ایسی صورت میں ان کا یہاں ذکر ہی عبث ہے۔

ولی سے لیکر داغ تک بلکہ خود فانی کے ہمعصر شعرا کا کلام دیکھیے تو بائے بسم اللہ سے تائے تمت تک سارا دفتر مجنوں کے شکووں سے بھرا پائیں گے۔ گویا شکوہ و شکایت عشق کا لازمہ ہو گئے ہیں بلکہ غزل کی ساری کائنات شبِ ہجر کے دکھڑے۔ معشوق کی رقیب نوازیوں پر سینہ کوبی' اپنی تیرہ بختی کا ماتم اور فلک کج رفتار کی عداوت جیسے اعلیٰ مضامین ہی تک محدود معلوم ہوتی ہے۔ محبوب کے جفا کارانہ کردار کو اس طرح چھڑک چھڑک کر پیش کرتے ہیں کہ ہلاکو خاں اور نیرو کی ستم رانیوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ کیا واقعی اس قسم کے جذبات محبت کا لازمہ ہیں ایک ایسا سوال ہے جو لازماً غزل کا نفسیاتی تجزیہ کرنے والے کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ امر ذرا غور طلب ہے۔ عاشقی ذرا صبر طلب ہی ہوتی ہے کیونکہ محبوب کی طرف سے ہمیشہ بے نیازی اور تغافل ہی برتا جاتا ہے۔ اور عاشق فطرتاً مضطرب اور مستعجل ہوتا ہے اس تضاد اور کشمکش کا لازمی نتیجہ عاشق کی دل شکستگی اور برہمی ہے بتنگ آمد بجنگ آمد۔ لیکن بے چارہ کچھ کر تو سکتا نہیں دل کا غبار نکالنے کے لئے شکایت و ملامت

کا طومار باندھ دیتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی بہت دلچسپ ہے کہ عاشق جس قدر کوتاہ ظرف ہوتا ہے اسی قدر جلد افتاد محبت سے گھبرا اٹھتا ہے۔ اسلئے وہ جس قدر محبوب کی بدسلوکی کا رونا روتا ہے اسی قدر اپنی کوتاہ ظرفی اور زبوں ہمتی کا اعلان کرتا جاتا ہے۔ اب ذرا فانی کی ہمت کا عالم دیکھیئے۔ مشق ستم اس پر بھی ہوتی ہے۔ قدم قدم پر ناکامی ہوتی ہے۔ مصیبت پر مصیبت آتی ہے۔ سر پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے لیکن وہ رضا و تسلیم کا پیکر بنا ہوا خندہ پیشانی سے ہر تلخی کو گوارا کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا جنون وفا تو محبوب کی جفا کو جفا بھی سمجھنے نہیں دیتا۔

ان کی کسی ادا پہ جفا کا گماں نہیں
شوخی ہے جو بسلسلۂ امتحاں نہیں

اگر کبھی جفا کو جفا سمجھ بھی لیتا ہے تو وفاؤں کی عزت کا پاس دامن گیر رہتا ہے۔

ظالم کا نہ شکوہ کر ظلموں کی نہ پروا کر
تو اپنی وفاؤں کی عزت پہ فدا ہوجا

اگر کوئی تمنا بھی کرتا ہے تو شیوۂ تسلیم کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ دیکھیئے کس حسین انداز میں کرم کی التجا کرتا ہے۔

فانیٔ زار پر کرم تیری رضا کے ہے سپرد
ایک نگاہ اور بھی یہ بھی نہیں، نہیں سہی

اردو شاعری میں محبوب کا کردار جیسا کچھ سوقیانہ ہے محتاج بیان نہیں۔ ایسے بازاری حسن کے طلب گاروں کی محبت کا معیار بھی ظاہر ہے۔ پھر انشا، جرأت اور داغ جیسے رنگین مزاج شعرائے کرام کی گندہ ذہنی نے تو غزل کو کلنک کا ٹیکا لگا دیا۔ کم و بیش[1] ہر شاعر کے ہاں ایسے سوقیانہ مضامین ملیں گے جو خود شاعر کی رکاکت نفس پر دلالت کرتے ہیں۔ لیکن فانی ہی ایک ایسا شاعر ہے جس نے آداب محبت میں سرمو فرق آنے نہیں دیا اس کے ایک ایک شعر سے محبوب کی عظمت ٹپکتی ہے اور اس کا یہ جذبۂ احترام اس کے محبوب سے زیادہ خود اس کی عظمت کا نقش دل پر بٹھاتا ہے۔ جب وہ اپنے محبوب کو سرکار اور حضور جیسے شایان شان الفاظ سے مخاطب کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک غلام اپنے عالی مرتبت آقا کی بارگاہ میں سہما ہوا کھڑا ہے اور نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ عرض حال کئے جا رہا ہے۔

بیداد پہ کہیئے اف نہ کریں ہم کہیئے تو تڑپ کر دم دے دیں
کچھ ڈھنگ ہمیں بھی آتے ہیں سرکار کا دل بہلانے کے

سرکار پاس وضع جفا چاہتا ہوں میں
یہ بھی اگر وفا ہے تو اچھا نہ کیجیئے!

دنیا کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے والا ہمیشہ مقصد حیات کی تحقیق اور زندگی کے مفہوم کی تعیین میں سرگرداں رہتا ہے۔ کبھی جبر و قدر کی پر پیچ گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی خیر و شر کے مسئلہ کو حل کرنا چاہتا ہے۔ کبھی وحدت و کثرت کے صوری تضاد میں گم نظر آتا ہے۔ یہی حال فانی کا ہے۔ یوں تو زندگی کا مفہوم سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش غالب نے بھی کی ہے۔ حضرت اصغر نے بھی جگہ جگہ اس عقدہ کی گرہ کشائی فرمائی ہے لیکن جو جامعیت اور حقیقت فانی کے ہاں ہے اوروں کے پاس مشکل ہی سے نظر آتی ہے۔ مگر بڑی دقت یہ ہے کہ ہم ایک کے خیال کا دوسرے کے خیال سے موازنہ بھی نہیں کر سکتے اول تو ایک ہی شاعر کی تعریفوں میں تنوع بلکہ کہیں کہیں

---

[1] یہ صحیح نہیں

تضاد بھی ہے۔ دوسری دشواری یہ ہے کہ ہر شخص کا زاویۂ
نگاہ جدا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں مقابلہ کس قدر مشکل
ہے۔ اس لئے یہاں فانی کے چند شعر نقل کر دئے جاتے ہیں
ناظرین خود اندازہ کریں۔

مایۂ ادراکِ ہستی ہوں تکلف برطرف
زندگی میری دروغِ مصلحت آمیز ہے

تجلیاتِ وہم ہیں مشاہداتِ آب و گل
کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

ہر مژدۂ نگاہ غلط جلوہ خود فریب
عالم دلیلِ گمرہیِ چشم و گوش تھا

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہیے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

اکثروں کا خیال ہے کہ فانی کی زبان و بیان میں بڑی ثقالت
اور تکلف ہے۔ والہانہ بے ساختگی جس کو وہ اپنے خیال میں
آرٹ سمجھتے ہیں فانی کے یہاں مفقود ہے رشید احمد صاحب
کے خیال کے مطابق ان حضرات کا تعلق اسی گروہ سے ہے جو
یہ سمجھتا ہے کہ "جو کچھ دل میں آئے وہ زبان پر نہ آسکے تو
نہ آسکے اسے صفحۂ قرطاس پر آجانا چاہیے۔ یہی کمال انشا
پردازی ہے جس میں تغیر و تبدل آرٹ کا خون کرنا ہے
ان بزرگوں کے نزدیک ان کی ہر لغزش یا برہنگی کا جواز
آرٹ میں مل سکتا ہے"۔ شاعر کا آرٹ یہ ہے کہ شعریت
کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے خیال کو بہ احسن وجوہ اس طرح
ادا کردے کہ اس سے زیادہ جامعیت اور حسن کے ساتھ
اظہار کرنا ممکن نہ ہو۔ فانی کا سطحی نظر سے مطالعہ کرنے والے یہ
نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیچ در پیچ خیال کو کس قادر الکلامی
کے ساتھ ادا کر جاتا ہے یہ واقعہ ہے کہ جس کا متخیلہ قوی ہوتا
ہے زبان کی پونجی اس کی فکر کی اڑان کا ساتھ نہیں دے
سکتی۔ بے چارے غالب ہی کا حال دیکھ لیجئے جب اردو کے
محاورے اور ترکیبیں اس کے تخیل کی رفعت اور نزاکت کی
ترجمانی سے قاصر ہو جاتے ہیں تو فارسی اضافتوں کے ردّے
چڑھانا پڑتا ہے۔ پھر بھی مطلب شاعر در بطن شاعر ہی رہ جاتا
ہے۔ لیکن فانی کے ہاں باوجود علوِ تخیل کے نامانوس ترکیبیں
اور غیر مطبوع اضافت در اضافت نہیں۔ جہاں خیال الجھا ہوا
ہوتا ہے فانی بھی فارسی کا سہارا لیتا ہے لیکن اس حسن سے کہ شعر
سے اردو پن جانے نہیں پاتا۔

ہوں اسیرِ فریبِ آزادی
پر ہیں اور مشقِ حیلۂ پرواز

انسان کو جو نام نہاد اختیار دیا گیا ہے۔ اسیر فریب آزادی
سے زیادہ حسین اور جامع انداز میں پھر اس حسن اختصار کے ساتھ
ادا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اور تدبیر کو جو نامعلوم طور پر تقدیر
الٰہی کے اشاروں پر چلتی ہے کتنی بلاغت کے ساتھ مشق حیلۂ
پرواز کہا ہے۔

دادِ مظلوم نگاہی بھی تو لے لینے دے۔
ٹھہر اے موت کہ قاتل کو پشیماں کرلیں

دادِ مظلوم نگاہی کی بلاغت کے قطع نظر قوتِ سامعہ کو صحیح
حکم تسلیم بھی کرلیا جائے تو کون صاحب ذوق کہہ سکتا ہے کہ
یہ ترکیب سماعت پر گراں گزرتی ہے۔ میں نے مثالاً دو ایک
شعر دے دیئے ہیں اور ہر جگہ یہی کیا ہے تاکہ مضمون میں غیر ضروری

طوالت نہ پیدا ہو۔

بالعموم فانی صرف اشارے کنائے میں وسیع سے وسیع مضمون ادا کر جاتے ہیں مگر ایسا نہیں کہ شعر چیستاں بن جائے۔ بلکہ معمولی غور سے مدعا سمجھ میں آجاتا ہے اور وہی اشارے کنائے شعر کا حسن اور شعریت کی جان بن جاتے ہیں۔ یہ قدرت بیان کی کوتاہی نہیں بلکہ قادر الکلامی کی دلیل ہے۔

آج پہلو میں کیوں ہے سناٹا
کیا ہوئی آہ آہ کی آواز!

محشر میں بھی وہ عہد وفا سے مکر گئے
جس کی خوشی تھی اب وہ قیامت نہیں رہی

جانے دل کے لہو پہ کیا گزری
رنگ اشکوں کا زرد رہتا ہے

معنی آفرینی اور نزاکت بیان فانی کی ایسی نمایاں خصوصیات ہیں کہ ان کی تصریح تحصیل حاصل ہے۔ رسماً ایک دو شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

مدعا ہے کہ مدعا نہ کہیں
پوچھتے ہیں کہ مدعا کیا ہے

وہ بالعموم متضاد صورت سے ایسے موافق اور لطیف معنی پیدا کرتے ہیں کہ سننے والا پھڑک اٹھتا ہے۔

امید عفو ہے ترے انصاف سے مجھے
شاہد ہے خود گناہ کہ تو پردہ پوش تھا

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اگر خدا محض انصاف سے کام لے تو شاید ہی کوئی بخشش کا مستحق نکلے۔ لیکن فانی کی شوخی دیکھنا کہ وہ انصاف ہی سے امید عفو رکھتے ہیں۔ لیکن مصرع ثانی کا حسن استدلال انہیں حق بجانب کر دیتا ہے۔

اسی سلسلہ میں ان کے انداز بیان کی ایک اور خصوصیت پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ جن شعرا کے ہاں خیال مقدم ہوتا ہے ان کے کلام میں لفظی محاسن ڈھونڈنا ہی فضول ہے۔ جن کے ہاں معنوی حسن مفقود ہوتا ہے۔ وہ الفاظ کے حسن اور زبان کے چٹخارے سے کلام کو چمکانا چاہتے ہیں۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ فانی کا کلام سرے سے محاسن لفظی سے عاری ہے۔ محاسن لفظی بھی ہیں مگر کم اور وہ بھی خیال کے تابع اور زور بیان کی رو میں بہہ کر چلے آئے ہیں۔ البتہ تکرار کے ساتھ اس کے متضاد لفظ کی بھی تکرار کرتے چلے جاتے ہیں۔ تقریباً ہر شعر کا یہی عالم ہے۔ لیکن باوجود اس کثرت کے یہ طرز بدنما نہیں معلوم ہوتا۔ کہیں ایک آدھ شعر "کا فسان" بن گیا ہو تو بن گیا ہو ورنہ فانی کے کلام کی یہ خصوصیت ہر جگہ حسین معلوم ہوتی ہے۔

ان کی دل نوازی میں کوئی شک نہیں لیکن
ان کی دل نوازی کو لاگ ہے تمنا سے

تم سے ملنے کی آرزو ہی سہی
تم سے ملنے کی آرزو تو کریں

سنتے تھے محبت آساں ہے۔ واللہ بہت آساں ہے مگر
اس سہل میں جو دشواری ہے وہ مشکل سی مشکل میں نہیں

حفیظ قتیل

گوالن

انسانیت کی قدر، خلوص اور محبت آج کل کے پڑھے لکھے لوگوں میں کہاں، یہ نعمتیں اُن لوگوں کا حصہ ہیں جن کو مہذب طبقہ، گنوار، قریہ باش کہتا اور نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے۔

اُس زمانے میں جب کہ میسور پر پالیگاروں کی حکومت کا پرچم لہرا رہا تھا، انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی جارہی تھی، رحم وکرم کی جگہ بربریت اور غارتگری کا دور دورہ تھا، انسانوں کا شکار محض دل کا بہلاوا خیال کیا جارہا تھا، ایسے وحشت خیز دور میں چند ایسی ہستیاں خدا نے پیدا کردیں جن کا وجود ایک دیوتا یا فرشتے سے کم نہ تھا۔

میسور کا ملک اُس وقت پہلوانوں کا اکھاڑا تھا، کوئی دن، کوئی ساعت، ایسی نہ گزرتی جس میں انسانوں کا خون پانی کی طرح نہ بہایا جاتا ہو، ہر زورآور یہی چاہتا تھا کہ کمزور کی ہستی کو نیست و نابود کردے درندوں کی طرح لڑتے رہنا، مچھلی کی طرح کمزور کو مار کر اپنی آتش شکم کو بجھانا اور اپنی کامیابی پر اکڑنا معمولی مشغلہ تھا، اس وقت ایسا کرنا ناگوار بھی نہیں سمجھا جاتا تھا کیونکہ عام فضا ہی تھی۔ حیرت تو یہ ہے کہ آج کل کے جیسے شائستہ زمانے میں ایسی ناشائستہ حرکتیں اچھی نظر سے دیکھی جارہی ہیں۔ بھلا یہ کونسا انصاف ہے کہ ہم اپنے زمانے میں بربریت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں تو کچھ نہ کہیں اور گزرے ہوئے لوگوں کی برائیوں کو طشت ازبام کریں۔

چتل درگ کا نایک ایک معمولی راجا تھا لیکن چند معرکوں میں اس کی کامیابی نے بہت زیادہ مغرور بنا دیا تھا۔ آس پاس کے معمولی قلعداروں پر اس کی بہادری کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ اپنی کامرانی کے بعد اس نے یہاں کے پہاڑ پر ایک مضبوط قلعہ بنایا، یہ قلعہ پہاڑ کی چوٹی پر ہے۔ اس کے چاروں طرف پتھر کی مضبوط فصیل ہے۔ پہاڑ کے دامن میں ایک جھیل ہے جو پہاڑ کے تین چوتھائی حصے کو گھیری ہوئی ہے، قلعے میں پہنچنے کے لئے سنگین سیڑھیاں بنائی گئی ہیں اور جگہ جگہ رہنے کے لئے سنگین مکان ہیں اور ان مکانوں میں پتھر کے بت رکھے گئے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر سنگین محل اور محل سے تھوڑی دور پر ایک چھوٹا سا تالاب ہے جس میں بارش کے موسم میں پانی زیادہ رہتا ہے۔ پہاڑ پر کچھ دور چڑھنے کے بعد قلعے کا صدر دروازہ ملتا ہے جو بہت بلند اور پتھر کا بنا ہوا ہے۔ صنعت وکاریگری کا تو نام ونشان نہیں نظر آتا لیکن ایک سیاح کا دماغ اسوقت کے لوگوں کی طاقتوں کا اندازہ آسانی سے کرسکتا ہے۔ معمولی پتھر کے سادہ اور اونچے ستون کھڑے کردئے گئے ہیں۔ صدر دروازے سے پہاڑ کی چوٹی تک دو ایک دروازے اور ملتے ہیں۔ ان دروازوں کے درمیان کھنڈر ہی کھنڈر ہیں جہاں کسی زمانے میں شاندار عمارتیں ہونگی لیکن اب تو ان پر الو بول رہے ہیں۔ جابجا ٹوٹی پھوٹی دیواریں، ان میں بھیڑیوں اور گیدڑوں اور ابابیلوں نے اپنا مسکن بنالیا ہے۔ درخت اور خاردار جھاڑیاں جابجا اگی ہیں، وہ بھی شباب رفتہ کا نوحہ کرتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ اسی کھنڈر کے درمیان درختوں کے جھرمٹ میں ایک چشمہ ہے جس کا شفاف پانی آبِ حیات سے بھی سوا ہے۔ یہ پانی پہاڑ کی ایک ٹوٹی ہوئی چٹان سے نکلتا ہے۔ گڑھے میں جمع رہتا ہے اور وہاں سے ایک نالے کی صورت میں آہستہ آہستہ بہہ کر نیچے دامن میں آتا اور ایک سرنگ سے گزرتا ہے۔ اس سرنگ کے قریب کئی نکیلی چٹانیں ہیں اور ان چٹانوں کے درمیان کئی گھنے درخت ہیں، خاردار جھاڑیوں نے اس سرنگ کو اور بھی خوفزدہ بنا دیا ہے۔ ان چٹانوں میں گزرنے کے لئے ایک پگڈنڈی بنائی گئی ہے جس کے نیچے اوپر چٹانیں ہی چٹانیں ہیں یہاں

اکثر چیتے اور بھیڑیے رہتے ہیں. لیکن اگلے زمانے میں یہی پگڈنڈی قلعے میں پہنچنے کے لئے "چور راستہ" کہلاتی تھی۔

جب حکومت بیجاپور نے نواب حیدر علی خاں کو سرا (رستم آباد) کا گورنر بنایا اور آس پاس کے راجاؤں سے خراج وصول کرنے کا انھیں اختیار دیا تو حیدر علی نے ان پالیگاروں سے خراج وصول کرنا شروع کیا. لیکن جب چتل درگ کے نایک سے خراج کی طلبی ہوئی تو اس نے نواب کی درخواست کو ٹھکرایا ہی نہیں دیا بلکہ جنگ کا اعلان کر دیا اب تو نواب کو بھی مجبوراً اس کی سرکوبی کرنا پڑی. نواب اپنے لشکر کے ساتھ سرا سے نکلے اور دو ایک مقام کے بعد چتل درگ کا محاصرہ کر لیا. کئی دنوں تک نواب کی فوجیں پڑی رہیں مگر قلعہ فتح نہ ہوا سپاہی ہر روز قلعے پر چڑھنے کی کوشش کرکے ناکام رہتے، اس لئے کہ محصور فوجیں، جن کے دلوں میں تعصب اور انتقام کی آگ بھڑکی ہوئی تھی، فصیل پر چڑھنے والے سپاہیوں کو تیروں کا نشانہ بناتی، آگ پھینکتی یا گرم گرم تیل انڈیلتی تھیں. چڑھنے والے سپاہی، نشانہ لگاتے ہوئے پرندوں کی طرح نیچے گرتے اور وہیں ڈھیر ہو جاتے تھے۔ کئی دن تک یہی حال رہا. لاشوں کے انبار لگ گئے، بہت سی لاشیں سڑ گئیں، ان کی بدبو نے گاؤں والوں کو ہراساں کر دیا تھا، گاؤں والوں سے ایسی بیرحمی کب تک دیکھی جاتی، وہ بھی تنگ آ گئے تھے مگر کسی کو یہ ہمت نہ تھی کہ نواب کی فوجوں سے مل کر قلعے کے خفیہ راستوں سے آگاہ کر دے اکثر لوگ ان راستوں کو جانتے بھی نہ تھے اور جو جانتے تھے وہ راجا کے بہی خواہ تھے یا اس سے زیادہ خوف زدہ۔

قلعے سے ایک میل دور نواب کی فوجوں نے قیام کیا تھا. وہیں ایک چھوٹا سا قریہ بھی تھا، رتنا اسی قریہ میں رہتی تھی۔ اس گاؤں میں ادھر ادھر چند جھونپڑیاں تھیں، سامنے کھیتوں سے لگے ہوئے دو مٹی کے گھر تھے جن میں پٹیل اور پٹواری رہا کرتے تھے، رتنا کی جھونپڑی سے لگی ہوئی ایک دوسری جھونپڑی تھی جس میں رمو رہتا تھا، ان دونوں جھونپڑیوں کا ایک ہی آنگن تھا. رمو کی جھونپڑی سے بالکل قریب کئی سایہ دار درخت تھے اور درخت کے نیچے ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پڑی رہتی تھی۔ رتنا نے آنگن میں کئی قسم کی ترکاریوں کی بیلیں لگائی تھیں اور ان کے لئے چھوٹے چھوٹے منڈھے بھی ڈالے تھے. درختوں سے لگا ہوا ایک گئوشالہ تھا جس میں رتنا اپنے گائے بیل باندھتی تھی. پٹیل کے مکان کے سامنے کنواں تھا جس سے گاؤں کے تمام لوگ پانی لیتے تھے۔ رمو کے بیوی بچے مر چکے تھے۔ وہ تنہا اپنی زندگی گزار رہا تھا. اس کا ایک کھیت تھا اور چند گائے بیل. مگر رمو مسلمان تھا اور رتنا ہندو۔ ان دونوں کا تعلق باپ بیٹی کا سا تھا. ایک روز صبح کو سورج کی کرنیں درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر آنگن میں گر رہی تھیں، رتنا بیٹھی دودھ دوہ رہی تھی، بوڑھا رمو کمبل اوڑھے، کھانستا ہوا ہاتھ میں چلم لے کر جھونپڑی سے باہر نکلا اور رتنا کی جھونپڑی کے پاس آکر پکارا، رتنا نے دوہتے ہوئے جواب دیا، کیا ہے —؟ باوا جی! — بوڑھے نے پلٹ کر دیکھا اور کہا: بیٹیا تو دودھ دوہ رہی ہے، چولہے میں آگ ہے کہ نہیں؟ ہو تو ذرا چلم بھر لوں — ہوگی باوا جی! اندر جا کر لے لو، دھوپ نکل چکی ہے کلے کو جانا ہے، دیر ہو جائے گی رتنا نے کہا — بوڑھا رمو دعائیں دیتا ہوا اندر گیا، آگ لی اور باہر آکر چارپائی پر بیٹھ گیا. بوڑھا حقہ پیتا اور کھانستا جاتا تھا، سامنے رتنا دودھ دوہ رہی تھی. کام ختم کر لینے کے بعد رتنا چارپائی کے پاس آئی، دودھ سے بھرے ہوئے لوٹوں کو سامنے رکھ کر

قریب ہی بیٹھ گئی۔ بوڑھے نے پوچھا کیوں رتنا ابھی نہیں جائے گی تو؟ ـــــ جا تو رہی ہوں باوا جی! مگر آج تم سے چند باتیں کرنا ہیں ـــــ رتنا نے کہا۔ وہ کیا بیٹا! ـــــ باوا جی نباب کی فوج والے کتنے بھلے آدمی ہیں کہ وہ غیر عورتوں کی طرف آنکھ اٹھاکر دیکھتے بھی نہیں۔ آج تک انھوں نے نہ ہمارے کھیت اجاڑ کئے، نہ گھر لوٹے ـــــ میں تو باوا جی شام سویرے وہیں سے آتی جاتی ہوں مگر انھوں نے ڈانٹا تک نہیں، کیا باوا جی یہ ہمارے دشمن نہیں ہیں؟ رتنا نے حیرت سے پوچھا ـــــ بوڑھے نے ہنستے ہوئے جواب دیا: وہ ہمارے دشمن کیوں ہوتے رتنا! ہم گریبوں نے نباب صاب کا کیا بگاڑا ہے؟ دشمن ان کا راجا ہوگا، اس کے گرور کا بدلہ اسے ملے گا، ہمارے لئے تو سب ایک ہیں، ہم کیا جانیں کون نباب کون راجا ـــــ ٹھیک ہے باوا جی پھر ـــــ رتنا یہاں ٹھیر گئی اور پھر کہا، باوا جی! وہ جو پچھلے سال مائی کنڈہ کے پالیگار پر اس ہمارے راجا نے لڑائی کی تھی تو کتنے ستم توڑے تھے، گھر بار سب جلا دئے، لوگوں کے کھیت اس نے ماتھے پر ٹیکا لگایا، جالم کہیں کا، اسی لڑائی میں تو میرے پتی نے بھی جان دی، میری آرجوؤں کا ستیاناس ہوا، میرا سہاگ لٹ گیا، پر یہ لوگ ایسے نہیں، میرے دل میں تو ان کے لئے پریم ہے، یہ دکھی ہیں، میں ان کو کس دکھ سے بچانا چاہتی ہوں۔ دوانی ہوئی ہے تو رتنا! عورت جات ان سورماؤں کے جنگل میں کیا کر سکتی ہے، دن رات گولیوں کی آواجوں سے کان پھٹے جا رہے ہیں، آدمی کتوں کی طرح مر رہے ہیں، دیکھتی نہیں آنکھوں سے تو، ہم بھی رحم کھاتے ہیں مگر آخر ـــــ تم کر جور، تیرا ہے کوئی نہیں، چپ رہ، بول مت، راجا کو کھبر ہوگی تو تیری جان جائے گی ـــــ اے باوا! اب ہے کون، جو روئے، جب میرا پتی مرا، میں تمھاری آڑ میں جی رہی ہوں، ساری آرجوئیں پھنا ہو چکیں۔ مگر میں ان دکھیوں کو پاپیوں کے جُلم سے ضرور بچاؤں گی ـــــ رتنا! تو دھن کی پکی ہے، کسی کی نہیں مانتی، جو من میں آئے کر، مگر اس بوڑھے کو اپنے کرتوت سے بچائے رکھنا ـــــ مانےگی کہ نہیں، رتنا چپ تھی، بڈھے نے پھر کہا، بولتی کیوں نہیں، بھگوان دیا کرے تجھ پر ـــــ اچھا! باوا جی کلہ ہو آتی ہوں ـــــ رتنا نے رمو سے اجازت لی اور دودھ لیکر قلعے کی طرف چلی گئی۔

دھوپ تیز ہو چکی تھی، نواب کے سپاہیوں نے قلعے پر دھاوا بول دیا تھا، وہ ہر چند قلعے میں پہنچنے کی کوشش کرتے تھے جان کھوتے تھے مگر کامیاب نہ ہوتے تھے، رتنا یہ سب کچھ دیکھتی تھی دل بھر آتا تھا مگر بے بس تھی، وہ جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی جھاڑیوں میں غائب ہوگئی، نواب کی فوج والوں نے دیکھا مگر خیال نہ کیا، وہ چور دروازے سے قلعہ میں پہنچی، دودھ دیا، اور قلعے کی فصیل کے پاس آئی جہاں راجا کے سپاہی تیل اور آگ انڈیل رہے تھے۔ انھوں نے کہا ـــــ کیوں ڈر گئی تو رتنا ـــــ جاتی نہیں ـــــ ہاں بھیا! کیسے جاؤں، لڑائی جو رکی ہو رہی ہے، دشمن کی فوجوں نے راستے بند کر دیے ہیں، رتنا نے جواب دیا ـــــ راستے بند کر دیے ہیں، ان میں سے ایک نے اس جملے کو حیرت سے دہرایا ـــــ اچھا!! آج رات دیکھنا دشمن کی فوجوں کا خون ندی نالے کی طرح بہیگا۔ رتنا خاموش رہی، جواب دینا پسند نہ کیا، باہر نکل گئی۔ آنکھ بچاتی، چھپتی چھپاتی گاؤں میں پہنچ گئی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، مگر کبھی کبھی اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوتے تھے۔

بوڑھا رمو، درختوں کے سایے میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ گرمی زوروں کی تھی، گاؤں کے تمام لوگ کھیتوں کو چلے گئے تھے، چند بوڑھی عورتیں، گھروں کے باہر چبوتروں پر سو رہی تھیں۔

بچے درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں کھیل رہے تھے۔
رتنا جھونپڑی میں گئی، لوٹے دھوئے اور برتن میں چپاتیاں
لیکر بوڑھے رمّو کو آواز دی ـــــ روٹی کھاؤ گے باواجی!
ـــ رتنا تو آگئی؟ بوڑھے نے اٹھتے ہوئے جواب دیا ـــ
ہاں ابھی ابھی آئی ہوں باواجی! کیا حال ہے کچھ سنا تو،
بوڑھے نے جھونپڑی میں جاتے ہوئے کہا ـــ سناتی ہوں
باواجی! پہلے روٹی تو کھالو۔ رتنا نے کہا ـــ بوڑھا ہاتھ
منہ دھوکر آیا اور روٹی کھانے لگا۔ رتنا نے روٹی توڑتے
ہوئے کہا ـــ باواجی! راجا کے سپاہی آج رات کو نباب
کی فوج پر حملہ کرنے والے ہیں۔ سپاہی کہتا تھا دیکھ آج رات کو
دشمن کا کھون۔ ۔۔۔ ندی، نالوں کی طرح بہیگا۔ باواجی!
یہ سن کر میں سہم گئی۔ نباب صاحب کو اس کی کھبر کردیں تو بہتر
ورنہ وہ ناحق مارے جائیں گے ـــ تیرا کہا تو ٹھیک پر بہت
مشکل ہے رتنا! تو جائیگی کیسے؟ ـــ نہیں باواجی میں
تو آج جرور جاؤں گی، رتنا نے جوش اور غصے سے کہا ـــ
بوڑھے نے سر اٹھایا، رتنا کا چہرہ سرخ تھا، کوئی جذبہ بھڑک چکا
تھا، اس کے چہرے سے استقلال ظاہر ہو رہا تھا، رمّو نے زیادہ
بولنا مناسب نہ سمجھا۔ اچھا، کہہ کر کھانے میں مشغول ہو گیا،
کیونکہ وہ رتنا کی پھرتی اور عزم سے واقف تھا۔ رمّو کھانے
کے بعد باہر آکر چارپائی پر لیٹ گیا۔ رتنا نے برتن باہر لاکر
دھوئے، اندر گئی اور پھر چولھا جلا کر کھانا پکانے میں مشغول
ہو گئی۔

دن ڈھل رہا تھا، دھوپ کم ہوتی جارہی تھی، پرندوں
کی بولیاں شام کی خبر دے رہی تھیں۔ دور، بہت دور چرواہے
بانسری بجا بجا کر جانوروں کو جمع کر رہے تھے، کھیتوں کو
گئی ہوئی نوجوان عورتیں، تیتریوں کی طرح تھرکتی ہوئی،
کبھی نالوں میں، کبھی مینڈھوں پر، کبھی جوار کے پودوں
میں چھپتی چھپاتی، جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی آرہی تھیں، خاموش
گاؤں میں پھر زندگی کی رو دوڑ گئی۔ پرندوں نے اپنے شور
سے گاؤں میں ہل چل ڈال دی، گائے بیل اپنی اپنی جگہوں
میں باندھے جانے لگے۔ عورتیں، برتن، مٹکے سر اور کمر پر لیکر
کنوئیں کی جگت پر جمع ہوگئیں کوئی پانی کھینچ رہی ہے، کوئی باتیں
کررہی ہے، چھوٹے چھوٹے بچے کنوئیں کے پاس کھیل رہے
تھے، بوڑھا رمّو گائیوں کو آتے ہوئے دیکھ کر چارپائی سے اٹھا،
رتنا کو آواز دی، جواب نہ پاکر جھونپڑی میں گیا، دیکھا، ڈھونڈا
پتہ نہ پایا، چولھے کی آگ تیز تھی، کھانا پک چکا تھا۔ رتنا نہیں
تھی، فکر میں ڈوب گیا، بات تو ظاہر کرنے کی نہ تھی، خدا
نگہبان کہہ کر باہر آیا۔ گائے بیل باندھے، آنگن صاف کیا،
حقہ جلا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تھکے ماندے کسان گھروں کو
پہنچے۔ ہل رکھے، بیلوں کو باندھا اور چلم لیکر رمّو کے پاس
آ گئے۔ رمّو بہت فکر مند تھا، آنکھیں بند کئے ہوئے کچھ
غور کر رہا تھا، جھرّیدار چہرے سے بشاشت دن کی روشنی
کی طرح اڑ چکی تھی، محض بناوٹی ہنسی ہنستے ہوئے لوگوں کا
حال دریافت کر رہا تھا۔ ان میں سے کسی نے پوچھا۔ باواجی!
رتنا کہاں ہے؟ نجر نہیں آتی ـــــ بھیّا! وہ تو پیہر گئی
ہوئی اب تک نہیں آئی لڑائی جور کی ہے، نباب کی فوج
کے لوگ بہت مر رہے ہیں۔ بھگوان جانے رتنا کا کیا حال ہے؟
اسی پھکر میں بیٹھا ہوں، رمّو نے جواب دیا ـــــ نا باوا،
پھکر کی کوئی بات نہیں، وہ ـــ کلے ہی میں ہوگی، اس کو
بھی تو جان کی آس ہے۔ کسی نے جواب دیا اور ادھر اُدھر
کی باتوں میں مشغول ہوگئے۔ تھوڑی دیر کی گپ شپ کے
بعد گاؤں پر سناٹا چھا گیا۔ رات بڑھتی جارہی تھی، بندوقوں

کی آوازیں کم ہوگئیں تھیں۔ گاؤں کی جھونپڑیوں کے چراغ جنگل
میں جگنوؤں کی طرح چمک رہے تھے۔ بوڑھا رتو اپنی چارپائی سے
اٹھا، لکڑی کے سہارے کیمپ کی طرف چل دیا۔ کیمپ گویا ایک شہر
تھا، سپاہی گھوڑوں کو دانہ چارہ دے رہے تھے، کچھ لوگ
ہتھیاروں کو صاف کر رہے تھے، گھوڑے ہنہنا رہے تھے، لشکر
کے قلب میں لکڑیوں کا انبار تھا، جس میں آگ لگائی جا رہی تھی۔
رتو چادر اوڑھے، کمر پر ایک ہاتھ رکھے، لکڑی کے سہارے ادھر
اُدھر دیکھتا جا رہا تھا کہ سامنے سے سفید گھوڑے پر کسی کی سواری
آئی، سپاہی نے بگل بجایا، تمام سپاہی قطار باندھ کر کھڑے ہوگئے
سلامی دی گئی، نواب نے فوج کا جائزہ لیا اور سب کو کچھ
حکم دینے کے بعد اپنے خیمے کی طرف روانہ ہوا۔ بوڑھا رتو بھی
ساتھ ہولیا مگر کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہ کی۔ نواب
اپنے ڈیرے کے قریب آکر ٹھیر گئے، گھوڑے سے اترے
اور ابھی اندر قدم رکھنے بھی نہ پائے تھے کہ انھوں نے
کسی کو اپنے قدموں سے لپٹے ہوئے دیکھا، قدموں کو
جھٹک کر تلوار سے وار کرنا چاہتے تھے کہ آواز آئی، حجور!
میں آپ کی ــــ کون ــــ عورت ــــ یہاں کیوں آئی؟
جان بخشی ہو تو کچھ کہنا چاہتی ہوں ــــ اچھا جو کچھ کہنا ہے کہہ
نواب نے فرمایا ــــ حجور! آج رات کو راجا کے سپاہی
آپ کی پھوج میں گھسنے والے ہیں، میں گوالن ہوں،
کلے کو ہر روز دودھ لے جاتی ہوں، وہاں میں نے یہ بات
سنی، رتنا نے جواب دیا ــــ تو رہتی کہاں ہے؟ ــــ
برابر والے گاؤں میں سرکار، اچھا!! تو باہر نہ جا، یہ کہہ کر
نواب نے سپاہی کو آواز دی، سپاہی آیا، نواب نے کہا
باہر کوئی اور ہے؟ ہاں حضور! کوئی بوڑھا، کمر پر ہاتھ دھرے
کھڑا ہوا ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے ــــ اس کو اندر لاؤ،
نواب نے حکم دیا۔ سپاہی گیا اور بوڑھے کو بلا لایا، بوڑھا اندر
آیا، نواب کو دیکھا، سلام کیا اور ڈیرے کے چاروں طرف
حیرت سے نگاہ ڈالی، اس کی نگاہ رتنا پر پڑی تو وہ بےساختہ
پکار اٹھا، رتنا! اُن دونوں کی آنکھیں لڑیں اور جو واقعات
رتنا نے کہے تھے، ایک ایک کرکے رتو کے دماغ میں آگئے۔ نواب
نے دونوں کی حالت کا بغور مطالعہ کیا اور بوڑھے سے پوچھا
یہ عورت تیری کون ہے۔ حجور! یہ میری منہ بولی بیٹی ہے،
میرا تو دنیا میں کوئی ہے نہیں، صرف اسی کو دیکھ دیکھ جیتا
ہوں، ہر روز کلے میں دودھ دینے جاتی ہے، کوئی ڈیڑھ ایکر
کھیت ہے، اسی میں اپنی جندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ ہم
میں پھرک ــــ ہے تو یہی کہ وہ ہندو ہے میں اللہ محمد کو یاد
کرتا ہوں، بوڑھے نے ابھی یہ جملہ ختم بھی نہ کیا تھا کہ نواب نے فرمایا
ــــ ایں تو مسلمان اور وہ ہندو، خوب ــــ اچھا! تم
دونوں یہاں کیوں آئے ہو، بوڑھے نے عرض کیا، حجور! رتنا
کا پریم مجھے یہاں کھینچ لایا، وہ کہتی تھی، نباب سے ملوں گی اور
آج رات کا ہونے والا کتہ سناؤں گی، وہ آج دوپہر سے
غائب تھی، میرا دل دھڑکنے لگا، اس لئے ڈھونڈتا ڈھانڈتا
یہاں پہنچا۔ نواب نے کہا، کیا تو سچ کہہ رہی ہے رتنا! حجور!
دھوکا باجی ہمارا کام نہیں، یہ کام ان مردوں کا ہے جو
انسانوں کی کدر نہیں کرتے۔ میں عورت جات ہوں
راجا کے جلم سے تنگ آگئی ہوں، اس نے جو کھون
کی ندی بہائی ہے اسے دیکھ دیکھ میرا جی کڑھتا ہے، کیا
راجاؤں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں حجور! کھون گریب
سپاہیوں کا ہو، پرجا ہو کی مر رہی ہو، تو ان کو کچھ نہیں،
یہ لوگ آرام سے محلوں میں رہتے ہیں، گریبوں کا کھون
چوستے ہیں، سچ مانئے میرے دل میں آپ کے لئے پریم ہے۔

یہ روز روز کا گھٹن، کُسل مجھ سے دیکھا نہیں جاتا، عاجز ہوئی رہوں، چاہے کچھ ہو۔ نوابؔ نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور دیکھا کہ اسکی آواز میں زور الفاظ میں صداقت ہے، دل نے شہادت دی کہ یہ واقعی بھی خواہ ہے۔ نواب نے پوچھا: اچھا تو رتنا! اب کیا کرنا چاہیے — حضور! کچھ نہیں، فوج کے تین ٹکڑے بنائیے، ایک ٹکڑا پہاڑ کے کنارے پتھروں میں چھپا رہے، دوسرا ابھی یہیں رہے مگر ہشیار اور تیسرا دستہ میرے ساتھ بھیج دیں اس کو جنگلوں میں چھپتی چھپاتی چور دروازے کے پاس لیجاؤنگی جب راجا کے سپاہی آپکو مارنے کیلئے کلے سے باہر نکلینگے تو میں اس دستے کو لیکر چور دروازے سے کلے میں گھس جاؤں گی اور راجا کے سپاہی کیمپ کے سپاہیوں کو ہشیار پاکر کلے کے چور دروازے کے کریب آئیں گے تو آپ پہاڑ کے کنارے کے دستے کو لیکر انپر حملہ بول دینا اور سیدھا چور دروازے سے کلے میں گھس آنا، فوج تھوڑی رہیگی، راجا پھنس جائیگا، کُسل اور گھٹن بھی زیادہ نہ ہوگا۔ رتنا نے کہا اور فکر میں ڈوب گئی، بس میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے حضور! نواب نے بھی اس کی باتوں پر غور کیا اور تھوڑی دیر کے بعد اس پر عمل کرنے کیلئے آمادہ ہوگئے، سپہ سالار کو طلب کرکے کان میں کچھ کہا، آگ بجھا دی گئی۔ سونے کا بگل بجا اور کیمپ پر سناٹا چھا گیا۔ رات کی تاریکی بڑھ رہی تھی، تارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، ہوا ساکت تھی رتنا فوج کے ایک دستے کو لیکر چور دروازے کے قریب آئی، چٹانوں اور جھاڑیوں میں انھیں چھپا دیا۔ دشمن کو کیا خبر کہ بساطِ جنگ کی کایا پلٹ ہونے والی ہے، وہ نشۂ غرور میں سرشار، دبے پاؤں چور دروازے سے ایک ایک نکلے، آن کی آن میں ایک انبوہ کثیر ہتھیار باندھے میدان میں جمع ہوگیا۔ کیمپ کیطرف بڑھا، کیمپ خالی تھا، ڈیرے پر سنتری تک نظر نہ آتا تھا۔ انھوں نے مالِ غنیمت خوب لوٹا اور ہنستے خوش ہوتے واپس ہوئے۔ دشمن کی چال بازیوں سے ناواقف سردار اور فوج کے بے خبر سپاہی اپنی کامیابی پر ناز کر رہے تھے کہ چاروں طرف سے گولیوں کی سنسناتی ہوئی آوازوں نے انھیں پریشان کر دیا، یہ ادھر ادھر بھاگ ہی رہے تھے کہ نواب کی فوجوں نے گھیر لیا اور قتل و خون کا بازار گرم کر دیا اور تھوڑی ہی دیر میں راجا کے تمام سپاہی موت کے گھاٹ اتار دئے گئے۔ ادھر رتنا فوج کے دستے کو لئے ہوئے قلعے میں داخل ہوئی، وہاں جو کچھ فوج تھی، اس نے نواب کی فوج کا مقابلہ کیا، گھمسان کی لڑائی ہوئی، نواب کی فوج نے محل کا محاصرہ کر لیا، راجا نے اپنی فوج کی تباہی کا حال سنا تو خوف و الم کے آثار چہرے سے نمودار ہوئے، ہمت کرکے تلوار سونت کر باہر نکلا، تھوڑی دیر تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ لڑتا رہا، آخر پیغامِ اجل آپہنچا۔ فوج تھوڑی تھی اس میں بھی بہت سے کٹ چکے تھے، کب تک نواب کا مقابلہ کرتا، کئی زخم کھائے، پسینے کی بجائے خون میں تر بتر ہوگیا، طاقت نے خیرباد کہی، ہمت کی جگہ یاس نے لی، لڑتے لڑتے سر چکرایا، زمین پر گرا اور ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

نواب کی فوجیں رات بھر قلعے میں رہیں، صبح ہوتے ہی نقارہ پر چوٹ پڑی، سپاہی نے بگل بجایا۔ فوجیں قطار باندھ کر کھڑی ہوگئیں۔ نواب نے فوج کا جائزہ لیا، اسلامی علم قلعے پر لہرایا گیا، نواب کے چہرے پر بشاشت کھیل رہی تھی، پھر فکر میں ڈوب گئے، نواب نے فرمایا: رتنا کہاں ہے، حاضر کرو، فوج والوں نے سارا قلعہ چھان مارا کہیں پتہ نہ لگا، تمام لاشوں کی شناخت کی گئی مگر وہاں بھی رتنا کا وجود نہ تھا۔ نواب اپنی غفلت پر پچھتانے لگے، افسروں کو دھمکی دی، رتنا کا پتہ نہ لگنا تھا نہ لگا، اسی فکر میں ڈوبے ہوئے، رنجیدہ خاطر اپنی قیام گاہ کیطرف قدم اٹھا رہے تھے کہ رتنا دودھ لیکر قلعے میں داخل ہوئی، سپاہی نے روکا، اندر جانے سے منع کیا، نواب نے پلٹ کر دیکھا تو رتنا کو بلایا، وہ آئی اور نواب کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئی، نواب نے فرمایا، رتنا بیٹی! میری کامیابی کا سہرا تیرے سر ہے ہے حضور! یہ سب کچھ آپ کا دیا ہے، ورنہ میں عورت جات کیا کرتی، میں خوش ہوں کہ اب بہت سی استریوں کو اپنے پتی کی سیوا کرنے میں چین ملیگا اور وہ بیوہ ہونے سے بچ گئیں۔ میں بیوہ ہوں، غریب ہوں، غریبی کی قیمت سوگ کی تکلیف جانتی تھی، ہر روز آنکھ سے دیکھتی تھی، اسلئے میں نے ایسا کیا، رتنا نے کہا۔

اچھا تو چاہتی کیا ہے؟ نواب نے پوچھا — میرا کون ہے حضور! جس کیلئے دھن دولت چاہوں، اکیلی پیدا ہوئی، شادی کو دو سال نہ ہوئے تھے کہ بیوہ ہوئی، اکیلی ہوں، اکیلی مروں گی، ارمان، آرزوئیں کوئی ہیں نہیں، پرماتما سے چاہتی ہوں یہ کہ جبتک اس جیون پر آکاش کا سایہ رہے آپ سلامت رہیں اور آپکی حکومت رہے رتنا نے جواب دیا، کورنش بجا لائی اور روانہ ہوگئی، نواب نے بہت کچھ سمجھایا، منایا، منت کی، خوشامد کی، مگر دھن کی پکی رتنا نے کوئی چیز قبول نہ کی، کیونکہ اسکو بڑا معاوضہ مل چکا تھا۔ انتقام کی آگ بجھ چکی تھی اور اس کا کلیجہ ٹھنڈا تھا!

عبدالواسع عصری

قاسم

یہ مضمون میرے ایک عزیز دوست قاسم سے متعلق ہے، جس نے ۱۵ اتیر ۱۳۴۹ف دوشنبہ کو انتقال کیا۔ اس میں میں نے دوسرے لوگوں کی دلچسپی کے لئے قاسم کی گفتگو کو ادبی رنگ دیدیا ہے، ورنہ مفہوم متاثر نہیں کیا۔

کام کرتا بیٹھا ہوں کہ آدمی نے خبر دی "آپ کے کسی عزیز کا انتقال ہوگیا" اور میں ہنسا کہ میرے عزیزوں میں کون ایسا ستمگر ابھرا ہے کہ بغیر مجھے اطلاع دئے یوں اچانک مرجائے سب ایسے ہٹے کٹے کہ خدا نہ کرے مجھے کسی کا غم دیکھنا نصیب ہو۔ اتنے میں ایک اور صاحب نے آہ کر تصدیق کی کہ "قاسم کا انتقال ہوگیا"

قاسم کا انتقال ——— !

اور سچ تو یہ ہے کہ مجھ سے ملنے والوں میں مجھے قاسم سے زیادہ عزیز اور کون ہوسکتا ہے۔

قاسم !

کتنی حسرت ناک موت! کتنا جوانا مرگ! ۔ آدمی سا آدمی کہ دیکھے سے نظروں میں جچے نہ جچے پر ڈھونڈے سے ہزاروں میں نہ ملے! خوبیاں اتنی ہی بلند، خامیاں اتنی ہی پست، اضداد کا مجموعہ، لیکن اخلاق کا مجسمہ! گویا صحیح معنے میں انسان!

ارشادی گھرانے کا فرد، شریف النسب سید، کوئی تیس کی عمر، اوسط قد، اوسط جثہ، گندمی رنگ، ناک نقشہ بس سیدھا سیدھا گول چہرہ، دبی صورت، ابھری پیشانی، مجموعاً بھلا سا انسان، کئی بہنوں کا بھائی، کئی بھائیوں کا ساتھی، ماں باپ حیات، گھر کا ولی عہد صاحبِ مقطعہ، کاروبار میں پختہ، پچھوروں میں پچھورا، سنجیدوں میں سنجیدہ، مرنجاں مرنج، جس سے ملے خوش کرے، ہنسے، بولے ہنسے ہنسائے اور رخصت طبیعت ذرا پھکڑ پن کی طرف مائل، عشق پیشگی فطری، مگر زیادہ تر خیالی، منشی فاضل تک تعلیم، ادب کا ذوق، شاعری کا شوق غالباً صدر محاسبی کے اہلکار، شادی کی بڑی آرزو لیکن شادی کی

اور سال ڈیڑھ سال میں سدھار گئے۔ مقطعہ تھا کافی آمدنی کا اس لئے لہلہاتا بچپن، ہنستی کھیلتی جوانی، لیکن ادھر کوئی چار پانچ سال سے مقطعے میں دوسرے دعویدار بھی پیدا ہو گئے تھے، گھر کے جھگڑے سرکار چڑھے، ضبطی آئی، اور دن ذرا بھاری ہوگئے۔ ابھی ابھی مقدمے میں جیتے تھے کہ زندگی سے ہارے۔ اُدھر مقطعہ جھگڑوں سے آزاد ہوا تھا کہ اِدھر روح جسم سے آزاد ہوئی۔

یہ تو ہوا ان کا ایک ذاتی یا خانگی خاکہ جس سے مجھے کوئی دلچسپی اور نہ اس سے زیادہ کبھی میں نے جاننے کی کوشش کی، اور میں سمجھتا ہوں کہ تکمیلِ سوانح کے لئے اتنا کافی بھی ہے۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ قاسم اپنے گھر میں کیا تھا، بلکہ اس سے کہ میرے ساتھ کیا تھا، اور میرے پاس کیا تھا، اس لئے میں اس کی زندگی کے اسی پہلو کو زیادہ اہمیت دوں گا، گو اندیشہ ہے کہ اس سے خود میری خودستائی یا دکانداری کا پتہ چلے گا، لیکن اگر اس سے بھی کم بیان کروں تو واقعات کی اصلیت بالکل مسخ ہو جائے گی اور یہ اصولِ سوانح کے خلاف ہوگا۔

مطمئن گھرانے کے لڑکے عموماً کھیل کود آرام و عیش سے فارغ ہوتے ہوتے پچیس تیس سال گزر چکے ہوتے ہیں، گویا صحیح معنے میں ان کا سنِ بلوغ یا شعور پچیس سال سے شروع ہوتا ہے اور پھر جب ماحول بھی کچھ اسی کے موافق ملے تو گویا بلوغ کا آنا ہی ناممکن۔ مشیر آباد کا محلہ بلگرام کے محلہ سے ایک خاص مناسبت رکھتا ہے۔ سنتے ہیں کہ رقبہ اور حیثیت وغیرہ میں وہ اس سے بڑا نہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ ایسا مردم خیز خطہ ہے کہ جتنے اکابر ہوئے یہاں

اکثر یہیں سے تعلق رکھتے ہیں، اور مشیر آباد بالکل اس کے برعکس واقع ہوا ہے، ورنہ اس ایک ذیلی فرق کو ہٹا کر دیکھیں تو دونوں میں غالباً چنداں فرق نظر نہ آئے گا۔

ایسے گھر اور ایسے محلے میں پیدا ہو کر قاسم کوئی خاص اہلیت کا مالک ہوتا اور وہ بھی اتنی چھوٹی عمر میں، ایک عبث توقع ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو صلاحیتیں اس نے فطرتاً پائی تھیں، اگر انہیں منجھایا جاتا اور وہ انھیں بکار آمد بناتا تو یقیناً ایک نمایاں شخصیت ہوتا، اور اب اس میں یہ شوق پیدا ہو چلا تھا کہ عمر نے دغا دی۔

ادب اور خصوصاً سیاست کا بہت ذوق تھا، اکثر سیاسی بحثیں چھیڑتے، مجھے اس نام نہاد سیاست دانی، جیسی کہ حیدرآباد میں ہے اور اخباری زٹلوں سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں ہوئی قاسم صاحب میری اس خصوصیت یا خامی کو اس نظر سے دیکھتے جیسے مجھ میں کوئی انسانی صفت ہی نہیں۔ اکثر افسوس کا اظہار کیا کرتے بالآخر مجھے مجبور کر دیا کہ اخبار جاری کراؤں میں نے انھیں کے لئے جاری کرا دیا، سمجھنے لگے کہ اب میں اخبار کا شوقین بھی ہو گیا ہوں، آتے اور پوچھتے کہ آج کا اخبار دیکھا؟ کیا لکھا ہے؟ میں سنجیدگی سے کہہ دیتا "جی ہاں دیکھا، لکھا ہے کہ پیالیس ٹاکیز میں "وچن" چل رہا ہے، اور زمرد محل میں "زمبو کا بیٹا" اور سلکٹ میں "لٹارو للنا"۔ "زمبو کا بیٹا" اور "لٹارو للنا" عید کے خاص پروگرام ہیں — ایک بیگم صاحبہ نے اپنے شوہر کو ملکیت اور مہر کے دعوے کی نوٹس دی ہے، اور دوسری صاحبزادی نے اعلان کیا ہے کہ اگر ان کے شوہر ایک ہفتہ کے اندر اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر خلع نہ کرا لیں تو مجبوراً وہ خود انھیں طلاق دے کر کسی دوسرے شوہر کو اپنے نکاح میں لا لیں گی آئندہ جمعہ کو عبدالعزیز خاں کے پاس شاندار ہراج ہوگا — خریدار حضرات جمعرات کے دن معائنۂ مال فرمالیں ......"

ہنستے بھی اور کڑھتے بھی۔

ادب کا اچھا ذوق پایا تھا، یا یوں کہنا چاہیئے کہ ایسا ذوق پایا تھا جو مجھ سے مشترک تھا، اور سچ پوچھئے تو یہی ایک سبب ان کے اور میرے ربط کو مضبوط کرنے میں زیادہ حصہ رکھتا تھا

ادب و سیاست سے ہٹ کر بلکہ ان سے بڑھ کر عشق و عورت ان کا ایک استمراری موضوع بحث تھا۔ اکثر اس سلسلہ میں بڑی دلچسپی لیتے۔ لیکن حسن و محبت کے معاملے میں ان کا وہی نظریہ تھا جو عام نوجوانوں اور خصوصاً ایسے پھکڑ مزاجوں کا ہونا چاہیئے۔ جب کبھی سنتے کہ "محبت ایک نہایت اعلیٰ پاکیزہ و بے غرض جذبہ ہے" تو ہنسی اڑاتے کہ "پاکیزہ و اعلیٰ ہونے کی بھی ایک ہی کہی ..... غرض اب پھکڑ باتوں پر اتر آتے، جن کا حاصل یہ ہوتا کہ ہوس ہی کا ایک شاعرانہ نام لوگوں نے محبت رکھ لیا ہے ورنہ کہنے کو کوئی ایسی مثال ہی بتا دیجیئے کہ کہیں بڑھا بڑھی میں بھی عشق ہوا ہو"۔ یہ صحیح ہے کہ قاسم کہ

"There can be no love without lust"

مگر محض اس کو سب کچھ قرار دینا زیادتی ہے۔ اس کا انحصار ہے زیادہ تر چاہنے والوں کی ذہنیتوں اور اخلاقی قوتوں پر! - بعض ایسی مثالیں بھی ملیں گی کہ ان کی محبت بہت ارفع و اعلیٰ ہوتی ہے ......"

ورنہ اگر محبت کی تشریح وہی ہوتی جو تم کہہ رہے ہو تو ایک ہی شخص کی خصوصیت نہ ہوتی۔ تم یہ مانتے ہو نا کہ محبت اسی وقت کہلاتی ہے جب کہ وہ ایک ہی سے ہو؟ ہوس کی تکمیل تو سب ہی سے ہو سکتی ہے، پھر کسی مرد کو ایک خاص عورت سے یا کسی عورت کو ایک خاص مرد سے شغف ہونا چہ معنے دارد؟

یہ صحیح ہے کہ محبت کی بناء میں حیوانی جذبہ کو بھی دخل ہے لیکن وہ اس لئے کہ اس لطیف جذبہ کی عملی توثیق بھی ہو سکے، نہ اس لئے کہ یہی سب کچھ ہے' ورنہ تم دیکھتے کہ جہاں باہم شادی نہ ہو وہاں محبت مٹ جاتی' حالاں کہ ایسا نہیں ہوتا۔

یا یوں سمجھو کہ "لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی" اس لئے محبت سی لطیف شئے بھی ہوس سی کثیف شئے سے تعلق رکھتی ہے' جس کے معنے یہ ہوئے کہ جس طرح ایک خوبصورت اور مضبوط عمارت کی بنیاد میں سخت' کثیف اور ادنی چیزیں بھی ڈالی جاتی ہیں' اسی طرح محبت کی بناء میں بھی ہوس شامل ہے' لیکن جس طرح ساری عمارت' نہایت پاکیزہ' بلند اور خوبصورت ہوتی ہے' اسی طرح محبت کا بھی بلند اور نفیس ہونا ضروری ہے' اس کے معنے یہ نہیں ہوئے کہ محض ہوس کا نام محبت ہے اور نہ یہ کہ ایک نفیس عمارت کی بناء کثیف چیزوں پر ہی ہونا ضروری ہے۔

ایک اور بات قابل غور ہے کہ وصل کے بعد محبت نہیں ہوتی بلکہ محبت کا نتیجہ وصل ہوتا ہے' اور وہ اس لئے کہ محبت کی خواہش ہوتی ہے کہ عاشق معشوق ہمیشہ ایک دوسرے سے قریب سے قریب رہیں اور یہ خاص کر معاشرت کی پابندیوں کے تحت بغیر وصل کے ممکن نہیں' نہ اس لئے کہ صرف وصل ہی مدعائے تمام ہے۔

ہم جو کسی سے متاثر ہوتے ہیں تو اسے دیکھ کر یا سن کر جس کے معنے یہ ہوئے کہ پہلے ہماری روح متاثر ہوتی ہے' اس لئے گویا سچی محبت کا تعلق روحی ہے' نہ کہ جسمی اور تم دیکھو گے کہ وہی محبت زیادہ استوار ہو گی جس کی بناء روحانی یا اخلاقی اصول پر رکھی جائے۔ اور جن لوگوں میں محبت کا ایسا اعلیٰ جذبہ ہو وہ مرتے دم تک نہیں مٹتا' ورنہ یہ ایک فطری بات ہوتی کہ جہاں سے معشوق حاصل نہ ہو محبت بھی فنا ہو جائے۔

اور پھر اس پر بھی غور کرو کہ ہوس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک حسین سے بڑھا ہوا دوسرا حسین نظر آئے تو میلان دوسرے کی طرف ہو جائے' لیکن ایسا نہیں ہوتا' بلکہ محبت کا معیار حسن بھی کچھ عجیب ہوتا ہے کہ "معشوق من است آں کہ بہ نزدیک تو زشت است" بلکہ عام نظروں میں جو غیر معمولی حسین ثابت ہو وہ ایک عاشق کے نزدیک اپنے معشوق کے برے حسن کے مقابلہ میں بھی کوئی قیمت نہیں رکھتا یہیں سے محبت اور ہوس کا فرق کھلتا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ جس طرح ہر بری بھلی چیز کے مختلف معیار ہوتے ہیں اسی طرح محبت کے بھی مختلف معیار و مدارج ہیں۔ ہوس کا نام محبت رکھ لینے سے محبت کی خوبی و عظمت میں کوئی فرق نہیں آسکتا یہی وجہ ہے کہ دنیا میں محبت بہت کم یاب ہے' اور یہ بھی ایک فطری بات ہے کہ جو چیز جتنی لاجواب ہو گی اتنی ہی وہ کمیاب و نایاب ہو گی۔

اب رہا تمہارا یہ استدلال کہ بڑھا بڈھی میں عشق نہیں ہوتا' اس لئے محبت کے معنے ہوس کے ہیں' تو چونکہ بڈھا بڈھی کے اولاد بھی نہیں ہوتی' اس لئے یہ نتیجہ نکالنے کے مساوی ہے کہ عورت مرد سے اولاد نہیں پیدا ہو سکتی۔ کیا یہ صحیح ہو گا؟۔

ہر چیز کا ایک وقت اور موسم ہوتا ہے۔

"یہ سب صحیح ہے خداوند' مگر ہم تو وہی ....."

"تم بڑے بیوقوف ہو قاسم' ایسی بحثیں مت کیا کرو میرے ساتھ"

"اچھی بات ہے سرکار' جانے دیجئے! اب کون لگے آپ سے آپ ایک بلا ہیں!"

طبیعت میں خوش مزاجی بہت تھی' اس لئے غصہ بہت کم آتا تھا۔ سخت کہنے سے بھی نہیں چوکتے تھے' اور سخت سننے

سے بھی نہیں، بلکہ بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوا ہے کہ جہاں محفل کچھ بدمزہ یا سہمی سی معلوم ہوئی کہ خود ہو کر ہنسنے لگے، لوگوں کو گالیاں دے دے جوش میں لائے، اور خاصی شگفتگی پیدا کر دی۔

مذہب کے بڑے پکے تھے، بوجہ من الوجوہ زیادہ تر اس لئے بھی کہ مرشد کے بیٹے تھے۔ لیکن ان کا سارا مذہب عام لوگوں کی طرح تعصب سے عقائد پر مبنی تھا۔ بات بات پر کفر کا خدشہ، بات بات پہ ایمان جانے کا اندیشہ۔ اس سلسلہ میں بھی مجھ سے اکثر بحثیں کیا کرتے، اور فیصلہ کرتے کہ میری صحبت میں بیٹھ کر کافر ہو جائیں گے۔ لیکن بعد کو وہ دور آیا کہ مجھی کو مرشد ماننے لگے اور چونکہ میں ہر مذہب کا طرفدار ہوں کبھی "السلام علیکم مرشد" کہتے اور کبھی "رام رام گروجی" وغیرہ کہہ کے ملتے۔

کھانے کے بہت شوقین تھے۔ چونکہ میرے پاس کوئی تکلف نہ کرتے تھے جب کبھی بلا تا کھانے پہ آ بیٹھتے۔ اچھا ہوا تو خیر، ورنہ ناک چڑھی کہ "بھئی تمہارے پاس تو اچھا کھانا کھانے کی حسرت رہی۔ تم میں سب باتیں اچھی ہیں شاکر مگر ایک بات بہت بری ہے اور وہ یہ کہ تمہارا کھانا اچھا نہیں ہوتا....." (گویا کہ یہ بھی میری بات ہے!)

اور جب کبھی پسند آیا تو کہا "آہا ہا! آج عمر میں پہلی دفعہ تمہارے ہاں اچھا کھانا کھایا ہے۔"

باتوں میں بھی ان کا یہی حال تھا جب سے عقیدتمندی کا دور آ گیا تھا، انھیں میری تقریباً ہر بات پسند آنے لگی تھی پھڑکتے اور داد دیتے تو یوں کہ "واللہ" شاکر آج عمر میں تم نے پہلی دفعہ یہ کام کی بات کہی ہے!" خواہ ایسی "پہلی دفعہ" ایک ہی نشست میں کئی بار کیوں نہ آ جائے! ــ کبھی میں نے یاد دہی کی کہ "پرسوں بھی تو تم نے یہی کہا تھا!" کہنے لگے "ارے بھئی، پرانی باتوں میں کیا رکھا ہے، یہ البتہ نئی بات ہے جو تم نے پہلی دفعہ کہی!"

چوٹیں چلنے اور فقرے کسنے کا بڑا شوق تھا، لیکن ہر چوٹ کی انتہا یہی کہ کسی نہ کسی طرح مخاطب کو عورت بنا دیا جائے یا کتا۔

لیکن جب دیکھا کہ چوٹوں میں بھی مجھ سے ہار جاتے ہیں تو کہنے لگے "تمہاری فطرت بچھو اور کھٹمل کی سی ہے شاکر، جب تک ڈنک نہ مارو چین کہاں سے آئے گا۔ اگر خاموش ہو جاتے تو کیا ہرج ہو جاتا۔"

چونکہ مجھے بھی ان کی خوشنودی زیادہ منظور تھی، اکثر ان کی چوٹیں سن کر بھی اس طرح خاموش ہو جاتا جیسے میں سچ مچ ہار گیا ہوں، اپنی فتح پر بہت خوش ہوتے۔

دماغ کسی قدر قانونی یا مکارانہ بھی پایا تھا، اور پھر مقطعہ کے سلسلے میں جو مقدمات کے تجربے اٹھانے پڑے تھے انھوں نے کریلہ کو نیم چڑھا دیا تھا، اور جس طرح "پرانا مریض آدھا حکیم" ہوتا ہے، اسی طرح یہ پرانا پیرو کار آدھا وکیل تو ہو ہی گیا تھا اور اب پورا وکیل بننے کی بہت آرزو تھی، چنانچہ غالباً درجۂ اول کی وکالت کا امتحان دینے والے تھے۔

میں نے شاید ایک آدھ دفعہ کہدیا تھا کہ "تم دیکھنا ہم مستقبل قریب میں کیا بننے والا ہوں!" بس یہ بات شاید ذہن میں رہ گئی تھی، دعویٰ کرنے لگے کہ تم دیکھنا شاکر دس پندرہ سال کے اندر ہی اندر میں کتنا بڑا وکیل بننے والا ہوں!"

میں نے کہا "بھئی دعوے کے ثبوت کے لئے وقفہ تو بہت مختصر رکھا ہے!"

کہا "اس لئے رکھا ہے کہ اگر بڑا نہ بن سکا تو اس وقت تک یا تو میں نہ رہوں، یا تم نہ ہو، یا پھر اتنے طویل عرصے تک تم میرے دعوے ہی کو بھول جاؤ!"

شعر گوئی کا بھی شوق تھا، لیکن چونکہ ذوق بلند تھا معمولی شعر غالباً خود کو نہ بھاتے ہوں گے، اور اعلیٰ شعر کے لئے دماغ سوزی کی ضرورت ہے، اور بھلا یہ ایسے خوش باش مستوں سے ہو سکتی ہے!

سب سے پہلے جو نظم سنائی وہ خود میری مذمت میں تھی یہ اُس وقت کی بات ہے جب کہ ان میں مجھ سے ٹکر لینے کا جذبہ تھا اور ایک طرح سے وہ بھی میرے مخالف تھے۔ نظم میں مجھی سے خطاب تھا، اور ردیف تھی "آپ کی" اور قافیہ غالباً "طبیعت" "عادت"، وغیرہ تھا اس میں میری بد اخلاقی، خشک مزاجی و بد دماغی کا رونا رویا تھا۔ نظم اچھی تھی۔ مجھے دکھانے کو تو دکھا دی، لیکن میں جو خوش ہوا تو ان کی حیرت اور پشیمانی کی عجیب کیفیت تھی۔ افسوس ہے کہ وہ نظم نہیں مل رہی ہے ورنہ چند شعر لکھ دیتا، جن سے ان کے ذوق شعر کا بھی اندازہ ہو جاتا وہ نظم میں نے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ ایک دو نظمیں اور سنائی تھیں جن میں سے ایک کا عنوان غالباً "مجھے تم سے محبت ہے، مجھے تم سے محبت ہے" تھا

دو غیر معمولی خوبیاں یہ تھیں کہ غالباً آٹھ نو سال وہ مجھ سے ملتے رہے، لیکن اس اثناء میں میں نے کبھی کسی کی شکایت یا غیبت ان کی زبان سے نہیں سنی، جس کسی کا ذکر کیا، اچھے الفاظ میں کیا۔ کسی کو بڑھتے دیکھا تو خوش ہوئے اور گرتے دیکھا تو اس طرح افسوس کیا جیسے خود کو نقصان پہنچا ہو۔ اگر کبھی زیادہ ملنے والوں میں سے کسی پر بگڑ بھی گئے تو اس کے غائبانہ میں بھی صرف اتنا کہا کہ اگر وہ سامنے ہوتا تو اس سے زیادہ کہتے، اور سخت کہتے۔

وضعداری کا یہ عالم تھا کہ اتنی طویل مدت میں کبھی دوستی کو غرض سے ملوث نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ دوستانہ رنگ میں دس دفعہ انھوں نے مجھ پر احسان کیا ہوگا تو ایک آدھ دفعہ میں نے ان کی خدمت کی ہوگی سنتا تھا کہ یہ آخری پانچ چار برس ان پر کافی تنگ تھے، اس کے باوجود پاسدارِ ننگ تھے۔

صرف ایک دن ایسا ہوا کہ دوپہر میں میرے ہاں آئے اور کہا "شاکر ایک آنے کے پیسے ہوں تو دو" کافی جلدی میں معلوم ہوتے تھے۔ اتفاقی بات کہ اس وقت میرے نزدیک ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ میں نے کہا "تم چلو!" کہنے لگے "کہاں؟" "تم چلو تو سہی!"۔ پاس ہی میرا دھوبی رہتا ہے، کہا "ارے دھوبی آپ کو ایک آنہ دیدے!"۔ عجیب کیفیت طاری ہوئی مجھے بہت غور سے دیکھا، قریب آئے، بازو تھامے اور کہا "شاکر تم میرے لئے کتنی ذلتیں اٹھاتے ہو، کیا تمھیں دھوبی سے پیسے مانگتے ہوئے شرم نہیں آئی؟"

شرم تو صرف مانگنے سے آنی چاہیے قاسم! جب یہ اٹھی تو پھر کیا دھوبی سے اور کیا رانی سے!

"اہا ہا، کیا پیاری بات بتائی، پیارے شاکر تم نے صرف ایک آنہ ہی نہیں دیا بلکہ ایک آنے کی بات بھی بتادی!"

"جی تو یہ قیمت ہے ہماری بات کی!"

"نہیں شاکر، باتیں تو تمھاری لاکھ کی ہوتی ہیں، مگر میں اس وقت اپنی موجودہ حیثیت کے لحاظ سے قیمت لگا رہا ہوں!"

پھر ذرا آگے بڑھے، اور کہنے لگے "تم چاہو کچھ ہی کہو، لیکن میرے ذہن میں تو یہی تھا کہ تم اپنے ماموں کے پاس سے منگا دوگے، یا کسی دوست کے پاس سے۔ دھوبی کا تصور تو میرے ذہن میں ہی نہ آسکتا تھا....."

"یہی فرق ہے تمھارے اور میرے ذہن میں!۔ تم نے غور کیا کہ یہ جو چھوٹے لوگ ہوتے ہیں کبھی کچھ دے کر بھی خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے "صاحب کی خدمت کی" اور بڑے لوگ

سمجھتے ہیں کہ احسان کیا۔ اب بتاؤ تم فطرتاً احسان اٹھانا چاہو گے یا خدمت لینا پسند، تم جانتے ہو کہ میں ملتا ہی بہت کم لوگوں سے ہوں، اس پر سے غرض لے کر ملوں، اور کیا وقر رہ جائے گا۔

اس لئے میرے جتنے متعارفین ہیں سب دھوبی، حجام ہی تو ہیں "دیکھا، دیکھا، چلتے چلتے بھی تم نے آخر ایک چوٹ کر ہی دی! ۔تم کیا کرو گے، تمھاری فطرت ہی ایسی ہے!

نیشِ عقرب نہ از پئے کین است　مقتضائے طبیعتش این است

دو خامیاں بدترین تھیں، ایک تو یہ کہ زبان کے پابند نہ تھے، دوسری یہ کہ وقت کے پابند نہ تھے۔ اگر کلام شریف بھی سر پر رکھ کے وعدہ کریں تو پورا ہونے تک یقین کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی، اور وقت کا تو کیا پوچھنا کہ چٹکیوں میں بتایا اور برسوں میں کیا۔ اس لئے میں کہا کرتا "قاسم میں ایک وجہ سے تمھیں معشوق سمجھتا ہوں، اور ایک وجہ سے بادشاہ" زبان کی پابندی کے اعتبار سے معشوق، اور وقت کی پابندی کے لحاظ سے بادشاہ" کبھی جھنجھلاتے اور کبھی ہنس پڑتے۔

اور بھی جتنی خامیاں تھیں، ان کی جڑ بھی دراصل یہ دو ہی نکلتیں۔ حافظہ کمزور تھا، اکثر ایک دفعہ کہی ہوئی بات کو کئی کئی دفعہ دہراتے اور اس طرح گویا پہلی دفعہ کہہ رہے ہوں بلکہ اکثر تو یہ غضب کرتے کہ ہم ہی سے سنی ہوئی کوئی دلچسپ بات یاد رکھ لی، اور کسی موقعہ میں ہمارے ہی منہ پر اس طرح سنانے لگے جیسے انھیں کی جدت ہو۔

حسن پرستی کا تو کیا ذکر! البتہ عورت پرست کہنا چاہیے۔ خواہ کیسی ہی عورت دیکھیں، لیکن یہ ضرور رجھیں، اور نام اس کا رکھ لیا تھا "حسن پرستی"۔

قاسم کے اور میرے تعلقات جس طرح بڑھے وہ بھی ایک عجیب دلچسپ چیز ہے میں نے قاسم کو ہمیشہ ایک کمزور کردار کا انسان سمجھا، لیکن پھر بھی اس سے دوستی رکھنے پر مجبور ہوا۔ اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں بھی تھی، اور تھی بھی۔ عجیب اضدادی حال!۔

میں اپنے ماحول میں اپنی بددماغی یا بداخلاقی کی وجہ سے کافی بدنام ہوں ۔اس لئے قاسم بھی ابتداءً میرے مخالفوں میں سے تھے۔ لیکن پھر بھی ملتے تھے ۔ابتداءً ان کی ملاقاتوں کا رنگ بالکل استادانہ یا حریفانہ ہوتا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا کہ وہ میرا امتحان لینا، زک دینا یا چوٹیں چلنا چاہ رہے ہیں۔ میں نے کہا " یہ بات ہے"! اسی رنگ کو ملحوظ رکھ کے ملا کیا۔ سرشت میں چونکہ بحث و حجت بہت شامل تھی، ایسے ایسے سوالات کرتے کہ گویا ان کی دانست میں لاجواب ہیں۔ مثلاً "ہوا نظر کیوں نہیں آتی ؟ تاروں کو گنا کیوں نہیں جا سکتا ؟ آسمان جب دھواں ہے تو سائنسدانوں کی آنکھوں میں کیوں نہیں گھس جاتا ؟ خدا کو کیا ضرورت تھی کہ دنیا پیدا کرے اور پھر کسی کو امیر، کسی کو غریب، کسی کو بد بنائے اور پھر عذاب و ثواب مقرر کرے ؟"

اب جتنا سمجھانے کی کوشش کیجئے، اتنی ہی منطقیں نکالیں ان کی منطقوں پر مجھے بعض دفعہ بہت غصہ بھی آتا اور سخت سست کہدیتا، بعض دفعہ خوشی بھی ہوتی کہ اس شخص میں کھوج کا اتنا مادہ ہے۔

رفتہ رفتہ دبنے لگے اور یہ عالم ہوا کہ میرا ہر لفظ ان کے لئے ایک سند اور دلچسپی بن کے رہ گیا تھا، سلام ترک کیا، اور پاؤں پڑنے لگے۔ عمر میں مجھ سے کچھ بڑے ہی تھے، مجھے شرم آتی، میں بری طرح ٹوکتا۔ غضب یہ کرتے کہ بھرے مجمع میں بھی ملتے تو میرے پاؤں پڑتے اور جب تک میں سر پر ہاتھ نہ رکھدیتا نہ چھوڑتے۔ ایک دفعہ میں نے ڈانٹ دیا کہ "قاسم یہ کیا بدتمیزی ہے،

کہ تم لوگوں کے سامنے بھی ایسی حرکتیں کرو!.....“
”شاکر کیا تم یہ سمجھے ہو کہ ان دھمکیوں سے میں تمھارے
پاؤں پڑنا چھوڑ دوں گا۔ یہی تو میرا منشاء ہے کہ لوگوں کو بھی
دکھاؤں کہ میں تمھارا کتنا احترام کرتا ہوں..... وہ جلیں تو
جلیں“ خدا جانے انھیں مجھ سے اتنا شغف کیوں ہو گیا تھا۔
سنا ہے کہ انھیں خود اُن کو برا کہنے سے اتنا ناگوار نہ ہوتا تھا
جتنا کہ مجھے کچھ کہنے سے ذرا میرے خلاف کسی نے کہا اور لڑ پڑے
چنانچہ ان کی یہ عادت جب معلوم ہوئی تو سنا ہے کہ بعض دوستوں
نے ان کے سامنے مجھے برا کہنے اور انھیں چھیڑ کے مزہ لینے
کا ایک مشغلہ ہی بنا لیا تھا۔

مجھے کبھی کسی کی خانگی باتیں معلوم کرنے کا خیال ہی
نہیں ہوتا، لیکن وہ خود ہو کر اکثر خانگی باتیں سنایا کرتے اور
مشورے بھی لیتے۔ میں فطرتاً ایک تنہا پسند آدمی ہوں، اس لئے
لازماً مجھے ان تمام چیزوں سے نفرت ہے جن سے ایک اجتماعی
تعلق پیدا ہوتا ہو، مثلاً انجمن، شہرت، دعوت وغیرہ۔

ایک رات آئے اور کہا ”چلو شاکر!“ کہا ”کہاں؟“
آج ہمارے ہاں دعوت ہے!“ ”تم مجھے کیوں بلاتے ہو قاسم!
تم جانتے ہو کہ میں دعوتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا! بلکہ کتراتا
ہوں، کہنے لگے ”اسی لئے تو دعوت نہیں دی بلکہ وقت پہ
بلا لے رہا ہوں!“ غرض منطق سے کہیں یا کسی اور طریقے سے
مانتے ہی بنتی۔ کہتے ”شاکر تم نہیں جانتے کہ تمھاری کوئی خدمت
کرتے ہوئے مجھے کتنی مسرت و عزت محسوس ہوتی ہے، ورنہ مجھے
کیا پڑی ہے کہ کسی کی اتنی خوشامد و اصرار کرتا پھروں!“

حضرت کی بڑی خواہش یہ تھی کہ میں انھیں نہ بھولوں،
چنانچہ اکثر کہا کرتے کہ ”دیکھو شاکر تم مجھے کبھی نہ بھولنا“ اور
اگر تم کسی بڑے مرتبہ یا عہدے پر پہنچے بھی تو یاد رہے کہ بندہ
تمھارا مددگار رہے گا!.....“

میں چڑانے کو کہہ دیتا کہ ”نہیں قاسم میں تمھیں دوست
کے اعتبار سے جتنا اچھا انسان سمجھتا ہوں، کردار کے اعتبار
سے اتنا ہی خراب، اس لئے خواہ مرتبہ پر پہنچ کر نہ بھولوں،
لیکن عہدہ پر پہنچ کر یاد رکھنے کی توقع ذرا کم ہے۔“

جھنجھلاتے کہ ”دیکھا تمھاری وہی شرارت! بھلا مجھ
میں کیا خرابی ہے، اور جب ہم خراب ہیں تو پھر آپ ہم سے اتنا
خلوص کیوں رکھیں صاحب؟“

”احمق! اگر خلوص و محبت کی بنا بھی کہیں صرف اچھائیوں
پر رکھی جاتی تو نہ دنیا میں عشق کا تصور ہوتا، نہ ماں باپ ہی
اپنی بری اولاد کو عزیز رکھتے!“

”جی! تو گویا آپ ہمارے ماں باپ ہیں؟ - ہاں صاحب
آپ کیا کیا نہیں بنیں گے!“ ”دیکھا تم نے اپنے حوصلے کے مطابق
ڈھال لیا! میں نے عشق کا بھی تو نام لیا تھا، تم نے ماں باپ
ہی کیوں سمجھا، عاشق سمجھو!“

”جی کیوں نہیں! یہ تو اور بڑا کرم ہے آپ کا! مختصر یہ کہ تم
میں بدفطرتی بھری ہوئی ہے شاکر! مگر یہ سب کچھ نہیں۔ دیکھو تم
کبھی بھولنا نہیں!“ میں اکثر چیزیں اپنے شوق کے لئے لکھتا
اور پھر لاپروائی سے کہیں ڈال دیا کرتا تھا،

نہیں معلوم قاسم کو کس طرح معلوم ہو گیا یا انھوں نے
کیونکر سمجھ لیا کہ میں شعر بھی کہتا ہوں اور جملے بھی لکھتا ہوں۔
میرا مطلب ہے، نثر بھی لکھتا ہوں، اصرار کرنے لگے کہ کچھ سناؤں
رفتہ رفتہ شاید چند شعر سنائے۔ خوش ہوئے۔

ایک دن میں خالہ جان کو خط لکھتا بیٹھا ہوں کہ آپ آگئے
سمجھا کوئی ادبی چیز ہے۔ اصرار کیا، کہا خانگی خط ہے، سمجھے
تکلف کر رہا ہوں۔ چونکہ کوئی بات ایسی نہ تھی سنا دیا۔ پھر لگ گئے

اس کے بعد انھوں نے معمول سا مقرر کر دیا کہ جب کبھی آ منٹی کو
خط لکھوں تو انھیں سنا کر ڈالوں یا اس کی نقل ضرور رکھوں ۔
اور یہیں سے ان میں سے استادانہ رنگ ہٹ کر شاگردانہ رنگ نے لگا ۔

اس اثناء میں انھوں نے کئی دفعہ مجھے مجبور کیا کہ مضامین
لکھوں اور رسالوں کو بھیجوں ۔ میں اس بات سے کتراتا تھا جس
کی وجہ انھیں کو نہیں، بلکہ میرے اور بھی ملاقاتیوں کو مجھ سے
سخت شکایت تھی ۔

ایک دن یکایک ایک نظم "سب سے نرالا اپنا فسانہ
سب سے انوکھی اپنی کہانی" ذہن میں آنے لگی اور تیار بھی
ہوگئی کیا بتاؤں سنا کر کیسی آفت مول لی ہے ۔ ایک ایک
بند بلکہ ایک ایک مصرع سنتے اور میری رانوں پر ہاتھ مارتے
کبھی اچھلتے، کبھی بیٹھتے کہ آہ شاکر کیا نظم لکھی ہے !......"
ان حضرت کا داد دینے کا طریقہ بھی کچھ عجیب تھا کہ لوگ تو
شاید پھڑکتے ہیں تو اپنی رانیں ٹھونکا کرتے ہیں، مگر یہ حضرت
میری رانوں کا قلع قمع کیا کرتے ۔ جب یہ رنگ دیکھا تو صوفہ
چھوڑ میں نے اس طرح کچھ سنانے کا طریقہ اختیار کیا کہ میز
کی ایک طرف میں ہوں اور دوسری طرف حضرت ! تاکہ دستِ
شفقت سے محفوظ رہ سکوں ۔ غرض جب نظم اور داد ختم
ہوئی تو حکم ہوا کہ "فوراً کسی رسالہ کو بھیج دو !" میں نے کہا
"دماغ خراب ہوگیا ہے ؟...... بگڑ گئے کہ "دیکھو شاکر،
اگر آج تم نے نہ مانا تو میری تمھاری بہت بگڑ جائے گی ! جو
ہو سو ہو !" "ارے بھئی میری طبیعت نہیں چاہتی کہ......"
"یہ سب کچھ میں نہیں جانتا، آپ کو بھیجنا ہوگا !" خیر اچھی بات ہے
"جی نہیں ابھی وقت میرے سامنے !" پیاڈ سامنے رکھا،
دوات اپنے ہاتھ میں پکڑی" اور قلم میرے ہاتھ میں دے کے
پکڑ لیا کہ "چلو" ابھی لکھو !" "واہ یہ اچھی زبردستی ہے !"
اور کیا آپ جیسوں سے "عدم تشدد وشہ" سے کام چلے گا !"
"لیکن یاد رہے کہ میں ٹکٹ وغیرہ کے پیسے نہیں دوں گا !"
جھک مارے آپ ! میں خود لگا کے ڈال دوں گا، بلکہ اگر خط
اچھا ہوتا تو نظم بھی میں خود ہی لکھ لیتا !" "لیکن کس کو
بھیجو گے !" "ساقی کو !" جب نظم لکھی کہنے لگے ایک خط
بھی مدیر کو لکھو !" "ارے بھئی مجھے کیا ضرورت ہے ! ویسے
بھی طور پر آپ بھی لکھ سکتے ہیں !" "ہم تو لکھ ہی سکتے ہیں
لیکن ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ بھی کچھ لکھ سکتے ہیں یا نہیں !"
"کیا لکھوں ؟" "سوچو جی میں آئے !"
سنا، اور پھر کہنے لگے کہ "دیکھا اس لئے لکھوایا تھا
تم کیا جانو شاکر کہ تم کیا ہو !" اکثر غور بھی کیا لیکن میری سمجھ
میں نہیں آیا کہ دراصل میری ادبیات ہی میں کوئی بات ہے
یا ان کی عقیدتمندی میں کوئی ایسی خوبی یا خامی تھی کہ وہ
میری ہر چیز کے اس قدر گرویدہ تھے ۔ نظم لے گئے، اور خود ہی
ڈاک کے حوالے کر آئے !

غرض اس کے بعد ان کا ایک معمول ہی ہو گیا کہ مجھ پر
جبر کر کر کے نظم و نثر لکھوائیں اور بھجوائیں ۔ پھر جب دیکھا کہ
مجھے عادت ہو گئی ہے تو ایسے مطمئن ہو گئے جیسے کسی باپ
نے اپنے نالائق لڑکے کی بری صفات کو دور کر کے کسی اچھے
ڈھرے لگا چھوڑا ہو ۔

ممکن ہے یہ باتیں لوگوں کی دلچسپی کی نہ بھی ہوں لیکن
اس اعتبار سے کہ وہ قاسم سے متعلق ہیں میرے لئے خاص
قیمت رکھتی ہیں اور اگر کوئی ایسا وقت بھی آیا کہ میں کچھ بن سکا
تو یہی باتیں ہوں گی جو یاد دلاتی رہیں گی کہ جس نامور شخص
کو دنیا جانتی ہے، اس کی شہرت کی بنا ایک گم نام ہستی کے
ہاتھوں ڈالی ہوئی ہے، اس لئے اگر وہ نامور شخص یاد رکھنے

کے قابل ہے تو یہ گم نام بھی بھلانے کے لایق نہیں۔

اس چھوٹی سی گنجائش میں ساری باتیں لکھی جائیں اور لکھتے وقت ساری باتیں یاد آجائیں یہ بہت دشوار ہے، لیکن پھر بھی اتنی طمانیت ہے کہ جو کچھ برا بھلا لکھ گیا ہے وہ ایک بچھڑے ہوئے کی یاد دلانے اور ایک فانی کی یادگار بننے کے لئے بہت کافی ہے۔ فانی! جس نے فنا ہو کر بقائے دوام حاصل کی اور اپنی ہر دلعزیزی کے سبب سب سے گم ہو کر بھی سب میں موجود ہے۔

خبر نہ تھی کہ ایسی جیتی جاگتی، ہنستی کھیلتی، بھاتی، بناتی مورت ہم سے اس طرح چھین لی جائے گی کہ کسی کو خبر بھی نہ ہو کہ قاسم کوئی بیمار ہے، اور اچانک موت کی خبر آجائے، لیکن خوبی و عظمت کا یہ کھلونا نہ صرف انسانوں کو عزیز تھا بلکہ خود قدرت کو بھی فرط رحمت اور رشک محبت سے لوگوں کے ہاتھ سے اس طرح چھینا کہ ٹھیک سے لوگوں کی نظر بھی اس پر پڑنے نہ پائے۔ قدرت نے چاہا اور آسمان نے دست ستم بڑھایا نازک جان تھا، آن کی آن میں دم توڑا۔ چرخ ستمگر کو بھی احساس ہوا کہ ایسی موہنی جان کو لے کر اس کا دل بھی شق ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا رویا اور اس قدر رویا کہ تین دن تک آنسو نہ تھمے ورنہ ۵ ارتیر کی چلچلاتی دھوپوں میں لگاتار بارش کے کیا معنے ہوتے ہیں۔

اس عجوبۂ قدرت سے لوگوں کا دل اور ہلا اپنا پرایا، چھوٹا بڑا جس نے لاشے کو دیکھا رو پڑا لیکن زندہ دل قاسم کی وہی انوکھی شان کہ گو چہرہ سوتا ہوا ہے حالت بالکل بدل چکی ہے، چار ہی دن کے نمونیہ نے یہ حال کر دیا ہے کہ شکل نہ پہچانی جائے لیکن آنکھیں کچھ کھلی ہوئی ہیں، اور دانت علانیہ نظر آتے ہوئے، گو یا دنیا ساری روتی رہی، لیکن قاسم نے ثابت کر دکھایا کہ وہ دنیا کی خوشی و غم اور اچھے، برے سب ہی کو ایک نیم نگاہی سے دیکھتا ہے، اور سارا فلسفۂ مرگ و زیست اس کے نزدیک ایک ادائے تبسم سے بڑھ کر نہیں! جیا تو مسکراتا ہوا، اور مرا تو مسکراتا ہوا!۔

کتنا بہادر تھا وہ! اور شاید اسی بہادری کا پرتو اس نے مجھ پر بھی ڈالا تھا، ورنہ جانتے ہو قاسم کہ تمھاری لاش پر تمھاری ماں رو رہی ہیں، باپ رو رہے ہیں، بھائی، بہنیں رو رہی ہیں، اپنے پرائے رو رہے ہیں اور میں ہوں کہ بت بنا ہوا کھڑا ہوں!۔ تو کیا تم سمجھتے ہو کہ تمھاری موت کا مجھے گویا کچھ غم ہی نہیں ہوا؟ سچ تو یہ ہے کہ تم ہی نے تو میری چھوٹی عظمت کا اعتراف کر کر کے مجھے اتنا بے بس بنا دیا کہ غالباً تمھاری ہی مانی ہوئی عظمت کے خلاف سمجھ کر میں تمھاری لاش پر دو آنسو بھی نہ بہا سکا، بلکہ فی الحقیقت تمھارا بے لوث جسم اس سے بہت ارفع تھا کہ مجھ جیسے گندہ اور ادنیٰ آدمی کے آنسو تم پر گرتے! اور پھر اب تمھیں ان آنسوؤں کی پروا بھی کیا ہے!

تم میرے آنسوؤں کی پروا کرو نہ کرو، دوسروں کے غم کی تمھیں فکر ہو نہ ہو، لیکن رونا تو یہ ہے کہ تم اتنے عیش پسند انسان رہے، اور تمھیں خود اپنے عیش و مسرت کا بھی تو خیال نہ رہا۔ کیا یہی تھی تمھاری بہار عیش کہ جب غنچہ چٹکنے کو ہو تو اسے مسل دو، کیا یہی تھی تمھاری زندگی، کہ جب اس کے عروج کا وقت آئے تو تم خود غروب ہو جاؤ۔ کسی اور کا نہ سہی لیکن کم سے کم تم نے اپنی اس بھولی بیوی کا تو خیال کیا ہوتا، جس کی تم نے بار ہا تعریف بھی کی اور کبھی کمزوریاں بھی گنائیں، جس کے سہاگ کے پھول کھلے ابھی پورا ڈیڑھ سال بھی تو نہیں ہوا تھا اندازہ کرو اس معصوم دل کا جو لوگوں کو روتے دیکھتی ہے، لیکن شرم دامنگیر ہے، خود اف نہیں کر سکتی، دم گھٹتا ہے، اور مر نہیں سکتی۔ کیا تم نے اسی دن کے لئے اس سے شادی میں اتنی جلدی اور کوشش کی تھی کہ اپنے وداع کے ساتھ

اس کی دنیا بھی اندھیر بنا جاؤ؟ یہی تھا تمھارا حاصل عیش کہ خود حسرت لے جاؤ اور اسے تڑپا جاؤ؟ - خیر تم نے بیوی کو چھوڑا چھوڑا کبھی اس ننھی کلی کو بھی دیکھا جس کا "چٹانا" کئے تمھیں ابھی شاید ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا؟ تم نے اس کی بلکتی ہوئی آواز کی بھی پروا نہ کی؟ - تمھیں میرے پاس بیٹھتے ہوئے تو اس کے دودھ کی بڑی فکر ہوتی تھی، لیکن اب دنیا سے جاتے ہوئے خیال نہ آیا کہ اس کے دودھ کا انتظام کون کرے گا؟ اسی لئے شاید میری زبان سے نکلتا تھا کہ "تم ابھی سے ان شادی کے جھگڑوں میں نہ پڑو قاسم!" لیکن تم کہتے کہ "ہٹاؤ شاکر تم تو نرے فلسفی ہو، کہاں کی محبت، کہاں کا فلسفہ، بس کھاؤ پیو مزے اڑاؤ شادی کرو...... اور چلتے بنو!" -

کیا اپنی سی کر دکھائی! لیکن آخر ایک وقت ان جھگڑوں سے تنگ آئے ہی اور کہا "ان جھگڑوں سے اب کچھ جی اکتا سا جا رہا ہے شاکر - جی چاہتا ہے کہ ایک بالکل الگ گھر لے کر تمھاری طرح تنہا رہوں!" - کتنا اچھا الگ گھر لیا تم نے! کہ نہ جھگڑے ہیں، نہ مخمصے ہیں، نہ بیوی ہے، نہ بچے ہیں، نہ غذا ہے، نہ دوا ہے، نہ خوشی ہے، نہ رنج ہے! - یہ سکون کی انتہا ہے، اور وہ تم نے پالی! اگر تم جیسے زندہ دل اور بے چین فطرت آدمی کے لئے اس کی اتنی جلدی بھی کیا تھی قاسم؟

شاکر

فن تقریر

دنیا کی تاریخ بتلاتی ہے کہ جس قوم میں اچھے اچھے مقرر پیدا ہوئے وہ قوم ہمیشہ نیک نام رہی، ان کے جذبات اور احساسات ہمیشہ بیدار رہے اور انھوں نے انسانی زندگی کی تاریخ اور تمدن بنانے میں بڑا حصہ لیا ــــ انھیں خیالات کو پیش نظر رکھ کر ادارۂ ادبیات اردو نے "فن تقریر" کے نام سے یہ کتاب ترتیب دی جس میں بتلایا ہے کہ ایک مقرر کے لئے کن کن باتوں کا خیال رکھنا لازمی ہے۔ اور وہ کس طرح ایک کامیاب اور ہردلعزیز مقرر بن سکتا ہے دیباچہ کے تحت جس میں بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں کئی ایک تصویریں بھی ہیں جن میں مقرر کو نقل و حرکت کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ کتاب ہر لحاظ سے مفید اور قابل مطالعہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کی کتابیں اردو میں زیادہ سے زیادہ منتقل ہوں۔

سہیل (گیا) جنوری ۱۹۴۱ء

یہ چھوٹی سی کتاب اپنے موضوع کی ہمہ گیری کے اعتبار سے صد درجہ اہم اور مفید ہے۔ دیباچہ میں فن تقریر کی تاریخ مختلف اقوام کے انداز خطابت کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد مقرر کی خصوصیات اور تقریر و خطابت کے مختلف پہلوؤں پر معلومات افزا بحث کی گئی ہے۔ اور قواعد، خطابت اور مقررانہ اوصاف و خصائص وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب قابل مطالعہ ہے۔

عالمگیر فروری ۱۹۴۱ء

غزل

فغاں آشنائے اثر ہو رہی ہے
مری زندگی مختصر ہو رہی ہے

قیامت یہ کیا چشم تر ہو رہی ہے
کہ ہر شامِ غم کی سحر ہو رہی ہے

محبت میں اب یوں گذر ہو رہی ہے
بسر کر رہا ہوں بسر ہو رہی ہے

ہر اک ضرب دل کارگر ہو رہی ہے
نظر مبتلائے نظر ہو رہی ہے

میں خود تو زمانے سے غافل ہوں لیکن
زمانے کو میری خبر ہو رہی ہے

مری انتہائے محبت سلامت
تری ہر جفا بے ضرر ہو رہی ہے

کہاں آفتاب اور کہاں ذرہ اختر
مری زیست نقشِ جگر ہو رہی ہے

اختر رضوانی

کلام وجد

اک پرتوِ دلکش ہے خیالوں کے اثر کا
خود حسن حقیقت نہیں دھوکا ہے نظر کا

اے جوشِ جنوں دولتِ دیدار مبارک
صد شکر نقابِ رخِ محبوب نہ سرکا

رہتی ہے نظر تشنۂ نظارۂ فطرت
شکوہ ہے تنک مایگیِ شام و سحر کا

ہنگامِ سحر قطرۂ شبنم کی ضیا میں
انجام جھلکتا ہے شبابِ گلِ تر کا

ہر شئے کے خریدار تھے بازارِ جہاں میں
طالب نہ ملا وجد کوئی جنسِ ہنر کا

سکندر علی وجد

مرہٹی زبان میں افسانوی لٹریچر

اُس زمانے میں جب کہ مہاراشٹر غفلت کی میٹھی نیند سو رہا تھا، وہاں کے باشندوں کے پیروں میں غلامی کی زنجیریں پڑی ہوئی تھیں ادب بھی قعر مذلت میں گرا ہوا تھا ایسے ہی تاریک زمانے میں ایک لڑکا دینا نیشور شک۔۔۔ میں موضع آلندی میں پیدا ہوا۔ اس نے عنفوان شباب ہی سے مذہبی پرچار شروع کیا اور مہاراشٹر کے باشندوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔

اس نوجوان سادھونے دینا نیشوری، لکھی جو مرہٹی ادب میں ایک ناقابل فراموش یادگار ہے۔ یہ بھاگوت گیتا کی منظوم شکل ہے اور مرہٹی زبان کی سب سے پہلی کتاب مانی جاتی ہے اس کے بعد سے اس خطہ میں کئی بڑے بڑے سنت و سادھو پیدا ہوئے جنھوں نے عوام میں بیداری کی روح پھونکی اور ادب کی ترقی میں کوشاں رہے۔ تکارام نے اپنے کلام کے ذریعہ سے لوگوں پر ایک قسم کی وجدانی کیفیت طاری کردی، رامداس سوامی نے ان میں مذہبی و سیاسی بیداری کی روح پھونکی۔ ایکناتھ نے چھوت چھات رفع کرنے کی کوشش کی۔ غرض اس دور میں ادب بھی ارتقائی منازل طے کرنے لگا۔

ابتداءمیں عوام کا رجحان بھکتی کی جانب زیادہ مائل تھا چنانچہ تکارام، نامدیو اور جنابائی کے کلام کو لوگ بڑے شوق سے سنتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ پرانی پریم کی کتھائیں بھی بہت شوق سے سنی جاتی تھیں، رادھا کرشن، نل دمینتی اور ستی ساوتری کے واقعات لوگوں پر ایک قسم کا روحانی اثر رکھتے تھے۔ اور ان ہی قصوں سے وہ افسانوی ادب سے بہرہ ور ہوتے تھے۔

جب مرہٹوں کا عروج تمام ہندوستان میں ہوگیا۔ تو عوام کی توجہ زیادہ تر رزمیہ نظموں کی جانب مبذول ہوگئی ان کو مرہٹی میں "پواڑے" کہتے ہیں۔ ان میں بہادران قوم اور شیران وطن کے گیت گائے جاتے ہیں، عموماً یہ نظمیں سیواجی اماجی نائک جیسے بہادروں کے کارناموں پر لکھی گئی ہیں۔

مرہٹوں کے زوال کے بعد بھی یہ صنف کافی مقبول رہی اور یہ جابجا محفلوں میں سنائے جانے لگے تاکہ لوگوں میں پھر سے وہی روح عود کرآئے، آج بھی مہاراشٹر میں پواڑے بکثرت سنے جاتے ہیں اور ان سے عوام میں بیداری پیدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

انگریزوں کی عملداری کے بعد سے عوام کی توجہ انشاء لطیف کی جانب مائل ہوئی اور ان میں ناول اور افسانے تیزی کے ساتھ ترقی کرنے لگے اس وقت کی اکثر کتابیں سنسکرت یا انگریزی کی ترجمہ ہوتی تھیں مثلاً ہتوا پدیش، پنچ تنتر، یال متر وغیرہ رفتہ رفتہ ادب میں رومان کا نشو ونما ہونے لگا۔ بتیال پچیسی سنگھاسن بتیسی جیسی بے نظیر کتابوں سے لوگ اپنا دل بہلانے لگے ۱۸۶۱ء میں چپ لوشن کر کی چمتکارک گوشٹی شائع ہوئی اور اسی انشاء میں مدن منجری، رتن پربھا، کتا مالا جیسے عشقیہ ناول شائع ہوئے جن کی بدولت ان میں کئی برس تک رومان کا زور وشور رہا۔ اور ناظرین کو ادب کی اس صنف کا خوب چسکا لگ گیا۔

۱۸۷۵ء میں مرہٹی ادب میں ایک انقلاب شروع ہوا ہری نارائن آپٹے آنجہانی نے جو مرہٹی کے مشہور ترین ناول نویس ہیں کرم نک، نامی اخبار جاری کیا اور اس کے ذریعہ اچھی ناول کی داغ بیل ڈالی۔ اس وقت اصلی اور اچھی ناولوں کا مطلق رواج نہ تھا، پن لکش کون شانت گھیتو (اگر غور سے کون سنا

گوارا کرے؛ جواُن کا مشہور سماجی ناول ہے اسی اخبار میں شائع ہوا۔ اس وقت کی کہانیاں موجودہ مختصر افسانوں کی جیسی نہیں ہوتی تھیں بلکہ وہ خود ایک ناول کی سی حیثیت رکھتی تھیں، آپ کی اکثر کہانیاں سماجی ہیں آپ کی کہانیوں کا ایک مجموعہ "سات کہانیاں" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جس کے چار حصے ہیں، ان میں تقریباً بیس کہانیاں ہیں جن میں' احسان کا بدلہ، قحط تو بہت کٹھن گزرا' غریبی کا سنسار اور ڈبیشیا پڑھنے کے قابل ہیں۔ قحط تو بہت کٹھن گزرا ۱۸۹۶ء میں لکھا۔ اس میں انھوں نے قحط زدہ لوگوں کی دردناک تصویر کھینچی ہے کیسے دن گزرے' میں پونا کے ۱۸۹۹ء کے طاعون کے وحشتناک زمانے کا ذکر ہے ڈبیشیا آپٹے صاحب کی مزاحی کہانی ہے۔ ہاتھ لگاتے ہی سونا' وغیرہ انگریزی طرز کے افسانے ہیں۔ اسلوب بیان فطری اور زوردار ہے۔ کرم نک اخبار نے مرہٹی ادب اور افسانے کی بہت خدمت کی۔ ۱۸۹۵ء سے مرہٹی افسانوی ادب میں ایک دوسرا انقلاب آتا ہے' کاشی ناتھ رگھوناتھ متر آنجہانی نے' منورنجن' رسالہ جاری کیا ان میں مختصر افسانے شائع ہوتے تھے جو زیادہ تر بنگالی زبان کا ترجمہ ہوتے تھے۔ کاشی ناتھ راؤ اور ان کے شریک مدیر وٹھل سیتارام گرجر کی کہانیاں' منورنجن میں شائع ہوئیں متر آنجہانی نے رام کا اجودھیا لیلا اور راما مادھو وغیرہ ناول لکھے جو ٹھیٹھ بنگالی کے تراجم ہیں' گرجر صاحب نے بھی بابو جلدھر سین' بابو پربھات کمار' مکرجی اور پروفیسر کالی پرسنن داس گپتا وغیرہ جیسے بنگال کے مشہور انشا پردازوں کی تصانیف کے ترجمے کئے۔ آپ کی ناولوں میں پونم کا چاند' خاوند بیوی' دیوتا بہت مشہور ہیں آپ بنگالی افسانوں کو مرہٹی جامہ پہنانے میں خوب مشاق ہیں' زبان شستہ اور بامحاورہ ہے' عموماً آپ کے پیش نظر تعلیمی اور سماجی چیزیں رہی ہیں۔

۱۸۹۶ء میں بال گنگادھر تلک آنجہانی نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور مراٹھا نامی ہفتہ وار اخبار نرسمہوں چنتامن راؤ کیلکر کی مدد سے جاری کیا۔ اس وقت مہاراشٹر میں صحافت کافی ترقی کر چکی تھی چنانچہ اس وقت کے مرہٹی اخبارات' کیسری' دینان پرکاش وغیرہ تھے۔ اسی زمانے میں کیلکر، پروفیسر پرانجپے آنجہانی' کولھٹ کر' پروفیسر وامن ملہار جوشی' اننت راؤ کرشناجی ٹیکاٹے وغیرہ جیسے مشہور مصنفین نے چیدہ چیدہ کہانیاں لکھیں اور اسی زمانے میں کیلکر اور کولھٹ کر نے مرہٹی ادب میں (ESSAY) لکھنے کا رواج ڈالا۔ کولھٹ کر کی کہانیوں میں مدیرہ غریب بے چارہ پھرگاؤ بہترین ہیں۔ کولھٹ کر نے سماج سدھار کے لئے جان توڑ کوششیں کیں چنانچہ کیلکر جیسے مشہور سدھارک اپنی سوانح حیات میں رقم طراز ہیں کہ' سماج کے سدھار نے میں کولھٹ کر مجھ سے بھی بازی لے گئے' ان کے افسانے کتھا پستک کے نام سے شائع ہوئے ہیں جن میں گیتاراؤ' چندون علی گڑھ میں میں نے ریل گاڑی کس طرح مس کی' دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں پلاٹ سیدھا سادہ مگر نہایت دلچسپ ہے پروفیسر شیورام مہادیو پرانجپے مہاراشٹر کے مشہور مقرر اور ادیب تھے آپ کی کہانیاں زیادہ تر سیاسیات سے متعلق ہیں آپ نے افسانوں کے ذریعے ملک میں ملک کی عزت اور خدمت کے خیالات پیدا کرنے کی کوشش کی ان کے افسانوں میں ایک کارخانہ' رام بھاؤ کی کہانی' ایک پتھر پھوڑنے والے کی کہانی' ایک جاترا' وغیرہ مشہور ہیں۔ پروفیسر وامن ملہار جوشی کے افسانوں کا مجموعہ' لوپشپ کرنڈک کے نام سے شائع ہوا ہے ان میں بعض مزاحیہ افسانے بہت عمدہ ہیں۔ اس وقت مرہٹی زبان بہت ترقی کر رہی تھی' بھنڈارکر اور راناڈے

جیسے عالم و فاضل اپنی تحریروں سے اس کی خدمت کر رہے تھے۔
مشہور سیاس کرشناجی گوکھلے آنجہانی نے بھی میدان صحافت میں قدم رکھا اور اپنے افسانوں کو منورنجن میں شائع کیا، آپ عموماً انگریزی افسانوں کو مرہٹی جامہ پہناتے تھے۔ آپ کے چند افسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔ منورنجن میں بنگالی، انگریزی، گجراتی فرانسیسی اور ہندی افسانوں کے ترجمے شائع ہوتے تھے۔

۱۹۰۶ء میں اگست کے مہینے سے واسودیو گوندا آپٹے آنجہانی نے آنند نامی ماہ نامہ جاری کیا، آپ انگریزی اور بنگالی زبان کے ترجمے کرتے تھے۔ بنکم چندر چٹرجی اور ہنری وڈ وغیرہ کے اکثر ناولوں کا ترجمہ مرہٹی زبان میں کیا ہے۔

۱۹۱۰ء کے بعد سے مرہٹی افسانہ نگاری کے میدان میں چند نئے افسانہ نگاروں نے قدم رکھا جن میں ناتھ مادھو آنجہانی، سہکاری کرشن آنجہانی، نارائن ہری آپٹے اور نارائن سیتارام پھڑکے اور سرسوتی کمار مشہور ہیں اس وقت منورنجن کے ڈھنگ پر نویگ، ادیان، مجو کر۔ کرتوسکر وغیرہ ادب لطیف کے ماہ نامے نکلے، اس زمانے میں انگریزی کی جاسوسی کہانیاں کثرت سے مرہٹی ادب میں منتقل ہونے لگیں پریم چندر اور ٹیگور کے افسانوں کا ترجمہ بھی اسی دوران میں کیا گیا چنانچہ پریم چند کی کہانیاں، آنند راؤ جوشی اور کتھا کدمب ایس آر مراٹھے نے جو ٹیگور کے افسانوں پر مشتمل شائع کیا۔

ناتھ مادھو مہاراشٹر کے مشہور ناول نگار تھے، آپ نے بھی چند افسانے لکھے ہیں۔ سہکاری کرشن کے چند افسانے سنسار کتھا کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ سرسوتی کمار کے افسانے زیادہ تر سماجی ہیں جو بال منڈوانے، بچپن کی شادی اور عمر رسیدہ مردوں کی شادی اور برے رسم و رواج سے متعلق ہیں۔

۱۹۲۰ء کے بعد سے مرہٹی افسانہ نگاری میں ایک انقلاب شروع ہوتا ہے۔ کئی ماہ نامے مثلاً سہیادری، ایشونت، چترتسنا کروسکر، منوہر وغیرہ نکلے، جن میں افسانے بکثرت شائع ہونے لگے۔ اسی دوران میں ٹالسٹائی، ہارڈی، گالزوردی، چیخوف، گورکی، موپاساں وغیرہ کے افسانے مرہٹی زبان میں کثرت سے منتقل ہوئے، نئے نئے افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے جن میں سے بعض اب چوٹی کے افسانہ نگار شمار کئے جاتے ہیں مثلاً پروفیسر پھڑکے، کھانڈیکر، ناڈکرنی، کولہٹکر، اترے، ودیکر وغیرہ

پروفیسر پھڑکے، نارائن سیتارام پھڑکے مرہٹی کے ہر دلعزیز ناول نگار اور افسانہ نویس ہیں، اب تک آپ کی ۴۶ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں ۱۳ ناول ہیں۔ ہری نارائن آپٹے آنجہانی کے بعد سے آپ ہی مرہٹی کے سب سے بڑے ناول نگار مانے جاتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں، مسافر، آرزو دولت، نرنجن، جادوگر وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ افسانے بھی خوب لکھتے ہیں، آپ کے افسانے دل پذیر اور دلچسپ ہوتے ہیں، عوام کا نقشہ خوب کھینچتے ہیں، نوجوانوں کے دلوں کو گرمانے اور محبت بھری کہانیاں لکھنے میں آپ کو کمال حاصل ہے۔ آپ کے افسانوں کے تین مجموعے، پروفیسر پھڑکے کی کہانیاں (۲ جلدیں) اور لولا اور دیگر افسانے شائع ہوئے ہیں۔ شانتا دنیا میں پہلا قدم، بھالچندر کی شکار میں آپ نے بچہ، عورت اور مرد کی نفسیات کا نہایت خوبی سے تجزیہ کیا ہے، کالج کی شرارتیں میں کالج کی شرارتوں کو نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے، دیگر افسانوں میں لکشمی پوجن، لولا، تسلا وغیرہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ آپ کے افسانوں کا پلاٹ عموماً بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ اور قارئین کی دلچسپی افسانے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اسلوب بیان نہایت دلچسپ

اور زبان کسی قدر سلیس ہوتی ہے۔

کھانڈے کر۔ وشنو سکھارام کھانڈے کر مرہٹی کے مشہور افسانہ نویس اور ناول نگار ہیں آپ کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۳۴ بتائی جاتی ہے جن میں آٹھ ناول اور گیارہ افسانوں کے مجموعے ہیں۔ آپ کے ناولوں میں سفید بادل دل کی پکار، پہلا پریم بہت مشہور ہیں۔ افسانے کے مجموعوں میں پھول اور پتھر، پوجن، سادھی پر کے پھول، گرمی اور بارش وغیرہ بہت مقبول ہیں۔ کھانڈے کر کو مرہٹی زبان کی افسانہ نگاری میں وہی درجہ حاصل ہے جو اردو زبان میں منشی پریم چند مرحوم یا ڈاکٹر اعظم کریوی کو، آپ کے افسانوں میں بھی منشی پریم چند یا ڈاکٹر اعظم کریوی کے افسانوں کی طرح کوئی نہ کوئی پیغام ہوتا ہے، چند سال قبل مرہٹی ادب میں آرٹ اور زندگی کی بحث خوب چھڑی، کھانڈے کر اس خیال کی تائید میں تھے کہ آرٹ زندگی کے لئے ہے اور پروفیسر پھڑکے کا خیال تھا کہ آرٹ آرٹ کے لئے، چنانچہ اس طرح مہاراشٹر میں دو اسکول پیدا ہو گئے ایک کھانڈے کر کا دوسرے پھڑکے کا۔ کھانڈے کر کا قول ہے کہ وہ ادب یا آرٹ بالکل بیکار ہے جو زندگی کے لئے کارآمد نہ ہو چنانچہ ان کی ہر تحریر میں یہی چیز کارفرما دکھائی دیتی ہے

کھانڈے کر کی افسانہ نگاری کا میدان بہت وسیع ہے وہ بہت بڑا مصلح ہے اس کے پیش نظر ہر افسانہ لکھتے وقت کوئی نہ کوئی آئیڈیل ہوتا ہے، چنانچہ 'اس کے آنسو' میں وہ موجودہ لیڈروں اور مقرروں کی دھوکا بازی کو نہایت عمدگی سے بیان کرتا ہے۔ 'مردوں کا پریم' میں اس نے مردوں کی عیاری کو ظاہر کیا ہے، وہ مزدوروں، غریبوں اور دکھی انسانوں کا بہت بڑا ہمدرد ہے۔ چنانچہ 'انصاف'، 'دکھی انسان'، 'بستا ہوا مسیں' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ کھانڈے کر بہت بڑا ماہر نفسیات ہے چنانچہ 'یتیم لڑکی'، 'ٹھہرو' وغیرہ میں اس نے بچوں کی نفسیات کا نہایت خوبی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے، رومانی افسانوں میں 'بیرون خانہ'، 'دوسری بیوی'، 'ڈھلکتے ہوئے آنسو' پڑھنے کے قابل ہیں۔

کھانڈے کر کی زبان نہایت سلیس اور شگفتہ ہوتی ہے۔ افسانے نہایت ستھرے اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ پلاٹ حد درجہ دلکش ہوتا ہے تشبیہیں اور استعارے بکثرت ہوتے ہیں۔ بعض تشبیہیں تو اتنی عمدہ ہوتی ہیں کہ انسان سر دھننے لگتا ہے۔ افسانوں میں مزاح کی چاشنی بھی نہایت ہی لطیف پیرایہ میں ہوتی ہے۔ حقیقت میں مرہٹی زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو اتنا بڑا آرٹسٹ ملا۔ (باقی آئندہ)

امجد علی خاں یوسف زئی (عثمانیہ)

سرگذشت

ادارۂ ادبیات اردو ——— مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد

ادارہ کی دس سالہ سرگذشت نہایت ہی محنت اور سلیقہ سے مرتب کر کے شائع کی گئی ہے۔ اس میں ادارۂ ادبیات اردو کی ہمہ جہتی علمی و ادبی خدمات کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ ایک مستقل کتاب ہو گئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے نہ صرف ادارہ کی علمی و ادبی خدمات کا پتہ چلتا ہے بلکہ حیدرآباد کی علمی سرگرمیوں اور اردو نوازیوں کا ایک خاکہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔

کتابت و طباعت بہت ہی نفیس اور پاکیزہ ہے

تعداد تصاویر (۲۵) خوشنما جلد اور گرد پوش بھی ہے

تعداد صفحات (۳۴۴) قیمت صرف ۱۲؍

گل بوٹے

ایک "رومانیت" بھرے بزرگوار جنھوں نے نامِ خدا زندگی کی صرف ساٹھ بہاریں ہی دیکھی ہیں، اپنی خزاں کو بہار کا سند لیبہ دے کر ساتویں مرتبہ گھر بسانا چاہتے ہیں، ماشاءاللہ سے آپ بالکل "صحیح سالم" ہیں، البتہ کسی قدر لرزہ براندام رہتے ہیں، لقوہ سے منہ کچھ ٹیڑھا ہو گیا ہے مگر منہ میں دانت نہ ہونے سے بدنمائی پیدا نہیں ہوئی ہے، بصارت کی کمزوری آپ کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے مگر عمر کے بڑھنے سے "بصیرت" بڑھ گئی ہے، کانوں سے برابر سنائی دیتا ہے، صرف چلّانا پڑتا ہے۔

آپ کے کئی عدد چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں ہیں، سب سے بڑے لڑکے نے پچھلے مہینہ چالیسویں برس میں قدم رکھا ہے اور سب سے چھوٹی لڑکی اٹھائیسویں سال میں کھیل رہی ہے ان سب کو آپ نے "اعلیٰ تعلیم" دلائی ہے، بڑا لڑکا انگریزی میں تار کا مضمون اچھی طرح سمجھ لیتا ہے، اردو تو "پدری زبان" ٹھیری! اس میں سب کو کافی مہارت ہے، البتہ بعض "پیچیدہ" الفاظ کی املا میں ایک آدھ حرف کی غلطی ہو جاتی ہے، جیسے آم کو "ع" سے، سلام کو "ص" سے، صبح کو "س" سے اور عقل کو "الف" سے بھی لکھا جاتا ہے، انگریزی لکھنے کا کام نہیں پڑتا اس لئے اس کی املا میں کسی غلطی کا امکان ہی نہیں! بولنے میں عادت نہ ہونے کی وجہ سے ذرا تکلف ہوتا ہے، اس لئے "یس" اور "نو" پر ہی گفتگو ختم ہو جاتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ لڑکوں کی تربیت کی طرف بھی پوری پوری توجہ کی گئی ہے اور بڑی کوشش سے ان میں "اعلیٰ کردار" اور "بلند اخلاق" پیدا کئے گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ آج کل کی "شریف" صحبتوں میں دن رات گھنٹوں بیٹھے اعلیٰ درجے کے "مہذب" کھیل مثلاً برج، پوکر، فلش وغیرہ میں جی کھول کر حصہ لیا کرتے ہیں، موسمی تفریحیں مثلاً گھوڑ دوڑ اور بارش کے سٹہ پر بھی تھوڑی بہت ہار جیت ہوا کرتی ہے، ایسے موقعوں پر ایک گونہ بے خودی پیدا کرنے کے لئے "بنت عنب" کو بھی دعوت دی جاتی ہے، "ولایتی" سے زیادہ رغبت ہے کیونکہ "دیسی" صحت کو بگاڑ دیتی ہے، جب یہ "مس صاحبہ" جلوہ گر ہوتی ہیں تو سارا گھر اُن کے عشوہ و اَدا کی کافرماجرائی پر مرمٹتا ہے، یہاں تک کہ پدر عالی مقام بھی ان کے حسنِ جہاں سوز سے اپنی بے نور آنکھیں سینک لیا کرتے ہیں۔

بچوں کی "سعادت مندی" کا یہ عالم ہے کہ ابا جان کتنا ہی خفا ہوں خاموش رہتے ہیں، کبھی غصہ آجاتا ہے تو صرف ڈیم فُل، بلڈی فُل وغیرہ کہدیا کرتے ہیں، اس قسم کے انگریزی لفظ جب بچوں کے منہ سے پھول بن کر جھڑتے ہیں تو پدر بزرگوار پھولے نہیں سماتے اور فرماتے ہیں "بچہ اب اچھی انگریزی بولنے لگا ہے"!

لڑکیوں کی لیاقت لڑکوں سے کچھ ہی کم ہے، مگر سب کی سب پڑھی لکھی ضرور ہیں، ان کی تعلیم میں بھی آپ نے کافی روپیہ صرف کیا ہے، اِس لئے جب کبھی کسی لڑکے کی جانب سے جہیز وغیرہ کا سوال ہوتا ہے تو آپ بہت برہم ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"تعلیم یافتہ لڑکی کی بھی خواہش کی جاتی ہے اور پھر جہیز بھی مانگا جاتا ہے، اگر جہیز جمع کیا جاتا تو ایسی "اعلیٰ تعلیم" کیسے دلائی جاتی"!

مگر اب تک آپ کو ایک بھی ایسا اعلیٰ خیال، علم دوست برخوردار داماد نہیں ملا جو آپ کی کسی لڑکی سے محض اس کی اس "مخصوص" اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے بیاہ کرنا پسند کرتا، حال ہی میں بڑی لڑکی

کے لئے پیغام آیا تھا گر شرط یہ تھی کہ ایک "اشد ضروری" قرض کی ادائی کے لئے فی الحال صرف پندرہ ہزار رُپے دئے جائیں، ایک اور صاحب بہادر" نے یورپ جانے کے لئے بارہ ہزار رُپے طلب کئے تھے، آج کل کے یہ "تعلیم یافتہ" صاحبزادے بیویوں کے رپے سے اپنی دنیا سنوارنا چاہتے ہیں، معلوم نہیں ایسے شرمناک مطالبوں کا کب منہ کالا ہوتا ہے اور کب آپ کی صاحبزادیوں کے سہرے کے پھول کھلتے ہیں۔

لڑکیوں کا بیاہ کچھ تو ان کی "کم سنی" اور کچھ پدر بزرگوار کے بیاہ پر بیاہ کی مصروفیت کی وجہ سے آج تک نہ ہوسکا، آپ کے عزیز اور دوست کبھی ان کے بیاہ کی طرف آپ کو متوجہ کرتے ہیں تو مسکرا کر فرماتے ہیں۔

" ابھی بچے ہیں جلدی کیا ہے!"

گران معصوم بچوں نے چپکے چپکے اپنے بیاہ کر لئے ہیں، اور بڑی چھان بین کے بعد "بازار" سے اپنے اپنے جوڑے خرید لائے ہیں، والد محترم کے بقول جوانی دیوانی ہوتی ہے اور ایسے کھیل تو سبھی کھیلتے ہیں!

بعض احمق لوگ اپنی لڑکیاں آپ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ سعادت مند اور ہونہار لڑکوں کو اِس لئے دینا پسند نہیں کرتے کہ وہ بے روزگار ہیں حالانکہ اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے، دوسری " نامعقول" وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بچوں کے بچے ہو گئے ہیں، مثل مشہور ہے " آج کا بچہ کل کا باپ ہوتا ہے"! اس میں تعجب کی کیا بات ہے!! ایں سعادت بزور بازو نیست!!!

خیر کوئی اپنی لڑکی دے کہ نہ دے، جو پسلی کا جوڑا ہے ایک دن جوتیاں چٹخاتے آئے گا اور ضرور آئے گا! اس لئے آپ نے لڑکوں کے بیاہ کا خیال ہی چھوڑ دیا ہے، لڑکے بھی باپ کے ہم خیال ہیں اور فی الحال افزایش نسل " دوبارہ"

میں مصروف ہیں، ان کی کوششیں خوب پروان چڑھ رہی ہیں اور گھر میں کچھ عجیب " میلہ" لگ رہا ہے۔

چندروز سے باپ بیٹوں میں ذرا چشمک ہو ئی ہے بچے چاہتے ہیں کہ ابا جان " نئی امی جان" کو نہ لائیں گر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جوانی کی یہ راتیں اور مرادوں کے یہ دن آخر کس طرح کٹیں!! اِس لئے کسی ایسی موزوں امی جان کی تلاش جاری ہے جو برس پندرہ یا سولہ کی ہو!!

جب سے لڑکوں نے ابا جان کے بیاہ کی خبر سنی ہے وہ بھی اپنے اپنے جوڑے بدلنے کی فکر میں ہیں، خدا وہ دن جلد لائے کہ ان سب کی فکریں دور ہوں اور باپ بیٹے اپنی اپنی مرادیں پائیں! آمین!!

"باغباں"

اُردو مثنوی کا ارتقاء

پروفیسر عبدالقادر سروری ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب میں اُردو مثنوی کی پیدائش سے لے کر موجودہ دور تک اس کی ترقیوں اور تبدیلیوں کی مختصر تنقیدی تاریخ پیش کردی ہے۔ اور ہر عہد کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ **شاہکار** لاہور۔ نومبر ۱۹۴۰ء

ادارۂ ادبیات نے اس کتاب کو شایع کرکے اُردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ امید ہے کہ صاحب ذوق حضرات اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں گے۔ **سہیل** گیا۔ مئی ۱۹۴۰ء

صنف مثنوی کے متعلق جس قدر تالیفات اب تک شایع ہوئی ہیں۔ ان میں یہ کتاب تفصیل تنقید اور تشریح کے لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ **البیان**۔ مئی ۱۹۴۰ء

مثنویوں پر پُر مغز تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اُردو ادب کے طلبہ کے لئے ناگزیر ہے **جامعہ** جولائی ۱۹۴۰ء

فطرت کا انتقام

اک زمانہ وہ بھی تھا' یادش بخیر! اے ہمنشیں
کائناتِ حسن و نغمہ تھی مرے زیرِ نگیں

ہائے کیا دن تھے بہ فیضِ شہرتِ شعر و سخن
میری ہمراہی پہ نازاں تھے عروسانِ چمن

کتنے پھولوں کو دیا تھا میری نظروں نے شباب
کتنی کلیاں بن گئیں تھیں چاند تاروں کا جواب

کتنے گل میرے لئے کھل کھل کر مرجھاتے رہے
کتنے دل میری جواں سالی کو بہلاتے رہے

کتنی آوازوں کی مے میرے لئے بہتی رہی
کتنی آنکھوں کی جوانی بارِ غم سہتی رہی

کتنے جلوے میری نظروں میں سما کر کھو گئے
کتنے چہرے نذرِ بے مہریٔ پیہم ہو گئے!

کتنے معصوموں کے دل ہنس کر چرالاتا تھا میں
کتنے ساغر آنکھوں ہی آنکھوں میں پی جاتا تھا میں

پھول سے چہرے رہے غم آشنا میرے لئے
پنکھڑی سے لب رہے وقفِ دعا میرے لئے

ہر نظر اک جلوۂ تازہ میں کھو جاتا تھا میں
ہر قدم اک منزلِ نو کی خبر لاتا تھا میں

ہر نفس پیغامِ سرمستی سناتا تھا مجھے
کھیلتا تھا' کھیلنے میں لطف آتا تھا مجھے

اِس طرف یہ رنگ تھا اور اُس طرف فطرت کا قہر
میرے جامِ زندگی میں بھر رہا تھا کوئی زہر

کیا خبر تھی ایسے دن' ایسی گھڑی بھی آئے گی
زندگی کی بادشاہی بھی کہیں جھک جائے گی

کیا خبر تھی عشق میں ایسا بھی اک دن آئے گا
جو کہیں جھکتا نہ تھا' ہائے وہ سر جھک جائے گا

بے نیازی خاک چھانے گی دو عالم کی نظر
قیصریت بھیک مانگے گی درِ محبوب پر

شادمانی جان دے گی' درد کے آغوش میں
زہر کی تلخی بھی ہو گی' بادۂ سرجوش میں

وقف ہوں گے قہقہے آنسو بہانے کے لئے
رات آئے گی تو آئے گی جگانے کے لئے

گاہ شکرِ غم نوازی' گاہ کربِ انتظار
گاہ آنسو' گاہ مجبوری کا دامن تار تار

لاکھ ہشیاری میں بھی سویا کرے گی زندگی
حلقۂ احباب میں رویا کرے گی زندگی

نیند ایسی آئی' کوئی صبح چونکاتی نہیں
کوئی عالم ہو طبیعت جوش میں آتی نہیں

فکرِ مستقبل' خیالِ یار' دردِ روزگار!
لب فسردہ' روح خوابیدہ' نگاہیں بے قرار

ایک دل اور اِس قدر رنج و تعب میں مبتلا
کتنی ظالم ہے مشیت' کتنا جابر ہے خدا

نظر

اُردو کی نئی کتابیں

۱-گنجینۂ صحت (جلد اوّل) از حکیم بشیر احمد ۹۶ صفحات ۔ بھوشن پرنٹنگ پریس ۔ جگادھری ۔

۲-مجربات سلطانی (حصہ سوم) از حکیم محمد یار خاں ۔ ۲۴۰ صفحات تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور

۳-مجربات جیلانی (جلد سوم) از حکیم غلام جیلانی ۔ ۱۶۰ صفحات آفتاب برقی پریس ۔ امرتسر ۔

۴-تحفۂ مقبول ۔ جلد اوّل (طبی نسخے) از پیر مقبول عالم ۷۲ صفحات حجازی پریس ۔ لاہور

۵-سائیکلوپیڈیا آف ہومیوپیتھک ورکس (حصہ اوّل) از کاشی رام ۹۵۰ صفحات ۔ فائین پریس ۔ لکھنو

۶-اقتصادی ہند ۔ از برج نرآن ۲۹۹ صفحات ۔ امرت الکٹرک پریس لاہور

۷-ہمزاد کے درشن (سحر و طلسم) از پنڈت سادھو رام ۱۶۴ صفحات حجازی پریس ۔ لاہور

۸-کامل جدید موٹر گائیڈ ۔ از ایم ایس ظفر آغا ۔ ۱۰۱ صفحات حجازی پریس ۔ لاہور

۹-اشک خونیں (نظمیں) از رامیشور پرشاد بسمل ۹۴ صفحات وزیر ہند پریس ۔ امرتسر ۔

۱۰-سرودِ غم (نظمیں، سلام وغیرہ) از سیماب اکبر آبادی ۱۰۰ صفحات قیمت ۱۲ ۔ دفتر رسالہ شاعر ۔ آگرہ ۔

۱۱-حیات محمد عبدہ (سوانح) از محمد مظہر الدین ۸۳ صفحات قیمت ۱۲ ۔ دفتر اقبال اکیڈیمی ۔ لاہور ۔

۱۲-بادۂ سرجوش (مجموعۂ کلام) از پنڈت بھورام جوش ۱۴۰ صفحات قیمت ۱۲ ۔ مرکز تصنیف و تالیف ۔ نکودر ۔ جالندھر ۔

۱۳-بھگوت گیتا ۔ مترجمہ پروفیسر محمد اجمل خاں ۔ قیمت عمہ کتاب گھر ۔ الہ آباد ۔

۱۴-ترتیب نزول قرآن کریم ۔ مترجمہ پروفیسر محمد اجمل خاں قیمت (ـہ) کتاب گھر ۔ الہ آباد

۱۵-بستان تجلیات (مجموعہ کلام) از میر غضنفر علی شاہ بیتاب ۲۷۶ صفحات قیمت (عا) اعانت دکن پریس ۔ حیدر آباد دکن ۔

۱۶-بشریٰ (آنحضرتؐ کی نسبت توریت اور انجیل وغیرہ کی بشارتیں) از عنایت رسول عباسی ۔ ۳۴۴ صفحات شروانی پرنٹنگ پریس ۔ علی گڑھ ۔

۱۷-افتتاح الاندلس (تاریخ) مترجمہ پروفیسر جمیل الرحمن ۱۶۴ صفحات قیمت (عہ) کتابستان ۔ الہ آباد

۱۸-خلافت اور سلطنت (تیسری صدی ہجری کے واقعات) از ڈاکٹر امیر حسن مترجمہ سبطین احمد ۔ ۲۷۴ صفحات ۔ دارالمصنفین ۔ اعظم گڑھ ۔

۱۹-مشاہیر عالم کی داستان مصیبت (سولہ مشاہیر کے حالات) از آتش گوجرانوالیہ ۱۶۰ صفحات قیمت عہ ۔ نرائن دت سہگل ۔ لاہور ۔

۲۰-سنہرے سپنے (۶۲ گیت) از تنویر قریشی ۔ ۷۲ صفحات قیمت ۱۲ ۔ نرائن دت سہگل ۔ لاہور ۔

۲۱-مسافر کی ڈائری باتصویر (سفرنامہ) از خواجہ احمد عباس ۱۹۲ صفحات قیمت عہ ۔ حالی پبلشنگ ہاؤس ۔ اُردو بازار ۔ دہلی

۲۲-جاہ و جلال (ڈراما) مترجمہ صوفی غلام مصطفیٰ ۔ قیمت عمہ ڈرامیٹک کلب ۔ گورنمنٹ کالج ۔ لاہور

۲۳-بہار داغ (داغ کا منتخب کلام) مرتبہ سید نذیر نیازی قیمت عہ ۔ کتب خانہ علم و ادب ۔ دہلی ۔

۲۴-علم خانہ داری ۔ از محمودہ صدیقی ۔ ۱۵۰ صفحات ۔ قیمت عہ ۔ سب رس کتاب گھر ۔ خیریت آباد حیدر آباد دکن

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

شہید کربلا قرآن کی روشنی میں

از ابو محمد مصلح ناشر ادارۂ عالمگیر تحریک قرآن مجید حیدرآباد۔ ۲۰۲ صفحات۔ قیمت تین روپے۔

اس چھوٹی سی کتاب میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے حالات زندگی کو قرآنی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سید الشہداء کی پوری زندگی ان کے باپ اور نانا کی زندگیوں کی طرح اس عظیم الشان کلام الٰہی کی تفسیر تھی اور اس موضوع پر اتنا مواد مل سکتا ہے کہ زیر نظر کتاب سے کئی گنا ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ ابو محمد مصلح صاحب نے امام حسینؑ کی حیات ایک نئے پیرائے سے لکھی ہے اور اس جدت کی حد تک وہ قابل مبارک باد ہیں۔ لیکن کتاب کی ترتیب اور فراہمی مواد موضوع کے شایان شان نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے کہ بغیر تلاش و جستجو اور قدیم کتابوں کے مطالعہ کے تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا اور اس کے لئے کافی وقت اور صبر کی ضرورت ہے۔ محمد مصلح صاحب کے یہاں بظاہر اتنا وقت نہیں کہ وہ صرف اسی موضوع کے لئے ایک عرصے تک وقف ہو جائیں۔ اسی لئے اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ کتاب روا روی میں لکھی گئی ہے۔ لیکن اس کا اسلوب شگفتہ اور کتابت و طباعت شایستہ ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو مطالعہ کے لئے زیادہ وقت نہیں نکال سکتے یہ کتاب بہت دلچسپ اور مفید ثابت ہوگی اور اس وقت تک جب کہ اس موضوع پر کوئی بسیط کتاب شائع نہ ہو یہی بہت سی مفید معلومات کا ذریعہ بنی رہے گی۔ اس کتاب کو مصلح صاحب نے مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری ناظم تعلیمات سرکار عالی کے نام معنون کیا ہے اور اس کے ذریعہ سے قوم کے ان نوجوانوں کے نام ایک پیام پہنچانے کی کوشش کی ہے جو قرآن کی روشنی میں حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ کتاب کی قیمت میں کمی کی کافی گنجائش ہے۔

سفینۂ نجات

از صغرا بیگم ہمایون مرزا ۴۸ صفحات مطبوعہ شمس المطابع حیدرآباد۔

اس چھوٹی سی کتاب میں تقریباً پچاس نوحے درج ہیں۔ یہ اصل میں اس سے قبل دو بار چھپ چکی ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۱۲ء میں اور اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں ان دونوں طباعتوں کے نسخے مفت تقسیم کر دئے گئے تھے اور غالباً اس تیسری طبع کے نسخے بھی ہدیتہً ارسال کئے جا رہے ہیں۔ اس میں مناجات، نعت اور سلام کے بعد نوحے درج کئے گئے ہیں۔ جن پر یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ کونسے نوحے کن تاریخوں میں پڑھے جائیں۔ اس طرح پہلی سے دسویں محرم اور پھر بارھویں اور بیسویں محرم اور ۲۸ صفر کو پڑھنے کے قابل نوحوں کی کافی تعداد اس کتاب میں شایع کی گئی ہے۔

سراج اور اُن کی شاعری

از عبدالقادر سروری۔ مطبوعہ عہد آفریں برقی پریس۔ ۹۰ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

اس کتاب میں اورنگ آباد کے مشہور صوفی شاعر سید شاہ سراج الدین سراجؔ کے حالات زندگی اور خصوصیات سخن تفصیل سے درج کئے گئے ہیں پہلا حصہ جو شاعر کی زندگی سے متعلق اعلیٰ پایہ تحقیقات پر مشتمل ہے تاریخ ادب اُردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک خاصے کی چیز سمجھا جائے گا۔ اس میں خاص تلاش و جستجو کے بعد سراجؔ اور ان کے ماحول اور ان کے حالات سے متعلق تفصیلی معلومات درج کی گئی ہیں۔ یہ حصہ ابتدائی ۶۵ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ دوسرا حصہ شاعری سے متعلق ہے اور تقریباً اتنے ہی صفحات اس کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سراجؔ نے کس طرح حافظؔ اور ولیؔ کے رنگ میں شاعری کی اور سراجؔ کے بعد کے شاعروں مثلاً میرؔ اور غالبؔ کے کلام میں سراجؔ کا رنگ کس طرح جگہ جگہ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ پوری کتاب اس قابل ہے کہ اُردو ادب کا ذوق رکھنے والے اس کو شوق سے

پڑھیں گے اور مصنف کی محنت اور قابلیت کی داد دیں گے۔

فکر مت کرو

از قاضی محمد زین العابدین۔ ۱۵۱ صفحات قیمت عہ۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔

یہ ڈراما ۱۹۱۷ء میں اس وقت لکھا گیا تھا جب کہ اس کے مصنف سیول سروس کی ٹریننگ کے لئے امراوتی ابرار میں مقیم تھے۔ اس وقت یورپ کی جنگ عظیم زور وشور سے جاری تھی اور اس کے شعلے مشرق تک پہنچ چکے تھے۔ ہندستان بھی اس زمانے میں حکومت برطانیہ کی طرف سے اس معرکہ میں کود پڑا تھا۔ اور اس کے ہر صوبے میں سپاہیوں کو بھرتی کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ اسی سلسلے میں مصنف نے کمشنر صاحب برار کی فرمایش پر یہ ڈراما قلمبند کیا تھا۔ اس میں ایک لطیف پیرائے میں جنگ میں شریک ہونے کے لئے ترغیب دلائی گئی ہے۔ اگرچہ اس کا اصل موضوع ترغیبی ہے لیکن پورا ڈراما ادبی لطافتوں اور خاکہ کی خوبیوں سے معمور ہے۔ اور جگہ جگہ مزاح کی چاشنی بھی موجود ہے۔

یہ ڈراما عرصہ تک برار میں اسٹیج پر بھی پیش ہوتا رہا ہے۔ اس میں مصنف نے ہندستان کی موجودہ سیاست اور اہل ہند کی معاشرتی حالت کی طرف بھی بلیغ اشارے کئے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے یہ احساس قوی ہوجاتا ہے کہ ہندستان اسی وقت آزاد ہوسکتا ہے جب کہ اس کے رہنے بسنے والے جوانمردی اور ایثار کے لئے تیار ہوں۔ جب تک یہ جوہر پیدا نہ ہوگا اہل ہند نہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہوسکتے ہیں اور نہ ان لوگوں کی مدد کرسکتے ہیں جو انھیں بیرونی آفتوں اور داخلتوں سے بچانا چاہتے ہیں۔

آئندہ زمانہ

از محمد فضل الرحمن۔ ۱۱۲ صفحات قیمت ایک روپیہ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔

یہ دو ایکٹ کا ڈراما ہے۔ جس میں ہماری سماج پر مذاحیہ پیرائے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ معاشرتی اور سماجی نقائص پر اسی انداز میں ضرب لگانے کی ضرورت ہے۔ اس ڈرامے کو دیکھنے سے اب اس امر کا یقین ہوتا چلا ہے کہ اردو کے ادیب زندگی کی کامیاب ترجمانی کرنے میں کسی ترقی یافتہ زبان سے پیچھے نہیں ہیں۔

اس ڈرامے کے مصنف مولوی فضل الرحمن صاحب حیدرآباد کے مشہور ادیب اور چوٹی کے ڈراما نگار ہیں۔ اس سے قبل ان کے تین ڈرامے ظاہر و باطن، نئی روشنی اور حشرات الارض شایع ہوچکے ہیں اور اسٹیج پر بھی کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ ڈراما بھی مقبول ہوگا۔

علم خانہ داری

از محمودہ صدیقی ۱۵۰ صفحات قیمت (عہ) ناشر سب رس کتاب گھر حیدرآباد۔

اُردو زبان میں خواتین کے اور خواتین سے متعلق ادب کی بہت کمی ہے۔ علم خانہ داری جو عورتوں کے لئے نہایت ضروری فن ہے۔ اس میں تو اور بھی زیادہ کمی نظر آتی ہے۔ اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر ادارۂ ادبیات اُردو نے محترمہ محمودہ صدیقی صاحبہ سے یہ کتاب مرتب کراکے شایع کی ہے۔ یہ دس فصلوں پر منقسم ہے جن میں جسم اور اعضائے جسمانی حفظ صحت، ہوا، پانی اور غذا۔ گھر اور اس کی نگہداشت امراض اور ان کی روک تھام، تیمار داری اور فرسٹ ایڈ۔ گھر کا انتظام اور کھانوں کے نسخے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ہر عنوان کے تحت کئی ذیلی سرخیاں قایم کرکے سلیس اور سادہ زبان میں مفید معلومات قلمبند کردی گئی ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ مولوی فیض محمد صاحب نے لکھا ہے جس میں اس موضوع سے متعلق اس وقت تک جو اردو کتابیں موجود ہیں ان پر تبصرہ کرکے زیر نظر کتاب کی خصوصیات اور اس کی افادیت کو واضح کیا ہے۔ ہر پڑھی لکھی خاتون کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ناموران سیاست (حصہ اول)

از عبدالمجید محمد نسیم ۶۶ صفحات قیمت ۶ر

ناشر مکتبہ جامعۂ دہلی۔

یہ کتاب وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتی ہے کیونکہ موجودہ جنگ کی وجہ سے اکثر لوگوں کی زبان پر ہٹلر اور مسولینی، روزوِلٹ

اور اسٹالن، چرچل اور چمبرلین کے نام سنائی دیتے ہیں۔ لیکن ان کے حالات سے بہت کم لوگ واقف ہیں جس کی وجہ سے سیاست حاضرہ کے سمجھنے میں ان کو دشواری ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب قابل قدر ہے اور توقع ہے کہ دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

اس میں عہد حاضر کے ۳۲ سیاسی مشاہیر کے حالات درج کئے گئے ہیں۔ یہ اگرچہ مختصر ہیں لیکن اخبار بینوں کی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں۔ البتہ اس میں ایک کمی ضرور محسوس ہوتی ہے اور وہ ان مشاہیر کی تصویریں ہیں۔ بہتر ہوتا کہ جس طرح حالات کی ترتیب میں انگریزی اخبارات اور رسائل سے مدد لی گئی ہے اسی طرح ان ذریعوں سے تصویریں بھی حاصل کی جاتیں۔

عرفان حافظ

از شیاما چرن داس ۵۰ صفحات مجلد قیمت ایک روپیہ۔ مطبوعہ دہلی پرنٹنگ پریس۔ دہلی۔

اس چھوٹی سی کتاب میں حافظ کے کلام سے مختلف موضوعوں سے متعلق اشعار منتخب کرکے توضیح و تشریح کے ساتھ شایع کئے گئے ہیں اس کے مولف شیاما چرن داس صاحب کو ادب کا اچھا ذوق ہے۔ انھوں نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ان کے مطالعہ کے دوران میں تین کتابیں انھیں سب سے زیادہ پسند آئیں۔ ایک دیوان حافظ (۲) بھگوت گیتا (۳) ایمرسن کا کلام۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"دیوان حافظ عشق حقیقی کی تعلیم کا نادر و نایاب خزانہ ہے اور خواجہ حافظ کو دنیا کا وسیع تجربہ ہے۔ اس پر ان کی قادر بیانی نے تو ان کے کلام کو اور بھی چار چاند لگا دئیے ہیں۔ میرا ناچیز خیال تو یہ ہے کہ فارسی زبان میں عشق حقیقی کی بہترین تعلیم شاید دیوان حافظ سے زیادہ اور کہیں نہیں ملتی یہی وجہ تھی کہ شاہ عالمگیر کو دیوان حافظ اس قدر عزیز تھا کہ روزانہ سرہانے رکھ کر سویا کرتے تھے۔"

اس طرح آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"دس خاک پانے بیس سال کے مطالعہ حافظ اور محنت شاقہ کے بعد دیوان حافظ میں سے ان تمام اشعار کے انتخاب کرنے کی کوشش کی ہے جو عشق حقیقی کے مختلف احوال سے تعلق رکھتے ہیں۔ انتخاب کے بعد ان اشعار کو بیس فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ تاکہ طالبان حق کے لئے عشق حقیقی کی مکمل تعلیم اختصار کے ساتھ اس طرح تیار ہو جائے کہ وہ باآسانی روزانہ وظیفہ کر سکیں۔"

خود مولف کی اس وضاحت کے بعد اس کتاب کے متعلق صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ یہ واقعی محنت و مطالعہ کا نتیجہ ہے اور خواجہ حافظ شیرازی کے اشعار کی جو توضیح کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولف کو تصوف کا اچھا ذوق ہے۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب میں یہ کتاب ضرور مقبول ہوگی۔

اردو رسم خط

از محمد سجاد مرزا ایم۔ اے (۲۸) صفحات قیمت ۵ مطبوعہ انتظامی مشین پریس

اس چھوٹے سے رسالے میں رسم خط سے متعلق نہایت تحقیقی اور اہم معلومات درج کی گئی ہیں اور مختلف خطوں کے جو نمونے دے گئے ہیں ان کی وجہ سے اس کتاب کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ اردو میں اپنے موضوع سے متعلق یہ پہلی کتاب ہے۔ جس میں اتنے اہتمام اور حسن ذوق کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مختلف عنوانوں مثلاً رسم خط کی ابتدا اور ارتقاء۔ اردو رسم خط کے پیش رو اور خود اردو رسم خط کے تحت مفید معلومات ایک جا کر دی گئی ہیں۔ اور اردو کے لئے ایک نئے خط کی ضرورت دکھاتے ہوئے مولوی شیخ حسین صاحب مہدی و شاہ آبادی کے بنیادی رسم خط سے متعلق جو نمونے اور تجویز پیش کی گئی ہے وہ بھی اردو کے لسانی ارتقاء جیسے مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے قابل مطالعہ ہے۔

نقش اولیں طلبہ کلیہ ورنگل کا ششماہی رسالہ۔ مدیر سید اختر حسین ایم اے ۔

ورنگل کالج سے اس سے قبل بھی ایک رسالہ شائع ہوتا رہا ہے لیکن اس سال سے اس نے نئی وضع اور جدید تراش خراش حاصل کرکے اپنے پیشروؤں کی صف میں ایک ممتاز جگہ حاصل کرلی ہے۔ اور جس انداز سے اب نکل رہا ہے اگر یہ جاری رہ سکے تو یقین ہے کہ یہ رسالہ ان تمام رسائل سے بازی لے جائے گا جو مملکت حیدرآباد میں طلبہ کی طرف سے شائع کئے جاتے ہیں۔ اس مجلہ کی کامیابی کا سہرا اس کے مدیر سید اختر حسین ایم آے اور نائب مدیر سید شاہ بلیغ الدین کے سر ہے ۔ اس رسالے کے تمام مضامین دلچسپ اور مفید ہیں۔ اگرچہ اس میں زیادہ تر طلبہ کو حصہ لینا چاہیے لیکن دوسرے اصحاب کے مضامین کی شرکت بھی ضروری ہے۔ تاکہ طلبہ ان کے مطالعہ سے اپنے ذوق ادب اور معلومات میں اضافہ کرسکیں، نظموں کا حصہ بھی بلند پایہ ہے۔ توقع ہے کہ اس رسالہ سے ورنگل کالج کے طلبہ کے علاوہ دوسرے اصحاب بھی اور خاص کر دوسرے مدرسوں کے طلبہ ضرور استفادہ کریں گے ۔

کنڑی شاعری کے جدید رجحانات از دلی کے بھیم سین راؤ ایم۔ اے۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس ۔(۱۶) صفحات ۔

یہ اصل میں مجموعہ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ کے ساتویں سالنامہ کا چھپا ہوا حصہ ہے جس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریاست حیدرآباد کی ایک مقامی زبان کنڑی کی شاعری کس خوبی کے ساتھ ترقی کرتی جارہی ہے۔ کنڑی ادب کو عموماً تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ۔اِس کی ابتدا کرناٹک میں اس وقت سے شروع ہوئی جب کہ پانچویں صدی عیسوی میں جین مذہب کو عروج حاصل تھا۔ چنانچہ کنڑی کی اکثر ابتدائی کتابیں جین مذہب ہی کے شاعروں کی لکھی ہوئی ہیں ۔ یہ دور ۱۱۶۰ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد جب لنگایت مذہب کو شہرت حاصل ہونے لگی تو کنڑی ادب کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اور اس دور کا آغاز کرنے والے لنگایت مذہب کے پیرو تھے۔

کنڑی شاعری کا تیسرا دور پندرھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ کنڑی بولنے والوں میں برہمنی مذہب کو مقبولیت حاصل ہونی شروع ہوئی ۔

اس رسالے میں مولف نے جدید کنڑی شاعری کی زبان صنائع وبدائع اور مطالب وموضوعات سخن پر دلچسپ پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے ۔ ضرورت ہے کہ اسی طرح ملک کی دوسری مقامی زبانوں کے ادب پر بھی پُراز معلومات مضامین شائع کئے جائیں۔ **شعبۂ تنقید**

نمود زندگی

یہ جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کی ایک سو ایک نظموں اور غزلوں اور رباعیوں کا دوسرا بیش بہا مجموعہ ہے ۔ جناب موصوف حیدرآباد کے مشہور ومعروف اور پختہ گو شاعر ہیں اُردو کا شاید ہی کوئی ایسا بلند پایہ رسالہ ہوگا جو آپ کے کلام کی اشاعت سے محروم رہا ہو۔ علی منظور صاحب قدیم وجدید رنگ شاعری کی معتدل روش پر نہایت استقلال کے ساتھ چل رہے ہیں اور آپ اس رنگ میں جو کچھ کہتے ہیں خوب کہتے ہیں۔ صوفیانہ جذبات کی سادگی اور مشق سخن کی پختگی آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو کا یہ جدید تحفہ دنیائے ادب میں مقبولیت کا درجہ حاصل کرے گا۔ **سہیل گیا ۔ جنوری ۱۹۴۱ء**

مقام مسرت ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو نے جناب سید علی منظور صاحب کے کلام کا مجموعہ اس نام سے شائع کیا ہے۔ سید صاحب جدید طرز کے شعرا میں بہت بلند پایہ ہیں ان کا کلام ہمایوں میں چھپا رہتا ہے۔ **ہمایوں مارچ ۱۹۴۱ء**

لفافے بدلنا (ایک تنقیدی نظر)

جناب احمد علی خاں صاحب مجاہد نے سب رس بابت ماہ مارچ ۱۹۴۱ء میں ایک مضمون " لفافے بدلنا " تحریر فرمایا ہے۔ اس کے متعلق کچھ عرض کرنے کی جرات کر رہا ہوں۔ اس کی وضاحت بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ نہ مجھے جناب مجاہد سے کوئی پرخاش ہے اور نہ حضرت جگر کے کلام کا ضرورت سے زیادہ معتقد ہوں۔

اگر کسی قوم یا کسی جماعت کے افعال پر انگشت نمائی کی جاتی ہے تو اس کے کسی ایک ہی فرد کو " اپنے دعوے کی دلیل میں " نہیں پیش کیا جاتا۔ خواہ اسی ایک فرد میں وہ تمام برائیاں کیوں نہ یکجا ہوں جو تمام قوم میں ہیں۔ لیکن اگر اس جماعت کی مجموعی مثال نہیں پیش کی جاسکتی تو اس جماعت کے متعدد افراد پر نکتہ چینی کر کے تمام جماعت کے متعلق نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔

اپنے تمام مضمون میں محترم نقاد نے ایک عام کمزوری کے متعلق خاص طور پر حضرت جگر کو اپنا نشانہ بنایا ہے۔ اور محض ان کی غزل گوئی میں نکتہ چینی ہی پر بس نہیں کیا بلکہ جگر جیسے بڑے اور اریجنل شاعر کو

" جہاں متقدمین کا کوئی اچھا شعر نظر آئے
بس رال ٹپکنے لگی، فوراً چوری کے مال کو گلادیا
الفاظ بدل دیے بحر و ردیف تبدیل کردی
تخلص ٹھونس دیا "

— جیسے سبک الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔ اگر کسی جماعت میں انفرادی برائیاں نکالنا جائز قرار دیا جائے تب بھی ادب واحترام اور طریقۂ تنقید کو بالائے طاق رکھنا کہاں کا انصاف ہے۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ قابل نقاد کا مقصد ایک عام کمزوری کو ظاہر کرنا تھا تو تمام محلہ میں صرف ایک مکان کو نشانہ بنانا کہاں کا طریقہ ہے؟

اب رہا فی نفسہٖ " لفافے بدلنے " کا سوال تو ظاہر ہے کہ دوسرے سے سیکھ کر ہی کچھ آسکتا ہے۔ ایک طرف اگر انسان کی فطرت میں جدت طرازی ہے تو دوسری طرف اپنے سے بہتر چیز کی نقل کرنا یا دوسرے کی اچھی چیز کی برائیوں کو اپنی اس سے کم اچھی چیز کی اچھائیوں سے چھپا لینا بھی اس کی فطری عادت ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ ایک پھل کا زیادہ تر حصہ اچھا اور کم تر حصہ سڑا ہوا ہے تو بجائے تمام پھل کو پھینک کر دوسرے کو تلاش کرنے کے اسی پھل کے سڑے ہوئے حصے کو نکال کر پھینک دیتا ہے اور اچھے حصے کو کھالیتا ہے۔ اسی طرح وہ شاعر اصلی معنیٰ میں شاعر نہیں کہا جاسکتا جو دوسروں کے اشعار کو اپنی شاعری کے سانچے میں ڈھال کر پیش نہ کرے۔

بہرحال قابل مضمون نگار کا یہ نظریہ کہ شاعری میں جدت اور اچھوتا پن ہونی چاہیے بڑی حد تک درست ہے اور بہترین شاعر وہی ہے جو اپنی شاعری میں ایک انوکھا پن پیدا کر دیتا ہے

مصطفیٰ کمال خاں شروانی

اُردو امتحانات

اِس سال اِدارہ کے اُردو امتحانات (اُردو دانی، اُردو عالم، اُردو فاضل خوش نویسی اور خطاطی وکتابت) ۲۱/۲۲/۲۳ اگست ۱۹۴۱ء مطابق ۱۵/۱۶/۱۷ مہر ۱۳۵۰ف کو لئے جائیں گے۔ اور درخواستیں بھیجنے کی آخری تاریخ یکم ۱۳۵۰ف تیر مقرر کی گئی ہے۔ اب تک متعدد مقامات سے شریک ہونے والے امیدواروں کی درخواستیں وصول ہو چکی ہیں۔ جو اصحاب ان امتحانوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں انھیں چاہیے کہ دفتر ادارہ سے مطبوعہ فارم (ایک آنے کا اسٹامپ روانہ کرکے) منگوالیں۔ اور خانہ پُری کرنے کے بعد فیس کے ساتھ جلد دفتر میں داخل کردیں۔

جملہ بہی خواہان اُردو سے توقع ہے کہ اپنی خواتین کو اِن امتحانات کی تیاری میں مدد دیں گے۔ اور اپنے جملہ ملازمین کو خواندہ بنا کر کم از کم اُردو دانی کے امتحان میں ضرور شریک کرائیں گے تاکہ ملک میں اُردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ اور اہلِ ملک کا معیارِ شائستگی و خواندگی بڑھے۔

تعلیم کا اِنتظام اور تقریریں

اِدارہ کے اُردو امتحانات کی تعلیم شہر حیدرآباد کی مختلف درسگاہوں (مثلاً درسگاہ ادبیہ بیگم بازار، درسگاہ لمعات شرقیہ بیرون یاقوت پورہ، مرکز ادبیہ سلطان پورہ وغیرہ) کے علاوہ اضلاع میں بھی پربھنی، کپل، گلبرگہ، کنگلی، کلیانی، ورنگل، خانہ پور، عثمان آباد وغیرہ میں دی جارہی ہے۔ دیگر مقامات میں بھی جو اصحاب اس قسم کا قومی کام کرنا چاہتے ہوں وہ اِدارہ سے مراسلت کریں تاکہ ان کو مفید مشورہ دیا جاسکے۔

ان تعلیمی انتظامات کے علاوہ گذشتہ سال کی طرح اس سال بھی حیدرآباد میں ایسی مفید تقریروں کا انتظام کیا گیا ہے جو ادارہ کے امتحانوں کی نصابی کتابوں کو پیش نظر رکھ کر مختلف ماہرین فن اصحاب سے دلوائی جارہی ہیں۔ ان تقریروں کا تفصیلی نظام نامہ اِسی ہفتہ مقامی اخباروں میں چھپ چکا ہے اور سب رس کے اِس شمارے میں صفحہ ۶۲ پر درج ہے۔

اِدارے کے شعبے

اِس دوران میں ادارہ کے کئی شعبوں کے جلسے ہوئے جن میں سے چند کا تذکرہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

شعبۂ زبان

اِس شعبے کا جلسہ ۲۰ فروری ۱۹۴۱ء مطابق ۱۹ فروردی ۱۳۵۰ف کو منعقد ہوا۔

حاضرین:۔ مولوی قاضی عبدالغفار صاحب، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مولوی سید محمد صاحب، ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب
مولوی ضیاء الدین احمد صاحب انصاری، مولوی نورالحسن صاحب
پنڈت دتّاتری دھر صاحب، نواب سیف علی خاں صاحب
مولوی عبدالقادر صاحب سروری، ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب

ف ۱ سابقہ جلسے کی روئداد پڑھی گئی اور اراکین نے اس کی توثیق فرمائی۔

ف ۲ مندرجہ ذیل امور بغرض تصفیہ پیش ہوئے:۔

(۱) حسب تحریک مولوی سید محمد صاحب بالاتفاق طے پایا کہ مردم شماری اور اُردو زبان کے متعلق موجودہ حالت کے پیش نظر حسب ذیل قرار داد منجانب ادارہ مقامی اخباروں میں شایع کرائی جائے:۔

"ادارۂ ادبیات اُردو مردم شماری کے موجودہ حالات کو پیش نظر رکھ کر اہل ملک کو خاص طور پر یہ مشورہ دینا ضروری سمجھتا ہے کہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے تمام لوگ جن کی مادری زبان اُردو ہے عام اس سے کہ وہ کسی فرقہ یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھیں کہ

مردم شماری کی خانہ پری میں مادری زبان صحیح طور پر لکھوائی جائے اس لئے کہ اردو زبان کی ترقی کا بہت کچھ انحصار آئندہ مردم شماری کے اعداد پر ہونے والا ہے۔ اسی طرح جن لوگوں کی مادری زبان اردو نہیں لیکن جو اردو زبان بولتے اور سمجھتے ہیں وہ بھی اس کا اندراج صحیح طور پر کرائیں اور احتیاط کے ساتھ دیکھ لیں کہ ان کے منشا کے مطابق اندراج ہوا ہے یا نہیں"۔

(۲) صحافتی الفاظ اور اصطلاحوں کے اردو ترجموں کے متعلق بالاتفاق طے پایا کہ اس سلسلے میں ذیلی مجلس کے اجلاس ہر فصلی ماہ کے پہلے پنجشنبہ کو دفتر پیام میں شام کے ۵ بجے منعقد ہوا کریں۔ مولوی قاضی عبدالغفار صاحب آئندہ سے اس مجلس کے داعی ہوں گے۔ نیز طے پایا کہ مولوی محمد سجاد مرزا صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج کو بھی اس جلسے میں مدعو کیا جائے۔

(۳) اراکین مجلس نے سرکاری اداروں وغیرہ کے مزید چند ایسے نام پیش کئے جو مدرسہ "کور وکر وکنگ" کی طرح ثقیل اور غیر مانوس ہیں مثلاً قانون انسداد بیرحمی بر جانوراں، دواخانہ امراض مرغی وغیرہ۔ بالاتفاق طے پایا کہ ایسے ناموں کی ایک فہرست تیار کی جائے تاکہ حکومت سرکار عالی اور متعلقہ محکموں سے ایسے ناموں میں مناسب اصلاح ترمیم یا تبدیلی کی استدعا کی جاسکے۔

(۴) دکنی محاوروں وغیرہ کے سلسلے میں بالاتفاق طے پایا کہ بغرض تشریح نواب سیف علی خاں صاحب کے پاس بھی فہرستیں روانہ کی جائیں تاکہ تشریح کا کام جلد ممکن ہوسکے۔

شعبۂ زبان کی ذیلی مجلس

پنجشنبہ ۶ مارچ کو ادارۂ ادبیات اردو کی ضمنی کمیٹی اصطلاحات جدیدہ کا جو جلسہ قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر پیام کے یہاں منعقد ہوا تھا اس میں قابل توجہ الفاظ کی دو فہرستیں پیش ہوئی تھیں۔ کمیٹی نے ان فہرستوں کے بعض اجزاء پر غور کیا اور بعض ترجمے وضع بھی کئے گئے لیکن آخر میں یہ رائے قرار پائی کہ ان تمام الفاظ کی پھر ایک فہرست مرتب کر کے تمام اراکین کمیٹی کی خدمت میں بھیج دی جائے تاکہ وہ کافی غور و فکر کے بعد آئندہ جلسے میں تشریف لائیں۔

اراکین سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس قسم کے اور بھی انگریزی الفاظ جمع کرتے رہیں گے جن کا ترجمہ ہونا چاہیے کام کو جلد ختم کرنے کے خیال سے شعبہ زبان کی اس کمیٹی کا آئندہ جلسہ ۱۶ اردی بہشت یوم پنجشنبہ کو بوقت (۵) بجے شام دفتر "پیام" میں منعقد ہوگا۔

شعبۂ امتحانات

مجلس امتحانات کا جلسہ ۱۷ فروری ۱۹۴۱ء بروز دوشنبہ (۹) بجے صبح محکمۂ نظامت تعلیمات میں مولوی سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔

صدر اور معتمد کے علاوہ مولوی سجاد مرزا صاحب، مولوی غلام ربانی صاحب، مس جیسی نندی صاحبہ، نواب میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا، ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ، پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی اور پروفیسر سید محمد صاحب ایم اے نے شرکت فرمائی۔

حسب ذیل امور طے پائے:-

(۱) آئندہ امتحانات کیلئے ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴ اگست ۱۹۴۱ء مطابق ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸ مہر ۱۳۵۰ف کی تاریخیں مقرر کی گئیں۔

(۲) امتحان خوش نویسی کے نصاب میں حسب ذیل کتابیں منظور ہوئیں۔

(۱) رسم خط آموز از مولوی اظہر الدین صاحب
(۲) اُردو رسم خط از مولوی سجاد مرزا صاحب (سرسری مطالعہ کیلئے)

(۳) ممتحنین کے متعلق طے پایا کہ حسب سال گذشتہ برقرار رکھے جائیں۔

(۴) اردو عالم میں خواتین کے نصاب امور خانہ داری کے لئے "علم خانہ داری" مرتبہ محترمہ محمودہ صدیقی (مطبوعہ ادارۂ ادبیات اُردو) منظور کی گئی۔

(۵) خطاطی کے نصاب میں (۱) "کتابت وطباعت" مرتبہ مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب (۲) "اردو رسم خط" مرتبہ مولوی سجاد مرزا صاحب کی منظوری دی گئی۔

(۶) تمام امتحانوں کے نصاب پر نظر ثانی کرنے کا کام سب کمیٹی کے سپرد کیا گیا اور مولوی سید محمد صاحب کا سب کمیٹی میں اضافہ کیا گیا۔

(۷) اُردو عالم کے پرچوں کا وقت گھٹا کر (۳) کی جگہ ۲½ گھنٹے مقرر کرنے کی تحریک پیش ہوئی، لیکن اس کو بھی سب کمیٹی کے سپرد کیا گیا۔

شعبۂ انسائیکلوپیڈیا

۵ مارچ ۱۹۴۱ء کو شام کے پانچ بجے ادارہ کے دفتر میں شعبہ انسائیکلوپیڈیا کا چوتھا جلسہ منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور نے صدارت کی اور معتمدین کے علاوہ عبدالمجید صاحب صدیقی، عبدالقادر صاحب صدیقی، سید محمد صاحب، ڈاکٹر رحمت اللہ خاں صاحب اور عبدالقادر صاحب سروری نے شرکت کی۔

انسائیکلوپیڈیا کے کام کی اہمیت اور وسعت کے لحاظ کرتے ہوئے کمیٹی نے بہ اتفاق آرا طے کیا کہ فیض محمد صاحب کے علاوہ سید بادشاہ حسین صاحب کو بھی معتمد مقرر کیا جائے۔

چونکہ عوام کو اس کام کی نوعیت کا صحیح اندازہ نہیں ہے اور مضمون لکھنے والوں کے پیش نظر کوئی نمونہ نہیں ہے اس لئے کمیٹی نے سفارش کی کہ سولہ یا چوبیس صفحات حسب ضرورت بطور نمونہ شائع کئے جائیں۔ اس نمونے میں مختلف علوم و فنون کے الفاظ ماہرین سے لکھوائے جائیں اور معتمد صاحبان ذوق و نظر کے پاس بغرض نقد و نظر بھیج کر ان کی آرا حاصل کی جائیں۔

کمیٹی نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ مختلف علوم و فنون کے الفاظ ماہرین علم و فن سے ہی لکھوائے جائیں تاکہ معلومات کی صحت کی ضمانت ہو سکے۔

سارے اراکین نے متفقہ طور پر طے کیا کہ ایشیا اور خصوصاً ہندستان سے متعلق الفاظ پر زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا جائے اور دوسرے ممالک کے الفاظ پر کم توجہ کی جائے کیونکہ ہر وہ ملک جو اس قسم کی حوالہ جاتی کتاب شائع کرتا ہے اپنے ملک کے الفاظ کو تفصیل کے ساتھ لکھتا اور دوسروں کو نظر انداز کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک کے الفاظ پر زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت اس وجہ سے بھی زیادہ ہے کہ ہماری زبان میں حوالہ جاتی کتابوں کے فقدان نے اُردو دانوں کی معلومات کو محدود کر رکھا ہے۔

اُردو انسائیکلوپیڈیا میں کام کرنے والے ماہرین علوم و فنون کی ایک مبسوط فہرست از بس ضروری ہے اور اس کے لئے کمیٹی نے سفارش کی کہ معتمدین کے علاوہ عبدالمجید صاحب صدیقی تاریخ کے کل شعبہ جات کی، ڈاکٹر راحت اللہ خاں عربی علوم کی عبدالقادر صاحب صدیقی اسلامی علوم کی اور سید محمد صاحب فارسی زبان و ادب کی الگ الگ فہرستیں مرتب فرمائیں۔

شعبۂ تالیف و ترجمہ

اس شعبے کا ایک جلسہ ۱۴ مارچ ۱۹۴۱ء کو منعقد ہوا جس میں پروفیسر فضل حق صاحب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور، عبدالقیوم خاں صاحب باقی سید محمد صاحب، میر حسن صاحب، سید بادشاہ حسین صاحب، سید ابوالفضل صاحب اور ظہیر الدین احمد صاحب (معتمد شعبہ) نے

شرکت کی حسب ذیل امور طے پائے :-

مولوی سید محمد صاحب اور مولوی سید بادشاہ حسین صاحب کو اس شعبہ میں شریک کرنے کی توثیق کی گئی۔ حسب ذیل مصنفین کی کتابوں کی اشاعت کا مسئلہ پیش ہوا اور ان کے متعلق حسب ضرورت مناسب تصفیے کئے گئے۔

بیرون ریاست کے مصنفین:- (۱) مجنوں گورکھپوری — مختلف کتب
(۲) غلام جیلانی برق کیمبل پور — دو کتابیں
(۳) عبدالوسیع عصری بنگلور — ڈرامے
(۴) محمد ابراہیم زبیری برار — اشتراکیت
(۵) محمود عثمانی دہلی — زندہ لاش
(۶) عزت رامپوری — افسانے
(۷) الطاف مشہدی لاہور — پریت کے گیت
(۸) ز خ ش مرحومہ — کلام

اضلاع کے مصنفین:- (۱) عطا کلیانوی — رباعیات
(۲) مراد علی طالع بھکنڈہ — درس عبرت
(۳) سید عبدالقادر چیتور — بالغوں کی پہلی کتاب
(۴) انور شاہ آبادی — نغمۂ معصوم
(۵) حمید اللہ خاں شیدا پربھنی۔ سوانح حیات بہادر یار جنگ
(۶) علی بن عبدالحبیب الحضرمی — سچ کا جادو
(۷) سید صادق — نواب عماد الملک کی تعلیمی سرگرمیاں

بلدہ کے مصنفین:- (۱) مرزا عصمت اللہ بیگ — فن کتابت و طباعت
(۲) ابوالقاسم سرور — مجموعۂ مضامین
(۳) ناصر علی ایم اے — معاشیات
(۴) اعجاز الحق قدوسی — بنات رسول
(۵) میر حسن ایم اے۔ تہذیب و تمدن کے اجزائے لطیف
(۶) شجاع احمد قائد — کشمش ثانی
(۷) شجاع احمد قائد — بات چیت
(۸) عزیزہ رضوانی — سراب
(۹) غلام جیلانی — گاندھی جی
(۱۰) علی شاکر — مضامین اور افسانے
(۱۱) جلال الدین اشک — از بسمت تا برلن

ان کے علاوہ حسب ذیل تجویزوں پر غور اور تصفیہ کیا گیا۔

(۱) بدر شکیب صاحب ترجمہ اے شارٹ ہسٹری آف سائنس

(۲) عزیز الحق صاحب بہترین مضمونوں اور نظموں کا انتخاب اور ترتیب

باقی صاحب نے اطلاع دی کہ کتاب اے مینِنگ اف لائف کا نصف سے زیادہ ترجمہ کر چکے ہیں لیکن اب وہ اس کی اشاعت کو پسند نہیں کرتے اس لئے وہ ایک دوسری کتاب ابی کامبی کی ایڈیا آف گریٹ پوئٹری کا ترجمہ کر کے ادارہ کو بغرض اشاعت دیں گے۔ پروفیسر فضل حق صاحب نے میاتھیو آرنلڈ کے مضمون آن پوئٹری کا جو ترجمہ کیا ہے اس کے متعلق طے پایا کہ رسالہ سب رس میں بالاقساط شایع کیا جائے۔

مسز نائیڈو کے حالات زندگی ترتیب دینے کی سفارش کی گئی۔

شاخیں

ادارے کے شاخیں برابر سرگرم عمل ہیں۔ پربھنی کی شاخ کی طرف سے طلبہ اُردو دانی، اُردو عالم، اُردو فاضل کے درس کا انتظام کر دیا گیا ہے اور پابندی سے اساتذہ اور طلبہ مصروف عمل ہیں۔ زنانہ مرکز بھی قایم کر دیا گیا ہے۔ محترمہ رحیم النسا بیگم صاحبہ صدر معلمہ نسوان اُردو پربھنی کی جدوجہد لایق صد آفریں ہے کہ موصوفہ نے باوجود اپنی شدید مصروفیات کے زنانہ مرکز قائم کرنے میں بڑی مدد کی اور اُردو دانی اور اُردو عالم کی طالبات کو تعلیم دینے کا بھی وعدہ کیا ہے اور موصوفہ کی کوششوں سے اُردو عالم میں چار اور اُردو دانی میں دس طالبات نے شرکت کی ہے امید ہے کہ زنانہ مرکز قایم ہو جانے سے اور بہت ساری طالبات شریک ہوں گی، دوسرا مرحلہ تعلیم بالغان کا انتظام تھا اور

جس کی شدید ضرورت تھی خدا کا شکر ہے کہ اس کی تعلیم اور طلبہ کی فراہمی کا بھی انتظام ہو گیا جس کے لئے مولنا سید محمد صاحب ذکی فاضل دیوبند صدر امام مسجد مہتاب علی شاہ پربھنی لائق تشکر ہیں کہ مولنا نے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیات کے طلبہ کی فراہمی اور ان کی تعلیم میں خاص طور پر حصہ لینے کا وعدہ فرمایا ہے اور درس کا آغاز ہو چکا ہے اب تک (۱۷) طلبہ شریک درس ہیں۔

ادارۂ ادبیات اُردو شاخ پربھنی کے دارالمطالعہ کے لئے مولوی محمد عبدالجلیل صاحب بی ایس سی، اے، جی مددگار کاٹن ریسرچ باٹنسٹ محبوب باغ پربھنی نے اپنے عزیز مولوی سید مرتضیٰ صاحب مرحوم گرداوری کی تقریباً (۵۰) عدد کتابیں عوام کے افادہ کے لئے مرحمت فرمائیں۔ جس کے لئے ہم موصوف کے مشکور ہیں۔

مولوی عبدالعلام صاحب اہلکار دفتر ماہر پنبہ صدر مزرعۂ زراعت پربھنی نے دو عدد مڈل عطا کرنے کا اعلان فرمایا ہے یہ مڈل ان طالبات کو دیئے جائیں گے جو زنانہ مرکز شاخ پربھنی سے اُردو دانی اور اُردو عالم میں بدرجۂ اول کامیاب ہوں گے جس کے لئے ہم موصوف کے مشکور ہیں۔

۲ مارچ ۱۹۴۱ء کی شب میں مارکٹ پویلین ہال میں شاخ پربھنی کی طرف سے ایک نہایت کامیاب مشاعرہ ہوا جس کے لئے حسب ذیل مصرع طرح دیا گیا تھا۔

آباد محبت کا ویرانہ ہوا آخر

مختلف شعراء مثلاً مسرت، شباب، پیکر، ماجد، معز، خیال اور سحر نے اچھی غزلیں سنائیں (مرسلہ حمید اللہ خاں شہید معتمد)

کتب خانہ

اس اثناء میں ادارہ کے کتب خانہ کو مولوی خواجہ اسد اللہ خاں صاحب کی طرف سے مہاراجہ بہادر کی تصنیف بزم خیال کی تینوں جلدیں اور مولوی ابوسعد سید اسمٰعیل صاحب رضا شوراپوری کے توسط سے مولوی عبدالحق صاحب محتسب بنولہ کی معطیہ پانچ قلمی کتب (۱) نکات مرزا بیدل (۲) رسالہ اصلاح مسلماناں (۳) رسالہ شرک بدعت (۴) دیوان بیدل (۵) رسالہ ظہوری اور تین مطبوعہ رسائل زیارت قانع۔ (۲) ام العرفان اور (۳) عیسیٰ مرے اور چند مختلف کاغذات بطور عطیہ وصول ہوئے جس کے لئے ان سب اصحاب کا نواب مرزا سیف علی خاں صاحب ناظم اعزازی کتب خانہ شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ادارتِ سب رس

ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے پرانے رفیق صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب میکش گزشتہ ماہ سے مجلس ادارت میں شریک نہیں ہیں۔ یہ ماہ نامہ دراصل انہی کی خواہش، جذبۂ عمل اور ابتدائی اخراجات سے جاری ہوا تھا لیکن چند ماہ بعد جب ان کا سرمایہ ختم ہو گیا اور انھوں نے خواہش کی کہ اس کو بالکلیہ ادارے کی مِلک قرار دے دیا جائے تو ادارہ نے از سرِ نو اس کی بقا کا انتظام کیا۔ بعد کو جب میکش صاحب سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں کی وجہ سے اس کام کے لئے زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے تو یہ کام ایک مجلس ادارت کے تفویض کیا گیا جو اَب تک یہ کام انجام دے رہی ہے۔ اس اثناء میں میکش صاحب نے مصروفیتوں کی بناء پر بارہا خواہش ظاہر کی کہ ان کا نام مجلس ادارت سے خارج کر دیا جائے اس لئے بادل ناخواستہ گذشتہ مہینے کے پرچے سے اُن کا نام شریک رسالہ نہیں کیا جا رہا ہے آئندہ سے سب رس کے بارے میں جملہ مراسلت مہتمم مدیر سب رس رفعت منزل خیریت آباد کے پتے سے کی جائے۔

اُردو امتحانات کی تقریریں

ادارۂ ادبیات اُردو کے امتحانات اُردو عالم و اُردو فاضل وغیرہ جو ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ مہر ۱۳۵۰ف کو منعقد ہوں گے اُن کے سلسلے میں ادارے سے حسب ذیل تقریروں کا انتظام

کیا گیا ہے جن میں امیدواروں کے علاوہ دوسرے اہل ذوق بھی شریک ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ ان سے نصاب کے علاوہ علم و ادب سے متعلق عام دلچسپ معلومات کی اشاعت بھی مقصود ہے۔

عنوانات	مقررین	تاریخ
۱۔ اُردو ادب کا قدیم دور	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۴ اپریل
۲۔ اردو ادب کا درمیانی دور	مولوی سید محمد صاحب	۶ ر ر
۳۔ جدید اُردو ادب	مولوی عبدالقادر سروری صاحب	۱۱ ر ر
۴۔ اُردو کے ڈرامے	مولوی سید بادشاہ حسین صاحب	۱۸ ر ر
۵۔ اجتماعی زندگی	مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب	۲۲ ر ر
۶۔ اُردو کے ناول و افسانے	مولوی عبدالقادر سروری صاحب	۲۵ اپریل
۷۔ معاشیات کے ابتدائی مسائل	مولوی میر ناصر علی صاحب	۲ مئی
۸۔ روزمرہ کی سائنس	مولوی فیض محمد صدیقی صاحب	۹ ر ر
۹۔ جذبات اور احساسات	مولوی صلاح الدین صاحب	۱۶ ر ر
۱۰۔ ادبی تنقید	مولوی عبدالقیوم خاں صاحب باقی	۲۳ ر ر
۱۱۔ اردو کے عناصر اربعہ	مولوی سید محمد صاحب	۳۰ ر ر
۱۲۔ فن شعر	مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب	۶ جون
۱۳	ر ر ر ر	۱۳ ر ر
۱۴	ر ر ر ر	۲۰ ر ر
۱۵۔ آج کل کے ادبی رجحانات	مولوی میر حسن صاحب یا مولوی مخدوم محی الدین صاحب	۲۷ ر ر

اِدارہ کی سرگذشت

ادارۂ ادبیات اردو کی دس سالہ سرگذشت (مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد)

کے اب چند ہی نسخے دفتر میں رہ گئے ہیں۔ اس کتاب نے اُردو دنیا میں کافی شہرت حاصل کی اور ادارہ کی خاموش مصروفیتوں سے متعلق واقفیت پیدا کرنے کے علاوہ اُردو زبان اور ادب کی ٹھوس خدمت کرنے کے طریقوں سے بھی اہل اُردو کو واقف کیا۔ جن اصحاب کو اردو کی تاریخ سے دلچسپی ہے وہ یہ کتاب ضرور مطالعہ کریں۔ اسی لئے تین سو سے زیادہ صفحات کی کتاب کی قیمت صرف ۱۲ر رکھی گئی ہے۔

اس کتاب کے متعلق اور ادارہ کی مصروفیتوں کے نسبت ہمارے معاصرین نے جو رائیں ظاہر کیں ان کے چند اقتباس یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

"حیدرآباد میں ادبیات اردو کے نام سے ایک مجلس چند سال سے قایم ہے جس نے نہایت قلیل عرصے میں مہتم بالشان کام کیا ہے اس مجلس کی زیر نگرانی ادبی ماہنامہ "سب رس" بھی جاری ہے متعدد کتابیں انجمن شایع کرچکی ہے۔ اور یہ سرگذشت درحقیقت اس ادارے کے کارناموں کی تفصیل ہے۔ ہندوستان بھر میں جہاں کہیں بھی چھوٹی بڑی علمی انجمنیں قایم ہوں یا جو لوگ اس سلسلے میں کام کرنا چاہیں انھیں یہ کتاب منگوا کر ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ تاکہ ان میں بھی کام کرنے کا جوش اور ہمت پیدا ہو۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پنجاب میں اس قسم کی ایک بھی انجمن قایم نہیں۔ اس سے قبل میاں بشیر الدین احمد صاحب (ناظم) مدیر "ہمایون" نے انجمن ترقی اُردو کی شاخ لاہور میں قایم کی تھی تو خیال تھا کہ اس سلسلے میں کچھ عملی کام بھی ہوگا۔ لیکن اب تک کوئی قابل ذکر نتیجہ نہیں نکلا اور انجمن ترقی اردو پنجاب ایک قرار دادیں منظور کرنے والی انجمن ہو کر رہ گئی ہے جس کا سال بھر میں ایک آدھ پرائیویٹ جلسہ ہوجائے یا سال بھر میں ایک دو آرٹیکل محترم میاں صاحب تحریر فرما دیا کریں۔ ضرورت ہے کہ انجمن ترقی اُردو سرگذشت ادارۂ ادبیات اردو کا مطالعہ کرکے اس سے بھی بڑے پیمانے پر کام کی ابتدا کرے۔"

نیرنگ خیال لاہور مارچ ۱۹۴۱ء

"ادارۂ ادبیات اردو سنہ ۱۹۳۱ء میں اردو زبان اور ادب کی توسیع وحفاظت کے پیش نظر قایم کیا گیا تھا۔ اور اس دس سال کے عرصے میں ادارۂ مذکور نے نہایت ہی قابل رشک کام کیا ہے سرگزشت اس ادارہ کے گذشتہ دس سال کے کام کی تفصیل ہے۔

اس وقت اردو کی توسیع وحفاظت کے مرکز دو ہیں۔ پنجاب اور حیدرآباد دکن۔ ادارہ ادبیات اردو کی گذشتہ دس سالہ کاروائی سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خاموشی اور استقلال سے کام کرنے والے ایسے ہی چند ادارے اور ہوں تو اُردو نہ صرف ہندوستان کی قومی زبان بن سکتی ہے بلکہ دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں شامل ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ دس سال کی قلیل مدت میں ادارے نے مختلف موضوعوں پر (۶۹) کتابیں شایع کی ہیں۔ اور سرگذشت ادارہ ستّرویں کتاب ہے۔ ان اہم تر مطبوعات میں تاریخ، تاریخ ادب، تذکرہ، تنقید، نظم ونثر، افسانے ناول اور ڈرامے غرض کہ ہر شعبۂ فن کی کتابیں شامل ہیں۔ اور اکثر کتابیں قابل قدر اور اُردو ادب میں ایک مفید اضافہ ہیں۔

سرگذشت ادارۂ ادبیات اُردو اس لحاظ سے بے حد قابل قدر چیز ہے کہ اس میں ایک ایسے ادارے کی دس سالہ زندگی کی مکمل تفصیل موجود ہے جس نے قابل رشک کام کیا ہے جو لوگ اُردو زبان وادب کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب ایک رہنما کا کام دے گی اور وہ ادارۂ ادبیات اُردو کی طرز پر زبان وادب کی خدمت خوش اسلوبی سے کر سکیں گے۔"

شیرازہ لاہور۔ ۱۶ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

"تقریباً نو سال تک خاموشی کے ساتھ کام کرنے کے بعد اب ادارہ کی خدمات کا دلچسپ خاکہ ان اوراق میں پیش کیا گیا ہے حیدرآباد میں اردو زبان کی توسیع وترقی کے لئے ادارۂ ادبیات اردو جو کچھ کام کرتا رہا ہے اس سے اب ملک بخوبی واقف ہو چکا ہے ادارہ کی یہ سوانح عمری جو سرگذشت کے نام سے شایع کی گئی ہے اس کی مصروفیات کے ہر شعبہ پر حاوی ہے اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ نو سال کی بڑھتی ہوئی مصروفیت کے ادارے نے اتنے شاندار نتائج حاصل کر لئے ہیں کہ اب حیدرآباد میں اس کی مرکزی حیثیت مسلمہ ہو گئی ہے۔ ان اوراق میں ادارے کے ہر شعبے کی خدمات کے نتائج کو پیش کیا گیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ ملک کے بہت سے "انجمن باز" ان اوراق کا مطالعہ کرکے اس... حقیقت سے روشناس ہو سکتے ہیں کہ محض اخباری پروپگنڈے سے زیادہ موثر ادارات کا ٹھوس کام ہوتا ہے جو بجائے خود سب سے زیادہ موثر اور دور رس پروپگنڈا ہے۔ ادارۂ ادبیات اُردو نے ملک میں جو حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اس کی بنیادیں اس لئے مضبوط ہیں کہ اس مرکز پر ٹھوس کام کیا جا رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ادارۂ ادبیات کو ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی زیادہ تائید حاصل ہے اور اس لئے اس کا دائرہ عمل زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ سرگذشت کے صفحات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ادارے نے نہ صرف بہت سی اچھی کتابیں شایع کی ہیں بلکہ حیدرآبادی ارباب قلم کی برادری میں ادبی ذوق کو صحیح سمت میں بہت آگے بڑھا دیا ہے۔ نو سال کی مختصر مدت میں تقریباً (۷۲) کتابوں کی اشاعت کے یہ معنی ہیں کہ ادارہ تقریباً ۸ کتابیں ہر سال شایع کرتا رہا ہے۔ تاریخی شعبہ میں ادارے نے ملک کو اس کی قدیم تاریخ سے روشناس کرنے کی بہت قابل تحسین کوشش کی ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ سلسلہ اُردو زبان میں دکن کی تاریخ کا بہترین مواد جمع کر دے گا۔

ہم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اور آپ کے مخلص

رفقا کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انھوں نے اس ادارے کو اردو زبان میں ادب کے احیاء کا ایک مضبوط مرکز بنا دیا ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ ملک کی عام رائے ادارے کی جدوجہد میں اس کی زیادہ سے زیادہ تائید کرے گی۔

اردو کے امتحانات کا جو نیا سلسلہ ادارے نے شروع کیا ہے وہ ہم امید کرتے ہیں کہ اس کو عام رائے سے اور بھی زیادہ قریب کر دے گا اور اس طرح اس کی تحریکات کو عوام تک پہنچانے کے نئے راستے پیدا ہو جائیں گے۔ **پیام** حیدرآباد۔ ۲ر فروردی ۵۰ف

"تین سو صفحات سے زاید کی یہ نفیس چھپی ہوئی مجلد و مصور کتاب ادارۂ ادبیات اردو کی سرگرمیوں کا نہایت روشن مرقع ہے۔ اس کتاب میں ادارۂ ادبیات کے مختلف شعبوں اور مختلف کارکنوں کے متعلق دلچسپ معلومات ملتی ہیں اس کے علاوہ اندازہ ہوتا ہے کہ نوجوانان دکن کا یہ ادارہ کتنا منظم اور بلند پایہ ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی سرگذشت پڑھنے کے قابل ہے اور حوصلہ افزائی اور تقلید کے بھی۔ اہل اردو کو ایسے ادارے کی دل کھول کر سرپرستی کرنی چاہیے **ہمایوں** لاہور۔ مارچ ۱۹۴۱ء

ادارہ کی مطبوعات

اس مہینے ادارے کی طرف سے دو کتابیں رسائل طیبہ اور انوار شایع ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں ایک عرصے سے زیر طبع تھیں۔ اور کوئی نہ کوئی بات ایسی پیدا ہو گئی کہ یہ اس سے قبل شایع نہ ہو سکیں۔

رسائل طیبہ یہ کتاب (۳۱۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ اور محترمہ طیبہ بیگم صاحبہ مرحومہ کے مضمونوں تقریروں اور خطوں کا مجموعہ ہے مرحومہ طیبہ بیگم جس پایہ کی ادیب اور اہل ذوق تھیں اس کا اندازہ محض اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ان کا ایک ناول "حشمت النساء" علامہ عبداللہ یوسف علی کے مقدمہ اور دوسرا ناول "انوری بیگم" مولوی ڈاکٹر عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو کے مقدمہ کے ساتھ شایع ہوا۔

مرحومہ نے حیدرآباد میں علم و ادب اور تہذیب و معاشرت کی ترقی و اصلاح میں بڑے بڑے مفید کام کئے ہیں۔ ان کی زندگی کیسی سرگرمیوں اور خلق خدا کے فلاح و بہبود میں گزری اس کا اندازہ ان مفید اور اخلاقی و اصلاحی مضامین اور تحریروں کے مطالعہ سے ہو سکے گا جو اس مجموعہ "رسائل طیبہ" میں شامل ہیں۔ کتاب میں

... ...

....

ان کی تحریروں کے عکس بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ خواتین کی علمی، سماجی اور مذہبی اصلاح و بہبودی کا ضامن ہوگا۔

انوار حضرت علی اختر ..... کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شایع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پُر گو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر اُن کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوشؔ کے کوئی شاعر اُن کی ٹکر کا نہیں۔

۱۶۸ صفحات قیمت عہ

اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر منزل خیرت آباد سے شایع ہوا

وقت کی دو اہم چیزیں

نازیت ۔ مصنفہ شاہد حسین رزاقی۔ مصنف نے بتایا ہے کہ نازیت اور ہٹلر یہ ہم معنی لفظ نہیں ہیں یہ سمجھنا کہ نازیت کا تخیل ہٹلر کی دماغی پیداوار ہے اور ہٹلر نہ رہے تو نازیت خود بخود فنا ہو جائے گی بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہٹلر نازیت کی پیداوار ہے اور یہ نظریہ دراصل ایک جدید ارتقاء کا نتیجہ ہے جسے ہٹلر نے پروان چڑھایا۔

مصنف نے آخر میں نازیت کے اچھے اور برے پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نازیت کا موجودہ ارتقاء ایک بحرانی کیفیت میں ہوا ہے اس لئے ہٹلر کے وجود سے قطع نظر بھی اس کا دیرپا ہونا مشکل ہے قیمت (۸؍)

اسلامی ممالک کی سیاست ۔ مصنفہ عشرت علی صدیقی۔ مصنف نے اس کتاب میں مختلف اسلامی ملکوں کے سیاسی اور تاریخی ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ جنگ عظیم سے پہلے مصر، ٹرکی، عراق، عرب، ایران وغیرہ کی کیا حالت تھی جنگ عظیم کے اختتام پر ان کی سیاسی اہمیت کیا باقی رہ گئی۔

مصنف نے یہ بھی بتایا ہے کہ جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد ان ملکوں میں کس قسم کی سیاسی تحریکیں اٹھیں ان کا کیا حشر ہوا اور موجودہ وقت میں ان کی سیاسی اور جنگی پوزیشن کیا ہے۔

اسلامی ملکوں کی موجودہ سیاست اس وقت کا نہایت اہم مسئلہ ہے اور ایسے وقت میں جب کہ ہر شخص اسلامی ممالک کی موجودہ سیاست کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے یہ کتاب بہت اہم ہے۔ قیمت عہ

قومیت اور بین الاقوامیت (زیر طبع)، **بحرالکاہل کی سیاست** (زیر طبع)

صدر دفتر ۔ مکتبہ جامعہ قرول باغ نئی دہلی

شاخیں ۔ (۱) مکتبہ جامعہ جامع مسجد دہلی (۲) مکتبہ جامعہ امین آباد پارک لکھنؤ (۳) مکتبہ جامعہ بیرون لوہاری دروازہ لاہور (۴) مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

ایجنسیاں

۱۔ کتب خانہ عابد شاپ حیدرآباد دکن۔ ۲۔ سرحد بک ایجنسی بازار قصہ خوانی پشاور

مقدمہ "زندگانیٔ محمدؐ"

عہدِ حاضر کی ایک بے مثال کتاب

"زندگانی محمدؐ" علامہ محمد حسین ہیکل وزیر تعلیم مصر کی ایک لاجواب تالیف ہے۔ اس کتاب کی قدر و عظمت کا اندازہ اِس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے پہلے ایڈیشن کی تین ہزار جلدیں پریس ہی میں فروخت ہو گئی تھیں اور باقی سات ہزار جلدیں صرف تین ماہ کے اندر اندر ختم ہو گئیں۔ پھر ایران میں اس کا فارسی ترجمہ ہوا اور وہاں بھی ہزارہا کی تعداد میں شائع ہوا۔ اب دفتر امت مسلمہ امرتسر نے مقدمۂ زندگانی محمد کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں قرآن مجید کی ترتیب اور پیغمبر اسلام کی مقدس زندگی پر اہلِ مغرب کے تمام اعتراضات کے نہایت مدلل اور معقول جواب دئے گئے ہیں۔ اس کے متعلق مشاہیر و جرائد کے چند تبصروں کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

۱۔ زندگانی محمدؐ ایک قابل قدر تالیف ہے (اعلیٰ حضرت فرمانروائے مانگرول)

۲۔ زندگانی محمد کا مقدمہ عالمانہ معلومات سے پُر ہے میں نے اِس کتاب کو دیکھتے ہی شوق سے پڑھا اور دلچسپ پایا (سر عبد القادر)

۳۔ بہت اچھی کتاب ہے اور بہت اچھا ترجمہ (ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی)

۴۔ جہاں تک مغرب زدہ گروہ کی پریشان خیالیوں کا تعلق ہے، مصنف کی کوششیں مستحقِ اجر و قابل داد ہیں (مولانا عبد الماجد دریا بادی)

۵۔ علامہ محمد حسین ہیکل کی کتاب (زندگانی محمد) یقیناً ممتاز درجہ رکھتی ہے (طلوع اسلام)

۶۔ مغرب زدہ نوجوانوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ واقعی مفید ثابت ہو گا (سب رس)

۷۔ کتاب بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھی گئی ہے۔ مسلمانوں کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے (شاعر)

۸۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے اس کا مطالعہ ازبس مفید ہے (جامعہ)

۹۔ جو نوجوان اسلام اور پیغمبر اسلام کو اہل مغرب کی نظر سے دیکھتے ہوں، ان کے لئے اس پاکیزہ کتاب کا مطالعہ ضروری ہے (حمایت اسلام)

۱۰۔ ہندستان کے اسلامی لٹریچر میں غالباً اس موضوع پر یہ پہلا مضمون ہے، جو اِس جامعیت اور اختصار کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے (پیام نسواں)

لکھائی چھپائی اور کاغذ صاف ستھرا۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات تیرہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر ایک نسخہ طلب کیجئے۔

ملنے کا پتہ
دفتر امت مسلمہ امرتسر
(پنجاب)

(ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں)

نام کتاب	صفحات	روپیہ	آنہ	پائی
من کی بپتا	۸۰	•	۸	•
سرگذشت غالب ...	۶۴	•	۸	•
نظام الملک ...	۴۰	•	۴	•
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	•
دکن نمبر (۷۸ تصاویر)	۱۶۸	۲	•	•
ارمغان جذب ...	۱۲۰	•	۱۲	•
سوتیلی ماں ...	۴۸	•	۴	•
سر سید احمد خاں ...	۱۶	•	۲	•
سر سالار جنگ ...	۴۸	•	۶	•
مغربی تصانیف کے اردو تراجم ..	۱۴۵	۱	۴	•
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	•
اقبال نمبر ...	۱۶۸	۱	۴	•
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	•	•
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	•
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	•
دادا بھائی ...	۱۶	•	۲	•
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	•	•
ارسطو جاہ ...	۶۵	•	۶	•
عماد الملک ...	۴۰	•	۶	•
اردو دانی کی پہلی کتاب ...	۵۶	•	۲	۶
" دوسری کتاب ...	۵۶	•	۴	۶
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	•	•
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	•
فن تقریر ...	۹۶	•	۸	•
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	•	•
پانی کی کہانی ...	۴۸	•	۶	•
رسایل طیبہ ...	۳۱۲	۲	۸	•
سلک گوہریں ...	۴۰	•	۴	•

نام کتاب	صفحات	روپیہ	آنہ	پائی
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	۱		
ورق سورتھہ اور اسکی شاعری...	۱۸۴	۱		
ھوش کے ناخن ...	۹۴	۱	•	•
یوسف ھندی قید فرنگ میں ...	۸۹	۱	•	•
ٹیگور اور ان کی شاعری ...	۱۲۸	۱	۴	•
مناع سخن ...	۱۲۴	•	۱۲	•
کیف سخن ...	۱۲۲	•	۱۲	•
بادۂ سخن ...	۱۲۷	•	۱۲	•
سراج سخن ...	۱۵۲	•	۱۲	•
ایمان سخن ...	۱۲۰	•	۱۲	•
فیض سخن ...	۱۴۲	•	۱۲	•
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر..	۵۰۰	۵	•	•
" دوم (۵۰) " ..	۴۳۲	۵	•	•
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	•	•
نذر ولی ...	۲۴۸	۲	۸	•
گریہ و تبسم ...	۱۹۲	۲	•	•
مشاھیر قندھار دکن ...	۱۸۴	۱	•	•
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	•	•
مدارس میں اردو ...	۱۹۶	۱	۸	•
محرم نامہ ...	۱۱۲	۱	•	•
نذر دکن ...	۱۰۴	۱	۴	•
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸	•
عاصم	۲۰۰	۱	۴	•
دفتری معلومات ...	۵۶	•	۶	•
آبدوز کشتیاں اور سرنگ ...	۴۸	•	۶	•
اردو مثنوی کا ارتقاء ...	۱۴۳	۱	۱۲	•
نمود زندگی ...	۲۱۲	۱	۸	•
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	•	۱۲	•

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

جلد ۴ — بابت فروری سنہ ۱۹۴۱ء — شمارہ ۲

سب رس کے مقاصد و قواعد

۱) "یہ ادارۂ ادبیات اردو" کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اُردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی

۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابلِ اشاعت متصور نہ ہوں گے۔

۳) اُردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوقِ صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اُردو میں منتقل کر کے اُردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا۔

۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے

۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

ارباب ادارۂ ادبیات اردو سنہ ۱۹۴۰ع

یہ تصویر اردو امتحانات کے جلسہ تقسیم اسناد و انعامات کے موقع پر بمقام ٹاؤن ہال باغ عامہ بتاریخ ۸ جنوری سنہ ۱۹۴۱ع لی گئی

AZAM STEAM PRESS

فن تقریر

ادارۂ ادبیات اردو کے کاموں کی ہم نے ہمیشہ تعریف کی ہے۔ لیکن ایک مرتبہ یہ شکوہ بھی سن لیجئے کہ حال ہی میں ادارہ نے "فن تقریر" پر ایک دلچسپ کتاب شائع کرکے ہمارے ملک کے لڑکوں کی لیڈری کے اسلحہ خانے میں ایک ایسا اضافہ کردیا کہ اگر کہیں واقعی ہمارے تقریر کرنے کے شوقین نوجوانوں اور نوجوان لیڈروں نے اس کتاب سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو اس ملک کی تقریروں سے تھکی ہوئی دنیائے سیاست میں لیڈریت کی کچھ اور زیادہ ہلچل مچ جائے گی! —— حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کتاب کی اشاعت سے اس قدر گھبرائے ہوئے ہیں کہ اگر موقعہ ملا تو اس کا ایک جواب اور رد لکھ کر شائع کریں گے۔

"فن تقریر" کے متعلق اس کتاب کی اشاعت میں یہ بے بنیاد مفروضہ بھی مضمر ہے کہ گویا مولف کی رائے میں ہمارے لیڈروں اور نوجوانوں کو ابھی اس فن میں مزید تربیت کی ضرورت ہے۔ مگر ہمارے ملک کی لیڈریت کے لئے یہ گمان توہین آمیز ہے!

اس کتاب میں کسی مولف یا مصنف کا نام درج نہیں کیا گیا البتہ اس کا "دیباچۂ عمومی" سید محی الدین قادری زور صاحب کا لکھا ہوا ہے، اس لئے اس خطرناک کتاب کی اشاعت کے متعلق بازپرس ان ہی سے ہونی چاہئے! اگر اس قسم کی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا تو ادارۂ ادبیات اردو "لیڈریت" کے شعبہ کے لئے ایک اچھا خاصا کتاب خانہ مرتب کردے گا اور لیڈروں کی دنیا میں ہر قسم کے لیڈرانہ مفاسد کا کچھ اور اضافہ ہوجائے گا!

افسوس ہے کہ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے ہم اس خطرناک کتاب کے مندرجات پر بالتفصیل تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں تاہم اس کے بعض عنوانات پر "سرراہ" کچھ عرض کر دینا ضروری ہے۔ مثلاً پہلے ہی باب میں لکھا گیا ہے کہ "ایک نہایت مفید وصف جو کسی مقرر میں ہونا چاہئے . . . . وہ فہم عامہ ہے" حالانکہ ہندستان میں ہر شخص جانتا ہے کہ ایک جادو بیان لیڈر اس صفت سے جس قدر زیادہ محروم ہوگا اسی قدر زیادہ اس کی تقریر موثر اور بلیغ ہوسکتی ہے! کوئی بڑا لیڈر اپنے "فہم خاصہ" کو کبھی "فہم عامہ" سے آلودہ کرنا گوارہ نہیں کرسکتا اور اگر وہ ایسا کرے تو اس کی لیڈری بہت خستہ ہوجاتی ہے!

پھر ایک جگہ لکھا ہے کہ :-

> اصل مقرر جب کھڑا ہوگا تو ایک سرگرم دل والے
> شخص کی طرح کھڑا ہوگا، بغیر مطلب کے وہ نہ بولے گا
> اور جب منہ کھولے گا تو اپنے پورے دل اور روح کو اپنی
> گفتگو میں مستغرق کردے گا۔

حالانکہ اگر صحیح طور پر لکھا جاتا تو یہ فقرہ اس طرح لکھا جاتا کہ :-

> " اصلی مقرر جب کھڑا ہوگا تو ایک اس چالاک
> سوداگر کی طرح کھڑا ہوگا جو ہراج میں بولیاں بلواتا ہے،
> بغیر مطلب کے وہ بولے گا اور بولے چلا جائے گا اور
> جب منہ کھولے گا تو زیادہ سے زیادہ کھولے گا تاکہ
> اگر ضرورت ہو تو اس کے حلق میں تمام حاضرین سما جائیں

ایک صفحے پر یہ عنوان قایم کیا گیا ہے کہ

" طالب علم کو محنتی ہونا چاہیے "

اس ایک ہی عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف کے

نظریات کس قدر غلط اور دور از کار ہیں جس کو یہ بھی معلوم نہیں کہ
صرف " فن تقریر" بھی تو ایک ایسا فن ہے جس میں کسی قسم کی محنت
کی ضرورت نہیں، سوائے اس کے کہ موٹے موٹے الفاظ کو گھمانے اور
پھرانے اور دوڑانے کی ترکیب معلوم ہو اور حلق کی رگیں مضبوط ہوں!
اگر مقرر کو یہ نکتہ معلوم ہے کہ وہ ہر غلط بات کو اس شدت کے ساتھ
بیان کرے کہ سامعین مرعوب ہو کر اس کو صحیح ماننے پر مجبور ہو جائیں
تو پھر اس کی فنی قابلیت میں کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا! ——
"محنت" "منطق" اور "غور" کی شرطیں جو اِس کتاب کے
مولف نے قائم کی ہیں، بالکل پرانے زمانے کی باتیں ہیں!

چوتھے باب میں تقریر کرنے کے مختلف طریقے بتائے گئے ہیں مثلاً:-

"اول لکھا ہوا پڑھنا - دوم اول لکھ لینا پھر یاد کر لینا
دیکھے بغیر تقریر کرنا، سوم مضمون کا خاکہ تجویز کر کے
دل میں رکھ لینا اور ادا کرنے کے وقت اور موقع پر
بھروسہ کرنا - وغیرہ وغیرہ -

اسی کے ساتھ جسم کی حرکتوں کے قلمی نقشے بھی بتائے گئے ہیں - یعنی
مقرر کی "نرت" کو بھی فنی حیثیت سے منضبط کرنے کی کوشش کی
گئی ہے ——— جہاں تک تقریر کرنے کے مندرجہ بالا طریقوں
کا تعلق ہے ہم سمجھتے ہیں کہ مندرجہ بالا تفصیلات دور از کار ہیں
بولنے کا مضبوط ارادہ کر کے بے محابا بولے جانا بالکل کافی ہے البتہ
نرت کے طریقے ضرور مفید ہیں، چہرہ کا اتار چڑھاؤ اگر ڈاڑھی ہے تو
اس کے مختلف زاویے اور گوشے اگر مونچھیں بڑی ہیں تو ان کی جنبش
شرقاً غرباً یا جنوباً شمالاً جوش کی حالت میں بعض اوقات ہونٹوں
کی لرزش، ہاتھوں کی حرکت، انگوٹھے کے اشارے آنکھوں کی
گردش، جسم کا گھماؤ اور رقص غرض یہ کہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ
ان کے زیادہ مفصل خاکے اس کتاب میں درج ہوتے تو اس
موضوع کی بہتر طریقہ پر تکمیل ہو سکتی ——— ہم امید کرتے ہیں کہ
کم از کم دوسرے ایڈیشن میں ابتدائی ابواب کے غیر ضروری مندرجات
سے قطع نظر کر کے "نرت" کے طریقوں پر زیادہ زور دیا جائے گا تاکہ
اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ہر نو خیز مقرر بھی الفاظ اور مطالب
کی کمی کو اپنے ہاتھوں، انگلیوں، آنکھوں اور ٹانگوں کی اضطراری
کیفیتوں سے پورا کرنے پر قادر ہو جائے ——— لیڈرانہ خطابت
کا اصل راز یہی ہے اور "فن تقریر" کے مولف نے اگر اس نکتہ پر
غور نہیں کیا ہے تو وہ اب غور کریں!

اس تمام "مخالفانہ" تنقید کے بعد بھی اگر کوئی صاحب
اس کتاب کو پڑھنا چاہیں تو ادارۂ ادبیات اردو یا سب رس
کتاب گھر - خیریت آباد سے طلب فرما سکتے ہیں - قیمت صرف ۱۲ ؍ ہے
لیکن اگر طلبہ اور لیڈروں کے لئے اس کتاب کا پڑھنا قانون
تحفظ حیدرآباد کے تحت ——— ممنوع قرار دیا جائے تو ہم اس
امتناع کی تائید کرنے پر اپنے کو آمادہ پاتے ہیں!!

قاضی عبدالغفار

پیام ۲۴ جنوری ۱۹۴۱ء

گداگری

سب رس ریڈیو نمبر میں گداگری پر ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں عام اور معروف انداز پر گداگری کو معاشی بیماری ثابت کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ جہاں تک نفس مضمون کا تعلق ہے صاحب مضمون کی رائے سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس قسم کی مضمون نگاری سے مضمون نگار کا ارادہ اور نیت کیا ہوتی ہے۔ آیا قوم کو صرف برائیوں سے آگاہ کرنا۔ یا یا اصلاح اور علاج! جہاں تک صرف آگاہی کا تعلق ہے۔ کون تعلیم یافتہ انسان ہے جو ان باتوں سے واقف نہیں لیکن اصلاح اور علاج اگر مقصود ہے تو ہمارے ملکی ریفارمروں کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ کسی چیز کی برائیوں کے اظہار سے کبھی بھی مطلب برآری نہیں ہو سکتی۔

بدقسمتی سے غلامی میں ریفارمروں کی حسیات میں آزاد انسان کے برعکس یہ نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ نہ تو قلم اٹھانے سے پہلے کوئی خاص نصب العین مقرر کرتے ہیں۔ نہ ہی قوم کی برائیوں کو اپنی برائیاں سمجھ کر خفت اور ندامت محسوس کرتے ہیں تاکہ ان خرابیوں کو دور کرنے کا احساس بھی شدت کے ساتھ پیدا ہو بلکہ مدعا بن جائے۔ البتہ برائیوں کا شمار اور بیان ان کے طریق کار کی انتہائی حد بن کر رہ جاتی ہے۔ نتیجہ میں قوم میں خوبیوں کا اضافہ تو کجا اور برائیوں کی زیادتی ہوتی چلی جاتی ہے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ اگر اولاد نالایق یا شاگرد کام چور ہے تو کیا باپ اور استاد صرف ان کی برائیاں کرتا پھرے گا۔ یا محنت اخلاق اور یگانگت کے ساتھ ان کی فطرتی استعداد اور مادہ قبولیت کو غلط راستے سے ہٹا کر سیدھے راستے پر ڈالنے کی سعی کرے گا۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو یہی طریق کار ہمارے مصلحین کو اختیار کرنا چاہیے۔ بشرطیکہ وہ قوم سے برائیاں دور کرنے کی نیت بھی رکھتے ہیں۔

یہاں اس بات کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ استعداد مادہ قبولیت، ذہنیت اور حسیات کی طاقتیں دراصل بھلائی اور برائی میں ایک ہی ہوتی ہیں۔ پارہ کی ماہیت اور اصلیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن جب وہ اعتدال پر ہوتا ہے تو صحت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اوپر اور نیچے ہونے پر انتہائی گرمی اور انتہائی سردی کی کیفیات کو ظاہر کرتا ہے اسی طرح انسانی فطرت بھی نیک اور بد قالبوں میں ایک ہی ہوتی ہے فرق صرف درجۂ اعتدال پر رہنے اور اوپر یا نیچے ہو جانے کا ہوتا ہے۔ قوت خشم اگر اعتدال پر ہو تو شجاعت، کرم، عالی ہمتی، حلم اور بردباری کہلاتی ہے۔ گھٹ جائے تو بزدلی، بے ہمتی، خوشامد اور ذلت اور بڑھ جائے تو عجب، خودی، لاف زنی بن جاتی ہے اسی طرح قوت شہوت اعتدال پر ہو تو عفت، شرم، قناعت اور صبر کہلاتی ہے۔ کمی اور بیشی کی حالت میں سستی، نامردی اور حرص، شوخی اور پلیدی بن جاتی ہے۔

اس لحاظ سے قوم کے بدکار اور نیکوکار افراد میں استعداد اور مادۂ قبولیت کا فرق نہیں ہوتا بلکہ اعتدال کی یا بیشی کا فرق ہوتا ہے۔ جوہر ایک ہی سب میں ہوتا ہے۔

بلحاظ عمل دونوں برابر ہیں۔ ایک ہی جذبہ ہر جگہ کار فرما ہے لیکن میدان جنگ میں دشمن کی ہلاکت اور خون غازی اور مجاہد بنا دیتی ہے اور حالت امن میں رہزنی آشامی قزاقی کہلا کر قابل دار بنا دیتی ہے۔

قصور دراصل مادہ قبولیت کے لئے صحیح یا غلط مواد اور ماحول کا ہے نہ کہ استعداد اور قابلیت کا۔

اب ایک صحیح مفکر اور خیر اندیش مصلح کا کام یہ نہیں ہوتا کہ وہ قوم کی صفات حسنہ اور برائیوں کو شمار کرتا رہے۔ بلکہ اس کا کام انجن کو غلط سمت سے ہٹا کر ٹھیک رخ پر ڈالنا ہوتا ہے اسٹیم کی وہی پہلی قوت جو غلط رخ پر لئے جا رہی تھی اب ٹھیک سمت پر لے جانا شروع کر دے گی۔

آزاد ممالک میں جب ان باتوں کے تجربات کئے گئے تو وہ ان کی صداقت کو پاگئے۔ اناطولیہ میں گذشتہ زلزلہ میں سرکاری عمال نے دیکھا کہ ایک جیل خانے کے قیدی بجائے فرار کے خدمت خلق میں مشغول تھے۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ جن میں بڑے بڑے سفاک اور بے رحم لوگ مناسب تربیت کے بعد بنی نوع انسان کے محسن بن کر چکے ہیں گداگری کو لعنت سمجھنے کے ساتھ اگر یہ بھی سوچا جائے کہ جن باتوں سے مجبور ہو کر قوم کا ایک درست حصہ آہستہ آہستہ گداگری کی بیماری میں مبتلا ہوا ان مجبوریوں کے پیدا کرنے اور قائم رکھنے میں قوم کے بحیثیت خویش بے قصور طبقے کا کتنا ہاتھ ہے تو ذمہ داری کا بوجھ کہیں کا کہیں جا لگتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ برا کہنے والوں ہی کی ذہنیت، نفرت، بے تعلقی اور عدم توجہی ہوتی ہے جو قوم کی معمولی سی کمزوری کو استقلال اور پائداری بخشتی ہے

بہرکیف دردمندوں کو کام کرنا چاہیے اور کام کرنے والوں کے لئے ہر وقت موقع ہے۔ اور خرابیوں کے مقابلے میں گداگری کا علاج اس قدر مایوس کن نہیں ہے۔ نہ زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہے۔ صرف کسی بڑے شہر کے قرب میں ایک قطعہ زمین اور چند فی سبیل اللہ کام کرنے والے مخلصین کے استقلال، ہمت اور محنت کی ضرورت ہے۔

کرنا کیا ہے

آپ کے دروازے پر ایک شخص پیسے کا سوال کرتا ہے تو وہ گداگر کہلاتا ہے اور پیسہ بھیک لیکن اگر وہی شخص آپ کے چار کام کر دے تو اس سے زیادہ پیسے اجرت، معاوضہ اور وہی شخص کارکن کہلاتا ہے۔ اس فرق کو تاڑ لیا جائے تو یہی اس راہ میں ہمارا دستور العمل۔ پروگرام اور کامیابی کا سگنل ہے۔ نہ گداگروں کو مٹانے کی عبث سعی کی جائے۔ نہ بھیک بند کرنے کی۔ بلکہ گداگروں سے کام لیا جائے اور بس! گداگری اور اس کے ساتھ اس سے وابستہ تمام برے اور بدنما تخیلات ختم۔ کسی آئندہ موقع پر تفصیلات پیش کر دی جائیں گی سردست اس قدر اشارہ کئے دیتا ہوں کہ گداگروں کی خوبیاں ان کی برائیوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ اور اس گودڑی میں وہ لعل پنہاں ہیں کہ اگر ان کو کارآمد بنا لیا گیا تو قوم کی کایا پلٹ ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہی زنان بازاری کی اصلاح کا موقع بھی پیدا ہو جائے گا۔

احمد سعید

شاہ آباد مارکنڈا (ضلع کرنال)

غزل

محبت کا طریقہ اور کچھ ہے
زمانہ اس کو سمجھا اور کچھ ہے

فلک پر برق بھی مضطر ہے لیکن
مرے دل کا تڑپنا اور کچھ ہے

ہزاروں درد ہیں دنیا میں لیکن
غمِ فرقت کی ایذا اور کچھ ہے

حرم کا دَیر کا سجدہ ہے کچھ اور
تمہارے در کا سجدہ اور کچھ ہے

بہت دیکھا ہے پیچ و تابِ سنبل
خمِ زلفِ چلیپا اور کچھ ہے

سماتا ہی نہیں کوئی نظر میں
مری آنکھوں میں جلوہ اور کچھ ہے

تماشے یوں تو ہیں دنیا میں لاکھوں
مگر دل میں تماشا اور کچھ ہے

حسیں کیا چیز ہیں، کیا حسن اُن کا
تیری صورت کا نقشا اور کچھ ہے

بظاہر سوئے بتخانہ چلا ہوں
معینؔ دل میں ارادا اور کچھ ہے

نوابؔ معین الدولہ بہادر معینؔ

نئے سال کا تحفہ

(حُسن والوں کی بارگاہ میں)

یہ دل، یہ انجمنِ آفتاب نذر کروں
گلوں کا چھین کے رنگیں شباب نذر کروں

شعاعیں اختر و مہتاب کی کروں حاضر
نگاہِ حسن کا رنگیں حجاب نذر کروں

صباحتِ رخِ عذرا سے دلکشی لے کر!
حیات تاج کا رنگین خواب نذر کروں

تم اور سیر کھلے بند صحنِ گلشن کی
عروسِ نو کی شہانی نقاب نذر کروں

ہو چشمِ نازِ جو مائل مطالعہ کی طرف
حریم دل کی سنہری کتاب نذر کروں

جو شعرِ نغمۂ فریاد[۱]، گنگناتا ہو
تو سازِ دل کا یہ بجتا رباب نذر کروں

یہ سالِ نو ہو مبارک! مگر یہ حیرت ہے
ریاضِ خلد کا ہنستا گلاب نذر کروں

قبول میرے یہ تحفے اگر نہ ہوں جوہرؔ
تو پھر انہیں دلِ خانہ خراب نذر کروں

جوہرؔ فریادی

---

[۱] جوہر فریادی کے کلام کے مجموعے کا نام جو عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

غزل

یہ غزل جامعہ عثمانیہ کے اس مشاعرے میں جو نواب صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا تھا پڑھی گئی تھی

دل تیری محبت کا دیوانہ ہوا آخر ۔۔۔ ہر چیز سے دنیا کی بیگانہ ہوا آخر

صورت گرِ حیرت ہے عرفانِ جنوں کیا کیا ۔۔۔ کعبہ بھی نگاہوں میں بتخانہ ہوا آخر

دل نورِ تجلی سے معمور ہے کچھ ایسا ۔۔۔ احساسِ محبت بھی پروانہ ہوا آخر

نیرنگِ محبت کی چھائی جو رنگینی ! ۔۔۔ عالم مری نظروں میں ویرانہ ہوا آخر

بستے ہیں یہیں ارماں رہتی ہے یہیں حسرت ۔۔۔ آباد محبت کا کاشانہ ہوا آخر

لبریزِ محبت ہوں فیضان ہے ساقی کا ۔۔۔ ایک ایک نفس میرا پیمانہ ہوا آخر

لب تشنہ، دہن تشنہ، دل تشنہ، جگر تشنہ ۔۔۔ ساغر ہی نہیں خالی میخانہ ہوا آخر

اک حرف جو بے معنی نکلا تھا کبھی منہ سے ۔۔۔ وہ آج محبت کا افسانہ ہوا آخر

پیراہنِ ہستی بھی بخشش ہے محبت کی
سامان عزیز اپنا شاہانہ ہوا آخر

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

فیضی کے منشآت

(بسلسلۂ گزشتہ)

اب ہم مرتب "لطیفۂ فیاضی" کے حالات کی طرف رجوع کرتے ہیں، درحقیقت انتہائی تلاش و جستجو کے بعد بھی کوئی خاطر خواہ تفصیل نہ مل سکی، ہماری دسترس جس قدر ہو سکتی تھی، ان سب کتابوں کو پیشِ نظر رکھ کر، ہم اس موضوع پر معلومات پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

جیسا کہ ہم حکیم عین الملک اول کی وفات کے حالات میں لکھ آئے ہیں کہ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ، حکیم عین الملک نے موضع ہانڈیہ میں انتقال کیا، اور بادشاہ نے اس کی مغفرت کے لئے دعا کی، اور اس کے فرزندوں کو اپنے شاہانہ الطاف میں پناہ دی، تو اس بیان سے، اور ابوالفضل کے اس رقعہ سے جسے ہم نے قبل نقل کیا ہے، یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ حکیم عین الملک کی وفات پران کی یادگار چند فرزند تھے، اور ابوالفضل کے طرزِ بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطانی عواطف جب ان پر مبذول ہوئے ہوں گے تو یہ بچے سنِ رُشد کو پہنچ چکے ہوں گے۔

"دربارِ اکبری" میں آزاد نے فیضی کی ایک عرضی نقل کی ہے، جو اس نے خاندیس سے بادشاہ کو لکھی ہے، ہمارے پیشِ نظر جو نسخہ ہے، اس میں اور اس میں اختلاف ہے، بعض باتیں اُس میں موجود ہیں، تو اس میں نہیں، چنانچہ حکیم عین الملک مذکور کا اس عرضی میں فیضی نے جہاں ذکر کیا ہے، اس کی حسبِ ذیل عبارت مولانا آزاد مرحوم نے درج کی ہے:-

"حکیم عین الملک نقشِ دہلی دارد، و در خدمتِ روضۂ مقدسہ و مقاماتِ پیرانِ دہلی، و خدمتِ فقراء و حسن سلوک بمردم تقصیری نمی کند، و گرچہ زنان حاضر می باشند و متعہد بندہ اند کہ وزروی نشود، پسرش عبداللہ جوانِ رشید است، ہمراہ درخدمتِ بادشاہی می باشد۔"

اس عبارت سے تو کامل یقین ہو جاتا ہے کہ حکیم عین الملک کے لڑکے کا نام عبداللہ ہے، شاید اس کا لقب نورالدین بھی ہو گا، اور خود اکبر بادشاہ نے جب باپ کی وفات کے بعد اس پر عنایتیں کی ہوں گی، تو اس کو اس کے والد کا خطاب "عین الملک" دیا ہو گا، یا جہانگیر کے دور میں اسے یہ خطاب سرفراز کیا گیا ہو گا۔ اس لئے اس عبداللہ کی ساری تصانیف میں اس کا نام ہمیشہ نورالدین محمد عبداللہ حکیم عین الملک شیرازی ملتا ہے۔

برٹش میوزیم کیٹلاگ جلد دوم میں، جہاں اس نسخہ کا ذکر ہے، نورالدین محمد عبداللہ کو حکیم عین الملک ہی کا لڑکا لکھا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرتب "لطائف فیضی" شاہ جہاں بادشاہ کے عہد تک زندہ رہا، چنانچہ اس نے "الفاظ ادویہ" کے نام سے ایک کتاب ۱۰۳۸ھ میں تالیف کی ہے۔

افسوس ہے کہ اس کے حالات کی تفصیل تاریخوں سے نہیں ملتی، اپنے آپ کو فیضی کا بھانجا لکھتا ہے مگر جہاں شیخ مبارک کے فرزندوں اور بیٹیوں کا ذکر ہے، اس میں فی الحال کہیں، اس کی بیٹی، جو حکیم عین الملک سے بیاہی گئی تھی، اس کا نام یا حال نہیں ملتا، اور نہ تحقیق ہو سکی۔ مگر اس کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا کہ وہ خود اپنے آپ کو بھانجا کہتا ہے، اور یہ خواہ مخواہ تھوڑی ہی لکھا ہو گا۔

ہمارے پیشِ نظر نسخہ کے صفحہ ۲۰۰ پر ایک خط خود حکیم عین الملک کے نام پر بھی ہے، ان دونوں بیانوں سے تعجب ہوتا ہے، اور سمجھ میں نہیں آتا، جب کہ کوئی تفصیل نہیں ملتی تو ان عبارتوں کی روشنی میں گزشتہ بیانات کی تردید کس طرح کی جائے، چنانچہ

"لطیفۂ فیاضی" کے آخر پر خود نورالدین محمد عبداللہ عین الملک کے رقعات درج ہیں، اس میں اس نے اپنے والد کو ایک خط لکھا ہے، اگر وہ عین الملک جو اکبری عہد کے ہیں، اور اس کے والد ہیں، تو ان کا انتقال اکبر ہی کے دور میں ہو چکا ہے، اور یہ خط جو اپنے پدر بزرگوار کو لکھ رہا ہے، اس میں ابوالفضل کے قتل کے بعد خود اس پر جو حالات گزر رہے ہیں، اس کی تفصیل ہے، حالانکہ حکیم عین الملک کا اکبر اور ابوالفضل دونوں سے پہلے انتقال ہو چکا ہے، اس میں درج ہے کہ:-

"فردیجہ کو تیر کی، پسر خواجۂ جہاں، شاہی فرمان کے ساتھ، جس میں تقصیرات کی معافی، اور دل جوئی درج ہے، یہاں وارد ہوا ہے۔ فرمانِ مبارک میں یہ بھی درج ہے کہ شیخ ابوالفضل کی جاگیر سنبل پور، چاند پور وغیرہ تمھیں سرفراز کئے گئے ہیں، اور شال خاصہ بطور تبرک روانہ ہے، فوراً حاضرِ آستانِ عالی ہونے کی عزت حاصل کرو۔ چنانچہ بحکم اقدس کی بنا پر نکل رہا ہوں، آئندہ کیا حشر ہوگا، خدا ہی بہتر جانتا ہے"

یہ واقعات جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد معلوم ہوتے ہیں، جو ابوالفضل اور اس کے خاندان پر عتاب شاہی نازل کر چکا تھا۔

جب دربار میں پہنچتا ہے، تو لکھتا ہے کہ اوائل صفر (غالباً ۱۰۲۶ھ) میں، میں آگرہ پہنچا، اور ۵ صفر چہار شنبہ کو باریابی نصیب ہوئی۔ لیکن دراندازوں کی فتنہ سامانیوں سے، اس فدوی کی طرف کوئی توجہ منعطف نہیں فرمائی، دو دن تک تو سلام کا ہی حکم نہ ہوا۔ تیسرے دن طلب فرمایا، اور بڑی سختی سے گفتگو کی۔ قسمت اچھی تھی، کہ بھلے کو سلامتی کے ساتھ واپس لوٹنا نصیب ہوا۔"

اس کے ایک اور خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی خود مہم دکن گیا تھا، اور وہاں کے لشکر کے ہاتھوں رنج و اندوہ اٹھا کر لوٹتا ہے، اور شیخ علاءالدین اسلام خاں اسلام جاہ گورنر بنگالہ و بہار کے پاس جانے کے ارادے سے نکلتا ہے۔ یہ اسلام جاہ، شیخ سلیم چشتی (المتوفی ۹۷۹ھ) کے پوتے تھے، جہانگیر جب تخت نشین ہوا تو انھیں پنج ہزاری منصب سرفراز کر کے حاکم بنگالہ مقرر کیا تھا، انھوں نے شیخ مبارک کی بیٹی لاڈلی بیگم سے عقد کیا تھا، جو فیضی کی بہن تھی۔ اس لحاظ سے گویا، اسلام جاہ حکیم نورالدین عبداللہ کے خالو ہوتے تھے۔ یہ ان کے پاس ۲۷ شوال ۱۰۲۰ھ کو "جہانگیر نگر" میں جا کر ملتا ہے۔

ہمیں کافی تلاش کے باوجود حکیم نورالدین عبداللہ کے اس سے زیادہ حالات نہ مل سکے ان کی حسب ذیل کتابیں ہم نے دیکھی ہیں، جن کے مختصر نوٹ بھی اس لئے درج ہیں کہ اس موضوع کے لواحق کی تکمیل ہو جائے۔

(۱) انشائے نورالدین خود اس لطیفۂ فیاضی کے نوٹ کے بعد اسی مضمون میں آخر پر اس کے متعلق ہم نے معلومات بھی درج کئے ہیں۔

(۲) سببِ ستۂ رشیدی۔ یہ کتاب طب میں، جیسا کہ نام سے ظاہر چھ اسباب (شش سبب) اور ایک خاتمہ پر حاوی ہے۔

اس میں اس نے اپنا نام "نورالدین محمد عبداللہ حکیم عین الملک شیرازی الصدیقی القرشی" لکھا ہے۔

ساری کتاب کچھ عجیب و غریب ہے، جس میں ہند کے موسم، ارضی و سماوی مباحث، اور بہت سے اعمال (جن سے صحت برقرار رہ سکتی ہے) بیان کئے ہیں۔ ایک عجیب طرز کی کتاب ہے، لطف یہ ہے کہ علم موسیقی کے باب میں، اس فن کی تاریخ، اور بڑے تفصیلی معلومات درج کئے ہیں، شاید اس لئے کہ طبیب کو علم موسیقی کا بھی جاننا ضروری تھا۔

سببِ تالیف میں لکھتا ہے۔

درکف آمد مرا، چو گنجے مفت　　کردم ایثار و آشکار نہفت
بہ ترازوئے دستِ تنگ زباں　　دانش شش جہات حکمت سنجت

۱؎ دربارِ اکبری صفحہ ۲۵۰، مرتبہ محمد ابراہیم منصف امرتسر ۱۹۱۰ء۔

تکملۂ شش قبائے صحت را   کلک مستی چنیں جواہر سفت
از خرد نام و سال و مہ پرسی   "سبب ستہ رشیدی" گفت

اس کا پیش نظر نسخہ ۱۰۳۵ھ کا مکتوبہ ہے، جس کے خاتمہ پر یہ عبارت ہے :-

"تمت الکتاب بعون الملک الوہاب بتاریخ ہفتم ماہ
جمادی الاول ۱۲۵۳ھ بر حسب فرمایش والدی حکیم الحکما
حکیم لطف حسین خاں، از دست خواجہ عبد الرزاق
عرف محمد مخدوم۔"

(۳) تیسری کتاب "الفاظ ادویہ" نظر پڑی، جس میں لکھا ہے کہ اس خادم الاطبا نیاز مند درگاہ بے نیازی نور الدین محمد عبد اللہ الحکیم عین الملک شیرازی نے خانہ زادان سلطنت سے ہونے کی وجہ سے انتہائی تلاش و جستجو کے بعد یہ کتاب ابو المظفر شہاب الدین محمد شاہجہاں کے اوائل جلوس میں لکھی۔ اپنی اس کتاب کی تاریخ تالیف کے لئے لکھتا ہے :-

دارو کتاب ما چو دوا پر وا فیے
تاریخ و نام نیز شد "الفاظ ادویہ"
۱۰۳۸

یہ کتاب ایک مقدمہ، نتیجہ اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔
مقدمہ کو چار فائدوں میں بیان کیا ہے :-
فائدۂ اول میں :- علامات تصحیح اعراب لکھے ہیں۔
" دوم میں :- علامات زبان "ہر دیار" - اور
" سوم میں :- تحقیق طبایع و درجات آں، و علامات کہ منسوب است بہ آں، و ذکر بعضے از دوا بہ طبع و درجہ و قوت۔
فائدۂ چہارم میں :- در بیان مختار و شربت و مصلح و بدل دوا و علامات آں۔

، نتیجہ صرف ادویہ کے اسما اور ان کے ذکر پر ترتیب دیا گیا ہے۔
خاتمہ میں چھ کثیر المنفعت ادویہ، بادزہر، موسیائی، چوب چینی، چائے، قہوہ، اور تمباکو کے خواص و افعال لکھے ہیں، اور لکھتا ہے کہ ان کا ذکر قدما نے بہت کم لکھا ہے، میں تفصیل سے درج کرتا ہوں۔

تمباکو کے خواص کے ضمن میں کہتا ہے :-

"ظہورش در ہند، انتہائے سلطنت عرش آشیانی
جلال الدین محمد اکبر بادشاہ است و ابتدائے اورنگ
نشینی جنت مکانی، نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ،
کہ سال ہزار و چہاردہ ہجری باشد و بیشتر از جانب
فرنگ، دریں دیار آمدہ، و اکنوں در جمیع اماکن ہندوستان
کشت و کار او می شود، و ارتکاب کشیدن دخانش
شعار کہہ و مہ گشتہ۔"

اسی کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک شخص درد قولنج سے گرفتار ہو کر آدھی رات کے وقت میرے پاس آیا، اور قریب مرگ تھا، اور اس وقت کوئی ایسی دوا بھی موجود نہ تھی۔ میں نے اسے تمباکو پینے کی ہدایت کی، اور کہا کہ اس کا دھواں بہت کثرت کے ساتھ نگلتا جا۔ اس ترکیب سے فی الحال اسے بہت کچھ افاقہ ہوا، اس لئے کہ دخان بذاتہ محلل ہے۔

اسی تمباکو کے متعلق ایک دوسرا تجربہ لکھتا ہے کہ ایک شخص مرض استسقا رکھتا تھا، انتہائی دوائیں دی گئیں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا، اور اس کا معدہ اس قدر ضعیف ہو چکا تھا کہ کوئی دوا قبول نہیں کرتا تھا، میں نے بڑی سوچ اور بچار کے بعد، گویا کہ مجھے الہام ہوا، یہ ہدایت کی کہ جو دوائیں تمھیں دی جا رہی ہیں، ان کو بیس گنا اضافہ کر کے، بطور تمباکو استعمال کر کے اس کا دھواں نگلو۔ چنانچہ

[1] یہ کتاب کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں فن طب یونانی فارسی قلمی نمبر (۳۸۱) پر موجود ہے ۱۲۔

عجیب نفع ہوا۔[1]

اپنے تیسرے تجربے میں یہ بیان کرتا ہے کہ اس کے کسی ایک عزیز کو ضعفِ بصر کا سخت عارضہ ہوگیا تھا، جب ایک مدت کے بعد اس سے ملنے گیا، تو اس کو دیکھا کہ وہ کتابت کر رہا ہے اس کا سبب پوچھا تو کہا کہ برگ تمباکو کے ساتھ برگِ شبنا لو کو نصف نصف لے کر خشک کرنیکے بعد، چند دنوں تک اس کے دھوئیں کا استعمال کیا ہے جس سے یہ فائدہ نصیب ہوا کہ آج میں کتابت کرنے کے قابل ہوگیا۔

واقعی ہر چیز جو اپنے محل پر استعمال کی جائے، فائدہ بخشتی ہے اور اس کی کثرت بجائے فائدے کے، نقصان رساں بن جاتی ہے، نہ یہ کہ آج کل عوام نے تمباکو نوشی کو اپنی عادۂ ثانیہ بنالیا ہے۔ کہیں ان فوائد سے آپ اپنی تمباکو نوشی پر خوش نہ ہوں، کیونکہ فعل الحکیم لایخلو عن الحکمۃ۔

اس کتاب کا بھی ایک قلمی نسخہ نظر سے گزرا، جو ۹ ربیع الآخر ۱۱۹۲ھ کا لکھا ہوا ہے، کاتب کا نام نظام الدین ہے۔[2]

یہ کتاب بعد میں چھپی بھی ہے، ایک نسخہ "مطبع احمدی شاہدرہ دہلی" میں امو جان کے اہتمام سے، اور دوسرا "مطبع ثمر ہند لکھنؤ" سے شائع ہوا تھا۔[3]

اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے، اور ایک خدا بخش خاں کی لائبریری میں بھی موجود تھا۔

(۴) جامع الاطبا کے نام سے بھی ایک کتاب، شاہجہاں بادشاہ[1] کے حکم سے متفرقات طبابت میں لکھی۔ یہ کتاب چودہ فتوحات پر مبنی ہے اور آخری باب، ہندی و فارسی ادویہ کے اسما و لغت پر اعراب کی تصحیح کے ساتھ شامل ہے۔

اس کتاب کا زیرِ استعمال نسخہ، غرہ صفر المظفر روز دوشنبہ کو محمد شاہ بادشاہ کے جلوس کے ساتویں سال لکھا گیا ہے، اس پر محمد بخش بہادر نامی کسی صاحب کی دو مہریں ہیں، ایک میں ۱۱۳۶ھ اور دوسری میں ۱۲۶۴ھ ثبت ہے

(۵) اب اصل کتاب "لطیفۂ فیاضی" کے نوٹ کی طرف رجوع کیجئے۔ اس لطیفہ کا ایک نسخہ جیسا کہ مولوی بادشاہ حسین صاحب نے ستمبر ۱۹۳۲ء کے معارف میں لکھا تھا، خود حیدرآباد کے کتب خانہ دفتر دیوانی، مال و ملکی سرکار عالی میں موجود ہے۔ لیکن اس میں یہ کمی ہے کہ جن اصحاب کے نام مراسلت کی گئی ہے، ان کے نام چھوٹے ہوئے ہیں، جن سے خطوط کی تاریخی حیثیت پوشیدہ رہ جاتی ہے، اور یہ نسخہ (۱۰۰) صفحات (تقطیع ۸/۵ انچ) کا ہے۔

ان لطائف کا ایک اور نسخہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں بھی موجود ہے۔ کتب خانۂ آصفیہ کا نسخہ ہمارے پیش نظر ہے، جس کے (۲۷۰) صفحات چھوٹی تقطیع پر ہیں۔[2] ایک اور ناقص نسخہ بھی اسی کتب خانہ میں ہے، جو ۱۱۵۵ھ کا مخطوطہ ہے۔[3]

مولانا آزاد مرحوم نے "دربارِ اکبری" میں فیضی کا حال لکھتے ہوئے، اس کتاب پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اور ایک پوری عرضی جو بڑی لمبی چوڑی ہے، پوری کی پوری، اصل فارسی عبارت ہی میں نقل کی ہے، انھوں نے اس کتاب کے متعلق جو رائے لکھی ہے، وہ حرف بحرف صحیح ہے، چنانچہ آپ بھی صفحاتِ آئندہ میں، اس کے اقتباس سے معلوم فرمالیں گے۔ آزاد کے دل نشین انداز میں

---

[1] یورپ کی طبی دنیا نے بھی اسی طریقہ کو رائج کیا ہے۔ چنانچہ نزلہ وغیرہ کے لئے متعدد قسم کے سگریٹ و سگار یورپ سے آتے ہیں۔

[2] کتب خانۂ آصفیہ۔ فن طب یونانی فارسی قلمی نمبر (۲۱۴)

[3] " " " مطبوعہ نمبر (۵۵۷) الفاظ ادویہ

---

[1] کتب خانۂ آصفیہ۔ جامع الاطبا فن طب یونانی فارسی قلم۔ نمبر (۱۳۰)

[2] " " لطیفۂ فیاضی فن انشاء " " " (۱۴۴)

[3] " " انشائے فیضی فن انشاء " " " (۸۰)

س کتاب کی اہمیت پڑھیے، فرماتے ہیں :۔

"انشائے فیضی ۱۰۳۵ھ میں نورالدین محمد عبداللہ خلف حکیم عین الملک نے ترتیب دی ہے اور لطیفۂ فیاضی اس کا نام رکھا ہے۔ بابِ اول میں عرضداشتیں ہیں کہ اکثر سفارت دکن سے حضور پادشاہ میں عرض کی ہے، یہ عرضیاں بڑی غور طلب رپورٹیں ہیں کہ رموزِ سلطنت پر مشتمل ہیں، ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہمیں بڑے بڑے نکتے سکھاتی ہیں، اول عجز و انکسار کے انداز، اور مجھے اس میں جتانے کے قابل یہ امر ہے کہ جب ہم ایشیا میں ہیں، اور ہمارے آقا کمالِ شوق سے آداب و تعظیم کے خریدار ہیں تو ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے میں کیا عذر ہے، آقا کی خوشی بڑی گراں بہا شے ہے۔"

"پہلی عرضی میں اول رستہ کی حالت، اپنی مملکت میں جس جس شہر سے گزرا ہے وہاں کی رُوداد، حاکم کی کیفیت، کارروائی اگر ضروری ہے تو ماتحتوں کی بھی خدمت گزاری۔ ملکِ دکن میں پہنچے تو سرزمین کی کیفیت، ملک کی حالت، ہر مقام میں پیداوار پھول پھل کیا کیا ہیں، اور کیسے ہیں، اہلِ صنعت کے صنایع علما و حکما شعرا وغیرہ اہلِ کمال کے حالات، ان کی شاگردی کا سلسلہ، کن کن استادوں تک پہنچتا ہے، ہر ایک کی لیاقت، اخلاق، اطوار، ہر ایک کی اپنی رائے کہ کون پرانی لکیر کا فقیر ہے، کون نئی روشنی سے اثر پذیر ہے۔ اور کون ان میں سے حضوری دربار کے قابل ہے۔"

عرایضِ مذکورہ سے اکبر کی طبیعت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے کہ کن کن باتوں سے خوش ہوتا تھا، اور باوجود سامانِ شاہنشہی کے، ان اہلِ علم اور اہلِ دانش کے ساتھ کس قدر بے تکلف تھا، اور یہ کیسی لطافت سے اسے خوش کرتے تھے، اور کس درجہ کی ظرافت و لطافت ہوتی تھی جو اس کے دل کو شگفتہ کرتی تھی۔"[1]

—— (۲) ——

اصل کتاب "لطیفۂ فیاضی" یعنی فیضی کے منشآت کا اقتباس حمد و نعت کے بعد لکھتا ہے :۔

"بادیہ پیمائے بادیہ سخن سنجی و آبلہ پائے سنگلاخ کلام سنجی، نورالدین محمد عبداللہ حکیم عین الملک کہ بہ نسبتِ آبائے کرام از خاکِ پاکِ شیراز است، و بہ حسبِ طینت شکرستانِ ہند، سخن طراز، بہ لمعانِ نظرِ امعان و ملاحظہ نمود کہ بسیار مصنفاتِ شگرف، از نظم و نثر ملک الکلام ....

قسطاسِ دانشورانِ ہند، شیخ ابوالفیض فیاضی چوں فروغِ سپہرِ جہاں آرا و ضیا گسترِ زمین و زماں گشتہ و بر بخشے از سخنانِ فیض تبیانِ آں شناور بحارِ الفاظ و معانی چوں "مرکز ادوار" کہ در جواب "مخزنِ اسرار" است۔

"رونق افزائے محفلِ دانش شیر دہی ....

افضل الاعالی نواب حکیم مستطاب، ابوالفضل علامی فہامی ترتیب دادہ، بہ رشتۂ انتظام کشیدہ، شہرۂ آفاق گردانیدند، مگر بعضے ملتقطات و منشآت کہ از قلمِ عنبریں شمائم، استعجالاً و اختصاراً، نقش پذیر رفتہ بود و ہم چناں کن در زاویۂ اختفا و کُنجِ گمنامی و گوشۂ خمول و ناکامی پراگندہ افتادہ، و بہ مقتضائے استعدادِ عالی و فطرتِ والا نسیاً منسیاً فرسودہ، بداں کم تر پرداخت و فراہم نیاوردہ بودند، ازاں جاکہ این کم ترین، نسبتِ خواہر زادگی و

---

[1] دربار اکبری صفحہ (۳۰۵)

تمہیدی بہ آں خدیو کشور دانائی داشت خواست کہ ایں جواہر زواہر آبدار کہ اولاً برادران معنوی راقم اند جریدۂ جداگانہ فراہم آوردہ در سلک ترتیب کشد، و در عہد ترتیب بہ پرورہ۔ بو کہ بدیں دست آویز مذکور محفل سخن سنجاں و مطبوع خاطر معنی پردازاں گردد، و بہ یاد کردانیاں سرائے جاوید زندگی اندوزد۔ تیمناً و تبرکاً سر آغاز ایں گلدستہ .... بہ افتتاح "تباشیر الصبح دیوان فیضی" معنون ساختہ انقسام می نماید، بہ پنج لطیفہ۔

(۱) لطیفۂ اول:۔ عرائض والا درگاہ،
(۲) مفاوضات فیاضی بہ شرفاء و علماء و عرفاء،
(۳) لطیفۂ سوم:۔ بہ حکمائے معاصر
(۴) لطیفۂ چہارم:۔ بہ امرائے عظام
(۵) بہ نیاک و اخوان

حسب ذیل عبارت سے کتاب کے سنہ تالیف وغیرہ کا پتہ چلتا ہے۔

" لطیفۂ فیاضی کہ بتاریخ انجام و انتظام ایں مطلب اہم است موسوم ساختہ، دست ہمت بہ دامن شاہد مقصود می زند۔
و باللہ التوفیق و بہ المستعان"

" لطیفۂ فیاضی" سے ۱۰۳۵ھ برآمد ہوتا ہے۔

اس کے بعد "تباشیر الصبح" کے نام سے فیضی کی عبارت بطور دیباچہ لکھی ہے، اس کے بعد ایک مثنوی درج ہے۔

مثنوی کے بعد فیضی نے مختصر طور پر اپنی زندگی کے کچھ حالات بھی لکھے ہیں، چنانچہ اپنی قادر الکلامی اور انشاء پردازی پر فخر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ میں نے اپنے والد ماجد قبلہ کے پاس تعلیم حاصل کی، اور فطری قابلیت و جوہر ذہانت و فطنت سے ترقی کی تحصیل علوم کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی لیکن شہنشاہ اکبر کے فرمان نے مجھے کنج عافیت سے نکلنے پر مجبور کیا، اور تعمیل حکم میں حاضر دربار ہو کر آستان بوسی کی عزت حاصل کی۔ شاہانہ الطاف مبذول ہوئے اور شاہزادہ کام بخش کی تدریس کے فرائض سپرد کئے گئے۔ اس خدمت سے ترقی کر کے، خدائے لا یزال کی عنایات کے باعث سلطان کا معتبر ترین خواجہ تاش بننے کی عزت حاصل کر لی۔ بخت نے اور یاوری کی تو دربار کے امرائے خاص سے سمجھا جانے لگا، اور خطاب ملک الشعراء حاصل کر کے امتیاز پایا۔

قوت طبع کے بہاؤ اور زور پر بہت کچھ کہتا جاتا ہے، چنانچہ اپنی مدح سرائی کے لئے یہ فقرے استعمال کئے ہیں، جن میں اپنے آپ کو مرد میدان بھی گننے لگتا ہے۔

" ہم در حساب امراء در آمدم و ہم خطاب ملک الشعراء گرفتم۔
اگر شمشیر بہ میاں بستہ ام، اما کلک مجروام کارگر تر است۔
اگرچہ تیر بر کمان می نہم، اما قلم در بنان من راست تری رود"۔

اس تمہیدی حصہ کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔

" لطیفۂ اول" کے عنوان کی تحت، عرائض درج ہیں، جن کو وقتاً فوقتاً، شہنشاہ اکبر کے دربار میں پیش کیا ہے۔

پہلی عرض داشت میں شہزادہ مراد (وفات ۱۰۰۷ھ) کے رکاب میں، اس نے جو دکن کا سفر کیا ہے، اس کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں، اور ہر جگہ شہزادہ کی جس شان و شوکت کے ساتھ آؤ بھگت کی جاتی ہے، اس سے بھی دربار شاہی کو مطلع کرتا جاتا ہے۔

عرضداشت دوم میں دکن کی پانچوں خود مختار اسلامی سلطنتوں کا کچا چٹھا لکھ کر بھیجتا ہے۔ یہ دکن کے سفر سے متعلق، اسی سلسلہ کا دوسرا معروضہ ہے۔ فیضی کے ان عرائض میں نہایت

عمدہ خصوصیات بھی ہیں، وہ صرف شہزادہ کے استقبال کی روداد ہی دارالسلطنت نہیں بھیجتا ہے۔ بلکہ جس مقام پر پہنچتا ہے، ایک انگریز مورخ کی طرح وہاں کے سیاسی، تمدنی، معاشرتی حالات کے ساتھ ساتھ، اُن قطعوں کے موسم و فصول، پیداوار اور باشندوں کے لباس و وضع قطع کی تفصیل سے بھی اپنی عرضیوں کو دلچسپ بناتا جاتا ہے، عورتوں کے لباس، اور ان کے زیورات پر بھی ان میں روشنی ڈالی ہے۔ غرض ہر معمولی سے معمولی چیز پر، جن کو موجودہ زمانہ میں اہمیت حاصل ہو گئی ہے، اپنی قلمی جولان گاہوں سے محروم نہیں رکھا ہے، ان خصوصیات کی وجہ سے اس کے یہ انشائی نمونے، اپنے معاصرین میں اسے ایک خاص امتیاز بخش رہے ہیں۔ اس دور میں، اس وسعتِ نظر کے ساتھ، اس قسم کی طرزِ نگارش خال خال لوگوں میں بھی نہیں دکھائی دیتی۔ ایسے طرز پر حالات اکٹھے کر کے بادشاہ کی خدمت میں بھیجنا، اکبر کی ہمہ گیریوں، اور فیضی کے تدبر و سیاسی مرتبہ کو ظاہر کرتا ہے، جسے آج مغربی مدبرین اہمیت دے رہے ہیں۔

اس عرضداشت کے ضمن میں، محمد قلی قطب الملک ۱۰۲۰ھ والیٔ گولکنڈہ کے متعلق لکھتا ہے کہ:۔

"تشیع دارد، و معمورہ ساختہ و عمارات پرداختہ، بھاگ نگر بنام بھاگ متی فاحشۂ کہنہ و معشوقۂ قدیمۂ اوست۔"

کچھ مختصر سے حالات اور غزلوں وغیرہ کے بعد، یہ قابل الذکر بات درج کی ہے کہ:۔

"تربتِ میر حسن دہلوی، در دولت آباد است، غالباً ہمراہ سلطان علاء الدین آمدہ بود، وایں عمر مستعار را بہ آخر رسانید بہ خاطر رسید کہ دیوانِ او کشودہ یک غزل تبرکاً و تیمناً، تتبع نمودہ شود، اتفاقاً ایں غزل بر آمدہ

باز نوائے بلبلاں عشقِ تو یاد می دہد؛ ہر کہ بہ عشق نیست خوش عمر بہ باد می دہد

شکستہ بستہ گفتہ شد، از اتفاقاتِ حسنہ آں کہ نامِ حضرت شاہزادۂ عالمیاں (یعنی مراد) قافیہ بود۔ بنامِ ایشاں مزین ساختہ فرستادہ وایں معنی را تفاؤل بر فتح و نصرت ایشاں نمود، و بہ عرضِ اشرف نیز می رساند۔"

اس دورۂ دکن میں، جب وہ احمد نگر پہنچتا ہے، تو اتفاقاً نظام الملک حاکمِ احمد نگر کی سرحد "بندرِ جیول" پر ایک جہاز ایرانی مسافروں کو لے کر لنگر انداز ہوتا ہے، اور فیضی جب یہاں پہنچتا ہے، تو اس کی ان لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے، وہ حسبِ عادت ان سے ولایتِ ایران و عراق کے تازہ حالات حتی الامکان تفصیلی طور پر معلوم کر کے بادشاہ کے پاس لکھ بھیجتا ہے، اس میں جس قسم کی باتیں درج ہیں ان کے اسباب پر غور کرنے سے خود فیضی کی سیاسی روش اور اکبر کا رجحانِ طبع جھلکتا نظر آتا ہے کہ وہ کن باتوں کا شائق رہا کرتا تھا

اس سے آگے بڑھ کر، ان حالات کے اختتام کے بعد شہر احمد نگر کی سیر کراتے ہوئے، دو مشہور شاعروں کے واقعات، اور ان کی شاعری پر رائے زنی کرتا ہے، ان دونوں میں، ایک "ملک قمی" ہیں، جن کے متعلق لکھا ہے کہ وہ لوگوں سے بہت کم ملتے ہیں، اور دوسرے "ملا ظہوری" ہیں، جن کی تعریف و توصیف اور رنگین بیانی کے ذکر کے ساتھ، لکھتا ہے کہ یہ دربارِ شاہنشہی میں حاضر ہونے کی آرزو رکھتے ہیں، بادشاہ کو واقف کرانے کے لئے، ان دونوں کا نمونۂ کلام بھی درج کیا ہے۔

اس کے بعد ایک عجیب و غریب واقعہ لکھا ہے جس کا ذکر یہاں سودمند نہیں۔ پھر اس کے ختم پر مولنا ظہوری کی

زبان سے ایک قصہ نقل کیا ہے۔ حضرت خواجہ گیسو دراز علیہ الرحمہ کا بھی ذکر ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ احمد آباد سے گلبرگہ آ جاتا ہے۔ لکھتا ہے کہ :-

"ملا عبد اللطیف دبیر پیرے بشوق و مردے شگفتہ بود، و در برہان پور می بود و عرائض راجہ علی خاں را او انشا می کرد۔ نقلے غریب بہ فقیر گزرانید کہ یکے از اولاد سید محمد گیسو دراز حضرت اللہ نام دارد و پیش ازیں بہ یک سال در برہان پور آمدہ بود، خادم او پیش من آمد کہ حضرت اللہ آمدہ اند و دعا می رسانند و می فرمایند کہ کجا فرود آئیم گفتم خوش آمدند، صفا آوردند، و در خانۂ خود فرود آیند۔ روز ملاقات بہ ملا عبد اللطیف گفت، می دانید کہ من کیستم ؟ حضرت مریم را بہ عرش بردند، و حضرت میر سید محمد گیسو دراز را حاضر ساختند و بی بی را با حضرت میراں عقد بستند، ما نتیجۂ ایشانیم"۔

"ملا عبد اللطیف می گوید کہ من گفتم، عجب است کہ بہ فرنگ تشریف نہ بردند۔ گفت آں ولایت برادر ماست (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی)، معلوم نیست کہ مردم آں جا بہ ما سلوک لائق کنند"۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایسے قصوں کو صرف بادشاہ کی دلچسپی کی خاطر لکھا جاتا ہے، جیسا کہ مشہور بھی ہے کہ اکبر کو اس کا از حد ذوق تھا۔ یہ مناسب ہوگا کہ اگر ہم اہم مقامات پر ترجمہ کرنے کی بجائے فیضی کی عبارت ہی ناظرین کی نظروں کے آگے پیش کر دیں، تاکہ واقعات، جن کو وہ اپنے مخصوص انداز بیان میں لکھتا ہے، پورے طور پر اسی کے الفاظ میں نقل کر دیئے جائیں۔

مذکورۂ بالا قصہ کے بعد تحریر کرتا ہے کہ :-

"بندہ از خواجہ نظام الدین مینی کرر شنیدہ و غالباً گجرات ہم رفتہ بود، دیگر شنیدہ شد کہ "بجزر" نام حکیم بود، نظام الملک بحری او را از فرنگ طلبیدہ، اعتبار کردہ بود۔ روزے حکیم در مجلس او از خواجگی شیخ شیرازی کہ دانشمندان مشہور است و شاگرد خواجہ جلال الدین محمود پرسید کہ اگر آں سر دنیا آتش افروزند و مانع نہ باشد از کوہ و تل، آں آتش دیدہ می شود، با آنکہ مانع نیست خواجگی شیخ جواب داد کہ از بہت بعد مسافت دیدہ نمی شود حکیم فرنگی بہ نظام الملک گفت کہ اگر حکم شود، رقص کنم کہ ایں سخن صد رقص دارد، در ہماں ساعت شاہ طاہر رسید و پرسید کہ چہ سخن می گذرد، تقریر کردند، شاہ طاہر گفت، خواجگی شیخ غلط کردہ، عناصر ہمہ بسیط اند مرئی نمی شوند، و ایں آتش کہ مرئی می شود بہ جہت ترکیب است با اجزاء ارض"۔

معین الدین رہبر فاروقی

یاس کا سکون

کامیابی زندگی کی موت ہے۔ وہ خواہش، وہ تمنا، وہ آرزو، وہ امید ہوشربا نہیں ہو سکتی جس کا انجام یاس والم نہ ہو۔ دلوں کے ٹوٹنے میں ایک زندگی ہے۔ آرزوں کی ناکامی میں ایک روحانیت و چہل پہل ہے۔ تمناؤں کی ان بان یاس و غمگینی کے پیمانہ میں اپنا اصلی روپ دکھاتی ہے۔ خوشیوں، مسرتوں اور شادمانیوں کی گود میں پلنے والے ہجوم الم کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ زندگی کی حقیقی کامرانی ارمانوں کا ماتم ہے۔ ان خواہشات کو سرخروئی نہیں نصیب ہوتی جن کی میت دھوم سے نہ نکلے۔ یاس میں جو مٹھاس ہے وہ اس آرزو ارمان میں نہیں۔

یہ مانا۔ اس کو تسلیم کرنے سے کس کافر کو انکار ہے کہ دل آرزوں کا گہوارہ ہے۔ مگر ہر آرزو پوری ہونے کے لئے نہیں ہوتی۔ آرزو کی تو یہی شان ہے کہ وہ انسان کے ساتھ دفن ہو جائے اس تمنا میں کوئی رنگینی نہیں جو ایک کامیاب تمنا سے معنون کی جائے۔ اسی طرح افسانہ بھی اسی وقت ایک کامیاب افسانہ کہلانے کا مستحق ہے جب کہ وہ کسی کی زندگی کا ایک المناک سانحہ بن کر اس سے وابستہ ہو جائے۔ کسی کام کے سرانجام پانے میں پورے ہو جانے میں وہ بات نہیں جو ادھورے پن میں ہوتی ہے۔ محبت ایک کھیل ہے۔ اس کو کھیل ہی سمجھ کر سب کھیلتے ہیں۔ کیوپڈ تیر و کمان لے کر کھیلتا ہے۔ یہ بچہ ہے۔ اس کی معصوم شخصیت دنیا کے ناجائز ہتھکنڈوں سے لاعلم رہتی ہے۔ اسی لئے غالباً محبت بھی بچپن ہی میں موت کے گھاٹ اتر جاتی ہے پریم کو پروان چڑھتے کس نے دیکھا ہے۔ اور شاید یہی اس کی کامیابی کی زبردست دلیل ہے۔ مجھے افسانہ لکھنے کا ایک جنون تھا۔ میں یوں ہی اناپ شناپ قصے کہانیاں لکھتا اور اپنی دانست میں ان کو بہت بڑے پایہ کے افسانے سمجھ رہا تھا۔ دنیا کی نظروں میں نہیں، اپنے آپ کو دھوکہ دینے، میں خود کو ایک زبردست ادیب و نامہ نگار تصور کرتا تھا۔ میرے افسانوں میں نہ کوئی کشش تھی نہ دلچسپی۔ اکثر میرے افسانے مزاحیہ ہوتے تھے۔ جن کو پڑھ کر انسان کا صرف وقت ضائع ہو سکتا ہے۔ اور کوئی نتیجہ ان کا نہیں ہوتا تھا۔ ہوتے ہوتے، رفتہ رفتہ میں اپنی افسانہ نگاری سے بھی بیزار ہو گیا۔ میں اب ایک جیتے جاگتے انسان کی زندگی کا خود مطالعہ کر کے ایک افسانہ لکھنا چاہتا تھا۔ مجھے اب ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جس پر سچے معنوں میں ایک رومانی زندگی کا افسانوی رنگ چسپاں ہو سکے۔ جس کو دیکھ کر، جس کو سن کر، جس سے گفتگو کر کے میں ایک سا آ اپسکوں یہ بھی میری ایک انوکھی اور عجیب و غریب تمنا تھی۔ اور تمنا تو ہمیشہ ہی نادر و عجیب ہوتی ہے۔ تمنا کا شاید دوسرا نام جنون یا خبط ہے میں بھی ایک ایسے شہ کار کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اپنے انوکھے افسانے کا ایک انوکھا ہیرو۔ یوں بھی میرے والدین میری مضمون نگاری کو ایک بے کاری کا شغل سمجھتے تھے۔ طعن و ملامت سنتے سنتے میرے کان پک گئے تھے۔ وہ مجھ سے میرے حصول علم کا کوئی زبردست معاوضہ چاہتے تھے۔ لیکن میں اس راستے سے دور تھا۔ بہت دور۔ مجھے ملازمت کے نام، اس کی پابندی اور غلامی کے صرف تخیل ہی سے الجھن ہونے لگتی تھی۔ میں ایک آزاد خیال نوجوان تھا۔ کسی قسم کی کوئی رکاوٹ مجھے خودکشی پر مائل کر دینے کے لئے کافی تھی۔ میں ہر کام میں آزادی چاہتا تھا۔ جو ہر انسان کا

پیدائشی حق ہے۔ جب یہ سب کے سب میری طبیعت کی اٹھان سے عاجز و تنگ آگئے تو اب ایک دوسری اسکیم شروع ہو گئی۔ خاموش نگاہوں سے میرے کردار پر غور و خوض ہونے لگا۔ میرے اٹھنے بیٹھنے لکھنے پڑھنے آنے جانے پر بہ ظاہر کوئی روک ٹوک تو نہ تھی۔ اور ہوتی بھی تو یہاں ماننے والا کون تھا ــــ لیکن زبان کو کون روکے۔ چہ میگوئیوں کا بازار گرم تھا۔ سارے کنبہ والے گویا برادران یوسف تھے اور میں تن تنہا یوسف مظلوم ــــ جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں۔ ہاں میں ہاں ملانے والے کہاں نہیں ہوتے۔ میرے ملنے والے بہت کم تھے۔ میرے دوستوں سے زیادہ میرے دشمنوں کا حلقہ وسیع تھا۔ میں لڑکپن سے ضدی اور ہٹ دھرم مشہور تھا۔ ان سب کی کٹ حجتی اور دخل در معقولات نے میری فطرت میں ان خصائل کو اور ابھار دیا تھا۔ مجھے یوں بھی دوست احباب کی محفلوں سے گھبراہٹ سی ہوتی تھی۔ ظاہر داریوں کو قبول کرنے سے میرے ضمیر کو سرے سے انکار تھا۔ "تپاک" کے لفظ سے میرا دم الجھنے لگتا تھا۔ میں جھوٹی بناوٹی اور رسمی خاطر داریوں کو روا رکھنے سے قاصر تھا۔ بس اب تک تو اس تمہید سے آپ کو میری فطرت کا ایک اچٹتا خاکہ معلوم ہو چکا۔ اب مجھ جیسے مشکل پسند سے اپنے افسانے کے لئے کس قسم کے ہیرو کی تلاش تھی اس کی کچھ روداد سنئے۔

جستجو میری فطرت کا خاصہ ہے۔ اور اپنی اس عادت سے میں مجبور تھا۔ میں آج صبح ہی صبح گھر سے نکل گیا۔ دیوانوں کی طرح۔ جن کا کوئی منزل مقصود ہی نہ ہو۔ میری آنکھیں تلاش و کھوج کے پیک لئے ہوئے راہ گیروں کا مشاہدہ کرنے لگیں۔ یوں بھی تھوڑی دیر کے لئے کوئی لب سڑک کھڑا ہو جائے تو اس کو کیا نظر نہیں آتا۔ دنیا جہاں کے لوگ۔ قسم قسم کی شکل۔ ہر نوع کا انسان، ہر قسم کا آدمی ــــ مجھے ان کانچ کے ٹکڑوں میں ایک ایسے ہیرے کی تلاش تھی جس کے وجود سے میرے افسانے کی دنیا میں چار چاند لگ جائیں۔ سارے عالم کی نگاہیں جو خیرہ کر دے۔ ایک کائنات میں اس کی شخصیت پر سب ایمان لے آئیں۔ ایک دقت پسند انسان کا ایک انوکھا ہیرو ــــ میرے راستے میں دشواریاں حائل تھیں۔ اس پتھریلی زمین پر مجھے بغیر کسی رہبر کے چلنا تھا۔ راستہ کا پتہ تھا نہ منزل مقصود کی خبر تھی ــــ کس نرالے انسان کی مجھے جستجو تھی۔ میری تمنا بڑی کٹھن تمنا تھی۔ میرے خواہشات کے سمندر کا دور دور تک ساحل نظر آتا تھا۔ آسمان سے تارے توڑ لانے کی طفلانہ امنگ شاید اسی کا دوسرا نام تھا۔ میری ہمت بہت بلند تھی۔ اور وہی میرا ساتھ دئے جاتی تھی۔ کسی حکیم مطلق کا یہ خیال ع

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں

تخیل کی گنجان وادیوں میں گونج رہا تھا ــــ اور سب سے بڑی چیز تو یہ تھی کہ میری خواہش میں "خلوص" تھا۔ میری تلاش میں "حقیقت" جلوہ گر تھی۔ میری آرزوؤں کی نگری میں "اصلیت" اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ مجھے اپنی قوت ارادی پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ مجھے گوہر مقصود کے ہاتھ آجانے کی کامل توقع تھی۔ اب یہ دشوار تر منزل آسانیوں کے پرتو سے معمور ہوتی جاتی تھی۔ راستہ تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے مختلف قسم کے لوگ۔ اکثر ایسے جن کے چہروں پر اطمینان تھا، سکون تھا، کہیں کسی کسی چہرہ پر مسرت کی ایک ہلکی سی لہر تھی۔ اکثر ایسے سرگرم جن کو دنیا اپنے ہاتھ سے دینا نہیں چاہتی۔ وہ دنیا سے خوش ہیں اور دنیا ان سے خوش۔ بعض کے قیافے یہ معلوم ہوتا تھا کہ بس جینا اور جیئے جانے کی تمنا کرنا ہی ان کی دلچسپیوں کا مرکز تھا۔ بھلا ان سے کیا میری تشنگی دور ہو سکتی تھی۔

ان کا افسانہ ہی کیا ہوگا ؟ مجھے اس آبِ حیات کی تلاش تھی جو ظلمات کی تاریکیوں میں اپنی پوری آب و تاب سے سیماب وش لرزاں تھا۔ میرے نزدیک تو ایسے لوگ داخل آدم ہی نہیں جو درد دل نہیں رکھتے۔

چینی میں بال آجانے سے اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔ وہ چیز دو کوڑی کی ہوجاتی ہے لیکن انسان کا دل جس کو عموماً آئینہ سے تشبیہ دیتے ہیں، ٹوٹ کر اتنا بیش قیمت اور انمول ہوجاتا ہے کہ دونوں عالم میں اس کو مول لینے کے لئے کوئی سرمایہ نہیں۔ اس کے افسانے کا پلاٹ جب ہی شروع ہوجاتا ہے۔ ایک المیہ و حزنیہ افسانے کا پلاٹ۔ مجھے ایک ایسی ہی شکستہ دل ہستی کی سعی لاحاصل تھی۔ لیکن "ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں۔" مالک کے کارخانے میں دیر ہے اندھیرا نہیں۔ آخر صیادِ جستجو کو اس کا صیدِ حقیقی مل چکا — ایک نوجوان لڑکا درویش جیسی شکل لئے ہوئے سامنے سے گزر گیا۔ جس کی چال ڈھال صورت شکل اس کی چغلی کھا رہے تھے کہ اس کا دل ایک آتش دان تھا، ایک دہکتی ہوئی آگ کی بھٹی تھی، جہاں کبھی شراروں نے اس کے لئے جینا وبال کر دیا تھا۔ لیکن اب امتدادِ زمانہ نے ان شراروں کو بجھا کر وہاں خاکستر کا ایک ڈھیر لگا دیا تھا۔ محبت کا نام میں نے کئی دفعہ سنا تھا، افسانے پڑھے تھے جن کی اکثریت محبت ہی کے گورکھ دھندے پر مبنی تھی۔ لیکن آج اس کو دیکھ کر محبت کے حقیقی معنے میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ میرے افسانے تو بالکل پھیکے، بے معنے اور نکمے ہوتے تھے۔ ان شاہکاروں سے ان کا کیا مقابلہ۔ لیکن ان بھولے ہوئے افسانوں کے خواب کی تعبیر مجھے اس کی شکل میں مل گئی تھی۔ محبت کو بعض کوتاہ بینوں نے گناہ سمجھا ہے۔ محبت نہ گناہ ہے نہ کوئی جرم بلکہ ایک مذہب ہے۔ ایمان ہے اور مذاہب تک پہنچنے کا ایک سب سے اونچا زینہ — اب سمجھنے والوں کا کیا ہے۔ دنیا کس کو اچھا سمجھتی ہے۔ اس کی نظروں میں تو سرے سے سب ہی برے ہیں۔ بدی جن میں بستی ہے اس کو ہر بات میں بدی کا ہی پہلو نظر آتا ہے۔ اچھوں کا خیال کبھی برائی کی طرف نہیں جاتا — اس کو دیکھنے سے پہلی نظر میں ہی یہ معلوم ہوجاتا تھا کہ اس پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ قدرت نے اپنے جبر و ظلم سے اس کو صبر کرنا بھی سکھلا دیا تھا۔ اس کو برداشت کے سب ڈھنگ آگئے تھے۔ گو صبر کا دامن کبھی کبھی ماضی کی کانٹوں میں الجھ کر پھٹ جاتا تھا۔ اور اس کے لئے زندگی اتنی دوبھر و اجیرن ہوجاتی تھی کہ وہ دیوار پر سر پٹک کر مرجانا چاہتا تھا۔ لیکن مر نہیں سکتا تھا۔ وہ خودکشی کو بزدلی سمجھتا تھا۔ بہادر ایک ہی وقت موت کا مزہ چکھتا ہے۔ اور نکمے بزدل دن میں سو مرتبہ مرتے ہیں۔ لیکن شاید محبت کرنے والے فی زمانہ سخت جان ہوتے جاتے ہیں۔ ورنہ کبھی تو یہ ضرب المثل عام تھی ؏

عشق جو کرتا ہے سنتے ہیں جواں مرجائے ہے

یہ تو صرف اس کو سرسری طور پر دیکھنے کے بعد میرا قیاس تھا۔ میں نے اپنے تخیل کا سرچشمہ آسمانی بلندیوں سے ٹکراتا ہوا آ رہا تھا جس میں کچھ جان تھی۔ جس طرح کسی بچہ کو کوئی نیا کھلونا ملنے سے خوشی ہوتی ہے۔ اس وقت اس کو کوئی دوسری بات یاد نہیں رہتی۔ اس کو کسی کی موجودگی کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ میری یہی کیفیت تھی۔ میری جستجو کی ناؤ کو سہارا مل گیا تھا، میری کھوج کے پیک کامیاب واپس آ رہے تھے — اس کی آنکھیں مجھے اپنی طرف کھینچتی تھیں — اس کی کھوسٹ تجربہ کار دل

جیسی چال، قدم اٹھانے میں ایک عجیب قسم کا پس وپیش ــــ گرد و نواح پر ایک ایسی نظر ڈال رہا تھا جیسے دنیا اس کی نگاہوں سے بالکل اتر گئی ہے۔ اس کے ذرہ ذرہ میں اس بوڑھے فلسفی کا نظریہ "دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا" رقص کرتا معلوم ہوتا تھا۔ میں کیسے اس سے گفتگو کروں۔ میں بات چیت میں پہل کروں تو وہ خدا جانے کیا سمجھے۔ میری جسارت ایک مہمل سی بات ہوگی۔ ایسے اور اس قسم کے کئی سوال میرے ذہن میں آمد و رفت کا سلسلہ باندھ چکے تھے۔ مگر کسی اجنبی کو حق ہی کیا ہے کہ وہ اس طرح کسی کو بے تکلفی سے مخاطب کرے۔ لیکن مجھے اس وقت کوئی اور ہی دنیا بسانے کی فکر تھی۔ مجھے اپنی جستجو نے اندھا بنا دیا تھا۔ میری عادت نہیں کہ بات چیت میں کبھی کسی سے سبقت کروں۔ اسی لئے مجھ سے ملنے والے مجھے مغرور سمجھتے ہیں۔ جو انتہائی غلطی پر ہیں۔ لیکن اس وقت میرا دعویٰ خود داری باطل ہوا جاتا تھا میری حمیت کا بھرم کھلنے والا تھا۔ اپنی عادت پر جبر کرنا بھی بعض وقت کتنا سنگین ارادہ بن جاتا ہے۔ میں نے اس کا راستہ روک لیا اور اس سے بالکل واقف کاروں جیسی باتیں کرنے لگا۔

میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ شاید آپ ــــ اور میری زبان میں لکنت سی آگئی۔ مجھ پر ایک رعب سا طاری ہو گیا۔ اور آگے میں کچھ بول نہ سکا ــــ پھر بھی بڑی ہمت کر کے یہ۔ یہ لیجئے سگریٹ ــــ اب میں یہ سوچنے لگا کہ صرف محبت ہی اندھی نہیں ہوتی، تمنا کو بھی اندھا ہونے کا حق ہے۔ اس نے میرے سگریٹ کے سوال پر ایک بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ بڑی متانت سے جواب دیا "آپ بھولتے ہیں۔ میں نے تو کبھی آپ کو نہیں دیکھا۔ مجھے جمالی کہتے ہیں۔ سگریٹ چھوڑے مجھے عرصہ ہوا۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں کہ کب چھوڑا تھا۔ اب تو مجھے کسی چیز کی بھی طلب نہیں رہی۔ مرگ ناگہاں کا طالب ہوں اور بس۔ آپ میری اس بدتمیزی سے ناراض تو نہیں؟" اس کی آواز میں ایک رقت تھی۔ ایک کیف اور سوز و گداز تھا۔ اس کے تیور سے ایک بے بسی و بے کسی کی جھلک نمایاں تھی۔ اس کی بناوٹی ہنسی غائب ہو گئی تھی۔ اس کے چہرہ کا ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ میں منزل مقصود کے بالکل کنارے لگ گیا تھا۔ میرا دل متضاد کیفیات کا بازیگاہ بنا ہوا تھا۔ لیکن جذبات چھپانے میں مجھے خوب ملکہ حاصل تھا۔ خوشی و غم کا اظہار بے ڈھنگے پن سے وہ کرے جس کو کبھی کبھی یہ واردات پیش آئے۔ سرے سے جس کی زندگی ہجوم افکار و آلام کے ہنگاموں سے معمور ہو اس کے لئے "مسرت" تو ایک بے معنی سا لفظ ہے۔ اب رہا غم ــــ جو غم دل ہے۔ وہ تو جان سے بھی زیادہ عزیز و پیارا ہے ــــ

ہاں تو میں پھر اس کی جانب ایسے مخاطب ہوا جیسے میرے دل میں کچھ تلاطم ہی نہیں۔ سگریٹ کا دھواں ہوا میں منتشر کرتے ایک انداز استغنا سے :۔ کیوں ایسی کیا دنیا سے بیزاری یہ سن اور ایسی نکمی باتیں۔ تم جیسے نوجوانوں کو تو زیب نہیں دیتیں۔ قومیت کو تم پر ناز ہونا چاہیئے۔ یہ زمانہ قیس و فرہاد کا نہیں رہا۔ دنیا زندہ دل ہستیوں کو آنکھوں پر بٹھاتی ہے۔ رونے والے تنہا روتے رہتے ہیں۔ تم ہنسو دیکھو ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی ہنسی آجائے گی۔ رونا بسورنا چہرہ کی رونق کو بگاڑ دیتا ہے۔ جمالی ــــ (قطع کلام کرتے ہوئے) اف آپ تو حضرت ناصح کے بھی پڑدادا معلوم ہوتے ہیں۔ ایک ہی سانس میں اتنی نصیحتیں۔ مگر حضور یہ خادم اب نصیحت کے حلقہ سے باہر ہے آپ اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ مجھ پر کسی کی خفگی کا اب اثر نہیں ہوتا ہے

ہم سے شکستہ بال اسیروں کے روبرو
ناحق خبر نہ لا کے سناؤ بہار کی

معاف کرنا آپ تو مجھے کوئی خفیہ پولیس معلوم ہوتے ہیں۔

میں ــــ کیوں کیا سوائے خفیہ کے کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی سے کچھ دریافت کرے؟

جمالی ــــ ہے کیوں نہیں۔ لیکن میری زندگی میں ایسی کوئی دلکشی نہیں جس کو سن کر آپ مطمئن ہو سکیں پھیکے جیون میں رس کہاں سے آئے۔ ندی جب سوکھ جاتی ہے تو بارش کی انتہائی کثرت بھی اس کو از سر نو تر و تازہ نہیں کر سکتی ــــ ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے اس کے قلب و جگر میں نمی آجائے ــــ جیسے اس وقت آپ کی پرلطف گفتگو سے میرا غم ہلکا ہوتا جا رہا ہے ــــ لیکن جونہی یہ فضا ہٹے پھر وہی میں اور وہی [illegible] زندگی ــــ وہی سوکھی ہوئی ندی ــــ وہی تمازت آفتاب سے جھلسی ہوئی ایک پگڈنڈی ــــ "عموماً پتھر کے نیچے پانی رہتا ہے لیکن جمالی کا دل ایک ایسی چٹان تھا جس کی انتہائی گہرائیوں تک صرف پتھر ہی پتھر ہوں۔ ایسی سنگلاخ زمین سے جب دھواں نکلے تو کیا اس کی صرف بھاپ سے ہی سارا سنسار جل نہیں سکتا؟ بات کرتے میں اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھیں مبہوت و ساکت تھیں۔ ان میں جان تھی مگر چمک نہ تھی۔ جگر تک غالباً اس کا جل گیا تھا۔ جہاں آنسو جل چکے تھے، میری دلی بے چینیوں میں لمحوں اضافہ ہو رہا تھا۔ اطمینان مجھ سے کوسوں دور چلا گیا تھا۔ اس لئے آفتاب بھی روپوش ہونے کے لئے بستر بدل رہا تھا۔ چرواہے ادھر ادھر سے اپنے اپنے مویشیوں کو سمیٹ رہے تھے۔ دیہات کی جھونپڑیوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ راستہ پر ایک آسیبی سناٹا چھا گیا تھا۔ درخت بھوتوں کی طرح کھڑے فطرت کے نشیب و فراز پر غور کر رہے تھے۔ چاند میں بتدریج چمک اور روشنی پیدا ہو رہی تھی۔ تارے کسی کے دل کی طرح دھڑک دھڑک کر فضائے سماوی پر نمایاں ہو رہے تھے۔ غرض ایک دنیا پر روانی کیفیت تھی۔ ایک عالم پر محویت تھی ــــ لیکن میرے قلب کے ہیجان میں کوئی کمی نہ تھی۔ صبح کا نکلا ہوا۔ بھوک سے میری جان پر بنی تھی۔ چلتے چلتے ہم ایک رسٹراں میں پہنچے۔ وہاں چاء پی۔ کچھ زہر مار کیا۔ اور پھر نکل گئے۔ ہم ایک مختصر سے پارک میں جا بیٹھے۔ درختوں کے سایہ سے چاندنی چھن چھن کر گر رہی تھی۔ بڑا سہانا وقت تھا۔

جمالی نے ایک انگڑائی لی۔ اور کہنے لگا:۔ مگر آپ کا نام۔ آپ نے نہیں بتایا؟ میں ــــ مجھے شاہد کہتے ہیں

جمالی (کچھ سوچتے ہوئے) مجھے اس نام سے ایک عجیب انس معلوم ہوتا ہے۔

شاہد ــــ واقعی؟ تب تو میں بڑا خوش نصیب ہوں۔ کم از کم میرے نام سے تو تمھیں انس ہے۔ یہ سنتے ہی جمالی پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگا ــــ میں مضطرب ہو گیا۔ میرا جی چاہتا تھا اس کے قدموں پر گر جاؤں اور اس کے رونے کا سبب پوچھوں۔ لیکن ہمت نہ ہوتی تھی۔ بتائیے آپ کو ایسے اتفاقات ہوں تو آپ کیا کریں گے؟ میری تو سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی ــــ پہلے تو میں نے اس کو خوب رونے دیا کہ دل کا سوز ذرا ٹھنڈا ہو جائے۔ مگر نہیں ایسا نہیں ہے۔ ان آنسوؤں کے فلسفہ پر بہت دل دکھا کے یہ نظریہ کسی نے قایم کیا ہے ؎

سیلاب اشک گرم نے اعضاء میرے تمام　　اے درد کچھ بہا دیئے اور کچھ جلا دیئے

جیسے ہر طوفان سے پہلے ایک سکون ہوتا ہے اسی طرح اس طوفان کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا جس کو سکون کہنا پڑے گا۔ یہ نظام کائنات کے منتر ہیں۔ دنیا ایک حالت پر نہیں رہتی —— جمالی کا گریۂ پیہم ہچکیوں میں تبدیل ہوتے ہوئے خاموش ہوگیا۔ اس کے ہاتھ پیر سرد ہوتے جاتے تھے۔ میں نے کہا "تم نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ بچوں کی طرح رونا۔ بڑی شرم کی بات ہے۔ بتاؤ جمالی میں تمہارا دوست ہوں۔ "بھائی" بننا نہیں چاہتا۔ کیونکہ بھائی بہت سے ہوتے ہیں۔ سچے دوست نہیں ملتے"۔

جمالی —— شاید اب تم سے کچھ چھپانا میرے نزدیک گناہِ عظیم سے بھی کچھ پرے ہے۔ سنو۔ میں نے محبت کی تھی۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ایسی غلطی مجھ سے ہوگئی۔ محبت دوراندیش نہیں ہوتی۔ بھولا بھالا انسان کتنی جلد اس کے ہتھکنڈوں میں پھنس جاتا ہے محبت کی ابتدا کتنی سندر ہوتی ہے۔ لیکن شاید تمنا پوری ہو تو زندگی وہیں ختم ہوجاتی ہے لیکن شاید یہ مکار اور پاپی سماج سچی و بے لوث محبت کو بھی نام رکھتی ہے۔ گر بلند و بالا کردار والے سماج کی ٹیڑھی نگاہوں، بے تباہ نکتہ چینیوں ناروا بہتانوں کو ہمیشہ حقارت سے ٹھکرا دیتے ہیں۔ محبت ایک شریف اور نیک جذبہ ہے۔ ہے نا؟ اور شرافت کا محبت سے گہرا تعلق ہے۔ اسی لئے تو محبت کا درجہ ایک مذہب کے مترادف ہے۔ شاید قدرت کے احسان مصیبت کی شکل میں بھی ہوتے ہیں۔ میں اپنے ٹھکانے پر چپ چاپ ایک خاموش زندگی بسر کر رہا تھا۔ مگر قدرت کے تیور بگڑ رہے تھے۔ وہ مجھ سے نجانے میرے کون سے گناہ کا بدلہ لینے والی تھی —— "کسی" نے میری زندگی میں قدم رکھکر —— اب اس کے آگے مت پوچھو اور نہ میں تمھیں بتا سکوں گا۔ یہ میری زندگی کا بہت بڑا راز ہے اب تک تو صرف "اسی کے لئے" جینے کا احساس تھا مگر اب —— یہ داستان بھی ختم ہوچکی ہے۔ میرے جیون کو یونہیں بیت جانے دو۔ ہٹو یہاں سے" وہ کچھ بہک گیا تھا۔ اس کا دماغی توازن بگڑ رہا تھا —— اس نے جس پتھر پر پیر رکھا تھا وہ ہٹ گیا تھا۔ اس کی زندگی ڈانوا ڈول ہوگئی تھی —— اس کے بعد میں اور جمالی ایک ہی ساتھ رہتے تھے۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ یوں تو اس کے کچھ عزیز تھے مگر وہ سب سے دور رہنا چاہتا تھا —— ہم کو ساتھ رہتے رہتے ۱۰-۱۲ سال ہوتے ہیں —— لیکن جمالی کی حالت میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا —— وہی خاموشی ہے —— وہی چپ ہے —— وہی سب کی نظریں بچاکر رونا ہے۔ راتیں سسکیوں کی آواز میں گم ہوجاتی ہیں ؎

کسی کی یاد کو سینے میں "دل" بنائے ہوئے
بہانہ ڈھونڈتا پھرتا ہوں اپنے مرنے کا

واقعی دنیا میں سچی محبت کرنے والے ہزاروں میں "ایک" ہوتے ہوں گے وہ بھی —— شاید ——!!

جہاں بانو بیگم

اردو کے ہندو ادیب

اردو اور نثری ادب کو بنانے اور ترقی دینے میں بھی ہندو ادیبوں اور انشا پردازوں کا اتنا ہی وسیع حصہ ہے جتنا اردو شاعری کو مقبول بنانے اور ترقی کے موجودہ مدارج تک پہنچانے میں ہے۔ نظم اور شاعری میں ان کی کوششیں جس طرح غزل قصیدہ مثنوی رباعی غرض ہر صنف پر حاوی ہیں اسی طرح نثر میں بھی ان کے کارنامے داستان قصص ناول خطوط ڈراما غرض ہر ادبی صنف میں موجود ہیں ان میں کئی کارنامے ایسے ہیں جو بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور ان کے شعری کارناموں کی طرح "ادب عالی" میں داخل ہو چکے ہیں۔

جس زمانے سے اردو نثر لکھنے کا رواج عام ہونے لگا اور اردو انشا پرداز فارسی کی تقلید میں خیالی مضامین مقفیٰ اور مسجع عبارتیں لکھنے لگے، ہندو انشا پردازوں نے بھی اس میں اپنی طبیعت کے جوہر دکھائے لیکن ایسے نثری کارنامے اب کم ملتے ہیں صرف تحسین اٹاوی کی "نو طرز مرصع" نمونے کے لئے باقی رہ گئی ہے۔

اردو نثر کی ترقی اور ترویج حقیقی طور پر ۱۸۰۰ء سے شروع ہوتی ہے اسی زمانے میں کلکتہ کا وہ مشہور مدرسہ قائم کیا گیا جس کے کارنامے اردو نثر کی ترقی میں داغ بیل کا حکم رکھتے ہیں۔ اس مدرسے کے قیام کا مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ان عہدہ داروں کے لئے جو ہندوستان میں خدمتوں پر مامور ہو کر آتے یہاں کی عام زبان میں درس و تدریس کے وسائل فراہم کرنا تھا۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے کمپنی کے اعلیٰ عہدہ دار ڈاکٹر گلکرسٹ نے مدرسے میں اطرافِ ہند سے ہندوستانی زبان کے اچھے لکھنے والے اور ادیب جمع کئے۔ انھیں ہدایت کی گئی تھی کہ مروجہ طرز عبارت آرائی کو چھوڑ کر عام بول چال کی زبان میں کتابیں لکھیں چنانچہ اسی ہدایت کے بموجب میر امن دہلوی نے "باغ و بہار" تصنیف کی جو عام طور پر "قصہ چہار درویش" کے نام سے موسوم اور مشہور ہے۔ میر امن کے علاوہ حیدر بخش حیدری، للو لال کوی، نہال چند لاہوری، بینی نرائن جہاں، بہادر علی حسینی، مرزا علی لطف وغیرہ نے بھی کتابیں تصنیف کیں اور اس طرح اردو نثر کا ابتدائی ذخیرہ پیدا ہوا۔

ان اہلِ قلم کی کوششوں میں ادبی لحاظ سے یہ اہمیت رکھتی ہیں۔ طوطا کہانی، لطایفِ ہندی، سنگھاسن بتیی، مذہبِ عشق، چہار گلشن، نثر بے نظیر، اخلاقِ ہندی اور گلشنِ ہند۔

ان آٹھ کارناموں میں سے چار ہندو ادیبوں کے ہیں۔

للو رام اور ان کے ایک اور ساتھی سدل مسرا، درحقیقت ہندی نثر میں کتابیں لکھنے کے لئے مامور کئے گئے تھے چنانچہ انھوں نے ہندوستانی زبان سے عام مسلمان مصنفین کے برخلاف فارسی اور عربی کے الفاظ کو چھانٹ کر ان کی جگہ سنسکرت کلکم اور برج بھاشا کے الفاظ زیادہ داخل کر کے ہندی نثر کی داغ بیل ڈالی لیکن للو لال کی کتابیں "لطایف ہندی" اور "سنگھاسن بتیسی" دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخطوں میں چھپی ہیں اور جس طرح وہ ہندی میں شوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں، اردو میں بھی عام طور پر مقبول ہیں۔ چنانچہ ان کے کئی ایڈیشن چھپتے رہے ہیں۔ ہمارے زمانے میں ناول اور مغربی طرز کے مختصر قصوں کی ترویج کے سبب ان قدیم قصوں کا زیادہ رواج نہیں رہا۔

نہال چند لاہوری کی تصنیف "مذہب عشق" اور منشی بینی نرائن جہاں کی کتابیں "نثر بے نظیر" اور "چہار گلشن" اس زمانے کی مروجہ اردو نثر ہی میں لکھی گئی ہیں اور اہمیت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔

اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج سے باہر جو لکھنے والے شہرت رکھتے تھے ان میں ہندو ادیبوں کی تعداد مسلمانوں سے

کچھ کم نہیں ہے۔ مسلمان ادیبوں میں صرف رجب علی بیگ سرور، فقیر محمد خاں گویا اور مولنا غلام امام شہید کے نام لئے جا سکتے ہیں لیکن ہندوؤں میں اور خاص طور پر مقبول اور عام مذاق کے مطابق لکھنے والوں کی تعداد ایک درجن سے کسی طرح کم نہیں ملے گی۔ ان میں سب سے پہلے نیم چند کھتری کا نام ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان کا قصہ "گل باصنوبر" بے حد مقبول ہوا۔ اور ناول کی ترویج سے پہلے تک بہت پڑھا جاتا تھا۔ اب بھی اردو کے مقبول قصوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ دوسرے لکھنے والے منشی جیون جی لال ہیں جن کا قصہ "قصۂ سورج پور" کئی دفعہ چھپ چکا ہے۔ ایک اور اچھے لکھنے والے منشی طوطا رام شایاں تھے۔ جنھوں نے "الف لیلیٰ" کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔
"نل دمینتی" کے مشہور ناٹک کو اردو میں منتقل کرنے کی خدمت جس ہندو ادیب نے انجام دی وہ منشی بنائک پرشاد تھے۔ منشی ٹھاکر پرشاد اپنی تصنیف "افسانۂ پرفضا" کی وجہ شہرت رکھتے ہیں ایک اور انشا پرداز منشی نیم چند ہیں جن کا قصہ "اگر گل" اتنا ہی مقبول اور مشہور ہوا جتنا "مذہب عشق" یعنی گل بکاؤلی کا قصہ یا آرائش محفل یا حاتم طائی کا قصہ۔ منشی ہلاتی داس کا قصہ "حیرت افزا" بھی اسی سلسلے کے مقبول قصوں میں شمار ہوتا ہے۔ ایک اور قصہ جو کئی بار چھپ چکا ہے۔ منشی انبی پرشاد کا قصۂ طوطا مینا ہے۔
ان قصہ نگار ادیبوں کے علاوہ کئی ادیب ایسے بھی ہیں جو دوسرے کاموں پر مامور تھے اس لئے بحیثیت ادب کے متعلق وہ زیادہ تصنیف و تالیف نہ کر سکے۔ یہ تاریخ، سائنس اور حکمیات اور تذکروں کی تدوین میں مشغول رہے۔ منشی سدا سکھ لال نے "سوپریم گورنمنٹ ایکٹ" کے قانون کو اردو میں منتقل کیا۔ پنڈت سروپ نارائن اور پنڈت شیو نرائن جو اس زمانے میں دہلی کالج کے اعلیٰ اسکالر تھے طبیعات میں ایک کتاب کے مترجم ہیں جو "حکمت عملی" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ اردو نثر کی ترقی کا ابتدائی دور ہے اس کے باوجود ان مترجمین نے علمی خیالات کے اظہار کے لئے جیسی عمدہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے اس سے ان کی قدرتِ زبان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔
دہلی کالج کے ایک اور مشہور مصنف ماسٹر رام چندر ہیں جن کی تالیف "تذکرۃ الکاملین" بھی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں یونان روما اور انگلستان کے مشہور فلسفیوں کے علاوہ فارسی شعرا اور ہندی مشاہیر کے حالات نہایت سلیس اور صاف زبان میں لکھے گئے ہیں۔ ماسٹر رام چندر کا سب سے بڑا اور نمایاں امتیاز یہ ہے کہ اردو کے ایسے غیر فانی ادیب جیسے آزاد، نذیر احمد اور ذکاء اللہ نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا ہے۔ "تذکرۃ الکاملین" کے علاوہ ان کی دو اور کتابیں بھی قابلِ ذکر ہیں ایک "اصول علم ہیئت" اور دوسری "عجائب روزگار"۔
اردو ادب کا جب جدید دور شروع ہوا۔ اور اردو زبان سرسید احمد خاں، حالی، آزاد، نذیر احمد، ذکاء اللہ، اور شبلی کی انتھک کوششوں سے جلد جلد وسعت اور ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کر رہی تھی، ہندو ادیب بھی مسلمان ادیبوں کے دوش بدوش اس کو ترقی دینے میں مصروف تھے لیکن جدید عہد کی تحریکوں سے وہ اس قدر جلد متاثر نہیں ہوئے بلکہ وہ قدیم زبان ہی کے پیرو تھے اور اسی انداز میں اپنی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان میں جو قابلِ ذکر ہیں ان میں سے ایک منشی دیبی پرشاد جو سنجیدہ عالم تھے اور ادب کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے۔ تاریخ اور سیر سے ان کو بڑی دلچسپی تھی چنانچہ اسی مطالعے کے نتیجے کے طور پر جو ذخیرہ ان کے پاس فراہم تھا

اس میں سے تاریخی لطیفوں کو چھانٹ کر انھوں نے ایک کتاب "لطائف ہندی" کے نام سے لکھی تھی جو منشی نولکشور کے مطبع سے شائع ہوئی۔ منشی دیبی پرشاد کی تصنیفات تعداد میں زیادہ نہیں ہیں لیکن اپنے علمی مذاق اور ثقہ ذوق کی وجہ سے وہ احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اردو شعر و سخن اور ادب کا ذوق انھیں ترکے میں ملا تھا۔ ان کے والد منشی نتھن لال بہجت فارسی اور اردو کے اچھے انشاء پرداز اور شاعر تھے۔

ایک اور مصنف بابو جگناتھ پرشاد فیض ہیں۔ جن کا تذکرہ "گلزار سخن" ہمیشہ تک زندہ رہے گا۔ یہ تذکرہ نہ صرف شعرا کے حالات پر مشتمل ہے بلکہ اس میں عروض اور قافیے کے متعلق بھی مفید معلومات درج ہیں۔ اس تذکرے کی ترتیب میں مرتب کو اپنے ایک دوست رام کرن سے بڑی مدد ملی تھی جس کا انھوں نے اعتراف کیا ہے۔

اردو میں کنڈر گارٹن یعنے چھوٹے بچوں کی تعلیم کے موضوع پر غالباً پہلی کتاب جو اس زمانے میں لکھی گئی اس کے مصنف لالہ خزان چند جادلہ بی اے ہیں وہ ضلع لائل پور کے ہستم مدارس تھے۔

اس زمانے کے بعض مشہور اخبار نویس بھی ہندو ہیں۔ "سحر سامری" کے نام سے جو ہفتہ وار لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا اس کے مدیر رائے گمبھیر نرائن تھے مشہور "اودھ اخبار" کے مالک اور مدیر منشی نولکشور تھے۔

منشی نولکشور اردو ادب کے بقا اور زبان کی اشاعت میں وہ کام کر گئے جو بہت کم لوگوں سے ہو سکا۔ اس زمانے میں جبکہ اردو چھاپہ خانوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی انھوں نے اپنے مطبع کے ذریعے "اردو ادب عالی" کے جواہر پاروں کو محفوظ کرنے کی جو سعی بلیغ کی ہے وہ اردو زبان کے ساتھ ساتھ ان کی شہرت کو بھی برقرار رکھے گی۔ اس مطبع کی ادبی خدمات کا تذکرہ ایک تفصیلی کتاب چاہتا ہے۔ منشی نولکشور کے بعد ان کے جانشین منشی حالیا پرشاد اور ان کے ساتھیوں نے اس خدمت کو اسی سلیقے اور بلند ہمتی کے ساتھ جاری رکھا۔ "اودھ اخبار" کی ترقی بھی مطبع کے ساتھ ساتھ جاری رہی۔ اسی اخبار کو پنڈت رتن ناتھ سرشار کی ادارت کا شرف بھی حاصل رہ چکا ہے۔

عصر جدید کے اس دور تحریکات کا تذکرہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے کارناموں کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جا سکتا۔ سرشار اردو کے باقی رہنے والے ادیبوں اور افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ یہ اور نذیر احمد دونوں اپنے اپنے قصوں کے ذریعے آیندہ اردو ناول کے لئے راستہ صاف کر گئے۔ خود سرشار کے آخری قصے انگریزی ناول سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ سرشار کا لازوال کارنامہ ان کا "فسانۂ آزاد" ہے۔ یہ ایک طویل قصہ ہے اور خاکے کے اعتبار سے بہت چست نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس کے بعض کردار ہماری مٹی ہوئی معاشرت کے نقوش کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ سرشار کی تحریروں میں ان کے دوسرے معاصرین کے مقابلے میں مزاح کی چاشنی زیادہ ہے۔ سرشار کا دوسرا کارنامہ "خدائی فوجدار" ہسپانیہ کے لافانی ادیب سروانٹس سے متاثر ہے۔

یہ جدید عصر کا ابتدائی زمانہ تھا۔ جو تخریب اور تعمیر کی تحریکوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے ختم ہوتے ہوتے ایک نسبتاً پرسکون زمانہ شروع ہوتا ہے جس میں منشی ہرگوپال تفتہ۔ لالہ گوری شنکر ساگر، لالہ لدا رام نغز، منشی بشن نرائن ابجار گو وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ تفتہ غالب کے چہیتے شاگرد تھے اور نظم اور نثر دونوں میں غالب کی تحریروں کو پیش نظر رکھتے تھے۔ گوری شنکر ساگر "ملاپ" کے مدیر تھے اور منشی بشن نارائن "اودھ اخبار" کے مالک اور مدیر اور منشی نولکشور کے جانشین ہیں۔

اس مختصر سے درمیانی زمانے کے بعد موجودہ عہد شروع ہوتا ہے۔ یہ عہد نئی نئی تحریکوں سے پر ہے۔ اور ہر تحریک میں ہندو ادیبوں کا پرخلوص حصہ موجود ہے۔ اس زمانے میں ہندو ادیبوں کے کارنامے ہر زمانے سے زیادہ شاندار نظر آتے ہیں۔ ان ادیبوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر کوئی تذکرہ مرتب کیا جائے جو محض انہی کے کارناموں پر مشتمل ہو تو وہ کئی سو صفحوں پر ختم ہوگا۔ ان میں مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر شاد، چکبست، پریم چند، پنڈت دتاتریہ کیفی، منشی دیانرائن نگم، جگت موہن لال رواں، پرنسپل رام پرشاد، کھوسلہ ناشاد، پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق، پروفیسر مہیش پرشاد، منشی سدرشن، پروفیسر کرشن چند وغیرہ چند مشہور نام ہیں۔

مہاراجہ بہادر جن کی ادبی سرپرستیوں کی گونج ابھی تک اس فضاء میں باقی ہے جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان کا انداز سادہ اور اظہار راست ہوتا ہے۔ ابتدا میں ان کی عبارتوں پر پنڈت رتن ناتھ سرشار کا کافی اثر رہا۔ چنانچہ ان کا ایک ناول "مطلع خورشید" سرشار ہی کے انداز میں لکھا ہوا ہے۔ ایک سفرنامہ بھی ہے جو نہایت دلچسپ ہے۔

چکبست کے متعلق یہ تصفیہ کرنا مشکل ہے کہ وہ شاعری میں زیادہ شہرت رکھتے ہیں یا نثر نگاری میں۔ ان کے ادبی مضامین معرکۃ الآرا ہیں اور کئی امتحانوں کے نصاب میں داخل ہیں۔

موجودہ عہد اور ہر عہد کے ادیبوں میں پریم چند کی ٹکر کا کوئی ادیب نہیں پیدا ہو سکا۔ خاص طور پر مختصر قصہ نگاری میں انھوں نے جو اونچی جگہ پیدا کرلی ہے وہاں تک پہنچنا دوسرے قصہ نگاروں کے لئے دشوار ہو گیا ہے۔ ان کی طرز کے لکھنے والوں میں منشی سدرشن بھی اردو ادب میں اپنی جگہ پیدا کر چکے ہیں۔ پنڈت کیفی ایک ایسے اسلوب کے مالک ہیں جس میں موجودہ عہد کے راست طریقۂ اظہار کے ساتھ ساتھ آزاد مرحوم کا چوچلا پن بھی موجود ہے۔ پروفیسر مہیش پرشاد کی تحقیقات غالب کے متعلق مستند مانی گئی ہیں۔ پرنسپل رام پرشاد ناشاد، جگیشور ناتھ ورما بیتاب، منشی تلوک چند محروم، رائے بہادر پنڈت شیو نرائن شمیم، پنڈت امرناتھ جھا، پنڈت منوہر لال زتشی، جگت موہن لال رواں، نوبت رائے نظر ہمارے زمانے کے مشہور مصنفین، مقالہ نگار اور شاعر ہیں۔ اس زمانے میں نئے ادب کی جو تحریک برسر کار ہے اس کے سرگرم وکیلوں میں کرشن چند، اپندر ناتھ اشک، گربخش سنگھ وغیرہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔

اخبار نویسوں اور مدیروں میں منشی دیانرائن نگم کا نام سرفہرست ہے۔ وہ تیس سال سے زیادہ عرصہ سے مسلسل اور انتھک اردو زبان اور ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ رسالہ "زمانہ" ان کی مستقل مزاجی اور ثقہ مذاق کا ثبوت ہے۔ ان کے علاوہ پنڈت دیوان سنگھ مفتون مدیر ریاست، ماسٹر جگت سنگھ مدیر ماہنامہ "رہنمائے تعلیم" لالہ رام لال وفا مدیر تیج، ڈاکٹر جگناتھ پرشاد مدیر دکن پنچ، رائے مجھن پرشاد صوفی مدیر ستارۂ جوگی، پنڈت نرسنگ راؤ مدیر رعیت دوسرے مشہور ارباب صحافت میں ہیں۔

حیدرآباد میں بھی اچھے لکھنے والے ہندو ادیبوں کی کسی زمانہ میں کمی نہیں رہی۔ ان میں سے بعض کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ ان کے علاوہ چند اور قابل ذکر یہ ہیں۔ پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ جن کی قابل قدر تصنیف "بستان آصفیہ" حیدرآباد کی تاریخ پر ایک یادگار کارنامے کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گی۔ راجہ راجیشور راؤ اصغر وسیع علمی اور ادبی دلچسپیوں کے مالک ہیں لیکن لغت اور زبان کی تحقیق ان کا خاص حصہ ہے۔ پنڈت رگھوناتھ راؤ درد صحافت اور افسانہ نگاری میں کافی شہرت رکھتے ہیں مولوی غلام محمد وفا کے ساتھ وہ رسالہ "تاج" کی ادارت کی خدمت بھی عرصہ تک انجام دیتے رہے۔ ان کے مختصر قصے بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ مسٹر جانکی پرشاد "عہد عثمانی" کے مصنف ہیں۔ جو حضرت سلطان العلوم کے عہد کی ترقیوں پر حاوی کتاب ہے۔ رائے گوبند پرشاد، پنڈت وشنو مادھو راؤ اور رائے بھوانی پرشاد صحافت کی دنیا میں مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ نوجوان لکھنے والوں میں رائے جنیندر راج سکسینہ حیاتیات کے مفید موضوعات پر دلچسپ مضامین لکھنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ وہ ایک دلچسپ کتاب "چیونٹی" کے مصنف بھی ہیں۔

یہ ایک سرسری خاکہ ان ہندو ادیبوں اور انشاء پردازوں کے کارناموں کا ہے جو مختلف زمانوں میں اردو ادب کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ یہ دریا کو کوزے میں سمانے کی ایک کوشش ہے لیکن اس سے تھوڑا سا اندازہ اس بات کا ہو سکتا ہے کہ اردو کی موجودہ ترقی میں ہندو ادیبوں اور لکھنے والوں کا کتنا وسیع حصہ ہے۔

عبدالقادر سروری

حادثہ کے بعد

سکنڈ کلاس کا ٹکٹ خرید کر میں بچھی ہوئی آہنی بنچ پر دراز ہوگیا، اور ٹرین کے انتظار میں اخبار سے جی بہلانے لگا، مشکل سے چند لمحہ گزرے ہوں گے کہ، ایک گیند میرے پیروں کے پاس آکر گری، میں نے قریب سے آواز سنی "بیٹا! اُدھر نہ جانا، میاں بیوی بیٹھے ہیں" میں اپنے مطالعہ سے دفعتہً چونک اٹھا اور آواز کی جانب نظر کی، کوئی مسافر عورت اپنے بیٹے سے یہ کہہ رہی تھی، جو گیند کے کھیل میں مصروف تھا، اب میری نظریں اپنے قریب کا جائزہ لینے لگیں، میں نے دیکھا میری بنچ کے دوسرے سرے پر ایک حسین و جمیل لڑکی بیٹھی ہوئی ہے، نسوانیت کا مکمل نمونہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ ع

شفق میں ڈوبے ہوئے نور میں نہائے ہوئے

نگاہوں کے دوچار ہوجانے پر مجبوراً مجھے اپنی نظریں ہٹا کر اخبار کے صفحات پر جمانی پڑیں میں حیران تھا، الٰہی یہ کون لڑکی ہے، اور کہاں جانا چاہتی ہے، اس کے ساتھ کوئی سامان ہے اور نہ کوئی آدمی، اس اثنا میں گھنٹہ بجا، اور ٹرین دھن دھناتی ہوئی سر پر آن کھڑی ہوئی ہمارا ڈبہ مسافروں کے ہجوم سے قدرے ناآشنا تھا البتہ کونے والی نشست پر کوئی نیم انگریز بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا ـــــ اتفاق دیکھئے وہی لڑکی میرے ڈبہ میں گھس آئی، اور میری مقابل کی سیٹ پر اُس نے اپنا قبضہ جمایا ـــــ میں بدستور اخبار کے مطالعہ میں لگا رہا۔ لیکن میری متجسس نظریں کبھی کبھی اس اجنبی حسینہ تک پہنچنے کی کوشش کرتیں، مگر میرا سارا رجحان اسی کی طرف لگا ہوا تھا وہ کون ہے اور کہاں جارہی ہے یہ معلوم کرنے کے لئے میرا دل نہایت مضطرب تھا، میں نے اپنی نظریں اس کے حسین و جمیل چہرے پر جمادیں اس نے میری گستاخ نگاہوں کی تاب نہ لاکر اپنا چہرہ باہر کھڑکی کی طرف کرلیا، میں نے محسوس کیا، اس کے حسین چہرے پر کچھ غم و فکر کے آثار نمایاں ہیں، اس کی بڑی بڑی مستی فروش آنکھوں میں ایک قسم کی غم آلودہ دوشیزگی پنہاں تھی اس کے لباس اور بالوں کی بے ترتیبی نے مجھے یہ خیال کرنے پر مجبور کیا، کہ وہ ضرور کسی آفت میں مبتلا ہے، میرے دل کی حیرانی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جارہی تھی، میں اس سے گفتگو کرنے کے لئے کسی خاص موضوع کا متلاشی تھا، اس عرصہ میں ایک بڑا اسٹیشن آیا، بے تحاشہ مسافروں کی ایک ریل ہمارے ڈبہ میں گھس آئی اور دیکھتے دیکھتے ہمارے ڈبہ میں اچھی خاصی بدنظمی پھیل گئی، اس انتظام کی خاطر ریلوے محافظ کو اپنی روایات ملحوظ رکھنا پڑے، ٹرین گائیڈ نے ہر ایک صوفہ پر دو دو آدمی بیٹھنے کو کہا، گو میں بظاہر اخبار کے مطالعہ میں محو رہا، لیکن میرا دل مستقبل کے خیال سے سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ریلوے محافظ کی ایک چیخ ڈبہ کی فضا میں تھرائی "مل مسٹر تم اپنی وائف کے ساتھ کیوں نہیں بیٹھتا" میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا، اخبار میرے ہاتھوں میں کانپ رہا تھا آخر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ مجبوراً میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، اور آنکھوں سے اپنی بے چارگی کا اظہار کرتے ہوئے اُس خاتون سے معافی کا خواستگار ہوا، لڑکی نے میری طرف کوئی توجہ نہیں کی، وہ بدستور کھڑکی کے باہر نظریں ڈالے بیٹھی تھی میرے مقابل کی سیٹ پر اب کوئی نوجوان میاں بیوی آکر بیٹھ گئے، وہ دونوں کے دونوں حسین اور زندہ دل واقع

ہو گئے تھے میری نظریں چند ثانیوں تک نو وارد مسافروں کا
جائزہ لینے کے لئے ادھر ادھر بھٹکتی رہیں "معاف کیجئے گا"
کیا میں آپ سے یہ دریافت کر سکتا ہوں" میرے مقابل کے
نوجوان نے کہا" جناب نے کہاں کا ٹکٹ خریدا ہے" "بمبئی"
میں نے اپنے زیر مطالعہ اخبار کو تہہ کر کے کہا " اوہ! بڑی
خوشی کی بات ہے، میں بھی وہیں اتروں گا، اور کہاں کہاں
جانے کا خیال ہے؟" پھر میرے ہم سفر نے کہا، بمبئی میں کوئی
ایک ہفتہ گزار کر کلکتہ روانہ ہوں گا، اور کشمیر نہیں آپ نے
تو شاید رعایتی ٹکٹ خریدا ہوگا؟" "جی نہیں، یونہی، وہ ایک
کام کے سلسلہ میں مجھے یہ سفر کرنا پڑا، خیر کچھ ہو، تھوڑے بہت
دنوں تک تو آپ کا ہمارا ساتھ رہے گا، آئیے ہم ایک دوسرے
سے متعارف ہو جائیں۔ میں ہوں شہریار کاوس جی! حیدرآباد
میوزک فرم کمپنی کا پروپرائٹر۔ یہ میری بیوی، ہم دونوں ماہ
عسل منانے کے لئے بمبئی اور کلکتہ سے ہوتے ہوئے کشمیر جا رہے
ہیں یہ سفر ہمارا کوئی ایک مہینہ تک رہے گا، اب مجھے بھی
اپنا تعارف کروانا پڑا میں ادیب ہاشمی، والئی سلطان آباد
کا پرائیوٹ سکریٹری، سلطان آباد کے نواب صاحب ان دنوں
کلکتہ کے ایک مشہور ڈاکٹر کے زیر علاج ہیں، ان کے ولیعہد
امریکہ سے پرسوں سنیچر کے دن اترنے والے ہیں، بس میں
انھیں لینے کے لئے، بمبئی جا رہا ہوں اور ــــ اور یہ آپکی
بیوی ہیں، شہریار نے مصافحہ کے لئے لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھائے
لڑکی کی آنکھوں میں خفگی کا جذبہ امنڈ آیا، مجبوراً اس نے
اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھایا، وہ بالکل خاموش بیٹھی ہوئی
تھی، جیسے ایک حسین مرمریں مجسمہ، اس نے اپنے متعلق
ایک لفظ بھی نہیں کہا اور نہ کچھ کہنے کو میری ہمت بڑھی، شہریار
نے مجھ سے کچھ دیر سکوت کے بعد کہا، آپ دونوں میں کچھ
تکرار ضرور ہوئی ہے جو اس طرح الگ الگ منہ پھلائے بیٹھے
ہیں، بھلا میں اس کا کیا جواب دیتا، ایک ٹھنڈی آہ بھر کر
چپ ہو رہا، آہ کیا معلوم؟ ان لوگوں نے ہمیں کیا سمجھا، کاش
ایسا ہو سکتا ــــ

دیکھئے جناب کاوس نے کہنا شروع کیا، ہمیں چاہیئے
اپنی زندگی کے دن ہمیشہ ہنس بول کر گزاریں زندگی اسی کا
نام ہے۔

اب مجھے ان میاں بیوی کی زندگی پر رشک آنے لگا،
یہ کتنے زندہ دل، کتنے اچھے لوگ واقع ہوئے ہیں، ہمیشہ
یہ اپنی زندگی کے دن ہنس بول کر کاٹ لیتے ہیں، میں عجیب
کشمکش میں پھنسا ہوا تھا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا کہ کیوں
میں نے اپنے آپ کو راز میں رکھا لیکن میں کیا کر سکتا ہوں
جب کہ لڑکی نے خود اپنے یا میرے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہا ہو
ہاشمی صاحب، آپ مطمئن رہئے چند گھنٹہ میں میری بیوی
آپ کی بیوی کو ہموار کرے گی۔ میں خوش ہوں کہ اس طویل
سفر میں اسے ایک ہم جنس اور ہم راز مل گیا۔

ہاں ہاں، بیگم کاوس نے کہا میں ضرور ہاشمی صاحب
کی بیوی سے اپنا بہناپا کر لوں گی، اور مجھے امید ہے کہ وہ
میرے اصرار پر ہاشمی صاحب کو کشمیر چلنے پر مجبور کریں گی، میں نے
دیکھا کہ اجنبی لڑکی اس درمیان بالکل ساکت و صامت بیٹھی
رہی، اس کے چہرے سے اب بھی کرب و اضطراب کے آثار
نمایاں تھے، جیسے وہ ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہے،
ہماری ٹرین تیزی کے ساتھ متعدد اسٹیشنوں کو چھوڑتی ہوئی
اپنا سفر طے کر رہی تھی، سورج مغربی وادیوں میں آہستہ آہستہ

قدم بڑھا رہا تھا، صبح ہماری ٹرین دادر کے پلیٹ فارم پر جا لگی، اتفاقاً پلیٹ فارم پر میرے ایک جان پہچان کے آدمی لے یہ یہاں حیدرآبادی ہوٹل کے نیجر ہیں، مجھے ٹرین میں دیکھتے ہی بے تحاشہ دوڑے آئے اور مجھ سے بڑی تپاک کے ساتھ آملے۔

اوہو ہاشمی صاحب، ارے بھائی آپ خوب ملے دوست، کہئے کیسے آنا ہوا، ارے آپ کے ساتھ زنانہ بھی ہے، چلئے ہمارا ہوٹل بڑا پاک صاف ہونے کے علاوہ آرام دہ بھی ہے کہاں ہے آپ کا سامان، میرا نوکرا سے اتار لے گا، اب میری پریشانی ملاحظہ فرمائیے، رہ رہ کر مجھے اپنی بے کسی پر رونا آرہا تھا، چلئے بانو صاحبہ! منیجر نے میری ساتھ والی لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، میری کار باہر آپ کا انتظار کر رہی ہے میں حیران تھا، آخر یہ راز کب وا ہوگا، اجنبی حسینہ حسرت مایوسی کا مجسمہ بنی کھڑی تھی، میرے دل میں اس کے متعلق ہمدردی کی ایک لہر اٹھی، آہ وہ کتنی مایوس و مجبور نظر آتی ہے، چلئے میں نے نامعلوم دلی جذبات سے مجبور ہو کر اپنے ساتھی سے کہا یہ پہلی دفعہ ہے جو میں نے اس سے بات کی، دس منٹ کے عرصہ میں ہم ہوٹل پہونچ گئے ہوٹل کے مالک حیدرآبادی پٹھان ہیں، مجھ سے وہ بڑے اخلاق کے ساتھ ملے تیسری منزل کے دو بڑے کمرے ہمارے تفویض کئے گئے۔ ایک میرے لئے اور دوسرا اس پراسرار اجنبی خاتون کے لئے۔

اس دن لڑکی تمام دن اپنے کمرے میں بند پڑی رہی رات کا کھانا بھی اس نے اپنے کمرے میں منگوا لیا تھا صبح کے ناشتہ کے بعد مجھ سے شہریار اور اس کی بیوی ملنے آئے وہ میری بیوی کے متعلق پوچھتے رہے۔ میں نے ان کے سامنے ناسازی مزاج کا عذر پیش کیا۔ یہ میں نے اپنے دوستوں سے صریحاً جھوٹ کہا۔ اب یہ مجھے اپنے ساتھ باہر لے جانا چاہتے تھے۔ شہریار اور اس کی بیوی کسی ایرانی ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ میاں بیوی ہمیشہ ہنستے بولتے رہتے ہیں۔ اور وہ مجھ کو بھی خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر آہ ان لوگوں کو کیا معلوم، میں کس حالت میں خوش رہ سکتا ہوں۔ میں لباس تبدیل کر کے ان کے ہمراہ روانہ ہوا۔ پہلے تار گھر پہونچ کر میں نے تین تار روانہ کئے ایک اپنے وطن کو، دوسرا نواب صاحب کے پاس کلکتہ، تیسرا صاحبزادہ کے پاس جہاز پر بھیجدیا، وہاں سے فارغ ہو کر جہاز کی آمد کا وقت معلوم کرنے کے لئے دفتر کو پہونچا معلوم ہوا کہ ٹھیک دس بجے جہاز بندرگاہ پر آجائے گا۔ وہاں سے رخصت ہو کر دوپہر کا کھانا شہریار کے ساتھ ایک ہوٹل میں کھایا غرض دن بھر خوب شہریار اور ان کی بیوی کے ساتھ شہر کی تفریح کرتے رہے رات کے دس بجے میں ہوٹل واپس ہوا۔ کھاتے وقت میں نے ہوٹل کے نوکر سے لڑکی کے متعلق دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں بند ہے اور وہیں اس نے اپنا کھانا منگوا لیا ہے رہ رہ کر مجھے اس کا خیال ستا رہا تھا۔ مختلف خیالات میں گھیرا ہوا میں پریشان سا ہو چلا۔ خدایا وہ کون ہو گی اور کہاں جانا چاہتی ہے۔ آخر یہ راز مجھ سے کب تک چھپا رہے گا، میں نے طے کر لیا کہ کل صبح کسی طرح اس سے اس راز کے افشا کرنے کے لئے کہہ دوں گا میں نے اس کا نام اور حالات دریافت کئے بغیر چین نہ لوں گا۔ میں دیر تک انہی خیالوں میں الجھا رہا۔

صبح ہوٹل کے ملازم نے آکر ناشتہ تیار ہونے کی اطلاع دی میرے میز پر پہونچنے تک لڑکی ناشتہ شروع

کر چکی تھی میں اس کے سامنے والی نشست پر جا بیٹھا آج اس کا چہرہ بہت زیادہ مغموم اور افسردہ نظر آ رہا تھا اس نے کوئی لباس تبدیل کیا اور نہ اپنے بالوں میں تیل ڈالا۔ اس نے اپنی عجیب حالت بنا رکھی تھی اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نیند کا خمار تھا اس کی لمبی لمبی پلکیں رنج و غم کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں نیچی نظریں کئے ہوئے وہ اپنا ناشتہ ختم کرنے میں مصروف تھی اس کی یہ غیر حالت دیکھ کر میرا دل بھر آیا آخر کار میں بول اٹھا —— خاتون! آپ مغموم ——

ابھی میرا جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا وہ اپنی جگہ سے اٹھی، اور ناشتہ ختم کئے بغیر میرے سوال کا جواب آنسوؤں سے دیتی ہوئی چل دی۔ ہوٹل کے ملازم ہماری اس حرکت کو تعجب خیز نظروں سے دیکھتے رہے اس کے چلے جانے کے بعد میں اپنا ناشتہ ختم کئے بغیر کمرے سے باہر چلا آیا۔ میرا دل ناہموار واقعات سے متاثر ہو کر تڑپ اٹھا، بے اختیار میری آنکھیں بھر آئیں۔ آہ میں کتنا بدنصیب ہوں میں نے محسوس کیا کہ وہ کیوں میری موجودگی سے گھبراتی ہے وہ کتنی مغموم ہے ضرور وہ کوئی بڑی مصیبت میں گرفتار ہے۔ کاش میں اس کی کوئی مدد کر سکتا مجھے اس کے ساتھ کسی قدر انس ہو گیا تھا۔ جہاز کی آمد کا وقت قریب آ رہا تھا۔ تبدیل لباس کر کے میں باہر جانے کے لئے تیار ہوا۔ اس عرصہ میں ہوٹل کا منیجر میرے کمرے میں گھس آیا۔ ہاشمی صاحب! انھوں نے میرے کمرے میں داخل ہو کر کہا آپ کی بیوی کے نام یہ خط آیا ہے، چھوڑ جائیے، میں اسے پہونچا دوں گا۔ منیجر صاحب لفافہ میز پر رکھ کر چلے گئے ان کے جانے بعد یہ خیال میرے دماغ میں پیدا ہوا، کیوں نہ میں اس لفافہ کو کھول کر پڑھوں۔ شاید اس کے مطالعہ سے اس اجنبی لڑکی کا راز افشا ہو جائے اس خیال کے آتے ہی میں نے دروازے کے کواڑ بند کئے اور لفافہ چاک کر کے بغور خط کے مضمون کا مطالعہ کیا —— لکھا تھا ——

بہن عذرا! اس طرح تمھارے اچانک چلے جانے پر گھر میں ایک کہرام مچا ہوا ہے بندی خدا! ذرا کسی سے کہہ کر چلی گئی ہوتی، تمھارے لئے چچی اماں بے قرار ہیں وہ تو وہ تمھارے لئے میرے آنسو کس طرح نہیں تھمتے۔ مگر چچا ابا، کا دل ہے کہ پتھر بنا ہوا ہے وہ کبھی اپنے ارادے کو بدلنے کے نہیں، وہ تمھیں کسی طرح خوفناک تاریک کوئیں میں ڈھکیل دینا چاہتے تھے۔ بہن! دولت کی لالچ میں انسان کو کچھ اچھا برا دکھائی نہیں دیتا۔ شہاب، علیم، کے مقدمہ میں بالکل بے گناہ ثابت کروایا گیا وہ کل ہی جیل سے چھوٹ کر گھر آیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پیسہ پولیس اور عدالت کی آنکھوں میں دھول جھونک دیتا ہے کل سے پھر شہاب کے یہاں رنگ رلیاں شروع ہو گئی ہیں۔

بہن تم نے اچھا کیا جو یہاں سے چلی گئی۔ ورنہ چچا ضرور تمھیں شہاب کے گلے چیپ دیتے، چچی جان کو میں سمجھا دوں گی۔ بھوپال پہونچ کر ضرور اپنی خیریت سے مطلع کرو —— تمھاری بہن ——

"نوشابہ"

خط کے مطالعہ کے بعد میں نے اطمینان کی ایک سانس لی، چلو کچھ تو حالات روشنی میں آ گئے خط پہونچانے کے متعلق میں نے یہ رائے قایم کی کہ جہاز کی واپسی کے بعد دکھاؤں گا۔ نیچے اتر کر میں نے ٹیکسی والے کو آواز دی اور بندرگاہ چلنے کو کہا میرے سوار ہوتے ہی ڈرائیور نے موٹر کو اسٹارٹ کیا چند سکنڈ میں موٹر کی رفتار نہایت تیزی پر آ گئی میں نے

ڈرائیور کو احتیاط سے چلانے کو کہا اُس نے میری بات سنی ان سنی کر دی، اور بدستور اپنی رفتار جاری رکھی، اُس نے شراب کچھ زیادہ مقدار میں پی لی تھی، دیکھو سامنے سے ٹرام آ رہی ہے' میں نے پھر اس سے کہا ٹرام والا مسلسل خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا، وہ اب بالکل قریب آ چکی تھی، شراب کے نشہ میں ڈرائیور ضرور بہکا ہوا تھا وہ اپنا توازن قایم نہ رکھ سکا اس کے ہینڈل کو تھامے ہوئے ہاتھ تھرتھرا رہے تھے، ایک سکنڈ میں اُف خدا ایک دھماکہ کی طرح ٹکر ہو گئی۔ میں اُچھل کر دور سڑک پر جا پڑا! اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوا میں بے ہوش ہو چکا تھا، ہوش آنے پر میں نے محسوس کیا اس وقت میں دواخانے کے ایک کمرے میں پڑا ہوا ہوں، میری موٹر ٹرام سے ٹکرا گئی اور موٹر پاش پاش ہو کر رہ گئی ڈرائیور کا خاتمہ ہو چکا میری پیشانی اور بائیں ہاتھ کی کہنی پر کاری چوٹ آ گئی تھی۔ قدرے ہوش آنے پر پولیس کے عہدہ دار نے میرا بیان قلمبند کیا دن بھر میں دواخانہ میں نیم غشی کی حالت میں پڑا رہا، زخموں سے خون زیادہ مقدار میں بہنے کی وجہ سے مجھ پر نقاہت کے حملے ہو رہے تھے۔

دواخانے والوں نے میرا پتہ معلوم کر کے ہوٹل کا مالک مجھ سے ملنے کے لئے آئے میری یہ حالت دیکھ کر دونوں نے اظہار افسوس کیا منیجر نے رخصت کے وقت مجھ سے کہا ہاشمی صاحب کیا آپ نے اس حادثہ کی اطلاع اپنی بیوی کو نہیں دی اگر واقعی ایں اس امر کی اطلاع نہیں ملی ہے تو اب میں انھیں جا کر کہہ دونگا۔

میں نے کہا، منیجر صاحب، براہ کرم اس کی اطلاع آپ انھیں نہ دیجئے وہ بیمار ہے ضرور پریشان ہو جائے گی، میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے منیجر اور ہوٹل کا مالک مجھ سے رخصت ہوئے۔ دوسرے دن ڈاکٹر علاج کی خاطر میرے کمرے میں گھس آیا وہ زخموں کو صاف کر کے پٹی باندھ رہا تھا، نرس نے آ کر اطلاع دی آپ کے نام حیدرآباد رسٹورنٹ سے ٹیلیفون آیا ہے، منیجر صاحب آپ کی خیریت دریافت کرتے ہوئے اطلاع دیتے ہیں کہ دو دفعہ آپ کی بیوی نے آ کر آپ کے متعلق دریافت کیا، ڈاکٹر نے تعجب کے لہجے میں کہا آپ نے اب تک اپنی بیوی کو اس حادثہ کی اطلاع نہیں دی اگر ایسا ہے تو افسوس آپ اس کے حق میں ظلم کر رہے ہیں، مس ٹلپ! ڈاکٹر نے نرس سے کہا، تم ہوٹل کے منیجر سے کہہ دو کہ فوراً ان کی بیوی کو اس حادثہ کی اطلاع کر دیں ڈاکٹر اپنا کام ختم کر کے کمرے کے باہر جا چکا تھا اور نرس بھی ــــ میں تنہا اپنے کمرے میں پڑا سوچ رہا۔ مختلف خیالات مجھے گھیرے ہوئے تھے، مجھے اپنی بے کسی پر رونا آ رہا تھا اس میں نرس نے دوبارہ آ کر اطلاع دی آپ کی بیوی آپ سے ملنے آئی ہیں۔ میرا دل دفعتاً بھر آیا، آہ دنیا کیا سمجھتی ہے کاش ایسا ہو سکتا۔

نرس مجھے خاموش پا کر چلی گئی، اور اپنے ہمراہ عذرا کو لے آئی۔

عذرا نہایت خاموشی کے ساتھ میرے پلنگ کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی میں نے اس کی تعظیم کے لئے اٹھنا چاہا مگر ناطاقتی کے باعث ایسا نہ کر سکا۔ نہیں نہیں، آپ لیٹے رہیئے اس نے مدھم لہجہ میں کہا آپ کو کیا ہو گیا تھا۔ دفعتاً میرے آنسو عذرا کے اس سوال کا جواب دینے کے لئے باہر نکل آئے، اب وہ میرے قریب والے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

نرس کو آواز دیجئے مجھے تشنگی محسوس ہو رہی ہے۔

وہ اٹھی اور گلاس میں پانی بھر کر لائی۔

لائیے مجھے دیجئے، میں نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔

عذرا نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا، اور اپنے ہی ہاتھوں سے پانی پلایا۔

آپ مجھے معاف کریں گے، میں نے کہا میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

وہ خاموشی کے ساتھ میری طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے تھی۔

بھوپال کب جاؤ گی؟

بھوپال؟ عذرا کی زبان سے تعجب کا کلمہ نکلا ——— آپ کو کیسے معلوم؟

یہ خط! میں نے اس کو پڑھنے کی جرأت کی۔

عذرا نے فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھینا، دریچہ کے پاس جاکر وہ اسے پڑھنے لگی ڈاکٹر دوبارہ میرے کمرے میں داخل ہوا اس نے مجھے ایک خوراک دوا پلانے کے بعد کہا اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے، زیادہ گفتگو نہ کریں پھر اس نے عذرا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا آپ مطمئن رہیئے، آپ کا چہرہ غموں کے آثار لئے ہوئے متاثر کن معلوم ہوتا ہے مجھے یقین ہے کہ آپ کے شوہر چند دنوں میں صحت یاب ہو جائیں گے۔ میرے خیال میں یہ زخم زیادہ خطرناک نہیں ہے یہ کہہ کر ڈاکٹر اپنی دیگر مصروفیات کے تحت دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

میں نے عذرا کی طرف نظر ڈالی، اس کا چہرہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔ سنا آپ نے ڈاکٹر کیا کہتا ہے اس نے میرے پلنگ کے قریب آکر کہا۔

عذرا افسوس دنیا ابھی کیا سمجھی ہوئی ہے کیا معلوم ہم ایک دوسرے کے لئے قطعاً ناآشنا ہیں کاش ہم دنیا کے اسٹیج پر حقیقی معنوں میں اس خواب نما ڈرامہ کو دکھلا سکتے میرے آنکھوں میں آنسو تھے، عذرا کا حسین چہرہ یک بیک خوشی کے مارے دمک اٹھا۔ اس کی محبت نواز آنکھوں میں ایک ملکوتی جذبہ امنڈ آیا۔

ہاں کیوں نہیں ہاشمی صاحب! اس کا لہجہ محبت آمیز تھا اب جب کہ ہم اس ڈرامہ کا کچھ حصہ دنیا کے سامنے پیش کر چکے ہیں مجھے افسوس ہے کہ میں نے زیادہ دن تک اپنے آپ کو راز میں رکھا، یقیناً میری اس طویل خاموشی نے آپ کو دکھ پہونچایا ہوگا اب آپ اچھی طرح میری مجبوریوں سے واقف ہیں، یہ میری انتہا درجہ کی خوش نصیبی ہے جو اس دورانِ سفر میں ایک رفیق و غمگسار ساتھی مل گیا۔

صابر کوسگوی

سال کے مہینے اور دن

ہم مہینوں اور دنوں کے ناموں سے اس قدر مانوس ہوگئے ہیں کہ ان سب کے نام ایک سانس میں سنا دے سکتے ہیں۔ لیکن ہم میں بہت کم ایسے ہیں جو ان کے ماخذوں سے واقف اور ان کی تاریخ کا علم رکھتے ہیں۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب کہ ہر کام اور ہر چیز کا ایک دیوتا تھا۔ اور ان سب کا شہنشاہ رومی زبان میں "جیوپی ٹر" اور یونانی میں "زیس" تھا۔ رومیوں نے سال اور مہینوں کے نام اپنے دیوتاؤں کے نام پر رکھے جس کی تشریح ذیل میں کی جاتی ہے۔ اس تشریح سے پہلے ہم یہ بتلائیں گے کہ وقت کے تعین کا خیال کیوں اور کس طرح پیدا ہوا۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ زمین اپنے محور پر چکر لگاتی ہے جس سے روشنی اور تاریکی کا ظہور ہوتا ہے۔ اور ہم دن اور رات کا نام دیتے ہیں۔ انگریزی لفظ (Day) بہت قدیم ہے جس کے معنی چمکنا کے ہیں۔ اور اس کے معنے ہیں" وہ وقت جس میں کہ کرہ ارض کا ایک حصہ سورج کی روشنی سے منور ہو" رفتہ رفتہ وسعت ہوتی گئی اور وہ وقت بھی مراد لیا جانے لگا جو زمین پر سورج کے طلوع ہونے کے بعد سے پھر طلوع ہونے تک۔ سورج کے غروب سے پھر غروب ہونے تک۔ اور ایک دوپہر سے دوسری دوپہر تک۔ رومی آدھی رات سے آدھی رات تک اور بابلی طلوع آفتاب سے طلوع تک کرتے تھے۔ اس طریقہ سے وقت کی اکائی وجود میں آئی دن کا وقت یا یہ اکائی بہت چھوٹی تھی اس لئے ایک دوسرا پیمانہ وضع کیا گیا۔ جو زیادہ طویل وقت کا ہے۔ اور یہ چاند کی بدلتی ہوئی شکلوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ دیکھا گیا کہ چاند ہلال سے بتدریج بدر اور پھر بدر سے بتدریج غائب ہوجاتا ہے۔ اس لئے ایک ہلال سے دوسرے ہلال تک کا وقفہ ایک مہینہ کہلانے لگا۔ اس وقفہ کو ابتدا میں ہلالی (Month) کہا جانے لگا جو بعد میں ہلالی مہینہ (Lunar Month) میں تبدیل ہوا (Lunar) لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنے چاند کے ہیں اور (Moon) انگلو سیاکسن زبان میں اس کا ہم معنی ہے۔

دوسرا پیمانہ "سال" موسموں کی تبدیلی سے لیا گیا۔ یہ مشاہدہ کیا گیا کہ گرمی کا ایک زمانہ ہوتا ہے۔ بارش ہوتی ہے۔ اس کے بعد سردی شروع ہوتی ہے۔ ایک موسم ایسا آتا ہے جب کہ ہر طرف بہار ہوتی ہے۔ اور پھر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب کہ سارے درخت ننگے ہوجاتے ہیں۔

یہ وقفہ اور دور موسم کے نام سے مشہور ہوئے۔ ایک موسم بہار سے دوسرے موسم بہار تک یا ایک موسم سرما سے دوسرے موسم سرما تک۔ بارہ ہلالی مہینے ہوتے ہیں۔ یہی ہلالی بارہ ماہ ایک سال کہلانے لگے۔ موسم کی یہ تبدیلی سورج کے اطراف زمین کی گردش کا نتیجہ ہے۔ سورج کے اطراف پورا ایک چکر لگانے کے لئے زمین کو تین سو پینسٹھ دن پانچ گھنٹے اور انچاس منٹ درکار ہیں۔ لیکن پہلے ہلالی مہینوں کا سال صرف تین سو چوّن دن کا ہوتا تھا۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہونے لگا کہ مہینے موسم سے پیچھے رہ جانے لگے۔ اور دس سال کے بعد جب کہ حسب سابق ایک خاص مہینے میں موسم بہار ہونا چاہیے تھا لیکن موسم

سرا ہی رہا۔ آج کل بھی یہ فرق موجود ہے۔ اس کو صحیح اور درست کرنے کے لئے اس ہلالی سال میں وقتاً فوقتاً دنوں اور مہینوں کا اضافہ کیا جانے لگا۔ اور اس طرح سے اس ہلالی سال کو سورج کے ایک سال یعنی تین سو پینسٹھ دن چھ گھنٹے (۳۶۵¼) کے مساوی کیا گیا۔ یہودی انیس سال میں سات مرتبہ اس قسم کا اضافہ کرتے ہیں یونانی ہر آٹھ سال میں تین ماہ کا اضافہ کرتے تھے۔ رومیوں کا پہلا سال صرف دس ماہ کا ہوتا تھا۔ جو مارچ سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد انھوں نے سال کے دنوں کی تعداد تین سو پچپن کرنے کے لئے دو ماہ کا اضافہ کردیا۔

اب بھی ایام کی کمی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً دنوں کا اضافہ کیا جاتا تھا۔ ان اضافی دنوں کے سبب پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں۔ اس کو دور کرنے کے لئے جولیس سیزر نے ۴۶ء قبل مسیح کے سال کو چار سو پینتالیس دن کا کردیا اور آئندہ کے لئے سال کے تین سو پینسٹھ دن مقرر کئے۔ لیکن چونکہ زمین کو سورج کے اطراف اپنی گردش کو پورا کرنے میں تین سو پینسٹھ دن پانچ گھنٹے اور انچاس منٹ درکار تھے اور اس طرح سے ہر سال میں ایک چوتھائی دن چھوٹ جاتا تھا۔ اس لئے سیزر نے حکم دیا کہ ہر چوتھے سال فروری کے مہینے میں ایک دن کا اضافہ کردیا جائے۔ اور یہ "لیپ" سال" کہلاتا تھا۔ یہ نام اس لئے تجویز ہوا کہ اس دفعہ سال ایک دن کی چھلانگ مار کر سابقہ چھوڑے ہوئے چوتھائی دنوں کی تکمیل کرلیتا تھا۔ جو چار سال میں ایک دن کے مساوی ہوجاتے تھے۔ یہ جنتری "جیولی آن جنتری" کہلاتی ہے کیونکہ اس کو جولیس سیزر نے ترتیب دیا تھا۔

آخر کار یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ ترتیب بالکل درست ہے

لیکن اس وقت بھی ایک معمولی سے غلطی رہ گئی تھی۔ کیونکہ پانچ گھنٹے انچاس منٹ کو چوتھائی دن فرض کیا گیا تھا۔ حالانکہ اس میں گیارہ منٹ کی کمی رہ جاتی ہے۔ جو واقعی بہت ہی معمولی سا فرق تھا۔ لیکن کئی صدی بعد یہ فرق بڑھ کر دس دن کے قریب ہوگیا۔ اس لئے اب سورج کے حساب کا سال بہت طویل ہوگیا۔ ۱۵۸۲ء میں پوپ جیاگری نے حکم دیا کہ اس سال دس دن چھوڑ دیئے جائیں اور ۴ر اکتوبر کے بعد کا دن ۱۵ر اکتوبر محسوب کیا جائے۔ یہ تفریق ۱۷۵۲ء تک انگلستان میں قبول نہیں کی گئی۔ اور جب اس سال ایک دم سے گیارہ دن کم کردیے گئے تو جاہل عوام میں کچھ بے چینی سی پھیلی وہ یہ خیال کرنے لگے کہ ان سے دن چرائے گئے ہیں۔ اس غلطی کے آئندہ نہ ہونے کے لئے یہ تجویز کی گئی کہ ایسے سال جو دو صفروں پر ختم ہوتے ہوں جیسے ۱۶۰۰ء ۱۷۰۰ء ۱۸۰۰ء وغیرہ۔ لیپ کے سال نہ سمجھے جائیں۔

جنوری سال کے پہلے مہینے کا نام اہلِ روم نے جی نوس (Janus) نامی دیوتا سے لیا اور جنوری رکھا۔ جی نوس کے دو سر ہیں اور اس طرح کہ وہ آگے اور پیچھے بھی دیکھ سکتا ہے۔ جینوس دروازوں اور پھاٹک کا دیوتا تھا۔ لاطینی زبان میں جنوا (Janua) کے معنی دروازے یا پھاٹک کے ہیں۔ چونکہ دروازے اور پھاٹک وغیرہ سے داخل ہوتے ہیں اس لئے اہلِ رومہ میں یہ ایک رسم ہوگئی تھی کہ جب کسی نئے کام کو شروع کیا جاتا تو پہلے جینوس کی پوجا کی جاتی۔ یہ دیوتا سورج کو طلوع کرنے والا بھی تھا اس لئے سال کے پہلے مہینے کا نام اسی مناسبت سے رکھا گیا۔ اس مہینے میں تازہ تازہ غذا اور تازہ شراب وغیرہ جیسی چیزیں جینوس کے

مجسمہ پر چڑھائی جاتی تھیں۔

چونکہ دروازہ کے کھلنے سے دونوں طرف دکھائی دیتا ہے اور جینوس دُوسروں کا دیوتا ہے اس لئے یہ خیال کیا جانے لگا کہ جینوس ماضی اور مستقبل ہر دو کو دیکھ سکتا ہے۔

روم کے قدیم ترین سکوں پر اس کی تصویر کندہ ہے اس کے ہر دو سروں پر گھنی داڑھی ہے وہ ایک ہاتھ میں عصا، اور دوسرے ہاتھ میں کنجی لئے ہوئے ظاہر کیا گیا ہے۔ وہ تجارت اور جہاز رانی کا بھی محافظ تھا اور بعض سکوں پر اس کے سر کو جہاز کے اگلے حصہ کی طرح بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ جب لوگوں نے چاہا کہ جینوس کو سال کے دیوتا کی شکل میں ظاہر کریں تو ان کو اس سے بہتر کچھ سجھائی نہ دیا کہ اس کے ایک ہاتھ میں تین سو اور دوسرے میں پینسٹھ کا عدد دے دیں۔

جینوس کی پرستش جینی کولم نامی پہاڑی پر ہوتی تھی۔ یہ ان سات پہاڑوں میں سے ایک ہے جس پر روم کی تعمیر ہوئی۔ چونکہ وہ دروازوں کا دیوتا تھا اس لئے روم کے سارے دروازے اس کے تابع سمجھے جاتے تھے۔ خصوصاً وہ کمان دار دروازہ جس سے افواج جنگ کے لئے جاتیں اور واپس ہوتیں اس کمان دار دروازہ کی جگہ پر ایک گرجا تعمیر کیا گیا تھا جس کا نام مربع ہونے کی وجہ سے "جینوس کواڈی فرونس" یعنی چوپہلو تھا۔ اس کے ہر ایک بازو پر تین کھڑکیاں اور ایک دروازہ تھا۔ جس سے بارہ ماہ اور چار موسم مراد لئے جاتے تھے۔ زمانہ جنگ میں اس کے دروازے کھول دئے جاتے تھے کیونکہ چڑھاوے چڑھانے کے لئے عوام کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ لیکن جب امن ہوتا تو یہ فوراً بند کر دئے جاتے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ رومی مسلسل جنگ کرتے رہتے تھے۔ اس لئے یہ سن کر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ سات سو سال میں یہ دروازے صرف تین مرتبہ بند کئے گئے۔

یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جینوس سورج کے دیوتا اپالو کا بیٹا تھا۔ جس کا کام یہ تھا کہ وہ ہر روز اپنی آتشیں رتھ میں سوار ہو کر آسمان پر چکر لگائے۔ ہر صبح جب کہ صبح کی دیوی " ارورا " مشرق کا دروازہ کھولتی تو اپالو اپنے کام پر روانہ ہو جاتا اور کام ختم کر کے مغربی سمندر میں چلا جاتا جہاں سے وہ اپنے محل میں مشرق میں واپس آجاتا۔

اپالو کا ایک اور بیٹا "فی ٹن" تھا۔ اس نے ایک دن اپنے باپ سے درخواست کر کے اس کی آتشیں رتھ پر سواری کی دیر تک تو گاڑی برابر چلائی لیکن بالآخر اپنی تیز طبیعت سے مجبور ہو کر گاڑی کو بہت تیز دوڑانے لگا۔ بہت جلد اس کے قابو سے گھوڑے نکل گئے۔ اور وہ گاڑی کو معمولی راستہ سے بہت دور کھینچ لے گئے۔ اور زمین سے اس قدر قریب پہنچے کہ سارے کھیت جل کر خاکستر ہو گئے۔ دریا کا پانی خشک ہو گیا۔ اور وہاں کے باشندوں کی رنگت بھی سیاہ ہو گئی۔ جو ابھی تک باقی ہے۔ مصیبت زدہ لوگوں کی چیخ و پکار کی آواز شہنشاہ اعظم جیوپی تک پہنچی۔ جب وہ سورج کی گاڑی کو اس حالت میں پایا تو آپے سے باہر ہو گیا۔ اپنی بجلی کو لے کر "فی ٹن" پر حملہ آور ہوا جس کے سبب بجلی گری وہ جھلس کر سر کے بل گرا اور مر گیا۔

اور ایک المناک کہانی یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اپالو کو " ہیارسن تھس " نامی ایک انسان سے بیحد محبت تھی جس سے گفتگو کرنے کے لئے وہ ہمیشہ زمین پر آتا تھا۔

جنوبی ہوا کا دیوتا" زے فائرس" بھی اسی کی محبت میں سرشار تھا ایک دن اپالو اور ہیارسن تھس کھیل رہے تھے کہ زے فائرس آیا اور اپنے رقیب کو دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا اور اپالو کے لوہے کی کڑی کو جس سے وہ کھیل رہا تھا۔ ہیارسن تھس کی طرف اس زور سے پھینکا کہ وہ مرگیا۔ اپالو کو اس کی موت کا بہت رنج ہوا۔ اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اپالو نے خون کے گرے ہوئے قطروں کو پھول کے گلدستہ میں تبدیل کر دیا۔ یہ پھول آج بھی ملتا ہے اور ہیارسن تھس کہلاتا ہے۔ دوسرا پھول جو ہم کو اپالو کی یاد دلاتا ہے وہ سورج مکھی ہے۔

قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک لڑکی گلائٹی ہی تھی۔ یہ ہر روز اشتیاق بھری آنکھوں سے سورج کی گردش کو غور سے دیکھا کرتی تھی۔ لیکن اپالو کو اس لڑکی کی محبت کا علم نہ تھا۔ اور وہ بغیر اس کا خیال کئے ہر روز گزر جاتا۔ گلائٹی ایک دریا کے کنارے پر کھڑی سورج کو دیکھا کرتی اور جب وہ غروب ہو جاتا تو اس کا دل بھی بیٹھ جاتا۔ وہ رات کو ساحل سے واپس نہ ہوتی بلکہ رات بھر سردی میں بیٹھی سورج کی پہلی کرن دیکھنے کی منتظر رہتی۔ آخرکار دیوتاؤں نے اس پر رحم کیا اور اس کو سورج کے پھول میں تبدیل کر دیا۔ اس کا سبز لباس سبز پتوں کی شکل میں زرین بال زرد پنکھڑیوں کی شکل میں باقی رہے۔ آج تک یہ اپنی اس حالت میں خوش و خرم ہے اور آج بھی اپنا کام کئے جاتی ہے۔

(باقی آئندہ)

انوار احمد صدیقی

رباعیات

(توبہ)

تردیدِ تمنائے ازل کیسے ہو؟
اک مسئلۂ خیال حل کیسے ہو؟
توبہ کا تصور ہی بہت مشکل ہے
پھر ایسے تصور پہ عمل کیسے ہو؟

(مٹی کا کھلونا)

برحق ہر شئے کا نیست ہونا ہی سہی
نقدِ ہستی سے ہاتھ دھونا ہی سہی
مٹی سے کمہار کچھ کما لیتا ہے
دنیا مٹی کا اک کھلونا ہی سہی

باقی

پروین

پروین احمد خاں کی جو ایک دولت مند تاجر تھے اکلوتی لڑکی
تھی۔ ماں باپ اپنی بیٹی کو ہر وقت خوش دیکھنا چاہتے تھے مگر اس کی
قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا وہ بہت ناز و نعم میں پلی تھی اسے
رنج و غم سے کبھی پالا نہ پڑا تھا۔ اگر اس کی تیوری پر بل آجاتا تو
ماں باپ اپنی جان نثار کرنے کو بھی تیار ہو جاتے۔ ایک مرتبہ
پروین کی ماں یکایک بیمار ہو گئیں احمد خاں اپنی بیوی کو بہت
چاہتے تھے اس لئے بہت گھبرائے۔ بہت سے ڈاکٹر بلائے
گئے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا بلکہ مرض بڑھتا گیا یہاں تک کہ غشی
کے دورے پڑنے لگے ایک دن جب ذرا طبیعت ٹھیک ہوئی
تو بیوی نے احمد خاں کو بلا کر کہا میں چند گھنٹے کی مہمان ہوں
پروین کو تمہارے سپرد کرتی ہوں اس کو اچھی طرح رکھنا کبھی
دکھ نہ پہنچنے دینا...... اس کو میری نشانی سمجھ کر پرورش کرو۔
یہ میری آنکھوں کا تارا ہے دیکھو اس کو کبھی یہ محسوس نہ ہونے
پائے کہ یہ بے ماں کی ہے۔" احمد خاں کی آنکھوں سے بے اختیار
آنسو ٹپکنے لگے اور انھوں نے اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے
کہا "گھبراؤ نہیں تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔" ان کی بیوی
نے اپنی بے نور آنکھیں کھولیں اور کہنے لگیں "نہیں اب میں
ہرگز اچھی نہیں ہو سکتی۔ دیکھو موت تمہاری تسلیوں پر مسکرا رہی
ہے۔" یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں پتھرا گئیں اور ان کی سسکتی
ہوئی سانس ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ پروین ماں کی موت
کے بعد بہت غمگین رہنے لگی۔ ہر وقت روتی رہتی۔ وہ سمجھ
گئی تھی کہ اب خوشی اس کی قسمت میں نہیں۔ احمد خاں بھی
بیوی کی موت سے بہت متاثر ہوئے تھے جب کبھی اپنے دوستوں
میں بیٹھے ہوتے تو اپنی بیوی کو یاد کر کر کے رویا کرتے ان کے
بعض خیر خواہ دوستوں نے اصرار کرنا شروع کیا۔ کہ وہ دوسری
شادی کریں۔ مرنے والا جینے والوں کے مستقبل کو غم آلود کر دیتا
ہے یا رنگین۔ لیکن ہمیشہ مرنے والے کی یاد گردش ایام کے
دھارے پر تیرنے کے ساتھ بہتے بہتے اپنی رفتار دھیمی کر دیتی
ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب کہ اندھیرے
سے مسرت کی کرن پھوٹ پڑتی ہے۔ وہ سب کچھ بھول کر
صرف اپنے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا ہے" احمد خاں کے دل میں
بیوی کا داغ کتنا ہی تازہ کیا نہ ہو لیکن وہ زیادہ عرصہ تک
غم کے سہارے اپنی آنے والی زندگی کو ٹھکرا نہ سکے اور
انھوں نے اپنے دوستوں کی بات مان لی۔ بڑی دھوم
دھام سے آخر ان کی شادی رچی۔ پروین کی سوتیلی ماں لیلیٰ
اپنے ساتھ ایک چودہ برس کی لڑکی بھی ساتھ لائیں۔ پروین
بڑی خوش ہوئی کہ کھیلنے کے لئے ایک ہمجولی تو مل گئی۔
احمد خاں پروین کو بہت چاہتے تھے اور لیلیٰ کی لڑکی کی طرف
وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دیکھتے ہی نہ تھے۔ جب لیلیٰ نے
یہ حالت دیکھی تو سوچنے لگی کہ کیا کرنا چاہیے چنانچہ ایک
ترکیب سمجھ میں آئی وہ یہ کہ احمد خاں کے کان پروین
کی شکایتوں سے خوب بھر دیے جائیں جس کا نتیجہ یہ ہوگا
کہ احمد خاں پروین سے نفرت کرنے لگ جائیں گے اور
یہی ہوا جب احمد خاں نے پروین کی شکایتیں سنیں تو
اس سے حد درجہ متنفر ہو گئے اور اب وہی احمد خاں
کی نور نظر جس کے کھانا کھلانے کے لئے چار نوکر رکھے گئے تھے۔
آج چولہے کے پاس بیٹھی پیٹ کے دوزخ کو پاٹ رہی تھی۔

پرویں اپنی بدقسمتی پر ہر وقت آنسو بہایا کرتی تھی جو روز ایک جوڑا بدلا کرتی تھی اس کے جسم پر میلے کچیلے کپڑوں کی دھجیاں رہنے لگیں۔ یہ وہی پرویں ہے جس کو احمد خاں ذرا بھی مغموم نہیں دیکھنا چاہتے تھے اب اس کو مسرور دیکھنا انہیں گوارا نہ تھا۔ ایک دن جب پرویں لیلیٰ کے کمرے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی اپنی بدبختی پر آنسو بہا رہی تھی اس کے کانوں میں لیلیٰ کی آواز آئی جس کو وہ غور سے سننے لگی لیلیٰ احمد خاں سے کہہ رہی تھی " اجی پرویں کو کوئی نہیں جان سکتا میں جانتی ہوں کہ اس میں کیا کیا گن بھرے ہیں ایک واقعہ تو ایسا ہے جس کو کہتے خود مجھے شرم آتی ہے"۔ احمد خاں نے کہا " کہو تو ایسا کونسا واقعہ ہے" لیلیٰ نے کہا " ایک دفعہ رات کو جب میری آنکھ کھلی تو پرویں کے کمرے کا چراغ روشن تھا میں سوچنے لگی آخر اتنی رات تک چراغ کیوں روشن رکھا گیا میں دبے پاؤں جا کر جھانکی تو معلوم ہوا کہ پرویں اسی موکھے میں جو اس کے کمرے ہے نا منہ ڈالے کسی سے کہہ رہی ہے اگر کل رات بارہ بجے آؤ گے تو میں تمہارے ساتھ چلوں گی میں نے گلشن کو باہر بھیج کر ... کر تو آ۔ باہر موکھے کے پاس کون کھڑا ہے۔ گلشن نے آکر کہا بیگم صاحب وہی خوبصورت سا لونڈا جو مسجد میں رہتا ہے" پرویں نے جب یہ گفتگو سنی تو اس کے اوسان خطا ہو گئے وہ اس ناکردہ خطا اور اس کی سزا کے تصور ہی سے کانپنے لگی اور مارے خوف کے وہ سہم کر جہاں کی تہاں رہ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد احمد خاں نے پرویں کو بلا بھیجا۔ پرویں بے چاری ڈرتی ڈرتی گئی اور ادب سے جا کر سامنے کھڑی ہو گئی احمد خاں کہنے لگے ذلیل لڑکی تو میرے گھر میں رہنے کے قابل نہیں ہے نکل جا میرے گھر سے اسی وقت اپنا منہ کالا کر" پرویں کی اداس آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر بہنے لگا جیسے انہیں اسی وقت کا انتظار تھا وہ کپکپاتی آواز میں رکتے رکتے کہنے لگی ابا جان آخر واقعہ کیا ہے جو آپ مجھ پر ناحق بگڑ رہے ہیں" لیلیٰ نے کہا " او ہو کیسی نادان بن رہی ہے جیسے کچھ جانتی ہی نہیں اور باپ کے منہ در منہ کیسے جواب دے رہی ہے بے شرم" پرویں رونے لگی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی "ابا جان میں نے کچھ نہیں کیا میں بے گناہ ہوں"۔ احمد خاں اور غصے میں آ گئے اور کہنے لگے نکل جا ورنہ ابھی نوکروں کے ذریعہ نکال باہر کروں گا۔ پرویں روتی ہوئی گھر سے باہر چلی گئی اس وقت رات کے دس بجے تھے ہر طرف گہرے اور کالے بادل چھائے ہوئے تھے تیز ہوا سے جانداروں کی سانس رک رہی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑ رہی تھی۔ پرویں اپنی دھن میں دنیا سے بیزار جنگل کی طرف نکل گئی۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے صیاد کے ظلم سے تنگ آ کر کوئی پرندہ پنجرے ہی کو جنت سمجھتا ہے۔ جنگل کی اس تنہائی میں بھی اسے کوئی خوف نہیں ہو رہا تھا۔ اتنے میں کہیں سے بین بجنے کی آواز آئی جس کو سن کر پرویں ذرا ٹھٹکی اور غور سے سننے لگی۔ سوچ رہی تھی کہ اتنی رات گئے اس بھیانک جنگل میں کون ہو گا جو بین بجا رہا ہے تھوڑی دیر کے بعد ایک ترنم خیز آواز فضا کو چیرتی ہوئی پہنچی۔ یہ ایک کمسن لڑکی کی آواز تھی جو بین کی سنگت کر رہی تھی ـــ دھوکا ہے سنسار سکھی ری دھوکا ہے سنسار ـــ

پرویں آواز کی طرف بڑھتی گئی اس کو ذرا بھی ڈر محسوس نہ ہوا۔ وہ بڑھتی گئی زندگی میں اس کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ مسرت کی ناؤ جو غم کے طوفان میں ڈوب چکی تھی

اب موسیقی کے دھارے پر ہچکولے کھانے لگی۔ جب اُس نے آواز کو بہت قریب محسوس کیا تو پوچھا "تم کون ہو! اس کے جواب میں کسی نے ایک سرد آہ بھر کر کہا" میں ایک جوگن ہوں مگر تم کون ہو جو اتنی رات کو اس بھیانک جنگل میں آئی ہو شاید تم بھی میری طرح دکھی ہو گی۔ پروین روتی ہوئی کہنے لگی "ہاں میں بھی ایک دکھی ہوں اور دنیا سے بیزار ہو کر جنگل میں آگئی ہوں میری یہ التجا ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ اپنی زندگی گزار دوں اس لڑکی نے کہا "آؤ شوق سے میرے ساتھ رہو۔ دو دکھ بھری زندگیاں مل کر ایک ایسی دنیا بنا سکتی ہیں جس میں غم کی تصویر سکون کا رنگ پیدا کر سکے"۔ اس کے بعد کسی نے بین کو چھیڑا اور وہی گیت اور اسی درد بھری آواز میں دو لڑکیاں مل کر گانے لگیں۔ اب ادھر کی سنئے۔ جب صبح ہوئی تو لیلیٰ اور اس کی لڑکی دونوں گھر سے غائب تھیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لیلیٰ اپنی لڑکی کے ساتھ بہت سا نقد سامان لے کر اسی لڑکے کے ساتھ جو مسجد میں رہتا تھا اور جس کے ساتھ کہا گیا تھا کہ پروین رات کے وقت موکھے میں سے بات کر رہی تھی فرار ہو گئی جب احمد خاں کو یہ معلوم ہوا کہ پروین بے گناہ تھی اور اس کو ناحق باتیں سنائی گئیں تھیں تو وہ بہت روئے اور اس کو تلاش کرنے گئے اخباروں میں بھی حلیہ دے دیا گیا مگر وہ نہیں ملی۔ ایک دن احمد خاں پروین کی یاد میں بیٹھے تھے کہ ایک زوردار دھماکہ کی آواز سنائی دی جس کو سن کر وہ چونک پڑے اور حیران ہو کر دیکھنے لگے۔ ایسا محسوس ہوا کہ ان کی مرحومہ بیوی کھڑی کہہ رہی ہیں۔ آپ نے لیلیٰ کی باتوں میں آ کر میری پروین کو گھر سے نکال دیا اس کو آپ نے بہت دکھ دئے وہ پروین جو آٹھ بجتے ہی سو جایا کرتی تھی اس سے دس دس بجے رات تک کام لیا۔ میری سکھی پروین رات میں دس بجے گھر سے نکالی گئی خیر جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ اب پروین کو ڈھونڈنے کی کوشش نہ کیجئے اب وہ آپ کو نہیں مل سکتی، پھر ایک دھماکے کی آواز سنائی دی جو اصل میں جرم کا اعتراف تھا یا ضمیر کی ملامت۔ احمد خاں کے تصور میں تہلکہ مچ رہا تھا۔ احمد خاں کی آنکھ کھل گئی ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور تکیہ اور بچھونا آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔

حمیدہ بانو

نوائے تلخ

جذبات کے طوفاں میں، یہ ضبطِ فغاں کب تک
مجبور یہ دل کب تک، مرعوبِ زباں کب تک

بے سُود کے پردے میں آہنگِ زیاں کب تک
الفاظ کے پھندوں میں اعجازِ بیاں کب تک

آزاد ہواؤں میں پر تول نہیں سکتے
اغیار کے ہاتھوں میں عمرِ گزراں کب تک

اُٹھ جذبۂ خود داری، تا چند زیاں کاری
اُٹھ! جوشِ حمیت اُٹھ! یہ خوابِ گراں کب تک

احساس کی بستی میں جب آگ لگائی ہے
اے سوزِ دروں آخر! نکلے نہ دھواں کب تک

مقصد تری ہستی کا پوشیدہ ہے کوشش میں
یہ نفس کشی تا کے، یہ خوابِ جناں کب تک

جینا ہے تو جینے کے انداز بھی پیدا کر
کام آئیں گے آبا کے یہ نام و نشاں کب تک

کہہ ڈالیں وہ سب آخر، کہنے کی جو تھیں باتیں
خاموش بشیر آخر! رہتی یہ زباں کب تک

بشیر النساء بیگم بشیر

سنہ ۱۹۴۰ء کا روزنامچہ

جنوری :-

۱ر جنوری۔ کینیڈا کی فوجیں انگلستان آئیں۔

۲ر " ۔ مدراس میں سائنس کانگریس کا اجلاس۔

۳ر " ۔ جرمنی کا فوجی مشن لینن گراڈ پہنچا۔

۵ر " ۔ وزیر جنگ مسٹر ہوربلیشا مستعفی ہوئے اور ان کی جگہ مسٹر آلیور اسٹانلی آئے۔

۶ر " ۔ ہندوستان کے سپاہی فرانس پہنچے۔

۷ر " ۔ اہل فنستان کو روسی فوجوں پر فتح حاصل ہوئی۔

۸ر " ۔ برطانیہ، فرانس اور ترکی کے مابین ایک تجارتی راضی نامہ طے ہوا۔

۹ر " ۔ مسٹر چیمبرلین نے میانشن ہاؤس میں تقریر کرتے ہوئے جنگ کے چار مہینوں پر تبصرہ کیا۔

۱۰ر " ۔ بمبئی میں وائسرائے بہادر نے ہندوستان کی سیاسی گتھی کو سلجھانے کے لئے لوگوں سے اپیل کی اور یقین دلایا کہ ہندوستان کو مستعمراتی درجہ ملے گا۔

۱۱ر " ۔ مسلح سرحدی قبیلوں نے بعض ہندوستانی دیہاتیوں پر حملے کئے۔

۱۳ر " ۔ ہلسنکی پر چار سو روسی طیاروں نے پرواز کی۔

۱۴ر " ۔ روس کی حکومت نے اسکانڈی نیویا کے مخالف روسی مسلک پر احتجاج کیا۔

۱۶ر " ۔ دارالعوام میں مسٹر ہوربلیشا کے استعفیٰ پر مباحثہ۔

۱۷ر " ۔ وائسرائے بہادر نے بڑودہ میں تقریر کرتے ہوئے وفاق کی ضرورت پر زور دیا۔

۱۸ر جنوری۔ سر اے۔ ٹی پان سلوان انڈیا کونسل کے رکن مقرر ہوئے

۱۹ر " ۔ دارالعوام میں مسودہ ترمیم قانون ہند کی دوسری خواندگی۔

۲۱ر " ۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے وائسرائے بہادر سے بات چیت کرنے کے لئے گاندھی جی کو منتخب کرلیا۔

۲۲ر " ۔ مسٹر جناح نے حکومت کو متنبہ کیا کہ کانگریس کے ساتھ کوئی علیحدہ سمجھوتہ نہیں ہونا چاہیے۔

۲۳ر " ۔ پیرس میں پادرے ریوسکی کو پولستان کی قومی کونسل کا صدر منتخب کیا گیا۔

۲۴ر " ۔ راج کوٹ کے دربار ویراوالا کا انتقال ہوا۔

۲۵ر " ۔ برطانوی حکومت نے مسٹر جناح کے شاہی کمیشن والے مطالبہ کو مسترد کردیا۔

۲۶ر " ۔ سارے ہندوستان میں یوم آزادی منایا گیا۔

۲۷ر " ۔ اتحادی پارلیمان میں جنرل ہرٹ زاگ کی تحریک ناکام ہوئی۔ اور ان کو ۸۱ کے مقابلہ میں ۵۹ آرا حاصل ہوئیں

۲۸ر " ۔ برطانیہ نے جاپان کے اس احتجاج کی نسبت جو آسامارُو کے واقعہ پر کیا گیا تھا مسٹر اریتا کو جواب دے دیا۔ جاپان نے انگریزوں کے خلاف اپنی سرگرمیاں بڑھادیں۔

۲۹ر " ۔ برطانیہ کے مشرقی ساحل پر جرمن طیاروں نے خوب سرگرمی دکھائی ان کا محاذ کوئی چار سو میل کا تھا۔

۳۰ر " ۔ برلن میں ہر ہٹلر نے نازی انقلاب کی ساتویں سالگرہ کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے اتحادیوں کے مقاصد جنگ کی مذمت کی۔

۳۱ر " ۔ فنستان میں سخت معرکہ ہوا۔

فروری:۔

۱ر فروری۔ جاپان کے وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ جاپان کی پوری توجہ چین کی طرف رہے گی اور وہ جنگ یورپ میں الجھنا نہیں چاہتا۔

۲ر " ۔ بلگریڈ میں بلقان کانفرنس شروع ہوئی۔

۴ر " ۔ دارالامراء میں مسودہ ترمیم قانون ہند پاس ہوا۔
بلگریڈ میں بلقان کانفرنس نے ایک معاہدہ طے کیا۔

۵ر " ۔ دہلی میں گاندھی، وائسرائے گفتگو۔
بین قومی لیبر آفس نے روس کو اپنے دائرہ سے خارج کر دیا۔

۶ر " ۔ مرکزی اسمبلی میں معازنہ کا اجلاس شروع ہوا۔ جناح وائسرائے خط و کتابت شایع ہوئی۔

۷ر " ۔ اتحادی پارلیمان میں جنرل اسمٹس نے بتایا کہ جنوب مغربی افریقہ میں نازسی کس طرح پروپگنڈا کر رہے ہیں۔

۸ر " ۔ ہز ہائینس آغا خاں نے سردار پٹیل کی تائید کی کہ ہندوستان کی گتھی کو سلجھانے کے لئے متفننوں کی ایک کانفرنس بلائی جائے۔

۹ر " ۔ پریذیڈنٹ رزولٹ نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ یورپ کی صورتِ حال کے مطالعہ کے لئے ایک سفیر روانہ کیا جائے گا۔

۱۰ر " ۔ ٹوکیو کے اخباروں نے امریکہ پر یہ الزام لگایا کہ وہ جاپان کے مفاد کو محدود کرنا چاہتا ہے۔

۱۱ر " ۔ لارڈ زٹلنڈ نے ہندوستان کے کانگریسی لیڈروں سے اپیل کی کہ وہ لفظی الٹ پھیر سے ہاتھ دھولیں۔

۱۲ر " ۔ کنیڈا کے گورنر جنرل لارڈ ٹوئیڈز موئر کا انتقال ہوا۔

۱۲ر " ۔ اسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی فوجیں سوئز پہنچیں۔

۱۳ر " ۔ سندھ کی وزارت کا قضیہ۔

۱۵ر " ۔ مولانا ابوالکلام آزاد رام گڑھ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۶ر " ۔ سر اینڈرو کلاؤ نے اسمبلی میں ریلوے کا معازنہ پیش کیا۔

۱۷ر فروری۔ شانتی نکیتان میں گاندھی جی نے ٹیگور سے ملاقات کی۔

۱۸ر " ۔ دکن کے سابق وزیر اعظم سر عزیز الدین احمد کا انتقال ہوا۔

۱۹ر " ۔ سوئیڈن نے اس خوف سے کہ کہیں جنگ کی آگ اسے بھی نہ لپیٹ لے، فنستان کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔

۲۰ر " ۔ مسٹر چیمبرلین نے الٹ مارک کے واقعہ پر تقریر کی۔

۲۱ر " ۔ حکومت مدراس نے مدرسوں میں ہندی زبان کو جاری کیا۔

۲۲ر " ۔ گاندھی سیوا سنگھ نے ایک تحریک کے ذریعہ یہ واضح کیا کہ وہ سیاسیات سے بالکل الگ رہے گا۔

۲۴ر " ۔ ہر ہٹلر نے میونخ میں ایک تقریر کی جس میں اتحادیوں کی خوب مذمت کی اور یہ مطالبہ کیا کہ "ہتھیائی ہوئی جائیداد" واپس ہونی چاہیئے۔

۲۵ر " ۔ پریسیڈنٹ روزولٹ رواج کے خلاف تیسری مرتبہ صدارتی انتخاب کے لئے کھڑے ہوئے۔

۲۶ر " ۔ فنستان کی فوجوں نے جزیرہ کوئی دستو کو چھوڑ دیا۔

۲۶ر " ۔ سندھ کے وزیر اعظم اللہ بخش نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا کیونکہ اسمبلی نے تحریک اعتماد پاس کیا تھا۔

۲۷ر " ۔ مسٹر چرچل نے دار العوام میں بحریہ کا موازنہ پیش کیا۔

۲۸ر " ۔ پٹنہ میں کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔

مارچ:۔

۱ر مارچ۔ پٹنہ میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے رام گڑھ کانگریس کے لئے ایک تحریک منظور کی۔

۲ر " ۔ خلیج فارس میں جاسک کے قریب "ہانی بال" ہوائی جہاز لاپتہ ہوگیا۔ سوویٹ فوجیں وائی پوری میں داخل ہوگئیں۔

۵ر " ۔ سر جان سائمن، چانسلر آف دی اکس چیکر نے ۳۰ کروڑ پونڈ کے جنگی قرضے کا اعلان کیا۔

۸ر " ۔ فنستان میں سوئیڈن نے امن کی تحریک شروع کی۔

۱۰ مارچ ۔ ربن ٹروپ نے مسولینی سے ملاقات کی۔ ہٹلر نے برلن میں تقریر کرتے ہوئے عمومیوں پر حملے کئے۔
۱۱ " ۔ بمبئی میں یوراج میسور کا انتقال ہوا۔
۱۳ " ۔ ایسٹ انڈیا اسوسی ایشن لندن کے ایک جلسہ میں سرمائیکل اوڈوائر کو ایک ہندوستانی نے قتل کر دیا۔
۱۴ " ۔ مسٹر گاندھی نے رام گڑھ کانگریس کی نمایش کا افتتاح کیا۔
۱۵ " ۔ کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس رام گڑھ میں۔
۱۶ " ۔ جرمنوں کا اسکیپا فلو پر حملہ۔
۱۷ " ۔ فنستان اور روس کے مابین صلح نامہ پر دستخط ہو گئے۔
۱۸ " ۔ ہٹلر اور مسولینی نے اطالیہ کے کسی سرحدی مقام پر ملاقات کی۔
سندھ میں اللہ بخش کی وزارت مستعفی ہوگئی۔
لارڈ زٹلینڈ نے دارالامراء میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ گکسٹن ہال کے واقعہ کا حکومت کے مسلک پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔
۲۰ " ۔ تروپاتی میں آل انڈیا اورئنٹیل کانفرنس کا دسواں اجلاس۔
۲۱ " ۔ رام گڑھ کانگریس کا اجلاس ختم ہوا۔
۲۲ " ۔ لاہور میں مسٹر جناح نے پاکستان کا مطالبہ کیا۔
۲۳ " ۔ مسٹر یعقوب حسن کا انتقال ہو گیا۔
۲۵ " ۔ مہاراجہ اندور نے اصلاحات کا اعلان کیا۔
۲۶ " ۔ سندھ کی نئی وزارت نے اپنے مسلک کا تعین کر لیا۔
۲۷ " ۔ کناڈا کے انتخابات میں لبرل پارٹی کو کامیابی ہوئی۔
۲۸ " ۔ شہزادہ جے چند میسور کے یوراج مقرر ہوئے۔
۳۱ " ۔ جاپان کے وزیر اعظم نے ایک نشری تقریر کی اور چین میں مرکزی حکومت کے قیام کا اعلان کیا۔
۔ ممالک متحدہ نے چین میں جاپان کی قایم کی ہوئی حکومت کو ماننے سے انکار کر دیا۔

اپریل

۳ اپریل ۔ لارڈ ٹویڈز موئر کی جگہ ارل آف اتھلون کو کناڈا کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔
۵ " ۔ کلکتہ میں سی۔ ایف۔ اینڈ روز کا انتقال ہوا۔
۸ " ۔ یورپ فتح کر لینے کے متعلق نازیوں کا ایک دہ سالہ پلان منظر عام پر آیا۔
۹ " ۔ جرمنی نے ناروے اور ڈنمارک پر حملہ کر دیا۔ ڈنمارک پر قبضہ ہو گیا اور ناروے نے مدافعت جاری رکھی۔
۱۰ " ۔ شمالی سمندر میں سخت بحری معرکہ۔
۔ مسٹر چیمبرلین نے ناروے کو پوری مدد دینے کا وعدہ کیا۔
۱۲ " ۔ ناروے کی فوجیں مختلف محاذوں پر سختی کے ساتھ مقابلہ کرتی رہیں۔
۱۳ " ۔ ناروک میں سخت بحری لڑائی۔
۔ برطانوی فوجیں ناروے کے متعدد مقامات پر اتریں۔
۱۶ " ۔ جاپانی وزیر خارجہ ارٹیا نے کہا کہ اگر ڈچ مشرقی ہند پر کوئی اثر پڑے تو جاپان عملی کارروائی کرے گا۔
۱۷ " ۔ ممالک متحدہ کی حکومت نے دوسری قوموں سے اپیل کی کہ ڈچ مشرقی ہند کی "حالت موجودہ" کو برقرار رکھا جائے۔
۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے کانگریسی اداروں کو ستیاگرہ کیلئے تیار رہنے کی ہدایت کی۔
۲۰ " ۔ بلقان کے متعلق اطالیہ، روس اور جرمنی کے مابین پیمان۔
۲۱ " ۔ مغربی محاذ پر بڑی ہوائی لڑائی۔
۲۲ " ۔ لکسمبرگ نے اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے تیاری شروع کر دی۔
۲۳ " ۔ سرجان سائمن نے دارالعوام میں جنگی موازنہ پیش کیا۔
۲۴ " ۔ ناروے میں جرمنی کے مقبوضہ شہروں پر برطانوی طیاروں نے حملے کئے۔

۳۰ر اپریل۔ دہلی میں آزاد مسلم کانفرنس۔

مئی:-

۱ر مئی ۔ بمبئی میں نیشنل پلاننگ کمیٹی کا اجلاس۔

۲ر " ۔ راج کوٹ کے دیوان اور کونسلروں نے استعفیٰ دے دیا۔

۳ر " ۔ ناروے کے بادشاہ اور حکومت کے لیڈر کسی نامعلوم مقام کو چلے گئے۔

۴ر " ۔ جنوبی ناروے سے اتحادی ہٹ گئے۔

۵ر " ۔ مسٹر لائیڈ جارج نے ناروے کے معاملہ پر حکومت کو بہت مطعون کیا۔

۶ر " ۔ ہٹلر نے شاہ گستاؤ کو یقین دلایا کہ سویڈن کی غیر جانب داری کا پورا احترام کیا جائے گا۔

۸ر " ۔ دارالعوام میں مسٹر چیمبرلین کے لئے تحریک اعتماد تھوڑی سی اکثریت کے ساتھ منظور ہو گئی۔

۹ر " ۔ جرمنی نے ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ پر حملہ کر دیا۔

۱۰ر " ۔ اتحادی فوجیں بلجیم اور ہالینڈ کی مدد کو دوڑیں۔

۔ مسٹر چیمبرلین مستعفی ہو گئے اور مسٹر چرچل نے ایک قومی کابینہ بنالی۔

۱۳ر " ۔ مسٹر ایل۔ ایس۔ ایمری وزیر ہند مقرر ہوئے۔

۱۴ر " ۔ ہالینڈ کی ملکہ اور حکومت کے اراکین انگلستان آئے۔

۱۵ر " ۔ ہالینڈ نے اطاعت قبول کرلی۔

۱۶ر " ۔ اتحادی فوجیں بلجیم کی حمایت میں لڑنے لگیں۔

۱۷ر " ۔ جرمن فوجیں برسلز میں داخل ہو گئیں۔

۱۸ر " ۔ جنرل گیملن کی جگہ جنرل ویگاں اعلیٰ کمان دار مقرر ہوئے۔

۲۰ر " ۔ کیمبرائے اور لینڈ ریسیز کے مشرق میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔

۲۱ر " ۔ جرمنوں نے آراس اور امینس پر قبضہ کرلیا۔

۲۲ر " ۔ مسودہ ضروری اختیارات نے قانون کی شکل اختیار کرلی۔

۔ فرانسیسی فوجوں نے آراس پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔

۲۳ر فروری۔ مسٹر ایمری نے ہندوستان کی نسبت حکومت کے مسلک سے متعلق اہم اعلان کیا۔

۲۴ر " ۔ آراس، کیمبرائے اور والن سین کے مقامات پر سخت لڑائی ہوئی۔

۲۵ر " ۔ سی۔ پی اور بمبئی کے گورنر نے یہ تصفیہ کیا کہ آئندہ سے مقننہ کے اراکین کو تنخواہ نہیں دی جائے گی۔

۲۶ر " ۔ سر ایڈورڈ آئرن سائڈ اعلیٰ کمان دار مقرر ہوئے۔

۲۸ر " ۔ بلجیم کے شاہ لیوپولڈ نے اطاعت قبول کرلی۔

۲۹ر " ۔ بلجیم کے وزرا نے شاہ لیوپولڈ کے فیصلے کو غیر دستوری قرار دیا۔

۳۰ر " ۔ سوویٹ حکومت نے سر سٹافورڈ کرپس کے ساتھ گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔

۔ فلانڈرس میں سخت معرکہ۔

جون:-

۱ر جون ۔ مسٹر ارٹیا نے بحرالکاہل میں جاپانی مفاد پر زور دیا۔

۲ر " ۔ حکومت کی طرف سے مدافعت ہند کے قرضہ کا اعلان ہوا۔

۔ پیرس پر جرمنوں نے بمباری کی۔

۴ر " ۔ مسٹر چرچل نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ فلانڈرس سے ۳½ لاکھ آدمیوں کو بچا لیا گیا۔

۵ر " ۔ جرمنوں نے ۱۴۰ میل کا محاذ بنا کر پیرس کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

۔ اودھم سنگھ کو سزائے موت۔

۶ر " ۔ برطانوی طیاروں نے شمالی مغربی جرمنی پر حملے کئے۔

۷ر " ۔ سوم کے محاذ پر سخت معرکہ۔

۸ر " ۔ سینیر اسالڈو نے ایک نشری تقریر میں کہا کہ پہلا اطالوی حملہ شمالی افریقہ پر ہو گا۔

۹ر " ۔ وائسرائے نے مرکزی اسمبلی کی مزید توسیع منظور کی۔

۱۰ جون ۔ اطالیہ نے اتحادیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔
۱۲ ر ۔ جنوبی افریقہ نے اطالیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔
۱۳ ر ۔ مسٹر رینا ؤ نے امریکہ سے مدد کی آخری اپیل کی۔
۔ اعلان کیا گیا کہ پیرس کی حفاظت نہیں کی جائے گی۔
۱۴ ر ۔ جرمن پیرس میں داخل ہوئے۔
۔ مولانا آزاد صدر کانگریس نے مسلم وزراء اعظم سے دہلی میں ملاقات کی۔
۱۶ ر ۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس بمبئی میں۔ یہ طے پایا کہ جنگی کمیٹیوں میں شرکت نہ کی جائے۔
۱۷ ر ۔ فرانس کے نئے وزیر اعظم مارشل پیتیان نے فرانس اور جرمنی کے درمیان جنگ کے موقوف کرنے کا اعلان کر دیا۔
۔ مسٹر چرچل نے اعلان کیا کہ اس سے برطانیہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔
۱۸ ر ۔ میونخ میں ہٹلر اور مسولینی کا مشورہ۔
۱۹ ر ٹین ٹسن کی نسبت انگریزوں اور جاپانیوں کے مابین معاہدے پر دستخط۔
۲۰ ر ۔ مارشل پیتیان نے ایک نشری تقریر میں فرانس کی شکست کے وجوہ بیان کئے۔
۲۱ ر ۔ ہٹلر نے فرانس کے سامنے اپنی شرطیں رکھ دیں۔
۲۲ ر ۔ مسٹر چرچل نے یہ بتایا کہ فرانس کے ہتھیار ڈال دینے کے باوجود ہٹلر کے خلاف جنگ برابر جاری رہے گی۔
۲۳ ر ۔ فرانس اور جرمنی کے درمیان صلح کی شرائط کا اعلان ہو گیا۔
۲۴ ر ۔ مارشل پیتیان نے کہا حکومت نے شرائط صلح پر دستخط کر دیئے۔
۲۵ ر ۔ اطالیہ کی شرائط صلح پر فرانس نے دستخط کر دیئے۔
۲۶ ر ۔ مسٹر چرچل نے دار العوام میں تقریر کرتے ہوئے مارشل پیتیاں کی حکومت پر الزام لگایا۔
۲۷ ر ۔ سوویٹ فوجیں رومانیہ کی سرحد میں داخل ہو گئیں۔
۲۹ ر ۔ مارشل بلباؤ مارا گیا۔
۔ جاپان نے مشرق بعید میں اصول منرو کا اعلان کر دیا۔
۳۰ جون ۔ جاپان نے ہانگ کانگ کے برطانوی افسروں پر بے ایمانی کا الزام لگایا۔

جولائی :-

۱ جولائی ۔ شملہ میں وائسرائے سے گفت گو کرنے کے بعد مسٹر گاندھی دہلی واپس آئے۔
۔ رومانیہ نے برطانیہ کی ضمانت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔
۲ ر ۔ مسٹر گاندھی نے برطانیہ سے اپیل کی کہ ہٹلر سے جنگ کرنے کی بجائے عدم تشدد پر عمل کیا جائے۔
۔ سوبھاش بوس کو کلکتہ میں گرفتار کیا گیا۔
۳ ر ۔ کانگرس کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس دلی میں: مسٹر گاندھی نے وائسرائے کے خیالات پر روشنی ڈالی۔
۵ ر ۔ جرمنی نے اصول منرو کے متعلق اعلان کیا کہ وہ اٹل نہیں ہے۔
۶ ر ۔ چیانگ نے ممالک متحدہ امریکہ اور روس سے مدد کے لئے اپیل کی۔
۷ ر ۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے یہ مطالبہ کیا کہ ہندوستان کی کامل آزادی کا اعلان کیا جائے۔
۸ ر ۔ مسٹر گاندھی نے کانگریس کے فیصلہ کی تائید کی۔ خان عبد الغفار خاں نے مجلس عاملہ سے استعفیٰ دے دیا۔
۹ ر ۔ فرانس کی قومی اسمبلی اس بات پر راضی ہوئی کہ دستور کی نظر ثانی کی جائے۔
۱۰ ر ۔ رود بار انگلستان پر سخت ہوائی لڑائی۔
۔ ڈیوک آف ونڈسر کو بہاماس کا گورنر بنایا گیا۔
۱۱ ر ۔ فرانس کی قومی اسمبلی میں ۸۰ کے مقابلہ میں ۵۶۹ آراء سے یہ بات طے ہوئی کہ نیا دستور بنایا جائے۔
۔ مارشل پیتیان آمر کی حیثیت میں۔
۱۲ ر ۔ ترکی وزیر اعظم نے نازی ریشہ دوانیوں کی مذمت کی۔
۱۴ ر ۔ بمبئی کی حکومت نے اعلان کیا کہ نشہ بندی کو دوبارہ جاری نہیں کیا جائیگا۔
۱۵ ر ۔ مسٹر چرچل نے ایک نشری تقریر میں کہا کہ اب انگلستان کو ایک طویل جنگ کے لئے تیار ہو جانا چاہیے۔

۱۶ر جولائی ۔ جاپانی کابینہ نے استعفیٰ دے دیا۔ نئی قومی کابینہ بنالی گئی۔

۱۷ر ،، ۔ کلکتہ کی بلدیہ نے سفارش کی کہ ہال ول کے مجسمہ کو گرادیا جائے۔

۔ برما کی سڑک کے استعمال کے متعلق انگریزوں اور جاپانیوں کے مابین راضی نامہ۔

۱۸ر ،، ۔ پارٹی کنونشن نے پریسیڈنٹ روزولٹ کو تیسری دفعہ نامزد کیا۔

۱۹ر ،، ۔ ہٹلر نے رائش تاغ میں تقریر کرتے ہوئے برطانیہ کو مخاطب کرکے کہا کہ ایک ہولناک جنگ کے مقابلہ میں برطانیہ کو چاہیے کہ اس کی شرائط کو ترجیح دیں۔

۲۱ر ،، ۔ جنرل اسمٹس نے آمروں کے چیلنج کا جواب دیا۔

۲۲ر ،، ۔ لارڈ ہیلی فیکس نے ہٹلر کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ برطانیہ پر ...

۔ اسٹونیا، لتھونیا اور لٹویا سوویٹ روس میں شامل ہوگئے۔

۲۳ر ،، ۔ سر کنگسلی وڈ نے دارالعوام میں "موقتی موازنہ" پیش کیا۔

۲۴ر ،، ۔ مسٹر فضل حق نے اعلان کیا کہ حکومت بنگال ہال ول کے مجسمہ کو ہٹادے گی۔

۲۵ر ،، ۔ لندن میں ایک نئی چک حکومت بن گئی جس کے صدر ڈاکٹر بنیش مقرر ہوئے۔

۔ کانگریس کی مجلس عاملہ کا پونہ میں اجلاس۔

۲۶ر ،، ۔ بندر سعید پر انگریزوں نے رومانیہ کے دو جہازوں کو گرفتار کرلیا۔

۲۷ر ،، ۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے واردھا کے تصفیہ کو منظور کرلیا۔

۲۸ر ،، ۔ ،، ،، نے دہلی کی قرارداد کو منظور کرلیا۔

۲۹ر ،، ۔ انگلستان کے جنوبی ساحل پر سخت لڑائی۔ متعدد ہوائی حملے۔

۳۰ر ،، ۔ لارڈ ہیلی فیکس نے ٹوکیو کی گرفتاریوں کے خلاف احتجاج کیا۔

۔ وشی کی حکومت نے دلادیر، بلیوم، جنرل گیملن اور دوسرے لوگوں پر تحقیقات کرنے کے لئے ایک خاص عدالت قایم کی۔ الزام یہ ہے کہ یہ فرانس کی شکست کے ذمہ دار ہیں۔

۳۱ر ،، ۔ جرمن فوجیں فرانسیسی ساحل کی طرف بڑھنے لگیں۔

اگست ۴۰ء

۱ر اگست ۔ تلک کی سالگرہ۔

۔ مولوٹوف نے سوویٹ جرمن دوستی کا تذکرہ کیا۔

۳ر ،، ۔ بنگلور میں ہز ہائینس کرشنا راجندر واڈیار کا انتقال ہوا۔

۴ر ،، ۔ لتھونیا سوویٹ میں داخل ہوگیا۔

۶ر ،، ۔ اطالوی فوجوں نے برطانوی سمالی لینڈ پر حملہ کردیا۔

۷ر ،، ۔ جامعہ آکسفورڈ کی طرف سے سر رابندرناتھ کو ڈاکٹریٹ عطا کی گئی۔

۸ر ،، ۔ وائسرائے نے مجلس عاملہ کی توسیع کا اعلان کیا۔

۹ر ،، ۔ برطانیہ نے چین سے اپنی فوجیں ہٹالیں۔

۱۰ر ،، ۔ جاپان نے محصورہ رقبہ کی توسیع کی۔

۱۳ر ،، ۔ نازیوں نے برطانیہ پر دوبارہ ہوائی حملے شروع کئے۔

۔ البانیہ اطالیہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔

۱۵ر ،، ۔ جرمن طیاروں نے کرائیڈن کی ہوائی بندرگاہ پر بمباری کی۔ دشمن کے ۸۸ مشین گرائے گئے۔

۱۶ر ،، ۔ مسٹر روزولٹ اور مسٹر میکنزی کنگ نے اوگنس برگ کے مقام پر مدافعتی تدابیر کے متعلق بات چیت کی۔

۱۹ر ،، ۔ شاہی طیاروں نے ادیس ابابا پر حملہ کیا۔

۲۰ر ،، ۔ مسٹر چرچل نے دارالعوام میں جنگ کی صورت حال کے متعلق ایک بیان دیا۔

۲۱ر ،، ۔ میکسیکو میں لیون ٹراٹسکی کا قتل۔

۲۲ر ،، ۔ سر آلیور لاج کا انتقال۔

۲۳ر ،، ۔ اطالیہ نے یونان کو الٹی میٹم دیا۔

۲۴ر ،، ۔ انگلستان میں ۴۶ نازی طیارے گرالئے گئے۔

۔ رومانیہ اور ہنگری کے درمیان گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

۲۶ر ،، ۔ آئرلینڈ پر نازی طیارے۔

۲۷ر ،، ۔ پریسیڈنٹ روزولٹ نے ایک مسودہ پر دستخط کردیئے جس کی

۲۸ ۔ امریکی جہاز اس بات کے مجاز ہو گئے کہ یورپ کے جنگی علاقے میں داخل ہو کر بچوں کو نکال لائیں۔

۔ کنٹ میں بڑی ہوائی لڑائی ہوئی۔

۲۹ اگست ۔ والسرائے اور صدر کانگریس کی خط و کتابت شائع ہوگئی۔

۳۰ ر ۔ لندن پر نازیوں کے سخت ہوائی حملے۔

۳۱ ر ۔ جنوبی افریقہ کی اسمبلی میں جنرل ہرٹزاگ کی تحریک امن ناکام رہی۔

ستمبر

ا ستمبر ۔ رومانیہ اور ہنگری کی سرحدوں کا تصفیہ کرنے کے لئے ایک کمیشن بیٹھا۔

۲ ر ۔ میونخ پر ۰۰ منٹ تک ہوائی لڑائی۔

۔ بمبئی میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے والسرائے کے اعلان کا خیر مقدم کیا۔

۳ ر ۔ برطانیہ اور امریکہ کے مابین بحری راضی نامہ

۔ ہندچین کو جاپان کا الٹی میٹم۔

۴ ر ۔ امریکی تباہ کن جہاز برطانیہ روانہ کئے گئے۔

۵ ر ۔ جاپان نے ہندچین کو جو الٹی میٹم دیا تھا اسے عارضی طور پر واپس لے لیا۔

۔ شاہ کیرول نے رومانیہ کے دستور کو منسوخ کر دیا۔

۶ ر ۔ شاہ کیرول تخت سے دست بردار ہوئے۔

۔ ہندچین نے اطاعت قبول کرلی اور ۱۲ ہزار جاپانی سپاہی اس علاقہ میں داخل ہوگئے۔

۷ ر ۔ یو۔ پی کے کانگریسیوں کی گرفتاری۔ الزام یہ کہ انھوں نے ممانعت کے باوجود ڈرل کی۔

۸ ر ۔ لندن پر بڑی ہوائی لڑائی۔

۔ شہزادہ جے چامراج میسور کے مہاراجہ بنائے گئے۔

۹ ر ۔ لندن پر سخت ہوائی حملہ۔

۔ یو۔ بانٹے برما میں نئی کابینہ بنالی۔

۱۰ ستمبر ۔ شاہی ہوائیہ نے برلن اور ہیمبرگ پر ہوائی حملے کئے۔

۱۲ ر ۔ اطالوی فوجیں مصر کی طرف بڑھنے لگیں۔

۱۳ ر ۔ یہ اعلان ہوا کہ قصر بکنگھم اور دارالامراء کو بمباری سے نقصان پہنچا۔

۱۴ ر ۔ بمبئی میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے گاندھی کو مکمل اختیارات دیئے۔

۔ اطالوی فوجیں مصری سرحد میں داخل ہوگئیں۔

۱۵ ر ۔ کانگریس کے جلسہ میں مسٹر گاندھی کانگریس کی قیادت پر رضامند ہوگئے اور والسرائے سے ملاقات کرنے کی تجویز ہوئی۔

۱۶ ر ۔ ہسپانیہ کے وزیر سینیر سونیز برلن گئے۔

۱۸ ر ۔ کانگریس کی کابینہ نے مسٹر گاندھی کے والسرائے سے ملنے تک سیول نافرمانی کو ملتوی کر دیا۔

۱۹ ر ۔ اطالویوں نے مصر میں سدی بارانی پر قبضہ کر لیا۔

۲۱ ر ۔ ہندچین میں فرانس اور جاپان کے مابین گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

۔ مصری کابینہ مستعفی ہوگئی۔

۲۲ ر ۔ ہندو مہاسبھا کی مجلس عاملہ نے مطالبہ کیا کہ کونسلوں میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے نمایندگی ہونی چاہیے۔

۲۳ ر ۔ جاپانی فوجیں ہندچین پر چڑھ دوڑیں۔

۲۴ ر ۔ فرانسیسی مغربی افریقہ میں ڈاکر کے مقام سے جنرل دوگال نے اپنی فوجیں ہٹالیں۔

مسٹر جناح نے والسرائے سے ملاقات کی۔

۲۵ ر ۔ جاپانی فوجیں راضی نامہ کے خلاف ہندچین میں داخل ہوگئے۔

۲۶ ر ۔ پریسیڈنٹ روزولٹ نے اعلان کیا کہ خام لوہا جاپان کو نہ بھجوایا جائے۔

۲۷ ر ۔ ۳ ½ گھنٹے تک گاندھی والسرائے کی گفتگو شملہ میں۔

۲۸ ر ۔ محوری ملکوں کا جاپان سے معاہدہ۔

۲۹ ر ۔ مسلم لیگ نے والسرائے کے پیش کش کو ماننے سے انکار کر دیا۔

۳۰ ر ۔ والسرائے جناح کی خط و کتابت شائع ہوئی۔

اکتوبر:

ا، اکتوبر۔ گاندھی۔ والسرائے خط و کتابت شائع ہوئی۔
۔ والسرائے نے جنگی کوششوں میں مداخلت کو ناپسند کیا۔
۲، " ۔ جرمنی اور سوویٹ کے ابین ریلوے کا راضی نامہ۔
۳، " ۔ مسٹر چیمبرلین مستعفی ہوگئے۔ برطانوی کابینہ میں تبدیلیاں۔
۴، " ۔ برمنر پر ہٹلر اور مسولینی کے درمیان گفتگو۔
۵، " ۔ ممالک متحدہ کے سکریٹری ناکس نے جاپان کو دھمکی دی۔
۔ لیبیا کے اطالوی مرکزوں پر شاہی ہوائیہ کے حملے۔
۶، " ۔ بلقان میں نازسی کارروائی۔
۷، " ۔ نازسی فوجیں رومانیہ میں داخل ہوگئیں۔
۸، " ۔ مسٹر چرچل نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ ۱۷ تاریخ کو برما کی سڑک دوبارہ کھول دی جائے گی۔
۹، " ۔ مسٹر چیمبرلین کی جگہ مسٹر چرچل کو کنسرویٹیو پارٹی نے اپنا رہنما منتخب کرلیا۔
۱۰، " ۔ چین میں جاپانیوں کی نئی سرگرمی۔
۱۱، " ۔ امریکہ نے روسی جہازوں پر جو پابندیاں عاید کی تھیں وہ اٹھالی گئیں۔
۱۲، " ۔ پریسیڈنٹ روزولٹ نے مجموعی مدافعت کے مسلک کو واضح کیا۔
۱۳، " ۔ کانگریس نے مسٹر گاندھی کی اس تجویز کو مان لیا کہ سیول نافرمانی انفرادی طور پر شروع کی جائے۔
۱۴، " ۔ بخارسٹ میں جرمنی کا بحری مشن۔
۔ برطانوی سفیر رومانیہ سے روانہ ہوگیا۔
۱۵، " ۔ ونوبا بھاوے کو پہلا ستیاگرہی منتخب کیا گیا۔
۱۶، " ۔ برطانیہ کے چانسلر آف دی اکس چیکر سر کنگسلی وڈ نے ایک ارب پونڈ کی رقم طلب کی۔
۔ چین کے امریکی باشندوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے وطن کو لوٹ جائیں۔
۱۷، اکتوبر۔ ونوبا بھاوے نے سی پی میں پاونر کے مقام پر ستیاگرہ شروع کی۔
۔ اسلحہ کی حمل و نقل کے لئے چین اور برما کے درمیان کی سڑک کھول دی گئی۔
۱۸، " ۔ رودبار انگلستان میں بحری جنگ۔
۔ برما کی سڑک پر ہند چین کے مرکزوں کی طرف سے بمباری کی گئی۔
۱۹، " ۔ ایم۔ لیون بلیوم اور ایم۔ ریناؤ کو نظربند کرلیا گیا۔
۲۲، " ۔ جاپان کے برطانوی باشندوں سے کہا گیا کہ وہ جاپان سے نکل آئیں۔
۔ ہٹلر نے ایم۔ لاوال سے گفتگو کی۔
۲۳، " ۔ فرانس اور اسپین کی سرحد پر ہٹلر نے فرانکو سے گفتگو کی۔
۲۴، " ۔ ہٹلر نے مارشل پتیاں سے ملاقات کی۔
۲۵، " ۔ والسرائے نے ایسٹرن گروپ کانفرنس کا دہلی میں افتتاح کیا۔
۔ برطانیہ پر ہوائی حملوں میں اطالیہ نے بھی اشتراک کیا۔
۲۶، " ۔ اعلان ہوا کہ فرانس اور جرمنی کے مابین راضی نامہ طے ہوگیا۔
۲۷، " ۔ مسٹر ایمری نے کہا کہ جنگ کا دوسرا مرکز ممکن ہے مشرق قریب بن جائے۔
۲۸، " ۔ اطالیہ نے یونان پر حملہ کردیا۔
۲۹، " ۔ برطانیہ نے یونان کی بحری امداد شروع کی۔
۳۰، " ۔ چینیوں نے نانگنگ پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔
۳۱، " ۔ اپریل ۱۹۴۱ء سے لارڈ ونلنگڈن کی مدت ملازمت میں ایک سال کی توسیع ہوئی۔
۔ چھیوکی میں پنڈت نہرو گرفتار کیے گئے۔

نومبر:-

ا/ نومبر ۔ ڈوور کے پاس جرمن توپوں نے برطانوی جہازوں پر شل باری کی۔

۲/ ر ۔ یونانیوں نے البانیہ میں بڑھنا شروع کیا۔

۳/ ر ۔ آیونیا کے سمندر میں برطانوی اور اطالوی جہازوں کے مابین لڑائی۔

۴/ ر ۔ اسپین نے تانجیر میں فوجی حکومت قائم کردی۔

۵/ ر ۔ پنڈت نہرو کو چار سال کی قید بامشقت۔

۔ وزیر مالیہ سر جیری رائس من نے امدادی بجٹ کا مسودہ پیش کیا۔

۶/ ر ۔ مسٹر روزولٹ تیسری مرتبہ صدر منتخب ہوئے۔

۹/ ر ۔ مسٹر چیمبرلین کا انتقال۔

۔ برطانوی فوجیں کریٹ پہنچیں۔ امریکہ نے وعدہ کیا انگلستان کو مزید امداد دے گا۔

۱۰/ ر ۔ دہلی میں اخباری مدیروں کی کانفرنس۔ ترکوں نے کمال کی دوسری برسی میں حلف اٹھایا کہ وہ آزادی کے لئے اپنی جانیں لڑا دیں گے۔

۱۱/ ر ۔ اسمبلی میں کانگریس نے مسودہ مالیات کی مخالفت کی۔

۱۲/ ر ۔ مولوٹاف نے برلن میں ہٹلر اور ربن ٹروپ سے ملاقات کی۔

۱۳/ ر ۔ برطانوی بحریہ نے اطالوی بیڑے کو زبردست نقصان پہنچایا۔ یونانیوں نے اطالویوں کے خلاف جارحانہ کارروائی شروع کردی۔

۱۴/ ر ۔ سر رابرٹ بروک پاپہم کو مشرق بعید کا اعلیٰ کمانڈر بنایا گیا۔ شہر کوونٹری جرمن بمباری سے تباہ ہوا۔

۱۵/ ر ۔ سوویٹ روس کو برطانیہ کی ضمانت۔

۔ برطانیہ پر رات کے وقت جرمن ہوائیہ کا حملہ۔

۔ برلن پر شاہی ہوائیہ کا حملہ۔

۱۶/ نومبر ۔ مسٹر پٹیل کو گرفتار کرکے سابرمتی لے جایا گیا۔

۱۸/ ر ۔ برغاف میں سنیر سونیر نے ہٹلر سے گفتگو کی۔

۱۹/ ر ۔ مرکزی اسمبلی میں دوسرا مسودہ مالیہ مسترد کیا گیا۔

۔ ٹریچی میں ڈاکٹر راجن کی گرفتاری۔

۲۰/ ر ۔ مرکزی مقننہ میں وائسرائے کی تقریر۔ کانگریس کو تنبیہ۔ وزیر ہند کی تقریر۔ ہنگری "محور" میں شامل ہوگیا۔

۔ اسمبلی میں جنگی مسودہ مسترد ہوا۔

۲۱/ ر ۔ بمبئی میں مسٹر کھیر کی گرفتاری۔

۲۲/ ر ۔ یونانیوں کا کورٹ زا پر قبضہ۔

۲۳/ ر ۔ مزدوروں کے برطانوی وزیر مسٹر ارنسٹ بیون نے ہندوستانی مزدوروں اور ملاحوں کے لئے ایک نئی اسکیم بنائی۔ رومانیہ بھی محور میں شامل ہوگیا۔ جناح کی تقریر اور پاکستان کا مطالبہ۔

۲۴/ ر ۔ پنڈت پنت کی گرفتاری۔ پوپ نے قیام امن کے لئے ایک ہفتہ روزہ رکھنے کا ارادہ کیا۔

۲۵/ ر ۔ سر فرانک برلی کا انتقال۔

۲۶/ ر ۔ لارڈ راتھرمیر کا انتقال۔

۔ بحر ہند میں ایک انگریزی تجارتی جہاز ڈوب گیا۔

۲۷/ ر ۔ بہار میں سری کرشنا سنہا کی گرفتاری۔

۲۸/ ر ۔ جنرل آچن لیک کو ہندوستان کا اعلیٰ کمان دار بنایا گیا۔

۲۹/ ر ۔ جاپانی ریل گاڑی کو جو شنگ ہائی سے نان کنگ جارہی تھی، اڑا دیا گیا۔

۳۰/ ر ۔ جناح کی تقریر کہ مسلمان سول نافرمانی کی تحریک میں حسب ضرورت مداخلت کریں گے۔

۔ جاپان نے نان کنگ کی ریاکار حکومت کو مان لیا۔

دسمبر:۔

۱ر دسمبر۔ ستیاگرہیوں کی گرفتاریاں۔ لاہور میں تحریک پاکستان کے خلاف کانفرنس۔

۲ر ،، ۔ ورسائے فرانس کا دارالسلطنت بنایا گیا۔ لورین کا علاقہ جرمن میں شامل کیا گیا۔

۵ر ،، ۔ جرمنی اور رومانیہ کے درمیان دس سالہ معاہدہ۔

۹ر ،، ۔ جاپان کا اعلان کہ امریکہ جنگ میں شریک ہو تو جاپان جرمنی کا ساتھ دے گا۔

ہزاکسلنسی تائی چی تاؤ شانتی نکیتان میں۔

۱۰ر ،، ۔ مصری محاذ پر اطالویوں کے خلاف برطانوی فوجوں کی کامیاب جارحانہ پیش قدمی۔

۱۲ر ،، ۔ مسٹر ایمری کی تقریر کہ سب جماعتوں کو خود غرضانہ منصوبے ترک کرکے "ہندوستان پہلے" کی آواز بلند کرنی چاہیے۔

۱۳ر ،، ۔ سپرو کی اپیل گاندھی جناح اور حکومتِ ہند سے کہ سب متحد ہو کر ایک قومی حکومت بنالیں۔

۱۴ر ،، ۔ والسرائے کی ایوان تجارت میں تقریر جس میں اگست والے پیش کش کو دوہرایا گیا۔

۱۶ر ،، ۔ پنجاب اسمبلی میں فوجی بھرتی پر مباحثہ اور خان بہادر کرانی کی تحریک کی منظوری۔

۱۷ر دسمبر۔ واردھا سے اعلان کہ کرسمس کے دنوں میں ستیاگرہ بند رہے گی۔

۱۸ر ،، ۔ حبش میں اطالویوں کے خلاف تحریک زور پکڑنے لگی۔

۱۶ر۔۱۸ر ،، ۔ لاہور میں انڈین ہسٹری کانگریس کا چوتھا سالانہ جلسہ

۱۹ر ،، ۔ لکھنؤ میں پہلی "انگلش کانفرنس"۔ ڈاکٹر امرناتھ جھا کی صدارت میں۔

۲۱ر ،، ۔ کلکتے میں دوسرے مسودہ تعلیم کے خلاف احتجاج۔

۲۱ر ،، ۔ بڑودے میں ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن کا سترھواں سالانہ جلسہ۔

۲۲ر۔۲۳ر ،، ۔ وسوا بھارتی کی سالگرہ۔

۲۴ر ،، ۔ امریکہ کو جاپان سے خدشہ۔ فلپائن کو بہت مستحکم کیا جانے لگا۔

۲۸ر ،، ۔ احمدآباد میں مسٹر جناح کی تقریر۔ پاکستان پر زور۔

۲۹ر ،، ۔ مدورا میں ڈاکٹر مونجے نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے۔

۳۰ر ،، ۔ روزولٹ نے اپنی قوم کو تنبیہہ کی کہ اگر برطانیہ ہار جائے تو امریکہ بڑے خطرے میں پڑ جائے گا۔

۲۸ر۔۳۰ر ،، ۔ پونا میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔

(ح۔ ص)

گورستان

یہ نظم میری ایک طویل نظم "گورستان" کا ایک ٹکڑا ہے جو میں نے اپنی والدہ صاحبہ کے انتقال سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ (احسان)

وقت کا غصہ، زمیں کا طیش، گردوں کا ستم
ریت کی جاجم سی یہ اڑتی ہوئی نقشِ قدم

یہ پرانی زاد و راہیں، یہ کھلی، پگڈنڈیاں
ان کو ویرانہ کہوں کیونکر لرزتی ہے زباں

یہ سمٹتی جھاڑیاں، یہ سانس لیتا التہاب
یہ جواں ہوتی طپش، یہ چرخ کھاتا آفتاب

یہ بگولوں کے بھنور، یہ گرم جھونکوں کا بہاؤ
یہ خنک سایوں کے مرہم، یہ تپی راہوں کے گھاؤ

یہ حزیروں کے کھنڈر، بیکس مزاروں کے نشاں
ان کو ویرانہ کہوں کیونکر لرزتی ہے زباں

اس احاطہ میں تکلم ہے خموشی کا اسیر
اس سڑک پر ایک ہو جاتے ہیں سلطان و فقیر

توڑ دیتا ہے یہاں آئینہ احساسِ شباب
خاک پر چھپتی ہے آئین و ضوابط کی کتاب

عشق کے دل میں جنوں کی رَو گزر سکتی نہیں
حسن کی جانب نظر تکلیف کر سکتی نہیں

سیر ہو جاتی ہے بھوک اور سرد پڑ جاتی ہے پیاس
گھٹنیوں چل کر نہیں جاتے ہیں بچے ماں کے پاس

بھائی کا بھائی سہارا لے کے چل سکتا نہیں
باپ بیٹے کی طرف کروٹ بدل سکتا نہیں

بے ثباتی ڈال دیتی ہے یہاں آنکھوں میں دھول
آئینہ سیماؤں کے سینوں پہ اگتے ہیں ببول

ذہن کے حجرے سے باہر آئے کیا لفظوں کی لاش
نطق کا سانچہ ہی کر دیتی ہے فطرت پاش پاش

اہلِ دولت گنگ ہیں اس انجمن کو دیکھ کر
ہنس نہیں سکتے غریبی کے کفن کو دیکھ کر

زرد کر دیتی ہے یہ آب و ہوا روئے بہار
اس زمیں پر جھک کے چلتا ہے غرورِ شہریار

بھول جاتی ہیں یہاں مائیں محبت کے اصول
امتوں کی دستگیری چھوڑ دیتے ہیں رسول

یہ بُرا ہے، یہ بھلا، یہ تیرہ دل یہ پاک باز
موت کی خوں ریز آنکھوں کو کہاں آتی امتیاز

منصفی، الفت، وفا، یہ اصطلاحاتِ بشر
موت کی کالی زباں پر اور پھر ان کا گذر؟

موت کی خشکی پہ ماتم جال بُن سکتا نہیں
اس کا بہرا پن ان آوازوں کو سُن سکتا نہیں

ہیں یہاں مدفون وہ سیمیں تن و رنگیں عذار
سیکڑوں قلب و نظر کرتے تھے جن کا انتظار

اس جگہ وہ لوگ دم سادھے ہوئے خاموش ہیں
کارنامے جن کے جرأت بخش و سطوت کوش ہیں

گُنگ ہیں پیندور کھائے مُطربانِ خوشنوا
جن کی ہر اک سانس تھی مہکی ہوئی موجِ صبا

جن کی آوازوں میں ڈھل کر نغمہ بن جاتا تھا ضو
جن کی مضرابوں سے دل کے ساز دا ٹھتے تھے تو

دفن ہیں اِن خاک کے تودوں میں وہ آنکھیں وہ دل
منکشف تھے جن پہ اسرار و رموزِ آب و گِل

ان میں وہ مزدور بھی ہیں ذی وقار و ذی حشم
جن کے احسانات سے دوہری ہے محرابِ حرم

جن کی محنت سے درخشاں ہیں شوالوں کے کلس
ارتقا کی نبض تھی جن کا ہر اک تارِ نفس

ہیں کلیساؤں کے رُخ پر جن کے جذبے آشکار
جن کی پستی پر ہے عالم کی بلندی کا مدار

خون جن کا جذب ہر دیوار میں ہر در میں ہے
فرش میں محراب میں مینار میں منبر میں ہے

جنِ کی شہ رگ کا لہو پی کر جواں ہے کائنات
کرتی ہے تصنیف جن کی عمرِ خونیں واقعات

ناخدا اس گھاٹ کی کشتی کو کھے سکتا نہیں
آدمی کو آدمی آواز دے سکتا نہیں

اب وہ بازو خاک ہو کر مل گئے ہیں خاک میں
مچھلیاں تھیں جن کی مضطر کوشش آہن چاک میں

نام کھودے ہیں جنھوں نے خود زمیں کے طشت پر
جن کی مہریں ثبت ہیں قرطاسِ بحر و دشت پر

سو رہے ہیں سب کے سب یہ سیکڑوں من خاک میں
غلغلے برپا ہیں لیکن گنبدِ افلاک میں

آ رہی ہے ہلکی ہلکی سی صدا یہ بار بار
موت کا چنگل ہے سر پر جانے والے! ہوشیار!

احسان دانش

نئی کتابیں

۱ ۔ محمد قلی قطب شاہ (سوانح) از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ۔ ۵۰۰ صفحات قیمت صہ سب رس کتاب گھر خیریت آباد

۲ ۔ عقل و جنوں (انقلابی نظمیں) از حکیم میر کاظم علی برق موسوی ۹۰ صفحات قیمت ایک روپیہ ۔ مرکز ادب حیدرآباد

۳ ۔ وجدانیات (مجموعۂ کلام) از شوکت علی خاں فانی قیمت عہ دفتر روزنامۂ پیام ۔ حمایت نگر۔

۴ ۔ رضا شاہ پہلوی (سوانح) از کے ۔ اے حمید بیرسٹرایٹ لا قیمت ہے مکتبہ ابراہیمیہ ۔ حیدرآباد

۵ ۔ نازو اور دوسرے افسانے از اختر انصاری ۱۷۵ صفحات قیمت عہ کتب خانہ علم و ادب ۔ دہلی۔

۶ ۔ بحر تبسم (مزاحیہ مضامین) از شوکت تھانوی قیمت عال کتب خانہ علم و ادب ۔ دہلی۔

۷ ۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق از حفظ الرحمن سیوہاروی قیمت معہ ر کتب خانہ علم و ادب ۔ دہلی۔

۸ ۔ غلامانِ اسلام (سوانح) از سعید احمد قیمت للعہ ر کتب خانہ علم و ادب ۔ دہلی

۹ ۔ نئی پود (افسانے) از ازہر قدوائی ۱۹۶ صفحات قیمت مکتبہ جامعہ۔ نئی دہلی

۱۰ ۔ اردو شاعری پر ایک نظر از حکیم الدین احمد عظیم پبلشنگ ہاؤس بانکی پور ۔ پٹنہ

۱۱ ۔ شادی (میری اسٹوپ کی کتاب کا ترجمہ) از توقیر مرزا رزاقی قیمت عہ ۔ ایس۔ اے۔ رحیم جنرل مرچنٹ حیدرآباد۔

۱۲ ۔ ہندوستانی تہذیب کی تکمیل۔ از کالیداس کپور قیمت ہر نولکشور پریس ۔ لکھنؤ۔

۱۳ ۔ خیال آفریں دماغ (ڈراما) از عرش تیموری قیمت ۱۲ر حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

۱۴ ۔ پاکستان اور مسلمان از انیس الرحمن ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲ر دفتر روزنامۂ پیام حمایت نگر

۱۵ ۔ انوار (غزلیں اور نظمیں) از علی اختر ۳۰۰ صفحات قیمت عہ سب رس کتاب گھر

۱۶ ۔ ذکر الحبیب صلعم (صدر یار جنگ کی تقریریں) مرتبہ محمد اکبر علی مدیر صحیفہ ۱۹۲ صفحات قیمت عہ دفتر صحیفہ چادر گھاٹ حیدرآباد

۱۷ ۔ قرآن اور اقبال (خطبات اور کلام کا مجموعہ) مرتبہ محمد ابو مصلح ۱۹۲ صفحات قیمت عال۔ ادارہ عالمگیر تحریک قرآن مجید۔ حیدرآباد۔

۱۸ ۔ دیوان ماجر از حکیم رگھناتھ سنگھ ماجر دہلوی ۴۰۸ صفحات قیمت صہ کوپراج رگھنندن سنگھ طاہر۔ کناری بازار۔ دہلی۔

۱۹ ۔ سہارا اور دوسرے افسانے از شفیق بانو شفیق ۱۴۴ صفحات قیمت عہ شفیق بانو نجیب آباد

۲۰ ۔ چیونٹی (چیونٹی کے حالات) از مہتدر راج سکسینہ ۱۱۵ صفحات سب رس کتاب گھر خیریت آباد۔

۲۱ ۔ دنیا کے بچے نمبر ۱ (مشرقی بچوں کے حالات) از عزیز رضوی ۴۷ صفحات قیمت ۴ر سب رس کتاب گھر۔

۲۲ ۔ خوں ناب (غزلوں کا مجموعہ) از اختر انصاری مکتبہ جہاں نما دہلی

۲۳ ۔ لفٹنٹ (مزاحیہ فسانہ) از مرزا عظیم بیگ چغتائی ۴۸ صفحات قیمت ۱۲ر دفتر کتابت ۔ جودھ پور۔

۲۴ ۔ اصولِ صحت حصہ اول و دوم از صفی حیدر کوثر قیمت ۴ر اسٹار بک ڈپو کلکتہ

۲۵ ۔ فلسفۂ موسیو منتیسی از ڈاکٹر یار محمد خاں غزنی فارسی عہ کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ

۲۶ ۔ کھیتی (ڈراما) از محمد مجیب ۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔

۲۷ ۔ سلطان محمود غزنوی از پروفیسر حبیب مترجمہ جمیل حسین قیمت عہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد

۲۸ ۔ کرشمات پھٹکری از ڈاکٹر علی شبیر ۱۵۰ صفحات قیمت عہ ۔ اے شیر اینڈ کمپنی ریلوے روڈ ۔ جالندھر

۲۹ ۔ ہم اور وہ از خواجہ محمد شفیع دہلوی ۔ ۱۲۸ صفحات قیمت ۱۲ر از مصنف مٹیا محل دہلی۔

مرزا اسعف علی (۱)

تنقید و تبصرہ

بغداد کا جوہری۔ از اشرف صبوحی صاحب دہلوی کتب خانہ علم و ادب دہلی قیمت ایک روپیہ۔ صفحات ۱۶۸۔

اشرف صاحب کی کہانیاں اور مضمون اکثر اردو رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں اور جیسا کہ اس کتاب کے تعارف میں پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب نے لکھا ہے اشرف صاحب کو مغربی افسانوں کو مشرقی انداز اور اسلوب سے بیان کرنے میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ ان کے ترجموں پر اصلی اور طبعزاد ہونے کا گمان گزرتا ہے۔

بغداد کا جوہری ایک افسانہ ہے جو انگریزی سے اخذ کیا گیا ہے۔ لیکن انگریزی میں بھی کسی اور زبان سے منتقل ہوا ہوگا۔ یہ افسانہ ایک شادی شدہ متمول تاجر کی ایک عجیب نفسیاتی کشمکش کو پیش کرتا ہے۔ اور اس میں بڑے کمال سے مشرقی بیوی کی وفا داری اور اطاعت گزاری کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ عہد حاضر میں اتنا دلچسپ اور بامعنی کوئی افسانہ شاید ہی اردو میں طبع ہوا ہو۔

مختصر حالات حضرت بی بی فاطمہ۔ مرتبہ صغرا بیگم ہمایون مرزا ۴۴ صفحات اس کتاب کو مرتبہ نے اپنے مرحوم شوہر سید ہمایون مرزا کے نام معنون کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ مرحوم نے حضرت علی کے حالات پر ایک کتاب شاہ راہ نجات لکھی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کو حضرت فاطمہ کے حالات چھپوانے کا خیال پیدا ہوا۔

یہ ایک چھوٹی سی دلچسپ کتاب ہے۔ اور اس کا مطالعہ خاص کر خواتین کے لئے سبق آموز ثابت ہوگا۔ اس کے آغاز میں دو تین غزلیں اور نظمیں ہیں جن میں نعت اور منقبت کی حد تک تو کوئی عذر نہیں لیکن بی بی فاطمہ کی سوانح حیات کی ابتدا میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی شان میں نظم درج کرنا بے موقع معلوم ہوتا ہے۔

رہنمائے مدینہ۔ مرتبہ مولوی مسعود علی صاحب محوی بی اے صفحات ۲۴۲ قیمت بارہ آنے۔

یہ کتاب مدینۂ منورہ کا کوئی سفرنامہ نہیں ہے بلکہ اس قدیم تاریخی اور مقدس شہر کے آثار کی ایک نہایت ہی مفید اور مستند تاریخ ہے۔ کچھ عرصہ سے اردو میں مقامات مقدسہ کے سفرنامے شایع ہو رہے ہیں۔ لیکن محوی صاحب نے بڑا اچھا کیا کہ سفرنامہ لکھ کر اپنے حالات و خیالات کی نمود و نمایش کرنے کی جگہ خود مدینہ اور اس کے نواح کے متعلق ایک ایسی محققانہ کتاب قلمبند کر دی جو ایک بڑا مورخ اور محقق ہی لکھ سکتا تھا۔ ہمارے خیال میں ہر اس شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے جو دیار نبی سے کسی نہ کسی طرح کی دلچسپی رکھتا ہو۔

اردو شاعری پر ایک نظر۔ از کلیم الدین احمد ناشر عظیم پبلشنگ ہاؤس بانکی پور۔ پٹنہ صفحات تقریباً چار سو مجلد۔

کلیم الدین احمد صاحب پٹنہ کالج میں انگریزی کے پروفیسر ہیں اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ اردو ادب کا بھی اچھا ذوق حاصل ہے۔ مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے بعد پروفیسر مسعود حسن رضوی کی ہماری شاعری اور پروفیسر سروری کی جدید اردو شاعری دو کتابیں اس موضوع پر اب تک لکھی گئی تھیں۔ یہ تیسری کتاب ہے جس میں گزشتہ کتابوں سے زیادہ شرح و بسط کے ساتھ اردو شاعری پر نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر منقسم ہے پہلا حصہ قدیم شاعری پر اور دوسرا جدید سے متعلق لکھا گیا ہے۔ لیکن زیادہ علمی ترتیب یہ ہوتی کہ تین حصے بنائے جاتے اور قدیم شاعری کو

بجائے میرؔ اور سوداؔ سے شروع کرنے کے وجہیؔ و غواصیؔ سے شروع کیا جاتا اور اگر یہ ممکن نہ تھا تو کم از کم ولیؔ اور سراجؔ ہی سے شروع کر سکتے تھے کیونکہ ان لوگوں کا کلام چھپ چکا ہے۔ اور اس دور کے دوسرے دہلوی شعرا مثلاً حاتمؔ، آبروؔ، اور تاباںؔ وغیرہ کا کلام بھی منظرِ عام پر آچکا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ مصنف نے اس دور کو بالکلیہ ترک کر کے میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کو متقدمین میں شمار کیا ہے۔

کتاب کی ترتیب اور کتابت و طباعت بھی اصلاح اور ترقی کی محتاج ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب شعر و سخن کے شائقین میں مقبول ہو کر ان کی معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگی اور اگر اس کی دوسری طباعت کا موقع آئے تو مرتب اس کے موجودہ نقائص کو ضرور دُور کر سکیں گے۔

دنیا کے بچے۔ از عزیز رضوی۔ ۷۴ صفحات ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر قیمت چار آنے۔

اردو میں ادبِ اطفال کی جو کمی عرصہ سے محسوس ہو رہی تھی اس کی تلافی اب کچھ کچھ ہوتی جا رہی ہے۔ زیرِ نظر کتاب دنیا کے بچے ادب اطفال کے اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جس کی اشاعت عزیز رضوی صاحب کے پیشِ نظر ہے۔ اس میں سلیس زبان کے ذریعہ سے مفید معلومات کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کو بچے شوق سے پڑھیں گے کیونکہ اس میں بچوں ہی کے آپس کے مکالمے کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

مبادی سیاسیات۔ از پروفیسر ہارون خاں شروانی مکتبہ جامعۂ ملیہ ۶۵۰ صفحات قیمت پانچ روپے۔

پروفیسر ہارون خاں صاحب کی یہ کتاب اس سے قبل شایع ہو کر اتنی مقبولیت حاصل کر چکی ہے کہ اب جامعۂ ملیہ نے اس کا دوسرا ایڈیشن شایع کیا ہے۔ ۱۹۳۰ء سے اب تک دنیا کی سیاست نے اتنا پلٹا کھایا ہے کہ پروفیسر ہارون خاں صاحب کو یہ کتاب ایک بڑی حد تک از سرِ نو لکھنی پڑی اس میں بعض حصوں کو حذف کر دیا گیا ہے اور آخر میں اصطلاحات کی فرہنگیں بھی شامل کی گئی ہیں جن کی وجہ سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ توقع ہے کہ یہ ایڈیشن بھی کافی مقبول ہوگا۔

مسلمانانِ ہند کی حیاتِ سیاسی۔ از محمد مرزا صاحب دہلوی کتب خانہ علم و ادب دہلی ۲۵۴ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

یہ کتاب ہندی مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا ایک مختصر سا تذکرہ ہے۔ اس میں مسلمانوں میں اپنے حقوق کا احساس پیدا ہونے کے بعد سے مسلم لیگ کے جدید ترین مطمحِ نظر تک کے حالات و رجحانات پر نہایت خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو ہندوستانی سیاست کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہتا ہے۔

فنِ تقریر۔ مرتبہ ادارۂ ادبیاتِ اردو ۹۶ صفحات قیمت آٹھ آنے۔

ہندوستان کی بدلتی ہوئی سیاست اس امر کی مقتضی ہے کہ اس کی نئی پود فنِ تقریر کی اہمیت سے واقف ہو کیونکہ آئندہ وہی جماعت اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکے گی جس کے زیادہ سے زیادہ افراد تقریر کرنے کے ہنر سے واقف ہوں گے۔ اسی ضرورت کو پیشِ نظر رکھ کر ادارۂ ادبیات اردو نے یہ بالتصویر کتاب شایع کی ہے جس میں متعدد تصویریں بھی شریک کی گئی ہیں۔ تا کہ ان کی مدد سے مقرر کی مختلف حرکات واضح ہو جائیں اور فنِ تقریر کے

طالب علم کو معلوم ہو کہ تقریر کرتے وقت کس طرح کھڑا ہونا چاہیے اور اپنے مختلف اعضا سے کیونکر کام لیا جا سکتا ہے۔ ابتداً میں فنِ تقریر کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور اس کے بعد تفصیل میں فنِ تقریر سے متعلق ضروری اور اہم معلومات دل نشیں پیرائے میں درج کی گئی ہیں یقین ہے کہ مدرسوں کے طلبہ اور تعلیم یافتہ نوجوان اس کے مطالعہ سے فائدہ اٹھائیں گے۔

معارفِ جمیل۔ مجموعۂ کلام حکیم آزاد انصاری ملنے کا پتہ کاشانۂ باز۔ گھانسی بازار حیدرآباد قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے۔ صفحات ۲۵۶۔

حکیم آزاد انصاری ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ اور مولانا حالی کے خاص فیض یافتہ اور معتقدوں میں سے ہیں۔ ان کے کلام میں خاص روانی اور بے ساختہ پن ہے۔ معارفِ جمیل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ردیف وار مرتب ہونے کے باوجود اس میں تقریباً ہر نظم یا غزل پر تاریخ بھی درج ہے۔ شاہ ظہور الدین حاتم کے دیوان زادہ کے بعد یہی ایک کتاب ایسی نظر سے گزرتی ہے جس میں شاعر نے خاص اہتمام سے اپنے کلام کو مرتب کیا ہے۔ جناب تراب علی خاں بانقابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اس گنجینۂ سخن کو بڑی خوبی سے شایع کیا ہے۔

دانہ و دام۔ از راجندر سنگھ بیدی مکتبہ اردو لاہور صفحات ۳۰۴ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

یہ دیدہ زیب کتاب اردو کے نوجوان افسانہ نگار راجندر سنگھ کے چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اکثر افسانے زندگی کے گہرے مطالعہ کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اور ترقی پسند ادب میں ایک اچھے اضافے کا باعث ہیں۔ راجندر سنگھ کے اسلوب بیان اور واقعیت پسندی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ منشی پریم چند کی کتابوں کا کافی مطالعہ کر چکے ہیں اور کوئی تعجب نہیں کہ ایک روز یہ ان کے سچے جانشین ثابت ہوں گے۔ جدید اردو افسانہ نگاری کی خصوصیتوں کے پیش نظر دانہ و دام ایک معیاری کتاب سمجھی جا سکتی ہے۔

قرآن اور اقبال۔ از ابو محمد مصلح ناشر ادارۂ عالمگیر تحریکِ قرآن مجید حیدرآباد دکن صفحات ۱۹۱ قیمت فی جلد دو روپے۔

ابو محمد مصلح صاحب کچھ عرصہ سے اردو میں قرآن سے متعلق مفید ادب پیش کر رہے ہیں۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے اردو ادب کی چھان بین بھی شروع کردی ہے۔ چونکہ ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اس لئے لازمی تھا کہ انھیں اس میں ان کے کام کی بہت سی چیزیں مل جاتیں۔ حسن اتفاق سے انھوں نے سب سے پہلے علامہ اقبال کے کلام کو منتخب کیا چونکہ اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد قرآن مجید ہی کی رہبری میں اپنی زندگیوں کو سنوارنے میں کوشاں ہے اور علامہ اقبال انہیں کے ترجمان ہیں اس لئے ان کے کلام میں مصلح صاحب کو بہت سا مفید مواد ہاتھ آگیا ہے۔

مغربی علم و فضل کے بہت بڑے ماہر اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کو اس امتیاز پر فخر حاصل تھا کہ وہ اسلامی علوم و فنون کے ماخذ و مبدا یعنی قرآن مجید کے بڑے رسیا اور فیض یافتہ تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں ان کے کلام میں اس عظیم الشان کتاب کے اثرات جگہ جگہ جھلکتے نظر آتے ہیں۔ انہیں جھلکوں کو مصلح صاحب نے ایک جگہ کرکے اپنی تشریح و توضیح کے ساتھ تابناک بنا دیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اقبال کے سمجھنے میں اور بھی سہولت پیدا ہو جائے گی۔ کتاب چھوٹی کراؤن سائز پر چھپنے کی جگہ اگر اسی نصف روبکاری سائز پر چھاپی جاتی جس پر اقبال کی کتابیں چھپی ہیں تو زیادہ بہتر ہوتا۔

خطبۂ صدارت

ہز اکسلنسی رائٹ آنربل ڈاکٹر سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر پی سی - کے ٹی - ایل ایل ڈی - ڈی سی ایل
صدر اعظم باب حکومت کا وہ خطبہ جو بمقام ٹاون ہال باغ عامہ بتاریخ ۸ جنوری ۱۹۴۱ء کو ممدوح نے ادارۂ ادبیات اردو
کے ۱۹۴۰ء کے اردو امتحانات کی سندیں اور انعامات عطا فرمانے کے بعد سنایا تھا۔

جناب صدر صاحب و ارکان مجلس انتظامی ادارۂ ادبیات اُردو و دیگر حاضرین!

آج اُردو امتحانات کی سندیں اور انعامات تقسیم کرکے مجھے بڑی مسرت حاصل ہوئی - یہ امتحان ملک میں خواندگی بڑھانے میں مفید ثابت ہو رہے ہیں۔

اُردو نہ صرف ہندستان کی بڑی زبانوں میں شمار ہوتی ہے بلکہ ہماری سلطنت کی سرکاری زبان بھی ہے اور اسی وجہ سے یہ ہم کو بہت عزیز ہے اور جو بھی اس کی خدمت کرتا ہے اس کی ہم قدر کرتے ہیں۔

ادارۂ ادبیات اُردو گزشتہ دس سال سے اُردو زبان اور ادب کی ٹھوس خدمت کر رہا ہے اور مجھے بڑی خوشی ہوئی جب میں نے گزشتہ ہفتہ میں اس کا معائنہ کرکے معلوم کیا کہ اس ادارہ کے کارکنوں میں علم و ادب کا ذوق اور تحقیق و جستجو کا مادہ موجود ہے چنانچہ میں نے دیکھا کہ بہت سا ایسا مواد جمع کر لیا گیا ہے جو کام کرنے والوں کے لئے مفید ثابت ہوگا اور جس کی اشاعت وحفاظت ہر ترقی یافتہ قوم کا مقدس فریضہ ہے۔

مجھے توقع ہے کہ ادارہ کے کارکن اسی طرح خلوص اور جوش کے ساتھ اپنا کام جاری رکھیں گے اور جب اس ادارہ کی ایک ذاتی عمارت بن جائے گی تو مجھے یقین ہے کہ وہ حیدرآباد میں تصنیف و تالیف اور علم و فضل کا ایک اچھا مرکز ثابت ہوگا۔

میں آخر میں امتحانوں میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کو مبارکباد دیتا ہوں اور متوقع ہوں کہ ہر سال اسی طرح سیکڑوں لوگ ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

ادارۂ ادبیات اُردو

آنربل نواب مہدی یار جنگ بہادر سید مہدی حسین بلگرامی ایم اے (کیمرج) معین امیر جامعہ عثمانیہ وصدرالمہام تعلیمات وفینانس دولت آصفیہ کی وہ تقریر جس کو جلسۂ عطائے اسناد میں موصوف کی ناسازیٔ مزاج اور آواز کی خرابی کی وجہ سے مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب ایم سی ایس معتمد فینانس حکومت سرکار عالی نے پڑھ کر سنایا۔

ادارۂ ادبیات اُردو اپنی زندگی کے دس سال ختم کرکے اب گیارھویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ اس اثناء میں اس نے اپنی علمی اور ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے حیدرآباد میں ایک مرکزیت حاصل کرلی ہے اور اپنے تحت مختلف مذاق کے اصحاب پر مشتمل بارہ شعبے قائم کرکے تقسیم کار کے مفید اصول پر عمل پیرا ہے۔

اس کی مطبوعات کا سلسلہ بھی برابر ترقی کر رہا ہے چنانچہ اب تک نثر کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں سے بعض مثلاً تاریخ ادب اُردو سائنس کے کرشمے، دفتری معلومات اور اُردو دانی کی کتابیں حیدرآباد میں اور باہر بھی نصاب کے طور پر پڑھائی جاتی ہیں۔ کتابوں کے علاوہ تین رسالے سب رس، بچوں کا سب رس اور سب رس معلومات بھی ہر مہینے پابندی سے شائع ہوتے ہیں اور سلیس وسادہ اور ہر رنگ کے مضامین کی وجہ سے مقبول ہیں۔

قلمی و تاریخی تحقیقات سے متعلق بھی اس نے نمایاں کام کیا ہے اور اس سلسلے میں نادر قلمی و مطبوعہ کتابوں اور کاغذات کا ایک ایسا ذخیرہ فراہم کرلیا ہے جو تحقیقاتی کاموں کے لئے گنج شائگاں ثابت ہوگا جس وقت اس ادارہ کی عمارت بن جائے گی تو اس کی افادیت میں اور بھی اضافہ ہوگا کیونکہ اس عمارت کا ایک حصہ ان لوگوں کے قیام کے لئے مخصوص رہے گا جو علمی تلاش و تحقیق کے سلسلے میں باہر سے آتے ہیں۔

ادارہ کا ایک شعبہ ادبی آثار کی حفاظت میں بھی مصروف ہے چنانچہ اس سال اس نے شاہ سراج اورنگ آبادی کے شکستہ گنبد کو بہت ہی خوبصورت بنا دیا ہے۔ انہی شعبوں میں سے ایک شعبۂ امتحانات ہے جس نے وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا۔ ان امتحانوں میں ہر مذہب و ملت کے مرد اور عورتوں نے شرکت کی۔ اُردو دانی کے امتحان میں ۹۵ مسلمان اور ۴۶ ہندو شریک تھے اور ۴۴ عورتیں جملہ امتحانات کے شرکا کی تعداد ۲۶۰ تھی۔ پہلے ہی امتحان میں اتنے امیدواروں کی شرکت باعث مسرت ہے۔ آئندہ اس تعداد میں اور اضافہ ہوگا کیونکہ اب بلدہ اور اضلاع کے علاوہ بیرون ریاست کے مختلف مقامات مثلاً مدراس، کرنول، عمرآباد، بمبئی اور پونہ میں بھی ان امتحانوں کے لئے امیدوار تیار ہو رہے ہیں اور توقع ہے کہ آئندہ امتحانات کے لئے ادارہ کو بہت زیادہ مرکز قائم کرنے پڑیں گے یہ امر بھی باعث مسرت ہے کہ ممتحنوں میں مقامی اصحاب کے علاوہ بیرون ریاست کے مستند اصحاب بھی شامل ہیں۔

میں آخر میں ادارہ کے سرپرست رائٹ آنربل سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر سے استدعا کرتا ہوں کہ امتحانات کے اسناد اور انعامات تقسیم فرمائیں۔ آپ کے ہاتھوں سے اس نیک کام کا آغاز ادارہ کے لئے مبارک و مسعود ثابت ہوگا۔

جلسۂ عطائے اسناد و انعامات

بتاریخ ۸ جنوری ۱۹۴۱ء ادارہ کے اردو امتحانات کی اسناد اور انعامات کی تقسیم کے لئے ہز ایکسلنسی رائٹ آنریبل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر سرپرست ادارہ کی صدارت میں بمقام ٹاؤن ہال باغ عامہ حیدرآباد ایک جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں ارکان باب حکومت سرکار عالی مثلاً آنریبل نواب سر عقیل جنگ بہادر، نواب مہدی یار جنگ بہادر اور نواب مرزا یار جنگ بہادر کے علاوہ اکثر معتمدین و نظماء نیز حیدرآباد کے اکثر معزز ہندو اور مسلمان اصحاب مثلاً نواب بہادر یار جنگ بہادر، میر اکبر علی خاں بیرسٹر، مولوی قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر پیام، راجہ نرسنگھ راج بہادر عالی، ڈاکٹر رگھو نندن راج سکسینہ، پروفیسر مہندر راج سکسینہ، مسٹر شنکر جی وغیرہ نے بھی شرکت کی۔ ٹاؤن ہال میں مہمانوں، ادارہ کے رفقاء و معاونین، مجالس ادارہ کے اراکین اور کامیاب امیدواروں کی نشست کے لئے بڑے سلیقہ سے علحدہ علحدہ انتظامات کئے گئے تھے۔ اس جلسے میں پہلے مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) صدر شعبۂ اردو امتحانات نے صدر اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور ۱۹۴۰ء کی روئداد سنائی۔ اس کے بعد نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر ادارہ نے ادارۂ ادبیات اردو کے متعلق ایک معلومات آفریں تقریر فرمائی اور سر اکبر حیدری سرپرست ادارہ سے تقسیم اسناد و انعامات کی استدعا کی۔

اس کے بعد سر اکبر حیدری نے تالیوں کی گونج میں کامیاب امیدواروں کو اسناد و انعامات تقسیم فرمائے امتحان اردو فاضل میں (۱۱) امیدوار شریک تھے جن میں سے چھ کامیاب ہوئے۔ ان میں سے تین نے درجہ دوم میں کامیابی حاصل کی۔ کامیاب امیدواروں میں ۲ خواتین بھی شامل ہیں

امتحانات اُردو عالم میں (۶۸) امیدوار شریک تھے جن میں سے (۴۴) کامیاب ہوئے۔ تین بدرجۂ اول کامیاب ہوئے۔ کامیاب شدہ خواتین (۴) ہیں۔

امتحان خوش نویسی میں (۹) امیدوار شریک ہوئے پانچ کامیاب ہوئے۔

امتحان اُردو دانی میں (۱۴۳) امیدوار تھے (۱۲۸) کامیاب ہوئے۔ پندرہ نے بدرجۂ امتیاز کامیابی حاصل کی۔ اس امتحان میں کامیاب ہونے والی خواتین کی تعداد (۲۴) ہے۔ حسب ذیل امیدواروں نے تمغے حاصل کئے۔ اُردو فاضل۔ طیبہ بیگم بلگرامی طلائی تمغہ بلقیس بانو۔ اُردو عالم۔ تمغۂ ادارۂ ادبیات اُردو، اشرف الدین فیضی (بربھنی) تمغہ محمدی بیگم، عصمت النساء بیگم اور محمودہ بیگم کو دیا گیا۔ تمغہ احمد عبداللہ صاحب بسٹپا (کشتگی)، خوش نویسی میں تمغہ ادارۂ ادبیات اُردو۔ سید اسمٰعیل (شور اپور) تمغۂ محمد حسین صاحب۔ کریم داد خاں (کشتگی)۔ اُردو دانی:۔ تمغۂ معطیۂ سکینہ بیگم صاحبہ، امجدی بیگم۔ تمغہ رستم جی آمنہ بی (کشتگی)، تمغہ معطیۂ احمد عبداللہ صاحب، کریم داد خاں (کشتگی)۔ انعام ادارۂ ادبیات اُردو۔ محمد عثمان علی بلدۂ محمد نظام الدین (کشتگی) عبدالقادر (کلیانی) مہادیو سنگھ (کلیانی) سید شمس الضحیٰ (بربھنی) ہنگنگوڑہ (کشتگی) محمد جعفر (کشتگی)

بین المدارسی فی البدیہہ تقریری مقابلہ۔ انعام اول تمغۂ ادارہ۔ مجید احمد فاروقی۔ کپ۔ مجید احمد اور معین الدین (مدرسہ وسطانیہ دار الشفاء)۔

انعام دوم۔ تمغۂ ادارہ سید یعقوب حسن قادری (مدرسہ فوقانیہ مفید الانام) انعام دوم، علی محمد حسین خسرو۔ ترغیبی انعامات فضل راؤ و شمس الدین۔

بچوں کے سب رس میں ۱۹۴۰ء کے بہترین اور سب سے زیادہ مضامین کے لئے تمغۂ ادارہ مسیح الدین خاں متین کو دیا گیا۔

اور لڑکیوں میں تمغۂ ادارہ حبیبہ حبیب الرحمن کو دیا گیا۔ تقسیم اسناد و انعامات کے بعد سر اکبر نے اُردو کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ادارۂ ادبیات کے کارناموں کا خراج تحسین ادا فرمایا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری معتمد امتحانات کے شکریہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

روئداد اُردو امتحانات بابت ۱۹۴۰ء

از مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) نائب ناظم تعلیمات و صدر شعبۂ اُردو امتحانات ادارۂ ادبیات اُردو

یہ رپورٹ جلسۂ عطائے اسناد منعقدہ ۸ر جنوری ۱۹۴۱ء مطابق ۶ر اسفندار ۱۳۵۰ف میں پڑھی گئی۔

میرا سب سے پہلا اور خوش گوار فریضہ ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو نے شعبۂ امتحانات کی صدارت کے اہم فرائض میرے تفویض کر کے جو میری عزت افزائی کی اس کے لئے اظہار تشکر کروں۔ ہرچند سرکاری فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ یہ کام میرے لئے دشوار ہوتا مگر بانیان ادارہ کی پُرخلوص جدوجہد اور غیر معمولی جذبۂ ایثار نے مجھ پر گہرا اثر کیا اور حتی الوسع ادارہ کی خدمت کرنے پر مجھے آمادہ کیا۔

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کا دور مسعود ہر جہتی ترقی کے لئے تاریخ دکن میں یادگار رہے گا۔ اس مبارک زمانے کو ہم علوم و فنون کی نشاۃ ثانیہ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں۔ آج زندگی کے ہر شعبہ میں نئی روح کار فرما ہے۔

قیام جامعہ کے بعد ہی متعدد ادارے ملکی سود و بہبود کے لئے قائم ہوئے۔ چنانچہ ان میں سے ایک ادارۂ ادبیات اُردو بھی ہے جس کی بناء جامعہ کے مایۂ ناز سپوت جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ نے ۱۹۳۱ء میں ڈالی۔ اس کے قیام کا مبارک مقصد یہ ہے کہ "ماضی" نے جو امانت اُردو زبان کی خدمت سے متعلق حیدرآباد دکن کے سپرد کی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر یہ "امانت" مستقبل کے سپرد کر دی جائے۔ چنانچہ اس وقت ملک دکن نے اُردو ادب کی خدمت گزاری میں نمایاں جگہ حاصل کر لی ہے۔

جامعہ عثمانیہ کا قیام ملک کے حق میں ایک نعمت غیر مترقبہ ہے، جو ہمارے افکار و اعمال کی فطرتی ترقی کا صحت بخش ذریعہ ثابت ہو چکی ہے۔ اُردو کی ترقی میں ملک کے سپوتوں نے برق رفتاری پیدا کر دی جس کا ایک ثبوت ادارۂ ادبیات اُردو کی "دس سالہ سرگزشت" سے ملتا ہے، جس کو آپ سب حضرات ملاحظہ فرما چکے ہوں گے۔

جامعۂ عثمانیہ کی تاسیس اور ترقی میں عالی جناب رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری بالقابہم صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی نے جو نمایاں حصہ لیا اس سے ملک کا ہر فرد واقف ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو اسی جامعہ کی بدولت وجود میں آیا۔ یہ ادارہ کی خوش قسمتی ہے کہ ابتداء ہی سے اس کو عالی جناب رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری کی سرپرستی حاصل رہی، جو اس کی بقا اور ترقی کی ضامن ہے۔ ممدوح الشان نے ایک ہزار کا عطیہ اس کو عنایت فرمایا اور حال ہی میں ادارہ کا معائنہ فرما کر گہری دلچسپی کا اظہار فرمایا اور آج باوجود گوناگوں مصروفیات کے اپنی علم دوستی کا یہ ثبوت دیا کہ اس محفل میں قدم رنجہ فرما کر ہماری عزت افزائی کی۔ اور اسناد و انعامات تقسیم کرنے کی زحمت گوارا کر کے ادارہ کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ ہم جناب والا کا بطور خاص خیر مقدم کرتے ہیں۔

عالی جناب نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام فینانس و تعلیمات جن کا ادبی اور علمی ذوق مسلمہ اور جن کو علمی اور تعلیمی خدمت کا جذبہ ورثہ میں ملا ہے صدر ادارہ کی حیثیت سے اس کے جملہ امور میں دلچسپی لیتے رہے اور ہمیشہ مفید اور نیک مشوروں سے ادارہ کی رہبری فرمائی۔

اس ادارہ کا ایک جزو شعبۂ امتحانات ہے جو ۱۹۳۹ء میں قائم ہوا۔ اس کا قیام اردو زبان اور ادب کی حفاظت بقا اور ترقی کے سلسلے میں ضروری سمجھا گیا۔ اس کے ذریعہ سے ذوق مطالعہ کو عام کیا جا رہا ہے۔ اور ان اشخاص کے لئے جو کسی جامعہ یا

سرکاری ادارہ کی سند نہیں رکھتے یا دوسرے مضامین کے تعلیم یافتہ تو ہوتے ہیں مگر اُردو سے دلچسپی رکھتے ہیں اس شعبۂ امتحانات کا قیام عمل میں آیا۔ تاکہ وہ اپنے ادبی ذوق کی تکمیل ایک باضابطہ معیار کے مطابق کرسکیں۔ شعبہ مقررہ قواعد و ضوابط کے تحت امتحانات لیتا ہے۔ اور کامیاب امیدواروں کو صداقت نامۂ اسناد اور انعامات دیتا ہے۔ اس شعبہ کا کام ایک مجلس کے تفویض ہے جو اُردو سے دلچسپی رکھنے والے افراد پر مشتمل ہے۔ اور اس کے ممتحنین میں مقامی ماہرین کے علاوہ ہندستانی جامعات کے پروفیسر اور مستند اصحاب شامل رہتے ہیں۔

ادارہ کی مجلس امتحانات کے ذمہ حسب ذیل امتحانات کا انتظام ہے۔

(۱) سند اُردو دانی (۲) اُردو عالم (۳) اُردو فاضل (۴) خوش نویسی (۵) خطاطی و کتابت

اس شعبہ کے اعلیٰ امتحانات میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ مضامین نرے ادبی نہ ہوں بلکہ شرکاء کے لئے عملی طور پر مفید اور ان کی زندگی میں کارآمد ثابت ہوں۔ اسی اصول کے مدنظر اُردو فاضل کے امتحان میں عام معلومات کا ایک پرچہ رکھا گیا ہے، جس کا تفصیلی نصاب معاشیات، آئین حکومت، عمرانیات، فلسفہ اور سائنس وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اردو عالم کے امتحان میں بھی علمی قابلیت بڑھانے والے مضامین جو افادی نقطۂ نظر سے ضروری ہیں رکھے گئے ہیں۔ مثلاً خوش نویسی، خطاطی و کتابت، مختصر نویسی، ٹائپ، عام دفتری معلومات اور اناث کے لئے خاص طور پر امور خانہ داری۔ خوش نویسی اور خطاطی و کتابت کو نصاب میں اس لئے شریک کیا گیا ہے کہ یہ ایک شریفانہ فن ہے۔ قدیم زمانے میں بڑے بڑے لوگ اس کو اکل حلال کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔ یہ چیز اب زوال پذیر ہے اور اس کو سنبھالنے کی ضرورت داعی ہوئی۔ اُردو کتابوں کی دیدہ زیبی اور صحت و خوبی کا بہت کچھ انحصار اچھے خوش نویسوں اور کاتبوں پر ہے۔

اُردو دانی کے امتحان کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ملک کو جس چیز کی شدید ضرورت ہے وہ تعلیم بالغان کا مسئلہ ہے ادارہ کوشش کر رہا ہے کہ اپنے مقررہ نصاب کی تعلیم کے لئے مختلف مقامات پر مدارس بالغان بھی قائم کرے چنانچہ ایک مدرسہ بالغات اڈیکمیٹ میں قائم ہو چکا ہے۔ اور اب بیگم بازار، یاقوت پورہ۔ اور چادر گھاٹ میں مدارس شبینہ بالغوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔ اُردو دانی کے امتحان سے تعلیم بالغان کی اشاعت میں بڑی مدد مل رہی ہے۔ چنانچہ گذشتہ امتحان میں ہر مذہب و ملت کے متعدد ملازم پیشہ مرد اور عورتیں شریک امتحان ہوئیں۔ ناظم صاحبان آبکاری و جنگلات مستحق شکریہ ہیں کہ اپنے سررشتہ کے ملازمین ادنیٰ کو شریک امتحان ہونے کی ترغیب گشتی کے ذریعہ دلائی۔ سررشتۂ تعلیمات کی سند امتحان بالغان ڈیڑھ سالہ کورس کی تکمیل پر منحصر ہے اور کسی مدرسہ میں امیدوار کی شرکت بھی ضروری ہے۔ مگر ادارہ کا امتحان ان قیود سے مستثنیٰ ہونے کی وجہ سے مقابلتاً زیادہ مقبول ہے۔ تعلیم بالغان کے سلسلے میں دوسری اہم ضرورت مناسب اور موزوں کتب کی فراہمی اور تالیف ہے۔ اس کمی کی تلافی کے لئے ادارہ کی طرف سے مولوی سجاد مرزا صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج کی نگرانی میں اُردو دانی کی پہلی اور دوسری کتابیں خاص طور پر تیار کرائی گئی ہیں، جو نہ صرف اس ریاست میں بلکہ بیرون ریاست بھی مقبول ہو رہی ہیں۔

اس کے علاوہ جن اشخاص نے سند اُردو دانی حاصل کرلی ہے اور پڑھنا، لکھنا سیکھ لیا ہے ان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی مشق جاری رکھیں اور اپنی قابلیت بڑھائیں۔ ورنہ تھوڑی مدت میں پڑھا لکھا سب بھول کر برابر ہو جائے گا۔ اس مقصد کے تحت آسان اردو میں کتب کی تالیف ناگزیر ہے، جو بالغوں کے مذاق کی ہوں، ان کے مطالعہ کے ذوق کو بڑھائیں، اور ضروری معلومات بھی بہم پہنچائیں۔ اس غرض

کے لئے آسان کتب کی تیاری کا مسئلہ ادارہ کے زیر غور ہے امید ہے کہ مستقبل قریب میں عملی صورت اختیار کرے گا۔ ادارہ نے اردو دانی کی کتابوں کے علاوہ دفتری معلومات اور تاریخ ادب اُردو کی کتابیں بھی امتحانات کے سلسلہ میں تیار کرائی ہیں۔

تیاری امتحانات امتحانات کی تیاری کے لئے شعبۂ امتحانات نے بہ مقام کوابریٹیو ہال توپ کا سانچہ مختلف ماہر فن اصحاب سے بیس تقاریر کرائیں جن میں جناب سید محی الدین صاحب قادری زورؔ، جناب عبدالمجید صدیقی صاحب جناب سید محمد صاحب، جناب عبدالقیوم صاحب باقیؔ، جناب عبدالقادر صاحب سروری، جناب صلاح الدین صاحب اور جناب جہاں بانو بیگم صاحبہ وغیرہ نے بطور خاص حصہ لیا۔

عورتوں کی تعلیم کا انتظام معتمد شعبہ سکینہ بیگم صاحبہ کی دلچسپی کی وجہ سے شعبۂ نسوان کے مدرسہ تعلیم بالغات میں کیا گیا ہے جن کی نگرانی اس شعبہ کی صدر جناب رابعہ بیگم صاحبہ نے قبول فرمائی ہے۔ بلدہ کے خانگی امیدواروں نے مولوی سید محمد صاحب اور مولوی عبدالقادر سروری صاحب سے بہ پابندی استفادہ کیا نیز درسگاہ علوم شرقیہ یاقوت پورہ میں خانگی تعلیم کا انتظام تھا۔

مختلف اضلاع پر جلال الدین اشکؔ صاحب، مولوی محمود حسین صاحب اور راگھویندر راؤ صاحب جذبؔ نے امیدواروں کو تعلیم دی اور مولوی سید عارف الدین حسن صاحب، مولوی حمید اللہ خاں صاحب شیداؔ، مولوی محمد فاروق صاحب ایچ سی ایس قاضی محمد حسین صاحب، عطاء اللہ صاحب، بسنتپا صاحب اور بلونت رائے صاحب گھاٹے نے امتحانات کی اشاعت و تنظیم میں بڑا حصہ لیا۔ اور امتحانات کے جملہ انتظامات ادارہ کے مستعد مہتمم خواجہ حمید الدین شاہدؔ کی ہمہ وقتی مصروفیت اور تندہی کی وجہ سے بحسن و خوبی انجام پائے۔

سال حال امتحانات کے مرکز خاص حیدرآباد میں دو اور اضلاع میں گلبرگہ، پربھنی، کلیانی اور کشتگی وغیرہ میں چھ اس طرح کل آٹھ مرکز قائم کئے گئے تھے۔

باوجودیکہ سال حال پہلی مرتبہ ادارہ کے امتحانات منعقد ہوئے مگر شرکاء کی تعداد بہت امید افزا رہی۔ اُردو دانی کے امتحان میں عورتیں بھی بکثرت شریک تھیں اور شرکاء کی جملہ تعداد ایک سو پینسٹھ ۱۶۵ تھی۔

اُردو عالم کے امتحان میں چہتر اور فاضل کے امتحان میں گیارہ امیدوار شریک تھے۔ بہ حیثیت مجموعی جملہ امتحانات کے کامیاب طلبہ کا اوسط یہ رہا۔

(۱) اُردو فاضل۔ گیارہ حاضر، چھ کامیاب۔ تین بدرجۂ دوم۔ نتیجہ ۵۵ فی صد۔

(۲) اُردو عالم۔ اڑسٹھ حاضر۔ چالیس کامیاب۔ تین بدرجۂ اول۔ نتیجہ ۶۵ فی صد۔

(۳) خوش نویسی۔ نو حاضر۔ پانچ کامیاب۔ ایک بدرجۂ اول۔ نتیجہ ۵۵،۵ فی صد۔

(۴) اُردو دانی۔ ایک سو چونتیس حاضر۔ ایک سو اٹھائیس کامیاب پندرہ بدرجۂ امتیاز نتیجہ چھیانوے فی صد۔ چاروں امتحانات میں شرکاء کی مجموعی تعداد ۲۶۲ تھی جن میں سے (۴۰) عورتیں تھیں۔

انعام خوشی کی بات ہے کہ ادارہ کے کرم فرما اور ہمدرد حضرات نے کامیاب امیدواروں کے لئے انعامات کا سلسلہ قائم کردیا ہے چنانچہ کشتگی کے مرکز سے اُردو عالم، خوش نویسی اور اُردو دانی کے امتحانوں میں اول آنے والے شرکا کو جناب احمد عبداللہ صاحب انسپکٹر آبکاری لنگسگور، جناب محمد حسین صاحب سب انسپکٹر آبکاری مہتمم ساگر اور جناب رستم جی صاحب متاجر نے نیز ادارہ کے مدرسہ تعلیم بالغات سے اول آنے والی امیدوارہ کو جناب سکینہ بیگم صاحبہ نے انعام دینے کے لئے رقمی عطیے روانہ کئے۔ موصوفہ نے اردو فاضل میں اول آنے والی خاتون کو ہر سال " طیبہ بیگم بلگرامی طلائی مڈل " دینے کا بھی وعدہ فرمایا ہے۔ نواب سر عقیل جنگ بہادر نے خود یا عماد الملک ٹرسٹ سے سال بہ سال اردو فاضل کے امتحان میں اول آنے والے امیدوار کو " عماد الملک مڈل " دئے جانے کا وعدہ کیا ہے۔ مختلف مرکزوں سے امتحانات کے سلسلے میں تعلیم کے انتظام کے لئے بھی اصرار کیا جا رہا ہے۔ گو پہلے سال ادارے نے نصابی مضامین کی تعلیم اپنے ذمہ نہ لی تھی۔ تاہم انتظام کرنا پڑا۔ اب اس سے زیادہ تنظیم اور باضابطہ پڑھائی کے لئے مختلف ادارے قائم کرنے کی ضرورت ہوئی چنانچہ یہ کام اور تعلیم بالغان کی نگرانی جناب سید محمد صاحب کے تفویض کی گئی۔

گلبرگہ، کشتگی اور کلیانی کے اطراف واکناف طاعون پھیل جانے کی وجہ سے وہاں کے کامیاب امیدوار سند لینے کے لئے کثیر تعداد میں آج حاضر نہ ہوسکے۔ ان کے نمائندوں کو اسناد دے دی جائیں گی۔ جو ہر مرکز میں ایک جلسہ منعقد کرکے تقسیم کی جائیں گی۔

ادارے کے دوسرے شعبوں کی طرح شعبۂ امتحانات کی کامیابی کا سہرا ادارے کے معتمد اور روح رواں جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور کے سر ہے۔ ادارے کے قیام اور ترقی میں آپ کی جدوجہد قابل قدر ہے۔ جناب موصوف جس طرح اُردو کی خدمت کر رہے ہیں اس پر اہل ملک بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔ شعبۂ امتحانات کے کام میں کمیٹی کے نائب صدر مولوی سجاد مرزا صاحب اور معتمد جناب عبدالقادر صاحب سروری اور دیگر اراکین خصوصاً جناب عبدالمجید صاحب صدیقی جناب سید محمد صاحب اور جناب ظہیر الدین احمد صاحب نے جو قیمتی امداد فرمائی ہے اس کے لئے وہ مستحق شکریہ ہیں۔

رازِ طرب

فریب رنگ ہے، رنگینیٔ نشاطِ خیال
مری نگاہ ہے خود باعثِ فروغِ جمال

مرے ہی قلب حزیں کے لطیف نغمے ہیں
نہیں ہے موج نوائے سروش کا یہ کمال

نشاط و عیش کا کیا راز ہے سمجھتا ہوں
فریب حسن طرب ہے عیاں بہ روئے طلال

محمد مظفر الدین ظفر (عثمانیہ)

مزدور کا گیت

آنکھوں سے خوں بہائے جا ساز نفس پہ گائے جا
آرزوئے کرم نہ کر تو گلۂ ستم نہ کر
خواہش بیش و کم نہ کر شکوۂ رنج و غم نہ کر
آنکھوں سے خوں بہائے جا ساز نفس پہ گائے جا
جھیل لے دکھ مثل خوشی شہد سمجھ کے زہر پی
تو تو برائے نام جی ہے یہی تیری زندگی
آنکھوں سے خوں بہائے جا ساز نفس پہ گائے جا
جب تک اٹھے شہید غم آنکھوں میں کھیلتا ہے دم
لاکھ کرے کوئی ستم حوصلہ ہو تیرا نہ کم
آنکھوں سے خوں بہائے جا ساز نفس پہ گائے جا
بھوک ہو چاہے پیاس ہو لاکھ شکستہ آس ہو
جینے سے چاہے یاس ہو لب پہ مگر سپاس ہو
آنکھوں سے خوں بہائے جا ساز نفس پہ گائے جا

راز قاسمی

شرابی

محفل سے اٹھا جھوم کے لہرا کے شرابی پیمانہ و خم پھینک کے ٹھکرا کے گلابی
ساقی کے تبسم کو بھی اک ناز سے دیکھا مطرب کو نگاہِ غلط انداز سے دیکھا
مدہوش تنک ظرفوں پہ ہنستا ہوا نکلا آتے ہوئے میخواروں میں دھنستا ہوا نکلا
کچھ دور خرابات پہ پھر مڑ کے نظر کی تنقید ہر اک بات پہ عادت ہے بشر کی
کہنے لگا مانا کہ ہوں صہبا کے اثر میں پر اور تجلی ہے میرے قلب و جگر میں
جذبات مقدس ہیں تخیل میں ہے پرواز ادراک منور ہے تصور ہے خدا ساز
رنگینیٔ آفاق ہے نظروں میں مری ہیچ بھاتا نہیں دل کو مرے زلفوں کا خم و پیچ
احساس مری روح میں قدسی منشی کا تقوی نہیں جچتا ہے نگاہوں میں کسی کا
اس وقت جو حاصل ہے مجھے قرب الہی یہ چیز کبھی میں نے عبادت میں نہ پائی

محمد عبدالحی خاں شارق

نشان مہر آصفیہ ۴۰ — رجسٹرڈ ایم ۱۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

کتاب	صفحات	قیمت آنہ	قیمت روپیہ
من کی بیلا	۸۰	۸	
سرگزشت غالب	۲۴	۸	
نظام الملک	۳۸	۴	
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۸	۳
دکن نمبر (۷۸ تصاویر)	۱۲۸		۲
ارمغان جذب	۱۲۰	۱۲	
سوتیلی ماں	۴۸	۴	
سر سید احمد خاں	۱۶	۲	
سرسالار جنگ	۴۸	۶	
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۴	۱
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۴	۱
اقبال نمبر	۱۶۸	۴	۱
سائنس کے کرشمے	۱۱۲		۱
رسائل طبیہ			
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۱۲	۲
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۸	۲
دادا بھائی	۱۶	۲	
اردو نامہ	۲۰۰		۲
ارسطو جاہ	۶۵	۶	
عماد الملک	۴۰	۶	
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۶	۲
" " دوسری کتاب	۵۶	۶	۴
محمد حسین آزاد	۲۰۰		۲
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۴	۱
فن تقریر		۸	
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴		۱
پانی کی کہانی	۴۸	۶	

کتاب	صفحات	قیمت آنہ	قیمت روپیہ
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	۴	
ورڈ سورتھ اور اس کی شاعری	۱۸۴	۸	
ہوش کے ناخن	۹۴		
یوسف ہلدی قید فرنگ میں	۸۹		
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱۲۸	۸	
متاع سخن	۱۲۴	۱۲	
کیف سخن	۱۲۲	۱۲	
بادۂ سخن	۱۲۷	۱۲	
سراج سخن	۱۵۲	۱۲	
ایمان سخن	۱۲۰	۱۲	
فیض سخن	۱۴۴	۱۲	
مرقع سخن جلد اول صفحہ (۴۰۰) ۵۰ تصاویر			
" " دوم " " "			
نقد سخن صفحہ	۱۷۵		
نذر ولی	۶۴۲	۸	
گریہ و تبسم	۱۹۲		
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴		
من کی دنیا	۱۴۵		
مدراس میں اردو	۱۹۶	۸	
محرم نامہ	۱۱۲		
نذر دکن	۱۰۴	۴	
روح غالب	۲۴۰	۸	
عاصمہ	۲۰۰	۴	
دفتری معلومات		۶	
آبدوز کشتیاں اور سرنگ		۶	
اردو مثنوی کا ارتقا		۱۲	

حیدرآباد پرنٹنگ ور

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہد
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی، ایس سی

جلد (۴) بابت اگست ۱۹۴۱ء شمارہ (۸)

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ

یہ خبر علمی حلقوں میں نہایت مسرت سے سنی جائے گی کہ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی طرف سے نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی میں اردو کا پہلا دیوان یعنی کلیات محمد قلی قطب شاہ شایع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔

یہ ایک نہایت ضخیم مجلد اور باتصویر کتاب ہے جو تقریباً ایک ہزار ایک سو[1100] صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو عالیجناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے دس سال کی مسلسل سعی و تلاش اور اعلیٰ تحقیق و ترتیب کے بعد اشاعت کے قابل بنایا ہے۔

اس میں ہر صنف سخن یعنی غزل، قصیدہ، رباعی، مرثیہ، ریختی، مثنوی وغیرہ کے وافر نمونے موجود ہیں جن میں صرف غزلوں کے لئے تین سو اور مختلف نظموں کے لئے سوا تین سو صفحات وقف ہیں دیگر اصنافِ سخن ان کے علاوہ ہیں۔

اردو کے کسی شاعر کا دیوان اس اہتمام اور شان سے نہیں شایع ہوا تھا۔ جو لوگ اردو ادب کی تاریخ اور شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے یہ ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔

اس کی قیمت بجائے پندرہ کے بارہ روپے کردی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کرسکیں۔

کلیاتِ شاہ سراجؔ اورنگ آبادی

اورنگ آباد کے مشہور اردو شاعر اور ولی اورنگ آبادی کے جانشین حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کا مکمل اردو کلام بھی مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی طرف سے منظر عام پر آچکا ہے۔

یہ بھی ایک نہایت ضخیم مجلد اور باتصویر کتاب ہے جو تقریباً آٹھ سو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو عالیجناب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری نے سالہا سال کی محنت اور اعلیٰ تحقیق و ترتیب کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

اس میں خود شاہ سراجؔ کے حالاتِ زندگی اور خصوصیات کلام تقریباً ایک سو تیس[130] صفحات میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد اتنے ہی صفحات میں سراجؔ کی متعدد اردو مثنویاں درج ہیں۔ غزلیں چار سو صفحات میں ہیں اور ان کے علاوہ مختلف اصناف سخن بھی شامل ہیں۔ آخر میں ایک سو صفحات فارسی نظم و نثر کے لئے وقف ہیں۔ اس حصہ میں شاہ سراجؔ کے خطوط خاص تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ قیمت سات روپے آٹھ آنے۔

دونوں کتابیں صرف سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہیں

ہندی نوجوان کی فریاد

خدا کے حضور میں

جانے کس بات کا ہیجان ہے میرے دل میں
ایک بے نام سا طوفان ہے میرے دل میں

سوچتا ہوں تو دھندلکے سے نظر آتے ہیں
گہرے بادل مرے احساس پہ چھا جاتے ہیں

دوپہر پر بھی مجھے ظلمتِ شب کا ہے گماں
ہر طرف بکھرے ہیں بہتے ہوئے لمحوں کے نشاں

میری نظروں میں تو ویران ہے عالم سارا
ضبط کا پردۂ نمناک ہے پارا پارا

جی میں آتی ہے کہ نوحہ کروں، فریاد کروں
قفسِ روح سے اک چیخ کو آزاد کروں

سر اٹھاؤں تو لرز جائے دو عالم کی اساس
قلبِ گیتی پہ مری آہ سے پڑ جائے خراش

آندھیاں آئیں، زمیں ایک ہیولیٰ بن جائے
زلزلے آئیں، یہ دنیا تری جھولا بن جائے

تند طوفاں سے چھلک جائیں سمندر تیرے
چیختا جاگ دو عالم کو لپک کر گھیرے

اس قیامت میں مرے پاؤں میں زنجیر نہ ہو
میں جدھر جاؤں، جلو میں مرے تقدیر نہ ہو

لوگ چیخیں تو میں ہنستا ہوا گاتا جاؤں
وسعتِ دہر میں طوفان اٹھاتا جاؤں

پھر کوئی لہر اٹھے اور بہا لے جائے
ایک ویران جزیرے پہ مجھے پھینک آئے

خلوتِ شب میں جب افلاک پہ تارے چمکیں
اس جزیرے پہ وہ بیتے ہوئے دن آ دھمکیں

گہری سوچوں میں تصور مرا مدہوش رہے
اس قدر سوچوں کہ خود دل مرا خاموش رہے

اور کسی رات کو جب مست ہو دنیا ساری
روح اجڑی ہوئی، اڑ جائے کہیں بیچاری

اپنی اس ہرزہ سرائی پہ بہت دنگ ہوں میں
لیکن اللہ! — ترے دہر سے دل تنگ ہوں میں

احمد ندیم قاسمی

حالاتِ حاضرہ

ترکی اور اس کا موقف

جب اطالیہ نے یونان پر حملہ کیا تو دنیا یہ سمجھنے لگی کہ اب جنگ ترکی کی سرحد تک آ پہنچی۔ اور مولوٹوف برلن گئے تو انقرہ میں بھی کچھ ہل چل سی نظر آنے لگی۔ لیکن یونان کی لڑائی میں جب اطالوی پیچھے ہٹتے گئے تو بظاہر ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب ترکی کو خطرہ نہیں رہا مگر اس سرزمین کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ دنیا کی نظریں اس کے خارجی مسلک پر لگی ہوئی تھیں کہ یہ ملک آخر کب تک اپنی غیر جانبداری کو سلامتی کے ساتھ قایم رکھ سکے گا۔ یہ ایک عجیب بات ہے اور اسے ترکی کی غیر معمولی اور کامیاب سیاست سمجھنا چاہیئے کہ ۱۹۴۱ء کی پہلی ششماہی تک وہ برابر غیر جانب دار رہا۔ اپنے جغرافی موقف کے لحاظ سے ترکی کو مشرقی بحرِ روم میں مرکزی اہمیت حاصل ہے چنانچہ اسی موقف کا اثر تھا کہ محوری فوجوں کیلئے مشرق قریب کا راستہ عرصۂ دراز سے بند ہے۔ دنیا کی اہم ترین آبنائے یعنی درۂ دانیال ترکی کے قبضہ میں ہے اور یہ ترکی قوم کی شہ رگ ہے جس کی حفاظت کو ترک اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں۔ جدید اسلحہ سے لیس طاقتور فوجیں ترکی کی سرحدوں کی حفاظت کرتی ہیں اور ترکی کا ہوائیہ اپنے ملک کو ہر بیرونی طاقت سے بچانے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ پوری دنیائے اسلام ترکی کو اپنا رہنما سمجھتی ہے۔ اور ترکی جس طرف بھی قدم اٹھائے، اس کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہے۔ کچھ اسی غیر معمولی موقف کا اثر تھا کہ اتحادی اور محوری دونوں طاقتیں ترکی کو ہموار کرنے کی ایک عرصے سے کوشش کرتی رہیں۔ چنانچہ ایک طرف برطانیہ اور فرانس نے جمہوریہ ترکیہ کے ساتھ بہت پہلے سے رشتۂ اتحاد قایم کر لیا تھا تو دوسری طرف محوری حکومتیں بھی ترکوں کو فراہم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی تھیں۔ ایک طرف مسٹر ایڈن بلقان کا دورہ کر کے ترکی کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کر رہے تھے تو دوسری طرف جرمنی کے ہوشیار سفیر فان پاپن انقرہ میں رہ کر ایک عرصے سے اس بات کی کوشش میں تھے کہ ترکی کو کسی طرح جرمن معاشی نظام کے دائرے میں داخل کر لیں۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود ترکی کی نظریں روس پر لگی ہوئی تھیں اور وہ روس کو ناخوش کر کے کسی ایک فریق کے ساتھ رشتۂ اتحاد قایم نہیں کر سکتا تھا اور ظاہر ہے کہ روس، جرمنی اور برطانیہ تین طاقتور حکومتوں کے ساتھ بیک وقت خوش گوار تعلقات قایم رکھنا ترکی کے لئے آسان نہیں تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ پچھلے دنوں ترکی کو دنیا کی موجودہ سیاست میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی اور دنیا یہ دیکھ رہی تھی کہ ترکی سیاست کا پلڑا کس طرف جھک جائے گا۔ بالآخر ایک طویل غیر جانب داری کے بعد ترکی نے اپنے خارجی مسلک کو واضح کر دیا اور ۱۸ جون ۱۹۴۱ء کو "ترک جرمن" دوستی کا اعلان ہو گیا۔

ترکی قومیت

موجودہ ترکی زندگی اور ترکی سیاست کو سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ پچھلی جنگ عظیم کے بعد سے ترکی کی کیا حالت رہی اور اس کی قومی زندگی میں کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ اس سرزمین میں قدرت نے اتاترک جیسا مرد مومن پیدا کیا تھا جس نے یورپ کے "مرد بیمار" کو ایک نئی زندگی بخشی اور اس کو آن کی آن میں دنیا کے تندرست مرد میدان کے مقابلے میں لا کر کھڑا کر دیا۔ اتاترک کا بنیادی خیال یہ تھا کہ ترکی صرف ترکوں کے لئے ہے۔ اتاترک نے ترکوں میں

احساس قومیت کا بیج بویا اور اس کی ایسے اہتمام سے آبیاری کی کہ یہ رفتہ رفتہ ایک شاداب پودا بن گیا۔ اتاترک نے ترکی سماج کی کشتی کو ایک نئے ڈگر پر ڈال دیا اور انھوں نے سب سے بڑی کوشش اس بات کی کی کہ ترکی کو بیرونی اثرات سے پوری طرح آزاد کردیں۔ چنانچہ یونانی، بلغاری اور سلاوی جو صدیوں سے ترکی کی تجارت پر قابض تھے، بے دخل کئے گئے اور ملک کے معاشی نظام کو استوار بنیادوں پر قایم کیا گیا۔ تعلیم، زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کو ترقی دی گئی اور آزاد ترکی جمہوریت کو ایک منظم اور باضابطہ نظام کے تحت قایم کیا گیا۔ غرض اتاترک نے ترکی کو ایک نیا قالب اور ایک نئی روح عطا کی اور اس کا اثر یہ ہے کہ ترکی نے آج وہ مقام حاصل کرلیا جہاں پہنچنے کی ہر بیمار اور دست و پاشکستہ قوم کو آرزو ہو سکتی ہے۔

ترکی سیاست

ترکی کا دستور عمومی ہے اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء سے جب کہ بڑی قومی اسمبلی نے اپنا مشہور اعلان شایع کیا، ترکی میں جمہوریت قایم ہوگئی۔ ترکی جمہوریت کے پہلے صدر مصطفیٰ کمال منتخب ہوئے اور بڑی قومی اسمبلی جو ایک ایوانی مقننہ ہے، جمہوری انداز پر کام کرنے لگی۔ لیکن اس عمومی دستور اور بڑی قومی اسمبلی کے ساتھ ساتھ اتاترک کی آمرانہ رہنمائی بھی ترکی کو میسر آئی جو ترکوں کو عمومیت کی بے راہ روی سے بچاتی رہی۔ اس عمومی طرز حکومت اور اتاترک کی باکمال قیادت کے خوش گوار امتزاج سے ترکی کو بڑا فائدہ پہنچا چنانچہ اسی کا اثر ہے کہ آج ترکی اپنی کامیاب سیاست کی بدولت اپنی ناؤ کو طوفانوں اور ناگہانی حادثات سے بچاتا ہوا سلامتی کے ساتھ لئے جا رہا ہے۔

ترکی کا خارجی مسلک

ترکی کی اس انوکھی سیاست کو جس میں جمہوری شان اور صحیح قیادت کے عناصر شامل ہیں، اس کے خارجی مسلک کے مطالعہ میں پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ نیز یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ترکی کے تجارتی تعلقات بہت سے غیر ملکوں کے ساتھ قایم ہیں مثلاً جرمنی، اطالیہ، انگلستان، فرانس، ممالک متحدہ، شام اور روس سے ترکی کو تجارت کرنی پڑتی ہے اور ظاہر ہے کہ ملک کی معاشی حالت کو اچھی بنیادوں پر استوار رکھنے کے لئے اسے ان تمام ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قایم رکھنا ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی نے ہمیشہ ان تمام ملکوں سے دوستی قایم رکھی اور خصوصاً اپنے طاقتور پڑوسی یعنی روس کو بہت ہموار رکھنے کی کوشش کی۔ ترکی کا یہ مسلک عصمت انونو کے موجودہ دور میں بھی قایم رہا اور اس یورپی جنگ کے نازک زمانے میں بھی ترکی نے ایک عرصے تک دونوں فریقین جنگ کو برابر اپنا دوست بنائے رکھا جسے ترکی کی غیر معمولی کامیابی سمجھنا چاہیے لیکن سب کو ملا کر رکھنے کا یہ مسلک آخر کب تک نبھ سکتا تھا۔ ترکی کو بالآخر ایک قطعی فیصلہ کرنا پڑا کہ اسے کس فریق کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اب رہا یہ سوال کہ ترکی نے جرمنی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیوں کیا اور وہ کیا عوامل تھے جن کی وجہ سے ترکی کو اس نئی راہ کے اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا، اپنے اندر غور و فکر کا کافی سرمایہ رکھتا ہے۔

ترکی اور جرمنی کا معاہدہ

جب بلغاریہ نازی استبداد کا شکار ہوا تو ترکی کی یورپی سرحدوں تک محوری طاقت پھیل گئی۔ پھر یونان پر جرمن

افواج نے قبضہ جمالیا تو انقرہ میں نازیی خطرے کا احساس ناگزیر ہوگیا۔ اس کے علاوہ جرمنی کی مزید کامیابیوں سے ترکی کا موقف بہت نازک ہوگیا۔ سامو تھریس اور لمناس پر جو درۂ دانیال کے قریب بہت اہم مرکز ہیں، جرمنی کا قبضہ ہوگیا جس سے درۂ دانیال خطرے میں نظر آنے لگا۔ نیز پورے ایجین جزائر پر جن میں کریٹ اور رہوڈس بھی شامل ہیں، جرمن فوجیں چھاگئیں تو مغربی اناطولیہ کی طرف سے ہوائی حملے کے امکانات پیدا ہوگئے۔ اس رفتار حوادث کے ساتھ بڑی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ بلقان کے تمام ساتھی ایک ایک کرکے نازیوں کے ہتھے چڑھ گئے اور ترکی تنہا میدان میں رہ گیا۔ ان حالات میں ترکی کے لئے یہ ناگزیر تھا کہ برلن کی دوستی کا سہارا ڈھونڈھے کیونکہ حالات کے لحاظ سے اتحادیوں کا ساتھ دینے میں ترکی کو سوائے نقصان کے اور کسی چیز کی توقع نہیں ہوسکتی تھی۔ مگر یہ عجیب و غریب بات ہے کہ برلن کے ساتھ ایک نیا معاہدہ طے کرنے کے باوجود ترکوں نے انگریزوں کی دوستی سے بھی منہ نہیں موڑا۔

سنہ ۱۹۳۹ء سے جب کہ فان پاپن ترکی کے سفیر مقرر ہوئے، جرمنوں کی یہ کوشش رہی کہ ترکی کو برطانیہ کا مخالف بنادے۔ لیکن لندن کی خبروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کو اس کوشش میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ترکی اور جرمنی کے اس معاہدے کی رو سے اتنا ضرور ہوا کہ ترکی انگریزی معاہدے پر کوئی اثر نہیں پڑا اور نہ اس سے ترکی کے اس پیمان پر کسی قسم کا اثر پڑسکا جو اس نے روس کے ساتھ پہلے سے طے کرلیا تھا کہ اس کے خلاف کسی جنگ میں ترکی شریک نہ ہوسکے گا۔ اس معاہدے کی رو سے ترکی اور جرمنی نے ایک دوسرے کی قومی سرحدوں کا تعین اور اس کا احترام کرنے کی پابندی اپنے پر عائد کرلی ہے اور ایسے مسائل میں جو دونوں کے لئے مشترک دلچسپی رکھتے ہوں ترکی اور جرمنی نے آپس میں مشورہ کرنے کا تصفیہ کیا ہے۔ اور اس معاہدے کی مدت دس سال بتائی گئی ہے۔ اگرچہ یہ معاہدہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت اہم اور بڑے دور رس نتائج کا حامل ہے لیکن چونکہ ترکی نے روس اور برطانیہ سے بگاڑ نہیں لیا اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے برطانیہ کا کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ اب یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ آیندہ ترکی کا رویہ کیا رہے گا اور وہ نازیوں کے ساتھ ملکر اتحادیوں کے خلاف میدان میں کھڑا ہوجائے گا یا اپنی موجودہ حالت کو برقرار رکھے گا۔ اگر ترکی کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ترکی کے دشمن کے خلاف ساری اسلامی دنیا متحدہ طور پر کھڑی ہوجائے گی۔ لیکن موجودہ حالات میں کسی ایک معین نتیجہ پر پہنچنا بہت مشکل ہے، ترکی اور اس کے ساتھ دنیائے اسلام کے آیندہ مسلک کے مطالعہ کے لئے آیندہ رفتار واقعات کو دیکھنا چاہیئے

حفیظ صدیقی

زلفِ چلیپا

آفریں ہے تجھ پہ اے سرمایہ داری کے نظام
اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا اتنا اہتمام

آندھیاں شعلہ بداماں خون کی برسات میں
اب تو بوئے آتش و باروت ہے ہر بات میں

موت محوِ شادمانی، غرقِ ماتم ہے حیات
لٹ رہی ہے ساری خلقت، جل رہی ہے کائنات

جس زمیں سے، ارتقا کے انبیا پیدا ہوئے
جس زمیں سے علم و حکمت کے خدا پیدا ہوئے

رام و لچھمن کی زمیں کرشن کی گوتم کی زمیں
وہ محمدؐ کی زمیں وہ ابنِ مریم کی زمیں

اس زمیں کے ہر نشیلے بام و در میں موت ہے
اس کے دل میں موت ہے اسکی نظر میں موت ہے

مندروں میں، معبدوں میں، اور کلیساؤں میں موت
خلوتوں میں موت ہے، شاہی شبستانوں میں موت

زرگری کا رقص ہے، سود و زیاں کا رقص ہے
ہر گلی کوچے میں مرگِ ناگہاں کا رقص ہے

اب کسی سینے میں روحِ شادماں گاتی نہیں
زندگی کی اب کہیں ہلچل نظر آتی نہیں

برہمی زلفِ چلیپا میں کبھی دیکھی نہ تھی
برہمی دیکھی تھی ایسی برہمی دیکھی نہ تھی

پی اور اپنے ہاتھ سے پی لے کے سرمایہ کا نام
موت کا لبریز ساغر عصرِ حاضر کے غلام

مخدوم

سوز و ساز

غزل :-

وہ نظر اٹھی، جھجک کر رہ گئی
پھانس سی دل میں کھٹک کر رہ گئی

میری جانب بڑھتے بڑھتے رک گئے
پھول کی ڈالی لچک کر رہ گئی

مسکرا کر اس نے پوچھا حالِ دل
بوند آنسو کی ڈھلک کر رہ گئی

کون دیتا ساتھ غم کی رات کا
شمع بھی آخر بھڑک کر رہ گئی

زندگی پر بار تھا احساسِ مرگ
زندگی دامن جھٹک کر رہ گئی

کتنی کیف آور تھی ساغر کی کھنک
آنکھ ساقی کی جھپک کر رہ گئی

حسن کی راہوں کے پیچ و خم نہ پوچھ!
خود محبت بھی بھٹک کر رہ گئی

کیا کہوں ماہر فسانہ دید کا
ایک بجلی سی چمک کر رہ گئی

قطعات :-

پھولوں کی ہنسی، ہنسی نہیں ہے
یہ موت ہے زندگی نہیں ہے
یہ رات! یہ غم کی رات، توبہ!
تاروں میں بھی روشنی نہیں ہے

ساغر میں شراب انڈیلتا ہوں
میں آگ سے روز کھیلتا ہوں
سچ یہ ہے کہ درد و غم کو ماہر
اک فرض سمجھ کے جھیلتا ہوں

لالہ کا جگر کہاں سے لاؤں
نرگس کی نظر کہاں سے لاؤں
شاید کہ درِ قبول ہے بند
آہوں میں اثر کہاں سے لاؤں
بستر سے اٹھے وہ آنکھ ملتے!
ماہر وہ سحر کہاں سے لاؤں

ماہر القادری

عنہ تلمیح

یہ مدراس ہے

زگ، زگ، زگا، زگ چھک، چھک، چھکا چھک کی آواز پر میری آنکھ کھل گئی اور خلافِ عادت میں نے اپنے آپ کو بارہ فٹ بلند کمرے میں مسہری پر پڑا ہوا پایا۔ مجھے یاد آگیا کہ میں حیدرآباد میں نہیں بلکہ مدراس میں ہوں اور یہ الیورسٹ ہوٹل کا ایک کمرہ ہے۔ کمرے سے بالکل متصل سفید برقی ٹرین صبا رفتاری سے جارہی تھی اور اسی نے مجھے ساڑھے چار بجے جگا دیا۔ "اونہہ" لاحول ولا" میری زبان سے نکلا اور میں نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کریں۔ پانچ منٹ بھی نہ گذرے ہوں گے کہ "گھر گھر گھر رد گھر گھر گھر رر" کی آواز پر پھر آنکھیں کھول دینی پڑیں۔ میں نے نیند کا خیال چھوڑ دیا اور ہوٹل کے ورانڈے میں آکھڑا ہوا تاکہ اس نئے شہر کی معمولی زندگی کا مطالعہ کروں جہاں انسان دن نکلنے سے بھی دو گھنٹے پیشتر اپنی دوزخ کی آگ فراہم کرنے میں لگ جاتا ہے۔

ہوٹل کے سامنے تارکول کی کالی سڑک بل کھاتی اینڈتی اکڑتی دور تک چلی گئی ہے اس کالی سڑک کے بیچوں بیچ برقی ستون اور ان کے دائیں بائیں ٹرام کی پٹڑیوں کے گڑھے ہیں بالکل ایسے جیسے کوئی اژدہام ریت پر سے ہوکر نکل گیا ہو۔ دور کیوں جائیے، ہمارے ہندوستانی فاقہ زدوں کی پیٹھ کی طویل گہری لکیر ان سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔

جرمن ڈیزائن زر ورنگ کی عمارت، چوتھی منزل کا ورانڈہ، مدراس کا منظر اور میں، مفلس و قلاش بے آب و گیاہ میدان میں مسافر کی طرح، جھونپڑی میں رہ کر محلوں کے خواب کی تعبیر پوری ہو رہی تھی۔

تو میں "ایورسٹ" کے ورانڈے میں کھڑا ہوا نیچے کالی سڑک پر دیکھ رہا تھا۔ دور ٹرام جارہی تھی اور سامنے واگنوں یا لمبی گاڑیوں کا ایک مربوط سلسلہ دو دو صبا کے صندوقوں سے لدا ہوا جارہا تھا گویا یہ گھاس یا کڑبی کی غلطاں گریاں ہی نہیں۔ غلطاں اس لئے کہ ابتدا، میں مجھے وہ قوت نظر آئی جو گاڑیوں کو کھینچ یا چلا رہی تھی اس لئے میں یہ سمجھا کہ ٹرام کی پٹڑیوں پر یہ سال کی واگنیں لیجا رہی ہیں۔ نیند کا خمار بھی عجیب ہوتا ہے۔ نہ ٹھیک سوجھے نہ سمجھ میں آئے اور نہ آنکھیں ہی قابلِ اعتبار خدمت انجام دیں۔ واگنوں کی سست اور ہنگامہ رفتار نے مجھے جلد سمجھا دیا کہ یہ بنڈیاں تو ہیں لیکن اس میں بجائے حیوانِ مطلق کے حیوانِ ناطق جوتا گیا ہے۔ دو آدمی آگے اور دو پیچھے۔ یہ مجھے پہلے نظر نہ آئے شاید اس لئے کہ میں ان کے اور تارکول کے رنگ میں تمیز نہ کرسکا۔ کوئی تمیز کر ہی نہیں سکتا۔ چار چھ انچ چوڑے اور چار سے پانچ فٹ لانبے، سڑک کا اور ان کا رنگ ایک، خطرے کی جھنڈی دو انچ کی لنگوٹی تاگے کا سہارا لئے کہیں چھپی ہوئی، چالیس پچاس فٹ کی بلندی سے دھندلکے میں کوئی کیا خاک تمیز کرے۔ میں نے چاہا کہ انھیں قریب سے دیکھوں اس لئے تین منزلیں طے کرکے نیچے اترا۔ میرے پیر میں چپل تھی اور اس کی "چپک چپک" نے ہوٹل کے دروازے پر سونے والے رکشا والوں کو بیدار کردیا۔ وہ فوراً اپنی ننگی پیٹھ جھاڑتے ہوئے اٹھ گئے اور رکشا کے دونوں ڈنڈے سنبھال کر "ایجمان، ایجمان" کہتے ہوئے رکو رح میں آ گئے میں ان حرکتوں کو دیکھ کر بوکھلا سا گیا اور بنڈیوں اور رکشاؤں کا صرف تصور ذہن میں لئے تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنے کمرے پر آکر دم لیا۔ یہ بھی کوئی انسانوں کی بستی ہے جہاں انسان جانوروں کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

کیا یہ بھی اسی خدا کی مخلوق ہے جس نے رکشا میں بیٹھنے والوں کو پیدا کیا۔ یا ان گاڑیاں کھینچ لے جانے والوں اور رکشا کشوں سے خدائے قدوس کو کوئی تعلق نہیں۔ ممکن ہے کوئی تعلق نہ بھی ہو، کیونکہ ان غریبوں میں قدسیت کا فقدان ہی فقدان ہے لیکن ان کی روزی کتنی قدسیت کی حامل ہے کیا ان پر کوئی حرف رکھ سکتا ہے۔ انہیں دنیا میں صرف ایک ہی بات معلوم ہے اور وہ یہ کہ تارکول کی ٹھنڈی یا تپتی ہوئی سڑک پر بوجھ کھینچنا خواہ کسی بڑی توند کا ہو یا اس کے سامان کا جفاکش بے چارے۔

اس ادھیڑبن میں میں کرسی پر لیٹ گیا۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اور شوروغل میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کوے ادھر ادھر کائیں کائیں کرتے ہوئے اڑ رہے تھے اور بے باکانہ کمرے میں بھی در آ رہے تھے۔ تارکول کی طرح کالے، بدوضع، بدشکل، ژولیدہ پروں والے جیسے کسی نے مسل کر چھوڑ دیا ہو یا چڑیمار کے پاس زیادہ دن تک قید میں رہنے کے بعد رہائی پائے ہوں۔ مدراسیوں کے نزدیک کوے کی اتنی ہی وقعت ہے جتنی کہ ہندوؤں میں گائے کی۔ یہ نکتہ مجھے کیسے معلوم ہوا اس کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ کمرہ میں توشہ دان کھلا پڑا ہوا تھا۔ ایک کوا آیا اور اس میں منہ ڈال کر روٹی وغیرہ کے ٹکڑے کھانے لگا میں نے "ہشت" ہائیں "ہشت" اور سب کچھ کہا لیکن وہ یوں بھی ڈھیٹ ہوتا ہے اڑا نہیں میں نے پیر سے چپل نکالی اور مارنے ہی کو تھا کہ فراش جو کمرہ جھاڑنے میں محو تھا، مجھے غصہ کی نظر سے دیکھنے اور کچھ "ترکی" بکنے لگا اور اس تفصیل میں یہ عقدہ کھل گیا کہ گاؤ ماتا کی طرح مدراس میں کوا بھی مقدس مانا جاتا ہے۔

صبح ہو چکی تھی۔ ہم ناشتے سے فارغ ہو کر دن بھر گھوما کئے اور سرِ مغرب ساحل سمندر دیکھنے کی غرض سے ٹریپلی کین بس اسٹانڈ پر اتر پڑے اور ساحل کی طرف چلے۔ دس ہی قدم گئے تھے کہ سیدھی جانب ایک چھوٹے سے دروازے پر ایک تختی آویزاں نظر آئی۔ اس پر "بکنگھم لاج" لکھا تھا۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔ یہ ایک مختصر سی سو ڈیڑھ سو فٹ لانبی اور بیس پچیس فٹ چوڑی عمارت ہے۔ اس کا رُخ سمندر کی طرف ہے اور سمندر اور عمارت کے درمیان وہ نالہ ہے جو سارے مدراس کی غلاظت لئے عفونت پھیلاتا ہوا بہتا ہے۔ شاید اس تختی پر گورنر مدراس کی نظر نہیں پڑی۔ خیر ہم نام رکھنے والے کی داد دیتے ہوئے ساحل پر پہنچ گئے۔ یہ حصہ بیچ کے نام سے مشہور ہے اور شام کے وقت یہاں خاصی چہل پہل رہتی ہے۔ بلدیہ کا ریڈیو کبھی تامل اور کبھی ملیالم میں بولتا رہتا ہے ریت کا سارا میدان سفید نظر آتا ہے لوگ سفید دھوتی اور سفید کرتے پہنے جوتی اور ٹوپی سے بے نیاز ریت پر دھونی رمائے بیٹھے رہتے ہیں۔ ٹوپی کی تو شاید اس لئے بھی ضرورت نہیں کہ بالوں کا جوڑا ہی سر ڈھانکنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے مگر معلوم نہیں کہ جوتے سے بے نیازی کس راز کی حامل ہے۔

موجوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی ان کا ساحل سے ٹکرانا اور پانی کا بکھر کر قطروں میں منتشر ہونا اور پھر بلندی سے سمندر میں گر جانا۔ مدراس میں ہمیں یہی ایک حسن نظر آیا۔ باقی کسی اور شئے میں دلکشی نہ تھی، اور پانی کی دلکشی تو ہر جگہ موہ لیتی ہے۔ انسانوں میں کرشن کے رنگ روپ کے تو سب ہی نظر آئے لیکن گوپیوں کے رنگ روپ والوں کا پتہ نہ تھا۔ شاید اس لئے کہ خدا جب ہمالیہ پر بیٹھے ہوئے دنیا کے تمام ملکوں کو حسن تقسیم کر رہا تھا اس وقت سطح مرتفع دکن، مدراس کے آڑے آ گئی تھی۔

اکبر صدیقی

اردو مرثیے

یہ عجیب اتفاق ہے کہ عربی کی طرح اردو میں بھی شعر غالباً مرثیہ سے شروع ہوا ہے۔ اگرچہ یہ مسئلہ ابھی تک طے نہیں ہوا کہ زبان اردو کی ابتداء کہاں ہوئی دکن پنجاب ممالک متحدہ اور کسی حد تک بہار بھی اس نزاع میں شامل ہیں اور اپنے اپنے دعوے پیش کر رہے ہیں۔ باں ہم یہ متعین نہ کیا جا سکا کہ اس زبان نے زندگی کی پہلی سانس کہاں لی۔ بظاہر جہاں تک غور و تحقیق کا تعلق ہے دکن ہی کا دعویٰ قرین قیاس اور دل لگتی بات معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال اگر دکن کو اردو کا خلاقِ اول مان لیا جائے تو پھر اس میں بہت کم شبہ رہتا ہے کہ اردو کی شاعری مرثیہ سے شروع ہوئی۔

قدیم دکنی زبان میں پہلے پہل مرثیے یا نعت و منقبت ہی نظم کہی جاتی تھی۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ اس زبان میں شاعری کو صرف انہی اصناف کی حد تک دخل تھا۔

مرثیہ بھی اصل میں مدح کی ایک صورت ہے۔ قصیدہ اور مرثیہ میں فرق یہ ہے کہ قصیدہ زندگی میں اور مرثیہ مرنے کے بعد لکھا جاتا ہے۔ عربی میں مرثیے بالعموم کسی عزیز کی موت پر بربنائے محبت نظم کئے جاتے تھے۔ اور ان میں وہی فطری سادگی اور سوز و اثر ہوتا تھا جو عرب قدیم کی شاعری کا امتیاز ہے۔ ہماری زبان میں اس نوع کے مرثیے بہت کم لکھے گئے ہیں اور جو لکھے گئے ہیں ان میں بہت کم قابلِ ذکر ہیں۔ مرزا غالب نے عارف کی موت پر جو مرثیہ لکھا ہے میرے نزدیک اردو میں اس سے بہتر مختصر اور دردانگیز مرثیہ شاید اب تک نہیں لکھا گیا۔ چند شعر سنئے۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا ہے کہ "مرثیہ کا اطلاق ہمارے ہاں زیادہ تر شہدائے کربلاؓ اور خاص کر جناب سید الشہداءؓ کے مرثیے پر ہوتا ہے۔ یہاں مرثیہ کی ابتداء اول اسی اصول پر ہوئی تھی جو کہ قدرت نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر تعلیم کیا ہے۔ یعنی میت کو یاد کر کے حزن و غم کا اظہار کرنا اور اپنے بیان سے دوسروں کو محزون و مغموم کرنا۔"

مولانا کا یہ بیان اردو مرثیوں کے بارے میں حرف بحرف صحیح ہے۔ ہماری زبان میں مرثیہ گوئی ایک مستقل فن کی حیثیت میں اختیار کی گئی۔ اور شعراء کا ایک خاص طبقہ واقعات کربلا کو طرح طرح سے نظم کرتا رہا۔ آخر آخر میں میر انیس اور مرزا دبیر نے مرثیہ کی لے کو اس قدر بڑھا دیا کہ عہد قدیم کی مرثیہ گوئی بالکل آڑ میں آگئی۔ ورنہ ان حضرات سے بہت قبل بلکہ اس وقت جب اردو کو ایک مستقل زبان کی حیثیت بھی حاصل نہ تھی۔ مرثیہ گو شعراء موجود تھے۔ جن کی شاعری صرف مرثیہ تک محدود تھی۔

چنانچہ نواب نصیر حسین خاں خیال نے اپنے ایک خطبے میں ابتدائی عہد کے بعض مرثیہ گویوں کا ذکر کیا ہے اور ان میں سے ہاشم و کاظم وغیرہ کے مرثیوں کے بعض شعر بھی نقل کئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان حضرات کے مراثی ایڈنبرا یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔

ان کے بعد میر و سودا کے زمانے میں میاں مسکین اور ان کے معاصرین سعداللہ سکندر شاگرد شاکر ناجی اور گدا وغیرہ موجود تھے۔ فضلی میرامانی اور محمد علی تپش بھی اسی صنف کے شاعر تھے۔

لیکن اس عہد کے تمام مرثیہ گو شعرا سیدھے سادے انداز میں کربلا کے مصائب کا ذکر کرتے تھے۔ جس سے رونے رلانے کا فرض ادا ہو جاتا تھا۔ اس کے سوا، مرثیہ میں کوئی قابلِ ذکر خوبی نہ تھی۔ اسی لئے شعراء میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں۔ سودا اور ان کے بعض معاصرین نے اس میں کچھ جدتیں کیں لیکن وہ بھی بین کے مقام سے آگے نہ بڑھ سکے۔ زمانہ اسی حال پر چلتا رہا۔ یہاں تک کہ میر ضمیر اور میر خلیق شاعری کی اس بساط پر نمودار ہوئے۔ اور وہ وقت آیا کہ اس عہد کی شاعری میں مرثیہ کا پلہ ہر صنفِ سخن سے گراں ہو گیا۔ اس وقت تک شاعری غزل گوئی یا قصیدہ نگاری کا نام تھا۔ غزل اہلِ زبان کی بول چال اور محاورے تک محدود تھی اور قصائد میں دور از کار باتوں کا ایک انبار ہوتا تھا۔ بلکہ وہی قصیدہ زیادہ کامیاب سمجھا جاتا تھا جس میں خلافِ قیاس امور حد سے زیادہ مبالغہ اور صنعت کے ساتھ بیان کئے جائیں۔ مثنوی کا بھی یہی حال تھا۔ اول تو مثنویاں صرف عشقیہ ہوتی تھیں دوسرے ان میں بھی زیادہ تر جنات اور دیو پری کے قصے نظم کئے جاتے تھے اور اصول نظم بھی تکلف اور آورد سے خالی نہ تھا! یہ حقیقت میں ان مرثیہ گویوں کا احسان ہے کہ انھوں نے مرثیے میں ایک ایسا انداز اختیار کیا جس سے اردو میں نظم کی نئی نئی راہیں کھلیں اور حیات انسانی کے تمام داخلی اور خارجی مقامات کے اظہار کا سلیقہ حاصل ہو گیا۔

شعرائے اردو کے تقریباً تمام تذکرہ نویس اس پر متفق ہیں کہ میر ضمیر پہلے شخص ہیں جنھوں نے مرثیہ کے معمولی انداز کو اتنا بلند کیا اور رزم و بزم اور واقعہ نگاری کو مرثیے میں داخل کیا۔ مولوی شبلی صاحب کا خیال ہے کہ اگر ان کے مرثیوں کا انتخاب کیا جائے تو میر انیس کا کلام معلوم ہوگا۔ آپ بھی چند شعر سن لیجئے۔

جا کے میدان میں کس طرح یہ محبوب لڑے
یہ تو کہئے کہ غلام آپ کے کچھ خوب لڑے
چیر کر فوج کو اس پار سے اس پار گئے
میں نے خود دیکھا کہ دریا پہ کئی بار گئے

گھوڑے کی تعریف میں ان کے مرثیے کا ایک بند ہے۔

گھوڑا وہ تیز رو ہے کہ ناگاہ ایک بار
اتنا کہا تھا وہم نے ہاں چل تو راہ وار
دونوں نے ہم عنانی و سرعت کی اختیار
آخر کہاں وہ اور کہاں وہم ہرزہ کار
کچھ کچھ تو ساتھ ساتھ وہ مقاصد بھر گیا
پھر یہ خبر نہیں کہ کہاں تھا کدھر گیا

غرض مرثیے میں مختلف مضامین بندش کی صفائی اور چستی پہلے پہل میر ضمیر نے متعارف کی۔ اور مسدس میں اظہار خیال مرثیہ کے لئے مخصوص کر دیا۔ اسی زمانہ میں میر خلیق جو میر انیس کے والد ہیں۔ اس فن کی اصلاح اور تعمیر میں لگے ہوئے تھے اور اگر وہ مرثیے جو ان کے نام سے شائع ہوئے ہیں انھیں کے نتائج فکر تسلیم کر لئے جائیں تو بقول مولنا شبلی بیٹے کو باپ پر ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ دو ایک بند سنئے۔

مرتا ہے باپ اے علی اکبر ابھی نہ جا
دل مانتا نہیں مرے دلبر ابھی نہ جا
اے لعل سوئے نیزہ و خنجر ابھی نہ جا
ہے ہے نہ جا شبیہ پیمبر ابھی نہ جا
مضطر ہوں چین آنے پہ آتا نہیں مجھے
رونے میں منہ ترا نظر آتا نہیں مجھے

اصل یہ ہے کہ اس فن کے امام اول و آخر میر انیس ہیں۔ مولوی حالی صاحب فرماتے ہیں۔

"اگرچہ سوسائٹی کے دباؤ اور کم عیار حریفوں کے مقابلے نے میر انیس کو ہر جگہ جادۂ استقامت پر قائم نہیں رہنے دیا بلکہ اس دھن تپنے کی طرح جیسے مجلس کے بے مغزوں کو رجھانے کے لئے کبھی کبھی بارہ ماسہ اور چوبولے بھی الاپنے پڑتے ہیں، اکثر مبالغہ اور اغراق کی آندھیوں کے طوفان اٹھانے پڑے۔ لیکن اس قسم کی بے اعتدالیاں ان فوائد کے مقابلہ میں جو ان کی شاعری سے اردو زبان کو پہنچے نہایت بے حقیقت اور کم وزن ہیں"

میر انیس کی شاعری پر اگر کوئی اعتراض ہوسکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ انھوں نے بعض جگہ محض الفاظ کا طلسم باندھا ہے لیکن جیسا کہ مولانا نے فرمایا ان کے کلام میں ایسے مقامات بکثرت ہیں جنھوں نے اردو زبان کی شاعری کو بڑا فائدہ پہنچایا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر ان کے مرثیوں کا انتخاب کیا جائے تو ان میں ایسی لاتعداد نظمیں دستیاب ہوں گی جن کے آگے عہد جدید کے کھوکھلے دعوے سر جھکا دیں گے۔ اور اخلاق وسیرت کے لحاظ سے اس شان کی نظمیں فارسی اور عربی میں بھی نہ مل سکیں گی۔ اب میں مختلف عنوانوں کے تحت ان کے مرثیوں کے چند بند سناتا ہوں جس سے آپ میرے اس بیان کی تصدیق فرما سکیں گے۔

جذبات نگاری شاعری کا ایک نہایت مشکل مقام ہے۔ امام علیہ السلام مدینہ سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اپنی صاحبزادی جناب صغرا کو بیمار ہونے کی وجہ سے ساتھ نہیں لیجا سکتے وہ اصرار کرتی ہیں۔ حضرت کا جواب سنیئے۔

اب شہر میں اک دم ہے ٹھہرنا مجھے دشوار
میں پا بہ رکاب اور ہو تم صاحب آزار
پھر آتا ہے وہ گھر میں سفر میں جو ہو بیمار
تکلیف تمھیں دوں یہ مناسب نہیں زنہار
غربت میں بشر کے لئے سو طرح کا ڈر ہے
میرا تو سفر رنج و مصیبت کا سفر ہے

قدرتی مناظر کی تصویر کھینچتے ہیں۔

وہ سرخی شفق کی ادھر چرخ پر بہار
وہ بارور درخت وہ صحرا و سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامان کوہسار
نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

واقعہ نگاری دیکھیئے۔

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند
دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند
چمکارتے تھے حضرت عباس ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

ایک مقام پر فوج کی آمد اور کثرت کے متعلق فرمایا ہے۔
گرمی، ہجوم فوج سے دو چند ہوگئی یہ خاک اس قدر اڑی کہ ہوا بند ہوگئی
ہمراہیان شاہ کی جرأت اور شوقِ جنگ ملاحظہ ہو۔

تھنا ہوا بڑھا کوئی قبضہ کو چوم کے
بھالا کسی نے رکھ لیا کاندھے پہ جھوم کے
نکلا کوئی سمند کو زانوں میں داب کے
غصہ سے رہ گیا کوئی ہونٹوں کو چاب کے
پاسِ ادب سے شاہ کے صف بڑھ کے تھم گئی
پٹری ہر اک سوار کی گھوڑے پہ جم گئی

جنگ کے جو مناظر آداب جنگ اور فنون جنگ کے لحاظ سے میر انیس نے پیش کئے ہیں فردوسی کو بھی نصیب نہیں ہوئے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انیس اردو کا شاعر ہے اور فردوسی فارسی کا۔ انیس کو شاعر سے بڑھکر ایک ذاکر کی حیثیت حاصل ہے اور فردوسی فارسی کا خدائے سخن تسلیم کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں ہندوستان کی اپنے جواہر سے بے اعتنائی اور غیروں کے سامنے گردن جھکا دینے کی اس سے زیادہ واضح مثال شاید ہی مل سکے۔ ہندوستان بھی اگر اپنے جواہر کو پرکھنے کا اہل ہوتا تو اب تک نہ جانتے انیس کے کتنے انتخاب ہوتے اور کس کس شان سے شائع کئے جاتے۔

علی اختر

(یہ مضمون لاسلکی نشر گاہ حیدرآباد سے پڑھا گیا۔)

افکارِ کاوش

ستم کش ہوں مگر یہ جور اب بھی سہہ نہیں سکتا
بچھڑ کر آپ سے دو دن بھی زندہ رہ نہیں سکتا

نہ جانے ان دنوں کیا ہوگیا رگ رگ میں نشتر ہے
میں جو محسوس کرتا ہوں وہ تم سے کہہ نہیں سکتا

کوئی کیا شرح کرسکتا ہے آدابِ محبت کی !؟
کہ اک طوفاں ہے دل میں لیکن آنسو بہہ نہیں سکتا

وہ کہتے ہیں کہ ضبطِ غمِ محبت میں ضروری ہے
ادھر کمبخت دل ترچھی نظر بھی سہہ نہیں سکتا

دلِ بیتاب کے ہوتے ہوئے راحت کہاں کاوش!
یہ وہ کمبخت ہے جو دو گھڑی خوش رہ نہیں سکتا

کاوش

باغ کا وہی جھونپڑا

وہ دور ـــ وہ امرود کے باغ کی پرچھائیاں!
دیکھتی تو ہو گی تم
کتنے فسانے ہیں گم
کتنے ہی ارمان ہیں
کتنے ہی رومان ہیں
آڑ میں پیڑوں کی ہیں کتنی ہی رعنائیاں!
وہ جو بہت چھوٹا سا
اس میں ہے اک جھونپڑا
آکے بسا ہے وہیں ایک کسان آج کل
جیسے بنا ہے وہیں ایک مکان آج کل
یاد ہے تم کو بھی کیا
یہ ہے وہی جھونپڑا
جس میں سناتے تھے ہم روز نئی سی غزل
اپنی بناتے تھے ہم لے کے کسی کی غزل
شعر سمجھ پا گئیں
کوئی تو شرما گئیں
اور مجھے روک کر خوب بناتی تھیں تم
پھر مرے احساس پر خود ہی مناتی تھیں تم
اور بہت سی ہے بات
یاد نہیں ہے مگر
جھونپڑے میں کائنات
آتی تھی ہم کو نظر

چھوٹا سا اک جھونپڑا عالمِ الفت بدوش
اجڑا سا اک جھونپڑا منظرِ جنت بدوش
پھیکا سا اک جھونپڑا حسنِ مسرت بدوش
صرف ہمارے لئے
اور تمہارے لئے
عہدِ محبت میں تھا
دورِ مسرت میں تھا
عشرت و راحت میں تھا
سایۂ دولت میں تھا
آج وہی جھونپڑا واقعی ویران ہے
آکے اسی میں بسا آج اک انسان ہے
میلا کچیلا غریب
فاقہ کش و بدنصیب
کس کی نظر ہے بھلا
کس کو خبر ہے بھلا
کتنی تمنائیں گم اجڑی فضاؤں میں ہیں
کتنی ہی دنیائیں گم پیڑوں کی چھاؤں میں ہیں
زندگی پُر بہار
حوصلۂ نغمہ بار
اور خوشی کی پکار
کیا یہ نہ ہوں گی ابھی اس کے لئے رونما
کیا نہ بنے گا کبھی پہلا سا یہ جھونپڑا
ویسا جب ہم اور تم
ہوتے تھے راحت میں گم
وہ دور ـــ وہ امرود کے باغ کی پرچھائیاں
دیکھتی تو ہو گی تم؟!!

سلام (مچھلی شہری)

رُومان ـــــ شخصیت

حُسن اس کے پُر اسرار طلسم کا کون اندازہ لگا سکتا ہے! اس خوبی کے بغیر جس کو ہم شخصیت سے موسوم کرتے ہیں، حسن بے اثر و بے فیض رہ جاتا ہے۔

پتھر کے مجسمہ میں بھی حسن موجود ہے، لیکن اس میں رنگینیت، زندگی اور ولولۂ حیات کا فقدان! ایسے حسین بھی نظر آتے ہیں جن میں کشش و دلچسپی نام کو نہیں ہوتی اور لطیف ذہانت سے عاری ہوتے ہیں۔

حسین شکل و صورت متناسب الاعضا، بجائے خود مرغوب خاطر ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ اگر حُسن، ذہین شعور و معاملہ فہم شخصیت کا بھی حامل ہو تو، خصوصاً نسوانی حسن اپنے کمال پر نظر آتا ہے۔

اگر کسی لڑکی کو حسین عورت بننے کی آرزو ہو ــــ لیکن خشک و تنگ ــــ یا متقابلتہً سیدھی سادی شکل اور جمیل شخصیت کی خواہاں ہو، تو اس کو آخر الذکر حیثیت حاصل کرنے میں مطلق تاخیر نہیں کرنی چاہیئے۔

حسن خود اپنے میں جادو کا بے پناہ اثر رکھتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ کسی کی خواب کی دنیا کو آن کی آن میں شان دار طور سے آباد کر دیتا ہے۔ ایسی حالت میں "محبت بیک نظر" ایک حقیقت بن جاتی ہے، ایسے رومان میں شخصیت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

آج کل عہد گزشتہ کے برخلاف، نسوانی ظاہرہ حسن و خوب صورتی و نمود، نمائش ہی دیکھ کر محبت میں گرفتار ہو جانے کا عام رجحان نہیں پایا جاتا ہے۔ مزید براں جسمانی خوشنمائی، خود نسوانیت کا افسوں بھی تو ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، جن کو ذرا سی کوشش سے حاصل کرنا، قایم رکھنا، ہر لڑکی کے قبضہ و قدرت میں ہے۔

صحت و حسن کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے، عمدہ صحت کے بغیر حسن اپنی کشش کو زیادہ عرصہ تک قایم نہیں رکھ سکتا۔ نسوانی سادگی، خوب صورتی کے عام تخیل سے خواہ عاری سہی، شوخ زندہ دلی کے امتزاج سے ایک ناقابل نظر انداز خوبی پیدا کر لیتی ہے۔

ہر انسانی روح میں پوشیدہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ عموماً دیکھا گیا کہ یہ ساری عمر خوابیدہ پڑی رہتی ہیں۔ ان شخصی قوتوں کو بیدار اور ان کی نشوونما کرنا نہایت ضروری ہے۔

تم اپنے میں سے "تم" کو جگا دو۔

جس قدر بھی ہو سکے علم و حکمت حاصل کئے جاؤ۔ تم اپنے باطن کی ساری گہرائیوں میں غوطہ زنی کر کے چھپے ہوئے جواہرات کو اوپر لے آؤ، کسی کی طعن و طنز کی کوئی پروا نہ کرو، تم اپنی خامیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لو، اور ان کی تعمیر و اصلاح کی سعی کرو۔

کسی کی تقلید کرنے کی کبھی کوشش نہ کرو، یہ تمھاری زندگی میں انتہائی خطرناک غلطی ہوگی۔ آخر دم تک اپنی شخصی خصوصیات ہاتھ سے نہ جانے دو یہی وہ لائحۂ عمل ہے، جس کے ذریعہ تم اپنی انفرادیت کو نمایاں اور شخصیت کو درخشاں کر سکتے ہو۔ اس پر اگر جسمانی خوشنمائی کا اضافہ ہوتا رہے اور بالکل تندرست رہو، تو تمھاری جذباتی طینت مزید حساس ہو جائیگی تمھارے خدوخال زندہ دلی کو ظاہر کریں گے، ایسی حالت میں تمھارا ذرا سا تبسم، روح کی اس پُر اسرار جاذبیت کو عیاں کر دے گا، جو خوددار شخصیت و مطمئن انفرادیت کا اقتضا ہے۔

(مکمقدش)،

یس، بی انتقا

جدید ادبِ نسواں

(ہمارا موضوع صرف قلمرو آصفی تک محدود ہے)

اُردو زبان اور ادب پر گزشتہ پانچ سو سال سے مختلف دور گزر چکے ہیں، اور آج وہ معراج کمال پر پہونچنے کے سامان کر رہی ہے، علوم و فنون اور ادب کا گراں مایہ ذخیرہ فراہم ہوتا جا رہا ہے جو نہ صرف غیر زبانوں کے ترجموں پر مشتمل ہے، بلکہ مستقل تصانیف پر بھی۔ دوسرے ملکوں کی ترقی اور ان کے ادبیات کے مطالعہ سے ہمارے خیالات میں جو نمایاں تبدیلی ہوئی ہے، نیا ادب اِس کا نتیجہ ہے جس کی ابتدا گزشتہ دس بارہ سال سے ہوئی ہے۔

یہ موقع نہیں ہے کہ "جدید ادب" کی خصوصیات یا اس کے رجحانات کو تفصیل سے بیان کیا جائے، اس کے لئے ایک علحدہ مضمون کی ضرورت ہے، ہمارا موضوع اس وقت قلمرو آصفی کا "جدید ادب نسواں" ہے، اِس لئے مختصر طور پر اس کی صراحت کی جاتی ہے۔

ادب کی تقسیم اولاً نظم اور نثر پر کی جاسکتی ہے۔ اس لئے ہم ہر ایک پر علحدہ علحدہ اظہار خیال کریں گے۔

یہ صحیح ہے کہ زمانۂ دراز سے خواتین دکن اُردو نظم کی خدمت کر رہی ہیں، لیکن ان کا تمام تر سرمایہ قدیم طرز کی شاعری پر مشتمل ہے جس میں وہی گل و بلبل اور شاہد و ساقی کی فرسودہ داستانیں، ہجر و وصال کے افسانے، معشوق کی بے وفائی اور ہرجائی پن کا رونا پیٹنا ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں اِس میں بہت کچھ تغیر ہو چکا ہے، عصر حاضر سے وہ پوری طرح متاثر ہوئی ہیں، اور نظم گوئی کی جانب زیادہ سے زیادہ متوجہ ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کے ثبوت میں کئی نظائر پیش کئے جاسکتے ہیں۔

موجِ تخیّل - یہ نوشابہ خاتون بی اے (عثمانیہ) کے کلام کا مجموعہ ہے اس کی نظموں کے بعض عنوان یہ ہیں 'زندانِ مسلم' قومی گیت' خرد خاور' زندگی کیا ہے' مرقع حسرت' جانِ زندگی' نغمۂ حیات ترانۂ عمل' مرقع بسمل' مرثیہ غم' فریاد مسلم' دہلی کی گرمی' فغانِ مظلوم اشک حسرت' پولس کی لاٹھی وغیرہ ان سے واضح ہوسکتا ہے کہ "موج تخیل" میں تخیل کی موج کن کن موضوعات پر سے گذری ہے۔ ان کی شاعری ایک ہمدرد قوم کے دل کی پکار ہے جو ہمیں اپنی قوم کی پستی کا احساس کراتی ہے اور قوتِ عمل کو ابھارتی ہے۔ نوشابہ خاتون جامعہ عثمانیہ کی وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے جامعہ اناث کے قائم ہونے کے قبل بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

نوشابہ خاتون کے بعد بشیر النساء بیگم بشیر کا نمبر آتا ہے' حیدرآباد کا کوئی زنانہ علمی' اور معاشرتی جلسہ ایسا نہ ہوگا جس میں بشیر النساء بیگم نے اپنی نظمیں سنا کر خراجِ تحسین حاصل نہ کیا ہو' ان کی نظمیں خواتین میں جوش اور عمل پیدا کرنے کا اچھا ذریعہ ثابت ہو رہی ہیں۔ اگرچہ اب تک بشیر النساء بیگم کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے' لیکن رسالوں کے علاوہ متفرق طور پر بھی ان کی نظمیں شائع ہوتی ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی شاعری میں قومیت' اخلاق اور جدت موجود ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ وہ اقبال کے رنگ میں اتنا کامیاب لکھ جاتی ہیں کہ اقبال کے کلام کا دھوکا ہونے لگتا ہے

لطیف النساء بیگم ایم اے (عثمانیہ) بچوں کی نظموں کے لئے مشہور ہیں۔ اور بچوں کی نظمیں لکھنا جتنا مشکل ہے ظاہر ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی کے سوا ہم کسی ایسے شاعر کو پیش نہیں کر سکتے: جو بچوں کا شاعر کہلا سکے۔ اس کی طرف ہمارے شاعروں کو خاص طور پر متوجہ ہونا چاہئے اور خوشی کی بات ہے لطیف النساء بیگم نے اپنے لئے یہی میدان منتخب کیا ہے۔

اس سلسلے میں سیدہ اختر' رفیعہ بیگم قمر' انیسہ بیگم شروانی' رابعہ بیگم

ت بیگم اداؔ، رحمت بیگم اسیرؔ، اور مسز برکت رائے کے نام بھی لینا ضروری ہے جن کی نظموں سے جدید ادب نسواں میں اضافہ ہو رہا ہے۔

نثر میں جو قدیم ذخیرہ ہمیں ملتا ہے وہ صرف چند افسانوں ناولوں اور سفرناموں پر مشتمل ہے، اور اس کی فہرست زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ درجن تک پہونچ سکتی ہے۔ لیکن گزشتہ چار پانچ سال کے عرصے میں جو ذخیرہ خواتین دکن نے مرتب کیا ہے وہ گزشتہ نصف صدی کے ذخیرے سے بہت زیادہ ہے اور بلحاظ فنون کی نوعیت کے لحاظ سے بھی ہمہ گیر ہے۔

مجھے کہنے دیجئے کہ اب اس امر کی ضرورت نہیں رہی ہے کہ مولانا نذیر احمد اور راشد الخیری کی طرح عورتوں کی اصلاح معاشرت اور ان کی زندگی کے سدھار پر مرد خامہ فرسائی کریں۔ اور قاضی عبدالغفار کی طرح "لیلیٰ" کے فرضی خطوط لکھ کر عورتوں کے دلی جذبات کی ترجمانی کی جائے، کیونکہ عورتیں خود بیدار ہو گئی ہیں اور ان کے قلم میں اتنا زور پیدا ہو گیا ہے کہ ان کو مردوں کی امداد کی پروا نہیں۔ ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں حسب ذیل کتابیں پیش کر سکتے ہیں۔

نذرِ ولی۔ تنقید جس قدر اہم ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہمارے یہاں تنقید کا فن بہت کچھ تشنہ ہے، اور اردو ادب میں اس فن کی کتابوں کی شدید ضرورت ہے "نذر ولی" فن تنقید کی بہترین کتاب ہے اس میں ولیؔ کی شاعری پر جتنے پہلوؤں سے تنقید کی گئی ہے وہ ہمارے ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ نذر ولی جامعہ عثمانیہ کی فارغ التحصیل خواتین کی تصنیف ہے۔ جس کو پڑھ کر بڑے بڑے نقادوں نے تعریف کی ہے۔

محمد حسین آزاد۔ یہ جہاں بانو بیگم ایم اے (عثمانیہ) کی قابل قدر کتاب ہے۔ دراصل یہ ان کا وہ مقالہ ہے، جس پر اُن کو ایم اے کی ڈگری ملی ہے۔ آج تک اردو زبان میں مولانا آزادؔ پر اس سے بہتر اور اس سے مبسوط کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ اس کتاب میں مولانا آزادؔ کی سوانح عمری کے علاوہ ان کی نظم اور نثر پر دقیق روشنی ڈالی گئی ہے اور بے لاگ تنقید کی گئی ہے۔ مولانا آزادؔ ان شخصیتوں میں ہیں جن پر زبان اُردو کو ناز ہے۔ لیکن افسوس کہ زبان اُردو میں اپنے محسن پر کوئی مستقل تصنیف نہیں تھی۔ فاضل مصنفہ نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے

رمزِ حیات۔ اقبالؔ کے کلام اور پیغام پر بیسیوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن اب تک صرف مردوں نے اس کام کو انجام دیا ہے اب "رمزِ حیات" نے ثابت کر دیا ہے کہ اقبالؔ کے کلام پر عورتیں بھی بہتر سے بہتر تنقید کر سکتی ہیں، بلقیس بانو بیگم نے رمزِ حیات میں اقبال کے کلام خصوصاً "فلسفۂ خودی" کی جو تفسیر کی ہے وہ ہر آئینہ قابل قدر ہے۔ فلسفہ ایک ادق اور خشک مضمون ہے، عورتوں کو اس سے زیادہ رغبت نہیں ہو سکتی اس کے باوجود بلقیس بانو بیگم نے جس دلچسپ اور آسان طریقے پر اقبالؔ کے فلسفہ کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔

تنقیدی مضامین کے سلسلے میں بعض اور کتابوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ مثلاً نعیم النساء بیگم کا مقالہ مولانا شبلیؔ۔ تسنیم ربانی صاحبہ کا ظفرؔ اور اُس کی شاعری، لطیف النساء بیگم کا مقالہ "اردو شاعری میں تصوف" اگرچہ یہ کتابیں شائع نہیں ہوئی ہیں، مگر جن لوگوں نے ان کے مسودوں کو دیکھا ہے، ان کا خیال ہے کہ یہ مقالے اُردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہیں۔

بربطِ ناہید۔ جدید ادب نسواں میں اس کتاب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ ناہید کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ راقم نے لکھا ہے۔ اس لئے یہاں پر اپنی رائے کے بجائے ڈاکٹر زورؔ کی تنقید کا اقتباس دیا جاتا ہے جس سے

معلوم ہوسکے گا کہ "بربط ناہید" کیا ہے۔

"اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ اب مَردوں کو صنفِ نازک کی ترجمانی کی ضرورت نہیں یا یوں کہئے کہ عورتیں اب مرد ترجمان سے بے نیاز ہوچکی ہیں، نسوانی سینے میں جذبات کا جو اتار چڑھاؤ رہتا ہے، اس کی آئینہ داری مرد سے کیونکر ہوسکتی ہے۔ جس پر اپنی جنس کی کثافت کا رنگ چڑھا رہتا ہے اس کے لئے تو کسی نسوانی قلم ہی کی ضرورت ہے، اور بربط ناہید کی مصنفہ نے اپنے خطوط کی رعنائی اور رنگینی کے ذریعے سے ثابت کردیا کہ واقعی صنفِ نازک کے دل کی گہرائیوں تک پہنچنا اور عہد حاضر کے تعلیم یافتہ بتانِ طناز کو سمجھنا آسان کام نہیں ہے"

نذرِ دکن ۔ ہمارے جدید ادب نسوان میں، نذر دکن کو بھی شامل کرنا چاہئے، اگرچہ بعض اصحاب نے اس کو "تنقید کی آگ" میں جلاکر ناقص اور ناکارہ قرار دیا ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ نذر دکن ایک قابل قدر کتاب ہے، جو تنقید کی آگ میں جل کر بھی راکھ نہ ہوسکی۔ اس میں دکن کی تاریخ طرز معاشرت اور علم و ادب پر معیاری مضامین ہیں۔ جن کو سکینہ بیگم صاحبہ نے مرتب کیا ہے۔

من کی بپتا، رموز خانہ داری اور علم خانہ داری ۔ یہ تینوں کتابیں علی الترتیب لطیف النساء بیگم، جہاں بانو بیگم اور محمودہ صدیقی کی لکھی ہوئی ہیں۔ اور من کی بپتا میں ہمارے متوسط طبقے کی خواتین کی معاشرتی اور اخلاقی کمزوریوں کو بے نقاب کرکے زندگی کی تلخیوں کا کامیاب مقابلہ کرنے کے طریقے پیش کئے گئے ہیں، اور بتایا گیا ہے کہ تقلید اور مغرب زدگی کو چھوڑ کر کس طرح زندگی کو کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔ تفکرات اور پریشانیوں کے اسباب پر غور کرکے کس طرح ان کی روک تھام کی جاسکتی ہے متوسط طبقے کے لئے، یہ کتاب شمع ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔

"رموز خانہ داری" میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے منزلی زندگی کے بہترین طریقے اور گھر کے انتظام کی باتیں بتائی گئی ہیں، "جو لڑکیاں شادی کے بعد کتابوں کے مطالعے میں اتنی سرگرم رہتی ہیں کہ ان کو امور خانہ داری سے کوئی واسطہ نہیں رہتا، وہ گھر کے انتظام کے قابل نہیں رہتی ہیں پھر ان سے نہ بچوں کی پرورش ہوسکتی ہے اور نہ جیسی کہ ہونی چاہئے میاں کی خدمت ہوسکتی ہے ایسی لڑکیوں کی زندگی میں ایک طرح کی بے لطفی پیدا ہوجاتی ہے، اور ان کا اصلی معنوں میں خوش رہنا بہت مشکل ہے"۔ رموز خانہ داری میں اسی مسئلہ کا حل موجود ہے اور اس علم پر عمل کے طریقے واضح کئے گئے ہیں۔ آخری کتاب علم خانہ داری ڈومسٹک سائینس کے متعلق پہلی اور کامیاب کتاب قرار دی جاسکتی ہے۔

"سوتیلی ماں" یہ رابعہ بیگم کے قلم کی رہین منت ہے "ماں" کا لفظ جس طرح بے پایاں محبت و شفقت کا حامل ہوتا ہے، اسی طرح ایک لفظ "سوتیلی" کے اضافے سے وہ ظلم و جور کا تصور پیش کردیتا ہے، لیکن "سوتیلی ماں" میں رابعہ بیگم نے بتایا ہے کہ کس طرح سوتیلی ماں بھی ویسی ہی محبت و شفقت کرسکتی ہے، ایک جگہ کتنی عمدہ بات لکھی ہے " دنیا میں فسادات کی جڑ حق تلفی ہے، اگر سب مستحق ہستیاں ایک دوسرے کے حقوق پر نظر رکھیں تو ناخوش گوار واقعات پیش ہی نہیں آسکتے"۔

رفتارِ خیال ۔ رفتار خیال میں جہاں بانو بیگم کے مختصر افسانے اور ادب لطیف کے مضامین شامل ہیں، افسانوں میں طبع زاد اور ترجمے دونوں شریک ہیں، رفتار خیال کے مختصر افسانے واقعیت نگاری کے لحاظ سے بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ افسانے نہیں، بلکہ کسی کی آپ بیتی کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں۔

نسوانی کوششوں میں خدیجہ بیگم کے بچوں کے ڈرامے، نورجہاں، گوتم، دمینتی، شاہجہاں اور ابوالحسن بھی نظر انداز نہیں کئے جاسکتے

یہ پانچوں ڈرامے اسٹیج ہو چکے ہیں اور پسند کئے جا چکے ہیں اور یوں تو ہر ڈرامہ قابلِ قدر ہے، لیکن "ابوالحسن" کو سب پر فوقیت حاصل ہے، اس میں ابوالحسن تانا شاہ کی سیرت کو ابتداء سے انتہا تک بچوں کی سمجھ کے مطابق جس حسن و خوبی سے پیش کیا گیا ہے وہ گویا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے برابر ہے۔ اِن ڈراموں سے بچوں کو نہ صرف اسلاف کے کردار کا صحیح علم ہو سکتا ہے بلکہ مذہبی پہلو کو نمایاں کرنے کی جو کامیاب کوشش کی گئی ہے، اس سے چھوٹے بچوں کو مذہب پر مائل کرنے اور مذہب کی اچھی باتوں پر عمل کرنے کی ترغیب بھی ہوتی ہے

گل خنداں ۔ یہ آصف جہاں بیگم کی تصنیف ہے، جو اُن کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، اُردو زبان میں اخبار اودھ پنچ میں ۱۸۷۷ء سے مزاحیہ نگاری کا آغاز ہوا۔ منشی سجاد حسین اور پنڈت رتن ناتھ سرشار وغیرہ اس کے بانی تھے، اس کے بعد گزشتہ دس پندرہ سال سے اس میں بڑی ترقی ہوئی ہے، جو مغربی ادب کا اثر ہے۔ صنف قوی کے کئی اصحاب مزاحیہ مضمون اور افسانے لکھا کرتے ہیں، جنس نازک میں ایک آدھ خاتون ہی نے اِس میدان میں قدم رکھا ہے، مسز حجاب امتیاز علی کے افسانے "تحفے" مزاحیہ نگاری کی پہلی کتاب ہے۔

گلِ خنداں دوسری تصنیف ہے جو مزاحیہ نگاری پر مشتمل ہے، اس کے متعلق مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کی حسب ذیل رائے ملاحظہ ہو۔

"ہم سمجھتے تھے کہ مزاحیہ مضمون لکھنا صرف مردوں ہی کا حصہ ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ صنف نازک بھی ہماری حصہ دار بن گئی ہے، بلکہ یوں کہو کہ صنف نازک بننے سے قبل ہی بعض لڑکیوں نے ہمارے مال پر ڈاکہ ڈالنا شروع کر دیا ہے .... ہم مزاح کے معنی کسی ہنسی کی بات پر ہنسنا لیتے ہیں، مگر یہاں ہر فقرہ پر چٹکیاں لی گئیں ہیں۔ اور مزا یہ کہ ہر چٹکی پر بجائے رونے کے ہنسی آتی ہے۔"

اس صراحت سے واضح ہو سکتا ہے کہ گل خنداں کس پایہ اور کس معرکہ کی تصنیف ہے۔ معلوم ہوتا ہے آصف جہاں بیگم فطری طور پر مزاحیہ نگاری کرتی ہیں ان کے مضامین کی شوخی، شگفتگی، بے ساختگی خاص طور پر قابل داد ہے۔ آصف جہاں بیگم کے متعلق ایک یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ان کو ادبی میدان میں آکر ہنوز کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔ اگر کہنہ مشق ہوتیں تو نہ معلوم کیا گل کھلاتیں۔

جدید ادب نسواں میں جن خواتین کے نام خصوصیت سے پیش کئے جا سکتے ہیں اِن میں سے بعض یہ ہیں۔

بادشاہ بیگم، انیسہ بیگم، معتصمہ بیگم، انور جہاں بیگم قریشی، آصف جہاں بیگم صدیقی بلگرامی، رابعہ بیگم (عثمانیہ) رضیہ بیگم (عثمانیہ) محمدی بیگم بی اے (عثمانیہ) افسر النساء بیگم بی اے (عثمانیہ) ممتاز جہاں بیگم صوفی، تصدق فاطمہ، سعیدہ بیگم ضمیر الدین، سیدہ احمد النساء بیگم، ثریا جبیں بی اے (عثمانیہ) وغیرہ۔

ان خواتین کے افسانے اور کہانیاں تاریخی تنقیدی اور ادبی مقالے مزاحیہ، اصلاحی اور معاشرتی مضامین سفرنامے وغیرہ اس کثرت سے موجود ہیں کہ ان سے کئی ضخیم کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں اور سب کے سب "ہمارے جدید ادب نسواں" کے ذخیرہ میں گراں قدر اضافے تصور کئے جا سکتے ہیں۔

سطور بالا میں مختصر طور پر ہم نے جدید ادب نسواں کی صراحت کر دی ہے، اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ جس طرح جنس قوی باقتضائے زمانہ کے تحت جدید ادب تیار کرنے میں مصروف ہے، جنس نازک بھی اس کوشش میں اِن سے پیچھے نہیں ہے۔ اور ان کے کارنامے ایک تابناک مستقبل کا پتہ دے رہے ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی

آنسو

حمید کو رضیہ سے بے حد محبت تھی۔ وہ رضیہ کو صرف چاہتا ہی نہیں تھا بلکہ اس کی پرستش کرتا تھا۔ مگر لطف کی بات یہ تھی کہ اِس راز سے سوائے میرے اور رضیہ کے کوئی اور واقف نہ تھا۔ حمید اکثر یہ گنگنایا کرتا ہے

نغمۂ عشق نہیں دہر میں گانے کے لئے — یہ فسانہ نہیں دنیا کو سنانے کے لئے
نہ جلانے کے لئے ہے نہ بجھانے کے لئے — عشق کی آگ ہے سینے میں دبانے کے لئے

حمید کو مجھ سے بہت خلوص تھا۔ گو ابتداء سے مجھے شکایت رہی ہے کہ کوئی صحیح قسم کا دوست مجھے اب تک نہیں مل سکا لیکن حمید میں مجھے ایسے انسان کی جھلک نظر آتی تھی جو میرے تخیل میں برسوں سے پرورش پا رہا تھا۔ اس میں محبت، ایثار، خلوص اور سچائی سب موجود تھی اور شاید وہ سب کچھ تھا جسے میں چاہتا تھا۔ حمید کو اور لوگ جو بھی سمجھیں مگر میرے لئے وہ ایک "دوست" تھا۔ وہ میرا سب کچھ تھا

حمید کوئی پانچ سال میرے ساتھ کالج میں رہا اور اِس اثناء میں مجھے بھی اس سے کچھ لگاؤ سا ہوگیا تھا۔ مگر تعجب تو یہ ہے کہ اس نے اپنے دل کی بات مجھ سے تک چھپا رکھی۔ یوں اس کا کوئی کام یا کوئی بات ایسی نہ تھی جو میری رائے یا علم کے بغیر ہو سکے مگر اس کا ایک راز جو اس کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا میرے علم میں اب تک نہ آیا تھا۔ ایک روز کی بات ہے کہ حمید میرے گھر آیا اور آتے ہی خواہش کی کہ اس کے ساتھ عثمان ساگر چلوں۔ میری طبیعت کچھ تفریح کی طرف مائل نہ تھی مگر حمید کے اصرار پر مجھے جانا پڑا۔ جس وقت ہم عثمان ساگر کے چمن میں پہنچے تو سات بج چکے تھے۔ ہم دونوں چمن میں گھوم گھام کر اس کے مغربی گوشے کی طرف چلے۔ یہاں ایک پارسی خاندان ٹھیرا ہوا تھا۔ ایک نازنین کسی مرد کے ساتھ جو غالباً اس کا شوہر تھا، بیٹھی ہوئی تھی دو خوبصورت بچے وہیں قریب کھیل رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر ہم وہاں سے پلٹ گئے اور اس طرف چلے جہاں جھولے وغیرہ پڑے تھے۔ یہاں کوئی نہ تھا۔ البتہ چاند درختوں کی آڑ سے جھانک رہا تھا۔ پتوں میں سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی اور اسی سمے میں اداس طبیعت بھی شگفتہ ہو رہی تھی۔ میں نے کہا "چلو حمید آج جھولا ہی سہی۔ دیکھیں کون سب سے بڑی پینگیں لیتا ہے۔" مگر اس کی طبیعت اس طرف مائل نہ تھی۔ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا "نہیں طبیعت نہیں چاہتی"۔ میں نے حمید کے چہرے کی طرف دیکھا مگر روشنی اتنی نہ تھی کہ چہرے سے اس کی اندرونی کیفیات کا پتہ لگا سکتا۔ پھر بھی جس طرز سے اس نے گفتگو کی اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ میں اس کے حال پر غور کرنے لگا۔ ہم جب سے مکان سے چلے تھے اس میں بہت سے تغیر نمایاں ہو رہے تھے۔ کبھی وہ مذاق کی کوئی بات کہہ جاتا اور کبھی کسی سوچ میں پڑ جاتا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ کبھی کبھی سوچ میں پڑ جانا تو حمید کی عادت ہی ہے۔ مگر پھر شبہ ہونے لگا کہ وہ کسی قسم کی ذہنی اذیت میں مبتلا ہے۔ وہ اپنے اندرونی جذبات کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی طرح اپنا جی بہلانے کی کوشش کرتا ہے مگر یہ اس کے بس کی بات نہیں۔ میں سوچنے لگا کہ حمید کی ایسی بات کونسی ہو سکتی ہے جو مجھ سے چھپائی جائے۔ اگر کچھ ایسی بات ہوتی تو وہ خود مجھ سے کہہ دیتا۔ اِس خیال سے میں نے سکوت اختیار کر لیا اور اپنے دل کو یوں بہلا لیا کہ کبھی کبھی حمید گم ہو جایا کرتا ہے۔

تھوڑی دیر اِدھر اُدھر ٹہلنے کے بعد ہم پھر اسی جگہ آئے جہاں وہ پارسی جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ اب اس جگہ کوئی نہ تھا حمید نے کہا چلو یہیں ریت پر بیٹھ جائیں۔ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گیا "ہاں ہاں کیوں! وہ بھی تو یہیں بیٹھی ہوئی تھیں"۔ مگر حمید نے

اس کا لطف نہ اٹھایا۔ اس وقت میں حمید کا چہرہ صاف طور پر دیکھ سکتا تھا کیونکہ چاند ہمارے اوپر تھا اور حمید نے جس وقت میرے جواب میں میری طرف خاموشی سے دیکھا اس پر کافی روشنی پڑی تھی۔ میں نے دیکھا کہ حمید کسی ذہنی تکلیف میں مبتلا ہے۔ مجھے اب یقین ہوگیا کہ کوئی خاص بات ہے جسے وہ چھپانا چاہتا ہے۔ اس وقت مجھے خاموشی ہی بھلی معلوم ہوئی۔ ہم دونوں زمین پر بیٹھ گئے۔ اس وقت دونوں ساکت تھے۔ ہمارے سامنے تالاب کا پانی بھی ساکت تھا۔ اور ہمارے سروں پر ساکت چاند بھی شاید حیرت سے ہم دو دیوانوں کو گھور رہا تھا۔ میں نے سہگل کی ایک چیز شروع کی مگر دبے سُروں میں:۔

"نہ کوئی پریم کا روگ لگائے ..."

کچھ وقت کا سہانا پن اور کچھ سہگل کی طرز۔ اس وقت گانا اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ میں اپنے گانے میں محو تھا کہ حمید میرے زانو پر سر رکھ کر زمین پر لیٹ گیا اور شاید چاند کو گھورنے لگا۔ فضا کچھ ایسی تھی کہ میں اپنی پوری محویت کے ساتھ گانے میں مصروف تھا لیکن ایک بات ایسی ہوئی کہ مجھے یکایک رک جانا پڑا۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ حمید کے سر کے نیچے دے رکھا تھا مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے ہاتھ پر گرم پانی کی بوندیں گر رہی ہیں۔ میں گاتے گاتے یکایک رک گیا۔ حمید یہ شعر پڑھ رہا تھا:۔

زاری نالم و کس نیست کہ گوید حالم
چیست آں ماہ کہ از دوری او می نالم

میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے گھبراہٹ میں پکارا "حمید!" اس سے اب نہ رہا گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں ادھر پریشان کہ ماجرا کیا ہے۔ پوچھتا ہوں تو اور رونے لگتا ہے۔ غرض تھوڑی دیر میں نے بڑی پریشانی سے گزاری۔ جب وہ خوب رو چکا تو کہنے لگا "بھیا! اب سمجھو کہ میں مر چکا" یہ کہہ کر اس نے مجھے بولنے کا موقع دیا۔

آخر کہو تو سہی بات کیا ہے۔ تم تو اپنی کوئی بات مجھ سے چھپاتے نہ تھے۔ ایسی کیا بات ہے کہ تم ہلکان ہو رہے ہو اور مجھے کانوں کان خبر نہیں۔"

"تم سے چھپانا ہی کیا ہے۔ تم ہی تو میرے ایک دوست ہو۔ مگر خیال تھا کہ تم سے کیا کہوں میری قسمت کی بات ہے"

"تم دیوانے ہوگئے ہو۔ کہو بھی کیا بات ہے؟"

"بھیا! بات یہ ہے کہ ..... تم جانتے ہو اس کو ....."

حمید نے کچھ ٹوٹے ہوئے الفاظ میں کہنا شروع کیا۔ میں نے جواب دیا "ہاں ہاں! بتاؤ!"

اس نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "تمہارا ایک دوست تھا وقار احمد۔ کوئی چار سال ہوئے کہ تم نے اس سے ملایا تھا۔"

"ہاں اور وہ اس کی بہن رضیہ جو تمہاری پھوپھی زاد ہے ..."

حمید نے بات کاٹ کر کہا "یہ تو تم جانتے ہی ہو۔ مگر مجھے کہنا یہ ہے کہ میری قسمت نے پلٹا کھایا ہے۔ رضیہ کی نسبت ایک خوش بخت سے ہوگئی ہے اور رضیہ کے والدین نے تمام کاروائی راز میں کروالی ہے۔ دو روز ہوئے کہ مجھے اس کی خبر ہوئی۔ میں اپنے والد سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا والدہ سے بڑی منت سماجت کی کہ میری مدد کریں مگر وہ کہنے لگیں "بیٹا! تمہاری نسبت تو تمہاری چچا زاد بہن سے قرار پائی ہے۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ اور ویسے بھی وہ لوگ ہم سے زیادہ مالدار ہیں۔ ان کے اونچے اونچے خیالات ہیں۔ وہ بہت فیشن ایبل ہیں۔ ابھی سے ہم کو ہچکیاں دینے لگے۔" جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا "نا ممکن! ایسی بہو لاکر مجھے یہ ہوں گی مجھے منہ کی کھانی پڑے گی اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ عمر بھر میں نے کسی کے سامنے نیچا نہیں دیکھا ......"

"وہ کیا کہنا کہہ گئیں نہیں معلوم۔ مگر میری تمام کوششیں بیکار ہوئیں رضیہ کے والد نے بات پکی کرلی اور اب کوئی کسر باقی نہیں۔"

"اس کی مجھے تو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی"

میں نے جواب دیا "بڑے تعجب کی بات ہے۔ یہ قصہ تو خود مجھے نہیں معلوم۔ خیر اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ میں جاکر کوشش کرتا ہوں۔ تم نے مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہا"

"نہیں نہیں اب تم جاکر کیا کروگے۔ وہاں تو شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی اور وہاں شادی کے بعد ہی دولہا دولہن تعلیم کی غرض سے انگلستان بھیجے جارہے ہیں۔"

"یہ بھی خوب۔ یہ سب کچھ طے ہو گیا اور ہمیں خبر نہ ہوئی۔"

میں نے جاکر رضیہ کی ماں سے گفتگو کی۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکیں۔ انھوں نے کہا بیٹا! بات پکی ہو گئی ہے۔ اس کو اب کیسے توڑا جاسکتا ہے۔ احمد بھی بالکل خاموش تھا۔ اس نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ معلوم نہیں وہ بھی اس معاملے میں مجبور تھا یا میری تجویز سے اس کو اتفاق نہ تھا۔ چار و ناچار ہمت کرکے رضیہ کے باپ سے ملا۔ بڑے میاں نے تو خوب صلواتیں سنانی شروع کیں۔ انھوں نے کہا "تم لونڈوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ شادی بیاہ کے معاملات میں بچوں کی مرضی پر کام چلتا ہے؟ ہم جو مناسب سمجھتے ہیں کرتے ہیں۔ یہی گھر میں سن کر تو میں نے بات پکی کرلی ہے۔ اس پر تم جو کرسکے کرو دیکھو منہ دھو رکھو......"

میں حیران ہو کر سوچنے لگا کہ آخر اس ساجھے میں آپ کو کیا خرابی نظر آئی۔ لیکن ان کی بزرگی کا پاس تھا۔ وہ بزرگ سمجھے کہ میں اٹھ کر چلا آیا۔ حمید سے سارا حال بیان کیا وہ آزردہ تھا۔ کہنے لگا "تم نے غلطی کی جو بات کہی۔ یہ تو میں پہلے سے سمجھا ہوا تھا۔ بات قسمت کی ہے حمید! اس میں کسی کا کیا گلا۔ اچھا تم نے رضیہ کو دیکھا......"

"ہاں دیکھا تو مگر مل نہ سکا۔ ویسے وہ مغموم تو معلوم ہوتی تھی مگر اس سے بات کرنے کا موقع نہ ملا"

حمید نے یہ شعر پڑھ دیا:۔

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

رضیہ کی شادی ہوئے دو ہفتے گزر چکے تھے۔ اور نئے جوڑے کو انگلستان بھجوانے کی تیاریاں بھی شروع ہو گئیں۔ مگر اب حمید مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا "اب مجھے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بڑی فکر مجھے رضیہ کی تھی کہ اگر وہ بھی میری طرح بے قرار ہے تو اسے اس شادی سے تکلیف ہو گی۔ اب قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوش ہے۔ یہی میرے لئے بڑی چیز ہے، وہ خوش ہے تو میں بھی خوش ہوں۔ مگر میری دعا یہی رہے گی کہ وہ ہمیشہ خوش رہے۔ اسے میں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا"

میں نے یہ سنا تو بڑا تعجب ہوا کہ یہ عجیب و غریب آدمی ہے۔ میں غیر ارادی طور پر اس سے لپٹ گیا۔ معلوم نہیں کیوں اس کے بعد سے میرے دل میں حمید کی عزت دوبالا ہو گئی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ حمید مجبور ہے اور مجبوری ہی کو صبر کا دوسرا نام سمجھتا ہے۔ مگر حمید کے خیالات جب مجھے معلوم ہوئے تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس میں کامل انسان کی کچھ جھلک ہے۔ وہ ایک تخیلی زندگی گزارنے لگا۔

کوئی دو سال گزر گئے۔ اس اثنا میں حمید کا کام صرف اتنا تھا کہ یا تو مجھ سے ملا کرے یا مکان جاکر کمرے میں بیٹھ رہے۔ اس کو اب دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اسکے

والدین نے کتنا مجبور کیا کہ وہ اپنی چچا زاد بہن سے شادی کرے یہاں تک کہ حمید کے والد نے شادی کی تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ مگر حمید نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ شادی نہیں کرے گا اور اگر اتنا مجبور کیا جائے تو شادی کے روز خودکشی کرے گا۔ میں اس راز اور حمید کی طبیعت سے خوب واقف تھا۔ جاکر حمید کے والد کو سمجھایا۔ وہ خودکشی کی دھمکی سے ڈرے ہوئے بھی تھے۔ حمید اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کی زندگی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے دن پورے کر رہا ہے۔ اسے میں سینما لے جاتا۔ کبھی باغ عام چلا جاتا۔ اسے لے کر کبھی تالاب کے کنٹے پر ٹہلتا اور کبھی ریڈیو کے سامنے بٹھا دیتا۔ مگر اسے کسی چیز سے بھی دلچسپی نہ تھی۔ وہ مجھ سے ملتا تو خاموش رہتا اور اپنے کمرے میں تو کسی سے بھی بات نہیں کرتا۔ اس کی صحت خراب ہو رہی تھی۔ ایک دن حمید کے والد خود میرے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ حمید کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے۔ اسے کہیں باہر تفریح کے لئے لے جائیں تو اچھا ہے۔ میں نے حمید سے کہا بھی کہ کہیں چلے چلیں۔ مگر وہ اس کے لئے تیار نہ تھا۔ ایک روز کی بات ہے کہ حمید مجھ سے کہنے لگا۔

"بھیا! رضیہ اور اس کے شوہر انگلستان سے واپس آرہے ہیں۔ تم کہتے تھے کہ کہیں باہر چلیں۔ چلو ہم بمبئی ہو آئیں"۔ میں فوراً تیار ہو گیا اور ہم لوگ بمبئی چلے گئے۔ بمبئی میں وہ بہ ظاہر خوش معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ بمبئی کی دلچسپیوں سے اسے کوئی تعلق نہ تھا لیکن وہ روز شام کو اپالو بندر جاتا اور گھنٹوں سمندر کا لطف اٹھاتا۔ معلوم نہیں وہ پانی کو دیکھتا تھا یا کسی جہاز کے آنے کی توقع رکھتا تھا۔

اس طرح کوئی ایک ہفتہ گزر گیا۔ ایک روز حمید بہت خوش معلوم ہوتا تھا اس نے کہا "کل وائسرائے آف انڈیا" آرہا ہے

میری رضیہ بھی اسی سے آئے گی"۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کو میری رضیہ کہتے سنا۔ بہرحال مجھے بھی خوشی ہوئی کہ اب حمید مغموم نہ رہے گا۔

دوسرے روز وہ بہت بےچین تھا۔ ہم لوگ وقت مقررہ پر رضیہ کے استقبال کے لئے جہاز پر گئے۔ رضیہ اور اس کا شوہر جہاز سے اتر رہے تھے۔ ہم لوگوں نے ان دونوں کو دیکھا۔ رضیہ کی گود میں ایک بچی بھی تھی۔ حمید نے ان لوگوں کو دیکھتے ہی مجھے پھولوں کے ہار دے دئیے جو اس نے خرید رکھے تھے۔

اس نے کہا کہ میں وہ ہار ان دونوں کو پہنا دوں۔ اس نے مجھ سے منت کی کہ اس کی آمد کی اطلاع رضیہ کو نہ دوں۔ میں یک دم ششدر ہو گیا۔ میں پوچھ ہی رہا تھا کہ کیوں تم کیوں نہیں چلتے مگر اس نے مجھے ڈھکیلتے ہوئے کہا "یہ تم کو بعد میں معلوم ہوگا۔ دیکھو وہ آرہے ہیں۔ تم جلدی آگے بڑھو"۔ میری سمجھ اس وقت بےکار ہو گئی تھی۔ میں ہار لے کر آگے بڑھا اور دونوں کو پہنا دیا۔ رضیہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئی اور اپنے تمام لوگوں کی خیریت پوچھنے لگی۔ میں ان لوگوں کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ باہر موٹر کے پاس آئے تو مجھے حمید کا خیال آیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ میں پریشان ہو گیا۔ رضیہ کے شوہر سے میں نے کہا "میں ریلوے ہوٹل چارنی روڈ میں ٹھیرا ہوا ہوں۔ آپ کے لئے بھی وہیں انتظام کیا ہے۔ آپ اسی ہوٹل کو چلے جائیے۔ میں ابھی آتا ہوں"

رضیہ وغیرہ تو چلے گئے اور میں حمید کو ڈھونڈتا رہا۔ بندر پر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ دو تین گھنٹے میں نے تلاش کی مگر اس کا پتہ نہ تھا۔ مجھے میری بےوقوفی پر غصہ آرہا تھا کہ حمید کو تنہا کیوں جانے دیا۔ مجبوراً ہوٹل واپس آیا۔ رضیہ پوچھنے لگی "اتنی دیر کہاں رہے؟" میری زبان سے یہ جواب نکل گیا کہ "حمید بھی میرے ساتھ تم لوگوں کے استقبال کے لئے آیا تھا۔ وہ معلوم نہیں

کدھر غائب ہوگیا۔ رضیہ کے شوہر بھی سامنے تھے۔ وہ تعجب کرنے لگے۔ رضیہ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو پہلے تو وہ بے ساختہ چلّا اٹھی "ہائیں"۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے کو سنبھالا۔ پھر اس نے مسکرا کر کہا "وہ بچے تو ہیں نہیں کہ کوئی اٹھالے جائے۔ شام تک آہی جائیں گے"۔
شام ہوگئی رات کے آٹھ بج گئے مگر وہ نہ آیا۔ میں بہت پریشان تھا۔ میرا دماغ اس وقت کچھ کام نہ کرسکا۔ میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا ہوا تھا کہ رضیہ آئی اور پوچھنے لگی۔

"بھیا! حمید صاحب نے جہاز پر آپ سے کیا کہا تھا؟"

"پھول کے ہار انھوں نے ہی خریدے تھے۔ مجھے ہار دے کر انھوں نے کہا کہ تم دونوں کو پہنا دو۔ میں نے جب پوچھا کہ کیوں تم کیوں نہیں آتے۔ وہ کہنے لگا نہیں یہ بعد کو بتاؤں گا۔ تم جلدی جاؤ۔ وہ لوگ آرہے ہیں"۔

رضیہ خاموش کھڑی سن رہی تھی۔ اس نے پوچھا "اور بھی کچھ کہا؟"

"ہاں یہ بھی کہا کہ میرے آنے کی اطلاع رضیہ کو نہ دینا"

رضیہ اب کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ اس نے کہا "بھیا آپ نے غلطی کی جو اُن کو تنہا چھوڑ دیا۔ آپ اُن کے دوست ہوکر بھی ان کو نہ سمجھ سکے..." رضیہ نے اِن الفاظ کو کچھ اس طرز میں ادا کیا کہ مجھ پر رقت سی طاری ہوگئی۔ وہ میرے لئے تازیانے تھے۔ غیر ارادی طور پر میری آنکھوں سے آنسو نکل گئے۔ تھوڑی دیر رضیہ خاموش رہی۔ پھر اس نے زبان کھولی۔ "بھیا! اب کسی طرح حمید کو ڈھونڈھ نکالنا چاہیئے!!"

میں نے رات میں چوپاٹی، اپالو، ملابار ہل غرض ہر جگہ اس کو ڈھونڈ ڈالا۔ حمید کا کہیں پتہ نہ تھا۔ دوسرے روز اخبار میں انعامی اشتہار بھی دیے۔ تین دن گزر گئے مگر اس کی خبر نہ ملنی تھی نہ ملی۔ رضیہ کے شوہر حیدرآباد چلنے بے تاب تھے مگر رضیہ نے انہیں روک رکھا۔ اس نے اپنی طرف سے پانچ ہزار روپے کا اعلان کیا کہ کوئی حمید کا پتہ لادے۔ لیکن حمید کا کہیں پتہ نہ تھا۔

میرے لئے رضیہ کا طرزِ عمل بھی بہت حیرت انگیز تھا۔ وہ اپنے شوہر کے سامنے تو خوش رہتی لیکن تنہائی میں میں نے اسے روتے دیکھا ہے۔ کوئی پندرہ روز کی ناکام تلاش کے بعد ہم لوگ حیدرآباد آئے۔ اب رضیہ کی فطرت کا مطالعہ میرے لئے دلچسپ تھا۔ اس کے شوہر کا خیال تھا کہ رضیہ میں پہلی سی خوش مزاجی اور خوش طبعی نہیں رہی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کا زخم ہماری محدود نظر سے دور ہے۔ اس کے تبسم میں درد ہے۔ مسکراہٹ میں کرب ہے جس نے اس کی زندگی کی ساری عمارت کو ہلا دیا ہے۔

ایک شام کو رضیہ کے شوہر میرے پاس آکر کہنے لگے "مجھے آج ایک ضروری کام پر جانا ہے۔ رضیہ سے عثمان ساگر چلنے کا وعدہ تھا۔ میں نہیں آسکوں گا۔ تم رضیہ کو لے جاؤ اس کی طبیعت بہل جائے گی"۔
ہم لوگ عثمان ساگر پہنچے۔ اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے کہ چاند نکل آیا۔ ہم لوگ اسی مقام پر جاکر بیٹھ گئے جہاں حمید نے اپنے انمول آنسو میرے دامن پر گرائے تھے..... ..... مجھے وہ بے ساختہ یاد آگیا .... رضیہ کی بچی کھیل رہی تھی ...... رضیہ نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا
"بھیا! میری بچی کو دیکھو"۔ تھوڑی دیر وہ خاموش رہی۔ پھر کہنے لگی "میں نے اِس کا نام حمیدہ رکھا ہے بھیا!!" اس نے یہ کہا اور اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا کر میری طرف جُھکی اور میری گود میں گر پڑی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ رضیہ پر رقت طاری ہے۔ چند گرم گرم آنسو میری گود میں گرے........ شاید حمید اور رضیہ کا ملاپ انہی آنسوؤں سے ہوا۔

حفیظ صدّیقی

صحتِ عامّہ اور پبلک کے فرائض

"روک تھام علاج سے بہتر ہے۔ خدا پرستی کے بعد پاکی اور صفائی کا درجہ ہے"۔ یہ اور اس قسم کی کہاوتیں دنیا کی ہر زبان میں پائی جاتی ہیں لیکن آج ایک جاپان کو چھوڑ کر تمام ایشیا ناقابلِ انسداد بیماریوں کا گھر بنا ہوا ہے۔ ہندستان جو اکثر معاملات میں دوسروں سے پیچھے ہے، اس سے یہ توقع کب کی جاسکتی ہے کہ بیماریوں کی روک تھام کے معاملے میں اوروں سے آگے رہے گا۔ اِن حالات میں ریاست حیدرآباد جہاں چھوٹے پیمانے پر ہندستان ہی کا نقشہ نظر آتا ہے، بیماریوں کی زد سے نہ تو بچ سکتی ہے اور نہ ان کی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ ہوسکتی ہے۔ میرے نزدیک اِس صورتِ حال کے دو اہم اسباب ہیں ایک تو یہاں کے باشندوں کا اعتقاد کہ بیماری مِن جانبِ اللہ ہوتی ہے، اِس لئے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں میں مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت ایک سرے سے گم ہے۔ اس لئے انھیں سمجھانے کی ضرورت ہے کہ عام طور پر بیماریاں کس طرح پھیلتی اور گھر کرلیتی ہیں۔ مثلاً زید بیماری اور موت کے خطرے سے بچ نہیں سکتا جب تک کہ اس کے پڑوسی بیمار بکر کی دیکھ بھال نہ ہو۔ اور اس کے مرض کا ازالہ نہ کیا جائے۔ اس مسئلہ کی اہمیت اور اس کی وسعت کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوگا جب کہ ہم یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین کرلیں کہ پڑوس کے جدید تصور میں محض وہ شخص ہی نہیں آتا جس کا گھر ہمارے گھر سے ملا ہوا ہو بلکہ اس ہمسائگی یا پڑوس کی تعریف میں ایسے تمام لوگ آجاتے ہیں جو ہم سے ہزاروں میل دور ہیں۔ آمد و رفت اور دیگر وسائل کی بڑھتی ہوئی ترقی اور تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ نہ صرف بیماریوں کی خبریں بلکہ خود بیماریاں بھی آن کی آن میں دور دور تک پھیل جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تقدیر کے قائل اور "بڑی بوڑھیوں" کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ ان کے زمانے میں بیماریاں اس قدر عام نہیں تھیں۔

اس تمہید کے بعد میں ان بیماریوں کی کچھ حقیقت بیان کروں گا۔ جن میں ہم اکثر مبتلا ہوا کرتے ہیں۔ بیماریوں کے تین بڑے اور بنیادی سبب ہیں۔ ہمارے آبا، خود ہم۔ اور ہمارا پڑوس۔ آبائی بیماریوں کا ازالہ بتدریج ہوسکتا ہے اور یہ ہمارے بس کی بات ہے بشرطیکہ شادی بیاہ کے معاملے میں ہم سوچ سمجھ کر اپنی مرضی سے کام لیں۔ یا ایک صورت اور بھی ہوسکتی ہے کہ شادی بیاہ کرنے والوں کو ازروئے قانون مجبور کیا جائے کہ فریقین بیاہ سے پہلے طبی معائنہ اور اپنی ازدواجی اہلیت اور موزونیت کی تصدیق کرالیں۔

دوسری بیماریاں وہ ہیں جو خطا کار فریقین کی ذات سے وابستہ اور مخصوص ہوتی ہیں۔ یہ تمام روگ گندگی یا کھانے پینے اور جنسی بے اعتدالیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں یہ بیماریاں میری اس نشری تقریر کے موضوع سے خارج ہوں گی۔ اس لئے کہ ان کی روک تھام ان لوگوں کے اپنے بس کی بات ہے جو اپنی زندگی میں صفائی، سرگرمی اور اعتدال کو ملحوظ رکھتے ہیں

اب میں ان بیماریوں کا ذکر کروں گا جو میری اِس تقریر کے موضوع کے اندر آتی ہیں یہ وہ بیماریاں ہیں جو ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل ہوسکتی ہیں۔ اور ہوتی بھی ہیں۔ اور صحت عامّہ کو متاثر کرتی ہیں۔ یہ انسانی جسم کے مختلف حصوں کو لاحق ہوتی ہیں۔ اور مختلف طریقوں پر مختلف وسیلوں سے پھیلتی ہیں۔ ان میں ایک تو وہ بیماریاں ہیں جو نظامِ تنفس (یعنی ہوا کی نالیوں اور پھیپڑوں) سے متعلق ہیں۔ ان میں سب سے عام انفلوئنزا یا معمولی زکام ہے۔ دیکھنے کو یہ ایک ادنیٰ سی شکایت ہے لیکن اس سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوسکتی ہیں جو بڑھ کر نہ صرف ایک خاندان بلکہ تمام محلے اور بعض اوقات دنیا کے ایک بڑے حصے کو مصیبت میں ڈال سکتی ہیں۔ جیسا کہ ۱۹۱۸ء کی وبا کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے۔ ان پیچیدگیوں سے بعض اوقات نہایت قبیح اور مہلک روگ بھی لگ سکتا ہے۔ مثلاً نمونیا۔ اور دل کے امراض جن کے عام طور پر بوڑھے اور ادھیڑ لوگ شکار

ہوتے ہیں۔ پھیپھڑے کی بیماریوں میں سب سے زیادہ موذی دِق کی بیماری ہے۔ حیدرآباد اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں اِس مرض کی اشاعت کے خطرناک امکانات نظر آرہے ہیں۔ اس بیماری کے پیدا ہونے اور پھیلنے کے بہتیرے عوامل ہیں جس میں خاص کر گرد و غبار، جہالت اور ناداری قابلِ ذکر ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کو کافی اور اچھی غذا نہیں ملتی۔ ان کے جسم کمزور ہوجاتے ہیں۔ اور ان میں بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہتی۔ انگلستان میں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء کے درمیانی سالوں میں مختلف اسباب سے مرنے والوں کا فی صد نکالا گیا، تو اس کی رو سے ۵۴ دِق میں مبتلا پائے گئے۔ لیکن رہنے بسنے کے طریقوں، پاس پڑوس اور معیارِ زندگی کی سدھار کے بعد سنہ ۳۶ و ۳۷ عیسوی کے اعداد شمار میں دِق سے مرنے والوں کا فی صد گھٹ کر اٹھارہ ہوگیا۔

دوسری قسم میں وہ بیماریاں ہیں جن سے آنتیں متاثر ہوتی ہیں مثلاً محض ہین قسم کے کیڑوں کی پرورش جنھیں عام طور پر کیچوے کدو دانے اور کِرم کہتے ہیں یا ہیضہ، پیچش، میعادی بخار وغیرہ۔ شکر کا مقام ہے کہ حیدرآباد میں صاف پانی کے عام انتظام کی بدولت پورا شہر کِرمی امراض اور کالرا سے بڑی حد تک محفوظ ہوگیا ہے۔ لیکن پیچش اور میعادی بخار سے ابھی پیچھا نہیں چھوٹا۔ اِس لئے کہ بول و براز کو حفظانی اصول پر ٹھکانے لگانے، مکھیوں کو ہلاک کرنے، پاس پڑوس کو صاف رکھنے اور افرادِ خاندان میں ان مہلک امراض سے بچنے کا کافی احساس ہم میں پیدا نہیں ہوا۔ اب بھی ہمارے ہاں دکانوں اور بازاروں میں کھانے پینے کی چیزیں جس طرح عام طور پر بکا کرتی ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ یہ موذی بیماریاں زیادہ شدت کے ساتھ عام کیوں نہیں ہوتیں۔

تیسری قسم میں وہ بیماریاں ہیں جن کا دورانِ خون سے تعلق ہے مثلاً چیچک، خسرہ، کنکر پتھر، ملیریا اور پلیگ۔ جذام کا مرض بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ ٹیکے کے عام رواج کی وجہ چیچک میں بڑی حد تک گھٹاؤ پیدا ہوگیا ہے لیکن خسرے اور کنکر پتھر میں (گویہ اتنی موذی بیماریاں نہیں ہیں) کوئی قابلِ لحاظ کمی ابھی تک نہیں ہوئی۔ جذام کی طرف بھی خاص طریقوں سے اور مختلف تنظیموں کے ذریعے توجہ جاری ہے۔ لیکن کچھ تو اس مرض کی عام صورتِ حال اور ابتدائی مراحل میں بروقت تشخیص کی مشکلات اور پھر اس مرض کے لاعلاج ہونے کے بارے میں ایک عام مگر غلط اعتقاد کی وجہ سے اس مرض کے استیصال میں بھی دشواریاں لاحق ہیں۔ موش کشی کی مہم میں عوام کے تعاون اور مشتبہ اور متاثرہ مکانوں کی صفائی اور "ڈِس انفکشن" کی وجہ سے پلیگ کا خطرہ آہستہ آہستہ دور ہوتا جارہا ہے۔ البتہ اِس ذیل کی بیماریوں میں صرف ملیریا ہی ایسا مرض ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملک کا دوامی ٹھیکہ لے لیا ہے۔ ہر سال ہندستان میں کوئی دس لاکھ آدمی اس کا شکار ہوتے ہیں۔ اور کوئی بیس لاکھ سدا روگی رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اتنی ہی تعداد اُن لوگوں کی ہے جن کی پیشہ ورانہ کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ طاعون کے سلسلے میں جو ہے اور اس کے پسوؤں کو اور ملیریا کی حد تک اس کے مچھر اور متاثر مریض کی جانب ہمیں پوری توجہ کام میں لانے اور انسدادی تدابیر اختیار کرنے کی بہت ضرورت ہے۔

اِن عام بظاہر معمولی امراض کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کرنے کے بعد میں اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس طرح اس ریاست کے باشندوں کا ایک جائز حق یہ ہے کہ وہ حکومت سے ہر چیز کا مطالبہ کریں جو بیماری سے بچنے اور صحت کو قائم رکھنے میں ان کی معاون ہو، اسی طرح حکومت کو بھی بجا طور پر حق حاصل ہوگا کہ عوام سے صحتِ عامہ کی پالیسی کی تفصیلات کو بروئے کار لانے میں فردی تعاون اور اشتراکِ عمل کی توقع رکھے اس لئے کہ اِس قسم کے تعاون اور باہمی مدد کے بغیر صحتِ عامہ سے متعلق کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی۔ عوام اس قسم کی مدد اس وقت تک مفید اور دانشمندانہ طریقے پر نہیں دے سکتے جب تک وہ اس امر کا بخوبی احساس نہ کرلیں کہ ایک شخص کی خرابیِ صحت کئی ایک افراد کی خرابیِ صحت کا

باعث بن سکتی ہے۔ اور یہ کہ جب تک ایک بیماری کو شروع ہی میں بڑھنے سے روکا نہ جائے تو ہزاروں انسان مصیبت اور تکلیف میں مبتلا ہوں گے لہٰذا ہمیں صرف اپنی ذات یا اپنے گھر کی صحت اور سلامتی پر نظر نہ رکھنی چاہئے بلکہ اس محلہ کا بھی خیال رکھنا چاہئے جہاں ہم رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ معمولی سمجھ کے انسان کے لئے بھی یہ تصور کرنا کچھ مشکل نہیں کہ اس قسم کا احساس بنیاد ہے "ریاستی صحت عامہ" کی اس استدلال کے بموجب دوسرا نمبر قومی صحت کا ہوگا۔ جو بہ آسانی ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ جب یہ حاصل ہو گیا تو پھر مانع امراض طب یا انسدادی تدابیر اور بین قومی صحت یا حفظانِ صحت کا تصور ایک آسان مسئلہ بن جاتا ہے۔ میرے نزدیک ایک کم سواد اور تنگ نظر شخص ہی طب اور خصوصاً انسدادی طب کو قومیت سے غلط طور پر خلط ملط کرے گا۔ مہذب ممالک میں حکومت اور عوام انسدادی طب کو پروان چڑھانے اور دنیا کے تمام ملکوں کے ساتھ تعاون کر کے بیماریوں کا سدّباب کرنے میں کوشاں ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہندوالے اور خصوصاً اس ریاست کے باشندے صحت عامہ کے اس ہمہ گیر تصوّر سے کوسوں دور ہیں۔ یہ صورتِ حال اس لئے ہے کہ انسدادی طب اور مانع امراض تدابیر سے یہاں کی آبادی کو جس کی بڑی تعداد اَن پڑھ اور جاہل ہے آشنا کرانے کے ذرائع ہمارے پاس مفقود ہیں۔

اب آخر میں میں اِن امور کا ذکر کرتا ہوں جن کا بجا طور پر حکومت سے مطالبہ کرنے کا پبلک کو حق حاصل ہے۔

۱۔ دواؤں، ٹیکوں، ڈِس اِنفکشن کے سامان اور قرنطینوں کے ذریعے بعض امراض کے پھوٹ پڑنے اور پھیلنے کا مناسب انسداد۔

۲۔ ایسے ذرائع اور وسائل کا اختیار کرنا جن سے حادثات اور بیماریوں کے امکانات بہت کم ہو جائیں اور بصورت علالت تکالیف اور (تا بہ امکان) اموات کا سدّباب ہو جائے۔

۳۔ کافی مقدار میں صاف پانی پینے اور برتنے کے لئے مہیا کرنا۔

۴۔ مختص اداروں اور محکمہ جات کے ذریعہ کھانے پینے کے تمام اشیاء اور خصوصاً دودھ، ترکاریوں اور میووں پر پوری پوری نگرانی۔

۵۔ جدید طریقوں پر بول و براز کے فوری اور مناسب طور پر ٹھکانے لگانے کے سامان مہیا کئے جائیں۔

۶۔ غیر حفظانی حالات کے دفعیئے کے لئے جدید اصولوں پر تعمیر امکنہ اور بلدو کے انتظامات۔

۷۔ طلبہ کے لئے ذاتی اور عمومی حفظ صحت کے اصول کی تعلیم و تربیت۔

۸۔ خرابیٔ صحت اور اموات کے باقاعدہ رجسٹر اور اعداد شمار کی ترتیب اور پبلک کے استفادہ کی غرض سے ان کے تجزیہ کی وقتاً فوقتاً اشاعت۔

معمولی سی معمولی عقل رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ متذکرۂ بالا امور کی ترتیب اور فراہمی میں کسی حکومت کو عوام کے تعاون کے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اِن امور کا بھی ذکر ضروری ہے جن کی حکومت کو آپ سے توقع رکھنی چاہئے۔ اور جن پر آپ کی ذاتی اور عمومی فلاح کا انحصار ہے۔

۱۔ یاد رکھئے کہ تازہ ہوا اور دھوپ بیماریوں سے محفوظ رہنے کے معاملے میں آپ کی بہترین ضامن ہے۔ پھر یہ کہ قدرت کے یہ عطیے آپ کو مفت ملتے ہیں۔

۲۔ اِس حقیقت کو نہ بھولئے کہ ماں کا دودھ بچے کے لئے بہترین غذا ہے۔ اگر اس کے اتنا دودھ ہے کہ بچے کو کافی ہو جائے تو اسے شکر کرنا چاہئے۔ جلدی سے یہ نہ فرض کر لینا چاہئے کہ اس کا دودھ کافی نہیں ہے۔

۳۔ کسی صورت میں یہ گوارا نہ کیجئے کہ کسی مقام پر غلاظت یا فضلہ پڑا رہے۔

۴۔ حکومت کے قریب ترین ادارے کو کسی بیماری کی فوری رپورٹ کیجئے۔ خصوصاً ایسی بیماری کی جس کے پھیلنے اور دوسروں کو متاثر کرنے کا اِمکان ہو اور جو مشورے دئے جائیں ان سے پورا فائدہ اٹھائیے اس کے ساتھ ساتھ ترغیب اور مشورے سے اپنے احباب اور عزیزوں کو جو بظاہر ہچکچاتے ہوں دباؤ ڈال کر کاربند ہونے پر مجبور کیجئے۔ اس ضمن میں اسپتالوں، تیمار خانوں اور بہبودی کے

مراکز سے پورا پورا فائدہ اٹھائیے۔

۵۔ پانی کو ضائع نہ کیجئے اور پانی کی صفائی کو اس کے سوتے سے لے کر صراحی اور گلاس تک کسی قسم کی آلائش سے مکدر ہونے نہ دیجئے۔

۶۔ پھیری والوں سے جو کھانے پینے کی مشتبہ اور کھلی ہوئی چیزیں بیچتے ہوئے نظر آئیں، کبھی کوئی چیز نہ خریدئیے۔

۷۔ پرانی وضع کے بیت الخلاء یا کھلے ہوئے مقامات میں رفع حاجت کے بعد فضلہ کو مٹی، ریت یا راکھ سے ڈھک دیا کرو۔ اس سے مکھیوں کے ذریعے بیماری کے پھیلنے کا انسداد ہو جائے گا۔

میری اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ آپ اپنی صحت کے مسئلے سے دلچسپی پیدا کریں جو شخص زندگی اچھی طرح بسر کرتا ہے، اسے موت کا دھڑکا نہیں ہوتا۔ ایسے شخص کے لئے موت جب کبھی آتی ہے تو وہ بقول ٹیگور "موت کا استقبال کرتا ہے اس لئے کہ موت اس کے سامنے ایک مہمان عزیز کی طرح آتی ہے ایک فاتح بن کر اس کے گھر میں نہیں گھستی"

لطیف سعید
(لاسلکی نشر گاہ حیدرآباد سے پڑھا گیا)

پانی کی کہانی

اس میں پانی ہی سے اس کی کہانی لکھوائی گئی ہے جو پڑھنے والے کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رکھتی ہے۔ پانی کے فائدے نقصانات، استعمال کے طریقے، اس کی بناوٹ اور شکلیں غرض ہر پہلو پر تفصیلی معلومات اور تصاویر درج ہیں۔

از مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے۔ ڈپ ایڈ صفحات (۵۲) قیمت صرف ۶ر

جنون و شوق

آزاد ہیں جنونِ خرد کے اثر سے ہم
یعنی کہ بے نیاز ہیں شام و سحر سے ہم

وارفتگیٔ شوق کے قربان جائیے
آگے نکل چکے ہیں بہت راہبر سے ہم

رکھتے ہیں آشیاں کی بِنا دیکھ اے فلک
پھر کھیلتے ہیں شوخیٔ برق و شرر سے ہم

پھر بھی اسیرِ دامِ تصور ہیں اے ندیم
واقف ہیں گرچہ زندگیٔ مختصر سے ہم

کنجِ قفس میں تیری تسلی کا شکریہ
پہلے سے آشنا ہیں غمِ رہ گذر سے ہم

اے چرخ اہلِ شوق کی پرواز دیکھنا
آگے بہت ہیں منزلِ شمس و قمر سے ہم

اب ہم پہ رازِ ہستیٔ فانی کھلا ظفر
آزاد جب کہ ہوگئے قیدِ نظر سے ہم

ظفر (عثمانیہ)

کنول

مشکل سے میں نے چھ دن اپنے وطن میں بسر کئے گاؤں کی غیر مانوس فضا میرے لئے کوئی دلچسپی کا سامان مہیا نہ کر سکی اور میں سوچنے لگا کہ بقیہ چوبیس دن یہاں کس طرح اور کن دلچسپیوں میں بسر کر سکتا ہوں جب کہ یہاں میرا کوئی ساتھی ہے اور نہ ہم خیال، والد دن بھر اپنے زراعتی کاروبار میں لگے رہتے، میرا اکثر وقت اپنے باغ والے کمرے میں بیٹھے ہوئے مطالعہ کرنے میں کٹ جاتا یا کبھی افسانہ لکھنے میں صرف ہو جاتا، البتہ شام کے فرحت افزا لمحات میں میں ندی کے کنارے ٹہلنے کے لئے نکل جاتا، جہاں ہمارے کھیت واقع ہیں، کئی مزدور یہاں کام کرتے ہوئے نظر آتے، یہ لوگ کتنے محنتی جفاکش اور تنومند ہوتے ہیں، ان کی زندگی کتنی پرسکون معلوم ہوتی ہے، یہ مجھے شہر کی ہنگامہ خیزیوں سے دور دیہات میں آکر ہی معلوم ہوا۔ اور ایک حد تک ان سے ہمدردی بھی پیدا ہو گئی۔

ایک خوبصورت مختصر سا باغ ہمارے مکان کا احاطہ کئے ہوئے تھا، جس کا تنہا نگراں کار ہمارا قدیم بڈھا ملازم موتی تھا یہ اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں باغ کے ایک گوشہ میں مقیم تھا۔ جب سے میں یہاں مقیم ہوں، موتی ہر روز ایک خوبصورت گلدستہ بنا کر میرے لکھنے کی میز پر رکھ دیا کرتا، میں نے اسے انعام کی صورت میں اپنا ایک کوٹ دے دیا تھا، جس کو وہ شکریہ کے ساتھ خاص موقعوں پر پہننے کے لئے رکھ لیا تھا۔ . . ــــــــــــ

ایک دن جب میں سو کر اپنے بستر سے اٹھا تو غیر معمولی اپنی میز پر گلدستہ نہ پا کر مجھے تشویش سی ہوئی لیکن ناشتے پر مجھے والدہ کی زبانی موتی کی علالت کی کیفیت معلوم ہو کر یہ تشویش دور ہو گئی ناشتے سے فارغ ہو کر میں اس کے جھونپڑے کی طرف گیا، مالی بستر پر پڑا کراہ رہا تھا کنول! میں نے اس کی لڑکی کو مخاطب کیا، جو چولھے کے پاس بیٹھی ہوئی روٹی پکا رہی تھی، بخار کب سے آیا ہے ــــــــــ

"سرکار"۔ اس نے کہا۔ "رات کے کھانے کے بعد سے بخار چڑھا ہے"۔

"پھر دوا" میں نے موتی کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار دیکھا، حرارت تھی اس وقت بھی ہے "بڑے سرکار نے حکیم جی کو بلایا ہے، اب آتے ہی ہوں گے" "کچھ کھایا بھی ہے اس نے"۔ "ایک کھیل بھی کل سے منہ میں نہیں گئی"۔

"ارے، غذا کے بغیر توانائی کیسے آئے گی، تم ابھی اسے اٹھا کر دودھ اور نرم پکے ہوئے چاول کھلا دینا"۔ یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اور کوئی کتاب دیکھنے لگا مشکل سے چند لمحے گزرے ہوں گے کنول میرے کمرے کے باہر کھڑی ہوئی نظر آئی۔ کیوں؟ کیا بات ہے کنول" "سرکار! بابو کھانا نہیں کھا رہے ہیں"۔ "تو چل، میں ابھی آتا ہوں" کتاب کو میز پر رکھ کر میں اس کے پیچھے چلا۔ "موتی! تم کھانے کے لئے کیوں ضد کر رہے ہو"۔ "سرکار" اس نے منہ بنا کر کہا، جیسے اسے کوئی تکلیف ہے، کھایا نہیں جاتا۔ "پھر بیماری کیسے جائے گی، تھوڑا سا کھا لو، نہ لانے چاہا تو دو روز میں تمہارا بخار اتر جائے گا"۔ "بابو، اس کی لڑکی نے منت کے ساتھ کہا" سرکار کے کہنے پر تو دو نوالے کھا لو"۔

بڈھا مالی طوعاً و کرہاً میرے کہنے پر کچھ کھا پیا اور میں اسے اپنے پاس کی کونین کی گولی کھلا کر وہاں سے لوٹا۔ دو تین دن میں موتی کا بخار اتر گیا، مگر نقاہت کچھ کچھ باقی رہی، والد نے اسے ایک ہفتے کی چھٹی دے دی، اور اس کی جگہ ہمارا دوسرا ملازم کام کرنے لگا

ایک دن شام کی تفریح کے لئے گھر سے نکلا، موتی کے جھونپڑے کے قریب سے گزر رہا تھا، اس نے آواز دی، میں اس کے پاس پہنچا۔ کیا حالت ہے تمہاری۔ سرکار کی مہربانی ہے ــ ارے تم شرمندہ کر رہے ہو، خدا سب پر مہربان ہے "ہاں مالک" خیر تم اب اچھے ہو جاؤ اور ہمارے لئے ویسے ہی خوبصورت گلدستے بنایا کرو، اس کے بغیر ہمارا کمرہ بے رونق سا معلوم ہوتا ہے۔ سرکار۔ اس نے شرمندگی سے کہا، مجھے تو اس کا خیال ہی نہیں رہا۔ نہیں کوئی بات نہیں۔ تم جو بیمار تھے۔

اس عرصے میں کنول سر پر پانی کا گھڑا لے آئی، اس نے مجھے دیکھا، اور نظریں نیچے جھک گئیں، میں وہاں سے نکل کر تفریح کے لئے ندی پر پہونچا، اور وہاں بہت دیر گئے گھر پہونچا۔ دوسرے دن صبح میں بیدار ہوا، پھولوں کی خوش بو سے میرا دماغ مہک اٹھا۔ ارے میری زبان سے تعجب کا کلمہ نکلا۔ یہ گلدستہ یہاں کس نے رکھا، شاید۔ موتی نے۔ لیکن اتنا اچھا جاذب نظر۔ شاید اس کی لڑکی کنول نے بنایا ہو۔ یہ گلدستہ مجھے اتنا پسند آیا کہ میں ناشتے سے فارغ ہو کر ڈرائنگ کا غذ اور قلم لے کر میز پر بیٹھ گیا، اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی محنت کے بعد میں نے ان پھولوں کو کاغذ میں جذب کر لیا۔ پھر اسے ایک معمولی فریم میں جڑ کر اپنے کمرے میں آویزاں کر دیا، آج کا تمام دن میں نے یہ دلچسپ مشغلہ جاری رکھا، مجھے ایسا کرنے میں ایک خاص قسم کی مسرت محسوس ہونے لگی،

دوسرے دن میں علی الصباح اپنے کمرے سے باہر نکلا، میرے کمرے کے قریب گلاب کے جھنڈ کے پاس مجھے کنول کھڑی ہوئی ملی۔ اس وقت وہ مجھے بہت اچھی لڑکی معلوم ہو رہی تھی، اس کا ملیح حسن، اور اٹھتی ہوئی جوانی نے حد درجہ اسے دلکش بنا دیا تھا۔ "کنول تم یہاں کیا کر رہی ہو"۔ "آپ کے گلدستے کے لئے پھول" اس نے لجائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، اوہ۔ میرے لئے۔ کل کا گلدستہ تم نے بنایا تھا۔ آپ کو پسند آیا۔ کیوں نہیں، تم نے جو بنایا وہ چپ ہو گئی۔ کتنے پیارے پھول ہیں، اور اس سے زیادہ حسین تمہارے نازک ہاتھ، کنول شرما گئی۔ وہ گلاب کے پھول توڑنے میں مصروف ہو گئی۔ اور میں وہاں سے نکل کر تفریح کے لئے روانہ ہوا۔

واپسی پر والد میرے منتظر تھے کوئی انگریزی لفافہ ان کے ہاتھ میں تھا، کل ڈپٹی صاحب، یہاں آ رہے ہیں میں نے انگریزی لفافہ کا مفہوم بیان کیا مکمر بیٹے" والد نے ذرا متفکرانہ انداز میں دریافت کیا، وہی، ہمارے مقدمہ کے سلسلے میں، جو نمبردار اور ہمارے مابین چل رہا ہے، والد کچھ پریشان سے نظر آنے لگے، میں نے انھیں اطمینان دلایا کہ سارے معاملات نبٹ

لوں گا، دوسرے دن ڈپٹی صاحب پہونچ گئے، ان کے ہمراہ ان کی لڑکی اور چھوٹا لڑکا تھا، ان کا پڑاؤ ہمارے ہی باغ میں ڈالا گیا تھا، والد کے ہمراہ میں بھی ان سے ملنے گیا، آدمی خوش اخلاق، اور وضع دار تھے

دوسرے دن ندی کے پاس مجھ سے اتفاقیہ طور پر ڈپٹی صاحب کی لڑکی سے ملاقات ہوئی، یہ بھی اپنے باپ کی طرح بلند و پاکیزہ جذبات کی مالک، اور حسین و جمیل لڑکی تھی۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے عرصے میں ہم کافی متعارف ہو چکے، واپس وہ میرے ساتھ کمرے تک آئی یہاں کنول میرے کمرے میں گلدستہ میں پھول لگا رہی تھی۔ یہ کون لڑکی ہے؟ ڈپٹی صاحب کی لڑکی نے دریافت کیا، یہ ہمارے مالی کی لڑکی کنول اوہ اس نے مسکرا کر کہا، تب تو آپ کو ہر روز تازہ تازہ خوبصورت پھول ملتے ہیں، جی ہاں۔ گاؤں کی فضا میں اور کیا رکھا ہے، چپراسی کے ذریعے اطلاع ملنے پر کہ والد ہمارے کھانے کی میز پر انتظار کر رہے ہیں، ہم دونوں وہاں پہونچ گئے۔ دوسرے دن ہمارے مقدمہ کی کارروائی کا آغاز کیا گیا تھا، زمینات کا معائنہ ہوا۔ گواہوں کے بیانات لئے گئے، اور بالآخر ایک طرفہ کارروائی کی گئی۔ اب وہ اپنے مستقر لوٹ رہے تھے۔ ڈپٹی صاحب کی لڑکی نے، جس کا نام مجھے بعد کو معلوم ہوا، طلعت سلطانہ ہے۔ خواہش ظاہر کی کہ میرے کمرے میں جو گلدستہ بنا رکھا ہے، ویسا ہی خوش نما گلدستہ باغبان کی بیٹی سے بنوا کر دیجئے۔ میں نے فوراً لڑکی کو طلب کیا، وہ آئی، کنول! تم ہمارا ایک کام کرو گی۔ خاتون! تعلقدار صاحب کی لڑکی ہیں، ہاں سرکار۔ اس نے کچھ متانت کے لہجے میں کہا، اب یہ اپنے شہر جا رہی ہیں، تم ان کی خدمت میں ایک اچھا گلدستہ بنا کر پیش کرو، لیکن سرکار۔ اس نے کہا، اس وقت تازہ پھول کہاں سے میسر آئیں گے، کہیں سے لے آؤ۔ وہ بغیر کچھ کہے چلی گئی۔ آج یہ لڑکی کچھ اداس سی معلوم ہوتی ہے، ڈپٹی صاحب کی لڑکی نے اس کے جانے کے بعد کہا، شاید۔ مگر ہے تو بڑی اچھی لڑکی۔ میں بھی پسند کرتی ہوں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، مگر آپ کی

رقیب نہیں۔ شکریہ! میں نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا' اس اثنا میں کنول آگئی۔ کیا بنا لائی؟ سرکار! باغ میں کوئی پھول نہیں' خیر کوئی بات نہیں' بانو صاحبہ میں نے کہا' آپ شوق سے میرا گلدستہ لے جاسکتی ہیں۔ اگر کوئی خیال نہ فرمائیں۔ لیکن کنول درمیان میں بولی' آپ کے لئے'۔ تم دوسرا بنادینا۔ طلعت نے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا' اوں۔ وہ سرہلا کر چلتی بنی۔ ملازم کو میں نے گلدستہ لانے کے لئے بھیجا۔ وہ واپس آکر کہنے لگا۔ حضور وہاں کوئی گلدستہ نہیں۔ نہیں کیسے؟۔ میں طلعت کے ساتھ کمرے میں ہونچا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ واقعی گلدستہ میں ایک بھی پھول نہ تھا۔ آخر یہ پھول کہاں غائب ہوگئے۔ میں نے ملازم سے دریافت کیا" وہ رہے پھول!" طلعت نے انگلی کے اشارے سے دریچے کے باہر دکھا کر کہا' ارے یہاں کیسے؟۔ آپ کی مالن نے ڈال دئے ہوں گے۔ اُف۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے طلعت سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کبھی بہترین گلدستہ پیش کرنے کی عزت حاصل کی جائے گی' اور جب میں باپ بیٹی کو وداع کرکے اپنے کمرے میں آیا۔ کیا دیکھتا ہوں' گلدستہ میں تازہ تازہ پھول چن دئے گئے ہیں۔ واہ۔ یہ کنول بھی عجیب لڑکی ہے۔ آخر اس نے ایسا کیوں کیا کیوں اس نے ڈپٹی صاحب کی لڑکی کے لئے پھول فراہم نہیں کئے۔

میں نے فوراً کنول کو طلب کیا۔ یہ تمہاری کیا حرکت ہے کنول —

وہ خاموشی کے ساتھ کھڑی تھی۔ تم نے کیوں میرے حکم کی تعمیل نہیں کی میں نے دوبارہ اس سے دریافت کیا۔ پھر بھی وہ خاموش رہی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ ارے تم رو رہی ہو۔ میں نے کچھ ہمدردی کے ملے جلے لفظوں میں کہا۔ گویا دریا کا بند ٹوٹ گیا۔ آخر بات کیا ہے اس کے ہونٹ کپکپائے۔ سرکار' اس نے کہا' تم کسی کو اپنے پھول دینا نہیں چاہتیں۔ میں نے اس کے دل کی بات کہہ دی'۔ ہاں۔ شدت جذبات سے مغلوب ہوکر وہ بولی' میں تو صرف آپ کے لئے۔

میرے لئے کیوں؟۔ میں نے اس سے عجیب سوال کیا۔ آپ ہمارے سب کچھ ہیں۔ اوہ۔ یہ بات' آج دل کی بات ہونٹوں پر آگئی۔ اب تو ہر روز۔ میرے لئے' اچھے اچھے تازہ پھول آئیں گے" لیکن ڈپٹی صاحب کی لڑکی کے لئے نہیں"۔ اس نے شوخ لہجے میں کہا —

دن گزرتے گئے۔ کنول کی شادی ہوچکی۔ اور اب وہ ایک بچے کی ماں ہے' اس کا شوہر موتی کی جگہ کام کرتا ہے۔ اب بھی ہر روز کنول میرے لئے پھولوں کا گلدستہ بنا کر لاتی ہے' اگر اتفاق سے کوئی دوسرا اسے حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے تو وہ بری طرح بگڑ جاتی ہے بلکہ گلدستہ کے پھول چورا چورا کرکے بکھیر دیتی ہے۔ آہ۔ کنول بھی عجیب لڑکی ہے۔ خدا ہر کسی کو ایسی ہی مالن عطا کرے (آمین)

صابر کوسگوی

انوار

جناب علی اختر صاحب کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف اک کہنہ مشق اور پُرگو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر ان کی نظر بہت وسیع ہے ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر ان کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوش کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت سے اردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے

صفحات (۱۶۸) قیمت عہ

اِزدواجی زِندگی —— (ایک تنقیدی نظر)[۱]

زمانہ متغیر ہے ضروری نہیں کہ ایک چیز جو متقدمین میں مروج رہی ہو متاخرین میں بھی مستحسن ہے۔ مثال کے لئے شادی ہی کو لیجئے کہ شکسپیر کے زمانے میں یہ واجبات میں سے سمجھی جاتی تھی۔ اگر ہم اس کے تمام مصنفات کا بالاستیعاب مطالعہ کریں تو سوائے فالسٹاف (Falstaff) کے ایک بھی ایسا کردار نظر نہ آئے گا جو شادی کے خلاف ہو۔ مچ اڈو ایباؤٹ نتھنگ (Much Ado About Nothing) میں بینڈک (Benedick) اپنے کو صنف نازک کا دشمن کہتا ہے لیکن آخر میں زندگی کی کشمکش میں پڑ کر بیاٹرس (Beatrice) سے شادی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے لوز لیبر لاسٹ (Love's Labour Lost) میں بائرن (Byron) بھی شادی کو اپنا مطمح نظر قرار دیتا ہے۔ اسی طرح رومیو اینڈ جولیٹ (Romeo and Juliet) میں مرکیوشیو (Mercutio) باوجودیکہ ابتدا میں وہ بینڈک (Benedick) کا ہم خیال معلوم ہوتا ہے اور شادی کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے تاہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر وہ ٹائیبلٹ (Tybalt) کے ہاتھوں قتل نہ کر دیا گیا ہوتا تو اپنے نظریہ کو تبدیل کر کے دنیاوی زندگی میں ضرور شامل ہو جاتا۔ اوتھیلو (Othello) میں ایاگو (Iago) انسانی خوبیوں کو تکفیر و الحاد سے تعبیر کرتا ہے لیکن وہ بھی ایک شادی شدہ انسان کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور سب سے زیادہ حیرت خیز بات تو یہ ہے کہ وہ اِزدواجی زندگی کی اہم ترین منزلوں بغض و حسد، رفاقت و رقابت سے کما حقہٗ واقف نظر آتا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ ایز یو لائک اٹ (As you Like It) میں جیکوز (Jacques) اور کنگ لیر (King Lear) میں فول (Fool) شادی کے مخالف ہیں۔ لیکن اِن کی ناکتخدائی کا سبب اِزدواجی زندگی سے نفرت نہیں بلکہ اور اسباب ہیں جن کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ وہ مدت العمر غیر شادی شدہ رہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ شکسپیر کے زمانے میں تمایل جنسی سریع تر اور لطیف تر رہا ہے، مگر اس کی دلچسپیاں متاخرین کے کارناموں میں تلخیوں کا سرچشمہ بنی ہوئی ہیں۔ متاخرین شادی سے متنفر ہی نہیں بلکہ اس سے خائف بھی ہیں۔ وہ اس کی طرف بڑھتے ہیں لیکن دل کی دھڑکن، قدموں کی لغزش اور دست و بازو کا رعشہ مانع ہوتا ہے۔ اس اِرتعاشی کیفیت میں ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شادی ان کے لئے ایک شکنجہ ہے، ایک جال ہے جو اُن کی آزادی و مطلق العنانی کو سلب کرے گا۔ مشہور ناول میتر گیورن (Maitre Guer...) میں سیسائل (Cecile) کے سوال کرنے پر آرتھر (Arthur) موت کو شادی پر ترجیح دیتا ہے اور کہتا ہے کہ خودکشی بہتر ہے شادی نہ کروں گا۔ بالزیک کے ناول بیاٹرے (Beatrix) میں میکسم ڈی ٹریلے (Maxime De Trailles) کسی کی شادی کو سن کر اتنا ہی متاسف و محزون ہوتا تھا جتنا کوئی اپنے عزیز کی خبر انتقال سن کر۔ یہ آخر کیوں؟ وجہ یہ ہے کہ متاخرین کے یہاں شادی کے نظریے مختلف ہیں۔ وہ شادی و موت کو مترادف سمجھتے ہیں اور شادی کو موت کی طرح ناگزیر سمجھتے ہوئے بھی تشویش و تفکر کا شکار بنے ہوتے ہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ ازدواجی

---

[۱] یہ مضمون R. L. Stevenson کی کتاب "Virginibus Puerisque" کے مقالۂ اول کا ترجمہ ہے

زندگی میں آرام ایک ایسا خواب ہے جو منت کش تعبیر نہیں ہو سکتا۔

یہ خیال کہ ازدواجی زندگی آرام دہ نہیں ہوتی بالکل غلط ہے۔ بفرض محال اگر شادی ایک ہیبتناک چیز ہے تو بغیر کسی ندیم و جلیس کے بڑھاپے کی زندگی اس سے بھی زیادہ ہیبتناک ہے۔ اگر یہ کہیں کہ بغیر شادی کے بھی دوستوں کی صحبت اور رنگینیاں ہمیں محظوظ و مسرور رکھ سکتی ہیں تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دوست و آشنا رفیقۂ حیات کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔ اولاً تو یہ کہ ان کی دوستی کا کیا اعتبار ممکن ہے ان میں سے ایک موت کی نذر ہو جائے دوسرا شادی کرے، تیسرا کہیں ملازم ہو کر چلا جائے، چوتھا کسی عورت کے عشق میں مبتلا ہو جائے اور پانچواں کسی مذہبی اختلاف کی وجہ سے انقطاع تعلق کرے۔ لہٰذا دوستی جب تک کہ وہ قائم ہے یقیناً بہت دلچسپ ہے لیکن اس کی بنیاد خام اور غیر مستقل ہے اور ہر لحظہ اس بات کا اندیشہ لگا رہتا ہے کہ اختلاف کا ہلکا سا تموّج ہمارے قصرِ لطف و محبت کو منہدم نہ کر دے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگرچہ شادی زمانۂ شیب و انحطاط کے مصائب و شدائد کے لئے تریاک کا اثر رکھتی ہے۔ تاہم ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ زن و شو کے باہمی تعلقات خوش نصیبی و خوش بختی کے ضامن ہو سکتے ہیں، ممکن ہے کہ دونوں کے اختلافِ مزاج اور اختلاف رائے سے سلسلۂ لطف و سرور منقطع ہو جائے؟ یہ قول کسی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن ہمیں ان دونوں باتوں میں سے کوئی نہ کوئی منتخب کرنی ہی پڑے گی۔ دوستوں کی دوستی کے مقابلے میں بیوی کے تعلقات پھر بھی زیادہ مستقل ہیں اس لئے کہ ازدواجی زندگی میں کم از کم ان تمام ممکنات سے دوچار ہونا نہیں پڑتا جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اور جب تک مقراضِ اجل رشتۂ حیات قطع نہ کر دے عموماً زن و شو کے تعلقات استوار ہی رہتے ہیں۔ بیوی دوستوں پر یوں بھی فضیلت رکھتی ہے کہ مزاج شناسی کے بعد وہ شوہر کا جزو زندگی بن جاتی ہے اور ابتداً آپس میں قدرے اختلاف کے باوجود زمانہ دونوں میں ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے اور وہ ایک دوسرے میں جذب ہو کر زندگی کو لطف و محبت کا نمونہ بنا دیتے ہیں۔

شادی اپنی صفتوں اور خوبیوں کے ساتھ ساتھ مردوں میں عیوب و نقائص بھی پیدا کر دیتی ہے۔ یہ ہماری شجاعانہ اسپرٹ کو فنا کر دیتی ہے۔ یہ ہمارے بلند اخلاقیات و جذبۂ حریّت و اُخوت کو زائل کر کے ہماری وسعت نظر کو محض خانگی زندگی تک محدود کر دیتی ہے۔ اس کی ذمہ داریاں ہمیں پابند و بزدل کر دیتی ہیں اور ہماری پیش بندیاں و منصوبے ہمارے خیالات کے قطعاً مطیع نہیں رہ جاتے۔ مثال کے لئے جارج ایلیٹ (George Eliot) کے مشہور ناول مڈل مارچ (Middle march) میں لیڈگیٹ Lydgate اور لیڈس لا (Ladislaw) کو دیکھئے کہ شادی سے قبل دونوں نہایت حوصلہ مند، مخیر اور شجاع جوان تھے جن کا نظریۂ زندگی محض خدمتِ خلق تھا لیکن شادی ہو جانے کے بعد وہ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ ان کے پیروں میں بیڑیاں پڑ گئی ہیں اور ان کے پہلے ارادے فسخ ہو گئے ہیں۔ خانگی زندگی کی ہوائیں مرد کے حوصلوں کو پژمردہ کر کے عیش و عشرت کا ایسا عادی بنا دیتی ہے، کہ اسے دنیا میں سوائے اپنی بیوی اور خاندان کی راحت کے کچھ نہیں سجھائی دیتا۔ شادی ہمیں دوستوں اور سوسائٹی کے مصرف کا بھی نہیں رکھتی۔ اگر کل تک ہم دوستوں میں گل چھرّے اڑاتے تھے اور دھادھند خرچ کرتے تھے تو آج پیسوں پر مہریں لگاتے ہیں۔ کل تک جذبۂ ایثار میں جان و مال سے دریغ نہیں کرتے تھے لیکن آج ہم ادامۂ نسل اور بقائے صحت کے لئے کوئی بلند ہمت کام نہیں کر سکتے۔ شادی سے ہم میں گھن لگ

جلتے ہیں اور باوجود سوسائٹی کے چھینٹوں کے ہماری روح ہرگز بیدار نہیں ہو سکتی۔ شادی کے انہیں بزدلانہ اثرات کا نتیجہ ہے کہ شجاعت وہمت کا مجسمہ ڈان کوِکس اوٹ (Don Quixote)[1] ناکتخدا پیش کیا گیا ہے اور شادی کی تلخیوں ہی کا ثمرہ ہے کہ مارکس اریلیاس (Marcus Aurelias)[2] اپنے زمانے کا بزرگترین فلسفی گزرا ہے۔ اگر ڈان کوِکس اوٹ (Don Quixote) شادی شدہ اور مارکس اریلیاس (Marcus Aurelias) کامیاب شوہر کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تو یقیناً دنیا اس بہادر اور اس فلسفی سے محروم رہتی اس لئے کہ ازدواجی زندگی شجاعانہ اسپرٹ اور فلسفیانہ جذبات کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی۔

شادی جہاں مردوں کے لئے مضر وہاں عورتوں کے لئے بے حد مفید ہے۔ یہ عورتوں کے جذبات عالیہ کو فنا نہیں کرتی بلکہ جلا کر کے عمدہ اور پاکتر بنا دیتی ہے۔ ان کی زندگی کا مستقبل نہایت شاندار ان کی آزادی میں اضافہ اور عزت و وقار میں زیادتی ہو جاتی ہے۔ عورت کو چاہے اچھا مرد ملے یا برا اسے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوتا ہے اور تھوڑے ہی زمانے میں وہ بہترین خدمت کے قابل بن جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ بعض عورتیں جن کے جذبات نہایت لطیف، جن کی محبت نہایت پاک اور جن کا ایثار نہایت گراں قدر رہا ہے اکثر و بیشتر وہ ہوتی ہیں جو ناکتخدا ہی رہی ہیں یا جن کی شادی پہ جبر ہوئی ہے اور ایسی صورت میں غیر شادی شدہ زندگی ان کے لئے بھی مفید ہے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ ہم قیاس بالعموم کثرت پر کرتے ہیں مستثنیات ہر چیز میں لازمی ہیں اور بآسانی نظر انداز کئے جا سکتے ہیں۔ عموماً شادی مردوں کے لئے مضر اور عورتوں کے لئے مفید ہی ہوتی ہے۔

ناظرین کو حیرت ہوگی کہ دنیا میں سیکڑوں شادیاں باوجود اختلاف رائے اور عدم حسن و ملاحت کے کامیاب ہوتی ہیں۔ اور زن و شو کے تعلقات مدت العمر قائم رہتے ہیں۔ اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ عورتیں احمق، کریہہ اور بدصورت مردوں سے بغیر سمجھے بوجھے عقد کر لیتی ہیں۔ اسی طرح مرد بدمزاج، جاہل اور غیر مہذب لڑکیوں سے، مگر دونوں آپس میں خوشی و محبت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ آخر اس کا کیا سبب ہے؟ اور انتخاب میں کونسا ایسا کلیہ مدِنظر ہوتا ہے جو دونوں میں تفرقہ اندازی نہیں کر سکتا؟ بعض کہیں گے کہ اِن شادیوں کی کامیابی کا سبب عشق ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام لغت میں اس لفظ سے زیادہ کوئی دوسرا لفظ اتنا غلط نہ استعمال ہوا ہوگا۔ بھلا عشق جیسی پاک و طاہر شے کو اِن دہقانیوں اور جاہلوں سے کیا نسبت؟ کیا وہ عشق کی کیفیات و مدارج کو بھی سمجھ سکتے ہیں؟ یقیناً اگر عشق کا معیار اسی قدر پست ہے تو شعراء و حکماء کا ابتدائے آفرینش سے یہ کہنا کہ "عشق ملکوتی ہے، عشق لاہوتی ہے" ہمیں سوائے دھوکے اور مغالطے میں ڈالنے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اصل واقعہ یوں ہے کہ جذبات کی ہم آہنگی اور طبیعت کی یکسانیت اِن تمام شادیوں کی کامیابی کی ذمہ دار ہے جسے ہم نے غلطی سے عشق کا مترادف سمجھ لیا ہے۔ اِن کے جذبات کی تشبیہہ محض اس سے ہو سکتی ہے کہ دسترخوان پر چند لوگ بیٹھے ہوں اور اس پر سے جو چیز ہم کو مرغوب ہو کوئی دوسرا اٹھا لے۔ اس سے ہمیں تکلیف تو ضرور ہوگی مگر بہت خفیف۔ بس یہی کنہ و حقیقت ان کے جذبات کی بھی ہے۔ اگر ہم ان کے چہروں کو بغور دیکھیں تو عشق کا

---

[1] اسپینی مصنف Cervantes کے مشہور ناول Don Quixote کا ہیرو جس کا نصب العین بہادرانہ اور شجاعانہ اقدامات تھے۔

[2] روم کا بادشاہ تھا جو فلسفیوں کی ایسی زندگی بسر کرتا تھا شادی کی دلچسپیوں سے محروم رہا اس لئے کہ اس کی فاسٹینا Faustina نامی بیوی بدچلن تھی اور کسی فوجی افسر سے ناجائز تعلقات رکھتی تھی۔

شائبہ بھی نہ پائیں گے ۔ یہی نہیں بلکہ شادی سے قبل اور بعد کبھی بھی وہ جانتے ہی نہیں کہ عشق کیا چیز ہے ۔ واقعات شاہد ہیں کہ شادیوں کی کامیابی کا مدار عشق پر نہیں ۔ مثلاً ایک مرد کسی کی بیوی کے عشق میں جان دے رہا تھا ۔ شوہر کو جب معلوم ہوا تو کہا کہ "شوق سے لے لیں دوسری کرلوں گا" کیا اسی کا نام عشق ہے ؟ ایک دوسرے شخص نے اپنی بیوی کے عشق پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ "جب اس کی سالیاں ساتھ ساتھ ہوتی ہیں تو اسے زیادہ لطف آتا ہے اور تنہا بیوی کی صحبت میں وہ حظ نہیں اٹھا سکتا" ایک تیسری بیاہی عورت نے شادی پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ "شادی کے دس برس بعد شوہر سے اس کی تمام دلچسپیاں ختم ہو گئیں" یہ تمام واقعات اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ نوے فیصدی شادیوں میں عشق کا لگاؤ بھی نہیں ہوتا ۔ لوگ شادیاں عشق کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ عورت کے کسی ذاتی حسن پر فریفتہ ہو کر ۔ شادی سے قبل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نسائی خوبیوں کی ایک فہرست اپنے دماغ میں بنالیتے ہیں اور اسی کو مدنظر رکھ کر شریک حیات تلاش کرتے ہیں ۔ ان لوگوں کی مثال بالکل ہناگاڈون (Hannah Godwin) ایسی ہے کہ اس نے اپنے بھائی ولیم (William) کی شادی کے وقت مس گے ہے (Miss Gay) کی صورت وسیرت کو بیان کرتے ہوئے یوں لکھا "مس گے (Miss Gay) ہر حیثیت سے تمہاری بہترین بیوی ہو سکتی ہے ۔ ظاہراً اس کی آواز شیریں اس کی خصلتیں پسندیدہ اور اطوار عمدہ ہیں وہ نہ بہت زیادہ تنہائی پسند اور نہ انتہا سے زیادہ آزاد ہے ۔ اس کی طبیعت بہت کفایت شعار اور مخیر ہے ۔ باطناً وہ اس سے بھی زیادہ اچھی ہے مزاج میں فہم و فراست کے باوجود تکبر نہیں ۔ دقیق النظر ہے اور عقائد مذہبی میں اتنا ہی درک وانہماک ہے جتنا کہ تم پسند کرتے ہو" اس خط سے بھی واضح ہوگیا ہوگا کہ شادی کی بنیاد عشق پر نہیں ہوتی بلکہ عورت کی کوئی ادا ایسی بھا جاتی ہے کہ شادی مدت العمر کامیاب رہتی ہے ۔

حقیقت امر یہ ہے کہ اگر ان شادیوں کی بنیاد عشق ہی پر ہوتی تو سیکڑوں بغیر شادی ہی کے رہتے اور ایک شادی بھی کامیاب نہ ہوسکتی ۔ عشق نہایت بلند، سریع و تیز جذبہ ہے وہ خانگی زندگی کی کامیابی کا ہرگز ضامن نہیں ہوسکتا ۔ شیر جنگل کا بادشاہ ہے وہ پالتو جانور کی طرح نہیں رکھا جاسکتا ۔ یہی حالت عشق کی بھی ہے ۔ تمام تیز جذبوں کی طرح اس کے بھی فائدے و نقصانات ہیں ۔ جہاں یہ بدترین نقائص کو دور کردیتا ہے وہاں بہترین خوبیوں کا بھی استیصال کردیتا ہے ۔ جس طرح شراب کی حالت میں لوگ سرشار و بدمست، یا جذبۂ مذہبی میں از خود رفتہ ہو جاتے ہیں اسی طرح ایماندار، پاک و صاف اور خوش طبع لوگ جذبۂ عشق میں متلون مزاج، حاسد اور درشت طبع ہو کر خانگی زندگی میں بالکل ناکارہ شوہر ثابت ہوتے ہیں ۔

ہم نے بھی دیکھا کہ شادی کی کامیابی کا سبب عشق ہرگز نہیں ۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اگر ہم میں مادۂ محبت موجود ہو تو ہم ہر عورت کے ساتھ باآسانی نباہ کرسکتے ہیں ۔ یہ قول بھی بالکل صحیح نہیں ۔ شادی کی کامیابی یقیناً کچھ قاعدوں کی پابند ہے ۔ جو ہماری مذہبی کتابوں میں بھی نہیں ملتے ۔ شرع و قانون ہم کو قریب ترین عزیز سے شادی کرنے کو منع کرتا ہے یا ان عزیزوں سے جو شادی کی وجہ سے قریب تر ہو گئے ہیں ۔ سوسائٹی کا نظریہ بھی شادی میں مختلف ہے ۔ ایک امیر کسی غریب سے شادی کرنے پر تیار نہ ہوگا لہٰذا ازدواجی زندگی کی کامیابی کے متعلق کچھ قواعد لکھے جاتے ہیں جو ممکن ہے

بالکل صحیح نہ ہوں تاہم بڑی حد تک جوان لڑکوں اور لڑکیوں کی دلچسپی اور فائدے سے خالی نہ ہوں گے اور انہیں سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ زندگی کیونکر خوش حال بنائی جا سکتی ہے۔

پہلی بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے اور رہنے سہنے میں زن و شو کے مذاق کی یکسانیت بہت ضروری ہے۔ غیر مذاق والے آپس میں اتحاد نہیں پیدا کر سکتے۔ ترکاری کھانے والا گوشت کھانے والے کے پلیٹ میں نہیں کھا سکتا۔ تڑکے اٹھنے والا دیر کو اٹھنے والے کا ہم بستر نہیں ہو سکتا۔ ہاں ذہنیت اور نظریۂ جمالیات میں اگر دو طبیعتیں متضاد ہوں تو بھی بسر ہو سکتی ہے مثلاً ایک شخص کسی زندہ دل و خوش طبع کے ساتھ خورد و نوش میں تکلف نہ کرے گا، چاہے وہ اس کی ذہانت اور خوش طبعی میں قطعاً حصہ نہ لے سکے۔ یوں ہی اگر ہماری بیوی فنی اعتبار سے کوئی دوسری چیز پسند کرے تو ہم کیوں آزردہ ہوں۔ اگر وہ ٹپر ([illegible])[1] کے مصنفات کی قدر کرتی ہے تو ہم کیوں منہ بنائیں؟ کوئی شکسپیر کو پسند کرتا لیکن دوسرا اس کی تصنیفیں بے وقت کی بکواس سمجھتا ہے مگر چونکہ پبلک شکسپیر کو استاد مانتی ہے۔ بے چارا اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اس کے کیا معنی اور وہ اپنی رائے کے اظہار میں کیوں رد کا جائے؟ ہر زمانے میں ایسے لوگ موجود رہتے ہیں جو شکسپیر کے خلاف رہے ہیں مثلاً میرا ہی ایک دوست جو فن صناعی میں کمال رکھتا تھا، جس کا مذاق سلیم تھا۔ وہ شکسپیر کو نظر حقارت سے دیکھتا تھا، اور کہا کرتا تھا کہ وہ ([illegible])[2] کو شکسپیر پر ترجیح دیتا ہے۔ بات پبلک کے خلاف ضرور ہے۔ لیکن اگر ایسی ہی بہادر اور نڈر چند ہستیاں اور پیدا ہو جائیں تو شکسپیر کی بہت کچھ صحیح تنقید ہمارے پیش نظر کی جا سکتی ہے۔ عورت بھی اپنی فنی معلومات کی عظمت قائم کرنا چاہتی ہے اور اس پر نہایت ضد و جسارت کے ساتھ نقد و تبصرہ کرتی رہتی ہے۔

دوسری بات جو ازدواجی زندگی میں قابل لحاظ ہے یہ کہ زن و شو میں مذہبی یا نظریۂ زندگی کا اختلاف نہایت مہلک ہے۔ جن میں یہ اختلاف ہوگا وہ اتفاق و اتحاد نہیں پیدا کر سکتے۔ ایک لاابالی مرد کسی ایسی عورت سے شادی نہ کرے جو اخلاقیات کی بہت بڑی حامی ہو۔ معقول انتخاب کی کمی عمدہ سے عمدہ لوگوں میں تفرقہ و کشیدگی پیدا کرا دیتی ہے۔ تیسری بات جو قابل توجہ ہے یہ کہ آپس میں میل و محبت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے زن و شو میں مزاج و قیافہ شناسی کا مادہ کافی زیادہ ہو تاکہ اختلاف اور وقتی نزاع کے باوجود دونوں میں نفرت کا پردہ نہ حائل ہونے پائے اور کدورت مسرت سے بدل جائے۔

عورت خانگی امور کی انجام دہی میں کامل ہو۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ فلسفۂ کینٹ (Kant)[1] کی عالمانہ بحث سمجھے، منطق میں عبور رکھتی ہو یا کئی زبانوں کی ماہر ہو۔ وہ باتونی ہو اور چھوٹے چھوٹے مختلف موضوعوں پر ہنسنے ہنسانے والی باتیں کرتی ہے اگر قصہ گوئی اور لطائف و ظرائف میں ملکہ رکھتی ہو تو کیا کہنا۔ اگر بیوی شوہر کا مذاق نہیں سمجھ سکتی اور اس وقت ہنستی ہے جب اس کا شوہر رو رہا ہو یا شوہر کی ہنسی کے وقت محض منہ کھولے تاکتی ہو تو وہ بالکل بیکار جوڑ ثابت ہوگی۔

بیوی کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ دنیا کی سیاست سے

۱؎ انیسویں صدی کا مشہور انگریز مصنف جو اپنے پند و نصائح کے لئے مشہور ہے
۲؎ انیسویں صدی کی مشہور ناول نگار۔ کافی شہرت رکھتی ہے اور کئی کتابوں کی مصنف ہے۔

۱؎ اٹھارویں صدی کا جرمن فلسفی اور نقاد۔

پوری طرح واقف ہو یا موجودہ سیاسی نقطۂ نظر پر بحث کرسکے ۔
اس کے لئے بس یہی کافی ہے کہ وہ خانگی سیاست میں کامل ہو۔
میں ایک دفعہ ایسی عورت سے ملا جو وعگ (Whig) اور ٹوری
(Tory) میں امتیاز نہیں کرسکتی تھی لیکن اگر آپ اس سے خانگی
زندگی اور لوگوں کے طور طریقے پر گفتگو کرتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ
وہ کتنی بڑی رمز و قیافہ شناس اور سیاست داں تھی۔ علمی و ادبی
مذاق میں امتیاز رکھتی تھی۔ اس کی عام معلومات کی کمی کا یہ عالم تھا
کہ وہ انسان کی خوبصورت بھووں کی تعریف سن کر تعجب کیا کرتی تھی
لیکن یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ آج بھی سیکڑوں ایسے مرد
موجود ہیں جو عقل کی روشنی میں بہت سی معمولی معمولی باتوں سے
ناواقف ہیں مثلاً زلزلہ، کوہ آتش فشاں کا پھٹنا، یا روحانی
قوت سے کسی باجے کا ہوا میں معلق نظر آنا وغیرہ وغیرہ ۔ ایسی
بیوی جو دنیا کے بڑے بڑے مسئلے یا جزئی چیزوں سے غافل لیکن
ظریف الطبع و حاضر جواب ہے یقیناً مرد کی زندگی میں بہترین رفیق
بن سکتی ہے۔ وہ ایک بہت پڑھی لکھی لیکن غیر مزاج شناس عورت
سے بدرجہا بہتر ہے۔

شادی کرتے وقت پیشے کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے

مرد کو کسی ادیبہ و معلمہ سے شادی نہ کرنی چاہئے اس لئے کہ تعلیمی
و ادبی پیشے میں دماغ اور قوت پر کافی زور پڑتا ہے اور گھنٹہ دو
گھنٹے کام کرنے کے بعد وہ تھک کر سست اور عیب جوئی کی عادی
ہو جاتی ہے۔ ایک مغنیہ بھی کامیاب بیوی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے
کہ اسے بھی اپنے کام میں سخت محنت کرنی پڑتی ہے جس کے بعد عورت
زود رنج اور ذی حس ہو جاتی ہے۔ ایک صناع و مصور سے شادی
اکثر کامیاب ہوتی ہے۔ مصوری دماغ کے لئے فرحت بخش ہے۔
اس میں ہاتھ اور دماغ دونوں درکار ہیں۔ تصویر کا خاکہ بناتے وقت
تو دماغی کاوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر بعض میں محض دستی
صناعیوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ اور دماغی فکر کی ضرورت نہیں
ہوتی۔ جوں جوں خاکہ تصویر کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے مصور
کے مزاج میں شگفتگی اور طبیعت میں بالیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔
ادب اور لٹریچر کی یہ صورت نہیں۔ اس میں ہمیشہ دماغ ہی کام کرنا
پڑتا ہے۔ اور صحیح خیال کی ادائیگی کے لئے موزوں ترین لفظ کی
ضرورت ہوتی ہے، صرف خوش نویسی کام نہیں آتی۔ مصوری
ادب پر یوں بھی فوقیت رکھتی ہے کہ مصور اپنا کام کسی سبزہ زار
یا چمن میں انجام دے سکتا ہے جہاں کی بھینی بھینی خوش بو اور
تراوت دل و دماغ کو نزہت بخشتی اور جسمانی و دماغی محنت کی
تلافی کردیتی ہے۔

ایک جہازی افسر سے بھی اگر شادی کی جائے تو کامیاب
ہوسکتی ہے۔ بشرطیکہ شادی کی بنیاد عشق پر ہو۔ شوہر پردیس میں
رہتا ہے اور بیوی گھر پر عشق میں گھلا کرتی ہے۔ اس طرح
بیوی سے ایک مدت تک ہجر و فراق کی کڑیاں جھیلنے کے بعد دونوں
میں رشتۂ عشق مضبوط رہتا ہے۔ اور آتش عشق دونوں کو
ایک جان و دو قالب بنائے رہتی ہے۔ لیکن زن و شو کی اس
طویل مدت میں ایک خطرہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر عشق دونوں
میں مشتعل اور تیز نہیں تو ہر لحظہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ غیبت
کی وجہ سے نفرت کی خلیج دونوں میں زیادہ وسیع اور عمیق نہ ہو جائے۔
اسی طرح ماہی گیر، علم نباتات کے محقق، اور سمندر کے کنارے
سوار جمع کرنے والے بھی عمدہ شوہر ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ
کام کی نوعیت اور ٹھنڈی آب و ہوا کا اثر ان میں ادیب و
مغنی کی بدمزاجی نہیں پیدا ہونے دیتا۔

عورت کو چاہئے کہ جس شخص کے بہت سے دلی دوست
ہوں اس سے شادی نہ کرے۔ اس لئے کہ ایسی صورت میں
شوہر کی محبت تقسیم ہو جاتی ہے اور بیوی خسارہ میں رہتی ہے۔

اگر محض صاحب سلامت والے دوست ہیں تو کوئی فکر نہیں۔ اگر مرد نے کہیں اور دو ایک دفعہ معاشقہ و نظر بازی کی ہے تو بھی مضائقہ نہیں۔ سمجھدار عورت اسے اپنے ڈھنگ پر لگا لیتی ہے۔ آخری بات یہ بھی یاد رکھنی چاہئے کہ عورت کبھی اس مرد سے شادی نہ کرے جو شرب مسکرات یا سگریٹ پینے کے خلاف ہو۔ سگریٹ پینے والے کے خیالات منتشر نہیں رہتے' اور وہ ان کو ایک مرکز پر جمع کر کے خانگی زندگی کو عمدہ اور دلچسپ بنا سکتا ہے (یہ شرط اسٹیونس کی مزاحیہ طبیعت کی آئینہ دار ہے ورنہ اس کو سنجیدگی اور عقل کی شرط نہیں کہہ سکتے)

ازدواجی زندگی کی کامیابی کے لئے یہ چند قواعد پیش کئے گئے ہیں جن میں ضرر کا احتمال کم ہے اس واسطے کہ اس پر سب عمل ہی کب کریں گے۔ ہاں زندگی پر حسب ذیل تبصرہ ضرور قابل لحاظ ہے سنیئے:۔

شادی زندگی میں ایک زبردست اقدام ہے جو مرد کو اپنی تاریک و مہیب وادی میں گم کر دیتا ہے۔ ہم حوادث کے متلاطم سمندر میں سرگرداں ہو کر اسے ساحل نجات تصور کرتے ہیں۔ مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ بھی ایک چٹان ہے' ایک پہاڑ ہے جس سے ٹکرا کر ہماری کشتیٔ حیات چور چور ہو جائے گی۔ شادی زندگی کی مصیبتوں اور دکھ درد کی دوا معلوم ہوتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ آخری کام ہماری تکلیفوں اور مصیبتوں کو بھلا کر دنیا ہمارے لئے جنت بنا دے گا۔ لیکن کتنی شادیاں ہمیں اس نتیجے تک پہونچنے نہیں دیتی ہیں؟ شادی' دام مکر و فریب ہے۔ اس میں پھنسنے کے بعد ہمیں ایام آزادی کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کیا فائدہ ہماری غفلت نے قافلے کو میلوں آگے بڑھا دیا اور ہم اب اس منزل پر ہیں جہاں دور سے جرس کارواں سنائی دیتا ہے۔ ہماری ٹھنڈی سانسیں اور گرم آنسو اسے واپس نہیں لا سکتے۔ دنیا اس وقت ہمیں پیام عمل دیتی ہے۔ لیکن ہم اپنی مجبوریوں کی وجہ سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ ہمیں بخوبی معلوم ہونا چاہیئے کہ شادی بچوں کا کھیل نہیں یہ مثل زندگی کے ایک عرصۂ جنگ ہے۔ جہاں خون آشام تلواروں کی چھاؤں میں بہادری و مردانگی کی داد دی جا سکتی ہے۔ یہ کوئی گلاب کا تختہ نہیں جسے ہم روندیں اور وقتی حیثیت سے محض دماغی تفریح اور مشام کو معطر بنانے کا ذریعہ قرار دیں۔

اقبال انصاری
(لکھنو یونیورسٹی۔ لکھنو)

مسکراتا جا

شگفتہ غنچوں کو حسرت سے دیکھتا ہوں میں
اِسی طرح سے پھر اک بار مسکراتا جا

ستم ظریف ستم سے بھی باز آتا ہے
اگر نہ ہو سکے کچھ تو یوں ہی ستاتا جا

جمالِ ناز کا ہے منتظر ہر اک ذرّہ
نقاب رخ سے اٹھا اور مسکراتا جا

نیاز علی خاں نیاز

نئی کتابیں

۱ - کاروانِ ادب (نثر نگاری کی تاریخ) از ڈاکٹر عبدالرشید ۴۸۴ صفحات
قیمت عا/ - فیروز اینڈ سنز - لاہور -

۲ - فیضانِ حسینؑ (مرثیے) از صالحہ بیگم مخفی قیمت ۴/ صالحہ بیگم
سید اسمعیل لین - پارک اسٹریٹ - کلکتہ

۳ - یاد انوار (سوانح حاجی انوار احمد) از محمد امین زبیری ۹۹ صفحات
مسلم یونیورسٹی پریس - علی گڑھ

۴ - مذاہب عالم - از پروفیسر پریتم سنگھ ۷۶ اصفحات - قیمت ۱۲/
پروفیسر پریتم سنگھ ۲۹ ٹیمپل روڈ - لاہور -

۵ - ریاضِ روح (مجموعۂ کلام) از عزیز الدین روحی - ۱۰۵ صفحات
محمد عزیز الدین روحی - امبور - مدراس -

۶ - محسوسات ماہر (مجموعۂ کلام) از منظور حسین ماہر القادری ۳۰۴ صفحات
قیمت عا/ - کتاب خانہ - شاہراہ عثمانی - حیدرآباد

۷ - تذکرۂ تاج الاولیا (ناگپور کے بابا تاج الدینؒ کی سوانح عمری)
از محمد حسام الدین ۲۰۰ صفحات از مولف مکان نمبر ۳ - چلکل گوڑہ سکندرآباد

۸ - کارنامۂ پہلوی (قدیم و جدید ایران کی تاریخ) از سید محمد حسن بلگرامی
۳۵۴ صفحات قیمت ۱۲/ - غلام دستگیر تاجر کتب - عابد روڈ - حیدرآباد

۹ - ہفت اورنگ (مقالات) از اقبال حسین انصاری ۲۴۶ صفحات
قیمت ۸/ - از ابو محمد انصاری - محلہ سپاہ - جونپور

۱۰ - جرمنی کی جاسوسہ (افسانہ) از سید نجم الحسن وحشی قیمت ۴/
انجمن بک ڈپو معرفت منروا پریس - قطب روڈ - دہلی -

۱۱ - میرے نغمے (مجموعۂ کلام) از سلام مچھلی شہری ۱۰۲ صفحات قیمت ۱۲/
اردو سوسائٹی دفتر اضطراب نظیر آباد - لکھنو -

۱۲ ہندوستان اور مسئلہ امارت (امارت شرعیہ کے قیام کے دلائل)
از عبدالصمد رحمانی ۱۲۸ صفحات - قیمت ۱۲/ دارالاشاعت امارت شرعیہ
پھلواڑی - پٹنہ

۱۳ - زبان و قلم (قرآن مجید کے عربی میں نازل ہونے کے اسباب)
از قاضی عبدالصمد سیوہاروی - ۱۲۴ صفحات - قیمت ۱۲/ بمکان
مولوی فیض الدین ایڈوکیٹ - عابد روڈ - حیدرآباد -

۱۴ - جامع الآداب (اخلاقی مضامین) از عبدالرحیم ۲۵۵ صفحات
مکتبۂ علوم مشرقیہ - اسلامیہ کالج - پشاور

۱۵ - تاریخ مجلس اتحاد المسلمین (مسلمانان دکن کی بارہ سالہ جدوجہد
کا مرقع) ۲۴۴ صفحات قیمت ۱۲/ دارالاشاعت سیاسیہ شاہراہ عثمانی حیدرآباد

۱۶ - تعلیمیاتی نفسیات - (تعلیم و تدریس کے نفسیاتی پہلو) از ملک سردار علی ۱۰۰ صفحات

۱۷ - مرقع پولینڈ (موجودہ جنگ کے حالات) از منشی شان الٰہی ۱۲ صفحات
قیمت ۱۲/ بنگالی کوٹھی - سول لین - علی گڑھ

۱۸ - آثار جمال الدین افغانی (با تصویر سوانح عمری) از قاضی عبدالغفار مدیر پیام
۵۰۰ صفحات قیمت ۳/ - انجمن ترقی اردو - دہلی -

۱۹ - سی - پی میں کانگریس راج (کانگریسی حکومت کے ظلم و نسق کی داستان)
از حکیم اسرار احمد ۳۸۰ صفحات قیمت عا/ - سکرٹری مسلم لیگ - ناگپور

۲۰ - السیاستہ المدینہ (حکومت اسلامیہ کی تشکیل پر مقالہ) از
مولنا ہندی قیمت ۸/ - انوار العلوم ہائی اسکول نام پلی حیدرآباد

۲۱ - شیخ جی اور دوسرے افسانے (مزاحیہ) از کوثر چاند پوری -
لاجپت رائے اینڈ سنز - لاہور -

۲۲ - گل و مل (مجموعۂ کلام) از سید علی عباس ۲۱۸ صفحات -
قیمت ۱۲/ - انجمن ترقی ادب

۲۳ - کلیات محمد قلی قطب شاہ - مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۱۱۰۰ صفحات - قیمت ۱۵/ - سب رس کتاب گھر - خیریت آباد

۲۴ - اقبال کا مطالعہ - از سید نذیر نیازی - قیمت عمر -
دارالادب پنجاب - لاہور -

۲۵ - معمار اعظم (ڈراما "دی ماسٹر بلڈر" کا ترجمہ) از عزیز احمد
۱۵۰ صفحات - قیمت ۱۲/ - انجمن ترقی اردو - دہلی

مرزا سیف علی خاں

میر محمد مومن کا ذوقِ تعمیر (بسلسلہ پیوستہ)

سید آباد کی مسجد کی وضع قطع

سید آباد کی مسجد کے کتبے اور اس کے کاتب کا حال بیان کرنے کے بعد اس کی وضع قطع سے متعلق بھی کچھ لکھنا ضروری ہے۔ یہ کوئی بڑی مسجد نہیں ہے اور نہ اس کے منارہی بلند ہیں جیسا کہ اس کی تصویر سے ظاہر ہوگا تاہم اس کی تعمیر میں تناسب اور نفاست کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس کی تینوں کمانیں خوش وضع ہیں اور چھجے کے اوپر جو منڈیر بنائی گئی ہے اس پر پہلے اکیس (۲۱) چھوٹی چھوٹی کمانیں اور پھر علموں کی شکل کا حاشیہ دے کر عمارت کی روکار میں دیدہ زیبی پیدا کی گئی۔

درمیانی کمان کے آگے تھوڑے فاصلہ پر ایک لنبوترا حوض بنایا گیا تھا جس میں اب مٹی بھری ہوئی ہے اور اسی پر سے گذر کر اس وقت دروازہ سے مسجد تک پہنچتے ہیں۔

مسجد کے چبوترے کے اطراف دیوار کھینچدی گئی ہے۔ لیکن یہ دیوار بعد کی ہے۔ اصل میں میر صاحب نے مسجد کے اطراف سرائے بنائی تھی۔ اور اس سرائے کے عین وسط میں ایک اونچے چبوترے پر مسجد قایم کی گئی تھی۔ سرائے کا عقبی حصہ تو اب بھی باقی ہے لیکن سامنے اور دونوں پہلوؤں کی عمارت بعد کو منہدم ہو گئی۔ اور اس جگہ مختلف چھوٹے چھوٹے بے ترتیب مکان بن گئے ہیں۔ اور انہی مکانوں کی وجہ سے مسجد کے چبوترے پر حصار کی دیوار اٹھا دی گئی ہے۔ اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی مسجد کا اصلی صحن ہے۔ حالانکہ یہ درمیانی چبوترہ تھا۔ مسجد کا اصلی صحن چبوترے کے نیچے دور تک ہوگا اور مسجد اور سرائے کا باب الداخلہ اس مقام پر ہوگا جہاں اب ایک جاگیردار صاحب کا نئی وضع کا بنگلہ بن گیا ہے۔

مسجد کا مسقف حصہ دس گز طویل اور ۷ گز عریض ہے۔ درمیانی محراب میں سنگ موسیٰ کا عالی شان کتبہ ہے جس کے حروف پر طلائی کام کیا گیا تھا لیکن مرور ایام اور آبک پاشی کی وجہ سے اب یہ باقی نہیں ہے البتہ لفظوں پر جگہ جگہ سنہرا رنگ اب بھی جھلکتا ہے۔

یہ مسجد اور سرائے ۱۲۸۰ھ تک ملا تمیمی کی اولاد کے قبضہ میں رہی۔ اس وقت سید حسین ولد سید جلال ولد سید لاڑ محمد بن شاہ محمد بن ملا تمیمی اس پر اور اس سے متعلقہ معاش پر قابض تھے۔ اور ان کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ان سے قبل ان کے مذکورۂ صدر اجداد جن کے نام انھوں نے اپنی ولدیت کے سلسلہ میں لکھے ہیں اس مسجد کی خدامت بجالاتے رہے اور اس سے متعلقہ معاش پر قابض تھے۔

جب مذکورہ سنہ میں حضرت میر محمد مومن کے ورثا نے اس مسجد اور سرائے کو اپنے قبضہ میں کر لینا چاہا تو سید حسین نے اپنے قدیمی حقوق پیش کئے اور خدمت گزاری کا وعدہ کیا جس کی بنا پر میر مومن صاحب کے نبیرہ میر سید محمد کے فرزندوں (میر محمد حسین اور میر کاظم علی) نے اس معاش پر سید حسین ولد سید جلال کا قبضہ اس شرط کے ساتھ منظور کیا کہ وہ سال بسال ماہ شعبان میں پانچ روپیہ ماہانہ میر صاحب کے فاتحہ اور چراغاں کے لئے دیا کریں۔ چنانچہ سید حسین نے اپنے اقرارنامہ میں لکھا ہے کہ:-

"آنہا (یعنی ورثائے میر صاحب) نظر بر قدامت من و شرط خدمت مسجد نمودہ مبلغ پنج روپیہ برائے چراغان عرس (ائرہ میر محمد مومن) ماحب مستغفرانہ من قبول کنانیدہ ا ز.

تفاوت برداشتند۔ و خود ہم بہ رضا و رغبت خود راضی شدم کہ سال بہ سال در ماہ شعبان پنج روپیہ برائے چراغان عرس و فاتحہ سالیانہ می دادہ باشم۔ بعد من قائم مقام من سال بسال می دادہ باشند احیاناً کسے از ایں قرار برگردد یا تفاوت دیا تجاوز کند مجرم شرع شریف خواہد بود۔ وکان ذالک تحریراً فی التاریخ غرہ جمادی الاول ۱۰۸۱ھ۔"

لیکن میر صاحب کے موجودہ وارث اور سجادہ مولوی میر عباس علی صاحب سے معلوم ہوا کہ یہ موعودہ رقم نہ اس وقت داخل ہوتی ہے اور نہ شاید ان کے والد میر حیدر علی مرحوم کے زمانہ میں داخل کی جاتی تھی۔ خود مسجد کی خدمت کے لئے بھی اب محکمۂ امور مذہبی کی طرف سے ایک موذن ملازم ہے جس کا بیان ہے کہ وہ تیس چالیس سال سے یہ کام انجام دیتا ہے اور مسجد کا کوئی متولی وغیرہ نہیں ہے اور نہ یہ معلوم کہ سید حسین ولد سید جلال کی کوئی اولاد بھی اب باقی ہے یا نہیں۔ بہرحال مسجد تو آباد ہے اور اب تک اس میں پنج وقتہ نماز ادا کی جاتی ہے۔ موذن کا بیان ہے کہ چالیس پچاس سال قبل مسجد ہی میں ایام عاشورہ میں علم بٹھائے جاتے تھے لیکن اب عرصہ سے یہ طریقہ مسدود ہے اور خود علم بھی شاید بلدہ حیدرآباد کے کسی صاحب کے یہاں ہیں۔

عاشور خانہ یہ امر یقینی ہے کہ سید آباد میں میر صاحب نے مسجد کے ساتھ عاشور خانہ بھی بنایا ہوگا۔ لیکن اس کی عمارت اب ناپید ہے اور شاید اسی عاشور خانہ کے علم بعد کو مسجد میں ایستادہ کئے جاتے تھے۔ اس سال یعنی سنہ ۱۳۶۰ھ کے محرم میں مولف کتاب ہذا اور پروفیسر سید محمد صاحب نے دوبار سید آباد (موجودہ سیدا باغ) کی بستی کا معائنہ کیا تو وہاں صرف ایک مکان کے دالان خانہ میں علم نظر آئے جو بالکل جدید ہیں اور یہ عاشور خانہ بھی حال ہی میں کسی خاتون کا بنایا ہوا ہے۔

سید آباد کی سرائے مسجد کے بعد میر صاحب کی سرائے کا بھی کچھ تذکرہ ضروری ہے۔ یہ سرائے کسی زمانہ میں بڑی آباد ہوگی۔ کیونکہ یہ شاہی راستہ پر واقع تھی۔ اب بھی اس کے کچھ بچے کھچے کمرے غریبوں کے مکان بن گئے ہیں اور اس طرح سے یہ سرائے آباد ہے۔

مسجد کے عقبی حصے کی طرف اس سرائے کی پوری کمانیں اب تک محفوظ ہیں ان کی تعداد سترہ ہے جن میں سے محراب کے عین مقابل والی تین کمانیں چھوٹی ہیں اور باقی کی چودہ کمانیں ایک ہی وضع قطع اور وسعت کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرائے مسجد حیات بخشی بیگم (واقع حیات نگر) اور مسجد کاروان قدیم کی سراؤں کی طرح عالی شان بنائی گئی تھی۔ اس میں جملہ ۵۶ کمرے تھے۔ عقبی حصہ کو چھوڑ کر بقیہ تینوں پہلوؤں کے وسط میں دروازے تھے۔ اور ان دروازوں کی دونوں طرف سات سات کمانیں بنائی گئی تھیں۔ اس سرائے کے شمالی گوشہ کی تصویر جو مسجد کی چھت پر سے لی گئی ہے اُس[1] کتاب میں شریک ہے۔

سرائے کے عقبی حصہ میں پتھر کی بڑی بڑی سلیں چھت سے باہر نکال کر جو خوبصورت چھجا بنایا گیا ہے اس کے اہتمام اور مضبوطی کو دیکھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ سرائے کس عمدہ پیمانہ پر تیار کی گئی تھی۔

میر پیٹھ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے فرمان مورخہ ۱۰۸۰ھ میں میر صاحب کے دوسرے گاؤں کے ساتھ میر پیٹھ کا ذکر ان الفاظ میں درج ہے:-

"در مصطفیٰ آباد عرف میر پیٹھ دو قطعہ تالاب بستہ و باغ

---

[1] سوانح میر محمد مومن۔

نارجیل و درختان مثمرہ نشانہ (کذا) دو مسجد کلاں احداث

فرمودہ :

متن کے علاوہ فرمان کے نیچے تلنگی عبارت سے قبل جہاں میر صاحب کی جاگیرات کی فہرست لکھی گئی ہے وہاں بھی موضع مصطفےٰ آباد عرف میر پیٹھ " کا نام دوسرے نمبر پر درج ہے۔

اس شاہی فرمان کے علاوہ میر پیٹھ کا ذکر ایک سَو دس سال بعد کے ایک محضر میں ملتا ہے جو میر صاحب کے ورثا سید محمد، شاہ بیگم، زہرا شاہ، فخر النساء بیگم اور خیر النساء وغیرہ نے سنہ ۱۱۶۰ھ میں لکھا ہے۔ اس میں میر پیٹھ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

" در موضع مصطفےٰ آباد عرف میر پیٹھ پرگنہ حویلی حیدرآباد ساختہ دو مسجد کلان احداث فرمودہ و دو تالاب بستہ وچاہا کندہ باغ نارجیل و اشجار مثمرہ جمیع اقسام کاشتہ[۱] "

ان حوالوں کی بنا پر راقم الحروف نے شہر حیدرآباد کے اطراف واکناف کے دیہات کی فہرستوں میں تلاش کرنا شروع کیا تو حسنِ اتفاق سے دو مختلف جگہوں پر میر پیٹھ نام کے دو دیہات کا پتہ چلا۔ جن میں سے ایک ضلع میدک کے متعلقہ باغات میں واقع ہے اور راجہ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی جاگیر ہے۔ اس میں ۲۴۲ مکانات ہیں جن میں جملہ ۷۰۲ نفوس (۳۴۹ مرد اور ۳۵۳ عورتیں) آباد ہیں[۲]۔

دوسرا میر پیٹھ ضلع اطراف بلدہ کے شمالی تعلقہ میں نواب قدیر جنگ بہادر کی جاگیر ہے اس میں کل ۳۱ مکان ہیں جن میں ۱۲۶ نفوس (۶۴ مرد اور ۶۲ عورتیں) بستے ہیں[۳]۔

ان معلومات کے بعد مصنف کتاب نے ان دونوں مقامات تک پہنچنے کے راستے اور دیگر حالات کی تلاش کی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں تین دفعہ تاریخی معائنہ کے انتظامات کئے گئے۔

پہلی بار ۲ فروری سنہ ۱۹۴۱ء کو مولوی سید محمد صاحب ایم اے کی رہبری میں راستہ دیکھنے اور تیقن کے لئے کہ یہ میر مومن ہی کا بنایا ہوا میر پیٹھ ہے ظل اللہ گوڑہ اور میر پیٹھ کا سفر کیا گیا۔ اور جب تالاب، مسجد اور کتبہ وغیرہ دیکھنے کے بعد یقین ہوگیا کہ یہ میر محمد مومن ہی کا بنایا ہوا گاؤں اور مسجد ہے تو ۵ رفروری کو ادارہ کی طرف سے تاریخی معائنہ کا انتظام کیا گیا۔ چنانچہ پروفیسر مجید صدیقی، پروفیسر سید محمد مولوی عبد الرحمٰن شریف، مولوی صدیق علی ماہر حرب اور بھگوان صاحب فوٹو گرافر کی معیت میں اس روز کئی گھنٹے میر پیٹھ میں گزرے۔ اور مسجد کی تصویریں اور کتبوں کے چربے لئے گئے میر پیٹھ کے دونوں معائنوں میں مولوی عبد الرشید صاحب بی اے نے (جو حسنِ اتفاق سے اسی باغ میں رہتے ہیں جو میر صاحب کا لگایا ہوا ہے) بڑی زحمت اٹھا کر ہماری معلومات میں اضافہ کا انتظام کیا، اور ہر طرح کی سہولتیں ہم پہنچائیں چنانچہ مسجد کو درختوں وغیرہ سے صاف کیا، دھلوایا، کتبوں میں سے چونا اور گرد و غبار نکلوایا اور ہماری پرتکلف ضیافت بھی کی۔

یہ میر پیٹھ شہر حیدرآباد سے تقریباً ۸ میل کے فاصلہ پر جنوب مشرق کی سمت میں واقع ہے۔ اور اس کا راستہ چمپا پیٹھ کرمن گھٹ، اور ظل اللہ گوڑہ پر سے گزرتا ہے۔ لیکن چمپا پیٹھ کے بعد سے کچی سڑک ہے جس پر سے موٹر قدرے زحمت کے ساتھ میر پیٹھ تک پہنچتی ہے۔

سید محی الدین قادری زور

۱۔ اس محضر کی آئندہ صفحات میں نقل درج ہے۔

۲۔ دیکھو فہرست دیہات ضلع میدک (انگریزی) مطبوعہ دفتر اعداد و شمار حیدرآباد بابت سنہ ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۰۔

۳۔ دیکھو فہرست دیہات ضلع اطراف بلدہ (انگریزی) مطبوعہ دفتر اعداد و شمار حیدرآباد بابت سنہ ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۱

دوسری شادی

اس کی دوسری شادی کے دن قریب آ رہے تھے ایک چلبلی لڑکی کا تصور ہر وقت اس کے ذہن پر چھایا رہتا۔ اسے پچکے ہوئے گالوں' اور جھریوں بھرے چہرے سے نفرت ہو چکی تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی کو اپنے پہلو میں دیکھنے کا آرزومند تھا، جس کی آنکھوں میں نشہ اور ہونٹوں میں رس ہو۔ جوانی چھپے ہوئیں روئیں سے چشموں کی صورت میں اُبل رہی ہو۔ جو ہنسے گنگنائے اور بات بات پر روٹھ جائے جس کے اعضا میں لوچ اور باتوں میں شعریت ہو۔ اور اسی لئے اس نے اپنی پہلی بیوی کو مار پیٹ کرا سے اس کے میکے بھیج دیا تھا۔ اور قریب کے گاؤں میں ایک غریب کسان کی مٹھی گرم کر کے اسے رشتہ دینے پر آمادہ کر لیا تھا۔ اور اب اس کی شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔

اس نے ان برتنوں کو پچھلی کوٹھڑی میں مقفل کر دیا تھا، جو اس کی پہلی بیوی جہیز میں لائی تھی۔ اور جس پر ان کے چرائے جانے کے ڈر سے اس کے والدین نے اپنی بیٹی کا نام کھدوا دیا تھا۔ اور ان چار پائیوں کو نئے سرے سے بنوایا تھا، جن پر بچوں کے پیشاب سے بڑے بڑے داغ پڑے ہوئے تھے۔ اور کچھ ایسے کپڑوں کو رضائیوں والے بھاری بھر کم صندوق کے پیچھے پھینک دیا تھا، جو اس کی بیوی جلدی میں اپنے ساتھ لیجانے بھول گئی تھی۔ اور جن کی موجودگی میں اس کی نئی بیوی کے دل میں ایک خطرناک شبہ کی آگ بھڑک اٹھنے کا اندیشہ تھا۔

دین محمد "پنجاب اینڈ سندھ بنک" میں معقول مشاہرہ پر ملازم تھا۔ مگر اس کی بیوی عمدہ کھانوں کے نام تک نہیں جانتی تھی' اس کے بچے مونگ پھلی اور بھونے ہوئے چنوں کے ذائقہ سے نا آشنا تھے۔ اور خود اس کو کبھی کسی نے دھوبی کا دھلا ہوا کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ صبح و شام دال روٹی اور ہفتہ میں ایک بار گوشت اور کبھی کبھی دال چاول یہ اس کی خوراک تھی۔ وہ کولھو کے بیل کی طرح دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر کے علاوہ کبھی کہیں نہ جاتا تھا۔ اپنے ساتھی کلرکوں کو سگرٹ پیتے دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں ان کا عبرتناک انجام پھر جاتا۔ وہ سوچتا یہ لوگ اپنے مستقبل سے کس قدر بے پرواہ ہیں۔ نہیں جانتے کہ عنقریب ان کے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہونے والا ہے۔ اور ان کی آنکھیں بصارت سے محروم ہونے والی ہیں۔ بڑھاپا منہ کھولے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور وہ وقت دور نہیں' جب دفتر سے انہیں دھکے مار کر نکال دیا جائے گا۔ اور اپنا پرایا کوئی بھی آنکھ ملانا گوارا نہ کرے گا۔ مگر پیسہ ــــ پیسہ ــــ پیسہ اس کے دل و دماغ پر گول گول روپہلی سکے ہمیشہ سایہ افگن رہتے۔ مگر اب اس کی زندگی میں انقلاب آ چکا تھا۔ کام دیو بے طرح اس کے حواس پر مسلط ہو چکا تھا۔ اس کی شادی کے دن قریب آ رہے تھے اس نے گھر کو دلہن کی طرح سجایا۔ دروازوں، کھڑکیوں اور روشندانوں کو سرخ روغن کے لباس میں ملبوس کیا۔ دیواروں کے تھوکوں بھرے سیاہ چہروں کو چونے کی تہوں میں چھپا دیا۔ اور "ہر چیز ملے گی چھ آنے" والے سے آملہ ہیر آئیل درجہ اول کی ایک شیشی خرید کر والان کی انگیٹھی پر رکھ دی اور گھڑیاں گن گن کر دن کاٹنے لگا۔ اب اس کی شادی کے دن بہت قریب تھے۔ وہ محسوس کرتا کہ اس کے رگ و ریشہ میں جوانی انگڑائیاں لے رہی ہے۔ اور مسرت و انبساط کا ایک بے پناہ طوفان نہایت عجلت سے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اس کی ڈاڑھی جو قینچی سے بھی دو چار ہونے کی بہت کم عادی
تھی، اب استرے کی نذر ہو چکی تھی۔ بڑھاپے کے آثار خضاب
کی چادر میں لپیٹ دیئے گئے تھے وہ رات کی تنہائیوں میں
سوچتا۔ پندرہ سولہ سال کی لڑکی، پھول سا چہرہ، رسیلی آنکھیں
اور بلور کی طرح دمکتا ہوا جسم، کیا یہ سب کچھ، یہ عیش بہا خزانہ
مجھے ملنے والا ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے۔ میں خواب تو نہیں دیکھ
رہا۔ وہ تصور کی سنہری چلمنوں کی اوٹ میں یہ سب کچھ دیکھتا۔
اور اس کے ہونٹوں سے پانی کے چند قطرے نکل کر تکیے میں
جذب ہو جاتے۔ کبھی خیال کرتا۔ کیا وہ مجھے بالکل اسی طرح چاہے
گی، جس طرح ایک دلہن اپنے نوجوان دولہا کو چاہتی ہے۔ اُسے
میرے کھُردرے منہ اور ڈھلکے ہوئے جبڑے سے معلوم تو نہیں
ہو جائے گا کہ میں بوڑھا ہوں۔ اسکے باپ سے بھی زیادہ بوڑھا۔
یہاں پہنچ کر بے اختیارانہ اس کے ہونٹوں سے ہوا کا ایک گرم
جھونکا شانہ لڑاتا ہوا نکل جاتا، اور وہ بغیر کوئی اثر لئے تصور
کی باگ جوانی کے لہکتے ہوئے سبزہ زاروں کی طرف موڑ دیتا
اور دیکھتا کہ شہر بھر کے نوجوانوں میں وہ اپنی مثال نہیں
رکھتا۔ اس کی خوبصورتی اور شہزوری کے قصے لوگوں کی زبانوں
پر ہیں۔ اور لڑکیاں اس کا نام سن کر انگڑائیاں لینے پر
مجبور ہو جاتی ہیں۔ وہ ہر شب انہیں خیالات کی رَو میں
بہتا ہوا نیند کی دنیا میں پہنچ جاتا۔

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ آخر وہ دن بھی آ پہنچا،
جب کھانستا ہوا بڑھاپا گنگناتی ہوئی جوانی کو جلو میں لئے گھر
میں داخل ہوا۔ سامنے ٹوٹی ہوئی جھونپڑی میں ایک ملنگ
نے یا علی کا نعرہ بلند کیا۔ اور مسکرا کر کہا

یوں بھی ہوتا ہے، سائیں بابا!

اس کا بڑھاپا اب بڑی بڑی بھیری ہوئی جوانیوں کو آنکھیں
دکھانے کے قابل ہو گیا تھا۔ فضلان جب چھان چھان کرتی ہوئی
صحن میں مٹک مٹک کر چلتی، تو دین محمد کی رگوں میں جوانی
دیپک راگ الاپنے لگتی۔ چلچلاہٹ تناؤ میں تبدیل ہو جاتی
اور رخساروں میں سرخیاں سانس لینے لگتیں۔ وہ محسوس
کرنے لگا کہ اس کی زندگی کی ابتدا فضلان کی آمد سے ہوئی ہے۔
وہ زندگی کے گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرتا تو اس کی آنکھوں
میں ایک بھیانک زندان کی تصویر ناچنے لگتی۔ اور وہ کانپ
اٹھتا مگر جلد ہی حال کی بے پناہ مسرتوں میں ڈوب کر رہ جاتا۔
اب دفتر کے در و دیوار اسے بچھو بن کر کاٹنے کو دوڑتے
تھے۔ وہ دس سے چار بجے تک نہایت اضطراب کی حالت میں
وقت بسر کرتا۔ رجسٹروں کے اوراق میں اسے فضلان کی
تصویریں چلتی پھرتی نظر آئیں۔ اس جنون کی وجہ سے بارہا
حساب میں اس سے بڑی بڑی نمایاں غلطیاں سرزد ہوئیں۔
منیجر نے یہاں تک کہہ دیا کہ تمہارا دماغ اب کام کرنے کے قابل
نہیں رہا۔ تمھیں خود بخود ملازمت سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے۔
مگر دین محمد کی دیوانگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس کی بوڑھی
ہوس بجھتے ہوئے چراغ کی طرح زیادہ لَو دینے لگی۔ منیجر کو آج
ایک ٹی پارٹی میں شریک ہونا تھا۔ اس لئے وہ ڈھائی بجے
کے ساتھ ہی دفتر سے روانہ ہو گیا۔ دین محمد کو یہ موقع کہاں،
منیجر کے سیڑھیوں سے اترتے ہی کاغذات الماری میں بند
کر کے گھر کی راہ لی۔ وہ سڑک پر اڑتا ہوا جا رہا تھا۔ اس کا جی
چاہ رہا تھا کہ میل ڈیڑھ میل کا فاصلہ ایک ہی گام میں ختم
ہو جائے۔ وہ گھر کے سامنے پہنچا تو خوشیا چپراسی اسے باہر آتا
ہوا دکھائی دیا۔ اس کے دل پر ایک دھکا سا لگا۔ اور آنتوں
میں ایک ٹیس سی بل کھاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ خوشیا اٹھارہ
بیس سال کا بانکا سجیلا نوجوان بغیر کام کے اس کے گھر میں

کیوں آیا اس نے پچھلے ہونٹ کو دانتوں میں چباتے ہوئے سوچا۔

ممکن ہے گھر میں کسی سودے کی ضرورت ہو، یا خوشیا ادھر سے لرزتا ہوا افسر کی بیوی سمجھ کر سلام کو چلا آیا ہو، یا دوپہر کا کھانا لیجاتے وقت اپنی کوئی چیز بھول گیا ہو۔ یا ـــ یا ـــ یا یوں ہی چلا آیا ہو یہاں پہنچ کر اس کا دماغ چکرانے لگا، اور دل میں شعلے بھڑکتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ اور وہ دروازہ کا سہارا لے کر اپنے منتشر حواس کو ٹھکانے لانے کی کوشش کرتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا۔ مگر فضلان کے نشہ آور تبسم نے اسے سب کچھ بھلا دیا۔ اور اس کی غیرت کچھ دیر کے لئے لنگناتے ہوئے حسن کی پھلواری میں میٹھی نیند سو گئی۔

دوسرے دن فضلان جب سو کر اٹھی، تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو باورچی خانہ میں کام کرتے ہوئے پایا اور مکان کے بڑے دروازے پر ایک ٹاٹ پڑا ہوا دیکھا۔ اور چپارہ کے پردوں کو پہلے سے دگنا اونچا دیکھ کر اس انقلاب کی وجہ محسوس کی اور دل ہی دل میں زہریلی ناگن کی طرح بل کھانے لگی۔ اس کی شکن آلود پیشانی پر ایک خطرناک تحریر کے الفاظ دمکنے لگے۔ اور دو دن بعد دین محمد جب دفتر سے لوٹا تو اس تحریر کے معنی اس کی سمجھ میں کچھ اس طرح آئے کہ تلووں سے زمین سرکتی ہوئی معلوم دینے لگی۔ اس نے دیکھا کہ گھر کے تمام دروازے کھلے پڑے ہیں۔ اور فضلان مع زیورات غائب ہے۔ وہ پہلے ہی خوشیا کی غیرحاضری کو بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ گھر کا یہ عالم دیکھ کر اس کا شک یقین سے بدل گیا۔ دو رنگین جوانیاں ایک بڑھاپے کو سسکیوں میں تقسیم کر کے وہاں سے دور عشرتوں کی دنیا میں پہنچ چکی تھیں۔

تین دن گزر گئے۔ مگر دین محمد کو کسی نے گھر سے نکلتے نہ دیکھا۔ وہ اس عرصہ میں ایک چارپائی پر لیٹا ہوا بغیر کچھ کھائے، پئے اور سوئے خدا جانے کیا سوچتا رہا۔ چوتھا دن اس کے لئے بے پناہ مسرتوں کو دامن میں لئے ہوئے طلوع ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں ناچنے لگیں۔ اس نے پچھلی کوٹھڑی میں مقفل سامان کو جھوم جھوم کر اپنی اپنی جگہ پر سجایا۔ رضائیوں والے بھاری بھرکم صندوق کے پیچھے پھینکے ہوئے کپڑوں کو کھونٹیوں پر لٹکایا اور اپنا بہترین لباس زیب تن کر کے گھر سے نکل گیا۔

دو دن بعد سامنے ٹوٹی ہوئی جھونپڑی میں ایک ملنگ نے دیکھا کہ دین محمد بچوں کو کاندھوں پر اٹھائے اپنی پہلی بیوی سمیت گھر میں داخل ہو رہا ہے۔

الطاف مشہدی

ضروری اعلان:- جو مضامین سب رس میں شایع کرنے کے لئے وصول ہوتے ہیں انھیں مجلسِ ادارت میں پیش کر دیا جاتا ہے اور جو قابلِ اشاعت قرار پاتے ہیں وہ سلسلہ وار شایع کئے جاتے ہیں اور ناقابلِ اشاعت مضامین کو الگ کر دیا جاتا ہے۔ قابلِ اشاعت و ناقابلِ اشاعت مضامین کو حفاظت سے رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے تاہم اس بارے میں دفتر سب رس پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ اس لئے مضمون نگار اصحاب اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھا کریں۔ اسٹامپ آنے پر ناقابلِ اشاعت مضامین واپس کر دیئے جائیں گے۔

مہتمم سب رس

تنقید و تبصرہ

قیمتی باتیں — از جناب خواجہ فیض محمدؐ فیض صاحب لودھیانوی منشی فاضل اور ہیڈ ٹیچر اسلامیہ ہائی اسکول شیراں والا دروازہ لاہور۔ ناشر ریاض بک ڈپو محلہ داراشکوہ لاہور۔ قیمت دو آنے صفحات ۳۲۔

اس چھوٹی سی کتاب میں ہندستانی بچوں کے لئے ایک ایک سو منظوم نصیحتیں درج کی گئی ہیں۔ خط واضح اور کتابت وطباعت اچھی ہے بچے شوق سے مطالعہ کر سکتے ہیں۔

دس نظمیں — از فیض لودھیانوی صاحب ناشر ریاض بک ڈپو لاہور قیمت دو آنے صفحات ۳۱

اس میں بھی بچوں کے لئے اخلاقی اور اصلاحی اشعار درج ہیں چند نظموں کے عنوان ہیں۔ بچے، نوجوانوں سے خطاب تہذیب جدید۔ تجارت۔ ہمدردی۔ بیداری کا راگ۔ مطالعہ کی سفارش کی جاتی ہے۔

بچوں کی بہار — از فیض لودھیانوی صاحب۔ ناشر ریاض بک ڈپو لاہور قیمت دو آنے صفحات ۳۲

یہ کتاب فیض صاحب کی مذکورۂ بالا دو کتابوں سے زیادہ مفید ہے اور شوق سے پڑھی جائے گی۔ اس میں بھی نونہالان قوم کے لئے علمی اور اصلاحی نظمیں شریک کی گئی ہیں۔ اور اس کا دیباچہ روزنامہ انقلاب لاہور کے مشہور مدیر عبدالمجید صاحب سالک سے لکھوایا گیا ہے۔

اسلام کا اقتصادی نظام — مولفہ مولوی محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی صفحات ۲۵۰ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔

ندوۃ المصنفین دہلی کی طرف سے اس اثناء میں چند نہایت ہی مفید مطبوعات شایع ہوئی ہیں جن کی یہ چوتھی کڑی ہے۔ اس میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اقتصادی نظام کی تشریح کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہی ایسا ہے جس نے محنت اور سرمایہ کا صحیح توازن قایم کر کے اعتدال کی راہ پیدا کی ہے کتاب اس قابل ہے کہ عہد حاضر میں ہر تعلیم یافتہ نوجوان اسکا مطالعہ کرے اور موجودہ معاشی اور عمرانی کشمکشوں کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

رسالہ گاؤں سدھار — جلد ایک نمبر دو۔ بابت اپریل ۱۹۴۱ء چیف ایڈیٹر مولوی سید محمد نواب صاحب ایڈیٹر مولوی محمد عبدالقوی صاحب بی اے (مدراس)

یہ رسالہ حیدر آباد کے محکمہ اتحاد امداد باہمی کی طرف سے ہر مہینے تین زبانوں، اردو۔ تلنگی اور کنٹری میں شایع ہوتا ہے۔ مضامین میں تنوع اور افادیت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اس مہینے کے پرچے میں دیہی قرضہ۔ دیہات میں حفظان صحت۔ حیدر آباد میں تنظیم دیہی وغیرہ ایسے مضامین ہیں جو دیہات کے باشندوں کے لئے خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

سیاسی معلومات — از جناب اسرار احمد صاحب آزاد ناشر مکتبہ برہان نئی دہلی مجلد قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

اس کتاب میں تمام دنیا کی سیاسیات سے متعلق افراد واقوام ممالک، متعلقات اور معاہدات واصطلاحات کی مکمل یادداشتیں پیش کی گئی ہیں۔ کتاب پانچ ابواب پر

منقسم ہے۔ پہلے میں مشہور سیاسی مشاہیر کے حالات حروف تہجی کے لحاظ سے درج ہیں۔ دوسرے میں ممالک مقامات۔ تیسرے میں اصطلاحات اعلانات اور معاہدات۔ چوتھے میں تحریکات ادارت اور پانچویں میں متفرق امور سے متعلق جدید ترین اور مفید معلومات شریک کی گئی ہیں۔ یہ کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل کرتی ہے۔ توقع ہے کہ مکتبہ برہان ایسی مفید کتابوں کی اشاعت سے اردو ادب میں اضافہ کرتا رہے گا۔

خطوط غالب

مرتبہ منشی مہیش پرشاد صاحب لکچرار اردو و فارسی ہندو یونیورسٹی بنارس۔

ناشر ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد صفحات ۴۱۰ قیمت ۵ روپے۔

اردو و فارسی کے مشہور شاعر مرزا غالب کے اردو خطوط زبان اردوئے معلی کا بہترین نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ اور اس لئے بطور نصاب کے پڑھائے جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت تک خطوط غالب کے جتنے مجموعے اور ایڈیشن شائع ہوئے ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن میں کتابت و طباعت کی غلطیوں کی وجہ سے اصل عبارتیں مسخ ہو گئی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ مہیش پرشاد صاحب نے سالہاسال کی کاوش و تلاش کے بعد مرزا کے خطوط کا ایک صحیح ایڈیشن مرتب کیا اور اس میں بہت سے نئے خطوں کا بھی اضافہ کیا جو پہلے کے مجموعوں میں شامل نہ تھے۔ حسن اتفاق سے اس کام کی نظر ثانی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے کی جو خود بھی خطوط غالب سے دلچسپی رکھتے ہیں اور ان کے بعض غیر مطبوعہ خط اس سے قبل چھپوا بھی چکے ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب میں بعض باتوں کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ جن لوگوں کے نام مرزا غالب نے خط لکھے ہیں انکے حالات اور مرزا سے تعلقات کا مختصر سا تذکرہ بھی خطوں کے ساتھ درج کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔ کیونکہ اس سے بہت سے خطوں کے سمجھنے اور ان سے لطف اٹھانے میں مدد ملتی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ جن لوگوں کے نام مرزا نے خط لکھے تھے ان میں سب سے پہلے مرزا تفتہ کے خطوط کو کیوں جگہ دی گئی۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ حروف تہجی کے لحاظ سے ناموں کی ترتیب دی جاتی یا جن لوگوں سے غالب کے تعلقات و مراسلت پہلے ہوئی ہے ان کے خط پہلے شریک کئے جاتے۔

بہرحال خطوط غالب کی اشاعت سے اردو کے ایک بڑے شاعر کی تحریروں کا بہترین ذخیرہ صحت و صفائی کے ساتھ منظر عام پر آ گیا۔ ہندوستانی اکیڈیمی کی طرف سے اب تک اس معیار کی بہت کم کتابیں شائع ہوئیں۔

عورت مرد کے تعلقات

مولفہ لیو ٹالسٹائی۔ مترجمہ کدارناتھ صاحب خورشید

صفحات ۱۴۸، قیمت ۱۰/ سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہے۔

ناشر لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور۔ یہ کتاب ہمارے ہی اصولوں کی تبلیغ کے لئے لکھی گئی ہے۔ اور اس میں بتایا گیا ہے کہ فیشن پرستی اور عہد حاضر کی دوسری سماجی برائیاں اسی وقت ختم ہو سکتی ہیں جب کہ لوگ عیش و عشرت اور مواصلت کے اصولوں پر سنجیدگی سے نظر ڈالیں۔

اردو بالغوں کیلئے

(انگریزی میں) مولفہ صاحبزادہ سعید الظفر خاں صاحب

ناشر کتابستان الہ آباد۔ صفحات ۴۴ قیمت عالی۔ اس کتاب میں اردو سکھانے کے صوتیاتی طریقے پیش کئے گئے ہیں۔ کئی نقشوں اور تصویروں کے ذریعہ سے اردو کے حروف صحیح اور حروف علت کے سمجھنے اور تلفظ کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو لوگ اردو زبان کے لسانی اور صوتی امور سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کیلئے بھی اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ا۔ د۔ ع

اِدارہ کی خبریں

شعبے | ادارے کے مختلف شعبے برابر سرگرم عمل ہیں۔ اس مہینے تین شعبوں یعنی شعبۂ زبان، شعبۂ تاریخ دکن اور شعبۂ انسائیکلوپیڈیا کے اجلاس ہوئے جن کی روداد درج ذیل ہیں۔

شعبۂ زبان | ۱۱ر شہریور ۱۳۵۰ف کو ادارے کے شعبۂ زبان کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت کی۔

مولوی قاضی عبدالغفار صاحب، ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ، مولوی سید محمد صاحب، مولوی عبدالقادر صاحب سروری، نواب مرزا سعید الظفر خاں صاحب حسنؔ، مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری، پنڈت ونشی دھر صاحب، ڈاکٹر محمد حمید اللہ خاں صاحب معتمد شعبہ۔

ف۱۔ سابقہ جلسہ کی روداد پڑھی گئی اور اراکین نے اس کی توثیق فرمائی۔

ف۲۔ مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری نے تحریک فرمائی کہ چونکہ اردو زبان میں عمدہ ناولوں کی تعداد نہایت ہی کم ہے اس لئے ادارہ کو اردو کے اس جزو کی جانب بھی خاص توجہ دینا اور ناول نویسوں کی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ پیش کردہ تحریک پر ہر پہلو سے کافی بحث کی گئی اور بالاتفاق طے پایا کہ ایک ذیلی مجلس مقرر کی جائے جو اس مسئلہ اور ان وسائل پر جو ناول نویسی کی ہمت افزائی کا باعث ہو سکتے ہیں مثلاً انعام وغیرہ، غور کرے گی اور آئندہ اجلاس میں اپنی رپورٹ پیش کرے گی۔ اس ذیلی مجلس کے اراکین حسب ذیل ہوں گے۔

مولوی قاضی عبدالغفار صاحب، مولوی عبدالقادر صاحب سروری، مولوی سید محمد صاحب، مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری۔ مولوی قاضی عبدالغفار صاحب اس ذیلی مجلس کے داعی ہوں گے۔

ف۳۔ رکن مجلس ڈاکٹر جعفر حسن صاحب کا مراسلہ مورخہ ۱۹ر جمادی الثانی ۱۳۶۰ھ مجلس کے روبرو پیش کیا گیا۔ متن خط کے پیش نظر بالاتفاق طے پایا کہ چونکہ یہ خط ادارہ سے متعلق ہے اس لئے اس کو معتمد صاحب ادارہ کے پاس بھیج دیا جائے۔ نیز طے پایا کہ آئندہ سے ڈاکٹر صاحب موصوف کو شعبۂ زبان کے جلسوں کے انعقاد کی اطلاع دی جائے۔

ف۴۔ معتمد صاحب عمومی کی تحریک کہ شعبۂ زبان، اردو انسائیکلوپیڈیا میں غیر زبانوں کے الفاظ کے لئے صحیح اعراب کے تعین میں مدد کرے منظور کی گئی۔ اور شعبۂ انسائیکلوپیڈیا سے خواہش کی گئی کہ وہ ایسے الفاظ کی فہرستیں روانہ کرے جن کو اردو حروف میں لکھنے میں دقت محسوس ہو رہی ہے۔

ف۵۔ صحافتی اصطلاحات کی تدوین کے لئے جو ذیلی کمیٹی کام کر رہی تھی اس کے احیاء کی تجویز منظور ہوئی۔

شعبۂ تاریخ دکن | شعبۂ تاریخ دکن کا معمولی جلسہ ۲۹ر امرداد ۱۳۵۰ف م ۴ر جمادی الثانی ۱۳۶۰ھ بروز جمعہ کو ادارہ ادبیات اردو میں منعقد ہوا۔ اس میں حسب ذیل اراکین شریک تھے۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ، خواجہ محمد احمد صاحب، میر محمود علی صاحب، عبدالمجید صدیقی۔ اس وقت شعبہ میں مختلف مولفوں کے مسودات تاریخ موجود ہیں جو اشاعت کے طالب ہیں۔ یہ سب مسودے اراکین شعبہ کی رائے کے لئے پیش کئے گئے۔ مراد علی صاحب طالعؔ کے مسودات کے متعلق قرار پایا کہ فی الحال امرائے پائیگاہ کا مسودہ ملتوی رکھا جائے۔ دوسرے مسودے سلاطین آصفیہ پر ہیں۔ ان کے متعلق مولوی خواجہ محمد احمد صاحب، محمود علی صاحب اور داعی شعبہ کی رائے حاصل کی جائے۔ اگر وہ ان اصحاب کی رائے میں اشاعت کے قابل ہیں تو ان کی اشاعت کا انتظام ہو سکتا ہے۔ ظفر الدولہ پر ایک کتاب مولفہ عبدالقادر صاحب کا مسودہ بھی پیش ہوا۔ اس کے متعلق اراکین کی رائے یہ ہے کہ فی الحال ملتوی رکھا جائے۔ کرسپ کے مسودہ کے متعلق جو رہبر فاروقی صاحب کا مولفہ ہے قرار پایا کہ وہ قابل اشاعت ہے۔ اس کی اشاعت کا انتظام ہونا چاہیے۔ اس کے بعد زاہد صاحب حیدرآبادی کے مسودے بھی پیش ہوئے جو قطب علی، سکندر وغیرہ ہیں۔ ان کے متعلق یہ طے ہوا کہ یہ مسودے شعبۂ تاریخ دکن کے فرائض سے خارج ہیں۔ ان کو کسی دوسرے شعبے کے سپرد کرنا چاہیے۔

تعلیم بالغان کے سلسلہ میں ادارہ کی کوششیں | ادارۂ ادبیات اردو

اپنے دیگر علمی و ادبی مشاغل کے ساتھ تعلیم بالغان کی طرف بھی گزشتہ تین سال سے اپنی توجہ مبذول کی ہے اور اردو کا ذوق عام کرنے کی خاطر امتحانات کا ایک سلسلہ قائم کیا ہے جس کی مقبولیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ گزشتہ سال یعنی سنہ ۱۹۴۰ء میں ان امتحانات میں ۲۰۵ امیدوار شریک ہوئے تھے اور اس سال یعنی سنہ ۱۹۴۱ء میں ۶۷۴ امیدوار شریک ہوئے ہیں گویا ایک ہی سال میں ۴۶۹ امیدواروں کا اضافہ ہوا۔

خوشی کی بات ہے کہ خواتین میں بھی اردو کا ذوق بڑھتا جا رہا ہے چنانچہ گزشتہ سال صرف ۳۴ عورتیں ان امتحانوں میں شریک ہوئی تھیں اور امسال ۱۱۳ کے اضافہ کے ساتھ جملہ ۱۴۷ خواتین شریک ہیں

اسی طرح غیر مسلم اصحاب میں بھی اردو سیکھنے اور اردو ادب کا ذوق پیدا کرنے میں ادارہ نے ایک اچھی کامیابی حاصل کی ہے۔ چنانچہ گزشتہ سال ۵۱ غیرمسلم امیدوار اردو امتحانات میں شریک تھے اور اس سال ۹۲ شریک ہیں۔ یعنے ایک سال میں ۴۱ کا اضافہ ہوا ——

ادارہ اور اس کے معاونین کی کوششوں سے گزشتہ سال ۱۶۵۔ ان پڑھ لوگوں نے اردو لکھنا پڑھنا سیکھا تھا اور اس سال ۴۳۵ افراد کو خواندہ بنایا گیا۔ اس تعداد ۱۲۰ عورتیں اور ۲۰ غیر مسلم افراد شامل ہیں۔

آخر میں ادارہ اپنے حسب ذیل معاونین کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ جنھوں نے مختلف مقامات پر اردو کی تعلیم اور اردو ادب کا ذوق عام کرنے میں خاموشی کے ساتھ ادارہ کا ہاتھ بٹایا۔ اور متوقع ہے کہ آئندہ سال ان معاونین کے علاوہ دوسرے اصحاب بھی اس نیک اور مفید کام میں ادارہ کی مدد کریں گے۔ ذیل کے سترہ مقامات کے صاحب ایثار خادمان اردو کی مثال یقین ہے کہ آئندہ سال دیگر بیسیوں مقامات کے اہل ذوق اصحاب کو سرگرم عمل بنا دے گی۔

۱۔ حیدرآباد :۔ رابعہ بیگم صاحبہ، بلقیس بانو صاحبہ، سید محمد صاحب، منظہرالدین صاحب قریشی، کلیم اللہ حسینی صاحب۔

۲۔ کاماریڈی :۔ احمد عبداللہ صاحب انسپکٹر آبکاری، ادے نرسا گوڑ صاحب

۳۔ پربینڈہ :۔ محمد یونس صاحب پیش امام۔

۴۔ خانہ پور :۔ ابوسعد سید اسمٰعیل صاحب مشہداپوری، عبدالکریم صاحب مہتمم جنگلات، ڈاکٹر محمد خلیل، سید محی الدین صاحب، شمس الدین خاں صاحب، حکیم کامل قادر خاں صاحب، عبدالرشید خاں صاحب، مہرالنساء صاحبہ۔

۵۔ گلبرگہ :۔ محمود حسین صاحب، نصیرالدین صاحب، نیاز علی خاں صاحب نیاز۔

۶۔ کلیانی :۔ عطاء اللہ صاحب عطاؔ، احمد حسین صاحب تعلقدار، غلام معین الدین صاحب، عبدالکریم صاحب، تاج الدین صاحب۔

۷۔ پرلی :۔ غلام حسین صدیقی صاحب۔ اشرف الدین صاحب فیضی۔

۸۔ کشنگی :۔ قاضی محمد حسین صاحب بی۔ اے، بلونت راؤ گھاٹے صاحب۔

۹۔ ہنم ساگر :۔ محمد حسین صاحب سب انسپکٹر آبکاری۔

۱۰۔ کپتل :۔ محمد حسین صاحب، سرفراز علی صاحب۔

۱۱۔ نرسی :۔ قاضی یوسف الدین صاحب فاروقی۔

۱۲۔ پربھنی :۔ حمید اللہ خاں صاحب شیدا، عارف الدین حسن صاحب۔

۱۳۔ چمپا پیٹھ :۔ داؤد خاں صاحب۔

۱۴۔ اندولہ :۔ سید علی صاحب رضوی۔

۱۵۔ گدوال :۔ شیخ احمد صاحب، محمد دولت صاحب، عبدالبصیر صاحب۔

۱۶۔ تنگسگور :۔ جڑیپا گوڑا صاحب، چنن گوڑا صاحب۔

۱۷۔ ناگر کرنول :۔ حکیم شیخ منصور علی صاحب وکیل۔

امتحانات کے ہال ٹکٹ اور مرکز

اردو امتحانات "اردو فاضل، اردو عالم، اردو دانی اور خوشنویسی کے ہال ٹکٹ اجرا ہوچکے ہیں۔ بلدہ کے امیدوار اپنے ہال ٹکٹ دفتر ادارہ سے بہ اوقات صبح ۹ تا ۵ ساعت شام حاصل کرسکتے ہیں۔ امسال امتحانات حسب ذیل مرکزوں میں ۱۹، ۲۰، ۲۱؍ مہر سنہ ۱۳۵۰ف کو منعقد ہوں گے۔ بلدہ، کلیانی، پربھنی، گلبرگہ، کشنگی، کاماریڈی، خانہ پور، نرسی، پرلی، پربینڈہ، کپتل۔

ہر مرکز میں خواتین کے لئے علحدہ انتظام کیا گیا ہے۔ "

وقت نامۂ امتحانات

اُردو دانی

۱۵ر مہر پنجشنبہ ۔ ۱۰ تا ۱۲½ تحریری امتحان ۔ ۲ تا ۵ زبانی امتحان ۔

اردو عالم

۱۵ر مہر پنجشنبہ ۱۰ تا ۱ پہلا پرچہ (نثر و قواعد) ۲ تا ۵ دوسرا پرچہ (نظم و عروض)

۱۶ر مہر جمعہ ۹½ تا ۱۲½ پانچواں پرچہ (خوشنویسی) ۲½ تا ۵½ پانچواں پرچہ دفتری معلومات امور خانہ داری ٹائپ وغیرہ)

۱۷ر مہر شنبہ ۱۰ تا ۱ تیسرا پرچہ (تاریخ ادب و مضمون نگاری) ۲ تا ۵ چوتھا پرچہ (عام معلومات)

اردو فاضل

۱۵ر مہر پنجشنبہ ۱۰ تا ۱ پہلا پرچہ (نثر) ۲ تا ۵ دوسرا پرچہ (نظم)

۱۶ر مہر جمعہ ۹½ تا ۱۲½ تیسرا پرچہ (تاریخ ادب و تنقید) ۲½ تا ۵½ چوتھا پرچہ عام معلومات)

۱۷ر مہر شنبہ ۱۰ تا ۱ پانچواں پرچہ (مصنف کا مطالعہ) ۲ تا ۵ چھٹا پرچہ (مضمون نگاری)

خوشنویسی

۱۶ر مہر جمعہ ۹½ تا ۱۲½ .... (ایک ہی پرچہ)

نوٹ :- (۱) جملہ امیدواروں کو چاہیئے کہ امتحان گاہ میں اجازت نامۂ شرکت اپنے ساتھ لیتے آئیں۔

(۲) خوشنویسی کے امیدوار واسلی قلم اور سیاہ روشنائی اور دیگر امیدوار صرف نپی کے قلم اپنے ساتھ لائیں۔

(۳) دواتیں اور نیلی روشنائی اور جوابی بیاضیں امتحان گاہ میں ادارہ کی طرف سے مہیا کی جائیں گی۔

ادارہ کی شاخیں

ادارہ کی شاخیں بھی برابر سرگرم عمل ہیں۔ ان میں خاص طور پر کلیانی، پربھنی اور خانہ پور کی شاخیں روزافزوں ترقی کر رہی ہیں۔

شاخ کلیانی

شاخ کلیانی مولوی احمد حسین صاحب تعلقدار اسسٹنٹ کلیانی کی صدارت میں کافی سرسبز اور بار آور ہوتی جا رہی ہے۔ آپ اردو کی ترقی کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں۔ مولوی سید سبط نبی صاحب بی اے۔ ایل ایل بی منصف عدالت کلیانی اور مولوی محمد ریاست علی صاحب منتظم پولیس۔ جناب تحصیلدار صاحب و مسٹر وامن راؤ پیشکار وغیرہ اور دیگر عہدہ داران کلیانی بھی مستحق تشکر ہیں۔ جن کی امداد اور ہمدردی شاخ کے شامل حال ہے۔

آج کل شاخ کی مصروفیات امیدواران امتحان کی تعلیم پر مرکوز ہیں۔ مولوی غلام معین الدین صاحب معین رکن تشہیر۔ مولوی نیر الدین صاحب منتظم دار المطالعہ۔ شیخ صالح صاحب تصبح و شیخ مہتاب صاحب اور معتمد شاخ امیدواروں کی تعلیم میں لگے ہوئے ہیں۔

شعبۂ طلبہ کلیانی

شعبۂ طلبا کی سرگرمیاں برابر جاری ہیں۔ اراکین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جن کی تعداد (۲۵) کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اس کے صدر مولوی مرزا محمد بیگ صاحب مرزا اور نائب صدر مولوی میر نذیر الدین صاحب نذیر مقرر ہوئے ہیں۔ اس کے ایک اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ ہر مہینہ میں دو بار کسی ایک عنوان پر تقریریں کی جائیں۔ چنانچہ اس وقت تک حب وطن، ہمدردی اور علم پر تقریریں ہو چکی ہیں۔ آیندہ کے لئے اتفاق اور دولت کے عنوانات تجویز کئے گئے ہیں۔ تقاریر میں طلبہ کافی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اگر یہی سلسلہ برابر جاری رہا تو کچھ عرصہ میں اکثر طلبہ تقریر کرنے پر قادر ہو جائیں گے۔

بتاریخ ۱۱ر شہریور ۵۰ف شعبہ طلبہ کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں شہاب الدین صاحب، آل حسن صاحب، وینکٹ راؤ صاحب شریک معتمد شعبہ طلبا و منظور احمد صاحب معتمد شعبۂ طلبا اور انوار اللہ صاحب اور عظمت اللہ صاحب اور مسٹر ترل راؤ مددگار صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ و مولوی مرزا

محمد بیگ صاحب صدر شعبۂ طلبا نے اتفاق پر تقریریں کیں جلسہ کامیاب رہا۔

شعبۂ طلبہ گلبرگہ

اس ماہ حسب ذیل طلبا نے شعبۂ طلبا کی رکنیت قبول کی۔

سید حسن سجاد رزاقی ۔ حبیب الرحمٰن ۔ حامد امین احمد ۔ غلام صادق حسین ۔ یوسف حسین ۔ بدیع الدین ۔ منہاج الدین ۔ عبدالحمید ۔ عبدالغنی ۔ عبداللطیف ۔ محمد حسن ۔ مسعود ۔ امین الدین ۔

اردو انسائیکلوپیڈیا

ترتیب کا کام شروع ہو چکا ہے ۔ اس اثنا میں دوسرے مضامین کی بھی کمیٹیاں اپنے متعدد اجلاس منعقد کر چکی ہیں ۔

شعبۂ تاریخ

اردو انسائیکلوپیڈیا کے شعبۂ تاریخ کا پہلا اجلاس پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی کی صدارت میں بروز جمعہ ۲۹ ماہ ہ رواد ۱۳۵۰ف شام کے چار بجے منعقد ہوا ۔

حاضرین :۔

مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب (۲) مولوی خواجہ محمد احمد صاحب (۳) مولوی میر محمود علی صاحب (۴) مولوی خواجہ خیر الدین صاحب (۵) مولوی بشیر الدین صاحب (۶) مولوی فیض محمد صدیقی صاحب (۷) ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ۔

۱ ۔ طے پایا کہ اردو انسائیکلوپیڈیا میں مضامین تاریخ کی تکمیل کے لئے حسب تفصیل ذیل کام کو تقسیم کیا جائے ۔

۱ تاریخ دکن ۔ { پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی ۔ مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب ۔ (علاوہ بعض خاص عہد قدیم کے لئے) مولوی خواجہ محمد احمد صاحب ۔

۲ تاریخ ہند (مع سیلون) { ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ۔ ڈاکٹر اشیشوری پرشاد صاحب ٹوپا ۔ مولوی میر محمود علی صاحب

۳ ۔ افغانستان ۔ ترکستان و وسط ایشیا ۔ ایران ۔ { ڈاکٹر قادری کلیم اللہ صاحب ۔ مولوی سید یوسف صاحب ۔ مولوی ابو نصر خالدی صاحب

۴ ۔ عراق ۔ شام ۔ فلسطین ۔ عرب (حجاز ۔ یمن ۔ نجد ۔ حضرموت) ایشیائے کوچک ۔ ارمنستان ۔ (افریقہ میں) مصر و شمالی افریقہ { مولوی جمیل الرحمٰن صاحب ۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ۔ مولوی محمد غوث صاحب

۵ ۔ تبت ۔ منچوریا ۔ منگولیا ۔ کوریا ۔ چین ۔ جاپان ۔ ایشیائی روس ۔ سیام (یا تھائی لینڈ) فرانسیسی ہند چینی (کمبوج ۔ ٹانکنگ ۔ لاؤس ۔ انام) ملایا اور ملایستیس ۔ جزائر شرق الہند (جاوا اور سماٹرا وغیرہ) ۔ { پروفیسر ہارون خاں صاحب ۔ مولوی خواجہ محمد احمد صاحب

۶ ۔ انگلستان ۔ { مولوی خواجہ خیر الدین صاحب ۔ مولوی سراج الدین احمد صاحب

۷ ۔ فرانس ۔ اسپین و پرتگال (بعد زوال غرناطہ) جرمنی و آسٹریا (مع مقدس سلطنت روما) اٹلی (مع سلطنت روما) ۔ سوئٹزرلینڈ ۔ شمالی یورپ ۔ جزیرہ نمائے بلقان مع یونان ۔ سلطنت عثمانیہ و جمہوریہ ترکیہ ۔ مکدس ۔ جزائر بحر روم ۔ (افریقہ میں) وسطی افریقہ ۔ جنوبی افریقہ ۔ آسٹریلیا ۔ نیوزیلینڈ ۔ { نواب علی یاور جنگ بہادر ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ۔ مولوی خواجہ خیر الدین صاحب ۔

۸ ۔ براعظم امریکہ ۔ { مولوی میر محمود علی صاحب ۔ مولوی آغا محمد حسین صاحب ۔ مولوی خواجہ خیر الدین صاحب

۹۔ سیاسیات { پروفیسر ہارون خاں صاحب
ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب

۲۔ جن اصحاب کے نام خط کشیدہ ہیں وہ داعی ہیں اور ان کے پاس ان اصطلاحوں کی ایک ایک نقل روانہ کرنے کا تصفیہ کیا گیا جو اردو انسائیکلوپیڈیا کے حجم اور معلومات کے معیار سے متعلق صدر مجلس میں طے ہوئے ہیں تاکہ ان کو پیش نظر رکھ کر فہرستوں اور مضمونوں کو مرتب کیا جائے۔

۳۔ طے پایا کہ ختم شہریور تک جملہ مضمونوں کی فہرستیں تیار کر کے اس مجلس کے سامنے پیش کی جائیں۔

۴۔ طے پایا کہ آئندہ اجلاس ۲ رمہر بروز جمعہ شام کے چار بجے منعقد کیا جائے۔

(ان تصفیوں کے مطابق کام جاری ہے اور تاریخ کی ذیلی مجلسوں کے کئی اجلاس اس اثنا میں منعقد ہو چکے ہیں۔)

شعبۂ اسلامیات

شعبۂ اسلامیات کا پہلا اجلاس زیر صدارت مولنا سید مناظر احسن صاحب گیلانی بروز سہ شنبہ ۹ ؍ جمادی الثانی ۱۳۶۱ھ م ۲۲ ؍ جولائی ۱۹۴۲ء دفتر ادارہ میں شام کے پانچ بجے منعقد ہوا۔

حاضرین:۔

(۱) مولنا مناظر احسن صاحب گیلانی۔
(۲) مولوی عبد الباری صاحب ندوی۔
(۳) ڈاکٹر زاہد علی صاحب۔
(۴) مولوی حسام الدین صاحب فاضل
(۵) مولوی احمد اللہ صاحب ندوی
(۶) مولوی عبد القادر صاحب صدیقی۔
(۷) ڈاکٹر قاری قطب الدین صاحب۔
(۸) مولوی عبد القادر صاحب سرعدی۔
(۹) ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور
(۱۰) مولوی غیض محمد صاحب صدیقی معتمد اردو انسائیکلوپیڈیا۔

مولوی سید ہاشمی صاحب ندوی۔ مولوی عبد القدوس صاحب ہاشمی ندوی۔ مولوی سید ابراہیم صاحب اور ڈاکٹر عبد الحق صاحب نے شرکت سے معذرت کی اطلاع دی۔

معتمد صاحب انسائیکلوپیڈیا نے وہ تمام فہرستیں اور انڈکس کارڈز پیش کئے جو علوم اسلامی سے متعلق اس وقت تک ادارے کی طرف سے مولوی عبد القادر صدیقی اور ابو الفضل صاحب ایم اے نے مرتب کئے تھے اور جن پر مولنا عبد الماجد دریابادی اور پروفیسر جمیل الرحمن صاحب نے نظر ثانی کی تھی۔

طے پایا کہ ان کارڈز کو چار سرخیوں کے تحت علحدہ کیا جائے اور پھر ہر سرخی کے تحت جتنے کارڈز جمع ہوں ان کی فہرستیں حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب کر کے مختلف ماہرین کے یہاں بغرض رائے وتقسیم کار روانہ کی جائیں۔

اسی وقت ایک ایک کارڈ کے اندراجات پڑھ کر سنائے گئے اور حسب ذیل چار سرخیوں کے تحت ان کو تقسیم کیا گیا۔

(۱) نقلیات (۲) عقلیات (۳) تاریخیات (۴) ادبیات۔

طے پایا کہ ان چاروں موضوعوں کے تحت چار ذیلی مجلسیں بنائی جائیں۔ ان مجلسوں میں جن اصحاب کو شریک رکھا جائے گا ان کے متعلق بعد میں غور کیا جائے گا فی الحال حسب ذیل نام منتخب کئے گئے۔

نقلیات۔ مولنا مناظر احسن صاحب۔ مولوی حسام الدین صاحب فاضل۔ مولوی احمد اللہ صاحب ندوی۔

عقلیات۔ مولوی عبد الباری صاحب ندوی۔ مولوی عبد القادر صدیقی صاحب۔

تاریخیات۔ ڈاکٹر زاہد علی صاحب۔ پروفیسر جمیل الرحمن صاحب۔

ادبیات۔ ڈاکٹر عبد الحق صاحب۔ ڈاکٹر زاہد علی صاحب۔ ڈاکٹر راحت اللہ صاحب

شعبۂ نسائیات

شعبۂ نسائیات کا پہلا اجلاس بروز جمعہ ۱۷ فہروری سنہ ۵۰ء شام کے پانچ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔

حاضرین:۔

(۱) محترمہ مسز ڈاکٹر جیار۔
(۲) ” مس جیسی نندی صاحبہ
(۳) ” مسز باقر علی خاں۔
(۴) ” مس خورشید ویکاجی۔
(۵) ” بلقیس بانو صاحبہ۔
(۶) مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی۔
(۷) ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔
(۸) فیض محمد صدیقی معتمد اردو انسائیکلوپیڈیا۔

مسز میر حسن صاحب نے بذریعہ ٹیلیفون شرکت سے معذرت چاہی

۱۔ طے پایا کہ اردو انسائیکلوپیڈیا میں مضامین نسائیات کی تکمیل کے لیے ذیل کی تفصیل کے مطابق کام کو تقسیم کیا جائے۔

(۱) سوزن کاری۔ کارچوب اور کشیدہ کاری وغیرہ — محترمہ بلقیس بانو صاحبہ۔
(۲) بچوں کی نگہداشت }
(۳) امور خانہ داری } محترمہ مسز باقر علی خاں
(۴) پکوان (نمکین اور شیریں) — محترمہ مسز ڈاکٹر جیار
(۵) اشیائے خانہ داری — محترمہ مس خورشید ویکاجی
(۶) لباس }
(۷) زیورات } مولوی آغا حیدر حسن صاحب
(۸) گھر کی آرایش — محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ
(۹) کھلونے }
(۱۰) بچوں کے کھیل } محترمہ خدیجہ بیگم صاحبہ
(۱۱) رسم و رواج — مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی
(۱۲) مشہور عورتیں }
(۱۳) نسوانی تحریکات } محترمہ مس جیسی نندی صاحبہ
(۱۴) سنگار اور بال بنانا — محترمہ مس پدمجا نائڈو

۲۔ طے پایا کہ یہ خواتین و اصحاب اپنے مفوضہ مضمون یا ذیلی شعبہ کے ذمہ دار رہیں گے اور اپنے کام میں حسب ضرورت دوسری خواتین و اصحاب سے مدد لیں گے۔

۳۔ طے پایا کہ سب سے پہلے ہر مندرجہ بالا عنوان سے متعلقہ اسماء و اصطلاحات کی فہرستیں تیار کرلی جائیں۔ اور پھر ان کو حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دے کر پہلے انہی اسما یا اصطلاحات پر نوٹ لکھے جائیں جو الف سے شروع ہوتے ہیں۔ ان کے بعد دوسرے حروف سے شروع ہونے والے الفاظ پر ترتیب وار کام کیا جائے۔

۴۔ طے پایا کہ مضمونوں اور مواد کے انتخاب میں ہندستان کے جملہ مذاہب اور تمدن کی نمایندگی کا خیال رکھا جائے۔

۵۔ طے پایا کہ ہندستانی امور پر بمقابلہ دیگر ممالک کے زیادہ شرح و بسط سے لکھا جائے۔

۶۔ حسب ذیل خواتین سے بھی استدعا کی جائے وہ اردو انسائیکلوپیڈیا کے شعبہ نسائیات سے متعلقہ مضامین کی ترتیب میں تعاون کریں اور ادارہ کو مطلع فرمائیں کہ ان کو کس موضوع سے دلچسپی ہے۔

(۱) محترمہ مس زبیدہ یزدانی (باغ تاریخ)
(۲) ” مس جلسن (نامپلی ہائی اسکول)
(۳) ” مس سباراؤ (زنانہ کالج)
(۴) ” بشیر النساء بیگم صاحبہ (نامپلی ہائی اسکول)
(۵) ” ڈاکٹر شری کھنڈے (زنانہ ہاسپٹل)
(۶) ” مسز ڈاکٹر مقبول علی
(۷) ” مسز میر حسن
(۸) ” مسز نواب علی (زنانہ کالج)

(۹) محترمہ مسز علمبردار (جوبلی ہل)
(۱۰) " مسز ریچانگ (چراغ علی گلی)
(۱۱) " جعفری بیگم صاحبہ (زنانہ کالج)
(۱۲) " مسز امیر حسن (جوبلی ہل)
(۱۳) " جہاں بانو بیگم صاحبہ (زنانہ کالج)
(۱۴) " محمدی بیگم مسز جمیل حسن جوبلی ہل

۷۔ طے پایا کہ آئندہ اجلاس مہر کے پہلے ہفتے میں مقرر کیا جائے۔ اور شہریور کے ختم تک جملہ خواتین و اصحاب اپنا اپنا مفوضہ کام مکمل کرکے ادارہ کے دفتر کو روانہ فرمادیں۔

شعبۂ تعلیمات تعلیمیات سے متعلق مضامین کے اندراج کے لئے ملک کے مشہور ماہر تعلیم مولوی محمد سجاد مرزا صاحب ایم اے (کیمبرج) سی ٹی (لندن) کے حسب ایما اس طرح کام کو تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ مولوی میر احمد علی خاں صاحب — تاریخ۔ مسائل تعلیم نظم ونسق تعلیم۔
۲۔ " ملک سردار علی صاحب — فلسفہ تعلیم۔ تعلیمی نفسیات۔
۳۔ " ملا فخر الحسن صاحب — تاریخ تعلیم۔ طریقۂ تعلیم اردو۔ بیسک ہندستانی
۴۔ " عبد العزیز صاحب — طریقۂ تعلیم حساب ریاضی۔ نفسیات اطفال۔
۵۔ " ریاض الدین خاں صاحب — طریقۂ تعلیم جغرافیہ و تاریخ۔ اردو ادب۔
۶۔ " عبد الرحمن مہاجر صاحب — طریقۂ تعلیم سائنس و ریاضی۔ یورپی نظامات تعلیم
۷۔ " خواجہ یوسف الدین صاحب — طریقۂ تعلیم انگریزی۔ انگریزی ادب متعلقہ اطفال۔ بیسک انگلش۔ (مولوی خیرات علی صاحب زیدی مددگار فوقانیہ میدک)۔
۸۔ " فاروق حسین صاحب — ورزش جسمانی۔ حفظ صحت مدرسہ۔
۹۔ جناب جگ موہن لال صاحب — تعلیم مطالعہ قدرت و باغبانی۔ سائنس۔
۱۰۔ مولوی شیخ سمیع اللہ صاحب — تعلیم دستی۔ ڈرائنگ۔ پینٹنگ۔
۱۱۔ مولوی عبد القادر بیگ صاحب — تعلیم دست کاری۔
۱۲۔ " شیخ حسین صاحب — خطاطی۔ (بنیادی یا بیسک رسم خط۔
۱۳۔ " حبیب احمد فاروقی صاحب — تجرباتی تعلیم۔ وپیشہ نمائی۔
۱۴۔ جناب ویدنتاچاری صاحب — جدید امتحانات۔

شعبۂ جغرافیہ دوسرا اجلاس زیر صدارت مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے کنٹب پنجشنبہ ۲۰ ر شہریور ۵۰ ف صبح ساڑھے نو بجے منعقد ہوا۔

(۱) مولوی غلام قادر صاحب
(۲) " عبد الستار صاحب سجانی
(۳) " عبد الجبار صاحب سجانی
(۴) مسٹر قاسم علی سجن لال صاحب
(۵) مسٹر گنیش چند صاحب
(۶) مولوی محمد یوسف صاحب
(۷) ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور
(۸) سید بادشاہ حسین معتمد اردو انسائیکلوپیڈیا

۱۔ مولوی عبد الوکیل صاحب کی مرسلہ فہرست ریاضیاتی جغرافیہ پڑھ کر سنائی گئی۔ جس کی نسبت متفقہ طور پر خیال کیا گیا کہ یہ مبسوط اور مکمل ہے۔ یہ رائے ظاہر کی گئی کہ اس موضوع پر پانچ مستقل اور بڑے مقالے لکھے جائیں جن کے عنوان یہ ہیں۔

(۱) نظام شمسی (۲) زمین (۳) آفتاب (۴) چاند و سیارے

اور باقی الفاظ پر ذیلی طور پر چند جملے یا چند سطریں کافی ہوں گی۔ جو اسماء کہ علم ہیئت سے تعلق رکھتے ہیں ان کی نسبت مولوی عبد الوکیل صاحب سے خواہش کی جائے کہ وہ صرف جغرافیہ کی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر ان پر مقالہ یا نوٹ لکھیں۔ صاحب موصوف سے یہ بھی دریافت کرنا طے پایا کہ آیا انھیں مذکورۂ بالا نقطۂ نظر پسند ہے یا وہ خود اس بارے میں کچھ اپنا خیال پیش کریں گے۔

۲. مولوی عبدالمجید صاحب سالک کی فہرست سمندر ماس کے متعلقات پڑھ کر سنائی گئی۔ طے پایا کہ وہ الف سے شروع ہونے والے الفاظ پر نوٹ مرتب کرنا شروع کر دیں۔ اس کے علاوہ سمندروں کی ساخت اور ان کی سیاسی و معاشی اہمیت سے متعلق بھی عنوانات کا اپنی فہرست میں اضافہ کریں۔

۳. گذشتہ اجلاس میں کرۂ ہوا سے متعلق کام کسی کے سپرد نہیں کیا گیا تھا۔ طے پایا کہ مولوی عبدالمجید صاحب کے سپرد یہ کام کیا جائے اور وہ اس سے متعلق الفاظ اور اصطلاحات کی فہرست مرتب کریں اور نوٹ لکھیں۔

مولوی محمد یوسف صاحب کی فہرست آسٹریلیا سے متعلق سنائی گئی۔ مجلس کا خیال ہے کہ یہ کافی تفصیلی اور مناسب ہے۔ آسٹریلیا پر صاحب موصوف نے اپنا لکھا ہوا نمونہ کا مضمون سنایا جو ابھی نامکمل ہے۔ طے پایا کہ اس کو اسی طرح مکمل کر لیا جائے۔

مسٹر گنیش چند صاحب نے اپنی فہرست افریقہ سے متعلق سنائی اور افریقہ پر اپنا لکھا ہوا نمونہ کا مضمون بھی سنایا۔ یہ بھی زیر تکمیل ہے۔ طے پایا کہ یکسانیت کے لئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کو نمونہ بنا لیا جائے۔

۶. مولوی غلام محمد صاحب اور مولوی عبدالعزیز صاحب کی مرتب کردہ فہرست دنیا کی خطہ وار تقسیم سنائی گئی۔ اوسط الوقت استوائی خطہ پر مضمون لکھنے کے لئے کہا گیا۔

۷. مسٹر قاسم علی سجن لال اور مولوی عشرت علی خاں صاحب نے فہرست پیش نہیں کی لیکن اول الذکر نے بیان کیا کہ یہ کام مکمل ہو چکا ہے۔ قاسم علی صاحب نے اپنے ذمہ یورپ اور برطانیہ کا علاقہ لیا ہے اور عشرت علی خاں صاحب کے تفویض ایشیا کیا گیا ہے۔

۸. پروفیسر ظہیر حسن صاحب (پٹنہ) کا خط پڑھ کر سنایا گیا۔ طے پایا کہ خطیب عبداللطیف صاحب کو کمرشیل جغرافیہ کی فہرست مرتب کرنے کے لئے لکھا جائے اور بعد میں یہ فہرست ظہیر حسن صاحب کے یہاں نوٹ مرتب کرنے کے لئے بھیجی جائے۔

۹. طے پایا کہ مضامین میں نقشوں اور تصویروں کا خاص طور سے خیال رکھا جائے۔ اور مقالہ نگار حضرات سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے مضمون میں ان کی جگہ اور سائز وغیرہ کی نسبت ضروری ہدایات واضح کریں۔

ادارہ

(ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں)

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	
من کی بپتا	۸۰	۰	۸	۰
سرگذشت غالب	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
دکن نمبر (۷۸ تصاویر) ...	۱۶۸	۲	۰	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں	۱۶	۰	۲	۰
سر سالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم ..	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی ...	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب ...	۵۶	۰	۲	۶
" دوسری کتاب ...	۵۶	۰	۴	۶
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر	۹۶	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴	۱	۰	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰
رسایل طبیہ	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں	۴۰	۰	۴	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈ سورتھ اور اسکی شاعری...	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں ...	۸۹	۱	۰	۰
ٹیگور اور ان کی شاعری ...	۱۲۸	۱	۴	۰
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر...	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) " ...	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن ...	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
مدارس میں اردو ...	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن	۱۰۴	۱	۴	۰
روح غالب	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء ...	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی	۲۱۲	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

سب رس

تین گھنٹے ٹیگور کے ساتھ!

چند برس پہلے کی بات ہے کہ سید محمد صاحب اور میں مہمان خانہ "راک لینڈ" کے وبانڈے میں کھڑے حسب ذیل اعلان پڑھ رہے تھے۔

اعلان

سوء اتفاق سے ڈاکٹر ٹیگور کچھ علیل سے ہو گئے ہیں اور ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق انھیں آرام کی ضرورت ہے اس لئے وہ ملاقاتیوں کو وقت دینے کے قابل نہیں ہو سکیں گے، براہ کرم انھیں معاف فرمایا جائے۔ معتمد

میں نے اس اعلان کو لاپروائی سے پڑھا لیکن سید صاحب پر اس کا کافی اثر معلوم ہوتا تھا۔ زبان سے تو میں کچھ نہ کہہ سکا لیکن مسکرا کر یہ ظاہر کرنا چاہا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہر بڑے آدمی کی آمد پر اسی قسم کا اعلان کیا جاتا ہے تاکہ ملنے والوں کا ہجوم ضرورت سے زیادہ تکلیف دہ نہ ہو جائے۔

"صاحب! آپ لوگ اگر آٹوگراف لینے آئے ہیں تو اپنی کاپیاں چھوڑ جائیے" نوکر نے پڑھایا ہوا سبق دہرایا "تین چار روز بعد معتمد صاحب ان پر دستخط لے لینگے اور آپ کسی وقت آ کر انھیں لے جائیں"۔

سید صاحب نے اس کو لطف خاص جانا اور فوراً ہی جیب سے آٹوگراف بک نکال کر نوکر کے حوالہ کر دی۔

"سوچ کیا رہے ہیں آپ! دے کیوں نہیں دیتے بیاض" سید صاحب نے گویا موقع سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ یاد دلایا" میں سوچ رہا تھا کہ آپ بھی بیاض کیوں نہ واپس لے لیں" میں نے کہا" پھر کسی روز آ کر ہم خود دستخط کروالیں گے" "اب رہنے بھی دو" سید صاحب بولے" دوبارہ کون آئے اور پھر کسے معلوم کہ ملاقات ہو بھی سکے یا نہیں"۔ سید صاحب کی اس ترغیب کے باوجود میں نے بیاض نہیں دی۔

تین روز بعد پھر راک لینڈ پہنچا۔ سیڑھیاں چڑھ کر میں ورانڈے میں پہنچا ہی تھا کہ ساڑھے آٹھ کا گھنٹہ بجا۔ اس دفعہ بھی وہی اعلان موجود تھا۔ میں نے بغور پڑھا کہ شاید الفاظ میں کسی قسم کی تبدیلی کی گئی ہو مگر وہی الفاظ بدستور باقی تھے البتہ نہ کوئی مہمان خانہ کا ملازم تھا اور نہ ٹیگور کا معتمد۔ چند لمحے باہر انتظار کرنے کے بعد میں ملحقہ کمرے میں پہنچا اور ٹوپی میز پر چھوڑ کر سگریٹ جلایا۔ ایک آرام دہ کرسی پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ کس طرح ٹیگور تک پہنچنا ممکن ہے!

جب دوسرا سگریٹ بھی ختم ہوا اور کوئی ملازم خبر لینے نہ آیا تو مجھے خیال ہوا کہ تھوڑی سی بے تکلفی برتنی چاہیے۔ بغیر کسی قسم کا خاص منصوبہ سوچے میں مہمان خانہ کے اندرونی حصہ کی طرف گیا فی الوقت تو مجھے نوکر کی تلاش تھی لیکن جب کوئی نظر نہ آیا اور ادھر ادھر گھومنے کے بعد ایک ورانڈے میں ڈاکٹر ٹیگور نظر آئے تو طبیعت بے چین ہو گئی۔ ایک آرام کرسی پر وہ لیٹے ہوئے تھے بازو ایک تپائی پر تازہ اخبار اور دو ایک کتابیں دھری تھیں۔ صندلی رنگ کے لبادہ پر ان کی سفید ریش کچھ عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھی اخبار ان کے ہاتھ میں تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اسے پڑھ رہے تھے میری آمد کو انھوں نے محسوس کیا لیکن پروا نہ کی۔ دل بے اختیار چاہتا تھا کہ حسن اتفاق سے جو موقع ملا ہے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں مگر جھجک اور تکلف کی وجہ سے قدم اٹھتے نہ تھے۔ میں گہری سوچ میں تھا لیکن ان کے سامنے اس طرح کھڑے ہو کر سوچتے رہنا بھی بے موقع سا تھا۔ قطعی فیصلہ کرنے کے لئے وقت درکار تھا اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ ورانڈے میں اسی طرح بے معنی طور پر گھومتا رہوں۔ نوکروں کا دور تک پتہ نہ تھا۔ میں ادھر ادھر گھوم کر پھر ٹیگور کے سامنے سے گزرا مگر اب بھی کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ ایسے میں ایک آواز میرے کان میں آئی، آواز دھیمی، سریلی اور رس بھری تھی۔

"ایک منٹ کے لئے تکلیف کریں گے آپ؟" ٹیگور پوچھ رہے تھے۔

اس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے حواس مجتمع کئے پھر بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ٹیگور کس سے مخاطب ہیں — میرے سوا کوئی اور وہاں نظر نہ آتا تھا اور میں اجنبی تھا — باہر لٹکا ہوا اعلان ابھی

ٹیگور ابھی کی طرف اشارہ کرنا تو نہیں چاہتے؟ دفعتاً مجھے خیال آیا اور ساتھ ہی مجھے اس طرح بلا اطلاع گھس آنے پر ندامت سی محسوس ہونے لگی۔

"کیا آپ کو ذرا سی تکلیف دینا چاہتا ہوں" میں نے اس خوف ابھی طرح دیکھا کہ ٹیگور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے "بہت اچھا، ابھی آیا" کہنے کی میں نے ہمت کی۔

"معاف کیجئے، یہاں کوئی نوکر نظر نہیں آتا"

"جی ہاں میں بھی نوکر ہی کی تلاش میں تھا ــــ بوائے! بوائے!! ــــ نوکر کو پکارتے ہوئے میں نے کہا" فرمائیے نا آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے معلوم ہوتا ہے کہ نوکر سب ناشتہ کر رہے ہیں، میرے لائق کوئی خدمت؟"

"میرا معتمد اوپر ہے یا باہر چلا گیا، ذرا دیکھ لیجئے"

"بہت بہتر"

میں فوراً اوپر گیا لیکن چونکہ یہ معلوم نہ تھا کہ معتمد صاحب کس کمرے میں رہتے ہیں اس لئے بڑی مشکل ہوئی ان کی تلاش میں۔ بالآخر جب بغیر کچھ معلوم کئے ہوئے واپس ہو رہا تھا ایک نوکر اتفاقاً ملا۔ اس سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ معتمد صاحب آدھ گھنٹہ پہلے جا چکے ہیں۔

"معتمد صاحب آدھ گھنٹہ پہلے جا چکے ہیں" میں نے واپس ہو کر اطلاع دی۔

"شکریہ! آپ کو بڑی تکلیف ہوئی"

"جی نہیں، آپ اس کا خیال نہ فرمائیں ــــ آپ کو کس چیز کی ضرورت معلوم ہوتی ہے، اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھ سے فرمائیں"

"شکریہ، کوئی خاص بات نہیں، ضرورت ہوگی تو آپ سے مدد لے لوں گا"

اتنے میں باہر موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس وقت میری مدد کی ضرورت ہے"۔

ٹیگور ہنس پڑے اور میں باہر پہنچا۔ ایک صاحب پتلون پر لمبا کالا کوٹ مدراسیوں کی وضع کا پہنے صافہ باندھے اور ستار ہاتھ میں لئے میرے منتظر کھڑے تھے۔

"میں گرو جی کے چرنوں میں بیٹھ کر ستار پر ایک راگنی بجانا چاہتا ہوں" پنڈت جی نے کہا۔

"مگر ان کی طبیعت ناساز ہے ــــ دیکھئے نا یہ اعلان" یہ کہہ کر میں نے اعلان ان کی آنکھوں کے آگے کر دیا جس کو پڑھے بغیر انھوں نے سلسلہ جاری رکھا۔

"مگر پرسوں ان کے سکریٹری صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کسی طرح آج وہ مجھے موقع دیں گے"

"سکریٹری صاحب اس وقت موجود نہیں ہیں، آپ پھر کسی وقت ان سے مل کر اس کا تصفیہ کریں" یہ کہہ کر میں واپس ہونا ہی چاہتا تھا کہ وہ بولے "کرپا کیجئے صاحب کرپا، میں سکندرآباد سے ٹکسی پر آیا ہوں اس سے پہلے بھی چکر کر چکا ہوں۔ میں زیادہ تکلیف نہ دوں گا، صرف دس منٹ ستار بجاؤں گا۔ یقیناً گرو جی خوش ہوں گے، سنا ہے کہ انھیں ستار سے بڑی دلچسپی ہے ــــ مہربانی کیجئے، میں بڑا ممنون ہوں گا" ستار تپائی پر رکھ کر وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر پیشانی تک لے گئے۔

"میری بڑی آرزو ہے، آپ دیا کریں تو مجھے موقع مل جائے گا" مجھے سوچ میں دیکھ کر انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"ایک صاحب آپ کو ستار سنانا چاہتے ہیں، دس منٹ سے زیادہ وقت نہ لینے کا وعدہ کرتے ہیں" میں نے واپس ہو کر ٹیگور کو اطلاع دی "میں نے ٹالنے کی کوشش کی مگر انھیں اصرار ہے کہ موقع دیا جائے"

"اچھی بات ہے بلا لیجئے"

پنڈت یہ مژدہ سن کر خوشی سے پھول گئے۔ ٹیگور کو انھوں نے مؤدبانہ طور پر بڑے سلیقہ سے پرنام کیا اور گرو جی کے چرنوں میں آرزو کے مطابق بیٹھ گئے اور فوراً ہی تار چھیڑنے شروع کئے۔ دس منٹ بعد انھوں نے کہا اسی راگنی کو میں حلق سے بھی ادا کروں گا۔

"ڈاکٹر صاحب ٹال نہیں جانتے" میں نے جرأت آمیز قدم اٹھایا۔
"لیکن گانے کو زبان سے زیادہ تعلق نہیں" پنڈت جی نے فوراً ہی جواب دیا۔

دس منٹ تک وہ گاتے رہے۔ ختم کرتے ہی ٹیگور نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ستار بجانے کی بڑی تعریف کی اور اس اخلاقی تعریف کو حسن طلب سمجھ کر دوسری گت چھیڑنے ہی والے تھے کہ ٹیگور نے انہیں منع کیا یہ کہہ کر آپ تکلیف نہ کریں اس وقت میری طبیعت کچھ زیادہ راغب نہیں معلوم ہوتی۔

پنڈت نے جاتے جاتے چرن چھوئے، پرنام کیا اور دل بھر کر مسکرا لیا۔

جب یہ چلے گئے تو ٹیگور نے مجھ سے پوچھا "آپ کو بھی موسیقی سے کچھ لگاؤ ہے؟"

"اس حد تک لگاؤ ہے کہ سن لیتا ہوں اور بغیر سمجھے بوجھے جتنا لطف مل سکتا ہے حاصل کر لیتا ہوں" میں نے جواب دیا۔ وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے "آپ کے ہاں موسیقی کا کیا حال ہے!"

"اتنا شوق تو نہیں جتنا بنگال میں ہے" میں نے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ وہ بولے "آپ کھڑے کیوں ہیں؟ کرسی لے لیجئے نا ——— معاف کیجئے آج آپ کو مہمان خانے کی نگرانی کے سوا میرے معتمد کے خدمات بھی انجام دینے پڑ رہے ہیں۔"

اب مجھے معلوم ہوا کہ ایک طرف ٹیگور مجھے اس مہمان خانہ کا منتظم سمجھ رہے ہیں اور دوسری طرف اتفاقی مجھے ان کا پرائیوٹ سکریٹری سمجھتے ہیں۔

"نہیں کوئی بات نہیں، آپ ہمارے مہمان ہیں اور مہمان کی ہر طرح خاطر اور خدمت کرنا ہمارا فرض ہے" میں نے گول گول الفاظ میں جواب دینا مناسب سمجھا۔

"ہاں تو آپ موسیقی کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے" ٹیگور بولے۔

"میں عرض کر رہا تھا کہ ہمارے ہاں گانے کا اتنا شوق نہیں جتنا کہ بنگال، مہاراشٹرا اور آندھرا میں ہے۔"

"آپ کے ہاں مدارس میں موسیقی تو شامل نہیں ہوگی"

"جی نہیں ——— لیکن اب بعض مدارس میں ابتدائی جماعتوں میں اس کی تعلیم دی جانے لگی ہے۔"

"کوئی موسیقی کا اسکول ہے یہاں؟"

"جی نہیں کوئی خاص اسکول نہیں۔"

"یہی وجہ ہے ——— بنگال میں ایسے بے شمار مدارس ہیں جہاں باضابطہ طور پر صرف موسیقی ہی سکھائی جاتی ہے۔"

"درست ہے اسی وجہ سے زیادہ چرچا ہے ——— اور آپ کے شانتی نکیتان کا کیا حال ہے؟"

"شانتی نکیتان؟ ——— آپ نے دیکھا ہے مدرسہ؟"

"جی نہیں، مجھے بدقسمتی سے موقع نہیں ملا؟"

"آپ کلکتہ آئے ہیں؟"

"نہیں شمال مشرقی ہندوستان کی طرف جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"اس مدرسے سے دلچسپی ہے آپ کو"

"بہت"

"یہاں لوگ عام طور پر کیا خیال کرتے ہیں ——— بعض مقامات پر تو میں نے سنا کہ لوگ اسے تفریح گاہ سمجھتے ہیں۔"

"سنجیدہ طبقہ تو اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور طریقۂ تعلیم میں اس کو ایک انقلابی زینہ سمجھتا ہے"

"سنجیدہ طبقے کو چھوڑیئے، ہمیں تو عوام سے واسطہ ہے۔"
عوام بھی اتنے بدظن نہیں"

"اتنے نہیں مگر ہیں ضرور، کیوں یہی ہے نا مطلب"
میں مسکرا رہا تھا اور ڈاکٹر صاحب ہنس رہے تھے۔

"آیئے نا کسی وقت! آپ دیکھ کر بہت خوش ہوں گے، اب تو اس کے کئی شعبے ہو چکے ہیں اور آپ اس کو مشرقی وضع کی ایک بڑی درس گاہ پائیں گے"

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک نوکر دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا ایک

بیگم صاحب آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے وہ اعلان دکھا یا مگر اتنی نہیں۔" میں اٹھ کر باہر گیا۔ ایک لمبی تڑنگی او ادھیڑ عمر کی مغربی نژاد عورت بے چینی کے ساتھ ٹہل رہی تھی مجھے آتا دیکھ کر وہ لپکی اور مسکراہٹ کو ہر لحظہ اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"صبح بخیر! میں مس ــــــ ہوں" افسوس کہ مجھے اس کا نام اب یاد نہیں رہا۔ میں نے بھی سلام کا جواب سلام سے اور مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا اور اس کو اعلان دکھانے میں جلدی کی۔

"یہ تو میں دیکھ چکی ہوں" اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "آپ نے میرا نام سنا ہوگا؟"

"جی ہاں یاد تو پڑتا ہے لیکن" میں نے اخلاق میں جھوٹ کی آمیزش کی۔

"مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر ٹیگور بھی میرے نام سے ناواقف نہ ہوں گے" اس نے فوراً بات کاٹ کر کہا۔

"ممکن ہے"

"اور یہ بھی آپ کو معلوم ہوگا کہ امریکہ سے ہندوستان تفریحی سفر پر آئی ہوں۔ تصویریں کھینچنا میرا محبوب ترین شغلہ ہے۔ ابھی تک میں نے ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیکڑوں تصویریں کھینچی ہیں۔ ان میں مناظر بھی شامل ہیں اور شخصیتوں کی شبیہیں بھی شامل ہیں"

کہنے کو جھوٹ کہہ چکا تھا کہ میں اس کے نام سے واقف ہوں لیکن اب معلوم کر کے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ وہ خیر سے مصورہ ہے۔

"کیا آپ ٹیگور کی تصویر کھینچنا چاہتی ہیں؟"

"جی ہاں، بالکل صحیح ہے"

"اس کے لئے آپ کو پھر کبھی آنا پڑے گا"

"نہیں نہیں، میں بہت جلد حیدرآباد سے جانے والی ہوں۔ زیادہ دیر تکلیف نہ دوں گی آپ مطمئن رہیں ــــــ کیا ڈاکٹر ٹیگور بستر پر ہیں؟"

"نہیں آرام کرسی پر"

"تب تو ٹھیک رہے گا ــــــ میں اسی حالت میں تصویر کھینچ لوں گی۔ خاص نشست کی ضرورت نہیں"

"پھر بھی"

"کچھ نہیں صرف بیس پچیس منٹ کا معاملہ ہے، آپ میری مدد فرمائیں، آپ کو رشوت میں ایک دوسری تصویر دوں گی یا آپ کی خود کھینچ دوں گی" وہ مسکرا کر بولی۔

میں نے واپس ہو کر ٹیگور کو حالات سے آگاہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اچھا بلا لو۔ ٹیگور کے سامنے پہنچنے تک اس نے میرا کئی دفعہ شکریہ ادا کیا۔ ٹیگور اس کی تعظیم کے لئے اٹھنا چاہتے تھے مگر وہ مانع ہوئی۔

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ میری تصویروں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" اس نے آس پاس کا ماحول درست کرتے ہوئے ٹیگور سے پوچھا

"معاف کیجئے اس وقت مجھے آپ کی تصویریں یاد نہیں"

مصورہ نے بعض رسائل کے نام لئے جن میں اس کی تصویریں ابھی حال میں شائع ہوئی تھیں اور ٹیگور نے بمشکل یاد کیا کہ ان میں سے بعض ان کی نظر سے گزری ہیں۔

"آپ کی پنسل کاری واقعی خوب ہے" ٹیگور بولے

"شکریہ! میں زیادہ تر پنسل کاری ہی کرتی ہوں، خصوصاً آپ کے ملک کی تصویریں تو میں نے پنسل ہی سے کھینچی ہیں ــــــ مسٹر حسین! کیا میں یہ تپائی ہٹا کر اس طرف قریب کر سکتی ہوں"

"کیوں نہیں ــــــ کیا کسی چیز کی اور ضرورت ہوگی؟"

نہیں ــــــ البتہ دو ایک تکیے مل سکتے تو شاعر کی گردن کے نیچے رکھ دیئے جاتے تاکہ چہرہ ابھرے"

"اچھی بات ہے ــــــ بوائے! دیکھو، اندر سے دو تین تکیے لاؤ" نوکر تکیے لینے لپکا۔ ٹیگور نے کہا "اگر آپ کو یہ ماحول پسند نہیں تو میں اندر کمرے میں چلا جاؤں"

"جی نہیں، اندر تو اندھیرا ہے ابر کی وجہ سے یہیں مناسب ہے

آپ آرام سے تشریف رکھیں" مصورہ بولی اتنی دیر میں نوکر تکیے لے کر پہنچ گیا۔
"آپ کو تکلیف دے سکتی ہوں" مصورہ بولی اور اس نے تکیے ٹیگور کی گردن کے نیچے رکھ دیے۔
"تصویر پوری کھینچیں گی یا صرف بسٹ؟" ٹیگور نے دریافت کیا۔
"میں سمجھتی ہوں کہ بسٹ تو اس "پوز" میں اچھا نہیں رہے گا۔ کرسی سمیت تصویر کھینچوں گی ——— ڈاکٹر صاحب آپ نے بھی کبھی بسٹ کھینچے ہیں؟"
"کھینچے تو ہیں لیکن بہت ہی کم ——— آپ نے میری تصویریں دیکھی ہیں؟"
"ہاں، کئی تصویریں"
"کیا خیال ہے آپ کا ان کے متعلق؟"
"میرا"
"میرا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کے ملک والوں کے خیالات معلوم کروں، بیشک ان کے لئے میری تصویریں بالکل ہی غیر متوقع ہیں، میری تصویروں میں ادبیت عنصر بالکل نہیں ہوتا"
جی ہاں ہندو فلسفہ ہوتا ہے"۔
"ہندو فلسفہ کا ذکر نہیں بلکہ میری تصویریں اصل خیال کا سایہ ہوتی ہیں۔ انسان کے تخیل میں وہ تنظیم اور وہ مادیت نہیں ہوتی جو عام طور پر تصویروں میں ظاہر ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تخیل کی دھندلی تصویروں کو اصلی خد و خال اور رنگ اور شکل میں ظاہر کروں ———"
"تو گویا آپ کی تصویریں بھی اشعار ہوتی ہیں" میں نے کہا۔
"ہاں، بالکل صحیح ہے" ٹیگور بولے۔
"اسی وجہ سے آپ مصوری کے عام اصولوں کی پیروی نہیں کرتے" میں نے پھر کہا۔
"جی ہاں، عام اصول تو کیا میں خاص اصول کی بھی پیروی نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ میں اپنے آپ کو مصور ان معنوں میں نہیں کہتا جن معنوں میں دوسرے لوگ مصور ہیں"

مصورہ نے اس وقت تک ایک بڑے ڈرائنگ پیپر کو لکڑی کے تختہ پر لگا لیا تھا کئی زاویوں سے شاعر کو دیکھ کر اس نے ایک زاویہ پسند کیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر اس نے خاکہ کشی کی اجازت طلب کی۔
"کیا میں اس اثنا میں کتاب پڑھ سکتا ہوں کیونکہ آپ کی طرف دیکھتے رہنا میرے لئے بہت بار ہوگا،" ٹیگور نے پوچھا "ضرور ضرور کیوں نہیں"
ٹیگور کی نظریں کتاب پر جمی تھیں، مصورہ اپنی قلم کاری میں مصروف تھی اور میں نے اجازت طلب کر کے ایک سگریٹ جلا لیا۔ رہ رہ کر میری آنکھیں کبھی مصورہ کی پنسل کو دیکھتی تھیں اور کبھی شاعر کے چہرہ کو۔ پانچ ——— دس پندرہ ——— بیس ——— پچیس منٹ اسی طرح گزرے۔ اس اثنا میں ٹیگور کے معتمد صاحب بھی تشریف لا چکے تھے۔ محفل کا یہ رنگ دیکھ کر کچھ حیران سے تھے لیکن ان کو علٰحدہ لے جا کر میں نے انھیں سمجھایا کہ دو گھنٹہ سے میں ان کے فرائض بجا لا رہا ہوں۔ ان کے لئے سوائے اظہار ممنونیت کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ دبی زبان سے انھوں نے یہ پوچھ لیا کہ شاعر ان کی غیر حاضری کو محسوس تو نہیں کر رہے تھے کیونکہ انھوں نے کافی دیر لگا دی تھی۔ میں نے اطمینان دلایا کہ میری موجودگی میں ٹیگور نے ان کی غیر حاضری محسوس نہ کی۔
کوئی آدھ گھنٹہ میں مصورہ نے پنسل اسکیچ مکمل کر لیا۔
"معاف کیجئے، میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی" انھوں نے تصویر ٹیگور کو دکھاتے ہوئے کہا "دیکھوں تو آپ اسے کیسے پسند فرماتے ہیں"۔
کچھ دیر تک ٹیگور دیکھتے رہے اور میں بھی قریب ہو کر دیکھتا رہا۔
"بڑی اچھی تصویر بنائی آپ نے، کافی مشق معلوم ہوتی ہے" بالآخر ٹیگور بولے۔
"شکر ہے کہ آپ نے پسند کی، میں سمجھتی ہوں کہ میری محنت ٹھکانے لگی ——— ابھی اس پر ایک آدھ گھنٹہ اور کام کروں گی گھر جا کر"۔
"کیا یہ آپ شاعر کو تحفہ دیں گی؟" میں نے پوچھا
"یہ نہیں، اس کو تو اپنے ہاں رکھوں گی البتہ اس کی ایک نقل بھیج دوں گی"۔

تصویر ابھی تک ٹیگور کے ہاتھ میں تھی۔ معصومہ نے قلم شاعر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے خواہش کی کہ وہ اس پر اپنے دستخط فرما دیں جس کو ٹیگور نے خوشی سے منظور کیا۔ تصویر لے کر وہ خوش خوش روانہ ہوئی

"آپ کے پرائیوٹ سکریٹری آ چکے ہیں، فرمائیے تو انہیں بلاؤں" میں نے پوچھا۔

"ہاں ضرور بلوائیے۔"

میں نے نوکر کو آواز دی اور مسعود صاحب کو بلوا بھیجا۔ ڈاک آ چکی تھی۔ مسعود صاحب اپنے ساتھ کئی خطوط اور متعدد اخبار ساتھ لے آئے۔ ٹیگور نے بعض خطوط کے جواب لکھوائے اور بعض کے جواب مسعود کو اپنی طرف سے دینے کے لئے کہا۔ ان میں آخری خط کسی پبلشنگ ہاؤس کا تھا، افسانوں کے مجموعہ کی اشاعت کی اجازت طلب کی تھی۔ مجھے فوراً اپنا ایک واقعہ یاد آیا۔

"اگر اجازت ہو تو ایک بات کہوں، اس خط سے یاد آ گئی" میں نے پوچھا۔

"ضرور ——" وہ مسکرا کر بولے۔

"پچھلے سال میں نے آپ کے بعض افسانے اردو میں ترجمہ کئے تھے اور ان کو مجموعہ کی شکل میں چھاپنے کی اجازت کے لئے آپ کو لکھا تھا لیکن آپ نے "لانگ منس" سے اجازت حاصل کرنے کی ہدایت کی۔"

"مجھے آپ کے خط کا خیال نہیں مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ میرے بعض افسانوں کا حقِ اشاعت "لانگ منس" کے پاس محفوظ ہے، اسی لئے میں نے لکھا ہوگا آپ ان ہی سے اجازت لے لیں۔"

"ترجمہ کا حق بھی آپ نے ان ہی کو دے رکھا ہے"

"ہاں ترجمہ بھی حق اشاعت ہی میں شامل ہوتا ہے —— لیکن یہ آپ نے نہیں بتایا کہ کمپنی نے آپ کو اجازت دی یا نہیں۔"

"نہیں —— انھوں نے روپیہ مانگا"

"ہاں مانگا ہوگا"

"مگر آپ شاید نہیں جانتے کہ اردو کتابوں سے اتنا مالی فائدہ نہیں ہوتا کہ ترجمے حق اور اشاعت کے اخراجات برداشت کرنے کے بعد مترجم کے لئے کچھ بچ رہے بلکہ نقصان ہونے کا اندیشہ رہتا ہے"

ٹیگور ہنسنے لگے اور بولے "اردو زبان ہی پر کیا موقوف ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کو بھی یہی شکایت ہے —— تو پھر کیا ہوا آپ نے کتاب چھاپی نہیں؟"

"جی نہیں، چھاپنے کی کس طرح جرأت کر سکتا"

"آپ کو میرے افسانے بہت پسند ہیں"

"جی ہاں بہت"

"آپ کچھ طبع زاد بھی لکھتے ہیں"

"جی ہاں لکھتا ہوں"

"افسانوں کے سوا ادب کی کسی اور صنف سے بھی دلچسپی ہے"

"ڈراموں سے خاص دلچسپی ہے، تنقیدی مضامین بھی لکھتا ہوں"

"شاعری کا ذکر نہیں کیا آپ نے؟"

"جی نہیں میں شعر نہیں کہتا"

"عجیب بات ہے، میں نے سنا کہ اردو زبان میں نثر نگاروں کی بہ نسبت شاعر بہت زیادہ ہیں"

"صحیح ہے —— لیکن افسانوں کے ترجموں کی اجازت کا سوال رہ جاتا ہے"

"میرے نوجوان دوست! جن افسانوں کے حقوق میں کمپنیوں کو دے چکا ہوں ان کے بارے میں مجھے مجبور سمجھو البتہ نئے افسانوں کے متعلق میں کوئی انتظام کر سکتا ہوں"

"کوئی نیا مجموعہ زیر ترتیب ہے کیا؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ جب بھی میرا نیا افسانہ چھپے اور تم اس کا ترجمہ کرنا چاہو تو فوراً ہی مجھ سے اجازت حاصل کر لو تاکہ میں کمپنی کو حقوق بیچتے وقت اس کی اطلاع دے سکوں"

"بہت بہتر —— ایک خواہش اور بھی ہے آپ سے!"

"وہ کیا"

"یہ میری آٹوگراف بک ہے ——"

"لائیے میں بڑی خوشی سے دستخط کردوں"

"دستخط نہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ کوئی شعر لکھیں"

"شعر؟"

"جی ہاں اور وہ بھی تازہ ترین شعر، بلکہ میری آرزو یہ ہے کہ آپ خاص طور پر میرے لئے ہی ایک شعر کہیں اور اس کے سارے حقوق بھی مجھ ہی کو حاصل ہوں"

"عجیب دل چسپ بات ہے" ٹیگور ہنسنے لگے "میں ضرور کوشش کروں گا گر فرمائش پر شعر نہیں کہا جاتا —— مگر دیکھیے میری بھی ایک بات سنئے"

"فرمائیے"

"ایک شعر کہنا میرے لئے بہت مشکل ہے اور پوری نظم آٹوگراف بک کے لئے موزوں نہیں —— ایسا کیجئے تاکہ میں نے پرسوں ہی ایک تازہ نظم کہی ہے۔ ابھی اس کو اشاعت کے لئے نہیں بھیجا۔ اس میں کا ایک شعر آپ کو دیتا ہوں"

"اور وہ شعر آپ اس نظم میں شامل نہیں فرمائیں گے؟"

"نہیں —— وہ شعر تو آپ کا ہو جائے گا"

میں نے بیاض دی اور انھوں نے ایک شعر اس پر لکھ دیا چھوٹی سی بیاض کا پورا صفحہ بھر گیا۔ اسی دوران میں باہر موٹر کی آواز سنائی دی اور فوراً ہی معتمد نے اطلاع دی کہ شریمتی سروجنی آئی ہیں۔ ٹیگور مجھے بیاض دے کر اٹھنے لگے۔

"اجازت دیجئے اب" میں نے کہا

"اچھی بات ہے شکریہ"

میں نے واپس ہوتے ہوئے دیکھا کہ شریمتی سروجنی اپنی دونوں لڑکیوں مس پدماجا اور مس لیلامنی اور لڑکے بابا کے ساتھ آرہی ہیں اور دور سے مجھے سروجنی کے یہ الفاظ سنائی دیے۔

"اوہ! آپ یہاں ورانڈے میں بیٹھے ہیں، موسم کا لطف اٹھا رہے ہوں گے، کوئی نظم تو نہیں ہو رہی تھی"

سید بادشاہ حسین

ٹیگور اور ان کی شاعری

ٹیگور کی شاعرانہ عظمت سے کون واقف نہیں ان کی شاعری نے بین قومی مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ یہ شاعر مشرق پر سب سے پہلی مستقل کتاب ہے جس میں مولوی مخدوم محی الدین صاحب ایم اے نے ٹیگور کی شخصیت، ان کی ادبی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں اور ان کے فلسفۂ زندگی پر روشنی ڈالی ہے ٹیگور کا پیام گاندھی اور ٹیگور اور شانتی نکیتن پر علحدہ ابواب میں تفصیلی بحث کی ہے اس کتاب کے لئے خود شاعر نے اپنی ایک نفیس تصویر بھیجی تھی جو اس میں شایع کی گئی ہے۔

یہ کتاب شاعر کی زندگی میں لکھی گئی تھی جو بہت مقبول ہوئی۔ اس کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ چند دن بعد یہ سب ختم ہو جائیں۔

تعداد صفحات (۱۲۸) مع تصویر شاعر قیمت ۱۲؍

حیات بعد الممات

لوگوں میں ایک غلط خیال پیدا ہوگیا ہے کہ "بھوت" اور "روح" دو جدا جدا چیزیں ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن چیزوں سے انسان کو خوف محسوس ہو یا ان سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہو ہم انھیں بھوت کے کارنامے تصور کرتے ہیں۔ اس طرح سب سود مند کام "روح" سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ حکماء یورپ جنھوں نے سائنٹیفک طور پر اس موضوع کی داغ بیل ڈالی ہے دونوں چیزوں میں مطلقاً کوئی فرق نہیں مانتے۔

لیکن اگر کچھ امتیاز پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "روح" وہ چیز ہے جو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن جب ارواح وجود اثیری میں نمودار ہو کر سامنے آئیں تو ہم انہیں بھوت کہہ سکتے ہیں۔

حیات بعد الممات پر جن لوگوں نے دماغ ریزی کی وہ ایک مدت کی تحقیق اور جستجو کے بعد آج اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس آسمان کے ورے ایک دنیا اور بھی ہے۔ اور اب کچھ عرصہ سے یہ خیال یا یقین بھی تقویت پکڑتا جاتا ہے کہ ارواح ہم سے میل جول کرنے کے کسی قدر آرزو مند بھی رہتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ یہ غیر فانی موجود کس طرح یا کس طریقے سے ہم سے میل جول کرتی ہے۔ صرف مثالوں سے ثابت کی جاسکتی ہے۔

یہ بات انسان کی فطرت ہے کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے اسے تسلیم کرنے میں پس و پیش کرتا ہے۔ یا بعض اوقات اس کے وجود یا صحت سے انکار کر دیتا ہے۔ اور بیان کرنے والے کو "دروغ گو" کا خطاب ملتا ہے۔ لیکن دل میں ہم اسی بات کو "بعد از فہم" یا "پر اسرار" ضرور باور کرتے ہیں۔

لارڈ کیلیون کا قول ہے:۔

"جس بات کو ہم بعید الفہم کہتے ہیں دراصل ہم اس کا مفہوم یا مطلب سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔"

لارڈ موصوف کا یہ قول ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس سے انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ہم غور و فکر کرنے کے خوگر ہوں تو ہر عقدہ کی کسی نہ کسی روز گرہ کشائی کر سکیں گے۔

لیکن یہ بھی تو نہ ہو کہ جتنا سوچو گے اتنا ہی ڈوبو گے۔

پروفیسر آسف حال فرماتے ہیں:۔

"کیا ضرورت ہے کہ ہم اپنے عقائد کی اصلاح کے لئے پادریوں سے مشورہ کرتے پھریں۔ اس کائنات میں ہر صاحب ذوق کے لئے تحقیق اور جستجو کا میدان کھلا ہوا ہے۔"

ارواح کا وجود اثیری میں نظر آنا یعنی مادی حالت میں دکھائی دینا کوئی عجیب بات نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ارواح ہمیشہ نظر نہیں آیا کرتے اور یہ بھی مشکل ہے کہ ہمارے وہ عزیز جنھیں دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہوں۔ حسب خواہش ہمیں نظر آجایا کریں۔ ان کا نظر آنا محض محبت کے معیار پر منحصر ہے۔ اس جگہ یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ ارواح کے کارناموں کو "بھوت یا جن" کی کارستانیاں نہیں سمجھ لینا چاہئے۔

مذہب "جن" کے وجود کے متعلق جو چاہے کہے۔ لیکن سائنس نے ابھی تک جنات کے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ بات صرف یہ ہے کہ ارواح ہم سے جدا ہو کر جب چاہیں ہم پر اپنے قرب کا "احساس" پیدا کر سکتے ہیں۔ یا مادی حالت اختیار کر کے (وجود اثیری) ہم کو اصلی روپ میں نظر آسکتے ہیں۔ اور اگر ضرورت

سمجھیں تو ہم سے ہم کلام بھی ہو سکتے ہیں یا اپنا پیغام اشاروں سے سمجھا سکتے ہیں۔

افسوس تو یہ ہے کہ ہم لوگ جب کسی روح کو دیکھ پاتے ہیں تو ہمارا خیال یا ذہن فوراً بھوت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور ہم اس سے گریز کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ جیسے پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ بھوت اور روح دو مختلف چیزیں ہر گز نہیں۔ ہاں اس میں کچھ کلام نہیں کہ ارواح بعض اوقات ہماری دستگیری کے لئے اس عالم رنگ و بو میں نمودار ہوتے ہیں اور کبھی انتقام لینے کے لئے بھی۔

ممکن ہے کہ اس خشک مضمون کا مطالعہ اکثر حضرات کو بار معلوم ہو۔ اس لئے میں چند واقعات پیش کرکے بھوت کے وجود پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ اور واقعات بھی ایسے مستند جن کی سچائی کی شہادت اکثر حکمائے مغرب دے چکے ہیں۔

ٹیلیفون کا پیغام

مسٹر ایلیٹ اوڈانل جن کا بیان بھوت کے وجود کے متعلق حکمائے مغرب کے یہاں بہت مستند سمجھا جاتا ہے ایک واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

میرا ایک دوست ڈاکٹر تھا۔ ایک روز وہ رات کے گیارہ بجے کے قریب ایک مریض جس کا نام رچرڈ تھا کو دیکھ کر گھر آیا ہی تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ڈاکٹر نے رسیور اٹھا کر پوچھا کہ کون ہے آواز آئی۔

"مسٹر رچرڈ کی حالت بہت خراب ہے۔ جلد تشریف لائیے۔"

ڈاکٹر نے کہا کہ میں تو ابھی ابھی ان کے پاس سے آرہا ہوں۔ وہ تو بہت اچھے تھے۔

آواز آئی۔

"آپ جلد تشریف لائیں ان کی حالت مخدوش ہو چکی ہے"

ڈاکٹر پھر اپنا بیگ اٹھا کر رچرڈ کے مکان پر پہنچا۔ نوکر دروازہ کھولا۔ اور ڈاکٹر کو دیکھ کر کہنے لگا۔

"شکر ہے! آپ ابھی واپس نہیں گئے۔ مسٹر رچرڈ کی حالت بہت خراب ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا کہ میں تو گھر سے آرہا ہوں۔ مکان پر سے کس نے ٹیلیفون جو کیا تھا؟"

"نہیں جناب!" نوکر نے حیران ہوکر۔ "کسی نے ٹیلیفون نہیں کیا۔"

ڈاکٹر نے اندر جاکر مریض کو دیکھا۔ مریض پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ اور دل کی حرکت بہت بے قاعدہ سی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے جلدی سے ایک انجکشن دیا۔ کچھ دیر بعد مسٹر رچرڈ کی طبیعت سنبھل گئی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ تو بہت اچھا ہوا کہ میں گھر پر موجود تھا۔ ورنہ آپ کو پریشان ہونا پڑتا۔ میں ٹیلیفون سنتے ہی چلا آیا۔"

مسٹر رچرڈ نے حیران ہوکر کہا کہ ٹیلیفون کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں تو بھلا چنگا تھا۔ اچانک دل پر کچھ بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔ ساتھ ہی آپ تشریف لے آئے۔ پھر اس نے اپنے نوکروں سے پوچھا کہ کس نے ٹیلیفون کیا تھا۔ لیکن سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ جب دوسرے لوگوں میں اس بات کا چرچا ہوا تو بہت سوچ بچار کے بعد یہ رائے قایم کی گئی کہ کسی غیر مادی روح کی طرف سے ڈاکٹر کو پیغام دیا گیا تھا۔ بہرکیف یہ ایک مشہور واقعہ ہے اور اسے غلط کہہ دینا محض کور باطنی ہو تو ہو۔

مامتا

ایک اور حیرت انگیز واقعہ سنئے۔

۱۸۵۸ء میں یورپ میں ایک کتاب "گھوسٹلی وزیٹرز" کے نام سے شایع ہوئی تھی۔ یہ واقعہ اسی کتاب میں سے لیا گیا ہے۔ راوی بیان کرتا ہے۔

مسٹر بی میرا بہت عزیز دوست تھا۔ اس کے چار بچے تھے۔ لیکن چوتھے بچے کی پیدائش اس کے لئے پیغام موت لائی۔ بیوی کے مرنے کا میرے دوست کو اتنا صدمہ ہوا کہ وہ آبائی گھر چھوڑ کر کسی اور جگہ جا رہا۔ اور بچوں کی پرورش کے لئے اتالیق رکھ لیں۔ ماں کے مرنے کے باعث بچے کسی قدر بے قابو سے ہوگئے۔ نوکر چاکر تو کام کاج میں لگے رہتے۔ اتالیق چھوٹے بچے کو کھلاتی۔ باقی تینوں دن بھر مکان میں کھیلتے۔ کبھی اوپر کبھی نیچے۔ ایک روز تینوں بچے کھیلتے کھیلتے تہ خانے میں چلے گئے۔

تہ خانے کا کمرہ بہت بڑا تھا۔ روشنی صرف ایک دو سوراخوں سے آتی تھی۔ وہ بھی دھندلی دھندلی سی۔ اس کمرے کی دیواروں پر کچھ مناظر کشی کی گئی تھی۔ یہ تصویریں دیکھتے ہوئے اچانک بچوں کے دل میں خوف محسوس ہوا اور وہ وہاں سے بھاگ کر ایک دوسرے کمرے کی طرف گئے۔ لڑکی جو سب سے بڑی تھی اور آگے تھی دروازہ پر پہنچ کر اچانک رک گئی اور چلا کر بولی۔ امی! امی جان!" بچے اور بھی دہشت زدہ ہو کر وہاں سے بھاگے اور باپ کے پاس آکر دم لیا۔ لڑکی نے سارا ماجرا باپ سے کہا کہ وہ اس کمرے میں گھسنے ہی کو تھی کہ اس نے اپنی ماں کو دروازے میں کھڑے ہوئے پایا۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر انھیں اندر آنے سے روک رہی تھی۔

مسٹر بی یہ سن کر ایک خادم کو ساتھ لے کر تہ خانے میں گیا۔ اور شمع روشن کر کے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کمرے میں جس کے دروازے میں بچوں نے اپنی ماں کو کھڑے دیکھا تھا ایک کنواں سا تھا۔ یہ کنواں آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اس واقعہ کو اکثر لوگوں نے مستند خیال کیا ہے۔ اور ارواح کی بحث میں مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ہم واقعات کی نوعیت پر غور کرتے ہوئے یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بچوں کی ماں کی روح یا "بھوت" اپنے بچوں کو خطرے سے بچانے کے لئے اس دروازے میں آکر کھڑا ہو گیا ہوگا۔ بچی جس نے ماں کو دیکھا تھا مشکل سے نو یا دس سال کی تھی انصاف تو فرمائیے کہ معصوم بچی کو جھوٹ کہنے سے کیا حاصل ہو سکتا تھا۔

ایم اسلم

وطن کی امانت

یہ آنکھوں میں پھیلے ہوئے سرخ ڈورے یہ لبریز ساغر یہ رنگیں کٹورے
یہ مہکے ہوئے نرم ہونٹوں کی باتیں شرابوں میں کھوئی ہوئی مست راتیں

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ ٹھنڈی ہوائیں یہ بہتے سفینے یہ پینے کے دن یہ بہکتے مہینے
یہ ساقی یہ مطرب یہ میٹھے ترانے نگاہوں میں کروٹ بدلتے فسانے

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ لچکیلی انگڑائیاں یہ جوانی یہ بوتل یہ بوتل میں پھولوں کا پانی
یہ مواج سینے سرکتے دوپٹے سنبھلتے، مچلتے، تھرکتے دوپٹے

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ باہیں یہ باہوں میں گاتے سے جوڑے مدھر راگنی گنگناتے سے جوڑے
یہ شانے یہ شانوں پہ لہراتے گیسو یہ ناگوں کی مانند بل کھاتے گیسو

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ پلکیں یہ پلکوں کی اوٹوں میں اک شے یہ ہنسی یہ ہنسی کے ہونٹوں پہ اک لے
یہ بربط یہ نغموں کی آباد بستی تبسم کا جادو، ترنم کی مستی

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ ساون کی رُت یہ نشیلی فضائیں   یہ میخانہ بردوش کالی گھٹائیں
یہ ریشم میں لپٹے ہوئے نرم بازو   یہ پھولوں سے ملتے ہوئے گرم بازو

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ مسکاتا جوبن یہ شرماتی آنکھیں   یہ نیچی یہ ترچھی یہ گھبراتی آنکھیں
یہ پازیب کے ساز کا گنگنانا   حسینوں کا چلتے ہیں محشر اٹھانا

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ نیندوں کا عالم یہ خوابوں کی دنیا   ہرے، سرخ، نیلے نقابوں کی دنیا
یہ پردوں کے پردے میں اک بیحیائی   یہ ساغر بکف جھومتی پارسائی

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ معبد یہ ملت فروشی کے اڈّے   خصومت، کدورت فروشی کے اڈّے
یہ لیڈر ہمارا دیا کھانے والے   یہ قومیں کی قومیں نگل جانے والے

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ ملاّ گدائی سکھانے کے ماہر   یتیموں کو رہزن بنانے کے ماہر
یہ بیواؤں کی عصمتوں کے محافظ   یہ سوئی ہوئی قسمتوں کے محافظ

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ پنڈت ہوئی قوم بیمار جن سے   لگا ہم کو غربت کا آزار جن سے
یہ چاندی کے ٹکڑوں پہ جاں دینے والے   غریبوں کا خوں چوسنے والے لالے

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

وطن کیلئے مجھ کو پالا ہے ماں نے (۲) جوانی کے سانچے میں ڈھالا ہے ماں نے
جوانی مری زلزلوں کی جوانی حوادث کے ہونٹوں پہ میری کہانی
میں مردوں کو جینا سکھا کر رہوں گا
وطن کی امانت ہے میری جوانی

امیری کو نیچا دکھا کر رہوں گا جھکا کر رہوں گا مٹا کر رہوں گا
یہ ذلت کی گودی میں سو کر رہے گی یہ ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر رہے گی
میں مُردوں کو جینا سکھا کر رہوں گا
وطن کی امانت ہے میری جوانی

قضا سے گلے میں ملاتا رہوں گا مصائب کو آنکھیں دکھاتا رہوں گا
تبسم کے موتی لٹاتا رہوں گا مسرت کی شمعیں جلاتا رہوں گا
میں مردوں کو جینا سکھا کر رہوں گا
وطن کی امانت ہے میری جوانی

جوانی مری بیکسوں کا سہارا وطن کے غریبوں کی آنکھوں کا تارا
یہ شعلوں پہ لہرا کے باقی رہے گی یہ توپوں سے ٹکرا کے باقی رہے گی
میں مردوں کو جینا سکھا کر رہوں گا
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ مردوں کو جینا سکھا کر رہے گی یہ مرقد کو ایواں بنا کر رہے گی
وطن اس کے ہاتھوں سے دلشاد ہو گا وطن اس کے کرنے سے آزاد ہو گا
میں مردوں کو جینا سکھا کر رہوں گا
وطن کی امانت ہے میری جوانی

الطاف مشہدی

مجبوریاں

دنیا میں سب ہی خوش رہنا چاہتے ہیں. کون ہے جو مسرتوں میں زندگی گزارنا نہیں چاہتا. کیا کسی نے کسی کو رنج و مصیبت حاصل کرنے کی جد وجہد کرتے دیکھا ہے. انسان زندگی کی ہر ہر گھڑی کو خوشی میں بسر کرنا چاہتا ہے. اس کی کوشش مسرت و سکون کے لئے ہوتی ہے. اس کو رنج وغم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ مصیبت سے کوسوں دور بھاگتا ہے اس کو رنجوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ یہ کیوں؟ اگر رنج و راحت صرف انسانی کوششوں کا نتیجہ ہوتے تو آج دنیا میں ہم کسی کو مبتلائے الم نہ دیکھتے۔ کوئی جان بوجھ کر مصیبت میں نہیں پڑتا لیکن

اتفاقات ہیں زمانے کے

مجبوری اسی کا تو نام ہے کہ ہم اپنی طبیعت کے بالکل برخلاف حرکت کرنے پر تیار ہو جائیں۔ مجبوریاں انسان سے کیا نہیں کرواتیں۔

دنیا کے واقعات اور اس کی رفتار یکساں نہیں. زندگیوں میں انقلاب آجاتے ہیں. زندگی سے آزادی چھین لی جاتی ہے لیکن پھر بھی زبان نہیں ہلا سکتے اس لئے کہ خود زندگی مجبوری کا دوسرا نام ہے. کوئی اپنی عزیز ترین چیزوں کو خود اپنے ہاتھوں برباد کر دیتا ہے. کوئی اپنے مطمح نظر کو خود نظروں سے دور کر دیتا ہے. اس لئے کہ وہ مجبور ہے. کسی کا سرمایہ لوٹ لیا جاتا ہے عمر بھر کی پونجی تباہ ہو جاتی ہے. لیکن اس کو خاموش رہنا پڑتا ہے. اس لئے کہ وہ مجبور ہے. کوئی دنیا کے خلاف کام کرتا ہے. دنیا والے اس کو برا سمجھتے ہیں. نکتہ چینیاں کرتے ہیں مگر کوئی کیا جانے کہ وہ اپنے کردار میں کس قدر مجبور ہے.

واقعات کسی کو چوری کرنے پر مجبور کرتے ہیں. لوگ اس کو چور کہتے ہیں لیکن وہ کیا جانیں کہ وہ مجبور ہے.

ایک بری حرکت کو دیکھنے والے برا اس لئے کہتے ہیں کہ وہ دنیا کی نظروں میں برا ہے مگر انھیں کیا معلوم کہ کرنے والا مجبور ہے۔ قدرت جب خود فطرت کی مخالف ہے تو یہ مجبوریاں کیوں ختم ہوں۔

فطرت انسانی اور قضا و قدر کا بیر تو ازل سے ہے. تم چاہتے کچھ ہو، ہوتا کچھ ہے تم اپنی سہولت کے مطابق لائحہ زندگی بناتے ہو. لطیف تصورات میں وقت بسر ہوتا ہے شیریں خواب مست بنا دیتے ہیں. آنے والی خوشی کے صرف خیال سے تم اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش نصیب ہستی سمجھنے لگتے ہو لیکن زمانہ اپنا کام کرتا ہے. وہ وقت آتا ہے جب یہ خیالی طلسم ٹوٹ جاتا ہے. تصورات کی لطافت گم ہو جاتی ہے. شیریں خواب بھیانک تعبیر پیش کرتے. تمھارے دل کو ٹیس لگتی ہے. زندگی کا خاکہ الٹ جاتا ہے. تم مجبور کرائے جاتے ہو کہ ان آلام کا مقابلہ کرو. کیونکہ تمھاری زندگی مجبور کرتی ہے کہ تم کسی طرح اپنی زندگی کی کشتی کو چلاتے رہو گو اس کی رفتار تمھاری فطرت کے کتنی ہی مخالف کیوں نہ ہو.

تم گرمی میں سرد پانی کی ضرورت محسوس کرتے ہو لیکن قدرتی طور پر تمھیں گرم پانی ملتا ہے. سردیوں میں جب کہ تم فطری طور پر گرمی ڈھونڈتے ہو سرد ہوائیں قدرت کی ستم ظریفی کا ثبوت دیتی ہیں.

زندگی مجبوریوں میں بسر ہوتی ہے اور مجبوریوں میں ختم بھی ہو جاتی ہے، سولی کے تختہ پر کھڑا ہوا شخص اپنی جان عزیز

دے رہا ہے لیکن کچھ نہیں کہہ سکتا، اس لئے کہ مجبور ہے۔

بستر مرگ پر پڑا ہوا انسان جانتا ہے کہ اب ہر چیز کو چھوڑنا پڑے گا لیکن کیا کر سکتا ہے۔ انسان دنیا سے جاتا بھی ہے تو مجبور ہو کر۔

موت بھی تو مجبوری کا دوسرا نام ہے خواہ وہ فطرت کی موت ہو یا خواہشات کی یا تصورات کی ہو یا زندگی کی۔ مرجانا مجبور ہو جانا ایک ہی تو ہے قدرت اور فطرت میں خود جب تضاد موجود ہے تو پھر زمانے کی چال سے سرتابی کیوں اس کی ستم ظریفیوں کا شکوہ کس لئے؟

رنج و غم سے بھاگنے کی کوشش کس بھروسے پر؟ زمانے کے خلاف مقابلہ کرنے کی آرزو کس برتے پر؟ اس کی چال بجا اس کا ستم روا۔ اس کی ستم ظریفی جائز! اس کا طریقہ قابل آفریں۔

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

پھول سا ہاتھ

سعید النساء بیگم

نہ شرما دیکھ ادھر اپنا بڑھا ہاتھ
مرے ہاتھوں میں دے یہ پھول سا ہاتھ
نگہ کو پیار اس پر آرہا ہے
شکیب و صبر دل سے جا رہا ہے
حیا سے خوبصورت سر جھکا دے
بڑھا دے ہاتھ ادھر ظالم بڑھا دے
کہ مجھ کو اس سے الفت ہو گئی ہے
مری روح آہ اس میں کھو گئی ہے
اجازت ہو تو ہونٹوں سے لگا لوں
نہیں بجھتی لگی دل کی بجھا لوں
کلی سے بھی ہے نازک یہ حسیں ہاتھ
یہ نازک پیارا پیارا مخملیں ہاتھ
دُھلا ہے یہ ستاروں کی چمک سے
معطر ہے ہوا اس کی مہک سے
نزاکت کی حسیں تصویر ہے یہ
مرے ہر شعر کی تفسیر ہے یہ
مرے باغ محبت کا ہے یہ پھول
کہ ہے یہ باغ جنت کا حسیں پھول
مری فردوس! میری مہ لقا سُن
مری پیاری مری شیریں ادا سُن
مرے ہاتھوں میں دیگی تو اگر ہاتھ
نہ چھوڑوں گا ترا میں عمر بھر ہاتھ
نہ شرما دیکھ ادھر اپنا بڑھا ہاتھ
مرے ہاتھوں میں دے یہ پھول سا ہاتھ

راجہ مہدی علیخاں

مقدس شہر!

میں اپنے عنفوان شباب میں سنتا تھا کہ ایک ایسا شہر ہے جس کے بسنے والے آسمانی صحیفوں کے مطابق بالکل مذہبی زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں کہا ــــ میں اس شہر کو ڈھونڈ نکالوں گا اور اس سے برکت حاصل کروں گا۔

یہ شہر بہت دور و دراز فاصلہ پر تھا۔ اس تک پہنچنے کے لئے مدت درکار تھی۔ میں نے سفر کا پورا سامان تیار کر لیا۔ اور فلک نیلی فام پر صبح کے ستارے کے نمودار ہوتے ہوتے چل پڑا ــــ چالیس دن کے بعد میری متجسس نگاہوں نے شہر کو دیکھ لیا۔ اکتالیسویں دن سورج کے ساتھ ساتھ میں بھی شہر میں داخل ہو گیا۔ میری حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا جب میں نے یہاں کے باشندوں کے صرف ایک آنکھ اور ایک ہی ہاتھ دیکھا۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر اپنے آپ سے کہا ــــ "اس مقدس شہر کے باشندوں کا صرف ایک ہاتھ اور ایک آنکھ!"

میں نے دیکھا کہ وہ خود حیرت و استعجاب کے بحر بے پایاں میں غوطہ زن ہیں۔ میرے دو ہاتھوں اور میری دو آنکھوں نے انھیں بھونچکا سا کر دیا تھا وہ میرے متعلق چہ میگوئیاں کر رہے تھے تو میں نے پوچھا ــــ "تمہارا یہ حال کیونکر ہوا؟ تمہاری داہنی آنکھ اور داہنا ہاتھ کیا ہوا؟ ــــ"

وہ میرے سوال پر اور بھی متعجب ہوئے اور کہنے لگے۔ "چلو ہمارے ساتھ اور دیکھو اس کی کیا وجہ ہے؟" میں ان کے ساتھ ہو گیا۔ وہ مجھے ایک عبادت گاہ میں لے گئے۔ یہ عبادت گاہ شہر کے بالکل وسط میں تھی۔ میں نے اس عبادت گاہ کے عین بیچ میں آنکھوں اور ہاتھوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر دیکھا۔ ان میں کچھ سڑ اور گل گئے تھے تو چند سے پیپ اور پانی رس رہا تھا! میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے غمگین لہجے میں کہا ــــ "افسوس تمہارے ساتھ ناانصافی کی گئی!"

لیکن ان لوگوں نے ذرا بھی افسردگی کا اظہار نہ کیا۔ ایک بڈھے نے آگے بڑھ کر کہا ــــ "یہ ہمارا اپنا کام ہے۔ کسی برتر و اعلیٰ قوت کا نہیں! خدائے تعالیٰ نے ہمیں اس حالت میں گناہوں اور برائیوں پر فتح بخشی ہے۔" یہ کہہ کر وہ مجھے ایک بلند مقام پر لے گیا۔ باقی سارے لوگ ہمارے پیچھے تھے۔ اوپر لیجا کر مجھے ایک کتبہ دکھایا ــــ "اگر تمہاری داہنی آنکھ تمہیں ٹھوکر کھلائے تو اسے نکال باہر پھینکو۔ کیونکہ سارے جسم کے مسموم ہونے کے بجائے ایک عضو کا نقصان اچھا ہے۔ اور اگر تمہارا داہنا ہاتھ تمہیں جرم اور گناہ پر مجبور کرے تو اسے کاٹ ڈالو۔ کیونکہ زہر اور پاپ کی لوٹ ــــ ایک عضو ہی الگ ہو جانے اور سارا جسم متاثر ہونے نہ پائے تو بہتر ہے۔"

اس عبارت کو پڑھ کر میں سب کچھ بھانپ گیا۔ میں نے منہ پھیر کر سارے لوگوں کو مخاطب کیا۔ تم میں کوئی عورت یا مرد ایسا نہیں جس کے دونوں ہاتھ اور دونوں آنکھیں ہوں

لوگوں نے جواب دیا ــــ "نہیں۔ ہم میں کوئی ایسا نہیں! یہاں ان بچوں کے سوا جو کم عمر ہونے کی وجہ اس کتبے کو پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کے قابل نہیں کوئی شخص صحیح سلامت نہیں ہے۔"

جب ہم عبادت گاہ سے باہر آئے۔ تو میں فوراً ہی اس "مقدس شہر" سے بھاگ آیا۔ کیونکہ میں بچپن ہی سے اس کتبہ کو اچھی طرح پڑھ سکتا تھا ــــ!

خلیل جبران ــــ محمد عبد القادر فاروقی (ترجمہ)

سوز و ساز

رضیہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا" ڈاکٹر صاحب میرا وقت قریب آچکا ہے اس لئے میں چاہتی ہوں کہ اپنی داستان زندگی آپ سے بیان کروں وہ کہانی جس میں میری زندگی کا راز پنہاں ہے۔ ممکن ہے اس کے کہہ دینے سے میرے دل میں لگی ہوئی آگ کچھ سرد پڑجائے۔ غور سے سنئے میری کہانی دلچسپی اور عبرت سے معمور ہے۔"

میں ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ آج سات سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ میں اپنے گھر دار کو چھوڑنے پر مجبور ہوئی اور پھر قسمت کی گردش نے مجھے نئے نئے روپ دکھائے۔ میرے والدین مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ جب میں انٹرنس کا امتحان کامیاب ہوئی تو میرے والدین کو میری شادی کی فکر دامنگیر ہوئی۔ آہ کسے معلوم تھا کہ یہی کامیابی اور اس کی مسرت میری تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ بنے گی۔ بچپن ہی سے مجھے اپنے چچازاد بھائی ممتاز سے محبت تھی اور جب ہم بڑے ہوئے تو ہماری یہ محبت عشق کی نوبت تک پہونچ گئی۔ ممتاز کے ساتھ گزری ہوئی ایک ایک ساعت اب تک میرے سینے پر نقش ہے اس کے الفاظ محبت" ابھی تک برابر میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ میری دلی آرزو تھی کہ اپنے جسم و جان کو ممتاز کے قدموں پر نچھاور کردوں۔ مگر میرے والدین اس چیز کے لئے تیار نہ تھے کہ میری شادی ممتاز کے ساتھ ہو۔ کیونکہ ممتاز کی مالی حالت زیادہ اچھی نہ تھی ــــ قصہ مختصر میرے ہزار انکار اور ناراضامندی کے باوجود مجھے ایک ایسے شخص کے حوالے کردیا گیا جو مجھے کسی طرح پسند نہ تھا ــــ آپ اسے جو چاہے کہیں کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان ہمیشہ اچھی چیز کو پسند کرتا ہے۔ میرے شوہر اور مجھ میں کچھ مناسبت ہی نہ تھی میں نوجوان، تھوڑی بہت حسین اور تعلیم یافتہ تھی اور وہ نہ صرف ان پڑھ اور جاہل تھے بلکہ سیاہ فام عمر رسیدہ اور کج فہم البتہ وہ مالدار ضرور تھے۔ اور ان کی یہی دولت نے میری روح کو نہیں میرے جسم کو ــــ ایک بے حس جسم کو خرید لیا تھا ــــ امیروں کی دولت غریبوں کی آزادی اور زندگی خریدنے کے لئے ہی تو ہوتی ہے۔ اپنی دولت ہی سے تو وہ غریبوں کی عصمت اور عزت سے کھیلا کرتے ہیں ــــ بہرحال میرا ان کا نباہ ناممکن تھا۔ میں دولت کی بھوکی نہ تھی بلکہ محبت کی ــــ میرا دل تو ممتاز کی نذر ہوچکا تھا ــــ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سال کے اندر ہی مجھے طلاق دے دیا گیا ــــ والدین کے دروازے میرے لئے بند تھے ــــ اپنی عزت اور دوشیزگی کو چور چور کرنے کے بعد میری صورت ممتاز کو دکھانے کے قابل نہ تھی۔ کسی شخص سے نکاح یا شادی کا خیال کرنا سماج اور دنیا والوں اور "نیک بندوں" کی لعنتوں اور ملامتوں کا مرکز بنتا تھا ــــ

رضیہ کے گال پر آنسو ڈھلک رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب" اس نے کہا ــــ "یقیناً میری کہانی آپ کے لئے تعجب خیز ہوگی خیر اور آگے سنئے ــــ اب میرے لئے فلم کمپنیوں کا دروازہ کھلا ہوا تھا ــــ میں نے اسی کو غنیمت جانا کیا کرتی پیٹ بھرنا تھا ــــ فلم کمپنی میں پہونچ کر مجھ جیسی تعلیم یافتہ اور حسین عورت کا مشہور ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے اپنی عزت اور عصمت کی قربانی کرنی پڑی شہرت اور دولت کی ترقی کے لئے یہ چیز ضروری تھی ــــ کیا کرتی مجبور تھی ــــ غرض کامل تین سال تک میں فلم کمپنی میں نوکر رہی اور کئی ایک فلموں میں کام کیا ــــ مگر اس سے بھی میری طبیعت اکتا گئی۔ میں نے

نوکری چھوڑ دی ـــــ تھوڑی بہت دولت جو جمع ہوئی تھی اس میں
زندگی گزارنے لگی ـــــ فلم کمپنی کی ملازمت نے میرے
شوق آرائش میں اور اضافہ کر دیا تھا چنانچہ میں روز آئینہ
بناؤ سنگھار کر کے آئینے کے سامنے کھڑے ہوتی اپنے لوچدار جسم
اپنے قدرتی حسن ، آرائش و زیبائش کو دیکھتی تو جذبات سے
مغلوب ہو جاتی عین اس وقت مجھے میرا ممتاز یاد آتا ـــــ کاش
اس وقت وہ میرے پاس موجود ہوتا ـــــ مگر وہ کہاں
اور میں کہاں ـــــ

میرے لئے حسن پرستوں کی کمی نہ تھی صبح سے شام
تک میرے چوکھٹ پر مجمع لگا رہتا ـــــ مگر اب میری حیثیت
ایک بازاری حسن فروش سے زیادہ نہ تھی ۔ شرافت اور عزت
کے آئینے چکنا چور ہو چکے تھے ـــــ صبح سے شام تک اہل غرض
میری زنجیر در کھٹکھٹاتے اور چند چاندی کے ٹکڑوں کے لئے
مجھے وہ سب کچھ کرنا پڑتا جو کسی شریف کو نہ کرنا چاہئے ـــــ میں
ان کی خاطر کرتی ان کو خوش کرنے کے لئے ہنستی اور ہر طرح کی
خوشامد کرتی مگر میرا دل روتا تھا ـــــ میرے تبسم میں میرے
دل کی آہیں نہاں ہوتیں اور میری باتوں میں میرے دل کے درد
بھرے ہوئے ہوتے ـــــ ذرا غور تو کیجئے کہ کیسے کیسے لوگ میرے
در پر جبیں سائی کرتے تھے ۔ وہی لوگ جن کو اپنی شرافت نسبی و
حسبی پر زعم تھا ۔ وہی لوگ جو بڑے با عزت اور نیک نفس مشہور
تھے ، زاہدوں اور عابدوں کا زہد و تقویٰ بھی شاید میرے
دروازہ پر کئی مرتبہ لوٹ گیا ـــــ نوجوانوں کا تو ذکر ہی کیا
ایسے لوگ بھی میری پابوسی کرتے جن کے چہرے نورانی ڈاڑھی
سے منور تھے اور جو بزرگ اور نیک مشہور تھے انھوں نے دنیا کی
آنکھ میں خاک جھونک کر اپنے آپ کو "نیک" مشہور کیا تھا ۔
مگر میرے آگے ان کے سب طلسم ٹوٹ چکے تھے ، مجھے ان لوگوں سے
سابقہ تھا جو شراب کے نشہ میں چور میرے کمرے میں لوٹتے
پھرتے ـــــ میں ان کی باتیں سنتی ، ان کی مار پیٹ سہتی انکو
سمجھاتی ـــــ غرض سب کچھ کرتی ـــــ آہ وہی لوگ جن کو
معذوروں ، محتاجوں اور فقیروں کو ایک پیسہ دینا بار معلوم ہوتا
میری معمولی اور مصنوعی ادا پر سینکڑوں روپے تصدق کر دیتے ۔
میں دنیا کا تماشا دیکھ رہی تھی ۔ کیا انصاف کے یہی معنی ہیں کہ
عبادت گزاروں ، محتاجوں اور غریبوں کو تو پیٹ بھر کھانا
نصیب نہ ہو لیکن عیاشوں ، حسن پرستوں اور بدکاروں کی
جیبیں دولت سے بھاری ہوں ـــــ غرض زمانہ گزرتا گیا ۔
تقریباً چار سال تک عصمت فروشی میرا ذریعہ معاش رہا لیکن یقین
جانئے ممتاز کی یاد میرے دل سے لمحہ بھر کے لئے بھی جدا نہ ہوئی ۔ میں خود
اپنی اس زندگی سے متنفر اور شرمندہ تھی مگر کیا کرتی پیٹ پالنا تھا ۔
کچھ دن بعد ہی اس زندگی سے بیزار ہو گئی اور اس "پیشہ" کو
چھوڑ دیا ۔ پھر زمانے کے ہاتھوں طرح طرح کے مصائب اٹھانے کے
بعد میں پیٹ بھر کھانے کے لئے محتاج ہو گئی ۔ یہی نہیں بلکہ بیمار
پڑی تو دوا کے لئے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی ـــــ غور کیجئے
میری اس تباہی ، بربادی اور گناہ آلودہ زندگی کا باعث کون ہے ۔
یہی میرے "والدین" اور میرا "سماج" ـــــ وہی والدین جنھوں نے
دولت کی حرص میں مجھے ایسے شخص کے حوالے کیا جس کے ساتھ گزارا ممکن
تھی ـــــ اور میرا سماج وہ ہے جس میں لڑکی کو اپنے حق میں
کچھ کہنے کی اجازت نہیں اگر کچھ کہے تو پھر چو طرف سے انگشت نمائی
ہوتی ہے ـــــ بے حیائی ، بے شرمی اور بے عزتی کے دھبے
اس کے دامن پر لگائے جاتے ہیں ۔ غور تو کیجئے کہ ایک معصوم
ہستی کی زندگی کا سودا ہو رہا ہو اور خود اس کو کچھ کہنے کا حق

نہ ہو ــــــ انصاف فرمائیے ایک نوجوان اور محتاج بیوہ اگر نکاح کا ارادہ کرتی ہے یا نکاح کرنے پر مجبور ہوتی ہے تو سماج اس کو گری ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے اس کو ذلیل وحقیر کیا جاتا ہے لیکن اگر ایک حریص بڈھا دو دو بیویاں رکھنے کے باوجود جب تیسرا نکاح کرتا ہے تو کیوں اس وقت سماج کی آنکھوں پر پٹیاں بندھ جاتی ہیں کیوں اس وقت سماج اندھا اور گونگا ہو جاتا ہے؟ ــــــ

بہرحال میری حالت زار پر رحم کر کے ڈاکٹر صاحب آپ نے اپنے پاس مجھے پناہ دی اور آپ کی انتہائی کوشش کے باوجود میں صحت نہ پا سکی مگر آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ خدا آپ کو ضرور دے گا۔ آپ میرے بے غرض محسن ہیں۔ کاش میری اس داستان سے میرے والدین بھی واقف ہو جائیں وہ ابھی زندہ ہیں۔ کاش ان کو معلوم ہو جائے کہ ان کی حرص وہوس نے ان کی بیٹی کو کس نتیجہ پر پہونچا دیا۔ کاش میری اس دردبھری کہانی سے دنیا سبق حاصل کرے ــــــ رضیہ کا دم پھولنے لگا اس کی آنکھیں پھرنے لگیں اور ایک ہچکی کے ساتھ وہ ڈاکٹر کے چہرے پر ایک حسرتناک نظر ڈالتے ہوئے ہمیشہ کے لئے سوگئی ــــــ ڈاکٹر حیرت اور رنج کے عالم میں کھڑا ہوا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے ــــــ

کاظم علی خاں

سحر

اندھیرے کی رانی چلی جارہی ہے — جوانی کے ڈھلنے پہ غم کھارہی ہے
ستاروں کی دنیا مٹی جارہی ہے — پھریرا اڑاتے سحر آرہی ہے

سحر ہورہی ہے سحر ہورہی ہے

رخِ ماہ پھیکا پڑا جارہا ہے — شبِ غم پہ نورِ سحر چھارہا ہے
زمانے میں اک انقلاب آرہا ہے — وہ دریا پہ ملاّح کچھ گارہا ہے

سحر ہورہی ہے سحر ہورہی ہے

صباؔ باغ میں پھول مہکارہی ہے — کلی اپنی مستی میں اترارہی ہے
محبت ہر اک شئے میں ٹھہر رہی ہے — 'جوانی' جوانی نظر آرہی ہے

سحر ہورہی ہے سحر ہورہی ہے

سید ناظم علی ناظم

سنگ تراش

سنگ تراش اپنے تصور سے کھیل رہا تھا۔ بے ڈول پتھر کا ٹکڑا آہستہ آہستہ ایک حسین صورت میں تبدیل ہو رہا تھا۔

وقت یکساں رفتار سے دوڑ رہا تھا۔

بالآخر مجسمہ تیار ہوگیا۔ حُسن کی وہ تمام باریکیاں جنھیں ظالم زمین نے ڈھانک لینے کی کوشش کی تھی پھر ایک بار سنگ تراش کی نظروں کے سامنے تھیں۔

دریچے میں پھولوں کا گلدستہ دیکھ کر ایک تتلی آئی۔

سنگ تراش اسے دیکھنے لگا۔

مگر وہ پھول پر نہ بیٹھی۔

سنگ تراش کی ہنسی ختم ہونے لگی جب اس نے دیکھا کہ تتلی مجسمہ کے ہونٹوں پر بیٹھ رہی ہے وہ غصہ میں بھرا ہوا اٹھا۔

"یہ میری تخلیق ہے۔ رقابت میں برداشت نہیں کرسکتا۔"

وہ دوڑا کہ تتلی کو پکڑ لے۔

اس کے زبردست ہاتھ تتلی پر پڑے اور وہ مجسمہ کے ہونٹوں پر چپک کر رہ گئی...... مگر... مجسمہ نیچے گر پڑا....

پتھر کے ٹکڑے زمین پر بکھر گئے۔

سنگ تراش نے ایک چیخ ماری اور ٹکڑوں پر گر پڑا۔

ٹوٹے ہوئے مجسمے کے لب صحیح و سالم ایک طرف پڑے تھے اور۔ ان پر مری ہوئی تتلی اسی حالت میں موجود تھی۔

"آہ" سسکتے ہوئے سنگ تراش نے تتلی کی طرف دیکھ کر کہا "تو نے وہ کیا جو مجھ سے بھی نہ ہو سکا۔"

فقیر

دُور افق کی پہاڑیاں پیچھے کی طرف ہٹنے لگیں تاکہ دنیا والے شاہ خاور کا چہرہ دیکھ سکیں۔ مرطوب ہوائیں جس کے فراق میں رات بھر نالہ و شیون کرتی رہیں اور جن کے آنسو ابھی تک سبزہ پر بکھرے پڑے تھے۔ کلیوں کی پتیاں جنھیں ان کے جذبۂ محبت نے رات کی تاریکی میں ایک دوسرے سے چھپائے رکھا تھا، شرماتی ہوئی علٰحدہ ہونے لگیں۔ اور بلبل نے ان کا مذاق اڑانا شروع کیا۔

فقیر اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا۔ یاس کی روندی ہوئی جوانی اس کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی اور مونچھوں کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔

ہاتھ میں کاسہ لئے وہ بستی کی طرف چلا۔

دن بھر مارا مارا پھرنے کے بعد وہ واپس ہوا۔ خیرات اس کی جھولی میں تھی.... اس کی دن بھر کی کمائی...... مغرب کی طرف افق کی لکیر بے چینی سے سورج کی طرف بڑھ رہی تھی

ببول کے درخت پر ایک قمری کا جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی ان کی چونچیں ایک دوسرے کے قریب ہوجاتیں جیسے وہ دن بھر کی روئداد ایک دوسرے کو سنا رہے ہیں۔

فقیر نے انہیں دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"کاش میں بھی کسی کو اپنی دن بھر کی محنت کا ثمر بتلا سکتا... بھلا ہو اس کا جس نے مجھے فقیر بنایا" وہ پلٹا اور آہستہ آہستہ جھونپڑی کی طرف روانہ ہوا۔ یکایک کچھ سوچ کر وہ واپس ہوا۔ جھولی میں سے کچھ چاول اور روٹی کے ٹکڑے نکالے اور درخت کی طرف پھینک دئے۔ معصوم پرندے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

فقیر کچھ دور چلا گیا۔

قمری کا جوڑا نیچے اترا اور کچھ دانے کھا لئے۔

فقیر مسرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "روز میں تمھیں اپنی محنت کی روئداد سنا دیا کروں گا.. مگر... کہیں تم بھی بے وفا نہ ثابت ہونا۔"

سید ظہیر الدین رونق

تین سبق

مدتیں گزریں جب دنیا کمسن تھی اس قدیم زمانے میں جب طلوعِ آفتاب سے قبل ستارے نغمہ سرا ہوتے تھے اس وقت ان کے گیت صاف سنائی دیتے تھے کیونکہ دنیا بالکل خاموش تھی اور آسمانوں کی موسیقی میٹھے میٹھے سروں میں پہاڑوں اور وادیوں میں سے آب جُو کی مانند بہتی ہوئی دنیا کو اپنے رمزوں سے بے کھٹکے سیراب کرتی تھی۔ کہ ایک ننھے سے انسانی بچے نے اپنی آنکھیں کھولیں اور چلانے لگا۔ اس نے دنیا کی طرف دیکھا اور حیران ہو گیا آسمان کی نیلی نیلی وسعتوں پر نگاہ دوڑائی اور اپنی تنہائی کو محسوس کیا۔ اس نے چاہا کہ وہ کسی تاریک غار میں گھس جائے یا جنگل میں گنجان درختوں کے سایہ میں اپنے آپ کو چھپائے۔ کیونکہ وہ خائف ہو رہا تھا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیوں ڈر رہا ہے۔

یکایک خدا نے اس بچے کو آواز دی۔ وہ اب ڈرتا نہیں تھا اور اس کے دل میں تاریک غار یا گنجان جنگلوں میں چھپنے کی خواہش بھی نہ رہی تھی۔ اس نے جواب نہ دیا کیونکہ وہ اس سے آگاہ نہ تھا۔ کہ جواب کیونکر دیتے ہیں :-

اور خدا نے کہا۔

تجھے ایک سبق سیکھنا ہے اپنا پہلا سبق پڑھ اور دن بھر اسے یاد کرتا رہ جب رات کا سایہ اس راستے پر دراز ہونے لگے جس پر تو گامزن ہے، تو تھک جائے اور چل نہ سکے تو میں تجھے سلا دوں گا اور جب تو جاگے گا تو میں تجھے دوسرا سبق دوں گا۔

بچے نے خدا سے سبق لیا اور یہ آسمان کے تاروں کی طرح چمک رہا تھا اس کی آنکھوں کو یہ ایک بابِ زریں کی طرح نظر آیا جو کھلا ہوا ہو لیکن دور، دور، بہت دور...... اتنی دور کہ کوئی ستارہ بھی اتنی دور نہ ہوگا اور اس دروازہ میں سے اسے ایک سفید نورانی روشنی نظر آئی اور ایک عجیب و غریب طریقے سے بچے کے دل نے محسوس کیا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور وہاں پہونچ کر رہے گا۔ نظارہ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا مگر سبق اس کے پاس ہی رہا۔

اور وہ سبق یہ تھا "میں میں ہوں" بڑا مشکل اور ادق سبق تھا بچے نے گھنٹوں اس پر صرف کر دئیے اور اس میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ دن ڈھل چکا ہے اور روشنی بتدریج کم ہوتی جارہی ہے وہ اپنا سبق یاد کرتا رہا جو اسے خدا نے دیا تھا یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا اور وہ تھک کر چور ہو گیا لیکن اب وہ چھوٹا بچہ نہ تھا کیونکہ دن بہت طویل تھا اور عمر کی وجہ سے اس کا جسم نحیف ہو کر جھک گیا تھا اس کے بال سفید ہو چکے تھے پیشانی پر جھریاں نمودار ہو چکی تھیں اور وہ کہہ رہا تھا۔ "میں بہت تھک گیا ہوں"

اور خدا نے مسکرا کر کہا

"اب سو جا اور آرام کر"

انسان سو گیا اور پھر اٹھا مگر اس دفعہ اس میں خوف کا شائبہ تک نہ تھا نہ اسے اپنے آپ کو چھپانے کی خواہش تھی اس نے اپنے اوپر جگمگاتے ہوئے نیلے آسمان کو دیکھا اور اس کی طرف اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ کیوں؟ آہ! اُسے یہ معلوم نہ تھا وہ کچھ سننے کا منتظر تھا!

اور خدا نے کہا

دیکھ یہ تیرا دوسرا سبق ہے اسے پڑھ اور جب شام ہو اور تو تھک جائے تو یہاں آنا۔ میں پھر تجھ پر نیند طاری کروں گا۔

بچے نے خدا سے سبق لے لیا اور دنیا میں چلا گیا اور دنیا کے درختوں پھولوں اور اس کی زندہ مخلوقات کو دیکھتا رہا اور ساتھ ساتھ اپنا سبق بھی یاد کرتا رہا ــــــ دوسرا سبق یہ تھا "تو تُو ہے"۔

اس دن کے لمحے بھی تیزی کے ساتھ گزر گئے کیونکہ جب اس نے یہ سبق پڑھا تو اسے آسمانی دنیاؤں کی موسیقی اور صبح کے ستاروں کے نغمے سنائی دینے لگے۔ جب اس کے پاؤں نئی نئی دنیا کو چھوتے تھے اور وہ اپنے سبق کو دہراتا تھا۔ تو شاید یہ عظیم الشان کائنات کے نغمے کی صدائے بازگشت تھی یا اس کے اپنے دل کی کہ وہ پھولوں اور سبزے میں سے موسیقی بن کر نکلتی تھی۔ اس وقت وہ پہلی مرتبہ مسرت سے آشنا ہوا اور خوشی اس کے دل میں پیدا ہوئی لیکن ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ شام کا سایہ اس کے راستہ میں محیط ہونے لگا آفتاب غروب ہوگیا تب انسان نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا اور مسکرا کر کہا۔

"اے خدا ہم بہت تھک گئے ہیں"!

اور خدا نے کہا۔

سو جا اور آرام کر کل میں تجھے اور سبق پڑھاؤں گا۔

جب تیسرے دن بچہ جاگا۔ اس نے انگڑائی لی اور اپنی آنکھیں ملیں لیکن اس نے اوپر کی طرف دیکھا نہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلائے اس نے اپنے آس پاس نگاہ ڈالی اور کہا۔

میرا ساتھی کہاں ہے۔

پھر خدا نے اسے تیسرا سبق دیا۔ اور آہ! یہ مشکل ترین سبق تھا اور جب اس نے اس کو دیکھا تو اسے چند لمحوں کے لئے غش آگیا پھر ایک عجیب لرزہ اس کے جسم پر چھاگیا اور اپنی چھڑی ہاتھ میں لے کر وہ نکل کھڑا ہوا۔

تیسرا سبق یہ تھا "یہ نہ کر وہ نہ کر"

شام کے وقت جب سورج چھپ گیا تو وہ بہت افسردہ ہوگیا تھا اور اس کے بال برف کی طرح سفید ہو گئے تھے شاید یہ اس کے بالوں کی سفیدی تھی۔ یا ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرن مگر ایک روشنی تھی جو اس کے ہونٹوں اور ابروؤں پر کھیل رہی تھی۔ وہ سو گیا اور اپنی نیند میں ایک چھوٹے بچے کی طرح مسکراتا رہا:-

دن کے بعد دن گزرتے گئے جب صبح ہوتی اور بچہ جاگتا تو اس کی آنکھ ایک نئی دنیا پر پڑتی لیکن کبھی اس کے دل میں یہ سوال پیدا نہ ہوا کہ اب اسے خوف کیوں نہیں معلوم ہوتا وہ اپنے بھائی بندوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا رہا۔ اور جواب میں وہ بھی مسکراتے رہے لیکن انھیں کبھی خیال نہ آیا۔

کہ کیوں!

لیکن چند روز بعد بچہ اپنے سبق سے غافل ہوگیا۔ خدا ہر روز اسے سبق دیا کرتا تھا مگر چند دن وہ سبق لینا بھول گیا اور اپنی بھول میں وہ اس سیدھے راستے سے بھٹک گیا جو نور جاوداں اور باب زرین کی طرف جاتا تھا۔ وہ مرغزاروں میں سنہری تیتریوں کے پیچھے بھاگتا رہا یا شہابا کی چمک کے پیچھے دوڑتا رہا۔ پھر جب رات ہوئی تو وہ مسکرا نہ سکا۔ وہ سو گیا۔ جب جاگا تو اس نے پھر وہی سبق دہرانا شروع کیا۔

کچھ روز وہ اپنے راستے سے بھٹکا رہا پھر اس نے الٹے پاؤں صعوبتوں اور تکلیفوں میں سے گزر کر راستے کو ڈھونڈ لیا۔ کیونکہ انسان ہمیشہ آزاد تھا۔ کیا اس نے پہلے ہی سبق میں یہ نہ پڑھا تھا "میں میں ہوں"

شنکر موہن لال ماتھر

("ریلی الین" کے زرین خیالات کا ترجمہ اور اقتباس)

محرومی

ہمنشیں! کیونکر سناؤں اپنی روداد حیات
آہ ہے تاریک تر مجھ سے جبینِ کائنات!

اب مری ہر سانس میں لہرا رہی ہیں بجلیاں
دل نہیں ہے دل مگر اک مرکزِ دردِ نہاں

خود ہی میرے حال پر گریاں ہے میرا حالِ زار
دردِ محرومی ہے پیشانی سے میری آشکار

زندگانی بن گئی ہے سربسر تصویرِ یاس
میں جواں ہوں پھر بھی ہمدم میری آنکھیں ہیں اداس

پھول کھلتے ہیں مگر میں مسکرا سکتا نہیں
خاک ہے وہ بحر جو طوفاں اٹھا سکتا نہیں

جذب و اضطراب

محسوس ہو رہا ہے یہ اب بےخودی کے بعد
اک زندگی ملی ہے مجھے زندگی کے بعد

نامحرمی، دلیلِ خبر تھی خدا گواہ!!!
حسنِ یقیں سے دور ہوں نامحرمی کے بعد

میں ہوں وہ نامرادِ محبت، ہزار حیف!
رازِ فریب کچھ نہ کھلا دوستی کے بعد

اب میں حیات و موت کے جھگڑوں سے ہوں بلند
دنیا بدل گئی ہے مری بےکسی کے بعد!

وہ التفاتِ یار کا موسم گزر چکا!
اب وہ رُخِ حیات نہیں بےرخی کے بعد

دنیا، حجابِ حسن و لطافت میں تھی نہاں
یعنی جنونِ ہوش نہ تھا بےخودی کے بعد

کیونکر کہوں کہ عہدِ جوانی گزر گیا!
دو اشک بھی ضرور ہیں کاوشؔ ہنسی کے بعد

کاوش

ہندی اور مسلمان

"۔۔ دو ہندی کی نزاع قدیم ہے۔ اس کا تصفیہ اگرچہ ناممکن نہیں مگر مشکل ضرور ہو گیا ہے اس لئے کہ یہ جھگڑا جہاں تک سمجھ میں آتا ہے سیاسی نہیں بلکہ قومی ہے اور غالباً یہی سبب رہا ہو کہ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کو یہ کہنا پڑا کہ یہ دونوں دو مختلف زبانیں ہیں اور فریقین کو الگ الگ اس کی ترقی کی کوشش کرنی چاہیئے۔ میں یہاں موصوف کے اصل الفاظ نقل کرتا ہوں

"اپنا دل بہلانے کے لئے اب ہم نے یہ وتیرہ اختیار کیا ہے کہ جب اردو اور ہندی کا تذکرہ ہوتا ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی زبان ہیں اور ہم کو بجائے اردو اور ہندی کے لفظ ہندوستانی استعمال کرنا چاہیے میرے خیال میں اس لفظ کے استعمال سے یا تو اپنے دل کا بہلانا مقصود ہے اور یا ایک دوسرے کو دھوکا دینا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں بنتی چلی جا رہی ہیں۔ اردو کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ اردو میں فارسی اور عربی کے غیر مروج اور غیر مانوس الفاظ کی بھرمار کر دیں۔ اسی طرح ہندی کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ ہندی میں بھی غیر مروج اور غیر مانوس سنسکرت کے الفاظ بھر دئے جائیں۔ اب میرے لئے یہ مان لینا غیر ممکن ہے کہ ایسی اردو یا ایسی ہندی کو ہم ہندوستانی کا لقب دے سکتے ہیں[1]"

سچ تو یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر جس زبان کی آبیاری کی اور جو تقریباً اٹھارہویں صدی تک خالص ہندوستانی کہی جانے کی مستحق تھی آج پامال ہو رہی ہے اور یہ محض اس لئے کہ ہم واقعات کو اپنی ذاتی خواہشوں پر قربان کر رہے ہیں ہندوستانی کی ترویج میں جتنا ہندوؤں کا حصہ رہا ہے اس سے کچھ زیادہ ہی مسلمانوں کا بھی تھا لیکن اب مسلمانوں کی ہندی خدمات پس پشت ڈال دی گئی ہیں اور ان پر یہ عام اعتراض ہے کہ انھوں نے زبان ہندی کو اپنا نہیں سمجھا، ان کی شاعری میں ہندی عنصر اور ہندوؤں کے کلچر کی کوئی نمایندگی نہیں، ہندی مسلمانوں کی زبان نہیں، اس لئے کہ ان کے جذبات اور زبان ہندی میں ہم آہنگی ناممکن ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ چند اعتراضات ہیں جو عموماً کئے جاتے ہیں۔ عرصہ ہوا رسالہ "الندوہ" اور "ہندوستانی" نے بعض غلط فہمیوں کا پورا پورا ازالہ کر دیا تھا لیکن ہٹ دھرمی ہے کہ لوگ اب بھی یہی کہے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے بیجا نہ ہوگا اگر مسلمانوں کی ہندی خدمات پر ایک نگاہ بازگشت ڈال لی جائے اور بالترتیب ان خدمات کا اعادہ کیا جائے۔

اگر ہم ذرا بھی غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کا طبعی میلان ہندی کی طرف تھا۔ خلفائے عباسیہ میں شروع سے یہ جذبہ موجود تھا اور ان کے یہاں سنسکرت کا چرچا بھی ہو چکا تھا۔ ہارون رشید کے زمانہ میں جید علما مناظرے کے لئے ہندوستان بھیجے جاتے تھے، جن کے سنسکرت کے اسکالر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ۱۰۲۲ء تا ۱۰۳۰ء کے درمیان مسلمانوں کا جو گروہ وارد ہندوستان ہوا اسی میں ابوریحان بیرونی جیسا اسکالر موجود تھا جس کی سنسکرت دانی اس پایہ کی تھی کہ اس نے مختلف عربی کتابوں کا سنسکرت میں ترجمہ کیا، اور سنسکرت علوم و فنون کے متعلق جو کتابیں اس نے لکھیں اس کے لئے اس نے سنسکرت کی بیشتر اور اہم مستند کتابوں سے مواد اخذ کیا۔ یہ بات بھی قابل یادداشت ہے کہ خلافت عباسیہ میں ہندوستان اور سندھ میں مسلمانوں کی مستقل سکونت ہو چکی تھی، بعد میں وہ اندرون ملک گھسے اور پنجاب، صوبہ متحدہ، ملیبار اور دکن میں قیام کر کے ہندی و سنسکرت سیکھنی شروع کر دی تھی اور بے شمار فاضل و شاعر

---

[1] "ہندوستانی" بابتہ جولائی ۱۹۳۲ء

مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔

تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ مسعود سعد سلمان جو دورہ غزنویہ کا مشہور شاعر گزرا ہے مسلمانوں میں سب سے پہلے اسی نے بھاشا زبان شروع کی۔ یہ واقعہ امیر خسرو سے تقریباً ۲۰۰ برس پہلے کا ہے۔ مسعود سعد سلمان نے ایک دیوان ہندی میں بھی لکھا تھا مگر افسوس کہ وہ مفقود ہے اگر مل سکتا تو اس وقت کے مسلمانوں کی ہندی دانی کا اندازہ ہوسکتا۔ صاحب مجمع الفصحا نے اس شاعر کے متعلق یہ لکھا ہے کہ

"الحاصل وے را سہ دیوان بود، تازی، ہندی، پارسی"

مسعود گو خاندان کے لحاظ سے ایرانی تھا لیکن پیدا لاہور میں ہوا تھا اس لئے ایک ہندی نژاد کا ہندی میں باکمال ہونا محل تعجب نہیں۔

مسعود کے بعد حضرت امیر خسرو آئے۔ انھوں نے سنسکرت اور بھاشا میں جو کمال پیدا کیا وہ ظاہر ہے۔ "مثنوی" "نہ سپہر" میں انھوں نے خود اپنے سنسکرت پڑھنے اور سیکھنے کا ذکر کیا ہے۔ تذکرۂ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر خسرو کا جتنا کلام فارسی میں ہے اتنا ہی ہندی میں بھی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے بھاشا کا خالص کلام ناپید ہے محض وہ کلام مشہور ہے جس میں انھوں نے فارسی اور ہندی کو جذب کر دیا ہے یہ ہندی میں بابل کے موجد ہوئے ان کی پہیلیاں، مکرنیاں، انمل، ڈھکوسلے وغیرہ سب اختصار کے ساتھ آب حیات میں درج ہیں۔

امیر خسرو کے بعد کبیر آئے۔ یہ رامانند کے چیلے تھے۔ ابھی تک ان کا ہندو یا مسلمان ہونا ثابت نہیں ہوسکا ہے۔ اور اگر وہ ہندو کہے جاسکتے ہیں تو ایک گروہ مسلمان ماننے کے لئے بھی تیار ہے خیر چھوڑیئے اس بحث کو ان کا سکندر لودی کے زمانہ میں موجود ہونا مسلم ہے جس نے کبیر کو لا مذہبیت کی وجہ سے قید کر دیا تھا اور بعد کو رہا کیا۔ شاعرانہ حیثیت سے کبیر کا درجہ بہت ممتاز ہے۔ ان کا کلام اس قدر مشہور ہے کہ صرف ایک دوہرے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ؎

دین گوایو دنی سے دنی نہ آئیو ہاتھ
پیر کلہاڑی ماریو گاپھل اپنی ہاتھ

کبیر سر پر سرانے دنیا ہے کیوں سوتے سکھ چین
کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین

سکندر لودی کی وفات پر جب ۹۱۵ھ میں سلطان ابراہیم حسین لودی تخت نشین ہوا تو اسی کے زمانے میں بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ بابر کو فتح ہوئی اور ابراہیم لودی کھیت رہا۔ اس کی وفات کی بہت سی تاریخیں کہی گئیں لیکن قوم بقال کے کسی شخص نے ہندی میں یہ تاریخ بھی بے مثل کہی ہے[1] ؎

نو سے اوپر تھا بتیسا — پانی پت میں بھارت دیا
اٹھواں رجب بار سکر وارا — بابر جیتے، براہیم ہارا

ہندوستان میں بابر کی آمد آمد کے ساتھ تیموریہ آفتاب طلوع ہوا۔ بابر ہندوستان کے لئے اجنبی تھا۔ یہاں کے رسم و رواج، طرز معاشرت، نباتات حیوانات وغیرہ کو اپنے یہاں کے مقابلہ میں بالکل مختلف پایا اور ان سے دلچسپی لیتا۔ وہ ہندوستان کی ان اشیاء کا جو اس کے لئے عجیب و غریب تھیں نام پوچھتا تھا اور اگرچہ صحیح تلفظ نہیں ہوسکتا تھا تاہم اپنے وقائع میں ان کو اسی طرح لکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ یہاں کی زبان کی طرف توجہ کرتا۔ اسے ہندوستان میں نہایت قلیل عرصہ تک رہنے کا اتفاق ہوا تاہم اس نے یہاں کی زبان اور لسانیاتی خصوصیات سے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل کر رکھی تھی اور کثرت کے ساتھ بابر نامہ میں ایسے الفاظ ملتے ہیں جن میں سے سوائے معدودے چند آج بھی بولے جاتے ہیں مثلاً ہاتھی، کلارن (کالا ہرن) کوئل۔ کرنی (کھرنی) گدل (گدل)، بدہل (بڑہل)، کرونڈہ چرونجی۔ کنیر۔ کیوڑا۔ ڈاک چوکی۔ کہار وغیرہ۔ ان تمام ہندی الفاظ سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اردو زبان ان ایام میں بولی جاتی تھی۔ بابر کا ایک دیوان بھی موجود ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

۱؎ حیات جلیل

مجکانہ ہوا کچ ہوس مانک و موتی
فقیر الیتہ بس بولغو سید مد پانی و روتی

پہلے مصرعہ کو آج کل یوں کہہ سکتے ہیں: مجھ کو نہ ہوتی کچھ ہوس مانک و موتی، دونوں مصرعوں کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے لعل اور موتیوں کی پروا نہیں۔ فقیروں کے لئے صرف پانی اور روٹی کفایت کرتے ہیں۔[1]

بابر کے وقت میں یوسفی ہندوستان میں موجود تھے۔ فنِ طب میں ریاض الادویہ ان کی بہت مشہور کتاب ہے۔ چھپ بھی چکی ہے۔ اس کے علاوہ رسالۂ ماکول و مشروب، فوائد الاخیار۔ جامع الفوائد رسالۂ قارورہ۔ رسالۂ نبض وغیرہ ہیں۔ فنِ انشا میں ان کی مشہور تصنیف انشائے یوسفی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ اور بھی کتابیں ہیں۔ ان کی ایک دلچسپ تالیف "قصیدہ در لغات ہندی" ہے جس میں کل چوالیس شعر ہیں اور جو خالق باری کے رنگ میں ایک منظوم لغت ہے[2]۔

حکیم یوسفی کے ہم عصر مولانا جمالی ہیں۔ ان کا حسب ذیل ریختہ ملاحظہ ہو۔

.....ہر دو تیرا کتا ہے — موتیا بن بر درِ تو ستا ہے
خوار شدم زار شدم لٹ گیا — در رہِ عشقِ تو کر شتا ہے
گرچہ بدم گفت رقیب کشٹ — اس کا کہا مت کرو یہ جھٹا ہے
گاہ نگفتہ کہ جمالی تو بیٹھ — تم کرو کیا اپنا کرم پھٹا ہے

حکیم یوسفی اور جمالی کے بعد دورِ شیر شاہی میں ملک محمد جائسی نے مثنوی پدماوت تصنیف کی۔ جائسی کبیر ہی کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ ان کی مثنوی کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ وہ قدرتِ زبان اور سادگی کے لحاظ سے رامائن سے کسی طرح کم نہیں۔

ہندی کی ترقی کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا یہاں تک کہ اکبر کا زمانہ آیا۔ اکبر کو اوائل عمری سے ہندوستان میں رہنے کا موقعہ ملا اس وجہ سے اسے ہندوستانی زبان سے کافی واقفیت ہو گئی تھی۔ ترکی اس کی گھریلو زبان تھی، فارسی میں اسے کافی مہارت تھی اور ہندی سے بھی وہ ناآشنا نہیں تھا۔ اس لئے کہ پہلی بات تو یہ کہ اگر وہ ہندی نہیں جانتا تھا تو محل کی ہندو رانیوں سے کس زبان میں گفتگو کرتا تھا، ترکی اور فارسی کو تو وہ سمجھ بھی نہیں سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ ہندی موسیقی سے بیحد شوق رکھتا تھا، ہندی مطربوں اور شاعروں کی سرپرستی کرتا تھا۔ برہمنوں کا اس کے دربار میں عروج تھا اور اکبر بھی سنسکرت کی خدمت اپنا فرض سمجھتا تھا۔ یہی نہیں اکبر خود بھی سنسکرت کا بیحد دلدادہ تھا وہ سنسکرت میں شاعری بھی کرتا تھا اور ہندی شاعری میں اپنا تخلص اکبر رائے رکھتا تھا۔ اسی بادشاہ کی بے دریغ فیاضیوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں سنسکرت کا ذوق پیدا ہوا اور بیسیوں سنسکرت کتابوں کا مسلمانوں نے ترجمہ کر ڈالا۔ دربار کے عمائدین، امراء و شعراء سنسکرت سے کماحقہ واقف تھے۔ شیخ مبارک ہی کو لیجئے تو ان کے متعلق عام اتفاق ہے کہ وہ شعر و سخن، عروض و معمّا، تاریخ و انشاء تفسیر اور سنسکرت میں ہندوستان کیا دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ فیضی انہیں کے بڑے بیٹے ہیں۔ علم حساب و ہندسہ کی مشہور کتاب لیلاوتی اسی کی احسان مند ہے جس کا ترجمہ اس نے فارسی میں سنسکرت سے کیا تھا۔ یہ کتاب بیدر کے مشہور پنڈت بھاسکر کی باکمال لڑکی کی تصنیف کہی جاتی ہے۔ حساب کی ایک دوسری کتاب بھی سنسکرت سے فارسی میں منتقل کی اور بھگوت گیتا کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا۔ اکبر ہی کی سنسکرت نوازی کا نتیجہ تھا کہ رامائن اور مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ ہوا اور زیچ میرزائی کا ترجمہ سنسکرت میں کیا گیا۔

اسی طرح ابوالفضل کا ہندی میں فاضل ہونا صرف آئین اکبری

[1] اورینٹل کالج میگزین بابتہ مئی ۱۹۳۲ء۔ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کا مضمون "اردو زبان کی لغت" ہندوستانی ۱۹۳۱ء

ہی سے ظاہر ہے کہ اس میں سیکڑوں ہندی کے الفاظ۔ میووں، درختوں پھولوں، غلہ، ترکاریوں، کھانوں، کپڑوں، ہتھیاروں کے نام اور بہت سی دوسری اصطلاحیں ایسی ملتی ہیں جو ہندی ہیں اور آج بھی وہ برابر استعمال ہوتی ہیں۔ ابوالفضل کی ہندی دانی کا ایک ثبوت یوں اور بھی دیا جاسکتا ہے کہ وہ خود آئین اکبری میں لکھتا ہے کہ علم ہئیت کی ایک کتاب کا ترجمہ حسب الحکم بادشاہ ہندی زبان میں کیا۔

اکبر کے زمانے میں یقیناً ہندی کو غیر معمولی ترقی ہوئی اور یہ حالت ہوگئی تھی کہ عمائدین اور شہزادے ہندی زبان میں شاعری کرنے لگے تھے۔ شہزادہ دانیال کے متعلق تزک جہانگیری میں ہے کہ

بہ نغمۂ ہندی مائل بود۔ گاہے بزبان اہل ہنود بہ اصطلاح ایشان شعری گفت۔"

اسی طرح عبدالرحیم خانخاناں کی سنسکرت اور ہندی دانی، عربی وفارسی میں مہارت تزک جہانگیری سے ثابت ہے۔

"خانخاناں حد قابلیت واستعداد و یکتائے روزگار بود۔ زبان عربی، ترکی، فارسی و ہندی میدانست واز اقسام عقلی و نقلی حتی کہ علوم ہندی بہرہ ذاتی میداشت۔ بزبان فارسی و ہندی شعر نیکو می گفت"

عبدالرحیم خود بھی شاعر تھا اور شاعر نواز بھی تھا چنانچہ مشہور شاعر گنگ کوی کا مربی بھی تھا۔

تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ہندی کا اکبر کے یہاں یہ عروج ہوا کہ ہندوستانیوں کے علاوہ ایرانیوں کو بھی اس کا چسکا لگ گیا تھا۔ فارسی شعرا جو اس وقت دربار میں موجود تھے اکثر ہندی الفاظ نظم کرتے اور بولتے تھے۔ ملا دو پیازہ کو دیکھیے کہ ایرانی النسل ہونے کے باوجود ظرافت کے پیرایہ میں برابر ہندی میں شاعری کیا کرتے تھے چنانچہ کلام کا نمونہ دیکھیے۔

وہ گورا گورا لڑکا بامن کا شوخ گھونا ایسا لگے ہے مجھ کو جوں کھانڈ کا کھلونا

شوخی نپٹ کرت ہے ٹک چکنی ہاتھ ملکر تیں تاک شیخ کھینچتی ایسی طرح لونا

دو پیازہ از دل و جان قربان جرانبا تم جوبن لدھکا ماتا وہ سانولا سلونا

اس وقت کی شاعری کا ایک نمونہ اور دیکھیے۔ ملا نوری فیضی کے دوست تھے۔ اعظم پور کے قاضی زادوں میں سے ہیں۔ شاعر فارسی کے تھے اور فن بدیع و معما میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ریختہ میں بھی ان کی کئی غزلیں محمد شاہی عہد تک مشہور تھیں چنانچہ قائم[1] نے ذکر کیا ہے۔ ایک شعر نوری کا ملاحظہ ہو۔

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد

بیچارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

جہانگیر بھی اکبر کی طرح ترکی سے واقف تھا۔ فارسی میں اتنی دستگاہ رکھتا تھا اور ایسے ذوق سلیم کا مالک تھا کہ اساتذہ کے مصرعوں پر برجستہ مصرعہ لگادیا کرتا تھا۔ ہندی سے بھی یقیناً واقف تھا اس وجہ سے کہ وہ ایک ہندو ماں سے پیدا ہوا اور ابتدا ہی سے ایک ہندی ماحول میں رہا۔ دوسرا ثبوت ہندی دانی کے متعلق یہ ہے کہ تزک جہانگیری میں ہندی الفاظ اس کثرت سے ملتے ہیں کہ اس سے اس کا ہندی زبان پر عبور معلوم ہوتا ہے دو چار الفاظ دیکھیے۔

"شیرمار۔ روپ سندر۔ ہنسراج۔ تالاب۔ گلہری۔ کالا پانی۔ بن مانس" وغیرہ وغیرہ جن میں سے اکثر اس وقت بھی مستعمل ہیں اس عہد کی شاعری کا نمونہ دیکھنا ہو تو خاکی نامی درویش[2] کا یہ ریختہ دیکھیے۔

ٹھانی ہے اپنے من میں اتو یہی سریجن

تجھ پیم کی گلی میں خاکی کو خاک ہونا

سلاطین مغلیہ عموماً جس طرح شاہی زبان یعنی فارسی کی

---

[1] مخزن نکات۔ [2] تذکرۂ میر حسن

سرپرستی کرتے تھے اسی طرح بھاشا کی بھی عزت افزائی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ جہانگیر کا خود بیان ہے کہ ایک اچھوتے مضمون کی نظم کے صلے میں اس نے ایک ہندو شاعر کو ایک ہاتھی فرط خوشی سے انعام میں دیا۔ ہندی تصانیف کے ساتھ مغلوں کا شغف اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ لوگ ہندی کی مشہور کتابیں یاد کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ میر ہاشم محترم مہابھارت کے صفحے کے صفحے زبانی سنا دیا کرتے تھے ہفت اقلیم کی عبارت سنیئے۔

"امروز در ہندوستان است تمام کتاب مہابھارت را کہ متجمع اسامی غریبہ و حکایات است در ذکر دارد"

جہانگیر کے بعد شاہجہاں بھی ہندی سے واقفیت رکھتا تھا۔ فارسی تو اس کی خاص زبان تھی ہی مگر فارسی کے علاوہ لوگوں سے ہندوستانی میں بھی گفتگو کرتا تھا۔ عبدالحمید لکھتا ہے۔

"بیشتر بہ فارسی در کمال فصاحت و بلاغت تکلم می فرمایند و بہ بعضے ہندوستانی زبانان کہ فارسی ندانند بہ ہندوستانی"[۱]

شاہ جہاں نامے اور دوسری کتابیں بھی اس وقت کے بیسیوں ہندی الفاظ کی حامل تھیں جو آج بھی متروک نہیں ہوئے ہیں مثلاً ابھول کٹورہ۔ دل بادل۔ چبوترہ۔ پالکی۔ رتھ وغیرہ۔

حیرت ہوتی ہے کہ اورنگ زیب کو لوگ ہندوؤں کی طرف متعصب و متہتک بتاتے ہیں لیکن بھاشا کی ترقی اس کے وقت میں بھی کچھ کم نہیں ہوئی۔ ایران کا مشہور شاعر ضمیر اسی زمانہ میں ایران سے آیا اور بھاشا میں انتہائی کمال پیدا کر کے ہندی راگ کی مشہور کتاب پارجاتک کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ آزاد بلگرامی ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

"..... بواسطۂ جدت ذہن و تعلیم ہندی طبع او آں قدر تجلی شد کہ از جملۂ استادان فن برآمد۔ زبانش بہ تلفظ ایں زبان خوب نمی گردید اما نظم او بسیار پختہ واقع می شد۔ ترجمہ پارجاتک در فن قصۂ نغمات ہندی از وست۔ در ہندی پنچھی تخلص میکرد"[۲]

[۱] شاہجہاں نامہ جلد اول [۲] [illegible]

اورنگ زیب کے زمانہ میں بقول مولوی نور الحسن صاحب نیر کاکوروی بھاشا کی زباں دانی کا چسکا اس قدر زیادہ پڑ گیا تھا کہ بڑے بڑے علماء و حضرات اولیا و صوفیا سب کے سب اس میں کمال پیدا کرتے تھے[۳]

اورنگ زیب کے بعد اعظم شاہ اور فرخ سیر کے زمانے میں بھی ہندی نوازی اور ادبیات میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ جعفر زٹلی ناصر علی سرہندی، میر عبدالجلیل بلگرامی، سید غلام نبی اور خود آزاد بلگرامی سب کے سب ہندی میں ماہر رہے ہیں انھوں نے ہندی کتابیں بھی لکھیں۔ یہی جذبہ محمد شاہی دور تک قائم رہا چنانچہ آزاد بلگرامی[۴] لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے علماء نے جے سنگھ کے حکم سے شرح چغمینی اور دوسری کتابوں کا جو علم ہیئت اور ہندسے میں تھیں عربی زبان سے ہندی میں ترجمہ کیا۔

یہاں تک مسلمانوں کی ہندی اور سنسکرت خدمات دکھانے کے بعد ہم اس بات کی قدرے کوشش کریں گے کہ مسلمانوں کی شاعری میں ہندی عنصر کی موجودگی اور ہندو کلچر کی نمایندگی ظاہر کریں۔ یہ بھی ایک عام اعتراض ہے کہ مسلمانوں کی شاعری فارسی سے متاثر ہے۔ اس میں وہی لالہ و گل کی بہاریں ہیں، بلبل و قمری کے نغمے ہیں۔ شیریں و فرہاد کی داستانیں ہیں اور رستم و سہراب کی نوحہ خوانی ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ اگرچہ مسلمانوں کی شاعری کے اکثر عناصر عجمی ہیں تاہم ہندی کلچر کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس کے اثرات مسلمانوں کے یہاں نہ ملتے ہوں مثلاً ہندو تہذیب، معاشرت مذہب، آداب و رسوم اور جملہ ہندی عناصر اس میں موجود ہیں ہندی کے سیکڑوں لفظ ولی، حاتم، آبرو، مضمون اور فائز دہلوی[۵] کے یہاں جو شمالی ہند کا سب سے قدیم شاعر ہے کثرت سے ملتے ہیں۔ یہی میر، انشا، سودا، مظہر، امانت، منیر، وغیرہم کی حالت ہے۔

[۳] ہندوستانی اکتوبر ۱۹۳۶ء [۴] سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان [۵] صدر الدین فائز دہلوی پر پروفیسر مسعود حسن رضوی نے ایک نہایت جامع مقالہ دہلی کانفرنس میں پڑھا تھا اور ثابت کیا تھا کہ وہ شمالی ہند کا سب سے پہلا شاعر ہے، اس کا دیوان ۱۱۲۷ھ میں یعنی ولی سے پانچ سال قبل مدون ہو چکا تھا۔

سودا کے متعلق آزاد دہلوی لکھتے ہیں کہ "مرزا اکثر ہندی کے مضمون اور الفاظ نہایت لطیف طور پر تضمین کر کے زبان ہندی کی اصلیت کا حق ادا کرتے ہیں (آب حیات) چنانچہ ان کی پہیلیاں، مرثیوں اور قصیدے سے ظاہر ہے۔ ان پہیلیوں کو دیکھیے جن کی زبان باوجود زمانہ کے فرق کے امیر خسرو کی زبان سے ملتی جلتی ہے۔

شمشیر کی پہیلی

(۱) سر پر چھتر کمر پر بار ٭ اس نار کا ہے یہی بچار
جیتے ہم کرے وہ دُو ٭ جب وہ ناری پیاری ہوتے

سپر کی پہیلی

(۲) ایک نار بھونرا سی کالی ٭ کان نہیں وہ پہنے بالی
ناک نہیں وہ سونگھے پھول ٭ جتنا عرض اتنا ہی طول

باز کی پہیلی

(۳) بعض بات کہی نا جائے ٭ ناری ہو کر نر کہلائے

قندیل کی پہیلی

(۴) سہرا باندھا پاؤں پر اور سنگ ہوئے اس کے ساتھی
پیٹ میں واکے آگ لگا دی گلے میں اس کے ڈالے پھانسی

اسی طرح ہندی شاعری کے تشبیہ و استعارے بھی پوری طرح سے مسلمانوں کے یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں بحریں بھی ہندی اثرات سے تبدیل ہوئیں۔ مثنویاں ہندو قصوں اور افسانوں پر لکھی گئیں۔ مسلمان شعراء میں نظیر اکبرآبادی کی شخصیت ہندوانہ موضوعوں پر نظمیں لکھنے میں بہت نمایاں ہے جنھوں نے "بلدیوجی کا میلہ" "کنھیا جی کی شادی" "ہر کی تعریف" "درگا جی کے درشن" "مہادیو کا بیاہ" وغیرہ عنوانات سے اکثر و بیشتر نظمیں لکھیں اور ان سے ہندو مذہب کے بہت سے رسوم اور حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح مختلف قسم کے زیورات، توہمات، ہندو رسوم، رنڈاپا، شادی بیاہ، ہندو تیوہار۔ سب قسم کی نظمیں موجود ہیں مگر طوالت کے لحاظ سے مثالیں نظر انداز کی جاتی ہیں۔

غرض کہ اگر ہم انصاف سے دیکھیں تو شعراء سے لے کر مسلمان بادشاہوں تک کا کلام اور معاشرت ہندوستان کی تہذیب اور معاشرت کی آئینہ دار ہے۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب اور واجد علی شاہ[1] سب کے یہاں ہندی تہذیب کے نشانات نہایت واضح ہیں۔ ان تمام باتوں سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے ہندی ادب کی ترویج میں کوئی کمی نہیں کی ان کا فطری میلان بھی ایک حد تک اسی کی طرف تھا اور خود ان کی شاعری و ادب ہندی اثرات اور تمدن و تہذیب و معاشرت کا پرتو ہے۔ رسالہ کی گنجائش مضمون کی وسعت کے ساتھ سازگار نہیں اسلئے اختصار مدنظر رہا ورنہ اگر اس موضوع کی تفصیل کر دی جائے تو مستقل ضخیم کتابیں تیار ہو جائیں۔

اقبال انصاری

اطلاع

جن اصحاب کا چندہ ختم ہو گیا ہے وہ براہ کرم جلد روانہ فرما دیں یا سب رس تقسیم کرنے والے کو چندہ دے کر باضابطہ مطبوعہ رسید حاصل فرمالیں۔

[1] واجد علی شاہ "اختر" تخلص کرتے تھے۔ موسیقی پر کئی کتابیں لکھیں۔ ہندی شاعری سے بیحد دلچسپی تھی ٹھمریاں اور گیتیں ان کی بہت مشہور ہیں۔ کل کتابیں ایک سو بیس (۱۲۰) سے زیادہ ہیں۔ واجد علی شاہ کی تقریباً پچاس تصنیفیں پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتب خانہ میں موجود ہیں جنھوں نے بیس سال کی کوشش کے بعد ان جواہر پاروں کو اکٹھا کیا ہے اور ایک مبسوط مقالہ واجد علی شاہ کی "ادبی خدمات" پر لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھ چکے ہیں۔

نشری تقاریر

ہماری زبان کا ایک ایک لفظ ایک گولی ہے جو ہمارے منہ سے نکل کر سننے والوں کے دماغوں میں پیوست ہو جاتی ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ اس کی اہمیت کو محسوس کریں۔ اگر دس منٹ کی تقریر دس لاکھ سامعین سنیں تو انھوں نے تقریباً دو سال کا وقت دیا ہے۔ اس دو سال کی مدت کو قوم کا نہایت قیمتی سرمایہ سمجھئے۔ اول تو ارباب نشر خود اس کو گوارا نہیں کرتے کہ غیر معیاری تقریریں نشر کروا کے اپنے سامعین کا وقت ضایع ہونے دیں اور اگر کبھی ان سے چوک ہو جائے تو خود مقرروں پر کتنی بڑی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ وہ قوم کے آگے کتنا بڑا گناہ کر رہے ہیں۔ نشریات کو شہرت اور آمدنی کا ذریعہ سمجھنے والوں کو اپنے اخلاقی اور قومی فرائض پر سب سے پہلے نظر ڈالنی چاہیے۔ خود پر قومی خدمت کی پابندی عاید کر کے نشریات کے میدان میں قدم رکھئے تو ان شرطوں کو پورا کرنے یا ان اصولوں پر عمل کرنے میں کافی آسانی ہوگی جو اربابِ نشر نے بنائے ہیں۔

صداقت نشریات کی سب سے پہلی شرط ہے۔ اس مقالہ کی ابتدا، کچھ واعظانہ اور لیڈرانہ انداز لئے ہوئے ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ نشریات کو آج کل قومی خدمت سمجھنے کی بجائے منفعت اور شہرت حاصل کرنے کا آلہ سمجھا جا رہا ہے۔ ہر نشرگاہ میں تقریروں، ڈراموں، فیچروں، مکالموں، مباحثوں، کہانیوں قصوں، افسانوں وغیرہ کے مسودوں کا اتنا انبار ہو جاتا ہے کہ اربابِ نشر ان کو مسترد کرتے کرتے تنگ آ جاتے ہیں۔ دوسری طرف نقالوں، اداکاروں شاعروں اور ان سے بہت زیادہ مطربوں کی کثرت پریشان کر دیتی ہے۔ میرا روئے سخن ان تمام فن کاروں اور اداکاروں اور ادیبوں کی طرف ہے جو ناتجربہ کار اور نوسیکھ ہیں مگر چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد شہرت بھی حاصل کریں اور فائدہ بھی۔

نشریات نے بہت ترقی کر لی ہے اس کے ہر شعبے کے اجزا پروگرام کی ٹکنیک مرتب ہو گئی ہے۔ ان ہی میں سے ایک تقریروں کا شعبہ ہے جو مختلف حیثیتوں سے بے حد اہم ہے۔ اس کی یہی اہمیت کیا کم ہے کہ انسانی جذبات اور تاثرات ہماری زبان اور الفاظ کے ذریعہ پیش ہوتے ہیں۔ دنیا کا اہم سے اہم واقعہ الفاظ ہی کی وجہ سے عوام کو معلوم ہوتا ہے۔ ہمارا منہ ایک جسم اور اس سے ادا ہونے والا لفظ روح ہے۔ جسم اور روح کی کثافت کس قدر زہر پھیلا سکتی ہے یہ آپ ضرور جانتے ہوں گے۔ ہماری زبان اور قلم سے جو الفاظ ادا ہوتے ہیں ان کی دو شکلیں ہیں۔ تقریر اور تحریر۔ نشریات نے تقریر اور تحریر دونوں کو ملا کر ایک نئی چیز پیدا کی ہے جو "نشری تقریر" کہلاتی ہے۔

پلیٹ فارم اور اسٹوڈیو

جو اصحاب پلیٹ فارم اور نشرگاہ کے اسٹوڈیو سے واقف ہیں وہ ان دونوں کی ظاہری ہیئت اور شکل کے پیش نظر بھی ان دونوں میں نمایاں فرق محسوس کرتے ہوں گے۔ پلیٹ فارم کی تقریر کو انگریزی میں اسپیچ کہا جائیگا۔ اور اسٹوڈیو کی تقریر ٹاک کہلائے گی۔ پہلی تقریر ایک قسم کا لکچر اور دوسری ایک طرح کی گھریلو بات چیت ہے۔ لکچر اور بات چیت میں اس کے سامعین کے مد نظر بھی فرق کیا جائے گا۔ پلیٹ فارم سے جو تقریر ہوگی اس کے سننے والوں کی تعداد بہت زیادہ رہے گی اس کے برخلاف بات چیت سننے والے دو چار ہی ہوا کرتے ہیں۔ لکچر سننے والے تقریر کے سامنے اور اس سے کافی قریب ہوں گے۔ اسٹوڈیو کی نشری بات چیت سننے والے غائب اور سیکڑوں میل کے رقبے میں پھیلے ہوئے۔

مگر مجموعی طور پر ان کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں ہوتی ہے۔

اس پلیٹ فارم کا تصور باندھئے جس کے سامنے سامعین بیٹھے تقریر کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس مجمع میں تقریر یا مقرر کے موافق، مخالف اور غیر جانب دار سب ہی ہوں گے۔ موافقین اور مخالفین نے موافقت یا مخالفت کرنے، نعرے لگانے، تالیاں بجانے، شور مچانے، حوصلہ افزائی کرنے یا پست ہمت کرنے کے بہت سے طریقے سوچ لئے ہوں گے۔ کمزور سے کمزور استدلال پر موافقین کا شور مخالفین کو خاموش کر سکتا ہے۔ معقول سے معقول دلیل پر کثیر مخالفین آتنی گڑ بڑ کر سکتے ہیں کہ مقرر کو کچھ اور بولنے کی جراءت نہ ہو سکے۔ غیر جانبداروں کا سکوت مفید بھی ہو سکتا ہے اور مضر بھی۔ مقرر کے نام کا اعلان ہوتے ہی یا تقریر کے شروع میں مجمع جس انداز میں اس کا خیر مقدم کرتا ہے اس سے پوری تقریر پر اثر پڑتا ہے۔ کالج کے مباحثوں میں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بعض مقرروں سے طالب علموں کو خدا واسطے کا بغض ہوتا ہے۔ وہ اس غریب کو بولنے ہی نہیں دیتے۔ کالجوں میں ہی بعض مقرر ایسے ہوتے ہیں جن کو بے وقوف بنانے کیلئے لڑکے نعروں اور تالیوں کی گونج سے طلب کرتے اور عین تقریر کے دوران میں چلے کس کر، زمین پر پیر پٹخ کر، تال کے ساتھ تالیاں بجا کر ان کو بے نیل مرام واپس کر دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ناظرین کی موجودگی مقرر پر طرح طرح کی ذمہ داریاں عاید کرتی ہے۔ پلیٹ فارمی مقرر کو غیر معمولی طور پر چوکس رہنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے حاضرین کے ردّعمل کو نظر انداز کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ مقرر مجمع کی مرضی کے خلاف طویل تقریر نہیں کر سکتا۔ تقریر کی طوالت یا اختصار کا دارومدار بالعموم مجمع کے مزاج پر ہوگا۔ اگر مقرر کے خیالات مجمع کے خیالات سے مختلف ہوں تو ان کی انتہائی مقبولیت اور افادیت کے باوجود مقرر کو "شان دار پسپائی" ہوگی۔ گو ایک

پلیٹ فارم کے حالات دوسرے سے الگ ہوتے اور ہو سکتے ہیں نیز جلسوں اور تقریروں کی نوعیت اکثر بدلی ہوئی ہوتی ہے اس کے باوجود حاضرین اور ان کا ردِ عمل ہر جلسے اور محفل میں ملے گا۔ کالج کا مباحثہ، کونسل کے جلسے دارالعوام کی بحثیں، تعزیتی جلسے خیر مقدمی جلسے احتجاجی جلسے وغیرہ ایک دوسرے سے الگ ضرور ہیں مگر ہر جلسے کے حاضرین کا ردعمل ہوگا کہیں متین کہیں شوخ، کہیں مہذب کہیں غیر مہذب۔ کالج کے جلسوں میں چہل دلگی مذاق ملے گا، تعزیتی جلسوں میں خموشی اور سنجیدگی، احتجاجی جلسوں میں شور و غوغا اور برہمی، خیر مقدمی جلسوں میں خوشی اور مسرت۔ تعزیتی جلسوں کی رقت مقرر کو اس قدر متاثر کر سکتی ہے کہ وہ جوش میں آجائے، احتجاجی جلسوں کی برہمی مقرر پر یہ اثر ڈال سکتی ہے کہ مقرر اپنے احتجاج میں اور شدت پیدا کر دے اور مجمع کو زیادہ برہم بنا دے۔ حاضرین کے اس ردعمل سے تقریر کا دوران، مقرر کا لب و لہجہ اور انداز بیان بھی متاثر ہوتا ہے۔ اگر حاضرین موافق نظر آئیں اور پروگرام کے مطابق وقت کی کوئی پابندی نہ ہو تو ممکن ہے اس موافقت سے فائدہ اٹھا کر مقرر دس بیس منٹ اور تقریر کرے یا خود صدر جلسہ مقرر کو مزید وقت دیدے۔ مخالفت کی صورت میں دانشمند مقرر خود اپنی تقریر جلد ختم کر دے گا۔ اگر سننے والے نعروں اور تالیوں سے اپنے خیالات ظاہر کر دیں تو مقرر کا انداز بیان اور لب و لہجہ موافقت کی صورت میں اور شگفتہ ہو جائے گا، الفاظ اور خیالات زیادہ روانی کے ساتھ نکلیں گے۔ اگر مخالفت ہو تو انداز بیان سے پژمردگی ظاہر ہوگی اور یہ محسوس ہوگا کہ مقرر کو باوجود کوشش کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ نہیں ملیں گے۔ یا یہ کہ اس کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ تو تھا مختصر سا حال پلیٹ فارم کا۔ اب ذرا اسٹوڈیو کے حالات پر غور کیجئے۔

اسٹوڈیو ایک نہایت خاموش کمرہ ہے جہاں سے مقرر اپنی تقریر نشر کرتا ہے۔ اس میں وہ اپنی تقریر سے چند منٹ پہلے پہنچا دیا جاتا ہے۔ داخلہ کے وقت بھی اسٹوڈیو میں وہی خموشی رہتی ہے جو تقریر کے دوران میں ہوتی ہے۔ نہ کوئی ہمت بڑھانے والا اور نہ مرعوب کرنے والا۔ متعلقہ جان دار چیزوں میں ایک اناؤنسر اور بے جان میں تقریر کی ایک کاپی ہوتی ہے۔ مقرر چاہے دو چار منٹ پہلے پہنچے یا آدھ گھنٹہ پہلے وہ خود کو ایک ہموار، موافق اور نہ بدلنے والی فضا میں محسوس کرے گا۔ کسی قسم کی کوئی تبدیلی یا غیر معمولی بات نہ ہوگی۔ میز کے قریب بیٹھے ہوئے مقرر سرخ روشنی اور اناؤنسمنٹ کا انتظار کرے گا۔ سرخ روشنی ہوئی، اناؤنسمنٹ دیا گیا اور اس نے بلا کسی تذبذب، انتظار، تکلیف یا تامل کے اپنی تقریر شروع کر دی۔ پلیٹ فارم کی طرح یہ نہیں کہ مقرر اپنی ٹوپی درست کر رہا ہے، تالیوں کے رکنے کا انتظار کر رہا ہے یا بے چین حاضرین کو اطمینان سے بیٹھ جانے کا موقع دے رہا ہے، اپنے تیار کئے ہوئے نوٹس الٹ پلٹ کر رہا ہے، حلق صاف کر رہا ہے، اپنی مسکراہٹ، سنجیدگی، اکڑ یا لاابالی پن ظاہر کر کے حاضرین کو اپنا بنا رہا ہے یا مرعوب کر رہا ہے۔ اسٹوڈیو کا مقرر خود کلام یعنی (monologist) ہے مگر اس کے سننے والے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ادھر ادھر پھیلے ہوئے مختلف ماحول میں تقریر سن رہے ہیں۔ پلیٹ فارمی مقرر کے حاضرین کے برخلاف جو ایک ہی ہال میں ایک خاص ماحول اور فضا میں تقریر سنتے ہیں، نشری مقرر کی تقریر مختلف حالات میں سنی جاتی ہے۔ ریڈیو چل رہا ہے، میاں تقریر سننا چاہتا ہے مگر بیوی نوکروں کو اس بری طرح ڈانٹ رہی ہے کہ کان پڑے آواز سنائی نہیں دیتی۔ بچوں کے شور نے ناک میں دم کر دیا ہے، باہر مارواڑی تقاضے کے لئے آیا ہے۔ اندر "سرکار" اس کے خوف سے نہایت کم حجم کے ساتھ ریڈیو سن رہے ہیں، موسم ناخوشگوار ہے، ریڈیو کی کھڑکھڑ میں الفاظ سنائی نہیں دیتے، تقریر کے دوران میں کسی نے بجلی بند کر دی اور تقریر کا بہترین حصہ سنا نہ جا سکا، عین اناؤنسمنٹ کے وقت کسی نے اتنی زور سے دروازہ بند کیا کہ مقرر کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ خاموش کمرہ میں صرف ایک شخص نہایت عمدہ ریڈیو پر مزہ میں تقریر سن رہا ہے غرض ہزاروں گھروں میں مختلف حالات ہوتے ہیں۔ پلیٹ فارمی تقریر ناپسند ہوئی تو احتجاجی نعرے بلند ہوئے اور مقرر سہم گیا۔ اسٹوڈیو کی تقریر بری لگی تو آپ نے اپنا ریڈیو بند کر دیا یا دوسری نشرگاہ کا پروگرام سننے لگے۔ مقرر پر رتی برابر بھی اثر نہ ہوا۔ نشری مقرر تعریف و تنقیص دونوں سے بے نیاز۔ اسٹوڈیو میں اس کی گنجائش نہیں کہ عین نشر کے وقت کوئی نیا خیال یا نکتہ یاد آیا اور مقرر اس کو بیان کرنے لگا۔ تقریر پہلے سے لکھی ہوئی اور ارباب نشر کی منظور کردہ ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ اپنی تقریر کو مجمع کے مزاج کے مطابق فوراً ڈھالنے لگے۔ حاضرین کا ردعمل محسوس ہی نہیں ہوتا۔ نہ خیال بدلنا پڑتا ہے نہ لب و لہجہ۔ نہ اختصار کی حاجت نہ طوالت کی ضرورت۔ مقررہ رفتار نشر میں کمی بیشی بھی نہیں کی جا سکتی۔ پندرہ منٹ کی تقریر کو پندرہ منٹ میں ختم کرنا ہے۔ جہاں تک سماعت کا تعلق ہے اسٹوڈیو کے مقرر کے مقابلہ میں پلیٹ فارمی مقرر کے پاس امکان کی دنیا ہی نہیں۔ ہال میں جو لوگ جمع ہیں ان کی شخصیت اور ردعمل دونوں محسوس ہوتے ہیں۔ اسٹوڈیو کے مقرر کے آگے امکان کی بہت وسیع دنیا ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس کی تقریر بادشاہ، وزیر اعظم، شاعر، فلسفی، طالب علم، چار خانے والے، دفتر کے منشی، افسران بالادست، عورتیں، بچے، عزیز و اقارب سن رہے ہوں۔ اس کے برخلاف کچھ ہال کے گنے چنے لوگ نظر کے سامنے رہتے ہیں۔

حاضرین کی موجودگی اور عدم موجودگی میں تقریر کرنا دو مختلف

آرٹ ہیں اسی لئے ان کے اصول بھی الگ الگ ہیں ان ہی اصولوں کے تحت مقرر کی شخصیت، تقریر کا عنوان، مواد و متن، اندازِ بیان زبان، لب ولہجہ، رفتار، آواز کا حجم وغیرہ خاص توجہ کے محتاج رہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اگر کیا گیا تو اس کا اثر مقرر اور ارباب نشر دونوں پر پڑے گا۔ تقریر اگر غیر دلچسپ یا غیر معیاری ہو تو صرف یہی نہیں ہوگا کہ سامعین مقرر کی قابلیت اور صلاحیت پر حملہ کریں گے بلکہ وہ ارباب نشر سے بھی پوچھیں گے کہ ایسے مقرر کو کیوں موقع دیا گیا۔

تقریری زبان

تقریر اور تحریر میں خواہ اس کا تعلق کسی زبان اور ادب سے ہو کافی فرق ہے۔ بہت سے الفاظ اور اشارے ایک کے لئے مناسب اور دوسرے کے لئے غیر موزوں اور غلط ہوں گے۔ اردو کی تحریروں میں اکثر "مندرجۂ ذیل" "مندرجہ بالا" "حسب ذیل" "مندرجہ صدر" جیسے الفاظ ملیں گے۔ ذیل، بالا اور صدر تو ایسی جگہ استعمال ہو سکتے ہیں جہاں کوئی رقبہ ہو۔ کاغذ کا جس پر لکھا جاتا ہے رقبہ ہوتا ہے اس کے اوپر اور نیچے والے حصے ہوتے ہیں مگر "تقریر" کا کوئی رقبہ نہیں۔ بات چیت میں ایسے الفاظ استعمال نہیں ہوتے۔ "بالا" اور "ذیل" کو "پہلے" اور "بعد" میں بدل دینا چاہئے۔ یا جملہ کو اس طرح ڈھال لینا چاہیے کہ اگلے یا پچھلے کا حوالہ معلوم ہو۔ چونکہ نشری تقریر پہلے سے لکھ لی جاتی ہے اس لئے لکھتے وقت عام طور پر تحریر کے اصول نظر کے سامنے رہتے ہیں۔ رو اور بے خیالی میں ایسے الفاظ لکھ لینا کوئی تعجب کی بات نہیں مگر یہ الفاظ مائکروفون پر بولے نہیں جا سکتے۔ اسی طرح چند اور مثالیں غور طلب ہیں۔

(الف) "پچھلے اوراق میں ذکر کیا گیا ہے" (ب) "آئندہ صفحوں میں بیان کیا جائے گا" (ج) "اوپر کی دلیلوں سے ثابت ہوتا ہے" (د) "نیچے کے استدلال سے یہ نتیجہ نکلے گا۔" الف اور ب پر یہ واجبی اعتراض ہوگا کہ اوراق اور صفحوں کا ذکر کر کے سننے والوں پر تقریر پڑھنا ظاہر کیا گیا جس سے تقریر کی کافی قدر گھٹ گئی۔ ج اور د پر دونوں اعتراض ہوں گے یعنی رقبہ کا سوال اور پھر تقریر کا پڑھا جانا۔ ان جملوں کو اس طرح بدلا جا سکتا ہے۔

(الف) "اس سے پہلے ذکر کیا گیا ہے" (ب) "ابھی تھوڑی دیر میں بیان کیا جائے گا" (ج) "پچھلی دلیلوں سے ثابت ہوتا ہے" (د) "اگلے استدلال سے یہ نتیجہ نکلے گا۔"

اکثر تحریروں میں ہم کو کچھ حصہ قوسین میں ملے گا۔ بظاہر وہ حصہ نامکمل اور تشنہ محسوس ہوگا مگر تحریر کی بعض روایتوں سے ہم اتنے مانوس اور واقف ہو گئے ہیں کہ فوراً مطلب سمجھ میں آجاتا ہے اور دراصل کوئی تشنگی نہیں ہوتی۔ مثلاً

"جہانگیر کا عہد حکومت (۱۶۰۵ - ۱۶۲۷) اپنی گوناگوں ترقیوں کی وجہ سے مغلوں کی تاریخ میں کافی امتیاز رکھتا ہے۔"

اس تحریر کو سمجھنے میں کسی کو کوئی دقت نہ ہوگی۔ مطلب واضح ہے۔ جملہ میں نہ تو کوئی غلطی ہے اور نہ ابہام۔ مگر یہی جملہ نشر کے لئے اس طرح لکھا اور پڑھا جائے گا۔

"جہانگیر کا عہد حکومت جو ۱۶۰۵ سے شروع ہو کر ۱۶۲۷ پر ختم ہوتا ہے اپنی گوناگوں ترقیوں کی وجہ سے مغلوں کی تاریخ میں کافی امتیاز رکھتا ہے۔"

قوسین کی ایک دوسری مثال دے کر میں یہ ثابت کروں گا کہ قوسین کی وجہ سے مفہوم بدل سکتا ہے۔

"مرہٹواڑی میں دو صوبے ہیں۔ اورنگ آباد اور گلبرگہ۔ اسی طرح تلنگانہ میں بھی دو صوبے ہیں میدک (گلشن آباد) اور ورنگل۔"

جن کو معلوم ہے کہ میدک کو گلشن آباد بھی کہتے ہیں وہ تو سمجھ جائیں گے مگر جن کو علم نہیں وہ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ مقرر سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ یا تو تلنگانہ میں تین صوبے ہیں یعنی (۱) میدک (۲) گلشن آباد (۳) ورنگل یا پھر ان تینوں میں سے کوئی ایک نام غلطی سے لیا گیا۔ شبہ نہ ہونے کی خفیف سی کوئی اُمید ہو سکتی ہے تو اس طرح کہ میدک اور گلشن آباد کو اس طرح ملاکر اور تیزی سے پڑھا جائے کہ دونوں ایک نام معلوم ہوں۔ توسین حذف کر کے وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

" مرہٹواڑی میں دو صوبے ہیں۔ اورنگ آباد اور گلبرگہ
اسی طرح تلنگانہ میں بھی دو صوبے ہیں۔ ورنگل
اور میدک جس کا دوسرا نام " (یا " میدک کا دوسرا
نام ") " گلشن آباد ہے "

ایک اور مثال پر غور کیجیے جہاں اردو ترجمہ توسین میں دیا گیا ہے۔

" سائبیریا کے شمالی حصہ میں بہت کم جانور پائے
جاتے ہیں۔ رین ڈیر (بارہ سنگھا) سفید ریچھ،
لومڑی اور سیل (دریائی بچھڑا) قابل ذکر ہیں "

ایسے جملوں کو نشر کرتے وقت توسین کا بدل لفظ " یعنی " ہوگا۔ یا پھر یہ کہا جاسکتا ہے " جس کا ترجمہ .... ہے " یا " جس کو .... میں .... کہتے ہیں " وغیرہ۔

میں ذاتی طور پر نشری تقریر میں اشارۂ قریب کا بہت مخالف ہوں۔ گو مقرر کی آواز سے جو ریڈیو پر سنی جاتی ہے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مقرر بہت قریب ہے مگر اصل میں وہ ہوتا بہت دور ہے۔ مقرر جن افراد، چیزوں یا مقاموں کا نام لیتا ہے وہ بھی مقرر اور سامعین دونوں سے بہت دور ہوتے ہیں۔ ایک مستند نصابی کتاب کا مندرجۂ ذیل حصہ پڑھیے۔

" یہاں جو دریا بہتے ہیں ان میں مچھلی کثرت سے
پائی جاتی ہے۔ یہ علاقہ سائبیریا کے جنگلوں کا علاقہ
کہلاتا ہے۔ یہاں کے باشندے زیادہ اودہر اودہر
نہیں پھرا کرتے "

اشارۂ قریب تحریروں میں جائز ہو یا نہ ہو نشری تقریروں میں تو کبھی جائز نہیں سمجھا جائے گا۔ ذرا غور تو کیجیے جس مقام پر دریا بہتے ہیں، جن دریاؤں میں مچھلی کثرت سے پائی جاتی ہے، جو علاقہ سائبیریا کے جنگلوں کا علاقہ کہلاتا ہے، جہاں کے باشندے زیادہ اودہر اودہر نہیں پھرا کرتے ان میں مقرر میں اور سامعین میں کتنا فصل ہے۔ اگر ہم کسی خاص کمرہ کی کوئی خاص کتاب لانے کے لئے کہیں تو اس طرح کہیں گے ـــــ " اُس کمرہ میں جو کتابیں ہیں اُن میں سے لال کتاب لاؤ "

ہم نے " اُس " اور " اُن " اس لئے استعمال کیا کہ کمرہ اور کتابیں ہم سے دور ہیں۔ بالکل اسی طرح مندرجۂ بالا جملہ میں بھی تبدیلی ہونی چاہیے کیونکہ زیر بحث مقام اور اشیا سامعین سے دور ہیں۔ جملہ کو اس طرح نشر کرنا چاہیے۔

" وہاں جو دریا بہتے ہیں، ان میں مچھلی کثرت سے
پائی جاتی ہے، وہ علاقہ سائبیریا کے جنگلوں کا علاقہ
کہلاتا ہے، وہاں کے باشندے زیادہ اودہر اودہر
نہیں پھرا کرتے "

یہ بات اور ہے کہ سائبیریا کے اس مقام پر جس کا ذکر کیا جارہا ہے یہ جملہ سنا جائے تو سننے والے اشارۂ بعید کو کچھ عجیب سا محسوس کریں مگر نشر میں ہمیشہ اکثریت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ " اِس " " اِن " " یہ " " یہاں " وغیرہ کا استعمال اکثر نشری تقریروں میں غلط محسوس ہوگا۔

نصابی کتابوں میں کم سن طالب علموں کو عمدگی سے سمجھانے

یا یاد کرانے کے لئے بعض باتیں پیراگرافوں کے ساتھ نمبروں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ ان نمبروں کی وجہ سے یاد کر لینا اور ایک نکتہ کو دوسرے نکتہ سے الگ کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ اعلیٰ اور عمدہ تحریروں کے مختلف خیالات اور مضامین میں نمبروں سے فرق اور امتیاز پیدا نہیں کیا جاتا۔ بلکہ پیراگراف بدلا جاتا ہے۔ اسی طرح نشری تقریر میں بھی کوشش کی جانی چاہیے کہ بلا وجہ نمبرات نہ دئے جائیں۔ نمبر لینے سے ایک تو تقریر کی علمی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے دوسرے بعض صورتوں میں تو غلط فہمی کا بھی خدشہ ہے۔ غلط فہمی کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے۔

"دشمن کے نقصانات یہ ہیں۔ (۱) دس ہوائی جہاز (۲) تین ٹینک (۳) چار موٹر دستے (۴) پانچ مشین گنیں"

اگر دس، تین، چار، پانچ کے ساتھ ایک، دو، تین، چار ملا کر پڑھا جائے تو اس کا امکان ہے کہ بعض سننے والے یہ سمجھیں کہ دشمن کے دس ہوائی جہازوں، دو تین ٹینکوں، تین چار موٹری دستوں اور چار پانچ مشین گنوں کا نقصان ہوا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چیزوں کے نام اور تعداد بتانے سے پہلے نمبر ایک، نمبر دو، نمبر تین اور نمبر چار کہا جائے تو بعض سامعین اچھی طرح سمجھ لیں اور ان کو کوئی غلط فہمی نہ ہو مگر یہ بھی ممکن ہے نمبر کہنے کے باوجود کچھ لوگ سمجھنے میں غلطی کر جائیں۔ قطع نظر اس کے نمبرات کہنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اس کو کیوں نہ بچایا جائے۔ اعلیٰ نشری تقریر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ متعلقہ باتیں کہی جائیں۔ نمبروں کو حذف کر کے ایک جملہ میں اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ مطلب سمجھ میں آجائے ——— مثلاً ——— "دشمن کے دس ہوائی جہازوں، تین ٹینکوں، چار موٹری دستوں اور پانچ مشین گنوں کا نقصان ہوا۔"

نمبروں کی اس لئے بھی ضرورت نہیں کہ پیراگرافوں کی حد بندی انداز بیان سے معلوم ہو جاتی ہے۔ ہر نئے پیراگراف کو ایک خاص انداز میں شروع اور ختم کیا جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان وقفہ ضرور رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ نئے پیراگرافوں میں ایک نئی بات یا نیا خیال پیش کیا جائیگا اور پچھلے پیراگراف کا نتیجہ یا استدلال نہیں۔ یہ بات خود ثابت کر دیگی کہ دونوں پیراگرافوں کی حدیں کہاں شروع اور ختم ہوئیں۔

ایسی تقریروں کو جنھیں پیشہ ور ادیب لکھ کر فروخت کرتے ہیں اور خریدنے والا اپنے نام سے نشر کرتا ہے "گوسٹیڈ ٹاکس" Ghosted Talks کہتے ہیں۔ ہندوستان میں ایسے ادیب اور مقرر نہیں ہیں مگر معتمد یا مددگار تقریریں تیار کر کے دیتے ہیں۔ ایسی تقریروں میں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ الفاظ جس طرح ادا کئے جانے والے ہوں بالکل اسی طرح لکھے جائیں۔ اعراب لگا کر ان کا تلفظ سمجھانے میں مدد دیجئے ان کی تحریری اور تقریری شکل میں کوئی فرق نہ ہو۔ ذیل کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"فنا ہونے کی دو حالتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آہستہ آہستہ فنا ہوتی ہیں دوسرے اچانک حادثہ کی وجہ سے فنا ہوتی ہیں۔ مرنے کو انسان حیوان روز مرتے ہیں لیکن کبھی کوئی سخت حادثہ، بیماری یا جنگ ایسی پیش آجاتی ہے کہ کشتوں کے پشتے لگ جاتے ہیں۔"

اس تحریر میں بظاہر کوئی سقم یا کمزوری نہیں مگر یہ جب نشر کی جائیگی تو اس اصول کے تحت کہ جو لفظ جس طرح لکھا گیا ہے اسی طرح پڑھا جائے لفظ "حادثہ" کا تلفظ پہلی اور دوسری مرتبہ بالکل ایک قسم کا ہو کیونکہ دونوں ایک طرح لکھے گئے ہیں۔ حالانکہ اصل میں پہلی مرتبہ "حادثے" پڑھا جائے گا اور دوسری مرتبہ "حادثہ"۔ ایک اور مثال ہے ——— "پلیگ ہیضہ اور انفلوئنزا نے لاکھوں جانیں تلف کیں" اس جملہ میں "ہیضہ" کو ہیضے پڑھا جائے گا۔

اگر کوئی تحریر سمجھ میں نہ آئے تو اس کو ایک سے چار مرتبہ پڑھنے، ایک ایک لفظ پر رک رک کر غور کرنے یا کسی اور سے مطلب پوچھنے کا موقع ملتا ہے۔ نشر میں اس کی گنجائش نہیں۔ جو لفظ یا جملہ سمجھ میں نہ آیا یا یاد نہ ہو سکا وہ ہمیشہ کے لئے گیا۔ اس لئے نشری تقریر تیار کرتے وقت اس کا خاص لحاظ رکھنا چاہیے کہ سننے والے کوئی دقت محسوس نہ کریں۔ تحریروں میں آپ اس قسم کے جملے دیکھیں گے۔

"زید، بکر، عمرو اور خالد نے ترتیب وار" (یا علی الترتیب) پچاس سوا سو اڑھائی سو اور چار سو روپے سے کاروبار شروع کیا۔"

مطلب بھی صاف ہے اور جملہ بھی صحیح۔ مگر ان سننے والوں کی حیثیت پر

غور کیجیے جس کو ناموں کی ترتیب یاد نہ رہی یا وہ رقم کی ترتیب بھول گئے۔ ترتیب کی ذرا سی لغزش سے ایک کا سرمایہ دوسرے کا ہوجائے گا۔ یہاں تک غلطی ہوسکتی ہے کہ زید کے چار سو روپے بکر کے اڑھائی سو عمرو کے سوا سو اور خالد کے صرف پچاس ہو جائیں۔ اگر ذیل کی طرح لکھا اور پڑھا جائے تو سننے والوں کو نہ تو دماغ پر بار ڈالنا پڑے گا اور نہ غلط فہمی کا زیادہ خدشہ رہے گا۔

"زید نے پچاس روپیوں سے بکر نے سوا سو سے عمرو نے اڑھائی سو اور خالد نے چار سو سے کاروبار شروع کیا"

عام طور پر نشری تقریروں میں اعداد و شمار، روپے آنے پائی یا پونڈ شلنگ پنس نہ ہوں تو بہتر ہے۔ اگر ان کا بیان کرنا ناگزیر ہو تو تفصیل میں نہ جائے بلکہ "تقریباً" کہہ کر ختم کر دیجیے۔ اس سے کیا فائدہ کہ آپ نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ تنگبھدرا پراجکٹ پر اتنے لاکھ اتنے ہزار اتنے سو روپیہ اتنے آنے اتنی پائیاں صرف ہوئیں مگر کسی نے یہ یاد رکھنے کی بھی کوشش نہ کی یا یاد نہ رکھ سکا کہ رقم کتنے لاکھ تھی۔ حساب نہ تو یاد رہتا ہے اور نہ کوئی یاد رکھنا چاہتا ہے۔ ملکوں کا حدود اربعہ وہاں کی آبادی، سڑکوں کا طول وغیرہ بیان کرنا بھی بے سود ہوتا ہے۔

تقریر کے جملوں کے متعلق کوئی خاص قاعدہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ہر لکھنے والے کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے دوسرے یہ کہ تقریر کے موضوع کو بھی زبان میں دخل ہوتا ہے۔ طویل جملوں کا بھی وہی اثر ہوسکتا ہے جو مختصر جملوں کا ہوگا۔ کامیاب ناشر طویل جملوں کو بھی خوبی کے ساتھ ادا کرسکتا ہے اور مختصر جملوں کو بھی۔ اس کا دار و مدار خود ناشر پر ہے۔ نیویارک ٹائمز کے ریڈیو ایڈیٹر نے سینیٹر ولیم ای بورہ Senator William E. Borah کی ۱۷ جون سنہ ۱۹۳۵ء والی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کو بے حد سراہا تھا کیونکہ اس کے جملے بہت مختصر تھے۔ ایڈیٹر موصوف نے ان مختصر جملوں کی بہت تعریف کی تھی۔

اووِن ڈی ینگ (Owen D. Young) ایک مشہور امریکی صناع ہیں انھوں نے ۲۴ نومبر سنہ ۱۹۳۲ء کو ایک تقریر نشر کی تھی جس کے جملے طویل بھی تھے اور مختصر بھی۔ اس کے متعلق سننے والوں اور مشاق ناشروں کا خیال تھا کہ وہ بہترین نشری تقریر تھی۔ جملے چھوٹے ہوں یا بڑے سیدھے سادے ہوں یا پیچیدہ اس کا جواب خود ناشر کی تقریری صلاحیت دے سکتی ہے۔ چھوٹے جملوں کو اس بری طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ ایک لفظ سمجھ میں نہ آئے اور طویل جملوں کو اس خوبی اور عمدگی سے پیش کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایک لفظ ذہن نشین ہو جائے۔ اتنا ضرور ہے کہ مختصر جملوں کی تقریر میں نسبتاً مواد کم ملے گا کیونکہ اس میں اختصار کی وجہ سے اسم فعل ضمیر وغیرہ زیادہ استعمال ہوں گے۔ جملے اگر چھوٹے ہوں تو زبان کو آسان بھی کیا جا سکتا ہے۔ اضافتیں بھی کم ہو جائیں گی۔

اندازِ بیان

نشری تقریر کی ترتیب کے بعد اس کا پیشکش بھی ایک اہم مرحلہ ہے۔ پیشکش کے سلسلہ میں اندازِ بیان، رفتار، لہجہ اور آواز کا حجم، خاص اجزا ہیں جو اس کو کامیاب یا غیر دلچسپ بنا سکتے ہیں۔

انداز بیان کے متعلق کوئی بھی قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیسا ہو۔ جس طرح کرکٹ کا بلہ باز گیند انداز کے ہاتھ سے گولا نکلتے ہی فیصلہ کرلیتا ہے کہ وہ گولے کو کس سمت میں مارے گا یا جس طرح فٹ بال کا کھلاڑی گولا قریب پہنچتے ہی اپنی شوٹ کا زاویہ متعین کرلیتا ہے بالکل اسی طرح تقریر تیار کرتے ہوئے یا تیار کرنے کے بعد مقرر کو یہ طے کرلینا چاہیے کہ اس کا انداز بیان کیا ہو۔ تقریر کی ترتیب اور پیشکش دونوں اہم اور مشکل ہیں۔ اچھے نشری مقرر ناکام ادیب اور مستعدد ممتاز ادیب غیر دلچسپ ناشر ثابت ہوئے ہیں۔ مسٹر ومیٹا کروسن ایک مشہور ادیب اور کہنہ مشق ناشر ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ اب بھی جب کہ نشریات کو اتنی مقبولیت حاصل ہو گئی ہے بہت کم نشری مقرر کامیاب کہے جا سکتے ہیں۔ مسٹر ولسن اناؤنسر کو بہترین مقرر سمجھتے ہیں اگر میں اناؤنسر ہوتا تو اس معاملہ میں اپنی رائے ضرور دیتا۔ جس طرح ہر شخص کے لکھنے کا طرز الگ الگ ہوتا ہے اسی طرح بولنے کا انداز بھی جدا جدا ہوتا ہے اس کے باوجود چند اصول مشترک ہیں مثلاً یہ کہ اندازِ بیان متن کی مناسبت سے ہو، ہر لفظ واضح طور پر ادا کیا جائے، موزوں لفظ پر زور دیا جائے، جملوں اور پیراگرافوں کے درمیان مناسب وقت وقفہ کے طور پر لیا جائے وغیرہ۔ یہ بتانے کی تو شاید ضرورت نہیں کہ نشر میں "فٹ نوٹ" "حاشیہ" اور "غلط نامہ" وغیرہ نہیں ہوتا۔

نشر کی رفتار

نشری تقریر کی رفتار کا تعلق تقریر کے موضوع اور مقرر کے اپنے اندازِ بیان سے ہے۔ ایک مقرر مساوی ضخامت کی دو مختلف تقریروں کو مختلف دوران میں ختم کر سکتا ہے۔ ہر ایک کی صوتی شخصیت (Voice Personality) جدا ہوتی ہے۔ مقرر کا منہ ایک مشین گن ہے جس سے مسلسل الفاظ نکلتے رہتے ہیں۔ ان الفاظ کا اچھی طرح سنائی جانا اور سمجھ میں آنا ضروری ہے۔ رفتار میں یکسانیت رکھنا ہمیشہ مفید ہوگا مگر نہ اس طرح کہ خیال اور اظہارِ خیال میں فرق ہو جائے۔ ایک امریکی ماہر کا کہنا ہے کہ دو ہزار دو سو پچاس الفاظ کی انگریزی تقریر پندرہ منٹ میں خوبی کے ساتھ پڑھی جانی چاہیے۔ امریکہ کے ایک مشہور مبصر مسٹر لوایل ٹامس دو ہزار چار سو الفاظ کی تقریر کے لئے تیرہ منٹ لیتے ہیں۔ ان سے زیادہ تیز پڑھنے والے اسی دوران میں پچیس سو سے اٹھائیس سو الفاظ تک ادا کرتے ہیں۔ اندازِ بیان اور رفتارِ نشر کے معاملہ میں دوسروں کی تقلید سود مند نہیں ہو سکتی۔

حجم

رفتار بتانے کے لئے موٹر میں ایک میٹر لگا ہوا ہوتا ہے جس کو اسپیڈو میٹر کہتے ہیں۔ جیسے جیسے موٹر کی رفتار گھٹتی یا بڑھتی جاتی ہے اسپیڈو میٹر کی سوئی صفر کی طرف پیچھے ہٹتی یا آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اگر موٹر چالیس میل کی رفتار سے دوڑ رہی ہو تو میٹر کی سوئی چالیس کے ہندسہ پر قایم رہے گی بالکل اسی طرح ایک "پروگرام میٹر" ہوتا ہے۔ گر یہ میٹر رفتار نہیں بلکہ آواز کا حجم (Volume) ظاہر کرتا ہے۔ جس طرح کسی ٹھوس چیز کا وزن ہوتا ہے اسی طرح آواز کا بھی وزن ہوتا ہے جس کو ہم حجم کہتے ہیں۔ آواز چاہے مقرر کی ہو یا مطرب کی، جان دار کی ہو یا کسی بے جان کی اپنا وزن یعنی حجم رکھتی ہے۔ پروگرام میٹر کا کام اسی کو پیش کرنا ہے۔ موٹر کا میٹر ایک عرصہ تک اور کچھ وقفہ تک ایک ہی ہندسہ پر قایم رہ سکتا ہے مگر انسان نہ تو ہمیشہ ایک ہی حجم سے بولتا ہے اور نہ حجم کو قایم رکھ سکتا ہے اس لئے پروگرام میٹر کی سوئی بھی آگے بڑھتی اور پیچھے ہٹتی رہتی ہے۔ جس وقت تک زبان سے الفاظ یا اسٹوڈیو سے آوازیں نکلتی رہیں گی پروگرام میٹر کی سوئی کام کرتی رہے گی۔ جب بالکل خاموشی ہو جائے گی سوئی صفر پر آجائے گی۔ تقریر میں ایسے بہت سے موقع نکلتے ہیں جب کہ کچھ بھی سنائی نہیں دیتا —— مقرر سانس لینے کے لئے، لب و لہجہ بدلنے کے لئے یا کسی اور ضرورت سے سکنڈ کے پچاسویں حصہ کے لئے بھی رک جائے تو سوئی صفر پر آجائے گی۔ مقررین کا یہ جان لینا ضروری ہے کہ آواز کا حجم گھٹتا کیوں ہے۔ مقرر کی آواز کی صلاحیت، مائکروفون کی قوتِ حس اور اسٹوڈیو کے فضائی حالات (Acoustics) کے پیشِ نظر مقرر اور مائکروفون کا باہمی فاصلہ مقرر کیا جاتا ہے۔ فرض کیجیے کہ متذکرہ مناسبت سے فاصلہ مقرر کیا گیا، تقریر شروع ہونے کے

کچھ دیر بعد محسوس ہوا کہ آواز کے حجم میں فرق ہوگیا ہے۔ اس فرق کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً

(الف) مقرر نے معینہ فاصلہ کو نظر انداز کر دیا اور مائکروفون سے زیادہ قریب ہوگیا جس کی وجہ سے آواز کا حجم بڑھ گیا۔

(ب) مقرر مائکروفون سے دور ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حجم گھٹ گیا ــــ فاصلہ بڑھ جائے تو حجم گھٹ جائے گا اور کم ہو جائے گا تو حجم بڑھ جائے گا۔

(ج) باہمی فاصلہ پہلے کی طرح قایم ہے مگر تقریر کے دوران میں مقرر نے ایک دم بلند آواز میں بولنا شروع کر دیا۔

(د) ایک دم آواز دھیمی کر دی اور بہت آہستہ بولنے لگا۔

(ہ) مقرر نے اس کو جس زاویہ سے بٹھایا گیا تھا، اسے بدل دیا یا صرف اپنا منہ پلٹا لیا یا اپنے اور مائکروفون کے درمیان کوئی چیز حائل کر دی۔

مائکروفون کے فاصلہ اور آواز کی کمی بیشی حجم کے فرق کو پروگرام میٹر اور ریڈیو پر محسوس کرا سکتی ہے۔ پروگرام میٹر میں ایک کھٹکا لگا ہوتا ہے جس کو فیڈر یونٹ (Fader unit) کہتے ہیں۔ پروگرام میٹر کے قریب بیٹھ کر جو انجنیر کام کرتا ہے وہ میٹر کو نہایت غور سے دیکھتا رہتا ہے۔ موٹر ڈرائیور یا انجن ڈرائیور اپنی مشین کی رفتار سے بے اعتنائی نہیں برت سکتا کیونکہ یہ بے اعتنائی دعوتِ خطر ہے۔ پروگرام میٹر سے لاپروائی کرنے میں بھی خطر ہے۔ انجنیر یہ دیکھتا رہتا ہے کہ جس قدر بلند آواز سے بولنا یا گانا چاہیے اس سے تجاوز تو نہیں کیا جا رہا ہے۔ اگر تجاوز محسوس ہو تو آواز کو کم کر دے گا یا اگر آواز دھیمی ہو تو اس کو ممکنہ حد تک بلند کر دے گا۔ یہ دونوں کام فیڈر یونٹ کے ذریعہ کئے جاتے ہیں اور اسی کو "کنٹرول" کرنا کہا جاتا ہے۔ مقرر آواز کو جس قدر بلند کر سکتا ہے اس سے زیادہ کنٹرول انجنیر کر سکتا ہے۔ انجنیر آواز کو دھیمی اور ناقابلِ سماعت بھی کر سکتا ہے۔ مقرر دورانِ نشر میں اپنی آواز بلند کر دے تو اس کا لہجہ بدل جائے گا اور اگر کنٹرول انجنیر بلند کر دے تو مقرر کا اب و لہجہ تو اسی طرح قایم رہے گا البتہ مقرر کے قریب سے بولنے کا احساس ہوگا۔ مقرر آہستہ بول رہا ہو تو کنٹرول انجنیر اس کو کنٹرول کرتے ہوئے ضرورتاً اور آہستہ کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں بھی مقرر کا لہجہ اسی طرح قایم رہے گا مگر یہ احساس ہوگا کہ مقرر کسی دور مقام سے بول رہا ہے۔ فیڈر کے ذریعہ آواز بلند یا دھیمی کی جا سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں حجم گھٹایا اور بڑھایا جا سکتا ہے مگر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ایک موٹر ایک گیلن پٹرول میں ستائیس میل چلتی ہو تو اس کو اور ٹھیک ٹھاک کر کے یا کچھ پرزے بدل کر ایک گیلن میں تیس بتیس میل چلایا جا سکتا ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ چالیس پینتالیس میل یا اس سے زیادہ جانے لگے۔ بالکل اسی طرح مقرر کی آواز میں قدرتی صلاحیت ہوتی ہے بعض عادتاً چیخ کر پڑھتے ہیں۔ بعض آہستہ بولتے ہیں، کسی جماعت کے طالب علموں سے مضمون پڑھوا کر دیکھئے آپ کو بلند اور پست آواز کا فرق معلوم ہوگا یا گھر کے دو چار بچوں کو کھیلتے وقت یا آپس میں گفتگو کرتے وقت سنئے۔ دیکھئے سب کے سب مختلف حجموں سے باتیں کرینگے۔

اسٹوڈیو میں مکمل خاموشی ہونے کے باوجود بہت سی ہلکی آوازیں ایسی نکلتی رہتی ہیں جو مقرر کو محسوس نہیں ہوتیں اگر آواز کا حجم بہت کم ہو اور اس کو فیڈر زیادہ کھول کر بلند کیا جائے تو اسٹوڈیو کی خفیہ آوازیں مثلاً مقرر کی سانس کی آواز، ہونٹوں کے ملنے کی آواز، صفحہ الٹنے کی صدا وغیرہ سنائی دے گی۔ ان خفیہ آوازوں کے مل جانے سے مقرر کی آواز خراب اور بھدی

ہو جائے گی۔ اگر کوئی فوٹو بڑی کروانی ہو تو وہ صرف اس حد تک بڑی کروائی جائے گی جتنی کہ اس کے شیشہ (Negative) میں صلاحیت ہے۔ صلاحیت سے زیادہ بڑی کروائی جائے تو خراب اور ہلکی ہو جائے گی۔ دوسرے عیب مثلاً دھبے وغیرہ دکھائی دیں گے۔ تالاب کا بند باندھا جاتا ہے۔ پانی خارج کرنے کے لئے اس میں دروازے لگائے جاتے ہیں۔ اگر تالاب میں پانی زیادہ ہو جائے تو ان دروازوں کو کھول دیا جاتا ہے مگر وہ جتنے کھولے جائیں گے اتنا ہی پانی خارج ہوگا۔ فیڈر کو دروازہ اور آواز کو خارج ہونے والا پانی سمجھئے تالاب کا پانی زیادہ ہو جائے تو بند اور دروازے توڑ کر نکل جائے گا۔ آواز ضرورت سے بہت زیادہ ہو تو اس سے ٹرانسمٹر کو نقصان پہنچے گا جس کو سائنس کی اصطلاح میں (over Modulation) کہتے ہیں۔ میں یہ سمجھانے میں کافی مشکل محسوس کر رہا ہوں کہ آواز کا حجم کتنا ہو۔ مضمون کے ذریعہ کم اور زیادہ حجم کا فرق اور اس کے اچھے برے اثرات سمجھائے جا سکتے ہیں مگر خود حجم کو الفاظ میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تعلق آواز کی عملی دنیا سے ہے۔

مرزا ظفر الحسن

(باقی آئندہ)

برکھا رُت

رت ہے سہانی مست ہوا ہے
مست ہوا میں ساری فضا ہے
ڈالی ڈالی جھوم رہی ہے
دنیا ساری ناچ رہی ہے
برکھا کی پھر رُت ہے آئی!

اودے اودے، کالے کالے
دیکھو بادل آئے، چھائے
پھر وہ پپیہا پی، پی بولے
کوک کوئل کی ہولے ہولے
برکھا کی پھر رُت ہے آئی!

گونجے بلبل کے نغمے ہیں
بھونرے کے تو کیا کہنے ہیں
روٹھے من بھی آج منے ہیں
غنچے چٹک کر پھول بنے ہیں
برکھا کی پھر رت ہے آئی!

پی، پی پپیہا کی سن سن کر
دل میں درد اٹھے رک رک کر
اور کوئل کی کو، کو سن کر
آنکھوں میں آنسو آئے بھر کر
برکھا کی پھر رت ہے آئی!

بلبل کے نغمے نالے ہیں
بھونرے کے گیت تو بن بھالے ہیں
آنسو کو رستے آج ملے ہیں
بوندیں نہیں یہ پرنالے ہیں
برکھا کی پھر رت ہے آئی!

صغرا عبد السبحان

اندازِ عمل

(عرب کی ہمیت و بربریت)
"ایک طویل نظم کے چند بند"

اہلِ دانش کو تحیر ہے کہ وہ ملکِ عرب　　　جہل و افلاس کا رہتا تھا جہاں لہو و لعب
حُسنِ اخلاق، نہ تہذیب، نہ کچھ علم و ادب　　　ایک ویرانہ تھا معمورۂ آلام و تعب
جور و بیداد کا افسانہ فضا کہتی تھی
خوف و دہشت کی اسی بن میں بلا رہتی تھی

منزلوں سایۂ اشجار نہ پانی کا نشاں　　　اس پہ گرمی وہ ستم کی کہ نہیں تاب بیاں
ریگِ تفتہ سے ہوئے جاتے تھے ذرے بریاں　　　اخگرِ کورۂ حداد کا تھا جن پہ گماں
قلب بھنتے تھے، جگر بر میں طپاں رہتے تھے
ایسے آلام میں یہ سوختہ جاں رہتے تھے

دستِ مفلس کی طرح رہتے تھے خالی جنگل　　　جس طرف دیکھا، نظر آتا تھا میداں چٹیل
اگر ایسا ہی نمو نے کیا پُر زور عمل　　　جھنڈ اُگ آئے ببولوں کے یہ ہاتھ آیا پھل
آفتیں قحط کی ہر سال جو پیش آتی تھیں
کھیتیاں زیست کی پامال ہوئی جاتی تھیں

آب نایاب تھا اک ریگ کا دریا تھا رواں　　　نام چشمے کا کہیں اور نہ کہیں کوئی کنواں
ابرِ رحمت سے اگر بھر گئے چقر اُس آں　　　ہو گئی عید، ملا راحت و عشرت کا نشاں
ایک میلا سا لبِ آب لگا رہتا تھا
گدلے پانی کو جو دریائے لبن کہتا تھا

کملیاں تان کے آ بستے تھے پانی کے قریں
پہلے جو آتا تھا ہو جاتی تھی ملک اس کی زمیں
بعد والوں کو نہ ملتی تھی جگہ جب کہ کہیں
خانۂ حسرت واندوہ کے ہوتے تھے مکیں

تلخیاں سہتے تھے اور خونِ جگر پیتے تھے
قابضِ آب کے الطاف پہ یہ جیتے تھے

دور دست اور قبائل جو رہے ان کے سوا
قابضِ آب کے قبضے ہی میں تھی ان کی بقا
منتیں کرنے پہ جب اذن انھیں ہوتا تھا
مردہ اجسام میں آجاتی تھیں جانیں گویا

آئے دن جانِ عطش کے جو الم سہتی تھی
آمد و رفت لبِ آب یو نہی رہتی تھی

ایسے آلام و مصائب میں یہ تھا ان کا حال
شعلہ خو، عربدہ جو، مستعدِ جنگ و جدال
یو نہی سی بات بڑھی اور انھیں آیا جلال
کشت و خوں ہوتے لگا خون سے میداں ہوا لال

رن وہ پڑتے تھے کہ صدہا کے گلے کٹتے تھے
دشت پٹ جاتا تھا کشتوں سے تو جب ہٹتے تھے

کبھی گھڑ دوڑ میں ان بن ہوئی تکرار بڑھی
فیصلے کے لئے شمشیر شرر بار بڑھی
اور کبھی گھاٹ کے جھگڑے پہ یہ گفتار بڑھی
لڑنے مرنے کے لئے قوم جفا کار بڑھی

تیغ کے گھاٹ سے جانیں اماں پاتی تھیں
زورقیں عمر کی ڈوبی ہوئی رہ جاتی تھیں

تغلب و بکر کی آپس میں نزاعِ لفظی
بڑھتے بڑھتے ہوئی یہ حد کہ کٹی نصف صدی
مٹ گئے نام قبائل کے چھڑی جنگ ایسی
مدتوں ملک میں اک آگ پڑی بھڑکا کی

مرغِ وحشی قفسِ تن سے اُڑے جانوں کے
شمعِ ارماں کے قریں ڈھیر تھے پروانوں کے

بارشِ خوں یہ نہ تھی سیم و گہر کی خاطر
نہ یہ کوشش تھی بلاؤں سے مفر کی خاطر
خوں فشانی یہ نہ تھی دردِ جگر کی خاطر
نہ یہ ہنگامہ کسی دفعِ ضرر کی خاطر

یہی علت تھی کہ سب علم سے بیگانے تھے
جہل کے دیو تھے، کج فہم تھے، دیوانے تھے

آپ ہی آپ رہا کرتے تھے اکثر تن تن　　ان کے اجناس خصائل میں معائب کے تھے تھن
چین سے بیٹھنے کی تھی نہ کسی وقت بھی دھن　　ان کے نغمات مفاسد کی شرانگیز تھی دُھن
رقص بسمل کے تماشے یہ پسند آتے تھے
ٹھٹ کے ٹھٹ گھاٹ پہ شمشیر کے لگ جاتے تھے

فرش تھا پاس نہ کچھ اور ہی سامان گزر　　کملیاں دوش پہ رہتی تھیں فقط آٹھ پہر
وہی بستر تھیں، وہی فرش، وہی پردۂ در　　اور وہی وقت ضرورت تھیں بجائے چادر
وہی اونٹوں پہ کسی جاتی تھیں محمل کی طرح
وہی بارش میں بھی کام آتی تھیں منزل کی طرح

دوش ہستی پہ دھرے جہل کے یہ پشتارے　　بے گھرے پھرتے تھے اُس دشت میں مارے مارے
وحشیوں کے سے تھے اخلاق و خصائل سارے　　گھاٹیاں گونج اٹھیں مل کے جو نعرے مارے
بز کو ہی تھے پہاڑوں میں تھا مسکن ان کا
بربریت سے نجس رہتا تھا دامن ان کا

شہ نشینیں تھیں، نہ رہنے کو محل اور نہ قصور　　نہ امارت کا حشم اور نہ حکومت کا ظہور
نہ کہیں دبدبۂ شان و شکوہ تیمور　　ان کی ایام گزاری کا عجب تھا دستور
بے نتھے بیل تھے جو چاہتے تھے کرتے تھے
آئے دن آپ ہی آپس میں کٹے مرتے تھے

حسن اخلاق نہ تہذیب نہ رسم تعظیم　　نہ تمدن کا چمن اور نہ اوامر کی نسیم
نہ سیاست کے شگوفے نہ عطا کی تسنیم　　چتر اجلال کہیں اور نہ تخت و دیہیم
فوج ہی فوج تھی جس کا کوئی سردار نہ تھا
کوئی اس قافلے کا قافلہ سالار نہ تھا

سید ابوالقاسم سرور

گُل بوٹے

ہمارے ایک دوست کو کرایے کے مکان کی ضرورت تھی، ایک روز ہمیں ان کی ہم کابی کی عزت حاصل ہوئی اور علی الصباح مکان کی تلاش میں نکل پڑے، کئی مکان دیکھ ڈالے مگر ایک بھی پسند نہ آیا۔

مارکٹ کی شاندار گھڑی ٹن ٹن بارہ بجا رہی تھی کہ ایک مکان پر "کرایہ پر دیا جاتا ہے" دیکھ کر موٹر سے اتر پڑے اور کمپونڈ میں داخل ہوئے۔

پہلی نظر ایک بھینس پر پڑی جو ورانڈے کے کھمبے سے بندھی ہوئی تھی، دوسرا کھمبا ایک بکری کی حفاظت کر رہا تھا، ورانڈے کے قریب جا کر ہم نے پکارا۔

کوئی ہے؟

دروازے کا ایک پٹ کسی قدر کھلتا نظر آیا، اندر سے کسی نے جھانکا اور نہایت فصاحت سے فرمایا "اوئی ماں مٹی پڑو دو مردوئے کھڑے ہیں، اری مردار گل بہار جا دیکھ!! باہر تیرے کون باوا یاں آئیں؟" ایک چھوٹی سی آٹھ برس کی گل بہار باہر نکلی اور ہم سے پوچھا۔

"کون ہے کیا ہونا"؟

ہم نے کہا "کسی مرد کو بھیجو مکان دیکھنے آئے ہیں، کرایہ پر لینا چاہتے ہیں"!

اندر سے آواز آئی "بس یہی کام ہے! تو آ نا میں تا مکان میں کیا ہیرے موتی جڑے ہیں! مکان سری کا مکان ہے!! جا بول مروا تیرے سرکار کو"!!!

اس اثنا میں ہمیں ورانڈے کی آرائش پر غور کرنے کا جو موقع ملا تو ہم نے صاحب خانہ کے سلیقہ کی دل ہی دل میں خوب داد دی، ایک تخت پر دسترخوان بچھا ہوا تھا جس پر چند پلیٹ اور چمچے بکھرے پڑے تھے، ایک صراحی جو صافی سے بے نیاز تھی ایک طرف رکھی ہوئی تھی، صراحی سے لگا ہوا ایک المونیم کا گلاس تھا جو ایک عرصہ سے شرمندۂ صفائی نہ ہوا تھا، تخت سے ذرا ہٹ کر ایک "کموڈ" فوری امداد کے لئے تیار رکھا تھا تخت کے نیچے چونی، بھونسے اور بنولے کے دو چار تھیلے پڑے تھے، ایک کونہ میں ہری گھاس اور کچھ "برگ سبز" اپنے اندر معرفت کردگار" کا ایک دفتر لئے ڈھیر ہو۔ ہے تھے، دیوار پر چار انگرکھے کچھ کرتے اچاے او۔ لنگیاں لٹکی ہوئی تھیں، الگنی پر ساڑیاں ہوا کھا رہی تھیں۔

ورانڈے کی اس آرائش و زیبائش کو ہم ابھی بہ نظر غور دیکھ ہی رہے تھے کہ "گل بہار" کے مولوی نما سرکار برآمد ہوئے۔ سر پر شاندار عمامہ اور اس کے نیچے ایک فٹ کی گھنی کھچڑی داڑھی، ہاتھ میں پیلے منکوں کی لانبی تسبیح، جسم پر ڈھیل ڈھالا کرتہ ٹانگوں میں ٹخنوں سے اونچا شرعی پاجامہ کاندھے پر تیلیا رومال۔

ہمیں دیکھ کر مولویانہ انداز سے "سلام علیکم" کہا، سلام کا جواب دے کر ہم نے اپنے آنے کی وجہ بتائی اور مولانا کے حسب الحکم ہم ان کے پیچھے ورانڈے سے ملے ہوئے ایک کمرے یا مولانا کے "ڈرائنگ روم" میں داخل ہوئے۔

صوفوں اور کرسیوں کے عوض اس کمرے میں ہم نے چند نادر چیزیں دیکھیں۔ مثلاً اناج کے تھیلے، مرچ اور املی کے بورے، غلہ رکھنے کے ڈبے، گھی اور تیل کے پیپے، تمباکو کے گٹھے، آم کے اچار کے مٹکے اور مہ لیے کی کپی۔ وغیرہ وغیرہ، غرض کہ کمرہ کیا تھا تمام ٹام کی دوکان تھا، اس کمرے کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے دو کمرے تھے، ایک مولانا کی عبادت گاہ معلوم ہوتا تھا، اس میں ایک طرف

مصلّے بچھا ہوا تھا، اور ایک کونے میں چند کتابیں منوں گرد و غبار کے نیچے دبی پڑی تھیں، دوسرے کمرے میں "گل بہار" کی بیگم صاحبہ "گل بہار" سے یوں مخاطب تھیں۔

"اری حرام زادی، ایسے پیاز کاٹتی! چھلٹہ (چھلکا) تک برو بر (برابر) نیں (نہیں) نکلا۔ کیری کے ٹکڑے دیکھو کاٹی سو!! اری مردار، خام پارہ، کام چور، نوالے حاضر! دیکھتے دیکھتے بڈی (بڈھی) ہوگئی پن تیرے کو ابی (ابھی) تک پیاز کاٹنا آیا نہ کیری کترنا آیا۔ اب تو مکان میں لوگاں (لوگ) ہے بول کو چپ بیٹھیوں، ماری نیں پھر کو ایسے کرنی تو مارتے مارتے فرش کر دیوں گی، اتے (اتنے) جوتیاں ماروں گی سر میں ایک بال بی نیں ہوں گا سمجھ کو رہو!! ایک دن تیری ناک چوٹی کاٹ کو گھر سے بارہ دھیلے باہر نیں کر دی تو میرا نام پلٹ کو رکھنا!!!"

اس پر لطف گفتگو میں ہم کچھ ایسے محو ہو گئے کہ گھر دیکھنے کے عوض یہی چاہ رہا تھا کہ بس ان "ارشادات عالیہ" کے اموال منثوروں سے اپنا دامن بھرتے جائیں، مولانا کی بے چینی سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی صورت ہم کو جلد دفع کرنا چاہتے ہیں، مگر ہم وقت کی "نزاکت" کا خیال کر کے ہر کمرے کو بڑے اطمینان سے دیکھ رہے تھے مولانا کے "تیور" کہہ رہے تھے کہ وہ "غیر محرموں" کا ان کی ایک عدد "محرمہ" کی پرائیوٹ "گفتگو سننا مولانا پر بڑا شاق گزر رہا تھا۔ مکان کا معائنہ ہم نے ختم ہی کیا تھا کہ اندر سے ارشاد ہوا۔

"اری مردار! جا دیکھ!! وہ موٹڑی کئے گئے نئیں؟ اندر بیٹھے بیٹھے خفکان (خفقان) ہوگیا! سرکار سے پوچ (پوچھ) کو آ، آج کھانا کھاتیں یا بھکے (بھوکے) رہتیں؟ ہنڈیاں چلے (چولہے) پر پڑیں ہور (اور) اپنے ٹھک ٹھک کو مکان بتاریں!!"

"باغبان"

"بھولنے والے سے"

زمیں پر زندگانی بدلیاں جس وقت برسائیں
رباب آسمانی پر ستارے مل کے جب گائیں
در میخانہ جس دم چھاؤں میں تاروں کے کھل جائے
سحر کے راگ کا دیوتا رسیلے سُر میں جب گائے
مہکتی ہو فضا جس وقت خوشبوئے گل تر سے
گھٹا برسات کی میدان میں جب جھوم کر برسے
تو پھر اے بھولنے والے ہمیں بھی یاد کر لینا!

کوئی ساز جنوں پر زندگی کے راگ جب گائے
سنہری وادیوں میں کیف کی بجلی سی لہرائے
چمن میں ڈالیوں پر جب پرندے چہچہاتے ہوں
کنار آب جو مہکے ہوئے جھونکے جب آتے ہوں
دلوں میں ولولے اٹھ اٹھ کے جب شیون کرتے ہوں
بہار رنگ و بو کے جس گھڑی گیسو سنورتے ہوں
تو پھر اے بھولنے والے ہمیں بھی یاد کر لینا!

نہال تازہ جب رقص ہوا سے جھوم کر مچلیں
جگا دیں خواب سے روحوں کو جب گاتی ہوئی شامیں
ہوائیں رقص کرتی ہوں، فضا جب گنگناتی ہو
کوئی آنکھوں میں پھرتا ہو کسی کی یاد آتی ہو
تو پھر اے بھولنے والے ہمیں بھی یاد کر لینا!

جوہر فریادی

نئی کتابیں

۱۔ تیس دن میں اردو۔ (اردو، ہندی، انگریزی اور بنگلہ ایڈیشن) قیمت ۴ر منیجر شمسی پریس بکڈپو۔ گیا۔

۲۔ الف لیلیٰ کی ایک رات (افسانے) قیمت ۸ر مکتبۂ بہار۔ گیا۔

۳۔ کیا خوب آدمی تھا (مشاہیر کی نسبت ریڈیائی تقریریں) حجم ۱۲۰ صفحے قیمت ۸ر حالی پبلشنگ ہاؤز۔ دہلی۔

۴۔ قلم نما (فلم کے متعلق تنقیدی مضامین) از نصیر الدین ہاشمی۔ حجم ۸۸ صفحے قیمت ۶ر کتاب خانہ۔ عابد روڈ

۵۔ اقبال کشیدہ کاری (سلائی کے نمونے اور طریقے) مرتبہ ادارہ سہاگ قیمت ۵۔ سہاگ انڈسٹری ہاؤس۔ بلال گنج۔ لاہور۔

۶۔ شہد کی مکھیوں کا کارنامہ از نواب منظور جنگ ۹۶ صفحے قیمت مجلد ۱۲ر کتاب خانہ۔ عابد روڈ۔

۷۔ تذکرۂ حبیبی حصہ اول و دوم (شاہ حبیب حیدر قلندر کے حالات) حجم ۴۹۲ صفحے قیمت لے۔ کتب خانہ انوریہ۔ کاکوری۔ لکھنؤ۔

۸۔ براہین وحی از محمد حسین عرشی و محمد اقبال حجم ۱۰۲ صفحے قیمت ۶ دفتر امت مسلمہ۔ امرتسر۔

۹۔ گناہ کے افسانے از خوشتر قیمت ۶۔ پریم شاستر بکڈپو۔ لاہور

۱۰۔ میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں۔ مرتبہ حکیم محمد یوسف حسن قیمت ۶ اردو اکیڈیمی پنجاب۔ لاہور

۱۱۔ کلیات اکبر تین حصے (جدید ایڈیشن) از اکبر الہ آبادی قیمت للعہ کتاب خانہ۔ عابد روڈ۔

۱۲۔ شب حسرت دو جلد (ناول) از تیرتھ رام فیروزپوری قیمت ۶ دائرہ ادبیہ۔ لاہور۔

۱۳۔ گناہ کی راہ (ناول) از تیرتھ رام فیروزپوری قیمت ۶۔ دائرہ ادبیہ لاہور

۱۴۔ گستاپو (ناول) مترجمہ بشیر احمد حجم ۲۲۴ صفحے قیمت ۶۔ ہاشمی بکڈپو لاہور

۱۵۔ پارس (افسانے) از گورکھ ناتھ حجم ۱۶۰ صفحے قیمت ۶ کتاب خانہ عابد روڈ۔

۱۶۔ خانہ بربادی (افسانے) از میاں وجودی حجم ۰۰ ا صفحے قیمت ۱۲ر دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۱۷۔ طوفان (افسانے) از رابندرناتھ ٹیگور۔ حجم ۲۴۰ صفحے قیمت ۱ر دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۱۸۔ وفا کی انتہا (ناول) مترجمہ میر حسین علی حجم ۱۰۸ صفحے قیمت ۱۲ر دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۱۹۔ پاکیزہ محبت (ناول) از ملکہ راج حجم ۲۴۰ صفحے قیمت ۵ دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۲۰۔ بھوک (افسانے) از حمید الدین حجم ۱۲۰ صفحے قیمت ۵ دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۲۱۔ محقق خاتون (ناول) از حاجی حفیظ الدین ۴۴۳ صفحے قیمت ۴ر دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۲۲۔ ذرۂ عظیم (ناول) مترجمہ برج کماری ۱۳۶ صفحے قیمت ۶ دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۲۳۔ طوفان جنگ (تاریخی ناول) از شیو برت لال ۲۲۲ صفحے قیمت ۶۔ دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۲۴۔ لکھنوی پریاں (ناول) از حامد حسین ۲۰۰ صفحے قیمت ۴ر دائرہ ادبیہ۔ لاہور۔

۲۵۔ جوش وطن (قومی نظمیں) از الوپ چند آفتاب قیمت ۴ر از مصنف زمین پاتی

۲۶۔ محاسن سجاد (سوانح محمد سجاد مرحوم) مرتبہ مسعود عالم ندوی قیمت ۶ الہلال بکڈپو بانکی پور۔ پٹنہ

مرزا سیف علیخاں

تنقید و تبصرہ

سالنامہ رسالہ جدید اردو باتصویربابت ۱۹۴۱ء

مرتبہ پرویز شاہدی و محمد ظہور احسن قاضی حجم ۱۰۰ صفحات قیمت ۱۲ ارپتہ بمبر ۳۰ ہارنسن اسٹریٹ کلکتہ

رسالہ "جدید اردو" نے اس دفعہ اپنے سالنامے کو کافی دلکش اور دلچسپ بنایا ہے۔ کاغذ کی روز افزوں گرانی کے باوجود عمدہ چکنے کاغذ پر یہ سالنامہ صاف ستھری لکھائی چھپائی کے ساتھ شایع ہوا ہے' ادبی اور تاریخی مقالے' اخلاقی افسانے، معیاری ڈرامے، اخلاقی نظمیں' نعتیہ غزلیں' رباعیاں قطعے۔ غرض کہ اس سالنامہ میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک معیاری ادبی پرچہ میں ہونا چاہیے۔ جناب پرویز شاہدی اور ظہور احسن قاضی کی کوششیں پروان چڑھ رہی ہیں اور اردو کا یہ نونہال پھولنے اور پھلنے لگا ہے۔

رسالہ سہیلی

لاہور کا باتصویر "اولاد نمبر" بابتہ مئی و جون ۱۹۴۱ء مرتبہ زہرا سعدیہ حجم ۹۰ صفحے چندہ سالانہ پانچ روپیہ پتہ برانڈرتھ روڈ۔ لاہور۔

رسالہ سہیلی کے اس خاص نمبر میں اکثر مضمون بچوں کی پیدایش' تعلیم و تربیت، ورزش اور ان کی صحت کے متعلق تجربہ کار مضمون نگاروں نے لکھے ہیں۔ دودھ پلانے کے طریقے اور اوقات' زچہ اور بچہ کی نگہداشت' بچوں کی خوراک' حفظان صحت کے اصول' بچوں کی مخصوص بیماریاں اور ان کے علاج کے متعلق بہت سی کارآمد باتیں بتائی گئی ہیں۔ چند اچھی اخلاقی نظمیں ایک مختصر مزاحیہ ڈراما اور ایک طویل دلچسپ افسانہ بھی پڑھنے کے قابل ہے' اس کے علاوہ عورتوں کی مغرب زدگی' ذمہ داریاں فرائض اور ان کی صحت کے متعلق بھی چند اچھے مضمون لکھے گئے ہیں۔ رسالہ کے آخر میں ڈاکٹر خدیجہ بیگم کا وہ خطبۂ صدارت درج ہے جو ایسے زنانہ اسلامیہ کالج انجمن حمایت اسلام میں پڑھا تھا' اس خطبہ میں موصوفہ نے اسلام کی روشنی میں طالبات کو جو نصیحتیں کی ہیں اور اخلاق کے جو سبق دیئے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ غور سے پڑھے اور سمجھے جائیں۔

رُوحِ مکاتیب حصہ اول

مرتبہ ساغر نظامی حجم ۲۵۰ صفحے قیمت عہ پتہ مکتبہ ساغر۔ ادبی مرکز۔ میرٹھ۔

رسالہ "ایشیا" میرٹھ بابتہ ماہ جون ۱۹۴۱ء کا یہ خاص نمبر ہے اس میں ملک کے مشہور انشا پردازوں اور شاعروں کے وہ خطوط درج ہیں جو مرتب کے نام لکھے گئے تھے۔ اس نمبر کا آغاز راجندر ناتھ شیدا ایم اے کے قابل مقالے سے ہوتا ہے جس میں جناب شیدا خطوں کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں "خطوط بجنس خود بھی ادب کی عمدہ مثالیں ہوسکتے ہیں' وہ تفصیل و اختصار کی قیدوں سے بے نیاز ہوتے ہیں اور طبیعت کی بیساختہ تراوش ہونے کی وجہ سے اپنے لکھنے والوں کی فطرت کو ایک بڑی حد تک بے نقاب کرتے ہیں' ان میں وہ تمام موضوع معرض بحث میں آسکتے ہیں جو کسی بھی اونچے ادب کا لگار خانہ ہیں"

اس مجموعہ کی خصوصیت بقول جناب ساغر یہ ہے کہ "یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں بیک وقت متعدد اسالیب نظر آتے ہیں" دوسرا یہ کہ اس میں "جماعت مکتوب نگار ہے اور فرد مکتوب الیہ یعنی ایک شخص (جناب ساغر نظامی) کو بہت سے اشخاص مخاطب کرتے ہیں"۔ بہرکیف یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے کتب خانے میں بھی اس کی ایک جلد ضرور رہے۔

رشوت خواروں کا حشر

مرتبہ محمد شمس الدین صدیقی سابق منصف حجم ۸۰ صفحے قیمت لکھی نہیں ہے پتہ از مولف۔ کالی کمان حیدرآباد دکن۔

یہ رسالہ مولف نے حکومت سرکار عالی میں انسداد رشوت ستانی کے اقدام کو اخبار میں پڑھ کر لکھا ہے۔ اس میں نواب مختار الملک مرحوم، نواب میر لایق علی خاں مرحوم' نواب سر آسمانجاہ مرحوم کے زمانے میں انسداد رشوت ستانی کے سلسلہ میں جن عہدہ داروں کو معطل اور برطرف کیا گیا تھا

اس کی تفصیل جریدۂ اعلامیہ کے حوالہ سے لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مولف کے چند اخلاقی مضامین بھی ہیں۔

محبّت کے افسانے مرتبہ محمد یعسوب الحسن حجم ۰ ۸ صفحے چھوٹی تقطیع قیمت ۵ر پتہ دفتر خضر راہ۔ بارود خانہ اسٹریٹ۔ لاہور۔

رسالہ "خضر راہ" کا یہ خاص نمبر ہے۔ اس میں دحی عبدالغفار، سالک حسن، محمد لطیف، پروفیسر حامد علی عابد۔ ڈاکٹر اعظم کریوی وغیرہ کے مختصر افسانے اور کہانیاں ہیں۔

تذکرۂ تاج الاولیا مرتبہ محمد حسام الدین حجم ۱۹۴ صفحے قیمت ۸ر پتہ مکتبہ ابراہیمیہ۔ عابد روڈ حیدرآباد۔

ناگپور کے مشہور بزرگ حضرت بابا تاج الدین رحؒ کی سیرت اور ملفوظات کا یہ مجموعہ ہے جس کو موصوف کے بھانجے نے مرتب کیا ہے۔ اس میں باباصاحب کا خاندان۔ ان کی ولادت، تعلیم، ریاضت، کرامات وغیرہ کے متعلق صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ "س"

نقشِ اوّل مرتبہ بیگم صالحہ عابد حسین حجم ۳۲۲ صفحے۔ ۲ دو حصوں میں منقسم ہے۔ قیمت عہ ۱ مجلد، حالی پبلشنگ ہاؤز۔ دہلی سے مل سکتی ہے۔

لائق مصنفہ کے اندازِ بیان میں گھلاوٹ، بیساختہ پن، سادگی وجاذبیت بلا کی ہے۔ حصہ اول چھ ۶ افسانوں پر مشتمل ہے اور حصہ دوم میں بھی چھ ۶ افسانے ہیں اس طرح اس پوری تصنیف میں ۱۲ بارہ افسانے گویا مشتری کے بارہ ۱۲ چاند ہیں جو اپنی آب وتاب سے اس کی درخشانی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ یوں تو ہر افسانہ ایک طویل وبسیط تنقید کا اہل ہے لیکن دامانِ باغباں میں اتنی گنجایش کہاں کہ ان سب پھولوں کی پوری پوری سرگذشت سمیٹ لے۔ مختصر یہ کہ اس کا ہر افسانہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک جداگانہ حسن وجاذبیت کا حامل ہے۔ اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ زندگی ـــــ ہر شخص کی زندگی جو بذاتِ خود ایک افسانہ ہے۔ ان کے مطالعہ سے اس کی اخلاقی، اصلاحی وتمدنی اصلاح ہوجاتی ہے۔ نری مضمون نگاری یا افسانہ نویسی وانشاپردازی کسی مصرف کی نہیں ہوتی تاوقتیکہ اس کا مواد کسی پڑھنے والے کی رہبری نہ کرے جیسے کسی زبردست شعر کی مقبولیت اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ سننے والا بول اٹھے کہ اگر میں شاعر ہوتا تو ایسا ہی شعر کہتا ـــــ اسیطرح سے ایک افسانہ یا مضمون کی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرنے لگے کہ واقعی ہم بھی ایسا ہی لکھتے اگر کبھی ہمیں لکھنے کا اتفاق ہوتا۔ بعض وقت ان کا پلاٹ آپ بیتی کا پرتو لئے ہوئے اپنی ہی آنکھیں کھول دیتا ہے۔

میرے خیال میں اگر زندگی میں کسی کو ذرا سا بھی موقع مل جائے تو وہ اپنی اولین فرصت میں نقشِ اول کا ضرور مطالعہ کرے۔ "بڑے میاں" "تارہ" اور "شیشہ کا گھر" سے واضح ہوتا ہے کہ انگریزی زبان میں کتنا مسالہ بھرا پڑا ہے جس سے ہم اپنی زبان اور اپنے خیالات کو وسعت دے سکتے ہیں۔ خوبی تو ترجم کی ہے جنھوں نے بڑے حسن وسلیقہ سے اسکو اپنا لیا ہے۔ محبت کی فتح سے ثابت ہوتا ہے کہ دھن دولت، ذات پات حسب نسب پریم نگری میں بے معنی سے بول ہیں۔ "یک نک" تو ایک خاصہ کی چیز ہے۔ اور آنکھ کا ڈاکٹر ایک دلنشیں ڈراما۔ "سیّدہ" ہر گھرانہ میں کاش ایسی ایک ہی لڑکی کم ازکم ہوجائے۔ ایک پیسہ ـــــ اف! یہ سرمایہ داری وافلاس کا بدنما داغ۔ دیکھئے کب یہ دھبہ مٹتا ہے۔ "خان بہادر" ہانکے پکارے کہتا ہے "بترس از آہ مظلوماں ـــــ الخ"۔ شادی، ایک کامیاب افسانہ ہے۔ غرض کہاں تک کہوں تو چنیں ہے چناں ہے۔

اگر ہر گھر میں اس تصنیف کے ان دلچسپ افسانوں کو ہر شخص پڑھ لے تو اسکی زندگی کیا سے کیا ہوجائے۔ لائق مصنفہ قابل مبارکباد ہیں۔

"ج"

ادارہ کی خبریں

نواب سالار جنگ بہادر کا معائنۂ ادارہ

حیدرآباد کے امیر اعظم نواب میر یوسف علی خاں بہادر سالار جنگ سرپرست ادارہ نے بتاریخ ۸ ستمبر ۱۹۴۱ء مطابق ۱۸ شعبان ۱۳۶۰ھ ادارہ کا معائنہ فرمایا۔ اس تقریب میں ادارہ کی طرف سے ایک پرتکلف عصرانہ دیا گیا تھا جس میں نواب خسرو جنگ بہادر صدر المہام فوج سرکار عالی، مولوی سید محمد اعظم صاحب ناظم تعلیمات، مولوی حسین علی خاں صاحب پرووسٹ جامعہ عثمانیہ، مولوی سید علی اکبر صاحب نائب ناظم تعلیمات، اور ادارہ کے اکثر معتمدین شعبہ جات و دیگر اراکین نے شرکت کی۔ اس موقع ایک گروپ فوٹو لیا گیا جو سب رس کی اس اشاعت میں شریک کیا جا رہا ہے۔ نواب صاحب معز نے ادارہ کے ہر شعبہ کا تفصیل سے معائنہ فرمایا۔ ادارہ کی مجوزہ عمارت کے "سالار جنگ ٹاور" کا نقشہ بھی پسند فرمایا۔ ادارہ کے کتب خانہ کی قلمی کتابوں کو بھی نواب صاحب معز نے دیر تک ملاحظہ فرمایا اور اس بارے میں نواب مرزا سیف علی خاں صاحب ناظم اعزازی کتب خانہ ادارہ سے تبادلۂ خیال بھی فرمایا۔

نواب معین الدولہ بہادر کی وفات

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ادارہ کے قدیم سرپرست اور حیدرآباد کے امیر اکبر نواب امانت جنگ معین الدولہ بہادر نے اس مہینے کی ۲۴ تاریخ مطابق ۲ رمضان المبارک ۱۳۶۰ھ کو فالج کے حملہ کی وجہ سے اچانک وفات پائی۔ نواب صاحب مرحوم کو ادارہ سے ذاتی دلچسپی تھی۔ اور وہ سب رس کے قدیم ترین قلمی معاون تھے۔ چنانچہ ان کی متعدد غزلیں سب رس میں چھپ چکی ہیں۔ اور ایک نظم "شیر" بھی سب رس میں شایع ہو کر بڑی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ نواب صاحب نے اس نظم کے لئے ادارۂ سب رس کی فرمایش پر ایک خاص تصویر اتروا کر روانہ فرمائی تھی جس میں ان کے شکار کئے ہوئے جملہ شیر بھی نمایاں تھے۔ نواب معین الدولہ بہادر کو ادارہ سے جتنی دلچسپی تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکے گا کہ انھوں نے ادارہ کے مشاعرے میں جو ان کی وفات سے صرف نو روز قبل منعقد ہوا تھا اپنی ایک خاص غزل روانہ فرمائی تھی۔ یہ خاندان سخن ور اور علم دوست نواب صاحب کی آخری غزل تھی۔ ان کی وفات سے حیدرآباد کی علمی دنیا اور خاص کر ادارۂ ادبیات اردو کو بڑا نقصان پہنچا۔ چند سال قبل انھوں نے اپنا دیوان "معین سخن" مرتب کر کے شایع کیا تھا جس پر ادارہ کے معتمد ڈاکٹر زور صاحب سے بڑے اصرار کے ساتھ مقدمہ لکھوایا تھا۔

نواب معین الدولہ بہادر کی وفات سے جو نقصان پہنچا ہے وہ اگرچہ ناقابل تلافی ہے لیکن ایک حد تک تسلی ہوتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فرزند اکبر نواب محمد ظہیر الدین خاں بہادر بی اے امیر پائیگاہ مقرر ہوئے ہیں جو ادارہ ہذا کے قدیم رفیق ہیں اور توقع ہے کہ وہ نواب معین الدولہ بہادر کی جگہ ادارہ کی سرپرستی قبول فرمائیں گے۔ نواب ظہیر الدین خاں بہادر بقول اعلیٰ حضرت بندگان عالی آصفجاہ سابع ایک نیک کردار جوان صالح ہیں۔ ان کا سفرنامۂ یورپ و امریکہ اردو زبان کی ایک دلچسپ اور مقبول کتاب ہے جو چند سال پیشتر شایع ہوئی تھی۔ وہ شمس الامراء بہادر کی علمی خدمات پر بھی ایک کتاب تحریر فرما رہے ہیں جو شایع ہونے کے بعد اردو ادب کی تاریخ کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔

ہز اکسلنسی نواب صاحب چھتاری صدر اعظم بہادر کی سرپرستی ادارہ

ادارہ کے بہی خواہوں اور کارکنوں کے لئے یہ خبر باعث مسرت ہوگی کہ ہز اکسلنسی کرنل ڈاکٹر سر محمد احمد سعید خاں بہادر ایل ایل ڈی نواب چھتاری و صدر اعظم دولت آصفیہ نے از راہ علم پروری ادارۂ ادبیات اردو کی سرپرستی قبول فرمائی ہے یقین ہے کہ یہ "دور سعید" ادارہ کی

علمی و ادبی خدمات اور اردو کی تبلیغ و اشاعت کے لئے مسعود و مبارک ثابت ہوگا اور ارباب ادارہ حسب دلخواہ اپنی مساعی میں کامیابی حاصل کریں گے۔

مشاعرہ

ادارۂ ادبیات کی طرف سے ۱۵ ستمبر ۱۹۴۱ء مطابق ۲۲ شعبان کو ایک خاص مشاعرہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں ادارہ کے اکثر معاونین و رفقا اور معتمدین شعبہ جات نے شرکت کی۔ اس ادبی صحبت میں شرکت کی عام اجازت تھی چنانچہ دور دور سے بلا امتیاز مذہب و ملت لوگ آئے اور اس خاص محفل سے استفادہ کیا۔

شعرا میں نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ، نواب شہید یار جنگ بہادر شہیدؔ، قاضی زین العابدین صاحب عابدؔ، حضرت امجدؔ، حضرت علی اخترؔ، ماہر القادری صاحب، مخدوم محی الدین صاحب، محمد علی صاحب تیزؔ، ڈاکٹر سکسینہ صاحب، آزاد صاحب، نظرؔ صاحب، محبتؔ صاحب، عابد علی صاحب جہدؔ، مہندر راج صاحب، علی احمد صاحب، مشتاق احمد صاحب، خیراتؔ صاحب، الہام صاحب، طالبؔ صاحب، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نواب معین الدولہ بہادر معینؔ نے بھی اپنی خاص غزل روانہ کی تھی۔

سامعین میں ہندو، مسلمان، طلبہ اور اعلیٰ عہدہ دار سب دوش بدوش شریک تھے۔ جدید ترقی پسند نظموں کے ساتھ ساتھ قدیم طرز کی معیاری غزلیں مساوی داد حاصل کر رہی تھیں۔ غرض ہر قسم کے امتیازات کو دور کرکے ادارہ کی اس ادبی محفل نے حیدرآباد میں ایک اچھی روایت قایم کی ہے۔

افتتاحی تقریر

مشاعرہ کے آغاز سے قبل مولوی عبد القیوم خاں صاحب باقیؔ ایم اے ریسرچ اسکالر استاد اردو جامعہ عثمانیہ نے ایک تعارفی تقریر کی جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

حضرات۔ اردو زبان اور ادب کی خدمت میں ادارۂ ادبیات اردو جو کچھ حصہ لے رہا ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔ آج کا مشاعرہ بھی اس جذبہ کا ایک روشن اظہار ہے۔

آپ کو علم ہوگا کہ قدیم زمانے سے مشاعرہ ایک کھلا میدان رہا ہے، جہاں نہ صرف شاعر کی تربیت ہوتی تھی، بلکہ سامعین کا ذوق بھی جلا پاتا تھا۔

خوشی کی بات ہے کہ حیدرآباد میں دورِ قدیم کے اس ادارے کو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ یہ ایک حیثیت سے مقامِ شکر بھی ہے، کیونکہ جہاں ایک طرف زمین کا نصف مغربی کرہ جنگ کی آتشباریوں سے جل رہا ہے، وہاں مشرق کے اس بعید گوشے میں ہم بحمد اللہ فنونِ لطیفہ کی خوشگوار خدمت کرنے کے قابل ہیں۔

آج سے ادارہ ادبیات اردو نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وقتاً فوقتاً ایسے خاص مشاعرے منعقد کرے جہاں اساتذہ اور نوخیز شاعر دونوں ایک خاص جذبہ عمل لیکر جمع ہوں، اور شاعری کے ذریعے اردو ادب کی کچھ خدمت کریں۔

آج کل کے مشاعروں کی نوعیت کچھ خاص ہے۔ وہ شاعر جو ادب کے جدید رجحانات سے متاثر ہیں، اور ترقی پسندی کا جذبہ رکھتے ہیں، ایک جوش اور جدت کے ساتھ قدیم اسلوب شعر گوئی میں کچھ تبدیلیاں کر رہے ہیں، اور اپنا ایک علحدہ محاذ قایم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا مشاعرہ بھی ترقی پسندی یا تغیر پسندی کا ایک پُرجوش مظاہرہ ہوتا ہے۔ ترقی پسندی کا جذبہ عموماً نوجوانوں میں پایا جاتا ہے، کیونکہ آج کل کے نوجوان، ہماری تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کی پیداوار ہیں۔ بعض مشاعرے اس قسم کے منعقد ہونے کی توقع کی جاتی ہے، اور ہوتے بھی ہیں، جہاں قدیم انداز کے شاعر جمع ہوں، اور پرانی روایات کے مطابق بزم شعر و سخن گرم کریں۔ ان دو جدا جدا تحریکوں کے باوجود، خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے قدیم دبستان کے شاعر اور بہت سے بزرگ ایسے ہیں جو آہستہ آہستہ نوجوانوں کا ساتھ دینے اور ان کا ہاتھ بٹانے آمادہ ہیں۔ آج کا مشاعرہ غالباً قدیم اور

جدید ذوق کی ہم آہنگی کا آئینہ دار اور سنگم ثابت ہوگا۔

جدید مشاعروں کی ایک خصوصیت ترنم سے پڑھنا ہے۔ لیکن قدیم مشاعروں کی تحت اللفظ غزلخوانی بھی اپنی ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ اگر مشاعروں میں سامعین دونوں طرز کے پڑھنے والوں کی قدرافزائی کریں تو اچھا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ترنم شعر کے لطف میں اضافہ کردیتا ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ تحت اللفظ پڑھنے سے شعر کی خامیاں چھپ نہیں سکتیں۔ ایک علمی خیال یہ ہے کہ مشکل اور تفکری شاعری گو اعلیٰ ادب کا اہم عنصر ہوتی ہے، مگر مشاعروں کے موزوں نہیں ہوتی کیونکہ یہاں ایک قسم کی مجموعی ذہنیت سے براہ راست سابقہ پڑتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ مشکل ادب کو مشاعرے کے قابل بنانا خود اہلِ ذوق کا کام ہے۔ حیدرآباد میں ذوق شعری اگر ترقی کررہا ہے تو ضرورت ہے کہ ہم مشاعرے میں خاص قسم کے ادبی کارناموں کو بھی توجہ سے سننے کے لئے تیار ہوں۔ آج کے مشاعرے میں توقع ہے کہ ایک طرف ہم غزل کی قدیم صنف میں اہلِ ذوق کی خیال آرائی سنیں گے، تو دوسری طرف نظم کے قالب میں جدید شاعر کے جذبات اور احساسات کا مطالعہ کرسکیں گے۔ چونکہ شعرا بہت ہیں اس لئے توقع کی جاتی ہے کہ حضرات شعرا ایک غزل یا ایک نظم سے زیادہ سنانے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں گے۔

میں آخر میں ایک خوشخبری سناؤں گا اور وہ یہ ہے کہ تعمیر پسند ادب کا ساتھ دینے میں پرانے شعرا نوجوانوں سے آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ شاعری کی قدیم روایات کے برخلاف جہاں بڑے بوڑھوں اور اساتذہ کو آخر وقت تک بیٹھنا پڑتا تھا آج ان کی خواہش ہے کہ وہ پہلے اپنے کلام سے ہمیں محظوظ فرمائیں۔ یہ ایک انقلابی صورت ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ انقلاب کے علمبردار ہمارے بزرگوں کے اس جذبے اور جوش کا زیادہ خیر مقدم کریں گے!

حضرات! حیدرآباد میں حضرت ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو "اردو کے بوڑھے" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر ہمارے ملک کے ہونہار فرزند اور اردو ادب کے سرگرم کارکن، ڈاکٹر زور کو ان کی حالیہ کامیابیوں کی مبارکباد دیتے ہوئے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں ——

خدا ہمارے "**اردو کے نوجوان**" کو سلامت رکھے!

قرارداد تعزیت حضرت فانی

اس تقریر کے بعد باقی صاحب نے حضرت فانی کی وفات حسرت آیات پر جو قرارداد تعزیت پیش کی اور جس کو جملہ شرکائے مشاعرہ نے ایستادہ ہوکر منظور کیا وہ درج ذیل ہے۔

مشاعرے کے آغاز سے قبل ہم ہندوستان کے ممتاز شاعر حضرت فانی مرحوم کی یاد تازہ کرنا چاہتے ہیں، جو چند روز ہوئے ہم سے جدا ہوگئے اور اگر وہ زندہ رہتے تو یقیناً آج زینتِ محفل رہتے۔ ان کی وفات حسرت آیات پر حسب ذیل قرارداد تعزیت منظور فرمائیں۔

"ہم حضرت فانی مرحوم جیسے مفکر شاعر کے انتقال پُرملال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ مرحوم نے اپنی بلند پایہ غزلوں میں زندگی کے یاس والم کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ہمارے دلوں کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ آپ کی وفات سے اردو زبان کا ایک محسن اور بزم سخن کا ایک ممتاز رکن گم ہوگیا۔ ہماری دعا ہے کہ خداوند کریم مرحوم کی روح کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگاں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔" آمین

مجلسِ ادبیاتِ اطفال یہ ادارہ کا ایک شعبہ ہے جو علحدہ شاخ کی حیثیت سے کام کر رہا ہے اس کی صدارت نامور فاضل سید علی بلگرامی مرحوم کی دختر نیک اختر محترمہ رقیہ بیگم صاحبہ بی اے آنرز کیمبرج (بیگم نواب زین یار جنگ بہادر) صدر کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ کے تفویض ہے اور اس کے معتمد مولوی میر حسن صاحب ایم اے ہیں۔ اس مہینے بتاریخ ۱۸ ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء اس کا ایک اجلاس ادارہ کے دفتر میں منعقد ہوا جس میں طے پایا کہ اس مجلس کی پہلی کتاب چیونٹی معتمد کے مقدمہ کے بعد شایع کر دی جائے۔

۲۔ لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم اے رکن مجلس کی مصنفہ بچوں کی نظمیں ایک باتصویر مجموعہ کی شکل میں جلد شایع کی جائیں۔ مجموعہ کے نام اور نظموں کی تعداد اور تصویروں کے بارے میں مصنفہ سے مشورہ کر لیا جائے۔

۳۔ "عرب اور دنیائے اسلام" کا مسودہ ڈاکٹر زور صاحب کے سپرد کیا گیا تاکہ موصوف اس کی زبان پر نظر ثانی کر کے اس کو بچوں کے مطالعہ کے قابل بنائیں۔ مولوی مجتبیٰ حسین صاحب نقوی مہتمم تعلیمات سے استدعا کی جائے کہ وہ اس کے لئے تصویروں کا انتظام فرماویں۔

۴۔ "کشمکش نانی" از شجاع احمد صاحب قائد چار تصویروں کے ساتھ چھپوائی جائے۔

۵۔ ڈاکٹر زور صاحب سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ اردو کے ایک قدیم شاعر محمد قلی قطب شاہ اور ایک جدید شاعر اقبال پر بچوں کے لئے دو جدا جدا کتابیں تحریر فرماویں تاکہ ڈسمبر تک شایع کی جا سکیں۔

۶۔ مسیح الدین خاں متین کی بچوں کی نظموں کا مجموعہ مولوی میر حسن صاحب ایم اے معتمد مجلس کو نظر ثانی کے لئے تفویض کیا گیا۔

چیونٹی مجلسِ ادبیات اطفال کے سلسلہ مطبوعات کی پہلی اور ادارہ ادبیات اردو کے سلسلہ مطبوعات کی تہترویں کڑی ہے جس کو ادارہ کے رفیق رائے ہمندر راج صاحب سکسینہ ایم ایس سی نائب صدر انجمن طیلسانین عثمانیہ و استاد شعبۂ نباتیات جامعہ عثمانیہ نے بڑے سلیقہ سے تالیف کیا ہے۔ اس میں تقریباً بیس عکسی تصویریں شریک ہیں۔ کتاب کا سرورق بھی بچوں کی دلچسپی کے لئے رنگین بنایا گیا ہے۔ کتاب میں چیونٹی کی سوانح عمری، سماجی زندگی، گھریلو زندگی، عام عادتیں اور مصنوعی چیونٹی گھر بنانے کے عنوانات کے تحت بڑی مفید اور دلچسپ معلومات شامل ہیں۔

سر عقیل جنگ میڈل ادارۂ ادبیاتِ اردو کے امتحان اردو فاضل میں اول آنے والے طالبِ علم کو ایک طلائی تمغہ ہر سال عطا کیا جائے گا جو نواب سر عقیل جنگ بہادر صدر المہام و نائب صدر اعظم دولتِ آصفیہ نے از راہِ علم نوازی عطا فرمایا ہے۔

اردو انسایکلوپیڈیا اس عظیم الشان تالیف کا کام روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ اس اثنا میں بعض مشاہیر نے اس کام کی نسبت جن اچھے خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان میں سے بعض کے اقتباسات یہ ہیں۔

مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ۔ "مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ متعدد مشاہیر نے بھی اس اردو انسائکلوپیڈیا کے لئے مختصر مقالوں کی تحریر کا وعدہ کر لیا ہے۔ میں دوبارہ اس عظیم الشان کارنامے کی تکمیل اور ہر طرح کی کامیابی کی توقع کا اظہار کرتا ہوں۔"

مسز سروجنی نائیڈو۔ "آپ کا ادارہ اردو زبان اور ادب کی ترقی و تحفظ کے لئے جو نمایاں کام انجام دے رہا ہے اس کی مدد کرتے رہنے میں مجھے ہمیشہ دلی مسرت حاصل ہوتی رہے گی۔"

پروفیسر نجیب اشرف صاحب ایم اے پروفیسر اردو اسمٰعیل کالج بمبئی تحریر فرماتے ہیں۔ "آپ نے انسائیکلو پیڈیا کا کام اپنے ذمہ لے کر اپنے لئے غیر فانی عزت اور نیک نامی کا سامان پیدا کر لیا ہے۔ اور جب تک اردو زندہ ہے اردو دنیا آپ کے اس احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اللہ پاک آپ کو اور آپ کے رفقائے کار کو زندگی و صحت دے کہ وہ اس کو مکمل کریں۔ مہدی مرحوم کے عہد میں انسائیکلو پیڈیا کا جو تصور تھا وہ ان کے مضمون سے ظاہر ہے۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں دار المصنفین نے اس بات کی کوشش شروع کی تھی اور خیال تھا کہ مرحوم راجہ صاحب محمود آباد اس کے لئے کم از کم ایک لاکھ روپیہ دیں گے لیکن کوئی نتیجہ نہ ہوا۔ اس کے بعد جب مرہٹی انسائیکلو پیڈیا شائع ہوئی اور اس کے چیف ایڈیٹر نے یہ اعلان کیا کہ اگر ہندی اردو والوں نے جلد اس کا ترجمہ نہ کیا تو وہ خود یہ کام انجام دے گا۔ لیکن اس پر بھی رگ حمیت و غیرت کو جنبش نہ ہوئی۔ البتہ سیرت سے متعلق مضمون پر بعض اعتراضات کئے گئے۔ شاید قضا و قدر کے کارکنوں کو یہ منظور تھا کہ یہ کام بھی اسی ادب نواز و علم پرور سرزمین میں ہو جہاں کی عثمانی فیاضی کا کوئی جواب نہیں۔ اردو کی واحد جامعہ کی اس سے بڑھ کر کیا کامیابی ہو سکتی ہے کہ اس کے اساتذہ اس کے تعلیم یافتہ نوجوان اور دوسرے ہمدرد ایک ایسے عظیم الشان کارنامے کا اس جوش ولولے۔ نظام۔ اور استقامت کے ساتھ بیڑا اٹھائیں۔ آپ کی مختلف کمیٹیوں کی جو روئداد سب رس میں چھپتی رہتی ہے وہ اس کی وسعت اور ہمہ گیری کی دلیل ہے۔ اللہ پاک اس چیز کو تکمیل تک پہنچائے۔"

پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے صدر شعبہ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی اردو انسائیکلو پیڈیا کے لئے خواجہ حیدر علی آتش اور انیس و دبیر پر مقالے تحریر فرما رہے ہیں۔ آتش کے مقالے کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ کے کارناموں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خداوند عالم آپ کی قوت عمل میں اور اضافہ فرمائے۔ اور آپ کو تا دیر زندہ و سلامت رکھے۔ آپ سے اردو کو بہت کچھ فائدہ پہنچ رہا ہے۔ اور ان شاء اللہ بہت دنوں تک پہنچتا رہے گا۔"

شعبۂ زراعت و باغبانی بتاریخ پندرہ ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء شام کے پانچ بجے دفتر ادارہ میں اردو انسائیکلو پیڈیا کے شعبۂ زراعت و باغبانی کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

۱۔ ڈاکٹر کالی داس سہانی ایم ایس سی۔ پی ایچ ڈی ناظم زراعت (تحقیقات)
۲۔ رائے ہندر بہادر بی اے۔ ایم ایس سی ناظم زراعت (تبلیغ)
۳۔ مرزا محی الدین بیگ صاحب بی اے سی ٹی پرنسل مددگار ناظم زراعت۔
۴۔ ڈاکٹر وحید الدین صاحب ایم ایس سی۔ پی ایچ ڈی۔
۵۔ ڈاکٹر میر حسین علی صاحب رضوی بی اے جی۔ پی ایچ ڈی۔
۶۔ ڈاکٹر قادر الدین خاں صاحب ایم ایس سی۔ پی ایچ ڈی۔
۷۔ مولوی رسول سلطان صاحب ایم ایس سی۔
۸۔ مولوی عبد المجید صاحب بی اے جی۔
۹۔ ڈاکٹر بی جی کرشنا بی ایس سی۔ پی ایچ ڈی۔
۱۰۔ جناب اردشیر بہمن جی مہرجی خورشید بی اے۔ ایم ایس سی۔
۱۱۔ مولوی عاقل خاں صاحب ایل اے جی۔
۱۲۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔
۱۳۔ سید بادشاہ حسین معتمد اردو انسائیکلو پیڈیا۔

طے پایا کہ اسمار اور مصطلحات کی جو فہرست محکمۂ زراعت میں موجود ہے اس سے ادارہ کے مرتب کردہ کارڈز کا مقابلہ کر لیا جائے اور ان کارڈوں کے مندرجہ الفاظ و مصطلحات کی ایک نقل مولوی مرزا محی الدین بیگ صاحب کی خدمت میں روانہ کی جائے تاکہ وہ ان دونوں فہرستوں کا مقابلہ کریں اور متعلقہ اصحاب کے مشورے اور ڈاکٹر کالی داس سہانی اور رائے ہندر بہادر ناظمائے زراعت کی نگرانی میں ایک مکمل

فہرست زراعت و باغبانی سے متعلقہ الفاظ کی تیار فرمائیں۔ اور بہ عجلت ممکنہ الف ممدودہ سے شروع ہونے والے الفاظ کا انتخاب کر کے مطلع کریں تاکہ آیندہ کمیٹی میں ان پر مضمون لکھوانے کی نسبت عملی تصفیہ کئے جائیں۔

شعبۂ قانون بتاریخ ۲۹ ستمبر سنہ۱۹۴۱ء صبح کے نو بجے دفتر ادارہ میں اردو انسائیکلو پیڈیا کے شعبہ قانون کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

۱. جسٹس ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ بہادر ایل ایل ڈی رکن ہائی کورٹ
۲. جسٹس رائے بشیشور ناتھ صاحب بی اے ایل ایل بی رکن جوڈیشل کمیٹی۔
۳. خواجہ زین العابدین صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لا۔
۴. مولوی احمد عبداللہ صاحب مسدسی بی اے۔ ایل ایل بی وکیل ہائیکورٹ۔
۵. ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔
۶. سید بادشاہ حسین معتمد ارد و انسائیکلو پیڈیا۔

ڈاکٹر میر سیادت علی خان صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی۔ بی سی ایل۔ پی ایچ ڈی۔ اور پنڈت سری پت راؤ صاحب ایڈوکیٹ نے بذریعہ تحریر اور مولوی عبداللہ صاحب وکیل تماپوری نے بذریعہ ٹیلیفون شرکت سے معذرت چاہی اور آیندہ اجلاس میں شرکت کا وعدہ فرمایا۔ یہ طے پایا کہ جن قانونی الفاظ کے اب تک ترجمے نہیں ہو سکے ہیں۔ ان کے ترجمے اور جن اصطلاحوں کے ترجمے ہو چکے ہیں ان کی نظر ثانی کا کام راجہ بشیشور ناتھ صاحب اور عبداللہ صاحب تماپوری کے تفویض کیا جائے۔ راجہ صاحب نے وعدہ فرمایا کہ اس کام کی تکمیل کے بعد اپنی رائے سے مطلع فرمائیں گے کہ کون کون سے قانونی الفاظ اردو انسائیکلو پیڈیا میں شریک کئے جائیں۔ الفاظ کے تعین کے بعد آیندہ اجلاس میں یہ طے کیا جائے گا کہ کون کون سے الفاظ پر کن اصحاب سے مضامین اور مقالے مرتب کرائے جائیں۔

شعبۂ حیوانیات بتاریخ ۴ ستمبر سنہ۱۹۴۱ء شام کے پانچ بجے دفتر ادارہ میں اردو انسائیکلو پیڈیا کے شعبۂ حیوانیات کی مشاورتی کمیٹی منعقد ہوئی جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت کی۔

۱. ڈاکٹر بی کے داس۔ ڈی ایس سی صدر شعبۂ حیوانیات جامعہ عثمانیہ۔
۲. مولوی مہدی علی صاحب ایم ایس سی استاد حیوانیات و ایڈیٹر اردو انسائیکلو پیڈیا
۳. مولوی محمد عابدی صاحب استاد حیوانیات۔
۴. رائے ستیہ نارائن سنگ صاحب ایم ایس سی استاد حیوانیات۔
۵. ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور
۶. مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ایم اے معتمد اردو انسائیکلو پیڈیا۔
۷. مولوی سید بادشاہ حسین صاحب۔

اس وقت تک شعبۂ حیوانیات سے متعلق ڈاکٹر محمد بابر مرزا صاحب ایم ایس سی پی ایچ ڈی۔ اور مولوی مہدی علی صاحب ایڈیٹران

شعبۂ حیوانیات نے اس فن سے متعلق اسماء و مصطلحات کی فہرستیں کی تکمیل کرلی ہے اور مختلف ذیلی شعبوں کے کام کی تفصیل بھی کردی ہے۔ اس کی نسبت تبادلۂ خیال کیا گیا اور معلوم ہوا کہ اس شعبہ کا کام بڑی خوبی سے انجام پارہا ہے۔ ڈاکٹر داس صاحب نے اس کی تکمیل میں ممکنہ امداد دینے اور سرگرمی کا اظہار فرمایا۔

معتمدین شعبہ جات کی طرف سے دعوت

چونکہ ادارۂ ادبیات اردو کے معتمد اعزازی عالیجناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ماہ اگست میں صدارت شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ پر فائز ہوئے اس لئے ادارہ کے معتمدین شعبہ جات نے اس ترقی کی مسرت میں بتاریخ ۲۳ ستمبر ۱۹۴۱ء ایک عشائیہ کا انتظام کیا تھا جس کے رقعے نواب مرزا سیف علیخاں صاحب جاگیردار و ناظم اعزازی کتب خانہ ادارہ نے منجانب معتمدین تقسیم فرمائے۔ اور یہ عشائیہ نواب مرزا علی حسین خاں صاحب بی اے کے مکان واقع نارائن گوڑہ روبرو والی ایم سی اے۔ ترتیب دیا گیا تھا جس میں اکثر معاونین و رفقا و اراکین ادارہ نے شرکت فرمائی اور متعدد اصحاب اور شعبوں کی طرف سے ڈاکٹر صاحب موصوف کو پھول پہنائے گئے۔

اردو امتحانات کی ایک نئی درس گاہ

اردو سیکھنے کے شائقین کی سہولت کے لئے درس گاہ اردو امتحانات کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ محلہ بیدڑواڑی میں قایم کیا گیا ہے جہاں محمود احمد صاحب انصاری روزآنہ بعد مغرب اردو زبان و ادب کی مفت تعلیم دیتے اور ادارۂ ادبیات اردو کے اردو امتحانات کے لئے طلبہ کو تیار کرتے ہیں۔

اردو امتحانات کے مرکزوں کی روئدادیں

اردو امتحانات کے مرکزوں کی نگرانی کے لئے جو حضرات تشریف لے گئے تھے ان میں سے چند کی روئدادوں کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔ باقی ماندہ روئدادیں آئندہ شایع کی جائیں گی۔

مرکز کلیانی

پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی تحریر فرماتے ہیں :- گزشتہ سال کی طرح امسال بھی کلیانی کا مرکز میرے سپرد تھا۔ ۲۰ اگست ۱۹۴۱ء کو چہارشنبہ کے دن میں اپنی گاڑی میں حیدرآباد سے روانہ ہوا۔ میرے ساتھ عبدالکریم صاحب بھی تھے جو شاخ ادارہ کلیانی کے بانی ہیں۔ ہم شام کے پانچ بجے ہمناباد پہنچے اور رات وہیں بسر کی۔ ۲۱ اگست کی صبح کو تقریباً ۸ بجے کلیانی پہنچے اور مسافر بنگلہ میں دم لیا۔ عطاء اللہ صاحب مہتمم اور دوسرے حضرات سے ملاقات ہوئی۔ ہیضے کی وجہ سے ہر جگہ پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ اسی وجہ سے ادارہ کا ارادہ یہ تھا کہ اس سال کلیانی میں امتحان نہ ہو یا اگر امیدوار امتحان دینا چاہیں تو ان کو حیدرآباد یا کسی قریبی مرکز میں منتقل کردیا جائے لیکن اہل کلیانی کا اصرار تھا کہ امتحان حسب دستور اسی جگہ ہونا چاہیے۔ اس لئے وہیں امتحان کا انتظام کیا گیا اور مجھے عالم مجبوری میں جانا پڑا لیکن وہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ حالات امتحان کے متقاضی نہ تھے۔ امیدوار، ان کے سرپرست، اور نگران کار بہت پریشان تھے۔ بہت سے امیدوار غیر حاضر تھے۔ اور اکثر اہل کلیانی اور نگران کار دیکھتے دیکھتے ہیضے میں مبتلا ہوگئے جن کا جانبر ہونا دشوار تھا۔

جوں توں ۲۱ اگست کو امتحان لیا گیا۔ اردو دانی کے جو امیدوار حاضر تھے انھوں نے صبح کو تحریری امتحان دیا اور دوپہر کو زبانی امتحان کی تکمیل کی گئی۔ اس کے ساتھ اردو عالم کے بھی وقفہ پرچے ہوگئے۔ امتحان سے فارغ ہوکر میں حفظ ماتقدم کی خاطر ستاپور میں جاکر ٹھیرا جو کلیانی سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۲۲ اگست کو جمعہ تھا۔ اور وقت نامے کے بموجب ڈھائی بجے سے امتحان تھا۔ ستاپور سے میں ۱۱ بجے کے قریب

کلیانی آیا۔ اور وقت پر اردو عالم کا پرچہ دیا گیا اور امتحان ختم کرکے بسوا کلیانی پہنچ گیا۔ بنگلہ پہنچنے کے بعد مجھے پیٹ میں کچھ تکلیف محسوس ہوئی اور مقامی لوگوں کے مشورے سے میرا بلدہ فوراً آنا ضروری سمجھا گیا۔ ۲۳ اگست کے دو پرچے جو اردو عالم سے متعلق تھے۔ مولوی احمد حسین صاحب تعلقدار کلیانی کے سپرد کرکے میں تقریباً ۸ بجے شب کے راہی بلدہ ہوا۔ دوسرے روز ۲۴ اگست شنبہ کو احمد حسین صاحب نے امتحان کی تکمیل کردی اور سربمہر جوابی بیاضیں میرے ہاں روانہ کردیں جو ہر طرح قابل اطمینان تھیں۔ موصوف شاخ ادارہ کے صدر ہیں اور مقامی عہدہ دار اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے ہر طرح قابل اعتماد ہیں اور مجھ سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور اسی اطمینان کی وجہ سے میں بلدہ واپس آگیا۔ موصوف ادارہ کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ توقع ہے کہ موصوف کی سرپرستی میں شاخ ادارہ کلیانی بہت سرسبز ہوگی حسب ذیل حضرات نے امتحان کی نگرانی کی۔

معلمہ تمام عبدالکریم صاحب، قاضی الدین صاحب، عطا اللہ صاحب، محمد بیگ صاحب، شیخ صالح صاحب، ترل راؤ صاحب۔

مرکز پربھنی مولوی سید بادشاہ حسین صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔ مدرسہ فوقانیہ پربھنی میں امتحانات کا مرکز رہا۔ دو کمرے مردوں کے لئے اور دو کمرے زنانہ کے لئے مخصوص کئے گئے۔ معقول انتظامات کی وجہ سے امتحانات میں بڑی سہولت ہوئی۔

زنانہ ہال میں حسب ذیل خواتین نے نگرانی کی۔

۱۔ حکیم النساء بیگم صاحبہ صدر معلمہ نسوان اردو تحتانیہ پربھنی۔ سوشیلا دیوی صاحبہ صدر معلمہ نسوان تحتانیہ مرہٹی پربھنی۔ جمال بی صاحبہ صدر معلمہ نسواں اردو تحتانیہ محلہ مومن پورہ پربھنی۔ اور حسب ذیل اصحاب نے مردانہ ہال کی نگرانی میں میرا ہاتھ بٹایا۔

محمد قاسم صاحب مدرس مدرسہ فوقانیہ پربھنی۔ سید امیرالدین صاحب مدرس مدرسہ فوقانیہ پربھنی۔ شیخ عبدالقادر صاحب مدرس مدرسہ فوقانیہ پربھنی۔ مسٹر مانک راؤ مدرس مدرسہ فوقانیہ پربھنی۔ مسٹر رینکا داس مدرس مدرسہ فوقانیہ پربھنی۔

ان کے سوا معتمد صاحب شاخ بھی پورے امتحانات میں صبح سے شام تک برابر موجود رہے جس سے انتظامات میں سہولت ہوئی۔ اس ضمن میں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ادارہ کی جانب سے متذکرۂ بالا خواتین و حضرات کا نگرانی امتحانات کے لئے شکریہ ادا کیا جائے۔ بے موقع نہ ہوگا اگر صدر مدرس صاحب (ابرار حسین صاحب) کا بھی شکریہ ادا کیا جائے۔ انھوں نے مدرسہ کے کمروں کے استعمال کی اجازت دی گو کہ وہ خود مستقر پر موجود نہ تھے۔

پربھنی کی شاخ کھلے میدان میں ایک موزوں عمارت میں قایم ہے معتمد صاحب شاخ کی کوشش اور مہتمم صاحب آبکاری کی توجہ سے یہ عمارت شاخ کو مل سکی۔ خاصا اچھا مطالعہ گھر ہے۔ روزنامے، ہفتہ وار اور ماہوار جرائد آتے ہیں اور روز آنہ کافی تعداد میں لوگ مطالعہ کرتے ہیں۔ انتظام بہت اچھا اور ہر چیز سلیقہ سے رکھی گئی ہے۔ ادارہ کی اکثر و بیشتر اور اردو کے دوسرے مصنفین کی تصاویر یہاں آویزاں ہیں اور امتحانات کے زمانہ میں طلبارات میں بڑی دیر تک یہیں مطالعہ کیا کرتے ہیں کیونکہ روشنی کا معقول انتظام ہے۔ مقامی عہدہ دار بھی ادارہ کی اس شاخ اور امتحانات سے واقف ہوگئے ہیں۔

مختصر یہ کہ اس شاخ کو کامیاب بنانے میں معتمد صاحب شاخ کی پرخلوص کوششوں اور مہتمم صاحب آبکاری کی مخلصانہ دلچسپیوں کو بڑا دخل ہے۔

(ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں)

کتاب	صفحات	روپیہ	آنہ	پائی
من کی بپتا ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگذشت غالب ...	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
دکن نمبر (۷۸ تصاویر)	۱۶۸	۲	۰	۰
ارمغان ادب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سرسید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سرسالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب ..	۵۶	۰	۲	۶
" دوسری کتاب ...	۵۶	۰	۴	۶
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۶	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰
رسائل طبیہ ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہر ...	۴۰	۰	۴	۰

نام کتاب	صفحات	روپیہ	آنہ	پائی
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈسورتھ اور اس کی شاعری...	۱۸۴	۱	۴	۰
هوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	۰
یوسف هندی و فرنگ عجم ...	۸۹	۱	۰	۰
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱۲۸	۱	۴	۰
متاع سخن ...	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کشف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن ...	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن ...	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر...	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) " ...	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
اذ رولی ...	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم ...	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاهیر قندهار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
مدارس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ ...	۱۱۰	۱	۰	۰
نذر دکن ...	۱۰۳	۱	۴	۰
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم ...	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۲	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہد
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۴
نشان ٹپہ برطانیہ M.3350
ٹیلیفون ۲۲۰۹
چندہ سالانہ روپئے آٹھ آنے
سب رس ایک پرچہ آٹھ آنے

جلد ۴ — بابت نومبر ۱۹۴۱ء — شمارہ ۱۱

[illegible] حیدرآباد دکن شائع [illegible]

غزل

یہ غزل نواب معین الدولہ مرحوم نے انتقال [illegible] ستمبر ۱۹۲۱ء کے لئے بطور خاص عالم بالا میں سے [illegible] شاعرہ سے کچھ دن قبل [illegible] فرمائی تھی جس کو اہل محفل نے بہت پسند کیا۔
یہ حیدرآباد کے اس محسن صداقت امیر [illegible] کا آخری کلام ہے۔ (مدیر)

جسے غم ہو فرقتِ یار سے جسے عشق ہو رخِ یار سے
اسے کیا خزاں سے ہے واسطہ اسے کیا غرض

کبھی ایسا ننگِ جنوں نہ تھا کبھی ایسا سوزِ دروں نہ تھا
کہوں کیا میں ہائے بہار کو یہ لگی ہے آگ بہ

یہ جو دل میں ایک سرور ہے یہ جو دل کو ایک سکون ہے
ترے بھولے پن کے نثار میں نہ چمن سے ہے نہ

مرا آشیانہ ہی جل گیا مرا دل ہی سب سے اتر گیا
مجھے ضد ہے باغ کی سیر سے مجھے چڑ ہے نام

میں ہوں ایسے رنگ کے باغ میں کہ کسی طرح کا بھی واسطہ
نہ تو گل سے ہے نہ تو خار سے نہ خزاں سے ہے

ترے حسن پر ہیں نثار گل ترے رخ پہ غش ہیں ہزار گل
مرے حق میں تو ہی بہار ہے مجھے کام کیا ہے

یوں ہی دن خزاں کے دکھائے گی یوں ہی سر پہ آفتیں لائے گی
جو چمن میں آئے بہار پھر تو میں آ نہ پوچھوں بہ

نہ تو جیب جیب رہا مرا نہ تو پیرہن رہا پیرہن
جو بہار کا یہی رنگ ہے تو خزاں ہی اچھی بہا

میں خیالِ پیرِ مغاں میں ہوں تمھیں رنگِ بیخودی کیا کہوں
نہ خزاں سے ہے مجھے آگہی نہ میں آشنا ہوں بہار سے

گارساں دتاسی

(اردو کا پہلا پروفیسر)

ذیل کا مضمون ڈاکٹر زورصاحب کی زیرطبع کتاب کا ایک حصہ ہے۔ (مدیر)

گارساں دتاسی صحیح معنوں میں اردو کا پروفیسر تھا۔ اس نے اس زبان کی بہی خواہی کا ہر وہ کام کیا جو ایک مخلص پروفیسر کو کرنا چاہئے۔ نہ صرف اپنے طلبہ میں اردو کا ذوق پیدا کیا، بلکہ ہمیشہ اس امر کی کوشش کی کہ مختلف مقامات میں اردو کی درسگاہیں اور اردو کی پروفیسری قائم کی جائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں میں اردو کا ذوق پیدا ہو۔ لندن اور انگلستان کی دوسری قدیم یونیورسٹیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے ، ر فروری ۱۸۶۱ء کے خطبے میں اس امر پر زور دیا کہ آئرلینڈ، اسکاٹ لینڈ اور امریکہ میں بھی اردو کی پروفیسری قایم ہونی ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے :-

"انگلستان کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں لندن میں اردو زبان کی تعلیم کو ناگزیر سمجھ کر رائج کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈبلن یونیورسٹی، اسکاٹستان کی یونیورسٹیوں، اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بھی اس کی طرف جلد توجہ کی جائے گی۔"

اسی طرح اس نے اس امر کی بھی تحریک کی کہ انگلستان کی یونیورسٹیوں میں ہندوستانیوں کو بھی اردو پڑھانے کے لئے مقرر کرنا چاہیے تاکہ انگریز صحیح اردو تلفظ اور لب و لہجہ سے واقف ہوجائیں۔ اس نے کہا :-

"بہتر ہوگا اگر کیمبرج یا اکسفورڈ میں کہیں ایک ایسا پروفیسر رکھا جائے جو اردو کا صحیح تلفظ اور تحریر و تقریر کی مشق کرائے۔ جیسے کہ ہمارے ہاں (پیرس کے مدرسۃ السنہ میں) ایک زمانے میں دتاسی کے ساتھ مصری فاضل رفائل مونا شمس اہل زبان ہونے کی حیثیت سے عربی کا تلفظ وغیرہ سکھاتے تھے۔" (تقریر ، ر فروری ۱۸۶۱ء)

دتاسی نے یورپ اور خاص کر انگلستان کے ان کتب خانوں اور ان کے نگران کاروں کا بھی موقع بہ موقع ذکر کیا ہے جہاں اردو کتابیں اور قلمی نسخے محفوظ کئے جارہے تھے۔ وہ ہر ایسی خبر سے خوش ہوتا تھا جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح اردو سے ہوتا۔ اردو کتابوں کی اشاعت اور اخباروں کے اجرا کی جو اطلاع اسے ہندوستان سے ملتی اس کی خوشی میں اضافہ کا باعث ہوتی۔ ۱۸۶۱ء میں جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ ہر اس انگریز کے لئے اردو پڑھنا لازمی کردیا گیا ہے جو فوجی ملازمت کے لئے ہندوستان جانا چاہتا ہے تو دتاسی کو بے حد مسرت ہوئی۔ چنانچہ اس نے اپنے ، ر فروری ۱۸۶۱ء کے خطبے میں بڑی خوشی سے اس کا اعلان کیا کہ :-

"یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ آئندہ سے ان انگریزوں کے لئے جو ہندوستانی افواج میں نوکری کرنا چاہتے ہیں یہ لازمی قرار پایا ہے کہ اردو کے تین اقتباسات کا جن سے پہلے سے وہ واقف نہیں، انگریزی زبان میں ترجمہ کریں اس کے ساتھ ہی انھیں نظم و نسق کے متعلق کسی عبارت کا اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو اور ہندی میں ترجمہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ ایسا ہونا چاہئے کہ ہندوستانی آدمی بھی اس کی عبارت کا مفہوم سمجھ سکے۔ اس امتحان میں کسی ایک انگریزی خط کا اردو میں فی البدیہہ مطلب بھی دریافت کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی امتحاناً ہندوستانیوں کے ساتھ اردو زبان میں گفتگو کرائی جاتی ہے۔"

اسی طرح ۱۸۶۱ء میں جب دتاسی کو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں جگہ جگہ مقامی عدالتیں قایم کی جا رہی ہیں تو اس نے انگریزوں کو توجہ دلائی کہ وہ قانون پڑھ کر ہندوستان جائیں ۔ وکالت اور بیرسٹری کے ذریعہ سے قسمت آزمائی کریں لیکن اس ترغیب میں بھی اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگ اردو لکھنا پڑھنا سیکھیں چنانچہ ساتھ ہی بڑی خوبی کے ساتھ اس کی بھی تبلیغ کر دی ۔ وہ کہتا ہے :-

"ہندوستان میں آج کل مقامی عدالتیں ہر جگہ قایم ہو رہی ہیں ۔ ان نوجوان انگریزوں کے لئے جن کی اپنے وطن میں قدر نہیں یہ موقع ہے کہ وہ اس وقت ہندوستان میں اپنی قسمت آزمائیں ۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ ہندوستان جانے کا ارادہ کریں یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ دیسی لوگوں کی زبان کو مطالعہ کے ذریعے سیکھیں انہیں ہندوستانی لوگوں کے ان محاوروں کو جاننا چاہئے جو ہر وقت گفتگو میں استعمال ہوتے ہیں ۔"

۲۳ جنوری ۱۸۶۹ء کو جب انڈین میل میں سید عبداللہ پروفیسر اردو لندن یونیورسٹی نے سر اسٹفورڈ نارتھ کوٹ (Sir Stafford Northcote) کے نام ایک خط شایع کیا کہ "آیندہ سے حکومت ہند سول سروس کے مقابلہ کے امتحان میں ہندوستان کی بعض مروجہ اور زندہ زبانوں کو لازمی قرار دے" تو گارساں دتاسی نے اس کی پُر زور تائید کی اور سنسکرت اور عربی کے مقابلہ میں اردو جاننے کے جو عملی فوائد ہیں ان کو واضح کیا ۔ اس نے اپنی ۶ دسمبر ۱۸۶۹ء کی تقریر میں کہا کہ "میں سید عبداللہ کے اس خط کے مضمون کے ساتھ بالکل متفق ہوں" اور اس کے بیان کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی تائید کرتا ہے کہ :-

"سید عبداللہ نے اپنے اس خط میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سول سروس کے ہر امیدوار کے لئے یہ لازمی قرار دینا چاہئے کہ وہ ملکی زبان میں پوری دسترس حاصل کرے ۔ شکستہ تحریر بآسانی پڑھ سکے ۔ اور اس زبان سے انگریزی میں اور انگریزی سے اس زبان میں بخوبی ترجمہ کر سکے ۔ دراصل یہ تمام باتیں نہایت ضروری ہیں ۔ چنانچہ نظائے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہیلی بری کالج کے طلبہ کے لئے انھیں لازمی قرار دیا تھا ۔"

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے اس قسم کے مباحث کے فوائد اور حکومت کو متوجہ کرتے رہنے کی ضرورت جس طریقہ سے ظاہر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گارساں دتاسی اردو کے حقوق کی حفاظت اور اس کی تائید کے لئے کس شدت کے ساتھ کمربستہ رہتا تھا ۔ وہ کہتا ہے کہ :-

"حکومت کو اس جانب توجہ دلاتے رہنا مفید ہے ... اس واسطے کہ ہندوستانی ہی ملک کی مشترک زبان ہے اور جیسا کہ میں بارہا پہلے بتا چکا ہوں اہلِ ہند کا ایک بڑا اور اہم طبقہ اس کے ذریعے اظہارِ خیال کرتا ہے ۔ اور ملک کے طول و عرض میں اس کے بولنے اور سمجھنے والے ملتے ہیں ان تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے ان لوگوں کو جو حکومت کی خدمت انجام دے رہے ہیں اس زبان کا سیکھنا ازبس ضروری ہے ۔"

گارساں دتاسی اردو اور ہندی دونوں کا یکساں ماہر تھا ۔ اس نے ابتدا ہی سے دونوں زبانوں سے متعلق کتابیں لکھیں ۔ لیکن ان دونوں میں وہ اردو کو ترجیح دیتا تھا اور انگریزوں کے اس رجحان کی مخالفت کرتا تھا جو ہندی کو اردو کے مقابلے میں لا کھڑا کرنے کے لئے روز بروز شدت پکڑتا جا رہا تھا ۔ اس نے اپنی اکثر تقریروں میں اس رجحان کی مذمت کی ۔ تقریباً پچاس سال کے تجربہ اور اردو اور ہندی دونوں کی تعلیم و تعلم نے

اس کو اپنے ایقان میں پختہ بنا دیا تھا۔

چنانچہ وہ کسی مسئلہ میں اس شدت اور آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتا تھا جتنا کہ اردو کی تائید کے لئے کرتا۔ اس کی آخری تقریروں سے ایک (۲ دسمبر ۱۸۶۹ء) میں اس نے اردو، ہندی جھگڑے کے ذکر میں علی الاعلان کہا کہ :۔

"اردو نے ہندستان میں جو حیثیت قایم کرلی ہے وہ باقی رہے گی۔ وہ اگر چاہیں کہ لوگوں کو عربی اور فارسی الفاظ ترک کرنے پر آمادہ کریں تو اس میں بھی انھیں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے کہ اسلامی حکومت کے زمانے میں صدیوں سے جو الفاظ عام زبان پر چڑھ گئے ہیں وہ آسانی سے ترک نہیں کئے جاسکتے۔ ان کی کوشش بالکل ایسی ہوگی جیسے انگریزی فضلاء یہ فیصلہ کریں کہ ان کی قوم ان فرانسیسی الفاظ کا استعمال ترک کردے جو انگریزی زبان میں نارمن فتوحات کے بعد گھل مل گئے ہیں۔"

اس بحث پر بطور نوٹ کے گارساں دتاسی لکھتا ہے کہ " مئی ۱۸۶۹ء کے کلکتہ ریویو میں میری ناچیز رائے سے موافقت کا اظہار کیا گیا ہے جو میں نے کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے اس جلسہ کے متعلق ظاہر کی تھی جس میں اس پر بحث ہوئی تھی کہ آیا اردو کو زیادہ اہمیت حاصل ہے یا ہندی کو اس ریویو نے لکھا ہے کہ :۔

" موسیو گارساں دتاسی نے اردو کی حمایت میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ ہمیں ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔"

۴ جولائی ۱۸۶۹ء کے "بمبئی پولا" میں میرے خیالات کو بنظر استحسان دیکھا گیا ہے۔" اس مذکورۂ بالا تقریر کے سلسلہ میں گارساں دتاسی نے کہا :۔

"میں اور مسٹر بیمز (M. Beams) اردو کی حمایت میں تنہا نہیں ہیں۔..... ہم نہ اس کے قایل ہیں کہ عربی، فارسی الفاظ اردو میں سے خارج کردئے جائیں اور نہ ہم ہندی کو بے وجہ اردو پر فوقیت دینا مناسب سمجھتے ہیں۔"

اس تقریر سے دو سال قبل ۴ دسمبر ۱۸۶۷ء کا افتتاحی خطبہ شروع کرتے ہی اس نے اردو، ہندی جھگڑے کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ :۔

"بہرنہج لوگوں کا خیال ہندستانی کی نسبت چاہے کچھ بھی ہو لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ سارے ہندستان کی مشترک زبان بن گئی ہے۔ روز بروز اس کی جو ترقی ہورہی ہے اس کی وجہ سے وہ پورے دیس کی زبان کہی جا سکتی ہے۔ اس مسئلہ کی نسبت کپتان ایچ مور (H. Moore) نے اپنی رائے سے مجھے مطلع کیا ہے۔ موصوف مرکزی حکومت میں ترجمان کے عہدے پر فائز ہیں۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں :۔

" اس زبان کے توسط سے لاکھوں اہل مشرق تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ ریل کی وجہ سے جو ہندوستان ملک میں تین ہزار میل کی مسافت پر پھیل گئی ہے اور بھی ہندستان اور وسط ایشیا کے لوگوں کو ملنے جلنے کا موقع ملا ہے۔ چنانچہ جب یہ لوگ ملتے ہیں تو ایک مشترک زبان کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ ہندستانی زبان اس مقصد کو بطریق احسن پورا کرتی ہے۔ اس لئے کہ اس کی ساخت میں ہندی، فارسی اور عربی کے عنصر شامل ہیں۔ اس زبان میں بدرجۂ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے مقاصد کو پورا کرے۔"

غرض کپتان مور کے خیالات بیان کرنے کے بعد دتاسی نے اس بحث کی وضاحت کی ہے اور آخر میں پھر اسی موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

جس کو وہ اپنا چہیتا موضوع کہتا ہے۔

"میں اب اپنے چہیتے موضوع کی طرف رجوع کرتا ہوں یعنی اردو کی ہندوستان میں اہمیت"۔
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو کا کتنا دلدادہ تھا۔

دتاسی نے آج سے ستر سال قبل ہندوستان کے اردو ہندی جھگڑے کی نسبت جو صحیح اندازہ قایم کیا تھا وہ آج کل کے بڑے بڑے سیاسیان ہند کے لئے سبق آموز ہے اور سچ تو یہ ہے کہ کچھ عرصے سے بعض اصحاب نے اس جھگڑے کی علمبرداری کر کے جو شہرت اور اہل اردو کا جو ہمدردیاں حاصل کی ہیں وہ گارساں دتاسی ہی کی ان تحریروں کے مطالعے اور اس کے دلائل کے استعمال کا نتیجہ ہے۔ عہد حاضر کا اردو کا بڑے سے بڑا سیاسی مدبر بھی دتاسی ہی کا خوشہ چیں ہے۔ وہ اردو کی تائید میں ایسی مدلل، ثقہ اور وزنی تحریریں لکھ گیا ہے جو ہمیشہ اردو کی تائید اور مدافعت کرنے والوں کا مضبوط حربہ ثابت ہوں گی۔ اس نے اپنے ۱۹ر دسمبر ۱۸۶۹ء کے خطبہ میں کہا تھا۔

"عجیب بات ہے کہ جس طرح آج کل یورپ میں ایک تحریک اٹھی ہے جس کا نصب العین یہ ہے کہ پھر سے ازمنۂ وسطیٰ کی طرف رجوع کیا جائے اور ان زبانوں کو زندہ کیا جائے جو اب بولیاں ہو کر رہ گئی ہیں اسی طرح ہندستان میں بھی ازمنہ وسطیٰ کو زندہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے .... ہندوستان میں بھی ازمنہ وسطیٰ کی ادبیات کو قدر اور احترام کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔ اس وقت ہندی کی حیثیت بھی ایک بولی کی سی رہ گئی ہے جو ہر گاؤں میں الگ الگ طریقے سے بولی جاتی ہے چنانچہ ہندوؤں کی کوشش ہے کہ اردو کی بجائے ہندی کو فروغ دیا جائے۔ حالانکہ اردو بہ نسبت ہندی کے زیادہ شستہ ہے۔ لیکن ہندی ان کے نزدیک خالص ہندستان کی زبان ہے اس واسطے کہ وہ سنسکرت سے نکلی ہے۔ ان کو یہ نہیں سوجھتا کہ اردو زبان میں فارسی اور عربی کی ساری خوبیاں جمع ہو گئی ہیں۔ یہ دونوں زبانیں (فارسی و عربی) اسلامی مشرق کی قابل احترام السنہ ہیں اور دنیا کے تمام علما و فضلا ان دونوں کو ہمیشہ سے اسی نظر سے دیکھتے آئے ہیں"۔

اس کے بعد دتاسی نے اہل اردو اور اہل ہندی کے دلائل کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا ہے اور آخر میں برطانوی حکومت کی حمایت ہندی کی اس طرح تشریح کرتا ہے۔

"برطانوی حکومت اس تحریک کے موافق معلوم ہوتی ہے حکومت کا خیال ہے کہ ہندی کی موافقت سے ہندو لوگ خوش ہو جائیں گے اور چونکہ ہندستان کی آبادی کی کثرت انہی پر مشتمل ہے اس لئے ہندی کی تائید ملکی مصالح پر مبنی ہے"۔

ہندی کی تائید میں انگریزی اخبارات میں جو اداریئے اور مقالے شایع ہوتے تھے ان کا ذکر کر کے دتاسی نے ان کی مخالفت کی ہے اور کہتا ہے کہ۔

"میرے خیال میں اس مقالہ میں ہندی کی تائید میں جو استدلال پیش کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں اور جو دعوے پیش کئے گئے ہیں ان پر بحث کی جا سکتی ہے لیکن اس جگہ میں اسے چھیڑنا نہیں چاہتا۔ اس مقالے میں اردو کے متعلق کم از کم یہ تو تسلیم کیا گیا ہے کہ اس نے ہندوستان میں وہی حیثیت حاصل کر لی ہے جو فرانسیسی زبان کو یورپ میں حاصل ہے۔ عدالتوں اور شہروں میں اردو بولی جاتی ہے۔ مصنفین اپنی کتابیں اسی زبان میں تصنیف کرتے ہیں اور اسی کی غزلیں گائی جاتی ہیں اردو کے ذریعے اہل ہند یوروپین لوگوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ غرض کہ اگر ان تمام امور کو پیش نظر رکھا جائے تو اردو

کو ہندی پر فضیلت حاصل رہتی ہے جسے تسلیم کیے بغیر چارا نہیں۔"

غرض اسی طرح اردو کی موافقت میں دتاسی نے طویل بحثیں کی ہیں جو اس خطبے کے کئی صفحات پر مشتمل ہیں۔ اور تقریروں میں بھی جگہ جگہ اس قسم کی بحثیں اور دلیلیں نظر سے گزرتی ہیں۔ چونکہ اس کے خطبات کے اردو تراجم شائع ہو چکے ہیں اس لئے یہاں مزید مثالوں کی ضرورت نہیں۔

سید محی الدین قادری زور

لا قوۃ الا باللہ

کسی پردے یا اوٹ کے پیچھے سے اگر کبھی کوئی لکڑی نمودار ہوکر ہم کو مارے
اور لکڑی کے سوا دوسری کوئی چیز نظر ہی نہ آئے تو اس وقت ہم کہتے ہیں کہ

ہم کو لکڑی نے مارا

(۲) اس کے بعد اگر صرف کوئی ہاتھ نمودار ہوکر ہم کو لکڑی سے مارے تو اس وقت ہم کہتے ہیں کہ "ہم کو ہاتھ نے مارا"

(۳) اس کے بعد اگر کوئی شخص یا ذات برآمد ہوکر ہم کو لکڑی سے مارے تو اس وقت ہم کہتے ہیں کہ ہم کو "فلاں شخص نے مارا"

ان تینوں صورتوں میں ضرب کا صدور تو لکڑی ہی سے ہوا ہے لیکن صورت اول میں

ضرب کا فاعل لکڑی کو ٹھہرایا ہے،

صورت دوم میں ہاتھ کو فاعل ٹھہرایا ہے۔

صورت سوم میں ذات یا شخص کو فاعل ٹھہرایا ہے۔ ھذا مبلغھم من العلم

رباعی

برہان و دلیل سب معطل ہو جائیں — جتنے جھگڑے ہیں دم میں فیصل ہو جائیں

ہر چند بہت سوال لاینحل ہیں — تم سامنے آجاؤ تو سب حل ہو جائیں

امجد حیدرآبادی

غزل

تم کو سوجھی ہے دل لگی کیسی میرے رونے پہ یہ ہنسی کیسی

جان پر بن گئی محبت میں موت ہے! موت! عاشقی کیسی

رس بھری آنکھ تیری اے ساقی مست کردے گی بےخودی کیسی

گلشن حسن ہے چمن کیسا دہنِ تنگ ہے کلی کیسی

عقدہ قسمت کا کھل نہیں سکتا یہ گرہ تم نے ڈال دی کیسی

پی لیا ڈگ ڈگا کے ساغر سے میکشوں کی ہے میکشی کیسی

چھا گیا حسن تم پہ یہ کیسا آ گئی تم میں نازکی کیسی

میرے ہی واسطے مرے ساقی یہ بخالت یہ جز رسی کیسی

جگمگاتی ہیں آج تک آنکھیں برقِ نورِ جمال تھی کیسی

طالبِ دید ہو اگر موسیٰ ہوش میں آؤ بےخودی کیسی

کھل گیا غنچۂ مرادِ عزیز

یہ ہوا آج چل گئی کیسی

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

یاس

"سوچتی کیا ہو شہناز۔ دو ایک روز سے میں تمھیں کھوئی کھوئی سی دیکھ رہی ہوں" صالحہ نے شہناز کے گلے میں محبت سے اپنی باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہاں ——— چند حسین تصورات ہیں" شہناز نے جواب دیا۔

"حسین تصورات ؟" صالحہ متعجب ہوگئی "کیوں خیر تو ہے! کیسے تصورات! کاہیکے تصورات ؟"

"ایسے تصورات صالحہ جن کی ابتدا مسرت آمیز رہی لیکن انتہا نہایت رقت انگیز اور المناک"

"تمھیں ہو کیا گیا ہے شہناز؟ ایسی اکھڑی اکھڑی باتیں کیوں کرتی ہو؟ ——— معلوم ہوتا ہے زندگی سے بیزار آگئی ہو" صالحہ ہنس کر بولی۔

"ہاں کچھ یوں ہی ہے بہن صالحہ! اگر زندگی صرف سانس کی آمد و شد کا نام ہے۔ حیات انسانی اگر کسی بڑی قوت کا کھیل ہے تو پھر خیر سے میں یہ دعا کروں گی کہ یہی ساعت میری زندگی کی آخری ساعت ہو جائے اور اسی وقت میں بقید مرگ ہو جاؤں ——— زندگی کے ستم اب مجھ سے اٹھائے نہیں جاتے۔"

"آج کیا بات ہے۔ میں نے اس سے پہلے تو تمھیں کبھی اس قسم کی باتیں کرتے سنا نہیں ——— ماجرا کیا ہے۔ کچھ کہو گی بھی" صالحہ نے شہناز کے سرخ گالوں کو چوما۔

"اونہہ۔ ماجرا" شہناز نے میز پر رکھی ہوئی کتابوں کو گھورتے ہوئے کہا "کہا نا کہ بس زندگی سے اکتا گئی ہوں ——— اچھا چلو تھوڑی دیر پائین باغ میں تفریح کریں ——— نرم ہوائیں دماغ کو کچھ سکون تو پہنچائیں گی" یہ کہہ کر وہ اٹھی ہی تھی کہ صالحہ نے پکڑ کر اسے پھر سے کرسی پر بٹھا دیا۔

"میری جان کی قسم" اس نے ٹھیٹ نسوانی انداز میں کہا "تمھیں آزردہ دیکھ کر میرا دل نہیں کہتا کہ تفریح کروں۔ دل تڑپ رہا ہے کہ تسلی بخش گفتگو سے تمھارا دل بہلاؤں اچھا کیا تم نے کسی سے محبت......"

"تم نے مجھے پھر سے ایک عجیب کشمکش میں ڈال دیا" شہناز نے جواب دیا "خدا کے لئے یہ باتیں چھوڑو کہیں پھر پرانے جذبات عود نہ کر آئیں۔ اور پھر گزرے ہوئے واقعات کی تجدید نہ ہو جائے تمھاری قسم! ذرا مجھے پائین باغ میں چلی جانے دو"

"سمجھ گئی" صالحہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا "تو خیر تم نہ کہو ——— مگر یاد رکھو ——— نہ مانو گے تو مٹ جاؤ گے"

"اور پھر میٹھے ہی اس لئے ہیں" شہناز نے گویا عالم نا امیدی میں کہا "حزن و یاس ہماری سرشت ہی میں لکھے ہیں ——— اری تم کیا آئی ہو منانے"

"اچھی بہن شہناز" صالحہ نے شہناز کی پیشانی چومتے ہوئے کہا "اس سے غیریت جسے تم اپنا جانتی ہو۔ اس سے پردہ جس کی تم نے کبھی بے اعتمادی کا گمان تک نہیں کیا۔ اس سے حجاب جس کی رفاقت پر تمھیں ناز ہے ———"

"درد بھرے نالے سن کر کیا کرو گی صالحہ"

"تمھارے دل کا بوجھ ہلکا کروں گی۔ اور میں کر ہی کیا سکتی ہوں ——— یہ لو ننھی اری تو کدھر آنکلی۔"

"امی آپ کو بلاتی ہیں" ننھی نے اپنی گڑیا سنبھالتے ہوئے کہا۔ "اچھا چل میں ابھی آتی ہوں" صالحہ نے جواب دیا ——— ننھی دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر ہو گئی۔ "شہناز۔ آسمان پر چھائے ہوئے نیلے بادل فضا میں ایک عجیب کدورت پیدا کر دیتے ہیں اور جب تک برس نہ جائیں فضا صاف نہیں ہوتی ——— میں کہتی ہوں کہ طبیعت کو ہلکا کرنے کا ایک طریقہ صرف یہی ہے کہ جتنا

ہوسکتا ہے تم رو ڈالو ۔۔۔۔'
'اچھی صالحہ!' شہناز کی آنکھوں سے دو گرم آنسو نکل کر
اس کے گالوں پر بہنے لگے 'دنیا میں اگر کوئی میرا ہوتا! باپ کو تو
مرے خیر برسوں گزر گئے۔ اگر ماں بھی جی جاتیں تو میں اس
جانکاہ صدمے کو ان کی خدمت میں لگ کر بھلا دیتی۔
بھائیوں بہنوں سے تو خدا نے محروم ہی رکھا۔ اب وہ جو خالہ زاد
بھائی بہنیں ہیں تو انھیں مجھ سے کیا دلچسپی۔ میں تو ان کے لئے عذاب
جان ہوں' ایک بلائے ناگہانی ہوں ۔۔۔۔ تمھیں اب لے دے کے
میری رہ گئی ہو ۔۔۔۔ بتاؤ صالحہ ابدی حیات حاصل کرنے کا کوئی
ذریعہ ۔۔۔۔ موت کو دعوت دینے کی کوئی ترکیب ۔۔۔۔ اس دنیا
میں کتوں کی سی زندگی گزارنے سے فائدہ ۔۔ ۔۔ جسے اپنا سمجھ کر
دل دیا تھا۔ وہ بھی بے وفا نکلا ۔۔۔۔' صالحہ نے شہناز کے ساتھ
ٹپ ٹپ آنسو بہائے ۔۔۔۔ 'میرے ماں باپ تھوڑی بہت پونجی
نہ چھوڑتے تو شاید بی اے کا امتحان دینے کے بعد میں کبھی لاہور
کی صورت بھی نہ دیکھتی ۔۔۔ صالحہ پیاری۔ شدت غم مجھے کھائے
جاتا ہے۔ اپنی داستان میں نے آج تک کسی کے آگے بیان نہیں کی۔
لیکن تم مجھے مجبور کرتی ہو تو لو سنو۔ لیکن جانو! میں اسے کسی افسانے
کی صورت بیان کروں گی اور نہ ۔۔۔۔۔ ہاں ۔ صنوبر کے درخت
جب ہوا کے تھپیڑوں سے جھومنے لگتے ہیں تو ان کے ان جھونکوں
سے ایک عجیب رومانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کا ہر سانس
پوشیدہ خواہشوں کو عمل کا جامہ پہنانے کا متمنی ہوتا ہے۔ رعنائی
انگڑائیاں لیتی ہے، دل مچلتا ہے ۔۔۔۔ حسن تڑپتا ہے۔
عشق کروٹیں بدلتا ہے ۔۔۔۔ زندگی کی وہ حسین شام ۔۔۔۔
آہ میں کبھی بھول نہیں سکتی ۔۔۔۔ تمناؤں کی وہ بے چینی
۔۔۔۔ مجھے ہمیشہ یاد رہے گی ۔۔۔۔ اور پھر دل کو ایک سکون
۔۔۔۔ میں کبھی فراموش نہیں کرسکتی ۔۔۔۔ صنوبر کے سایوں
میں میرے دل کے ارمانوں کی تڑپ ۔۔۔۔ کیسے حسین دن تھے
وہ بھی محبت بھرے ارمان بھرے۔ 'ذرا' میں نے شام کی
ڈھلتی ہوئی دھوپ میں ایک سائے کو روکتے ہوئے کہا۔
'ذرا ادھر دیکھئے' میرا دل بیٹھ گیا سائے نے پلٹ کر جواب دیا
'معافی چاہتا ہوں۔ شاید آپ کو دھوکا ہوا ہو خاتون ۔۔۔۔ ہیے میرے
رب! ۔۔۔۔ 'معافی کی خواستگار ہوں' میں نے لجاجت سے
اپنی ساری کی کور کو مسلتے ہوئے کہا' مجھ سے غلطی ہو گئی' نیلے
آسمان! ۔' اوہ شہناز' سایہ میری طرف بڑھنے لگا۔ اور ایک تعجب
خیز مسکراہٹ سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالا۔' تم نے مجھے
شاید ارشد سمجھا ۔۔۔۔ ایں'
'ہاں ۔۔۔۔ نہیں تو ۔۔۔۔ بہرحال آپ مجھے معاف کریں'
میں نے سائے سے التجا کی' میں نے جسارت سے کام لیا'
'ان کتابوں کی قسم' سائے نے اپنی کتابیں میری طرف
بڑھائیں 'تم سے ایسی کونسی غلطی ہو گئی جو معافی مانگتی ہو'
'غلطی! ۔۔۔۔ جی ہاں ۔۔۔۔ فاش غلطی ۔۔۔۔ کر دیجئے
نا معاف'
'تمھاری بھی خواہش ہے تو پھر لو معاف کیا ۔۔۔۔ ارشد
کو ڈھونڈھ رہی تھیں! ۔۔۔۔'
'نہیں تو' میں نے جواب دیا۔' میں ارشد کو نہیں ڈھونڈھ
رہی تھی ۔۔۔۔ صنوبر کے سایوں میں زندگی کے لطیف جذبات کو
ابھار رہی تھی ۔۔۔۔ خیالات میں بلند پروازی پیدا کر رہی
تھی۔ دل کی دبی ہوئی چنگاریوں کو سرے سے مشتعل کرنے کی
سعی کر رہی تھی ۔۔۔۔ نہیں یہ سعی کچھ ناکام ہی رہتی نظر آتی
ہے ۔۔۔۔ اوہ معاف کیجئے گا۔ میں آپ سے یکایک اتنی کھل
گئی ۔۔۔۔ پہلی ہی گستاخی کیا کم تھی جو میں نے ۔۔۔۔' زندگی بھر
میں پہلی بار آج ایسی میٹھی میٹھی باتیں سننے کا موقع ملا ۔۔۔۔

اور تم کہتی ہو کہ یہ گستاخی ہے، غلطی ہے، گناہ ہے ـــــ اگر گناہ بھی ہے تو مقدس، گستاخی بھی ہے تو پاکیزہ، غلطی ہے تو قابل فراموش، ـــــ سایہ مجھ سے قریب ہوتا گیا۔ میرے دل کی دھڑکن ایک نامعلوم خیال کے تحت تیز ہوتی جارہی تھی ـــــ میرے مالک!۔

'شہناز ـــــ' ایک دبی ہوئی آواز فضاء میں گونجی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے غیرارادی طور پر اپنے بڑے بڑے ہاتھ میرے برہنہ بازوؤں پر رکھ دیئے ـــــ ایک پھریری سی میرے جسم نے محسوس کی ـــــ میں بدستور اپنی آسمانی رنگ کی کور کو مسل رہی تھی ـــــ ہ

گو بجتے ہیں شباب کے نغمے
مستیٔ بے حساب کے نغمے

افق مغرب پر سورج کی سرخ ٹکیہ پیام وداع دے رہی تھی۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے دل اور دماغ میں ایک تازگی سی پیدا کررہے تھے۔ اور سائے ڈھل رہے تھے۔ او خدا کیسا دل کو موہ لینے والا منظر تھا ـــــ صنوبر کے درخت اسی نزاکت کے ساتھ جھول رہے تھے۔

'کیسی حسین شام ہے ـــــ' اظہر نے فرحت بخش ہواؤں کے نرم تھپیڑوں سے متاثر ہو کر کہا ـــــ

"حسین ترین" میں نے جواب دیا ـــــ اور میری نظریں خود بخود اٹھ گئیں ـــــ دوچار ہوئیں ـــــ ایک عالم مدہوشی تھا ـــــ ایک حسن پوشیدہ بے نقاب ہورہا تھا ـــــ اور پھر یکایک دونوں کی نظریں جھک گئیں ـــــ ع

نیچی نظروں میں کیا نہیں ہوتا ـــــ
اس دل کے تصدق جو محبت سے بھرا ہو
اس درد کے صدقے جو ادھر بھی ادھر بھی

زندگی کا ساز چھڑ گیا۔ دل کی وادیوں میں مسرت کے نغمے گونجنے لگے۔ اور ناامیدیوں کا گھٹا ٹوپ اندھیرا انبساط اور خوشی کی روشنی میں تبدیل ہونے لگا ـــــ۔ رباب حیات کا تار تار والہانہ انداز میں کرشمے دکھا رہا تھا ـــــ آہ کتنی مسرت زا شام ـــــ شہناز ـــــ' اظہر کہنے لگا ـــــ ذرا رک رک کر '.... پیاری ..... شہناز ـــــ محبت کے گرم سانس اثر کئے بغیر نہیں رہتے۔ محبت لافانی ہے۔ انسانی حیات کی ہر خزاں رسیدہ شام محبت ہی کی بدولت صبح بہاراں میں بدلتی ہے ـــــ محبت ہی راجا ہے اور محبت ہی پرجا ـــــ محبت ہی کی کڑی خالق و مخلوق کو ایک دوسرے سے قریب تر کرتی ہے ـــــ محبت ہی ایک ایسا جذبہ ہے جو دلوں کو گرماتا ہے۔ خالق عالم نے اگر محبت کی تخلیق نہ کی ہوتی تو حیات انسانی کا وجود ہی نہ ہوتا۔ اور اگر ہوتا بھی تو محض بے کار ـــــ ایک سوکھے ہوئے تالاب کی طرح بے سود۔ پت جھڑ درختوں کی طرح بے فائدہ۔ ـــــ یہ صنوبر کے درخت جو مستانہ وار جھوم رہے ہیں محض ایک چنگاری سے مشتعل ہو کر ـــــ وہ محبت کی چنگاری ہے' اپنے خالق کی محبت! کائنات کا ذرہ ذرہ خود میں ایک وسعت لئے ہوئے؛ ساقی عالم کی محبت میں سرشار ہے ـــــ کہو شہناز ـــــ کیا تم اپنے دل کو اس نعمت غیر مترقبہ سے مملو نہیں پاتیں ـــــ کیا تم میں محبت کا خیال کروٹیں نہیں لیتا ـــــ کیا تمہارا دل محبت کی غیر فنائیت سے متاثر نہیں۔'

'اظہر ـــــ تم میرے دل کی خوابیدہ خدمات کو جگا رہے ہو ـــــ مجھے ایک ایسی غیر فانی دنیا میں گھسیٹ رہے ہو جہاں کا ذرہ ذرہ محبت ہی کے نشے میں چور ہے جہاں زندگی کی ساعتیں محبت ہی کے حسین آغوش میں کٹتی ہیں ـــــ جہاں حسن ہے، محبت ہے، عشق ہے اور پھر دل ہیں ـــــ عشق کی

گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے، محبت کی منور شعاعوں سے روشن
—— حسن کی نگاہوں کے گھائل —— ہاں اظہر آج کی شام
نہایت حسین ہے —— اتنی حسین جتنے —— یہ محبت کا
ایک دھندلا تصور مجھے اظہر کے قریب ڈھکیل رہا تھا۔

" ہاں تم روشن ضمیر ہو شہناز، اظہر کے خوبصورت ہونٹوں
پر تبسم کھیل رہا تھا —— آج سے ٹھیک ایک سال پہلے کا وہ
دن مجھے اب تک یاد ہے جب تم نے اپنے تیر نظر سے مجھے محبت کے
دیوتا کی دنیا میں لا بسایا تھا۔ مجھے وہ دن اب تک یاد ہے جب
تم پہلی مرتبہ ہمارا کرکٹ میاچ دیکھنے آئی تھیں —— اُف
کیسا دن تھا وہ بھی —— آسمان پر بادل چھائے ہوئے۔
ہلکی ہلکی پھوار، سرد ہوائیں، ہماری جیت کے آثار —— اور
سب سے بڑھ کر تمہارا خوشی میں دو تالیاں بجانا۔ وہ مسرت اور
شادمانی میں اچھلنا کودنا —— مجھے اب تک یاد ہے وہ دن
شہناز —— لیکن ارشد —— شاید، یہ کہہ کر وہ رک گیا ——
اور دو آنسو گہر آبدار کی طرح اس کی عینک کے نیچے سے ہوتے
ہوئے اس کے گالوں پر آٹھیرے —— میں بیتاب ہو گئی۔

' بخدا اظہر، میں نے اس کے آہنی بازوؤں کو اپنی
گرفت میں لے لیا، ارشد میرا بھائی ہے۔ چھوٹا بھائی ——
سچ جانو —— وہ میرا خالہ زاد بھائی ہے۔ میں اس کے ساتھ
بطور —— بطور اس کے نگران پھرا کرتی ہوں —— اپنی
خالہ کے حکم سے —— اسی دن سے یہ دل تمھارے بے پناہ
حسن اور محبت کے ایک ہی حقیقی جذبہ سے متاثر ہے ——
کہو کیا تمھیں یقین نہیں آتا —— آہ کاش میں اپنا دل نکال کر
تمھارے آگے رکھ سکتی ——،

' اچھی شہناز' اظہر نے کہا —— اور پھر ہم دونوں
ایک دوسرے سے قریب ہو گئے۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ
میری زندگی مسرت و انبساط سے مخمور ہے۔

چودھویں رات کا چاند ضو فشانی کر رہا تھا۔ اور اس کی
روپہلی کرنیں صنوبر کے درختوں سے چھن چھن کر گنگا جمنی منظر
پیدا کر رہی تھیں۔ ستارے آسمان کے سیاہ پردے پر ایک
عجیب شان سے جھلملا رہے تھے —— ع

زندگی کی ہائے وہ اک رات کیا پر کیف تھی

' یہ ہماری محبت کی نشانی' اظہر نے میری پیشانی کو چوم
چوم لیا۔ میں ندامت اور خوشی کے بے پناہ سیلاب میں ڈوب گئی۔
' تم نے آج تک مجھ سے شرارت کی۔ میں اب تک خاموش رہا کہ
مبادا تمھاری دل آزاری ہو۔ اور ابھر آنے والے جذبات کے
ایک ریلے کو دل میں روکے رکھا —— تم نے بھی بھڑک اٹھنے
والے ان شعلوں کو دبائے رکھا —— میں تخیلات میں گم رہا۔
اور تم اندر ہی اندر میرے تخیلات کی ان سوکھی ہوئی کھیتیوں کی
آبیاری کرتی رہیں —— لیکن آج ——'

' آج کا دن دنیا بھر کے لئے مسرت کا دن ہے، ہم دونوں
ایک زبان ہو کر بول اٹھے۔ ' لیکن نہیں —— صرف ہماری
ہی دنیا کے لئے مسرت کا دن ہے،' اظہر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔
' ٹھیک ہے —— اور آج کی شام بھی نہایت حسین
ہے۔ بہت حسین' وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا ؎

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے دل دل ستاں روانہ ہوا

ہماری محبت کا رشتہ قایم رہا اور سچ کہو تو یہ کڑی روز
بروز مضبوطی ہی پکڑتی جاتی تھی۔ کالج کی کیف آور اور مست
فضاؤں میں ہماری محبت کی صدائیں گونجنے لگیں۔ رنج و غم کے
بادل بہت جلد چھٹ گئے۔ اور دلچسپیاں بڑھتی گئیں ——
اب امتحانات کے دن قریب آ چکے تھے —— لیکن ہم دونوں

محبت میں ایسے مست، عشق کی فضا میں ایسے مگن اور مسرت
آمیز خیالات کے سیلاب میں ایسے بہے جا رہے تھے کہ نہ ہمیں
امتحان کی فکر تھی اور نہ کامیابی کا خیال ـــــ اظہر نے تو خیر کچھ
تیاری کی بھی تھی۔ لیکن میری یہ حالت کہ جیسی کوری کالج میں
داخل ہوئی تھی ویسی کی ویسی ہی رہی ـــــ بادلِ ناخواستہ
امتحان تو دے دیا ـــــ دیکھو کیا ہوتا ہے ۔

میری اس حالت کو دیکھ کر چو طرف سے اظہارِ تاسف
ہونے لگا۔ اور ہر ایک کو مجھ سے ہمدردی ہوگئی ـــــ صبیحہ نے
اپنی زرین نصیحتوں سے مجھے واپس اس راستہ پر لانا چاہا جہاں سے
میں نے اس سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس مقام
سے میرے لئے کوئی اور راستہ تجویز کرے ـــــ لیکن پیاری
صالحہ! سچ جانو۔ صبیحہ کی باتیں صبیحہ کی ہمدردانہ گفتگو، اس کی
پاک محبت۔ اس کی نصیحتیں، کوئی چیز کام نہ آسکی۔ میں نے
اتنی لانبی مسافت طے کرلی تھی کہ واپس ہونا مجھے دوبھر معلوم
ہو رہا تھا۔ خوش گوار سفر تھا ـــــ آہ کتنا خوش گوار سفر
ـــــ صالحہ سچ کہتی ہوں استادوں کی گھرکیاں اور پرنسپل
صاحب کی شفقت آمیز تقریریں بھی ہماری راہِ محبت میں
حائل نہیں ہو سکیں ۔

اس واقعہ کے پندرہ بیس روز بعد ـــــ میں اپنے
کمرے میں بیٹھی اظہر کی خیالی تصویر اپنی نظروں کے آگے کھینچ رہی
تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا ـــــ میرا تنفس تیز ہوگیا اور
میں سمجھی کہ ضرور اظہر ہے۔ میں نے اندر سے دریافت کیا کون
ہے، جواب آیا "میں صبیحہ"

تب میں نے ٹھنڈا سانس لیا۔ اور اٹھ کر دروازہ کی طرف
بڑھی۔ "صبیحہ پیاری" میں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "کہاں
تھیں ، اتنے دنوں سے'۔ 'اری میں تو اپنے ماں باپ کے
گھر گئی تھی ـــ' اس نے کہا 'میری یہاں اور کیا دلچسپی ہو سکتی
ہے۔ کسی کو اپنا بنا لیتی تو ایک بات بھی تھی۔" اور مسکراتے ہوئے
میری طرف کنکھیوں سے دیکھنے لگی 'ہاں تو اندر آسکتے ہیں'؟

'کیوں نہیں' میں نے جواب دیا "دیدہ و دل فرشِ راہ"

'اس خیال سے پوچھ لیا کہ کہیں تمہارے کاموں میں
میری طرف سے خلل نہ آجائے' اس نے کمرے کا دروازہ بند
کیا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

" نوج! تمہیں تو ہمیشہ مذاق ہی سوجھتا ہے۔ کیسے
کام' کاہے کا خلل'۔

"یہی شاید کسی کو خط لکھ رہی ہوں گی اور......"

"بس خاموش رہو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "یہاں
تو بنی ہے اور تمہیں بنانے کی سوجھی ہے"

"ارے اللہ" اس نے اپنی کرسی میرے قریب کی۔

'اتنی سی بات پر اتنی خفگی۔ اچھا لو ہم آئندہ سے کبھی.....'

"کبھی کیا کرو گی"

" کبھی اظہر میاں کا نام نہ لیں گے' اور وہ کھلکھلا کر ہنس
پڑی۔ "سچ کہتی ہوں شہناز! ـــــ اب کبھی جو اس مردوے
کا نام ـــــ لیا تو جو چور کی سزا وہ میری سزا!"

" ہٹاؤ بھی صبیحہ" میں نے کہا "کیا بکواس لئے بیٹھی ہو"

اب اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور مجھ سے قریب
ہوگئی "شہناز پیاری!"

اس نے کہا 'ایک بات بتاؤ گی ـــ پوچھوں! ـــ
یہ تمہیں صرف اوقات میں کیا لطف آتا ہے؟'

" صرف اوقات کیا؟" میں نے دریافت کیا۔

" اور پھر نہیں تو کیا؟ اس نے جواب دیا، یہ محبت اور

یہ عشق و تعشق کا جنوں ......'
"ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں:"
"اونہہ۔ تم تو پوری فلسفی بن گئی ہو ——"
"خاموش رہو صبیحہ:"
"شہناز۔ اگر اتنی محبت تمھیں خدا سے ہوتی تو شاید تمھارے لئے جنت کے سارے دروازے کھل جاتے —— اور پھر تمھارے طفیل میں ہم گنہگاروں کی بھی عید ہو جاتی۔"
"صبیحہ تم ناصح نہ بنو' میں نے ذرا تیز ہو کر کہا "مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔'
"تو گویا تم اس بت کافر کا پوجنا نہیں چھوڑو گی:
میں نے کہا' ہاں! ——
'چھوڑوں گی میں نہ اس بت کافر کا پوجنا:
"چھوڑے نہ خلق گو تجھے کافر کہے بغیر؟" اس نے کہا۔
"نہ چھوڑوں گی۔ نہ چھوڑوں گی۔ ایک نہیں ہزار مرتبہ کہہ دیا۔"
"شہناز۔ بچوں کی سی باتیں نہ کیا کرو' صبیحہ آہستہ آہستہ سنجیدگی اختیار کر رہی تھی' ساری دنیا تمھیں کیا کہے گی۔ اپنا منہ کالا کرنے سے کیا فائدہ۔ کالج کے جس کونے میں جاؤ تمھارے ہی چرچے۔ ہر کس و ناکس کی زبان پر تمھارا ہی نام —— ذرا اپنی حیثیت کا تو خیال کرو۔'
'بہت خیال کر چکی' میں نے کہا۔' زیادہ نہ کہو'
'تمھاری قسم۔ خفا نہ ہو شہناز۔ میں تمھارے ہی بھلے کے لئے کہتی ہوں۔'
'میں اپنے بھلے برے کو خوب سمجھتی ہوں صبیحہ:'
'یہ دیکھو کہ کالج کے سارے اساتذہ اور استانیاں تم سے ناراض۔ ساری لڑکیاں تم سے خائف اور تمھاری صحبت سے کنارا کش —— لڑکے تو خیر ——' اس جملے پر وہ مسکرا پڑی اور میں بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ پھر اس نے سنجیدہ ہو کر کہا' یاد کرو وہ دن جب تم نے پہلی مرتبہ کالج کے حدود میں قدم رکھا تھا۔ کیسی بھولی بھالی لڑکی تھیں تم، نہ کسی سے واسطہ نہ کسی سے تعلق۔ تم تھیں اور تمھاری کتابیں۔ اب تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ بی۔اے کا امتحان دینے کے لئے بھی تم نے کچھ تیاری نہیں کی۔ یہ گن ٹھیک نہیں بہن۔ یاد رکھو اگر تم میرا کہا نہ مانو گی اور اس نگوڑے اظہر کی محبت سے ......'
'خاموش رہو صبیحہ' میں نے ترش رو ہو کر کہا' یہ کیا بات ہے کہ تم ہمیشہ اظہر کو کوستی رہتی ہو۔ اس نے تمھارا کیا بگاڑا۔'
"اور کیا بگاڑتا" صبیحہ نے جواب دیا "تمھیں جو تباہ کر دیا۔"
'تو تمھیں کیا اس سے؟'
'میری ایک دنیا لٹ گئی' اس کی آواز گلوگیر ہو گئی' تم نہیں جانتیں شہناز مجھے تم سے کتنی الفت ہے۔ تمھاری بدنامی کے چرچے میرے دل پر ٹھیس لگاتے ہیں۔ میں جب سنتی ہوں کہ میری شہناز کو فلاں نے یوں کہا اور فلاں نے اسے بری نظروں سے دیکھا تو میرے دل پر جیسے گھونسا لگتا ہے —— اور تم کہتی ہو کہ تمھیں کیا اس سے! ——
—— خیر بہن دنیا ہی بے وفا ہے۔ تم سے کا ہے کا گلہ —— اچھا لو میری باتوں سے تمھیں تکلیف پہنچتی ہے تو میں خود یہاں سے چلی جاؤں' میری آنکھوں میں بھی دو آنسو چھلک آئے —— وہ اٹھی اور دروازے کے قریب گئی۔ لیکن مجھے سسکیاں بھرتی دیکھ کر رک گئی۔' رو نہیں شہناز —— رونے کا کون موقع ہے۔ آئندہ سے تم کبھی مجھے ناصحانہ گفتگو کرتے نہیں سنو گی' اس نے اپنی دستی سے میرے آنسو پونچھے اور

جانے ہی کو تھی کہ باہر سے ایک شور و غل اور دوڑنے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔

"یہ کیا ہو گیا" اس نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا "اری کیا ہو گیا شاما ــــــ" میں بھی کھڑکی کے قریب آ گئی۔

"ٹکر ہو گئی ہے موٹر سے" شاما نے نیچے سے بہ آواز بلند کہا۔ "کس کی ؟"

"اظہر کی" بلند آسمان! اظہر کا نام سنتے ہی میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ ہاتھ میں رعشہ پڑ گیا۔ اور نہ جانے کس حالت میں بھاگتے ہوئے دوسری منزل سے میں میدان میں اتر آئی۔ دنیا کی ساری چیزیں مجھے تاریک نظر آ رہی تھیں۔ اور صرف اظہر کا تصور میرے دل و دماغ پر مسلط تھا ــــ میں اس مجمع کو چیرتی پھاڑتی جو اظہر کے اطراف جمع تھا وہاں پہونچی ــــ آہ میرا اظہر! صالحہ ــــ وہ کس حالت میں پڑا تھا ــــ میں شاید بیان نہ کر سکوں ــــ خون میں لت پت ــــ آنکھیں آسمان سے لگی ہوئیں۔ زبان پر اس بے وفا شہناز کا نام۔

"شہناز۔ مجھے یاد رکھنا" یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔ اور اس کی روح زندگی کے غیر فانی آسمانوں کی سیر کر رہی تھی۔

"آہ میرے اظہر" اور میں اس پر گر پڑی۔ اس کے بعد مجھے خود پتہ نہیں کہ کیا ہوا ــــــ

"چار چھ گھنٹے بعد جب میری آنکھیں کھلیں تو میں نے خود کو ارشد کے کمرے میں لیٹا پایا۔

"بہن شہناز" ارشد نے میرے چہرے سے اپنا چہرہ قریب لا کر کہا۔ "کیسی ہے طبیعت؟" دو گرم آنسو میرے چہرے پر سے ہوتے ہوئے نیچے گرے اور گر کر زمین میں جذب ہو گئے۔

صبیحہ پلنگ کے دوسرے بازو پر بیٹھی اپنے آنسو پونچھ رہی تھی ــــ

"آہ او حسین شام" شہناز کہنے لگی

یہ کیا دستور ہے یارب تری آباد دنیا میں ہر کوئی برباد کرتا ہے کوئی برباد ہوتا ہے

صالحہ نے اپنے دامن سے آنسو پونچھ کر کہا۔

"بہت ارمان ایسے ہیں جو جی کے جی میں رہتے ہیں"

"آپ کو امی کب سے بلاتی ہیں آپا جان" ننھی نے پیچھے سے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ "نہیں آئیں گی آپ؟" ــــ "چل ننھی چل"

عزیزہ رضوانہ

آئیں گے

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

یہی نگاہ، یہی شوخیاں، یہی انداز — یہی جمال، جبیں پر یہی تجلیٔ ناز!
اسی طرح سے سرِ دوش رقصِ زلفِ دراز — قدم قدم پہ بتاتے ہوئے حیات کا راز
ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

نقاب اٹھائے ہوئے موجِ رنگ و بو ہو کر — چمن فروش بہاروں کی آرزو ہو کر
جہانِ شوق میں عنوانِ جستجو ہو کر — حیاتِ نو کا طرب آفریں لہو ہو کر
ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

یہی ادائے جوانی، یہی غرورِ جمال — دماغِ شاعرِ فطرت میں اک لطیف خیال
چمن کی چاندنی، راتوں میں رقصِ بادِ شمال — نسیمِ صبح کا عالم، شعاعِ مہر کا حال
ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

لبوں پہ نورِ تبسم، نظر میں رازِ شباب — ہوا کی رو میں مچلتا ہو جس طرح سے گلاب
شمیمِ صبح سے مہکی ہوئی بہار کا خواب — فضائے شام میں گاتی ہوئی روانیٔ آب
ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

اسی خیال میں تھا میں کہ آپ آئیں گے — چھپے ہوئے تھے جو اسرارِ شوق پائیں گے
مرے تصورِ رنگیں پہ آ کے چھائیں گے — نشاطِ روح مری روح میں سمائیں گے
ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

خدا سے مانگ سکا میں نہ عشرتِ کونین — مرے نصیب میں تھی آج نعمتِ کونین
بتاؤں آپ کو کیا ہے حقیقتِ کونین — اس اک نگاہ پہ قربان دولتِ کونین
ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

علی اختر

تحفہ

دنیا ساری کوزے میں دریا بند کرنے پر اکڑتی ہے تو میں نے سوچا لاؤ میں گلاس میں ساری دنیا کو بند کر دوں، اس میں بھلا خاکسار کا تو کیا کمال ہوگا، کہئے گلاس کی بات کہ دیکھنے میں کچھ بھی نہیں لیکن سچ پوچھئے تو یہی سب کچھ ہے، اور اسی سے سب کچھ ہے۔ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھئے گا، فی الحال تو صرف اتنا دیکھ لیجیے کہ ایک باپ، ایک بیٹا، اور ایک بھانجی ہی کا اس سے کتنا تعلق ہے، رہے باقی اور تو پھر کبھی سہی — باپ تھے حکیم صاحب، بیٹے تھے سراج میاں، اور بھانجی تھیں صفیہ

حکیم صاحب یوں تو حکمت کے لحاظ سے بھی برے نہ تھے، لیکن حق یہ ہے کہ حکمت سے زیادہ وہ اپنی وضعداری کیلئے مشہور تھے، اسباب مایحتاج کا جہاں تک تعلق ہے فطرت نے حکیم صاحب کو نوازنے میں ذرا بھی کوتاہی نہ کی تھی۔ اس پر مستزاد ان کا خاندانی وقار، وافر اولاد، فکرِ معاش سے بے نیاز، قدیم روش کے آدمی، گو جدید اثرات سے بھی بیگانہ نہیں، سلیم الطبع پیرِ متقطی، قبیلہ پرور، مذہب پرست، غرض ایسی ہی کئی خصوصیات تھیں کہ اپنے حلقہ میں دور دور تک وہ ایک مثالی حیثیت رکھتے تھے اور اس پر انہیں ناز بھی تھا کہ سب گھر تو بیٹیوں کو پیام جاتا ہے، اور ان کے گھر بیٹیوں کو پیام آتا تھا۔ چونکہ اساس اخلاقی میں تعلقات ازدواجی کو وہ بہت دخیل سمجھتے تھے۔ اور لڑکیاں سستی اور اچھی ملتی تھیں، ایک چھوڑ تین تین بیٹیوں کی شادی انھوں نے مسیں بھیگتے کر دی۔ اک رہ گئے تھے ان کے چھوٹے صاحبزادے، ان سے بڑی صاحبزادی اور سب سے چھوٹی بھانجی کہ دوسروں کے دیکھتے ان کی شادی کو دیر لگ گئی تھی، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ خدانخواستہ ان میں کوئی کھوٹ کسر تھی، بلکہ بیٹی کے لئے اچھے سے اچھے بر کی تلاش تھی، اور بیٹا بھانجی حکیم صاحب کے گھر کی عام روش کے خلاف آزاد خیال و روشن دماغ واقع ہوئے تھے، صاحبزادے نے صاف انکار کر دیا کہ گریجویٹ ہونے سے پہلے وہ شادی نہ کریں گے، اور بڑی بیٹی سے پہلے چھوٹی بھانجی کی شادی یوں بھی بے موقع تھی، اس لئے انھوں نے ان ہی کی مرضی پر ان کی شادی چھوڑ دی تھی، یوں بھی یہ دونوں انھیں ضرورت سے زیادہ عزیز تھے، بھانجی یوں کہ مرحوم بہن کی واحد یادگار تھیں، اور بیٹے کا تو کیا پوچھنا، زر سے قسمت لکھا لائے تھے، پہلے تو کئی اولادوں کے مرنے کے بعد پیدا ہوئے پھر اس دن پیدا ہوئے جس دن اُن کے خاندان کے سب سے بڑے بزرگ کوئی سراج السالکین پیدا ہوئے تھے، اور جس دن یہ پیدا ہوئے اُسی دن ان کے پاس منصب کے اجراء کے احکام خلاف توقع آئے جس کے لئے وہ ایک عرصہ تک لڑ، تھک کر بیٹھ رہے تھے، اس پر حکیم صاحب کا گمان کہئے یا خدا کی شان کہ ان کی پیدائش کے بعد سے حکیم صاحب کی حکمت کو بھی بہت فروغ ہوا، پھر ان آثارِ رشد و ہدایت سے مسقف تھے جو ہمیشہ اس عمر کے بچوں سے غیر متوقع ہوتے ہیں، تقریباً ہر امتحان میں اول آنے ہر دفعہ انعام لانے، اور جو بڑی جماعتوں میں آئے تو وظیفے پانے، ایسی صورت میں ان کے جتنے اللے تللے نہ ہوتے کم تھے۔ اور یہی باعث تھا کہ ان کا اصلی نام تو کبھی غصہ میں ہی یاد آتا یا بیگانوں میں، ورنہ اتنے لاڈ کے نام مقرر تھے کہ شناور ناموں میں اب تھوڑی سی کسر باقی رہ گئی تھی، کبھی سراج میاں، کبھی سراج پاشا، کبھی منصبدار، کبھی چھوٹے میاں، کبھی چنو میاں غرض اتنے میاں کہ اس کے بعد کسی میاں کی آرزو باقی نہ رہی۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود جیسے جیسے دن گزرتے گئے حکیم صاحب محسوس کرتے گئے کہ ان کے لاڈلے بچے بے راہ ہوئے جاتے ہیں، یا تو یہ خود جدید وضع کے لوگوں سے اتنی نفرت رکھتے تھے کہ اسی سبب سے وہ اپنے مرشد کے سوا بہت کم کسی سے ملتے تھے یا یہ ہوا کہ خود ان کا لڑکا لڑکی فیشن کی تپلی بننے لگے، یہ گویا ایک طرح قدرت نے ان کی رعونت کی سزا دی تھی، آدمی دوسروں کے لئے تاکید کرتا ہے، اور اپنے لئے تاویل، جہاں یہ اوروں کو تنبیہ کیا کرتے تھے اب اپنے لئے تاویلیں کرنے لگے کہ ابھی تو بچپن ہے، سمجھ آئے گی تو یہ باتیں جاتی رہیں گی، پھر جو اصولِ اساسی میں وہ ان سے مختلف نہیں تو وجہ ظاہر کی حد تک شوق کرلیں، اس میں ہرج ہی کیا ہے، غرض اس چشم پوشی سے کہئے یا خبث باطن سے، ان بچوں نے فائدہ اٹھایا اور وہ رنگ نکھارا کہ اہم کیا دسم کے "ماڈل" معلوم ہونے لگے، اب وہ پچھتانے لگے کہ انھوں نے بیجا کیا کہ جدید تعلیم کے ڈھرے لگا چھوڑا جس میں اور کچھ ہو نہ ہو تربیت کا تو نام نہیں، اور جس تعلیم سے تربیت نہ ہو اندھے کی آنکھوں پر عینک لگانے کے مساوی ہے سراج کالج میں کیا آئے اپنے آپ کو پروفیسر سمجھنے لگے، اور صفیہ ہائی اسکول میں کیا آئیں اپنے آپ کو گویا یونیورسٹی سمجھنے لگیں، اور کچھ انھوں نے سیکھا نہ سیکھا، یہ تو لوگوں نے دیکھا کہ ان کے مزاج میں نزاکت، طبیعت میں نفاست، کمر میں لچک، چال میں مٹک اور بات میں چٹک پیدا ہوگئی ہے، اور اگر واقعات نے ساتھ دیا تو علم و فضیلت کے لحاظ سے وہ روشن خیال عورتوں کے ادعائے "مطابق" مردوں کے دوش بدوش "چلیں نہ چلیں، لیکن رعونت و حماقت کے اعتبار سے "مردوں کے پا بدوش" چلنے میں بھی دریغ نہ کریں گی، یہ تھے حکیم صاحب کے خیالات ان کے متعلق، اور اس کی تقویت دینے کے لئے ان لونڈوں نے اسباب بھی عجیب پیدا کرلئے، صفیہ نے نفاست کی انتہا یہ کردی کہ گھر میں اپنے لئے ایک کمرہ علٰحدہ مخصوص کرلیا، جس میں سوائے بہن کے اور کسی کا آنا انھیں گوارا نہ تھا، اور جانے کس سہیلی کو انھوں نے ایسا کرتے دیکھ لیا کہ خود بھی اپنے پانی کا علٰحدہ انتظام کرلیا، ایک نہایت خوبصورت صراحی منگائی، اس پر ریشمی جالی چڑھائی ماموں سے کہہ کر کوزے اور گلاس کا چاندی کا کیس تیار کروایا، اور اپنے کمرہ میں الگ رکھنے لگیں۔ یہ باتیں حکیم صاحب جیسے آدمی کو فطرتاً تلخ لگنی چاہیے تھیں، اور واقعات نے انھیں تلخ تر کردیا۔

جس طرح عموماً دو مشترک صفات کے طالب علموں میں چھیڑ ہوا کرتی ہے، سراج اور صفیہ میں بھی ہوتی رہتی تھی۔ ایک دن جو سراج صفیہ کے کمرہ میں داخل ہوا صراحی گلاس کو دیکھتے ہی قریب جاتے ہوئے بول اٹھا "اوہو! یہ ٹھاٹ! کہاں سے چرا لائیں سفی؟"

بہن بھی بیٹھی تھیں، بولیں "ارے بھئی، کہیں تم ہاتھ نہ لگانا، ورنہ یہ بگڑ جائیں گی، انھوں نے بڑے اہتمام سے اپنے پانی کا انتظام الگ کرلیا ہے!"

"تو پھر ہم بھی پی نہ دیکھیں کہ انتظام ٹھیک ہے یا نہیں!"

صفیہ انھیں "دیکھئے چھوٹے میاں، براہ کرم آپ یہاں پانی پینے کی تکلیف نہ کیجئے!"

"کیوں بھئی، کیا یہ نہر فرات کا پانی ہے!! اور کیا خدا نخواستہ آپ کے دشمن کربلا میں بیٹھے ہیں!! اب رہا میری تکلیف کا، سو بھا! پانی پینے میں بھی کوئی تکلیف ہوتی ہے، یہ تو عین

ٹھنڈک کی بات ہے! اور پھر ایسی صراحی گلاس سے کہ جی چاہے، پانی کو چھوڑ کوزے گلاس ہی کو پی جائیں!"

یہ کہتے ہوئے اس نے گلاس میں پانی ڈالا، صفیہ چھیننے کے لئے جھپٹیں، اس وقت تک وہ ایک دو گھونٹ پی چکا تھا، صفیہ نے جھنجھلا کر فریاد اٹھائی "دیکھئے بواجی، آپ انھیں جتا دیجئے!"

بات تو کچھ بھی نہ تھی، لیکن ضد نے رنگ دیا۔ بہن نے کہا "سراج پاشا، بھلا یہ بھی کوئی ضد ہے کہ کوئی آپ سے کترائے، اور آپ اس کے سر ہوئے جائیں۔ سنا ہے ان کی استانیوں نے تعلیم دی ہے کہ ایک کا پانی دوسرا پئے، نہ ایک کے گلاس میں دوسرا پئے، یہ صحت اور صفائی دونوں کے خلاف ہے، اس لئے انھوں نے الگ انتظام کر لیا ہے!"

ایک قہقہہ مارتے ہوئے "بھئی، صفائی کی بھی ایک ہی کہی، میں سن چکا تھا کہ اسکول جا کر، تعلیم کا نام تو سات، انھوں نے یہ نئے چوچلے سیکھے ہیں، اس لئے آج صبح جب یہ نہیں تھیں، میں نے اسی صراحی میں، اسی صفائی کے خیال سے ناک چھینک دی تھی!"

صفیہ کراہت و غصہ کے مارے آپے سے باہر ہو گئیں، گو تاڑنے والے یہ بھی سمجھ سکتے تھے کہ اس غصہ کی تہ میں کچھ گدگدیاں بھی چھپی ہیں، تن تناتی ہوئی گئیں، صراحی مانجھی، غلاف دھویا، گلاس مانجھا، اور پھر سے پانی بھر لائیں۔

سراج میاں نے فیصلہ سنایا "بھئی، ہم تو آج سے اسی برہمنی کا پانی پیا کریں گے، واقعی صفائی کا بہت خیال رکھتی ہے!"

جی منہ دھو رکھئے!

خیر، یوں ہی سہی!

بات تو محض وقتی اور معمولی تھی، لیکن دونوں کی ضد نے اسے ایک مستقل چھیڑ کی صورت دے دی، صفیہ جتنی چڑتیں، سراج اتنے ہی ان کا پانی پینے پر تلتے، اور دونوں میں جنگ چلتی، حتی کہ ایک دن دسترخوان پر بھی پانی پینا چھوڑ دیا، ماما نے جو پانی پیش کیا کہا "نہیں بھئی، ہمارا پانی تو وہاں (صفیہ کے کمرے کی طرف بتاتے ہوئے) رکھا ہے! یہ پانی پینا صحت اور صفائی دونوں کے خلاف ہے!"

"ارے، لاحول ولا، برف بھی بھلا کوئی پینے کی چیز ہے، میں تو (صفیہ کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے) انگارے ڈال کر پیتا ہوں، انگارے!"

یہ کہا اور صفیہ کے کمرہ کی طرف چلے۔ صفیہ چڑ چڑا کر رہ گئیں، لیکن ساتھ ہی انھوں نے ماما کو بھی چپکے سے کچھ اس طرح دیکھا، جیسے بس چلے تو اسے کچا ہی کھا جائیں، اور جب سراج پانی پی نکلے تو یہ الجھتے ہوئے انھیں، کوزے گلاس کو دھویا، اور پھر سے پانی بھر دیا۔ یہ بھی ایک عجیب قسم کا مذاق تھا، اور سبھی کو اس سے دلچسپی ہو گئی تھی، کبھی مزے لیتے، اور کبھی فہمائش بھی کرتے کہ "بھئی پاشا، کسی کو اس طرح دق کرنے سے کیا فائدہ۔ میں سوچتی ہوں کہ آخر تمہاری اور بی بی کی بنتی کیوں نہیں!"

"کہیں ہندو مسلمان کی بھی بنتی ہے امی جان!"

صفیہ ان باتوں سے بظاہر تو بہت جلتیں، لیکن یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ اب وہ پانی کا پہلے سے زیادہ اہتمام کرنے لگیں، جب سے ماما نے برف کی آس دلائی تھی، انھوں نے ہر کھانے سے پہلے گلاس میں برف بھی ڈال کر رکھنا شروع کیا، اور جب سراج میاں پانی پی لیتے تو الگ چیختیں کہ "دیکھئے امی جان، چھوٹے میاں نے میرا برف کا پانی پی لیا!" اب انھوں نے کوزے کا غلاف بھی بدل دیا اور اس پر اپنے ہاتھ سے

ایک نہایت خوبصورت " S " بھی کاڑھ دیا تھا۔

یہ مذاق یا چھیڑ، چھیڑ کی حد تو کافی دلچسپ سہی، لیکن آگے چل کر ایک دن اس نے ایسی خطرناک صورت اختیار کرلی، جس نے حکیم صاحب اور ان کے سارے گھر کی زندگی و تخیلات میں ایک غیر معمولی انقلاب پیدا کر دیا، اور حکیم صاحب وغیرہ کے دلوں کو ایسا دھکا دیا کہ عمر بھر کو توبہ کر لی۔

بات یوں ہوئی، جیسا کہ میں نے کہا ہے، تعلیم اور لاڈ نے جہاں صفیہ کے دماغ کو خراب کر دیا تھا وہاں سراج کے دماغ کو بھی صحیح نہ رکھا تھا، آزادی و خود مختاری کی اسپرٹ نے ان کو بظاہر ایک شتر بے مہار بنا دیا تھا، اس لئے وہ باپ کی ساری پابندیوں اور وضعداری کو ایک خرافات اور رسم ما فات سمجھنے لگے، اس سے باپ روز بروز ناراض ہوتے جا رہے تھے، اس پر غضب یہ ہوا کہ سراج میاں جہاں بیا ڈمنٹن کھیلتے تھے، اسی سے لگا ہوا ان کے کالج کے چپراسی کا مکان تھا، ایک دن گیند اس کے گھر میں چلی گئی، اور یہ بھی بے سوچے سمجھے اسے لانے کے لئے لپکے، چونکہ انھیں معلوم تھا کہ چپراسی انھیں جانتا ہی نہیں، بلکہ بڑی حد تک ان کا فیضیاب بھی ہے۔ جیسے ہی داخل ہوئے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک پلنگ پر بڈھا چپراسی اور اس کے بازو ایک حسین اور نوخیز لڑکی بیٹھی ہے۔ کہتے ہیں کہ نوجوان خون پر پتنگ کی گلٹی بڑا تیز اثر کرتی ہے، لیکن میں نہیں سمجھتا وہ اتنا تیز اثر کرسکتی ہے، جتنا کہ ایک حسین و نوجوان عورت کے نظارے کے بعد عشق کی گولی، ایک تو نوجوانوں کی نظر پھر طالب علمانہ نظر، سراج میاں نے دفعتاً ایک کشش سی محسوس کی، اور ٹھٹک کر رہ گئے، پھر دوسرے ہی لمحے جو انھیں خیال آیا کہ وہ حکیم صاحب کے لڑکے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی، ایک بزرگ چپراسی کے سامنے، تو یک دم سنبھل گئے۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکی چپراسی کی کوئی نواسی، پوتی لگتی ہوگی، لیکن ان کی حیرت کی کوئی حد نہ تھی جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ اس کی بیوی ہے۔

اب التفات کے ساتھ ساتھ ان میں انسانی ہمدردی امنڈ آئی، چنانچہ اس کے بعد سے جب کبھی موقع ہوا انھوں نے اس ہمدردی کا صرف اس پر کرنا شروع کیا۔ طینت میں صداقت ہو تو خلوص کا جواب ہمیشہ خلوص سے ملتا ہے، اس لئے اگر اس لڑکی کو بھی ان کے ساتھ الفِ معہود سے زیادہ انس ہوگیا تو کوئی تعجب کی بات تھی، نہ غیر فطری، لیکن چوں کہ غیر معاشری تھی اس نے کئی دلوں میں شرارے بھڑکا دیئے۔ حکیم صاحب جیسی تقدس مآب ہستی اس بات کو کیسے گوارا کرسکتی تھی جب کہ ان کے خاندان کی پشتوں میں بھی کبھی ایسے واقعات کی توقع نہ تھی۔ بہت کڑھنے لگے۔ پھر بھاوج کا نون مرچ ان کے زخموں پر الگ چڑکے لگاتی تھی۔ لیکن حکیم صاحب ان گوہ صفت بردباروں میں سے تھے جنھیں شاید ہی کبھی غصہ آتا ہو، اور جب آجائے تو کسی کی جان کی بھی شاید ہی پروا کرتا ہو۔ وہ بگڑتے تھے، لیکن سوچتے تھے کہ اس کے تدارک کے لئے کیا اقدام مناسب کیا جائے، اپنے پرایوں کی انگلیاں الگ نشتروں کا کام کرتی تھیں، بالآخر تنگ آکر انھوں نے بیٹے کو ایک دو وعظ کے خوراک بھی پلا دیکھے، اس کا اثر نہ پایا تو ڈانٹ ڈپٹ بتائی، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکا جو کچھ چھپے دبے کرتا تھا، اب کھلے بندوں کرنے لگا، چنانچہ ایک دفعہ صفیہ نے سب کو خوش کرنے کے لئے جو طعنہ دیا " کہئے، آپ کی چپراسن کیسی ہے؟ " تو بول اٹھا " بہ خدا آپ سے تو ہزار درجہ اچھی ہے! " یہی نہیں بلکہ وہ خاندان کی اور لڑکیوں اور خود صفیہ سے بھی پھکڑ مذاق کرنے لگا۔ حکیم صاحب کو اب اسی عزیز بیٹے سے نفرت بڑھتی جا رہی تھی، التفاتِ خاص تو درکنار انھوں نے

رسم گفتار بھی ترک کردی، پھر جیب خرچ جو خود دیا کرتے تھے، اب اپنی لڑکی صفیہ کے ہاتھ سے دلاتے لگے، اور ادھر ایک عرصہ سے تو دینا ہی بند کردیا، بلکہ وہ خود بھی جو وظیفہ لاکے پیش کرتا اسے ایک حقارت سے لینے لگے، سراج ان سب باتوں پر دل میں مسکراتا اور یہ سمجھتا کہ گویا یہ سب اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ اور جب واقعات کی اصلیت پر سے پردہ ہٹے گا تو یہ سب اکڑ فوں خود بخود جاتی رہے گی، لیکن صورت حال کچھ اور ہی پیش آئی۔ حالات کی نوعیت سے فائدہ اٹھا کر بھاوج نے دیور کو اور بھی اُکسانا شروع کردیا تھا کہ سراج اور صفیہ کا یہ میل ملاپ، یا چھیڑ مذاق بھی ایک غیر شریفانہ نوعیت رکھتا ہے۔ بیوہ بھاوج کی عظمت حکیم صاحب کے دل میں ویسے ہی زیادہ تھی، اور اب تو اور بھی بڑھتی جا رہی تھی، لیکن ابھی تک وہ غور ہی کئے جا رہے تھے۔

ایک دن کی کرنی ایسی ہوئی کہ سراج صفیہ کے کمرہ میں داخل ہوا، بہن بھی موجود تھیں، حسبِ عادت اس نے گلاس اٹھایا، اور صفیہ بپھرنے لگیں، جناب، رہنے دیجئے، یہ آپ کا ہمیشہ کا مذاق!"

چونکہ لہجہ میں کسی قدر ترشی تھی، اس نے گلاس میں کلی کرکے رکھ دیا کہ "لو بھئی، تمھارا پانی واپس کرتے ہیں، روتی کیوں ہو!"

منہ میں پان تھا، اس لئے کلی سے سارا پانی لال ہوگیا، صفیہ کراہت سے جھلا اٹھیں "لاحول ولا، غلاظت کی بھی کوئی انتہا ہے!"

"ارے، تم اسے غلاظت کہتی ہو! کرامت کہو کرامت کہ ایک کلی میں تمھارے سڑے پانی کو شربت بنا دیا ہے شربت!" صفیہ غصہ کو پیتے ہوئے، اس طرح بڑھیں گویا گلاس کو پھوڑ دیں گی۔ سراج نے غضب یہ کیا کہ اس کے گالوں کو ہاتھ میں پکڑ کے نرمی سے کہنے لگا "اے ہے، میری رانی، تمھارا غصہ بھی کتنا میٹھا ہے، لیکن بگڑتی کیوں ہو، لو اب سے نہیں پئیں گے!"

صفیہ نے ایسا محسوس کیا، گویا اس کے سارے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی ہو۔ وہ شاید ایک لفظ بھی نہ بول سکتی، لیکن معاً اسے خیال آیا کہ وہ بہن کے سامنے ہے، اور اس سے بڑھ کر اس کی نظر چچی پر پڑی جو دروازہ میں کھڑی یہ سب تماشا دیکھ رہی تھیں تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کیوں کہ جانتی تھی کہ حکیم صاحب کی ان محترم بھاوج میں جرمنی کے پانچویں کالم کی ساری خصوصیات موجود ہیں۔ غصہ سے سراج کا ہاتھ جھٹکا اور بولی "چھوٹے میاں، آپ شاید نہیں دیکھتے کہ آپ اپنی حد سے بہت آگے بڑھ رہے ہیں، میں آج ہی ابا جان سے آپ کی اس حرکت کا ذکر صاف نہ کردوں تب کہنا!"

"ارے، تم کہہ کے کیا کرلوگی میرا؟ یہ دیکھا؟ (جیب میں سے ایک رقعہ بتاتے ہوئے) آج وہ چیز پیش کرنے والا ہوں کہ اگر آج تمھیں قتل بھی کردوں تو ابا جان مجھے انعام ہی دیں گے!"

یہ واقعہ فی الوقت تو رفت و گزشت ہوگیا، لیکن، جانے کیوں صفیہ کا دل ضرورت سے زیادہ دھڑکنے لگا۔ اسے کھٹکا تھا کہ اگر حکیم صاحب گھر میں ہیں تو بھاوج فوراً برے لگا چھوڑیں گی، لیکن وہ یہ دیکھ کر کچھ مطمئن ہوئی کہ وہ اس وقت گھر میں نہیں تھے، اور بھاوج اپنی دیورانی سے باتیں کرتی بیٹھی تھیں۔ اس نے گلاس دھویا اور پڑھنے میں لگ گئی۔ بہت دیر کے بعد حکیم صاحب بڑے دروازے سے داخل ہوئے، جس سے صفیہ نے اندازہ لگایا کہ بھاوج کے پاس سے نہیں آ رہے ہیں کیونکہ تھوڑی دیر بعد بھاوج چھوٹے دروازہ سے آئیں۔ لیکن حکیم صاحب کو

غصہ میں دیکھ کر اسے کچھ وسوسہ بھی ہوتا تھا، پھر اس نے دل کو سمجھایا کہ شاید یہ اس کے گمان کی وجہ ہو، یا حکیم صاحب کے دھوپ میں سے آنے کی۔ چونکہ بھاوج صاحب آگئی تھیں اسے خیال آیا کہ کہیں وہ ذکر نہ کردیں، اس لئے اپنی بریت کے طور پر خود اس نے کہہ دینا مناسب سمجھا، اور حکیم صاحب کے پاس آکر کہتے رُکتے لاڈ سے کہا" دیکھئے ابا جان، آپ چھوٹے میاں سے کہہ دیجئے کہ وہ ہمیں نہ ستایا کریں!"

" ہاں، اب وہ تمھیں کیا کسی کو بھی نہیں ستا سکیں گے!"
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے ہیں، صفیہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ اسی غصہ کے عالم میں انھوں نے پوچھا" سراج کہاں ہے؟"

بھاوج بولیں" ہوں گے اُسی چپراسن کے پاس، اور کہاں ہوں گے!"

" ہوں!" حکیم صاحب نے غصہ کو نمایاں کیا۔

اتنے میں سراج گاتا، گنگناتا مکان میں داخل ہوا، باپ کو دیکھ کر خاموش ہوگیا، اور اپنے عادتی بھولے پن اور مسرت کے ساتھ "یہ دیکھئے، ابا جان!" کہتے ہوئے رقعہ پیش کیا۔

باپ نے غصہ سے رقعہ کو اٹھا کر پھینک دیا، اور آگے بڑھ کر چھڑی اٹھائی، بیٹا ٹھٹک کر رہ گیا، باپ آگے بڑھے، اور بغیر کچھ بولے، چھڑی سے ہاتھ مانگنا اور پیٹنا شروع کیا، لڑکا بھی بغیر کسی سوال کے ہاتھ دیتا گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکیم صاحب آج کوئی "معجونِ وحشت" ضرورت سے زیادہ کھا گئے ہیں۔ وہ ہی چار ماروں میں صفیہ تاب نہ لا سکی، اور روتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ اسی کی شکایت سے حکیم صاحب کو اتنا غصہ آیا، اور سراج کو سزا مل رہی ہے، سب کے سب بھی مبہوت تھے، لیکن نہ کوئی کچھ کہہ سکتا تھا، نہ روک سکتا تھا، حکیم صاحب کو اس کا بھی خیال نہ ہوا کہ لڑکے کے ہاتھ پھٹ کر خون نکل رہا ہے، البتہ جب چھڑی چرچرگئی تو مجبوراً ہاتھ روکنا پڑا۔ لڑکا اتنا نازوں کا پلا، اور نازک مزاج، کہاں تک تاب لاتا، آخر آنسو ڈھلکنے لگے، باپ نے جب سزا روکی تو فیصلہ سنایا" کمینہ پن کی بھی ایک حد ہوتی ہے، اگر تم میں ذرا بھی شرافت ہے تو اب تم میرے گھر میں نہ رہو گے! سمجھے؟"

" تعمیلِ حکم میں مجھے کوئی عذر نہیں، لیکن میں اس کا سبب نہ معلوم کرسکا، ابا جان!"

باپ نے غصہ سے تن کر صفیہ کی طرف ہاتھ بتاتے ہوئے کہا" یہ صفیہ سے پوچھو!"

اب دفعتہً اسے خیالات آنے لگے کہ شاید آج صبح کی حرکت نے صفیہ کو اس قدر برہم کردیا، اس کی زندگی نے عجب پلٹا کھایا، اس نے محسوس کیا کہ بڑے کا باپ بھی ساتھی نہیں، اور یہ کہ جس نازوں اور سہاروں کا اسے غرہ تھا وہ سب ہیچ ہیں، اور یہ کہ دنیا میں وہ اکیلا ہے، سب سے بڑھ کر اسے اس بات کی خلش تھی کہ اس نے صفیہ کی اتنی دل آزاری کردی، حالانکہ یہ اس کی نیت نہیں تھی، انہیں خیالات میں غرق وہ صفیہ کے کمرہ کی طرف بڑھا اور دروازہ میں کھڑے ہوکر اجازت مانگی" صفیہ بیگم، میں حاضر ہوسکتا ہوں؟"

صفیہ جو رو رو کر بےجان ہورہی تھی، دفعتہً چونک پڑی، اور آنسو پونچھ کر سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سراج اندر گیا، اور بولا" مجھے معاف کیجئے، مجھ سے بڑی غلطی ہوئی، لیکن میں نے محض دل لگی میں ایسا کردیا تھا، ورنہ مقصود آپ کی توہین نہیں تھی!"

صفیہ جو پہلے ہی سے بدحال تھی، یہ سنتے ہی بےقابو ہوگئی، اور جس طرح جھرنا جھرتا ہے، اس کے آنسو جھرنے لگے، ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ وہ بولنے کی انتہائی کوشش کے باوجود بھی بے بس ہے۔
اور سراج نے معافی کے لیے جو ہاتھ جوڑے تو ہتھیلیوں سے
رستا ہوا خون کہنیوں تک بہہ آیا تھا، صفیہ کی نظر کبھی اس پر
ہے تو کبھی سراج کے چہرہ پر۔ زبان جب عاجز ہو جاتی ہے تو آنکھوں
کو گویائی اور دل کو سماعت مل جاتی ہے، سراج کو خیال ہوا
کہ شاید اس نے یہ نہ کہا ہو۔ جانے، کیا سوجھی کہ اس نے بھی
خون کو دیکھا اور بولا "اُوہ! کیا آپ براہ کرم تھوڑا سا کپڑا عنایت
فرمائیں گی؟"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صفیہ گویا ایسے ہی سوال کی منتظر
تھی، جھٹ سے اس نے اپنی ساڑی کا دامن پھاڑا اور شاید
باندھنے کے لیے آگے بڑھی، سراج نے کچھ سوچ کر کہا "جی نہیں
آپ تکلیف نہ کیجئے، میں دھو کے باندھ لوں گا!" اور کپڑا
لے لیا۔

دسترخوان چنا جا چکا تھا، لیکن اس بے ہودگی میں کافی
دیر ہو گئی، کھانے کی خواہش کسے تھی، جھوٹے منہ جا بیٹھے۔ اسی
اثنا میں اماں نے سراج میاں کے ہاتھ دھو کر پٹی باندھی، پھر رُکتے
رُکتے بولی "خاصہ حاضر ہے!"

"ابھی مجھے بھوک نہیں اماجی، ٹھہر کر کھا لوں گا، جلدی
کیا ہے!"

"آپ کی جیسی مرضی ہوتی، لیکن بڑی بیگم بہت دُکھی ہیں،
اور آپ کو یاد فرماتی ہیں!"

"اچھی بات ہے چلو!"

لوگوں کو اندیشہ تھا کہ وہ مخالفت کرے گا، لیکن اب
وہ نہایت سنجیدہ ہو گیا تھا، "آن بیٹھا" ہاتھ سوج گئے تھے،
پٹی الگ بندھی تھی، پھر بخار بھی چڑھ آیا تھا، کیا کھاتا، چمچہ پکڑنے
میں بھی بہت تکلف ہوتا تھا۔

ماں نے نرمی سے پوچھا "میں کھلا دوں، سراج؟"

"جی نہیں امی جان، آپ فکر نہ کیجئے، میں کھا لوں گا!"

مشکل سے دو چار چمچے کھائے ہوں گے، ایک لقمہ لب تک گیا تھا،
کہ انگلیاں تھرتھرائیں اور چمچہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ماں کا دھکا
ویسے ہی ناقابل برداشت تھا، جھٹ سے اٹھیں، اور بے قابو ہو کر
بیٹے کو گلے سے لگا لیا اور رونے لگیں۔ سب کے سب آبدیدہ ہو گئے۔

لوگوں کی بہتیری کوشش تھی کہ کسی طرح سراج جانے نہ پائے
لیکن دوسری ہی صبح انھوں نے دیکھا کہ وہ غائب ہے۔ سب کے
ہوش اڑ گئے۔ حکیم صاحب کی حالت اب سب سے زیادہ ردّی
تھی۔ اور حق تو یہ ہے کہ جانے کس اضطراری یا جنونی حالت
میں انھوں نے یہ حرکت کر دی۔ ورنہ ان سے زیادہ سراج
اور کس کو عزیز ہو سکتا تھا، اب وہ ندامت و رنج سے روتے
تھے اور ہاتھ ملتے تھے، اور ان سے بڑھ کر صفیہ بدحال ہوئی
جاتی تھی، ہرچند سہیلی یا بہن نے اصل واقعہ دریافت کر کے سمجھایا
کہ وہ بالکل بے قصور اور ساری کارستانی چچی صاحبہ کی ہے، لیکن
اس کے ذہن میں یہی بیٹھ گئی کہ سب قصور اسی کا ہے، جتنا
سمجھاتی، اتنا ہی اس کا رونا بڑھتا، اب اس نے پانی کا
انتظام بھی ترک کر دیا، اور کچھ وحشی وحشی سی رہنے لگی۔

مشکل یہ آن پڑی تھی کہ بات پھیلنے کا بھی ڈر تھا، اور
لڑکے کی تلاش بھی لازم تھی، اور یہ دونوں متضاد چیزیں تھیں،
سب ہی نے کافی احتیاط سے پتہ لگانا چاہا، لیکن بہ بغیر ذرائع
کے کس طرح ممکن تھا، کالج میں دریافت کرنا بھی حکیم صاحب
مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے۔ جب الجھن زیادہ بڑھتی تو وہ رونے
لگتے، اسی غم کے عالم میں جب وہ دوسرے تیسرے دن پہنچے

اتر کر اس جگہ آئے جہاں انھوں نے لڑکے کو سزا دی تھی، تو بہت دیر تک گم سم کھڑے رہے، پھر جو نظر اٹھائی تو مقابل کی الماری کے نیچے کسی چمکتی ہوئی چیز پر جا ٹھیری، قریب گئے تو ایک لفافہ سے کوئی سنہری چیز چمکتی نظر آئی، معاً انھیں اس لفافے کا خیال آیا جو ان کے لڑکے نے سزا سے پہلے نہایت ادب و مسرت سے پیش کیا تھا، دل کو ایک دھکا سا لگا، اٹھایا اور کھولا تو ایک سونے کا تمغہ، سند اور اپنے ایک دوست کا خط ملا۔

"مجتبیٰ"

تسلیم۔

ایک سند اور ایک طلائی تمغہ ملفوف کر رہا ہوں، کئی دن سے ارادہ ہے کہ نیاز حاصل کروں، مگر جب سے یہاں آیا ہوں، دوری اور گٹھراگ کچھ ایسے بڑھ گئے ہیں کہ موقع ہی نہیں ملتا خیر اس بات پر آپ کو فخر ہونا چاہیے، اور ہمیں رشک کہ خدا نے آپ کو ایک ایسے سعید و فریس دلبند سے سرفراز فرمایا ہے جو آپ کے خاندان ہی کی نہیں بلکہ سارے ملک کی ناک ہوگا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ وہ علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ تقریر میں بھی ایسا باہنر نکلے گا کہ بین الکلیاتی تقریری مقابلہ میں اول آئے، حالانکہ یہ اس کی پہلی تقریر تھی۔ خدا عمر و اقبال دے! لڑکا آپ کا ہے اور مسرت ہمیں ہوتی ہے۔

تفصیل تو کسی ملاقات پر ہوگی، اتنا سن لیجیے کہ پرنسپل صاحب خود اتنے متاثر ہوئے کہ جب تقریر ختم ہوئی تو اچھل کر اسٹیج پر گئے، پہنچ کر لڑکے کو گلے سے لگایا، بہت دیر تک تعریف کرتے رہے، دوسرے ہی دن یہ تمغہ اور اپنے دستِ خاص کی یہ تعریفی سند عطا فرمائی، مبارک ہو!

لیکن اس عریضہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ سند اور تمغہ لیکر وہ سیدھا میرے پاس آیا، میں نے بھی بے ساختہ گلے سے لگا لیا اور کہا "خوش رہو بیٹا، تم نے مجھے بہت خوش کیا!"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں؟ ضرور!"

"تو پھر ارادہ ہے کہ ایسی تقریب میں وہ موٹر سیکل والی بات بھی چھیڑ دوں!"

"ضرور!"

"مگر، چچا، اپنی زبان سے کہتے ہوئے طبیعت جھجکتی ہے، انکار کر دیں تو میری کیا باقی رہ جائے گی! اگر مناسب سمجھیں تو آپ ہی کبھی تحریک کر دیجئے نا!"

"اچھی بات ہے، لاؤ، میں ایک ترکیب کروں، اپنا ایک خط اور تحریک کو ان کے ساتھ ملفوف کر دوں۔ نہ تمھاری زبان جائے، نہ میری۔ جائے تو تحریر ہی جائے! ہنسنے لگا۔

اب اس کے بعد بھی کچھ کہنے کی ضرورت ہوئی تو بلا لیجیے گا، لیکن جب تک کہ میں آؤں مٹھائی تیار رہے!۔ بچوں کو دعا، بڑوں کو آداب۔

مخلص

"سرور"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خط کی ہر سطر نے حکیم صاحب کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک قطار باندھ دی ہے، حکیم جی خط تو ختم کر چکے، لیکن آنسوؤں کو نہ ختم کر سکے، کسی کی آہٹ سنی تو پھر اوپر چلے گئے۔

(باقی آئندہ)

سید علی شاکر

خزانہ باؤلی بیڑ

آج سے کوئی تین سو ستر برس پہلے ۱۹۹۱ھ میں بیڑ کے جاگیردار اور احمد نگر کے وکیل السلطنت صلابت خاں نے اس انوکھے خزانۂ آب کی تعمیر کرکے اس زمانہ کے لوگوں کو محو حیرت بنا دیا تھا۔ چار صدیاں گزرنے آئیں اور فن انجنیری ترقی کرکے آج اپنے معراج کمال پر ہے مگر اس شہ کار میں کسی نقطۂ نظر سے کسی قسم کا نقص نہیں اور بلا کسی ترمیم و تعمیر کے یہ اپنی تعمیری غرض کو پورا کر رہا ہے۔

بیڑ سے کوئی ساڑھے چار میل دور جانب شمال ایک پختہ اور سنگ بستہ مدور باؤلی بنائی گئی ہے۔ سطح زمین سے اس کی گہرائی کوئی ۷۰ فٹ ہے پہلے ۱۲ فٹ میں اس باؤلی کا قطر کوئی ۶۰ فٹ کا ہے اور نچلے حصہ میں ۴۱ فٹ کا جیسا کہ خاکہ میں بتلایا گیا ہے۔
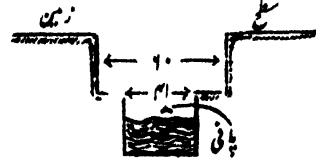
اس باؤلی کے نہ صرف اطراف میں پختہ بندش کی گئی ہے بلکہ اس کے نچلے حصے میں بھی کنکریٹ ڈال دی جاکر سوتوں کو روک دیا گیا ہے۔ لیکن تین نہریں جن میں سے ہر ایک کوئی ۴ فٹ چوڑی اور ۱۰ تا ۱۵ فٹ گہری اور مختلف طول کی اس کی تین سمتوں میں بنائی گئی ہیں۔ ان میں سے دو نہریں فراہمی آب کے لئے ہیں اور تیسری اخراج کے لئے۔ اول الذکر میں سے ایک بند پڑی ہے اس وقت صرف ایک نہر سے پانی باؤلی میں داخل ہوتا اور دوسری سے خارج ہوتا ہے۔

دوسرے کالم میں خاکہ دیکھا جائے ←

اس زمانہ میں یہ چیز ایک معمہ تھی اور لوگ اس کو ایک عجوبہ خیال کرتے تھے۔ زمانۂ موجودہ کی وسیع معلومات نے اس ندرت میں کچھ کمی کردی ہے لیکن یہ حیرت ہنوز باقی ہے کہ آج تک اس طریقۂ کار میں اضافہ نہ کیا جا سکا۔ اس کو مختصراً اس طرح سمجھایا جا سکتا ہے۔ زمین پر کچھ بارش ہوتی ہے اس کا تقریباً ۶۰ فیصد حصہ بہہ جاتا ہے اور باقی ۴۰ فیصد حصہ زمین میں جذب ہوجاتا ہے اس مقدار میں کمی یا بیشی زمین کے کم یا زیادہ مسام دار ہونے پر منحصر ہے۔ یہ پانی زمین کی مختلف گہرائیوں میں پہنچ کر جس طرف اس کی پرتوں کی ڈھال ہوتی ہے، اس سمت میں بہتا رہتا ہے۔ یہی پانی ہے جو ہم کو باؤلیوں اور کنوؤں سے حاصل ہوتا ہے۔ اورنگ آباد، برہان پور وغیرہ کے کاریزہائے آبرسانی جس اصول کے رہین منت ہیں خزانہ باؤلی کی تعمیر میں بھی اسی قدرتی اصول سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ اس خزانۂ آب کے لئے ایک ایسے مقام کا انتخاب کیا گیا جہاں تین طرف سے زمین کا ڈھلان اس کے جانب ہے۔ اور اس کے اوپر قریب سے ہی بنسرا ندی بہتی ہے ایک زمین دوز نہر اس ندی کے قریب تک بنائی گئی ہے اسی نہر کے ذریعہ زمین کا جذب شدہ پانی بہہ کر خزانہ باؤلی میں داخل ہوتا ہے۔ ایک اور نہر بھی اسی غرض کے لئے بنائی گئی تھی مگر وہ ایک زمانہ دراز سے

بند پڑی ہے۔ تیسری نہر جو تقریباً تین میل طویل ہے یہ بھی زمین دوز ہے، اسی کے ذریعہ پانی خارج ہوتا ہے مگر چونکہ یہ نہر ندی کے نچلے حصے میں واقع ہے اس لئے ندی کا جذب شدہ پانی اس میں داخل ہوکر مقدار آب میں کافی اضافہ کرتا ہے۔ اس کا تمام پانی چھن کر اور تقطیر ہوکر آتا ہے اور اس میں سطح زمین کے پانی کے راست شامل ہونے کا امکان نہیں اس لئے یہ نہایت مصفا ہوتا ہے۔ اس نہر کو بیڑ کی آبادی تک پہنچانے کے لئے ضروری تھا کہ اس کو بنسرا ندی میں سے عبور کیا جائے، چنانچہ وہاں بھی اس کو زمین دوز اور اس قدر مضبوط بنایا گیا ہے کہ نہ تو ندی کا پانی اس میں داخل ہو سکا اور نہ طغیانی کا اس پر کوئی اثر ہو سکے۔ کوئی تین میل کے بعد یہ نہر بتدریج اپنی گہرائی میں کم ہوتی ہوئی سطح زمین سے آکر مل گئی ہے اور یہاں سے کھلی نہروں میں پانی زراعتی اغراض کے لئے لیا جاتا ہے اور کوئی پانچ سو ایکڑ زمین کو جو برگ زار کے نام سے موسوم ہے سیراب کرتا ہے۔

اس نہر کی نگہداشت کے لئے معائنہ کی باؤلیاں (Inspection wells) بنائی گئی ہیں جن میں سے نہر کے اندر اتر کر اس کی حالت کا معائنہ کیا جا سکتا ہے، یہ باؤلیاں بیڑ میں اساوی کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ برگ زار سے آگے ایک پختہ نہر کے ذریعہ بیڑ کی آبادی تک اس کا پانی پہنچایا گیا تھا اور احمد نگر دروازہ کے قریب ایک مقام پر جو کارنجہ کے نام سے اب بھی مشہور ہے ایک خوبصورت ہشت پہلو حوض میں یہ پانی چھوڑا جاتا تھا۔ عدم نگرانی اور عدم توجہ کی وجہ اس نہر میں شکست و ریخت ہوکر اس حوض تک پانی کا آنا بند ہوگیا، بجائے اس کے کہ اس کی معمولی ترمیم کی جاکر اس حوض میں دوبارہ پانی چھوڑا جاتا ایک تعلقدار وقت نے اس حوض کو پاٹ دے کر اس پر ایک بھونڈا سا گھنٹہ گھر بنوا کر اپنے مذاق سلیم کا ثبوت دیا ہے۔ ایک زمانہ دراز کے بعد جب یہ باؤلی محکمہ آب سے محکمۂ تعمیرات کی نگرانی میں آئی تو ۱۳۴۴ف میں میں نے ان نہروں کی صفائی کرائی۔ اخراجی نہر بنسرا ندی تک تقریباً صاف تھی مگر اس کے بعد سے وہ تقریباً کیچڑ اور روڑوں سے پٹی پڑی تھی جس کی وجہ پانی کی روانی بہت متاثر ہوگئی تھی، اس کو میں نے صاف تو کرا دیا لیکن یقین نہ آسکتا تھا کہ خود بہ خود اس نہر میں خرابی پیدا ہو رہی ہے۔ تجسس و کرید کے بعد معلوم ہوا کہ بہت دنوں پہلے ایک نیک نیت تعلقدار صاحب نے اس نہر میں اضافہ آب کے خیال سے بند نہر کے ایک حصہ کو توڑ کر اس میں بنسرا ندی کا پانی داخل کرایا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ندی کے گدلے پانی، کیچڑ اور پتھر نے اس نہر میں داخل ہوکر بتدریج اس کو بھرنا شروع کر دیا تھا۔ نیم حکیم خطرۂ جاں کی مثل شاید اس سے زیادہ کہیں اور صادق نہ آئے۔ محکمۂ تعمیرات کی نگرانی میں آنے کے بعد سے اس قدیم خزانہ کی حفاظت و سلامتی کا یقین ہوگیا ہے۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے اس باؤلی کے متعلق جو روایت مشہور ہے اس کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کہتے ہیں کہ اس باؤلی سے ایک نہر احمد نگر تک بنائی گئی ہے اور اس طرح صلابت خاں نے اپنے بادشاہ کی خدمت میں یہاں کے پانی کو بطور تحفہ پیش کیا تھا، اس کے ثبوت میں ایک قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک سیاح اس باؤلی پر تشریف لائے تھے پانی پینے کے لئے نیچے اترے ان کے ہاتھ میں ایک عصا تھا وہ باؤلی میں گر پڑا اور نہر میں بہہ گیا، یہ وہاں سے مایوس ہوکر نکلے اور گھومتے گھومتے جب احمد نگر پہنچے تو ایک تالاب میں اس عصا کو تیرتا ہوا پایا۔ ان روایتوں اور قصوں پر کسی قسم کی تنقید غیر ضروری ہے۔

محمد ابراہیم

نشری تقاریر (سلسلۂ گزشتہ)

نشری تقریر کی ترتیب اور پیشکش کا کچھ حصہ اربابِ نشر سے اور کچھ مقرر سے متعلق ہوتا ہے مثلاً عنوان، مقرر، تاریخ، وقت اور دورانِ نشر وغیرہ کا انتخاب و تعین۔ یہ سب جب ہو جائیں تو پھر مقرر کے فرائض شروع ہوتے ہیں۔ اس کو مقررہ دوران وقت اور تاریخ کے لئے ایک ایسی مستند تقریر تیار کرنی ہوتی ہے جس کا کوئی جزو اصول نشریات کے منافی نہ ہو یا جس سے نشر گاہ کے کسی قاعدہ پر مضر اثر نہ پڑ رہا ہو اور جو نہایت آسان "تقریری زبان" میں لکھی گئی ہو۔ نشر گاہ کا احتساب بعض مقرروں کو ناپسند ہوتا ہے۔ وہ اس کو گوارا نہیں کرتے کہ ان کی تقریر میں کوئی دوسرا شخص ترمیم یا اضافہ کرے۔ میں اپنے دو استادوں کی مثالوں سے آپ کو دو مختلف ذہنیتوں کا فرق بتاؤں گا۔ میرے ایک استاد کو یہ پسند نہ تھا کہ میں جو ان کا شاگرد رہ چکا تھا، ان کی تقریر میں نشریات کے فنی نقطۂ نگاہ سے بھی کسی قسم کی تبدیلی کروں۔ میرے ایک دوسرے استاد نے اپنی تقریروں کے سلسلہ میں مجھ سے کہا تھا: "تم میرے شاگرد ہو تم کو شاگردی کا حق اب اس طرح ادا کرنا چاہیے کہ مجھے نشری تقریر کی فنی باتیں سکھلاؤ"۔ یاد رکھئے جب کوئی نشر گاہ آپ کو دعوتِ نشر دیتی ہے تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ آپ کی قابلیت کی معترف ہے اور آپ کو استادِ فن سمجھتی ہے مگر جب تقریر میں اضافہ یا ترمیم کی جاتی ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی معقول وجہ ضرور ہوگی یا تو اس کا دوران کم یا زیادہ ہوگا، یا اس کی زبان ادق اور غیر تقریری ہوگی یا اس کی فنی معلومات کو زیادہ سہل انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہوگی وغیرہ۔ اربابِ نشر نہ تو کسی کے استاد بننا چاہتے ہیں اور نہ ان کے پاس اتنا وقت ہے۔ روزآنہ بیچاسوں مسودات دیکھنے پڑتے ہیں۔ بلا وجہ یا تفریحاً تقریر پر قلم چلانے کے لئے وہ کس طرح وقت نکال سکتے ہیں۔ اور اس سے حاصل؟ کیا اربابِ نشر کی ترمیم و اضافہ کو نشر کرتے وقت یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ ترمیم اربابِ نشر نے کی ہے؟ دنیا کی ہر نشر گاہ کو احتساب کا حق حاصل ہے اور فنی امور کے پیش نظر حاصل رہنا اور اس کو سختی سے استعمال کرنا چاہیے۔

(ترتیب اور پیشکش)

پیشکش کے اصول مظاہرے کے ذریعہ بہتر طریقہ پر سمجھائے جا سکتے ہیں۔ نشریات میں علم اور عمل دونوں کا راج ہے۔ کوئی شخص کتابی ہدایتیں پڑھ کر اچھا موٹر ڈرائیور نہیں بن سکتا۔ شاستر کے اصول اور راگ راگنیوں کے سرگم یاد کر کے اچھے مطرب ہونے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح نشر ایک بالکل نئی دنیا ہے یہاں صرف ہدایتوں کو پڑھ کر کامیاب نشری مقرر بننے کی توقع بے جا ہے۔ اس دنیا کا ہر بسنے والا کچھ اپنا اور کچھ قدرت کا محتاج رہتا ہے۔ نشری قاعدوں کو پیش نظر رکھ کر عمدہ تقریر تیار کرنے اس کے بعد مضمون کے مطابق اس کو ادا کرنے، آواز کے حجم، تنوع مناسب رفتارِ نشر، پابندئ وقت، مقرر کے دوران میں موزوں وقفوں اور الفاظ کو واضح طور پر ادا کرنے کی حد تک وہ خود اپنا محتاج ہے۔ آواز اور لب و لہجہ قدرت کی طرف سے ملتا ہے۔ اگر قدرت نے عطا میں سخاوت کی اور ناشر نے اکتساب میں لاپروائی یا تساہل نہ کیا تو اس کا مستقبل یقینی روشن ہو سکتا ہے۔ ذیل کے اشاروں کو نشری تقریر کی ترتیب و پیشکش کے سلسلہ میں یاد رکھئے۔ ان سے آپ کو مختصر طور پر معلوم ہو جائے گا کہ مقرر کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔

ترتیب (۱) مقرر کی شخصیت ضرور اہمیت اور دلکشی رکھتی ہے مگر اس سے یہ ضمانت نہیں ملتی کہ پوری تقریر سنی جائے گی۔ اس لئے تقریر کے مواد کا خاص طور پر خیال رکھئے۔ بالعموم تقریر کا متن ہی سامعین کو سننے پر زیادہ مجبور کرتا ہے۔

(۲) تعمیری خیالات زیادہ بھلے لگتے ہیں۔ تنقیص و تخریب سے سامعین کو الجھن ہوتی ہے۔

(۳) راست، آسان اور مدلل پیام دیجیے۔ اعداد و شمار، سنہ اور فنی امور دلچسپی گھٹا دیتے ہیں۔ یاد رکھئے ہوا پر زبردست مقابلہ ہو رہا ہے۔ اچھے اچھے گانے، ساز، فلمی ریکارڈ، آپیرا، آرکیسٹرا، ڈرامے، فیچر ـــــ سب ہی سے ٹکر ہے۔

(۴) اپنی دلیلوں میں کسی جگہ تشنگی یا خامی نہ چھوڑ دیے۔ سننے والا سنتے ہوئے سمجھتا ہے اور غور کرتا ہے۔

(۵) ایک نشر میں مختلف عنوانوں پر خیال آرائی کی کوشش نہ کیجئے ورنہ اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔

(۶) صرف اسی عنوان پر لکھئے جس پر آپ کو قدرت اور کامل اعتماد ہو۔ نشر ہونے والے مواد کا مستند اور لکھنے والے کا ماہر ہونا ضروری ہے۔

(۷) پیشین گوئی اور پیش قیاسی سے احتراز کرنا مفید ہو گا۔

(۸) تقریر فلسکیپ کے آدھے حصے پر لکھی جائے تو صفحوں کے الٹنے میں آسانی ہو گی۔

(۹) صفحہ کے ایک ہی رخ پر لکھئے۔

(۱۰) ترتیب کے وقت اسے نہ بھولئے کہ نشر کا دوران کیا مقرر کیا گیا ہے۔ اسی کی مناسبت سے لکھئے۔ لکھنے کے بعد بار بار پڑھ کر قطعی دوران معلوم کر لیجیے۔ بعض مقرروں کو اپنی تقریروں کا کچھ حصہ طوالت کی وجہ سے کم کیا جانا برا معلوم ہوتا ہے۔ اگر تیاری کے وقت ہی دوران کا لحاظ رکھا جائے تو کمی بیشی کی ضرورت نہ ہو۔

(۱۱) تقریر نشر سے کافی پہلے لکھ لیجیے۔ لکھئے بالکل اسی طرح جس طرح آپ بولنے والے ہیں یا آپ کو بولنا چاہیے۔ زبان تقریری ہو نہ کہ تحریری۔

(۱۲) غلطی ہو جانے کے بعد اس کی تصحیح ممکن نہیں اس لئے ابتدا ہی سے کافی جانچ اور احتیاط کیجیے۔

(۱۳) تقریر کا کوئی حصہ ایسا نہ ہو جس سے سامعین کے جذبات کو ٹھیس لگے۔ آپ کی تقریر سننے والوں میں چند آپ سے کم لائق ہوں گے اور چند زیادہ۔ اور یوں بھی کسی کے متعلق بری رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

(۱۴) مقرر کو ایک ماہر اور عالم کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا بلا وجہ انکسار اور تکلف یا اپنی لاعلمی یا بے بضاعتی کا اعتراف تقریر کی قدر گھٹا دے گا۔

(۱۵) تحریر و تقریر میں غیر ضروری "شاعری" کبھی مفید نہیں ہو سکتی۔ سیدھی سادی زبان لکھئے اور اسی انداز سے پڑھیے۔ نہ لفاظی چل سکتی ہے اور نہ ترنم متاثر کر سکتا ہے۔

(۱۶) تقریر سننے والوں میں دوست دشمن ہوا خواہ اور بدخواہ سب ہی ہوتے ہیں اس لئے جو کہیے مکمل یقین کے ساتھ کہیے۔

(۱۷) طویل جملوں کو "مگر" "لیکن" "اور" وغیرہ کی مدد سے مختصر جملوں میں تقسیم کر دیجیے۔

(۱۸) تقریر میں ایسے الفاظ استعمال کیجیے جو آپ کو پسند ہوں جن سے آپ کی زبان اور کان اچھی طرح آشنا ہوں اور جو آپ کی آواز کے آتار چڑھاؤ کے لئے موزوں ہوں۔

(۱۹) تقریر لکھنے کے بعد گھر میں اسے بار بار پڑھیے۔ اگر کسی جملہ یا لفظ پر آپ رک جائیں اور یہ محسوس کریں کہ اس کی آواز یا ساخت

موزوں نہیں ہے تو اسے ضرور بدل دیجئے۔

(۲۰) تقریر کو اس طرح ترتیب دیجئے کہ زیادہ اہم حصّہ کے بعد کم اہم حصہ نہ آئے۔

(۲۱) نشرگاہ کے احتساب سے مقرر کو ناراض نہ ہونا چاہیے۔ ارباب نشر تقریر میں ہمیشہ کسی نہ کسی ضرورت کے تحت ترمیم یا اضافہ کرتے ہیں۔

(۲۲) بہتر ہوگا اگر ایک جملہ کو پہلے صفحہ کی آخری اور دوسرے صفحہ کی پہلی سطر میں تقسیم نہ کیا جائے۔ پورا جملہ پہلے یا دوسرے صفحہ پر لکھا جائے۔

(۲۳) جن الفاظ یا جملوں پر زور دینا ہو ان کے نیچے اشارہ کے لئے خط کھینچ دیجئے۔ ایسے دو جملوں کے درمیان ایک لکیر کھینچئے جہاں آپ کو کچھ وقفہ دینا ہو۔

پیشکش

(۲۴) اپنے من بھاتے اور فطری انداز میں نشر کیجئے۔

(۲۵) ایک ایک لفظ اتنی وضاحت سے ادا کیجئے کہ سمجھ میں آجائے۔

(۲۶) ایک جملے اور دوسرے جملے کے درمیان ضرورت کے مطابق مناسب وقفہ دیجئے۔

(۲۷) دو مختلف خیالوں یا پیراگرافوں کے طرز بیان میں فرق رکھئے اور موزوں وقفہ دیجئے۔

(۲۸) وقفہ کی حد تک یہ یاد رکھئے کہ اسٹوڈیو میں ایک سکنڈ کا وقفہ ریڈیو پر تین چار سکنڈ محسوس ہوگا کیونکہ مقرر دکھائی نہیں دیتا۔ سامعین کی دلچسپی کا سامان صرف آواز ہے۔

(۲۹) مائکروفون کو عیوب پھیلا کر اور بڑا کر کے پیش کرنے کی بُری عادت ہے۔ آپ ذرا زور سے سانس لیجئے۔ مائکروفون سامعین کو یہ محسوس کرائے گا کہ آپ کی سانس پھول گئی ہے یا آپ کو زور سے سانس لینے کی عادت ہے۔

(۳۰) سامعین کو رلانے کی ناکام کوشش نہ کیجئے۔ وہ رونا نہیں چاہتے۔ ان سے گھریلو انداز میں بات چیت کیجئے۔

(۳۱) واعظانہ انداز بیان اور قدیم شانِ خطابت کو مائکروفون اور سامعین دونوں ناپسند کرتے ہیں۔

(۳۲) اس یقین کے ساتھ مائکروفون کے سامنے آئیے کہ اپنی تقریر مخالفین کو بھی سننے پر مجبور کر دے۔

(۳۳) مائکروفون ان اصحاب کے لئے ایک رحمت ہے جو شخصیت نہ ہونے کی وجہ سے پلیٹ فارم کے مقرر نہیں بن سکتے۔ ہوا کی دنیا میں آواز کی شخصیت اور دلیل کی حکومت چلتی ہے۔

(۳۴) نشر کے وقت صفحے اس طرح الٹیے کہ ان کی آواز سنائی نہ دے۔ اگر سننے والوں کو کاغذ کی آواز سنائی دے تو تقریر کا کافی اثر جاتا رہے گا۔

(۳۵) جب آپ صفحہ کی آخری دو سطروں کے قریب تک پڑھ لیں تو وہ صفحہ نیچے کی طرف ذرا سا کھسیٹ لیجئے تاکہ اگلے صفحہ کی ابتدائی چند سطریں دکھائی دیں۔ اس کی وجہ سے آخری لفظ ادا کرتے ہی اگلے صفحہ کی پہلی سطر کے پہلے لفظ پر فوراً پہنچ جانے میں نہ تو کوئی مشکل ہوگی اور نہ وقت لگے گا۔

(۳۶) اناؤنسر یا کسی دوسرے متعلقہ شخص نے آپ میں اور مائکروفون میں جو فاصلہ مقرر کر دیا ہے اس کو کبھی نہ بدلئے۔

(۳۷) رفتار نشر اور آواز کے تمّوج میں بھی بلا وجہ تبدیلی نہ کیجئے۔ تبدیلی ہو بھی تو اتنی نمایاں نہیں کہ پیشکش متاثر ہو۔

(۳۸) نشر سے عین پہلے نہ تو کھانا کھائیے اور نہ پان۔ کھانے کی وجہ سے ڈکار آنے کا امکان ہے اور پان کی پیک وغیرہ سے ایک خاص قسم کی آواز نکلتی ہے۔

(۳۹) مائکروفون پر انگلی سے مارنے یا اس کو پکڑے رہنے کی کوشش نہ کیجئے۔ اگر مائکروفون تقریر کے وقت ہلا یا جائے تو

اس سے نہایت کرخت آواز نکلتی ہے۔

(۴۰) کم ضخامت کی تقریر کو رفتار دھیمی کرکے اور زیادہ ضخامت کی تقریر کو رفتار تیز کرکے مقررہ دوران پورا کرنے کی کوشش کبھی کامیاب نہ ہوگی۔ دوران سے زیادہ اہمیت رفتار کی ہے۔ ریہرسل کے وقت ہی ضخامت اور رفتار کا تعین کرلینا چاہئے۔

(۴۱) سننے والوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ صنف، عمر، تمدن، مذہب، قابلیت اور ذوق کے فرق کے علاوہ مقام سماعت کا ماحول بھی مختلف ہوتا ہے۔ نشر کی رفتار ایسی رکھئے کہ ہر ایک سمجھ سکے۔

(۴۲) ریہرسل ضرور کیجئے اس میں انداز بیان، رفتار، حجم وقفوں کا تعین کرلیجئے۔ ریہرسل کے وقت اگر کوئی جملہ اپنی ساخت کی وجہ سے مشکل محسوس ہو یا طرز ادا کے خیال سے اس کا بدل دیا جانا ضروری ہو، اگر کوئی لفظ ثقیل یا ناخوشگوار معلوم ہو یا آپ کو کسی لفظ کا صحیح تلفظ ادا کرنے میں دقت ہو تو تبدیلی کرلیجئے ورنہ عین نشر کے وقت وہی مشکل اور دقت پیش آئے گی۔

(۴۳) نشر کے وقت اپنی گھڑی میز پر یا مائی کروفون کے قریب نہ رکھئے۔ اس کی ٹک ٹک کی آواز بھی سنائی دے سکتی ہے۔

(۴۴) میز پر اپنے ہاتھ یا زمین پر پیر نہ پٹخئے۔ یہ آوازیں تقریر کے ساتھ بالکل بے معنی محسوس ہوں گی اور سننے والوں کو بری لگیں گی۔

(۴۵) تقریر کے الفاظ کو غور سے دیکھتے ہوئے پڑھئے۔ اپنے حافظہ پر اعتماد کرکے لاپروائی نہ کیجئے۔ مقرر کا بلاوجہ ایک سکنڈ کے لئے رکنا بھی مناسب نہیں۔

(۴۶) سرخ روشنی اس کی علامت ہے کہ اسٹوڈیو چالو ہے۔ یہ روشنی ہونے سے پہلے ہی اپنا گلا صاف کرلیجئے، کرسی پر آرام سے بیٹھ جائیے اگر کالر تنگ ہو تو اسے کھول لیجئے، عینک استعمال کرتی ہو تو پہلے سے نکال کر لگا لیجئے۔ صفحوں میں پن یا کلپ لگی ہو یا تاگا بندھا ہو تو اس کو نکال لیجئے۔ اگر دو صفحے جڑے ہوئے ہوں تو ان کو الگ کردیجئے۔

(۴۷) تقریر کے وقت صرف تقریر کے الفاظ ادا ہوں۔ دوسری آوازیں مثلاً سانس، کھانسی، چھینک وغیرہ بہت بری معلوم ہوتی ہیں۔ اسٹوڈیو میں سرخ روشنی اور اناؤنسمنٹ کے انتظار میں بالکل خاموش بیٹھئے۔ جو کچھ پوچھنا ہو اناؤنسر سے پہلے ہی پوچھ لیجئے۔ تقریر سے دو تین منٹ پہلے ہی خاموش ہوجانا اچھا ہے۔ روشنی ہوجانے کے بعد جب اناؤنسر آپ کا تعارف کرادے تو بلا تکلف کامل اطمینان کے ساتھ تقریر شروع کردیجئے۔ تقریر کے ختم پر جس وقت اناؤنسر اختتامی اناؤنسمنٹ دیتا ہے اس وقت بھی بالکل خاموش بیٹھے رہئے۔ جب تک اسٹوڈیو کی سرخ روشنی گل نہ ہو تو اسٹوڈیو چالو رہتا ہے۔ اناؤنسر جب بول رہا ہو اس وقت اگر مقرر اپنے کاغذات جمع کرنے لگے یا زور سے سانس لینے، کھانسنے یا چھینکنے لگے یا عینک کا کیس زور سے بند کردے یا کوئی اور آواز نکالے تو اسی سے غریب اناؤنسر چپٹ میں آجائے گا۔ تقریر کے وقت اگر اناؤنسر کھٹ پٹ کرے تو وہ مقرر کی سمجھی جائے گی اور اناؤنسمنٹ کے وقت مقرر کچھ گڑبڑ کرے تو اناؤنسر پکڑا جائے گا۔ سامعین مقرر کو قابل معافی سمجھیں گے کیونکہ وہ گاہے ماہے تقریر کے لئے آتا ہے۔ مگر اناؤنسر کو معاف نہیں کریں گے۔ یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے۔

(۴۸) بالعموم اناؤنسر کی آواز اور انداز بیان پسندیدہ ہوتا ہے۔ تقریر کے شروع میں اور ختم پر مستقل اناؤنسر ہی بولتا ہے۔ مقرر کو یہ خیال رکھ کر تقریر کرنا چاہیے کہ اس کا مقابلہ اناؤنسر سے ہے۔

(۴۹) تقریر نشر کرنے کا ایک خاص انداز بنا لیجئے۔ ہر ناشر اپنے لئے مخصوص طرز پیدا کرسکتا ہے۔ یہی طرز بیان کی انفرادیت ہے

(۵۰) اچھی یا بری نشر جہاں مقرر کی نیک نامی یا بدنامی
کا باعث ہوتی ہے وہیں وہ نشرگاہ کی شہرت کو بھی متاثر کرتی
ہے۔ فرد کے مقابلہ میں ادارہ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔
نشرگاہ سے بالعموم تین قسم کی تقریریں ہوتی ہیں۔
پہلی تو وہ جو خود اربابِ نشر مقرر کرتے ہیں۔ سال بھر کے تقریری
پروگرام کو وہ تین حصوں میں تقسیم کرکے اسی مناسبت سے عنوانات
کا تعین کیا جاتا ہے جس کے بعد مقرروں کی تلاش ہوتی ہے۔
ایسے مقرروں کو ڈھونڈا جاتا ہے جو استاد اور ماہرِ فن ہوں،
جن کی آواز مائکروفون کے لئے موزوں ہو جو دعوتِ نشر کو
رد نہ کریں، وقت پر مقرروں کے مسودے بھیجدیں، ریہرسل
کے لئے آئیں غرض نشرگاہ کے تمام قاعدوں کی پابندی کریں۔
دوسری قسم میں وہ تقریریں آتی ہیں جو مضمون نگار اپنے
طور پر لکھ کر نشر کی غرض سے بھیجتے ہیں۔ تیسری قسم ان تقریروں
کی ہے جو اچانک ہو جاتی ہیں۔ کوئی ممتاز ادیب پہنچ گیا، کل ہند
اہمیت کا شاعر، فلسفی، پروفیسر، سیاح، مورخ، مدبر، سیاس آگیا۔
اگر اس کے قیام کے دوران میں تقریر نہ کروائی جائے تو وہ
چلا جائے گا اور پھر بڑی مدت تک اس کی تقریر کروانے کا
موقعہ نہ ملے گا اس لئے پروگرام کی تقریر منسوخ کر کے،
ریکارڈوں کا وقت کم کر کے یا موسیقی کا کچھ وقت لے کر
وہ تقریر کروائی جاتی ہے۔ متذکرہ اصولوں کی پابندی
تینوں قسم کے مقرروں کو کرنی ہوگی۔ البتہ اپنے طور پر مضمون
بھیجنے والوں کو خود اپنے مفاد میں ایک بات کا خاص طور پر
خیال کرنا چاہیئے۔ وہ پوری تقریر لکھ کر بھیجنے کی بجائے اس کا
ایک سرسری خاکہ لکھ کر بھیجدیں تاکہ پہلے یہ معلوم ہو جائے کہ
اس عنوان کو پروگرام میں جگہ مل سکتی ہے یا نہیں۔ اربابِ نشر
جب اپنی پالیسی کے پیش نظر تمام امور پر غور کر کے مطلع کریں
تب تقریر بھیجی جائے۔

اس سے کیا فائدہ کہ آپ اپنی جان کھپا کر نہایت
دلچسپ مضمون لکھ بھیجیں مگر وہ نشرگاہ کے پروگرام اور
پالیسی کی وجہ سے شریک نہ کیا جا سکے۔

مرزا ظفر الحسن

میر محمد مومنؒ

سلطنت قطب شاہیہ کے مشہور پیشوا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم حیدرآباد کے مشہور تعمیر کار اور مصلح اور بانیٔ دائرہ
میر مومنؒ کے حالات زندگی اور علمی و رفاہی اور سیاسی کارناموں کا مفصل تذکرہ جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صدر شعبۂ اردو
جامعہ عثمانیہ نے مرتب کرکے شایع کیا ہے۔ یہ ضخیم کتاب جو (۳۰۰) تین سو سے زیادہ صفحات اور ۴۴ عکسی تصاویر پر مشتمل ہے، کئی سال سے
زیر طبع تھی۔ دکن کی علمی و سیاسی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حیدرآباد کے اس سابق وزیر اعظم کے کارناموں کے مطالعہ سے مفید معلومات
حاصل کرسکتے ہیں۔

سب رس کتاب گھر خیریت آباد

(قیمت عہ)

ٹیگور

ٹیگور نے پائی تھی تعلیم محبت کی
دیکھی نہ کبھی اس نے دشمن کی مصیبت بھی
دنیا نے بہت اس کی تعظیم کی عزت کی
خالق نے اسے دی تھی دولت بھی وجاہت بھی

لاتا تھا وہ ہر جرعہ کوثر کے کناروں سے
رہتا تھا خیال اس کا جنت کی فضاؤں میں
پیدل تھا مگر اکثر آگے تھا سواروں سے
نغموں کا بہاتا تھا سیلاب ہواؤں میں

کھینچی ہیں فسانوں میں جذبات کی تصویریں
گیتوں میں جھلکتا ہے اک نور حقیقت کا
ہر رنگ کی حامل ہیں ٹیگور کی تحریریں
تا عمر رہا گلچیں وہ گلشن فطرت کا

مشرق سے وہ چمکا تھا گو شمع ادب بنکر
مغرب کے ادب پر بھی اک خاص اثر ڈالا
وہ پیکر صد نغمہ وہ شعر کا پیغمبر
دامانِ تفکر کو اخلاق سے بھر ڈالا

اے ہند کی خاکستر اندیشۂ فردا کر
مٹی میں ملے کیا کیا نایاب ترے گوہر

مرزا سیمابی عالمپوری

ٹیگور اور موت

ہنستے ہیں اسی طرح سے بکھرے ہوئے تارے
ہنس ہنس کے جہاں والوں کو کرتے ہیں اشارے
برسات کا پیغام سناتی ہیں گھٹائیں
اٹھلاتی ہوئی چلتی ہیں مستانہ ہوائیں
اک گیت سناتا ہے یہ بہتا ہوا دریا
آباد کناروں پہ ہے ملاحوں کی دنیا
منظر ہیں جہاں کے وہی دنیا بھی وہی ہے
محسوس یہ ہوتا ہے کسی "شے" کی کمی ہے
لاتی ہے کبھی ہنستے ہوئے موت تباہی
رکتے ہی نہیں ہیں عدم آباد کے راہی
اس موت کے نغمات انوکھے ہیں نرالے
اک بہتا ہوا دھارا ہے سب کچھ جو بہالے
چھینے ہیں بہت گوہر نایاب اسی نے
دریا کو کیا علم کے پایاب اسی نے
افسوس کہ ہم نے بھی دُرِ بے بہا کھویا
اس موت کی آغوش میں ٹیگور بھی سویا

سردار علی الہام

من کے مندر کا پجاری

من کے مندر کا پجاری اپنی دیوی کو چھوڑ ہمیشہ کے لئے چلا گیا... بہت دُور..... جب دیبی کی پوجا ہی اُس کی زندگی کا سہارا تھی اور دیبی بھی اس کی پوجا سے خوش تھی تو ایسا کیوں ہوا؟

بستی کے لوگ پجاری کو اس مندر سے نکالنا چاہتے تھے۔ ان کی نظروں میں وہ گنہگار تھا۔ صرف اس لئے کہ وہ ذات کا برہمن نہ تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ چھتری لڑنے کے لئے پیدا ہوا ہے نہ کہ پوجا کے لئے۔ مگر وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ دیبی کی پوجا کے لئے ایک ایسا بہادر نوجوان چاہیے جو دیبی کے من میں جگہ پا سکے۔ دیبی کو ذات پات کی کیا پرواہ تھی۔ سب اس کے تھے اور وہ سب کی۔ جو مندر میں اس کا دھیان لئے ہوئے داخل ہوتا اس کی قدر کرتی اور جس کو چاہتی اپنے چرنوں میں جگہ دے سکتی تھی!

بستی والوں نے ایک برہمن کو جسے بستی کے لوگ مقدس سمجھتے تھے دیبی کی پوجا کے لئے مقرر کر دیا۔ اس کو دیبی بہت پسند تھی، پہلے بھی جب کبھی وہ پوجا کے لئے اس مندر میں داخل ہوتا تو دیبی کو تکتا اور پہروں تکتا اور اس کا دل بے اختیار چاہتا کہ وہ اس دیبی کا پجاری ہو جائے۔ مگر اس نے اپنی اس خواہش کو کسی پر نہ ظاہر ہونے دیا کیونکہ اس کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا تھا۔ وہ چھتری نہ سہی برہمن تو تھا۔ بستی والوں نے پنچایت گھر میں اس کا تصفیہ کیا۔ اور سب نے ہم زبان ہو کر کہا کہ ایسی مقدس دیوی کا پجاری برہمن ہی کو ہونا چاہیے۔

دوپہر کا وقت تھا جب معمول پجاری اپنی دیوی کی پوجا میں کھویا ہوا تھا کسی نے آ کر اس کے کان میں چپکے سے کہا کہ کل سے مندر میں دوسرے پجاری کا راج ہوگا۔ اس خبر کے سنتے ہی پجاری کے دل پر ایک غم کی بجلی گری، جس کی تپش نے اس کو بے ہوش کر دیا۔ وہ بہت دیر تک اسی حالت میں پڑا رہا اور جب اس کو ہوش آیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا تمام جسم پسینے سے تر بتر ہو گیا ہے وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور انگڑائی لیتے ہوئے، شام کے دھندلکے میں مندر کی پھلواری کی طرف بڑھا۔ وہ مندر چھوڑنے سے پہلے دیبی کی آخری پوجا سے اپنے دل کی تسکین چاہتا تھا۔ اس نے بہترین گلاب اور بیلا جو مندر سے ہم آغوش باغ کی بہار تھے، توڑے اور دیوی کو گلاب میں نہلا کر مانگ میں سندور اور ماتھے پر ٹیکہ لگایا۔ ایک بیش بہا ندین ساڑی اور قیمتی جواہرات سے اس کا سنگار کیا۔ کافوری شمع جلائی اور آرتی لیکر آخری بار اپنی دیبی کے نثار ہونے کے لئے پروانہ وار جھومنے لگا۔ آج اس کی ہر ادا میں مجنونانہ پن تھا۔ اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے بھجن میں پہلے سے زیادہ سوز تھا۔ اتنا سوز کہ سننے والوں کے دل کو جلا کر خاکستر بنا دے۔ کیوں نہ ہو یہ جو اس کا آخری بھجن تھا۔ جب بھجن ختم ہوا تو آرتی کی تھال اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے زمین پر آ رہی اور وہ اس عالم بے خودی میں کھسکتا ہوا آگے بڑھا اور دیبی کے چرنوں سے لپٹ کر بوسے لئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک دریا رواں ہو گیا اُس خیال نے اس کو بے چین کر دیا تھا کہ اس کے ہونٹ دیبی کے چرنوں کو جھو نہ سکیں گے۔ دیبی کے پاؤں آنسوؤں سے نم ہو گئے۔ وہ اب دیبی کے سامنے گھٹنوں کے بل ہاتھ جوڑے کھڑا تھا اور غم کی حالت میں گھٹی سانس سے یہ الفاظ نکلے۔

" میری دیبی بستی والے نہیں چاہتے کہ تو میری ہو کر رہے۔ جب میں تیرے پاس تھا تو مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ پریم کی دنیا اتنی دکھیاری ہوتی ہے۔ دیبی! تیرا پجاری اس پریم روگ کو من میں بسانے اور اپنی اجڑی دنیا ختم کرنے کے لئے جا رہا ہے۔ مجھے صرف یہ

معلوم کرنیکی ضرورت ہے کہ میری پوجا کو تو نے قبول کیا ہے یا نہیں اور اپنے من کے مندر میں مجھے جگہ دی ہے یا نہیں۔ یہ کہکر اسنے حسرت وامید سے دیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں محبت کی آگ پتھر کے سینے میں بھی بھڑک سکتی ہے۔ اور وہ بھی موم کیطرح پگھل سکتا ہے۔ دیبی میں جنبش ہوئی اور آرتی کے پھول نیچے آرہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک اٹھے اور اس کے منہ سے ایک آہ نکلی اور ہونٹوں پر آکر رک گئی مگر وہ دیبی تھی انسان نہیں تھی اور زیادہ نہ بول سکی۔ اس کے پجاری کے لئے اتنا بھی بہت زیادہ تھا۔ جدائی کا غم اور محبت کی کامیابی کی خوشی دونوں نے مل کر اس کے دل میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور اس کی آخری نظریں آنسوؤں کے بادل کو چیرتے ہوئے دیبی پر پڑیں اور وہ اپنی چھاتی پر صبر کی سل رکھ کر اپنی گٹھڑی سنبھالے مندر سے چل پڑا۔ رات ہو چکی تھی۔ فطرت بھی دو محبت بھرے دلوں کی جدائی کو دیکھ کر تڑپ اٹھی، آندھی اٹھی، بجلی کڑکی، بادل گرجے، اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ آسمان بھی اس سماں کی تاب نہ لاکر رونے لگا۔ مگر آسمان صرف آنسو بہانا جانتا ہے۔ اس کو تڑپانے میں ہی مزا ملتا ہے۔ ہنسانے میں نہیں۔ وہ محبت اور اس کی گہرائیوں کو کیا سمجھ سکتا ہے۔

برہمن پجاری نے اپنے من کی مراد پائی اور دوسری صبح مندر میں اپنی دھونی رمائی۔ وہ جانتا تھا کہ دیبی کو کونسا پجاری پسند ہے۔ اس لئے وہ اپنی پوجا میں ایسی مقناطیسی قوت پیدا کرنا چاہتا تھا جو دیبی کے دل کو اس کی طرف کھینچ لائے۔ وہ پو پھٹنے سے پہلے اٹھتا اور شبنم سے لدے ہوئے خوبصورت مہکتے پھول دیوی کی پوجا کے لئے توڑ لاتا۔ دیبی کے جسم کو عطر و عنبر سے مہکا دیتا۔ اس کی مانگ میں سیندور بھرتا۔ ماتھے پر ٹیکہ لگاتا۔ ہر روز دیبی میں ایک نیا روپ بھرتا اور تقدس کے پھول اس کے چرنوں میں رکھکر آرتی اتارتا اور گڑگڑا کر اس سے التجا کرتا کہ اے دیبی تو مجھے اپنا بنالے۔ مگر اس کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ اتنی التجا پر بھی دیبی نہ مسکراتی! یہ کیوں؟ اس لئے کہ دیبی کو ان پھولوں میں اگلی سی بوئے محبت نہ آتی اور نہ عطر میں وہ خوشبو جس سے اس کا دماغ تازہ ہوجاتا تھا۔ جب پجاری کے ہاتھ سیندور لگانے کے لئے اس کے ماتھے سے مس ہوتے تو غصے اور نفرت کی آگ اس کی آنکھوں سے نکلتی اور پجاری کے دل میں دیبی کے غصے کی دھاک بیٹھ جاتی اور اس کے قدم لڑکھڑا اٹھتے اور وہ اپنا سر ہاتھوں میں لئے بیٹھ جاتا۔ اس کا شیشۂ دل چور چور ہوجاتا۔ ان ٹکڑوں کو دوبارہ جوڑنے کی فکر میں دیبی کے چرنوں پر اپنا سر رکھ دیتا۔ اس امید میں کہ شاید دیبی پھر کبھی مسکرا دے اور ان ٹکڑوں کو باہم جوڑنے مسالہ مل سکے۔ مگر پجاری کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ دیبی کبھی نہ مسکرائی پجاری کی آرتی دیبی کو کیوں پسند نہ آئی۔ کیا اس کے پھولوں میں تازگی اور عطر میں خوشبو سچ مچ نہ تھی۔ پجاری حیران ہو گیا۔ دل میں کہتا کہ پھول تو اسی بیل سے توڑ لایا ہوں، عطر وہی، سیندور وہی، بھجن وہی، مگر دیبی کیوں نہیں مسکراتی؟ اس کی بھونڈی سمجھ اس راز کو نہ پہچان سکی اگر وہ دل سے سوال کرنے کے بجائے اپنے ضمیر سے سوال کرتا تو یہ جواب ملتا کہ دیبی کی پوجا کا حق دار تو نہیں اور نہ دیبی تیری پوجا کو قبول کر سکتی ہے۔ اس کے پجاری کو تیری وجہ مندر سے نکالا گیا۔ وہ روتا، تڑپتا، آہ بھرتا بہت دور ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔ کیا پجاری کمزور تھا۔ کیا اس کے بازوؤں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ تیرا مقابلہ کرتا۔ نہیں وہ تنہا تھا اور تیرے ساتھ بستی کے سب لوگ۔ وہ چاہتے تھے کہ تو اس کا پجاری بنے۔ ہاں صرف تو۔ مگر انھوں نے دیبی سے کیوں نہ پوچھا کہ اس کو کونسا پجاری پسند ہے۔ دیبی بول بھی نہ سکی۔ اس کو ڈر تھا کہ بستی کے لوگ اس کو مندر سے نکال باہر نہ کردیں اور مندر میں دوسری دیبی کا راج ہو وہ دیوتا نہیں بلکہ دیوی تھی۔ حسد کی آگ اس کے دل میں بھڑک اٹھی اور اس نے اپنے دل میں ٹھان لیا کہ چاہے کوئی میری پوجا کرے بستی کے لوگ تو مندر میں آئیں گے میری پرستش ہوگی۔ آرتی اتاری جائے گی۔ دعائیں مانگی جائیں گی۔ وہ تو مجھ سے

خوش ہوں گے کہ میں نے ان کے پجاری کو مندر میں جگہ دی۔ ہاں۔ مندر میں۔ دل میں نہیں۔ پجاری ان کا ہے میرا نہیں۔ وہ مندر میں بیٹھا کرے۔ پھول چڑھایا کرے۔ آرتی اتارا کرے اور بھجن گایا کرے۔ مجھے کیا؛ میں نہیں مسکراتی اور مسکرانے کے لئے میرا دل چاہتا ہے۔ مجھے تو اپنے پجاری کی پوجا چاہیے۔

دن بیت گئے۔ پجاری امید میں رہا کہ میری پوجا قبول ہوگی اور دیوی اسی امید میں رہی کہ شاید میرا پجاری میری محبت سے مجبور ہوکر ایک دن میرے درشن کو آنکلے۔ مگر افسوس کہ وہ کبھی نہ آسکا اس کو بستی والوں کا، پجاری کا، اور ضمیر کی ملامت کا ڈر تھا۔ وہ نیک تھا۔ نتیجہ کے تصور نے اس کو ایسی حرکت سے باز رکھا۔

آخر کیا ہوا! ایک دن پجاری نے اپنی ان تھک پوجا سے تنگ آکر دیوی کے چرنوں پر جان دے دی اور دیبی نے محبت کی آگ سے پژمردہ ہوکر اور ملامت کی تاب نہ لاکر اپنا گلا گھونٹ لیا۔ مگر خطا کس کی تھی؟ نہ تو دیوی کی اور نہ اس کے پجاری کی........ بستی والوں کی.... اگر بستی والے دیبی کے من کے مندر کے پجاری کو مندر میں رہنے دیتے تو آج دیوی کے درشن سے محروم نہ ہوتے اور ایک نوجوان پجاری کی جان بھی نہ جاتی!!

سلیم النسا بیگم

عشرتِ حزیں

حلقۂ احباب میں جب جھومتی ہو زندگی
قہقہوں کی گونج میں کھو جائے آہوں کا خروش
گر رہے ہوں آسماں سے جب ہزاروں آبشار
آسماں پر بن رہے ہوں کہکشانی راستے
سیلِ موسیقی میں بہہ جائے سکوتِ کائنات
اور ایسے میں کسی کی مست نظروں کا پیام

سو گئی ہو حال کے زانو پہ جب فکرِ مآل
نور کے سانچے میں ڈھل جائے فضاؤں کا جمال
چاندنی کی گود میں سو جائے فطرت کا جلال
نیم وا کلیوں میں جاگے پھول بننے کا خیال!
ڈھل گئی ہو جب دلوں سے خود بہ خود گردِ ملال
ہاں فقط میرے لئے بن جائے مبہم سا سوال

پھر کسی صورت دلِ شاعر بہلتا کیوں نہیں
نغمہ و انوار کی زد میں مچلتا کیوں نہیں!!

نظر حیدرآبادی

انیسویں صدی کے بعض سیاسی افکار

(۱) انفرادیئے (Individualists)

انیسویں صدی کے نصف اول میں انفرادیت کے تخیل نے ایک نمایاں سیاسی نظریہ کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ یورپ میں انقلابی انفرادیت کا جذبہ ترقی پر تھا۔ ایک طرف اعتدال پسند جمہوری بھی اس کے علمبردار تھے تو دوسری طرف انتہا پسند جمہوری بھی اس کے حامی تھے فشٹے اور کانٹ نے بھی اس نظریہ کی درمیانی صورت کو انسانی صفات سے متصف کیا۔ مشہور مفکر ولہم فان ہمبولڈٹ (۱۸۳۵-۱۷۶۹ء) نے اس نظریہ کو اپنی کتاب "اختیارات مملکت کی تحدید" میں ایک اعتدالی رنگ میں پیش کیا۔ اس نے یہ بتایا ہے کہ حکومت ایک ناگزیر برائی ہے اور حکومت کے فرائض کار صرف جان و جائداد کی حفاظت تک محدود رہنے چاہئیں۔ اس کا خیال ہے کہ ایک فرد کی غیر محدود آزادی گفتار و کردار انسانیت کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ انگلستان میں بھی انفرادیت کا یہ سخت گیر مزاجی نظریہ کچھ اہمیت حاصل کرچکا تھا۔ چنانچہ طامس پین کی تصانیف متعدد بار شایع ہوئیں اور انہیں برطانوی انتہا پرستی کی انجیل سمجھا جاتا تھا۔ رچرڈ کارلائل (۱۸۴۳-۱۷۹۰ء) نے پین کے نظریوں کی اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ اس کے جریدہ "دی ریپبلیکن" (۱۸۱۹ء) نے بہت مقبولیت حاصل کی گر اسے ضبط کرلیا گیا۔ میجر جان کارٹرٹ (۱۸۲۴-۱۷۴۰ء) بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ہے جو روسو کا ایک جوشیلا شاگرد تھا۔ بنتھم نے "انسانی حقوق" کو ایک "مزاجی افترا" قرار دیا۔ مگر اس کے باوجود ایک عرصہ تک کارٹرٹ نے "انسانی حقوق" کے نظریہ کی تبلیغ کی۔

انگلستان میں انفرادیت کا جو نظریہ رائج تھا وہ بنتھم کا اصلاح کردہ افادی (Utilitarian) نظریہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انتہا پسند فلسفیوں کا وہ نظریہ بھی رائج تھا جو بنتھم سے ماخوذ تھا۔ یہ انفرادی نظریہ تباہ کن حکومتی "مداخلت" کا ردعمل تھا جو اٹھارویں صدی میں نمایاں حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ یہ مداخلت غیر دانشمندانہ تھی۔ اس مداخلت کا مقصد محض مخصوص اشخاص اور سرمایہ دار طبقوں کا مفاد تھا۔ یہ تباہ کن مداخلت مذہب میں بھی کی جارہی تھی۔ یہ تاجرانہ مداخلت اقتصادیات پر بھی حاوی تھی۔ اس مزدورکش مداخلت کا دائرۂ عمل صنعت تک بھی پہنچ چکا تھا۔ یہ مستبدانہ مداخلت اندرون ملک اور سمندر پار کے مقبوضات کے معاملات میں بھی جاری تھی۔ فطری حکومت کے حامیوں نے فرانس میں اس حکومتی مداخلت کے خلاف اور آزادی کامل کے حق میں آواز اٹھائی۔ انگلستان کے وہ پراٹسٹنٹ بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے جو کلیسائے انگلستان کے رکن نہ تھے ان میں گاڈون اور اڈم سمتھ جیسے ماہرین اقتصادیات بھی شامل ہیں فرانسس پلیس جیسے لیبر لیڈروں نے بھی اس تحریک سے دلچسپی ظاہر کی۔ بنتھم اور اس کے شاگردوں کے سے سیاسی مصلحین نے بھی اس نظریہ کو اختیار کیا۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے اولین دور تک یہ نظریہ عام تھا۔ اور یہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نظریہ نے انتہا پسندوں کو بیدار کیا کہ وہ پرانی ناانصافیوں اور دیرینہ کمزوریوں کو ختم کردیں۔

بنتھم کے تمام شاگردوں میں جیمز مِل سب سے بڑا آدمی تھا۔ اس کی زندگی کا اہم مقصد بنتھم کی تصانیف کا انگریزی ترجمہ کرنا تھا

---

[1] اس نظریہ کی رو سے ہر فرد کو عمل کی آزادی ہونی چاہیے۔ (مترجم)

اور اس طرح اس نے بنتھم کی دقیق اور مشکل تصانیف کو ایک اوسط فہم کے انگریز کے لئے قابلِ مطالعہ بنا دیا۔ اس نے اپنے استاد کے اصولوں میں بہت کم اضافہ کیا اور کہیں کہیں تھوڑا بہت اضافہ صرف بنتھم کے اصولوں کی نفسیاتی بنیادوں کو مستحکم کرنے کیلئے کیا تھا۔ ہابس کی طرح اس کا بھی یہی خیال تھا کہ انسان ایک خود غرض حیوان ہے اور اس کی نمایاں خصوصیات آزادی کی محبت اور قوت کی طمع ہیں۔ اس طرح اس نے یہ ثابت کیا کہ اگر اس منفعت اندیش فرد نے ایک مملکت کے قیام اور ایک حکومت کے استوار کرنے میں مدد دی تو اس نے یہ کام صرف ذاتی خواہشات اور افادی مقاصد کے تحت کیا۔ اور افادی مقاصد اپنی زندگی، آزادی اور ملکیت کے دفاع و تحفظ پر مشتمل تھے۔ اس نے یہ بھی بتلایا کہ جن انسانوں کو حکومتی اقتدار تفویض کیا گیا ہے وہ سب لازمی طور پر زیادہ قوت حاصل کرنے کی خواہش کریں گے اور اپنی رعایا کی مختلف آزادیوں کو غصب کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ اس نے اپنے ہمسایہ شہریوں کو بیدار مغز اور چوکسی رہنے کی تلقین کی اور انھیں یہ مشورہ دیا کہ قوتِ حاکمہ کو کمزور کرنے کے لئے صرف ایک نمائندہ ایوان ہونا چاہیے، رائے دہندگان کا حلقہ وسیع ہونا چاہیے، انتخابات اکثر ہونے چاہئیں اور رائے خفیہ طریقہ سے دی جائے۔

جیمز مل ایک تند خو اور زبردست منطقی مفکر تھا۔ اس کا بیٹا جان سٹوارٹ مل (۱۸۰۶ء–۱۸۷۳ء) نرم دل تھا اور اس کے ذہنی تخیلات باہم خلط ملط ہو چکے تھے۔ وہ طبعاً سریع الفطرت تھا لیکن بچپن میں اسے بہت زیادہ تعلیم دے کر اس کی یہ فطرت کچل دی گئی۔ مگر پھر بھی اس کی طبیعت تاثر پذیر رہی۔ لیکن اس کے تعمیری و تخلیقی جذبات ختم ہو گئے۔ سب سے پہلے اس نے بنتھم اور جیمز مل کے افادی نظریہ کو قبول کیا۔ پھر کالرج کی رومانیت کو اخذ کیا۔ بعد ازاں کارلائل کے تخیل کو اپنایا۔ کومت کی ثبوتیت[1] کو اختیار کیا۔ مسز ٹیلر کی نسائیت کے اثر کو قبول کیا۔ اور سینٹ سائمن کی نیم اشتراکیت سے استفادہ کیا۔ اس طرح اس کے ذہنی تخیلات باہم خلط ملط ہو گئے۔ مل ایک ایسا افادیت پسند ہو گیا جو خوشی کے کیفیتی اور کمیتی امتیازات کا اعتراف کرتا تھا۔ وہ ایک ایسا اتاعی (Empiricist) جو شخص محض تجربہ کی بنا پر کام کرتا ہو اور نظریات و استدلال کا قائل نہ ہو) بن گیا جو وجدان و بداہت کی قوت کو محسوس کرتا تھا۔ وہ اس قسم کا حقیقت پسند ہو گیا جس کے اندر بلند تخیل کار فرما تھا۔ وہ ایک ایسا دہریہ بن گیا جو مذہب کا احساس رکھتا تھا۔ وہ ایک ایسا انفرادیت پسند ہو گیا جو اشتراکیت کی طرف واضح رجحان رکھتا تھا۔ تاہم وہ ایک انفرادیت پسند تھا۔ اس کے طبعی مزاج کا انتہائی جذبہ شخصی آزادی سے محبت کی بنا پر تھا۔ اس کی بہترین سیاسی تصنیف آزادی پر گراں قدر مقالہ ہے۔ اس مقالہ میں وہ پوری قوت کے ساتھ آزادئ گفتار اور آزادئ عمل کو پیش کرتا ہے۔ وہ آزادی جو دیگر افراد کی مساویانہ آزادی میں مداخلت نہیں کرتی ـــــ وہ اس مقالہ میں شخصیت کی اہمیت پر زور دیتا ہے اور خوشی کی بجائے خود شناسی کے جذبہ کو زندگی کا انتہائی مقصد قرار دیتا ہے۔ اس نے اس مقالہ میں حکومت کی اس قوت پر جو وہ ایک فرد پر استعمال کرتی ہے سخت پابندیاں عائد کی ہیں۔ اس کی دوسری زبردست سیاسی تصنیف "نمائندہ حکومت" (۱۸۶۱ء) ہے۔ اس کتاب میں وہ جمہوری طرز حکومت پر بحث کرتا ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ عام حقِ رائے دہی سے عوام کو جو تعلیم ملتی ہے صرف وہی تعلیم

---

[1] (Positivism) آغست کومت کا نظام فلسفہ جس کی رو سے صرف ان چیزوں کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے جو دیکھی اور ثابت کی جا سکتی ہوں (مترجم)

جمہوریت کو دوسری ہر قسم کی طرزِ حکومت پر ترجیح دینے کے لئے کافی ہے۔

جب جان اسٹوئرٹ مِل آزادی اور اشتراکیت میں ہم آہنگی پیدا کر رہا تھا اس وقت ہربرٹ اسپنسر (۱۸۲۰ تا ۱۹۰۳ء) پُر زور طریقہ پر یہ ثابت کر رہا تھا کہ آزادی اور اشتراکیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اپنی تصانیف "معاشرتی اعداد و شمار" (۱۸۵۱ء) اور "انسان اور مملکت" (۱۸۸۴ء) میں اس نے قانون سازوں کی غلطیوں کی مذمت کی ہے۔ حکومت کی مسلسل غاصبانہ حرکات پر افسوس کیا ہے۔ کھوئی ہوئی آزادیوں کا ماتم کیا ہے۔ اور اس امر پر زور دیا ہے کہ مملکت کے فرائض پرانی حدود کے مطابق صرف انسان کی زندگی، آزادی اور ملکیت کے قدرتی حقوق کے تحفظ تک محدود رہنے چاہئیں۔ پروفیسر ہکسلے اپنے دوست اسپنسر کے اس نظریہ کو "انکارِ قوتِ انتظامیہ" قرار دیتا ہے۔

(۲) اجتماعیئے (Collectivists)

اسپنسر نے "انسان اور مملکت" میں یہ ظاہر کیا تھا کہ انسان اور مملکت باہم متضاد ہیں۔ یہ وہی نظریہ تھا جس پر روسو نے اظہارِ تاسف کیا اور جس کے شبہات کو دور کرنے کی اس نے بہت کوشش کی تھی۔ یہ امر یاد رکھنا ضروری ہے کہ انسان اور مملکت کے بین تضاد کو دور کرنے کی روسو نے جو کوشش کی تھی یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ قوم کی مشیتِ عامہ کے وجود کا اقرار کیا گیا اور اس مشیتِ عامہ کو قوم کے ہر فرد کی رائے کے مترادف سمجھا گیا۔ اس نظریہ کی بنا پر مملکت کو میکانکی کی بجائے نامیاتی سمجھا جانے لگا۔ اور مملکت کو دانش و تدبر، ضمیر اور قوتِ ارادی کی مالک شخصیت سمجھا جانے لگا۔ روسو کے اس شان دار تخیل نے کانٹ کی زبردست اور موثر ذہانت پر اثر کیا۔ اس نے اسے قانون کے ایک کلیہ کی شکل میں پیش کیا۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ قانون آزادی کے خلاف نہیں بلکہ آزادی کی ناگزیر شرط ہے۔

روسو نے اپنی انقلابی تعلیم کے انفرادی پہلو میں جس نظریہ آزادی کا اظہار کیا تھا وہ کانٹ کی تعلیمات کا اصل اصول بن گیا۔

کانٹ کا قابل ترین اور جوشیلا شاگرد جے۔ جی فشٹے (۱۷۶۲ء تا ۱۸۱۴ء) بھی اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں میں اسی نظریۂ آزادی کی دھن میں لگا رہا۔ فشٹے ایک وسیع المشرب شخص تھا۔ اس نے انفرادیت پر زور دیا۔ روسو کی مدح و ثنا کی۔ اور انقلابِ فرانس کا خیر مقدم کیا۔ اپنی زندگی کے اس دور میں فشٹے نے "انقلابِ فرانس" (۱۷۹۳ء) اور "اصولِ قانونِ فطرت" (۱۷۹۶ء) نامی کتابیں لکھیں۔ جب فرانس نے جرمنی پر حملہ کیا اور "جنگِ جینا" میں پروشیا کو آزادی سے محروم کر دیا تو فشٹے کے نظریہ میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اس نے اپنی مشہور کتاب "جرمن قوم سے خطاب" میں اپنے ہم وطنوں کو لڑائی اور انتقام کے لئے ابھارا۔ وہ قوم پرست اور سیاسی رجعت پسند بن گیا۔ اور انفرادی آزادی کی بجائے اس نے قوم کے اتحادِ مقصد و عمل پر زور دینا شروع کیا۔ اس نے یہ تبلیغ شروع کر دی کہ قوتِ اقتدار کی ضرورت ہے۔ اطاعت لازمی ہے۔ فوجی خدمت ضروری ہے۔ اس نے مملکت کی قربانی کی بہت تعریف کی اور کہا کہ حفاظتی محاصل عاید ہونے چاہئیں تاکہ قوم کے ذرائع آمدنی میں وسعت پیدا ہو۔ یہ سب امور اجتماعیت کی صفاتِ خصوصی ہیں۔

---

[۱] اس نظریہ کے حامی کہ ملکیت اجتماعی ہونی چاہیئے (مترجم)

کمل تبدیلیٔ خیال کی بہترین مثال اس کی مذکورہ بالا اولین تصنیفات اور خود "مکتفی صنعتی مملکت" (سنہ ۱۸۰۰ء) اور "اصول قانون" (سنہ ۱۹۱۳ء) میں موجود ہے۔ تاہم ان متعدد نظریوں کے باوجود وہ کانٹ کی بجائے روسو کا معتقد رہا۔ اس نے صرف روسو کی تعلیمات کے قومی پہلو ـــــ یعنی مملکت کے نامیاتی وجود، قوم کی فرد پر قوتِ اختیار، اور مشیتِ عامہ کی حاکمیت ـــــ پر زور دیا تھا۔ یہ سب اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ وہ ایک انفرادیت پسند سے اجتماعیت پسند بن گیا تھا۔

فشٹے کے نظریۂ اجتماعیت کو، ہیگل نے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ ہیگل انیسویں صدی کا موثر ترین فلسفی تھا اور جامعہ برلن میں فشٹے کا جانشین مقرر ہوا تھا۔ اپنی کتاب "فلسفۂ قانون" (سنہ ۱۸۲۱ء) اور پھر "فلسفۂ تاریخ" میں اس نے مملکت کی اس قسم پر زور دیا جس میں فرد کی حیثیت کمل طور پر اطاعت گزار کی ہو اور فرد کو اجتماعی مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ثابت کیا ہے۔ ہیگل خیالی دنیا میں بسنے والا ایک انسان تھا جو یہ یقین رکھتا تھا کہ کائنات کی بنیاد روح ـــــ یعنی ایک معقول رائے پر ہے۔ وہ ایک ایسا ارتقائی تھا جس نے اسپنسر اور ڈارون سے بھی پہلے اس امر کا اعلان کیا تھا کہ تاریخ لا متناہی اور قادرِ مطلق قوتِ ارادی کے مسلسل ارتقا کی شاہد ہے۔ وہ ایک ایسا اطلاقی تھا جو یہ خیال کرتا تھا کہ ارتقا کا عالمگیر طریق حریت اور قوتِ اقتدار، قانون اور آزادی، قیام اور حرکت استبدادیت اور جمہوریت، اور زندگی و موت کی طرح کے مخالف و متضاد اصولوں کا منطقی عمل اور ردِ عمل ہے۔ اور یہ کہتا تھا کہ حقیقت مطلق ان تمام بین متضاد امور کی ہم آہنگی و توافق پر مشتمل ہے۔ وہ یہ سیاسی فلسفہ پیش کرتا تھا کہ آزاد رائے فرد اور مملکت دونوں کی بنیاد ہے۔ اس کا یہ خیال تھا کہ اس بنیادی آزادی کا احساس و اظہار پہلے پہل خارجی قانون میں ہوتا ہے، پھر داخلی اخلاق میں، بعد ازاں معاشرتی اصولِ اخلاق میں۔ اور آخر کار اس بنیادی آزادی کا احساس و اظہار ریاست کے سیاسی اصولِ اخلاق میں ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کے ثقافتی ارتقا کی انتہائی منزل مملکت ہے۔ اور یہ مملکت مطلق العنان ہے جس میں ہر فرد مملکت کی حقیقی رائے اور بہ حیثیتِ مجموعی قوم کی رائے عامہ کے درمیان ہم آہنگی موجود ہوتی ہے۔ اور صرف مملکت ہی میں فرد آزادی کامل حاصل کرتا ہے ـــــ اور یہ حقیقی آزادی صفاتی ارتقا اور ادائیگی فرض ہے۔ ہیگل کی تعلیمات کی شکل میں سیاسی نظریہ افلاطون کی تعلیمات پر واپس آگیا ہے۔

ہیگلی نظریہ انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں ایک عجیب بوقلموں تاریخ کا حامل ہے۔ جب ترنیشک نے ہیگل کی تمثیلی مملکت کو ہوہن زولرن شہنشاہیت کے مترادف قرار دیا تو بسمارک، بنہارڈی اور ہر ایک جنگِ عظیم کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ جب فیوربک اور کارل مارکس نے کائنات کی اساس کے روحانی ہونے سے انکار کیا اور اسے مادی قرار دیا تو انھوں نے اشتمالیت اور پرولتاری آمریت کیلئے راستہ صاف کر دیا۔ جب آکسفورڈ میں طامس ہل گرین اور اس کے شاگردوں نے ہیگل کے اس نظریہ کو جو اس نے اپنی کتاب "فلسفۂ قانون" میں پیش کیا ہے افلاطون، ارسطو، کانٹ، فشٹے، کارلائل اور ماریس کے قدیم نظریوں کے ساتھ ملایا تو اجتماعیت کے حق میں ایک جوش پیدا ہو گیا جس نے آخر کار فیبین اشتراکیت کی شکل اختیار کر لی۔

طامس ہل گرین (سنہ ۱۸۳۶ء تا ۱۸۸۲ء) ایک زبردست اور شریف الطبع انسان تھا مگر اعلیٰ پایہ کا مفکر نہ تھا۔ اس کی تحریر میں فصاحت بیان کی صفت موجود نہیں تھی۔ اس نے جرمن فلسفہ کو دوبارہ زندہ کیا "مبادیاتِ اخلاقیات" اور "سیاسی ذمہ داری کے اصول"

میں اس نے ہیوم کی مادیت، بنتھم کی افادیت، اسپنسر کی انفرادیت جی ایچ لے ویس کی ثنویت کی مخالفت کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان ایک روحانی ہستی ہے جو لا انتہا قیمت اور غیر محدود امکانات رکھتی ہے۔ اس کی ترقی کامل کے لئے آزادی کا ہونا ضروری ہے اور یہ آزادی صرف مملکت ہی میں قائم رہ سکتی ہے۔ نیز مملکت کا مقصد اعلیٰ ان رکاوٹوں کو دور کرنا ہے جو ایک فرد کی مشتر زندگی کے راستہ میں حائل ہیں۔ گرین کے سیاسی فلسفہ میں کانٹ کا اثر ہیگل سے زیادہ نمایاں ہے۔

(۴) اشتراکی (Socialists)

اس میں شک نہیں کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں انفرادیت کا نظریہ عروج پر تھا۔ مگر اس نظریہ کے ساتھ ساتھ اشتراکیت (سماج کو ملکیت کی مساوی تقسیم کی بنیادوں پر دوبارہ قایم کرنے اور مقابلہ کی بجائے شراکت کا اصول جاری کرنے کا نظریہ) کی تین چھوٹی چھوٹی شاخیں بھی نمودار ہوتی گئیں اور آخرکار یہ تینوں شاخیں مارکسی اشتمالیت کی شکل میں متحد ہوگئیں۔

اشتراکیت کی پہلی شاخ فرانسیسی تھی۔ اس کا آغذ روسو کی غیر فانی تعلیمات تھیں۔ روسو نے منجملہ دیگر باتوں کے یہ بھی کہا تھا کہ "انسانی تاریخ کے فطری دور میں تمام انسان آزاد اور ایک دوسرے کے برابر تھے۔ تمام اشیا مشترکہ سمجھی جاتی تھیں اور ہر فرد اپنی ضرورت کے مطابق ذخیرۂ عامہ سے چیزیں لے لیا کرتا تھا۔ جب شخصی ملکیت کے ادارہ کا قیام عمل میں آیا تو انسان کی مسرت اور اس کی معصومیت کا خاتمہ ہو گیا۔ مارلے نے اپنی کتاب "قانونِ فطرت" (۱۷۵۵ء) میں اور مابلے نے اپنی کتاب "اصولِ قانون" (۱۷۷۶ء) میں روسو کے نظریۂ اشتمالیت کو اور ترقی دی۔ علاوہ ازیں انقلابی عہد میں بابوف (۱۷۹۷ء) نے اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ لیکن انقلابِ فرانس بنیادی طور پر ایک انفرادیت پسند تحریک تھی ـــــ اس کی اساس مساوات کی بجائے آزادی پر رکھی گئی تھی ـــــ اس لئے اشتمالیت کو کچھ عرصہ کے لئے پس پشت ڈال دیا گیا۔ جب یہ انقلابی دور ختم ہو گیا تو اشتمالیت ایک اعتدال پسند اور ولاویز شکل میں دوبارہ نمودار ہوئی۔ کومت ڈی سینٹ سائمن (۱۸۲۵ء) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ غریب طبقہ کا مفاد اس امر میں مضمر ہے کہ زمین، زر اور پیداوار کے تمام ذرائع مشترک ہوں۔ ہر شخص اپنی بساط و قابلیت کے مطابق کام کرے اور اس کی خدمات کے مطابق اسے معاوضہ دیا جائے۔ اسی زمانہ میں سی، ایم، فورئر (۱۸۳۷ء) نے تجویز پیش کی کہ تمام بنی نوع انسان کو فیلانسٹری (فورئر کے نظام اشتراکیت کے پیرو) دوبارہ منظم کریں۔ تمام کو پانچ پانچ سو خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔[۱] ہر حصہ مکمل بالذات اور اشتمالی اصولوں پر مبنی ہو۔ پی، جے، پرودھوں (۱۸۶۵ء) نے شخصی ملکیت اور حکومت پر شدید نکتہ چینی کی۔ اس کا خیال تھا کہ حکومت کا وجود صرف شخصی ملکیت کے ادارہ کے قیام کی وجہ سے ہے۔ اس نے اس امر کا اعلان کیا کہ قیمت کا واحد معیار اور اساس مزدوری ہے۔ لوئی بلینک (۱۸۸۲ء) نے مزدوروں کو گلڈ[۲] اشتراکیت کے اصولوں پر منظم کرنے کی ایک جامع تجویز پیش کی۔

---

[۱] اشتراکیت کی وہ قسم جس کی رو سے سارے سماج کو مختلف پیشوں کی برادریوں میں تقسیم ہونا چاہیے اور ہر پیشہ کی حکومت اسی کی کونسل کے ہاتھ میں ہو (مترجم)

اشتراکی رجحان کی دوسری شاخ انگلستان میں نمودار ہوئی۔ گزشتہ زمانہ کے مفکر جان بال کے اعتراضات، مور کی تصنیف "یوٹوپیا" اور ہیرنگٹن کی کتاب "اوشیانا" کے سے تخیل، ایویرڈ اور ونسٹینلے کی طرح کے سترھویں صدی کے اشتمالیوں کی تصنیفات و تجربات، اور ولیم اوگل وی اور طامس سپنس کے سے اٹھارویں صدی کے مفکرین کے خیالات پر اس شاخ کی بنیادیں استوار کی گئیں۔ یہاں طامس پین اور ولیم گاڈون کا ذکر کرنا کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ انھوں نے اپنے انفرادیت پسند نظریوں کے دوران میں چند بے ربط اور غیر متناسب اشتمالی خیالات پیش کئے ہیں۔ انیسویں صدی کے ربع اول میں چھ عظیم الشان ہستیوں نے ترقی پسند اشتراکی لائحہ عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ ان شخصیتوں کی زندگیوں اور کارناموں سے مفصل آگاہی حاصل کرنے کے لئے قارئین کو پروفیسر فاکس وال کی کتاب "رائٹ ٹو دی ہول پروڈیوس آف لیبر" (مطبوعہ اے۔ مینگر ۱۸۹۹ء) کا اور ایم۔ بیر کی تصنیف "تاریخ اشتراکیت برطانیہ" (۲۰-۱۹۱۹ء) کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان مفکرین کے نام چارلس ہال، رابرٹ اوون، ولیم ٹامپسن طامس ہاج سکن، جان گرے اور جان فرانسس برے ہیں۔ اپنے نظریات میں انھوں نے اکثر اقتصادی غلطیاں اور سراب آسا انکشافات کئے ہیں۔ کارل مارکس کی تعلیمات کی بنیاد انھیں غلط اقتصادی نظریوں اور انکشافات پر ہے۔ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ ۴۸-۱۸۳۷ء کی تحریک منشوریت میں اشتمالی عنصر غالب تھا۔ لڈلو، ماریس اور کنگسلے کی پیش کردہ عیسوی اشتراکیت بھی کچھ عرصہ (۵۴-۱۸۴۸ء) تک مقبول رہی حالانکہ اس عیسوی اشتراکیت کا بنیادی نظریہ اشتراکیت کی بجائے تعاون تھا۔

اشتراکی رجحان کی تیسری اور آخری شاخ جرمنی میں پیدا ہوئی۔ اس کی بنیاد ہیگلی فلسفۂ مملکت اور اس کے واسطے سے روسو کے نظریہ پر تھی۔ جرمن اشتراکیت کے مندرجۂ ذیل تین علمبردار تھے:۔

(۱) "کارل مارلو" (پروفیسر ونکل بلیخ ۶۵-۱۸۱۰ء) اپنے زمانہ کی اقتصادی برائیوں کا علاج اس نے اجتماعی ملکیت تعاونی پیداوار، دولت کی تمام قوم میں تقسیم اور آبادی کو حد سے بڑھنے نہ دینے میں پایا۔

(۲) کے۔ جے۔ روڈ برٹس (۷۵-۱۸۰۵ء) اس نے قیمت کا مزدوری نظریہ پیش کیا۔ دولت کے سود اور زمین کے لگان اور کرایہ کو ایک ظلم قرار دیا۔ اس نے مستقبل کی ایک ایسی اشتمالی ملی مملکت کا نقشہ پیش کیا جس کا قیام اگرچہ مستقبل قریب میں ناممکن تھا مگر اس مملکت میں ہر فرد ایک دوسرے کے برابر ہوگا اور ہر شخص کو اس کی سماجی خدمت کے مطابق معاوضہ دیا جائے گا۔

(۳) فرڈیننڈ لازیل (۶۴-۱۸۲۵ء) اس نے اگرچہ پروڈھون، بلینک، مارلو اور روڈ برٹس کی تعلیمات میں چنداں اضافہ نہیں کیا۔ مگر اس نے اشتراکیت کی نشر و اشاعت نہایت فصاحت و بلاغت اور جوش و خروش سے کی۔ ۱۸۶۳ء میں اس نے "انجمن مزدوراں" بناکر "جرمن سماجی جمہوریت" قائم کی۔

اشتراکی رجحانات کی یہ تینوں شاخیں کارل مارکس (۸۳-۱۸۱۸ء) کی اشتمالیت کی شکل میں متحد ہو گئیں۔ مارکس کا لاطینی نام موڈیشیا تھا۔ وہ طریوس کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس نے بون اور برلن کی جامعات میں ہیگلی فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ وہ شروع شروع میں ایک انقلابی صحافی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی زندگی کا یہ دور مختصر مگر کٹھن تھا۔ چنانچہ وہ پیرس بھاگ گیا اور وہاں (۴۵-۱۸۴۳ء) پروڈھون اور دوسرے فرانسیسی اشتراکیوں سے اس نے بنی نوع انسان کی تنظیم نو کے متعلق بہت کچھ سیکھا۔ ۱۸۴۵ء سے ۱۸۴۸ء تک اس نے بلجیم میں عارضی

قیام گیا۔ ۱۸۴۸ء میں جرمنی واپس آکر ایک مختصر سا عرصہ رہا اور پھر لندن چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنی زندگی کے بقیہ ایام (۱۸۴۹ء-۱۸۸۳ء) مطالعہ، تصنیف، تنظیم اور تحریک میں صرف کئے ——— یہ سب کام اس نے معاشرتی انقلاب اور عالمگیر اشتمالی دولت متحدہ کے قیام کے لئے کئے۔ اس کی تجاویز کے معاشرتی عناصر فرانسیسی، اقتصادی اجزا انگریزی اور سیاسی اصول المانوی تھے۔ اس نے اپنی تعلیمات و تجاویز کو مشہور عالم "اشتمالی منشور" ۱۸۴۸ء کی شکل میں بہترین و موثر پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ لندن میں ۱۸۶۴ء میں ایک اشتمالی کانفرنس ہوئی تھی اس کے نتیجہ کے طور پر مارکس کی تصنیف "سرمایہ" (۱۸۶۷ء) "اشتمالی منشور" سے ضخیم ہے۔ اس کتاب کا انداز بیان نہایت مشکل ہے۔ مگر "اشتمالی منشور" میں پیش کئے ہوئے سیاسی نظریہ کے علاوہ اور کوئی نیا سیاسی نظریہ اس کتاب میں موجود نہیں ہے۔

مارکسی تعلیم کے مندرجۂ ذیل پانچ اجزا ہیں:—

(۱) تاریخ کے متعلق مادی نظریہ اس نظریہ کے مطابق انسانیت کا ارتقا خیالات کی بجائے جسمانی ضروریات کی وجہ سے ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے۔

(۲) طبقاتی جنگ کا نظریہ۔ اس نظریہ میں تہذیب کے عروج و زوال، مملکتوں کے عروج و زوال، اور معاشرتی نظاموں کی تبدیلیوں کو بیان کیا گیا ہے۔

(۳) قیمت اور فاضل قیمت کا مزدوری نظریہ۔ اس نظریہ کی رو سے طبقاتی جنگ کو درست اور جائز قرار دیا گیا ہے۔

(۴) اقتصادی جبریت کا نظریہ۔ اس نظریہ میں مارکس نے سرمایہ وار تہذیب کا زوال ناگزیر بتایا ہے اور پرولتاری جنت کی پیشین گوئی کی ہے۔ اور (۵) ایک اشتمالی لائحہ عمل جسے بہت جلد بروئے کار لانے کو کہا گیا ہے تاکہ سرمایہ وار تہذیب کا ناگزیر زوال جلد تر وقوع میں آئے اور بے رحم سمت کا نفاذ آسان ہو۔

(ترجمہ)

اکرام قمر ہوشیارپوری

اطلاع

جو اصحاب اپنے مضامین سب رس میں اشاعت کے لئے بھیجتے ہیں، اگر وہ قابل اشاعت قرار پائیں تو ان کو سلسلہ وار شائع کیا جاتا ہے۔ جو مضامین ناقابل اشاعت ہوتے ہیں ان کو واپس نہیں کیا جاتا۔

براہ کرم مضمون نگار صاحب اپنے ہاں مضامین کی نقل رکھیں۔

علم ہیئت و جغرافیہ

(اس مضمون میں جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں اڈیٹر کو ان سے اتفاق ہونا ضروری نہیں۔ جو صاحب بھی اس کا جواب لکھ بھیجیں اس کو شکریہ کے ساتھ شایع کیا جائے گا۔)

شاہ دکن نے علوم و فنون کے وہ دریا بہائے کہ جو لوگ پہلے سے علمی کاموں میں مشغول تھے، وہ میدانِ علم میں اور آگے بڑھ گئے۔ وہ اقوام جو صدیاں گزرنے پر بھی علم و فن سے ناآشنا تھیں علم و فن کے میدان میں داخل ہوئیں اور آگے بڑھنے والوں نے اپنی جگہ خالی کی تو ان شائقین جدید نے ان کی جگہ لے لی۔ ہر کس و ناکس تحصیل علم و کمال میں مشغول نظر آتا ہے اور ملک میں ایسے افراد پیدا ہوئے ہیں کہ زمانہ ان پر فخر کرسکتا ہے ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ جن علوم و فنون کی کتابیں اس وقت زیر درس ہیں ان کو بھی ایک قدم آگے بڑھایا جائے۔ اور جن ابتدائی مضامین کے عامۃ الناس عادی ہوگئے ہیں۔ اور ابتدائی منزل کو معراجِ کمال سمجھے ہوئے ہیں' ان کے آگے علم و فن کا نیا باب کھول دیا جائے۔ اور یہی سلسلۂ ترقی جاری رہے۔ تاکہ میدان علم و فن کو راہ تقلید کا اڈا نہ بنا رہے۔ علم ہیئت و جغرافیہ بھی ایک فن ہے۔ اس فن کی جس قدر کتابیں زمانے میں پڑھائی جاتی ہیں، ان کا یہ نظریہ ہے کہ زمین اور چاند مل کر ایک ہی سیارہ ہے اور زہرہ و عطارد تین سیارے، شمس کے اطراف چکر لگاتے ہیں اور شمس کے تابع ہیں۔ اور دورِ حاضر نے اس کا نام نظام شمسی رکھا ہے۔ اس کے سوا اور بہت سے نظریے ہیں۔ مثلاً فیثاغورس کا نظریہ۔ بطلیموس کا نظریہ او دورِ حاضرہ یعنی ہیئت قدیم، متوسط، جدید۔ ان نظریوں پر تنقید اور غور و فکر کرنا رصدگاہ میں ایک زمانہ گزارنے کا نتیجہ ہے۔ اس نظریہ کی رو سے تمام سیارے زمین کے اطراف چکر لگاتے ہیں، جس میں بعض کی سیر مشرق سے مغرب کی طرف اور بعض کی مغرب سے مشرق کی طرف ہے اس لحاظ سے اس نظام کا نام نظامِ ارضی قرار دینا زیادہ موزوں ہوگا۔ نظامِ ارضی کا یہ نظریہ ماہران و نقادان فنِ ہیئت و جغرافیہ کے آگے پیش کیا گیا اور اس کے دلائل عقلی و نقلی جو تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہیں دکھائے گئے اور ذکی الحس ماہرانِ فن ہیئت و جغرافیہ نے اسے تسلیم کیا۔ اور بعض متحیر و متردد ہیں۔ یہ چند سطور ان کے تحیر و تردد کو رفع کرنے کی غرض سے لکھی جاتی ہیں۔ جغرافیہ پڑھانے کا پسندیدہ طرز تعلیم اور اصول تفہیم یہ ہے کہ جغرافیہ کی ابتدا، ساکن مسکن اور اس کے ماحول سے کی جائے۔ مثلاً ایک شخص اپنے گھر میں رہتا ہے تو جغرافیہ کی ابتدا اسی کے گھر سے کی جائے۔ پھر شہر، پہاڑ، دریا، سمندر وغیرہ دکھائے جائیں۔ نیوٹن کا قول ہے کہ حرکت کشش کے بغیر پیدا نہیں ہوتی حکما و فلاسفہ بھی اس رائے سے متفق ہیں۔ اور ٹائچو براہی جو محققین فن ہیئت میں بہت بڑا پایہ رکھتا ہے۔ ....

...... اس نظریہ سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ زمین ساکن ہے۔ اور تمام سیارے اس کے گرد چکر لگا رہے ہیں ٹائچو براہی کو اپنی رائے پر اتنا وثوق تھا کہ جب اس کے پاس نظام شمسی کے تا مین مارگلیہ۔ کوپرنیکس کیپلر۔ نیوٹن نے دوائر فلکیات کے تجربات کو جو ماہر نظام شمسی نے بغرض تصدیق پیش کیا تو اس نے ان تجربات کو بغور ملاحظہ کرنے کے بعد بھی جواب میں یہی کہا کہ میرا پہلا قول ہی صحیح ہے۔ یعنی زمین ساکن ہے۔ اور تمام سیارگان زمین کے اطراف چکر لگا رہے ہیں۔ اس کا بیان کسی اور وقت وضاحت سے آئے گا۔

یہ تمام خیالات اور افکار پچھلے لوگوں کے ہیں جو ان کے تجربوں پر مبنی ہیں لیکن اس خیال کی تقلید ضروری نہیں۔ تحقیق کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھلا ہوا ہے۔ انسان کو کسی خیال پر اس وقت تک قایم نہ ہونا چاہیے جب تک خود بھی اس کی تحقیق و تجربہ

نہ کرے اس نظریہ کے تحت ہم نے تحقیق کا دروازہ کھٹکھٹایا نظامِ شمسی کے نظریہ پر پہلے زمین سے پتھر اٹھایا اور آسمان کی طرف پھینکا وہ زمین پر آرہا۔ اتفاقاً وہاں ایک بلند پہاڑ پر آم کا درخت تھا اوپر کی ڈالی سے ایک آم ٹوٹا خیال ہوا شاید آم آفتاب میں جگہ لے گا لیکن وہ بھی زمین پر آپڑا۔ بعد خیال آیا کہ طیارے ہوا میں ہزاروں فٹ بلندی پر پرواز کرتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی چیز پھینکی جائے تو شاید سورج میں پہنچ جائے گی لیکن تجربہ نے بتلایا کہ وہاں سے بھی زمین پر ہی آگرتی ہے۔ پھر خیال نے پرواز کی کہ طیارہ شکن توپیں سمت الراس کی طرف گولا پھینکتی ہیں اور فی ثانیہ ان کے گولے میلوں بلند پہنچتے ہیں ممکن تھا کہ کسی وقت ان کا گولا غلطی ہی سے کبھی آفتاب میں ٹھہر جاتا لیکن تجربہ نے اس کی نفی کی۔

حالیہ جنگ میں یہ ہو رہا ہے کہ طیارے بجائے بم اندازی کے توپیں سر کر رہے ہیں اگر ایسا طیارہ پوری بلندی پر بھی چلا جائے اور وہاں سے ادھر کی طرف توپ سر کی جائے تو اس صورت میں بھی تجربہ میں کوئی اضافہ نہ ہو سکے گا اور نہ گولا آفتاب میں جگہ لے سکے گا۔ بلکہ وہ بھی زمین پر آرہے گا پھر یہ فکر دامن گیر رہی کہ اور کون سا تجربہ کیا جائے جس سے سورج کی کشش کا پتہ چلے۔ خیال کی جولان گاہ میں ایک بات آئی کہ شہابِ ثاقب جو فضاءِ بسیط سے نکلتے ہیں وہ کہاں جاتے اور کہاں جمع ہوتے ہیں۔ دوربین سے دیکھا گیا بلکہ رصدگاہ کی اس دوربین سے دیکھا گیا جس سے یورانس اور نیپچون (فلک الثوابتہ اور فلک الافلاک) کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ جو ہیئت جدید و متوسط اور قدیم کے آرا کے لحاظ سے ساری کائناتِ عالم کا انتہائی نقطہ ہے۔ ایسی دوربین سے دیکھنے پر بھی شہابِ ثاقب فضائے بسیط سے زمین پر ہی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ نظر تو آسمان کی طرف لگی ہوئی تھی ایک سال تک یہی عمل جاری رہا سال بھر تک تمام رات جاگتے جاگتے ختم کی گئی لیکن کبھی ایسا مشاہدہ نہ ہوا کہ کوئی شہابِ ثاقب سورج میں جاتا تو درکنار زمین کی مخالف سمت جاتا یا بازو سے کتراتا ہوا گزر رہا ہو بلکہ ہوا کی مخالفت کے باعث تڑپتا ہوا زمین پر گرتا ہوا دکھائی دیا۔ بسا اوقات اس کے ذرات بلکہ ایک ایک پونڈ کے ٹکڑے زمین پر پائے گئے جس سے ثابت ہوا کہ ان سب کا میلان گاہ زمین ہی ہے اور ہونا بھی چاہیئے کیونکہ زمین ہی ہر چیز کا میدان ہے۔ اور وہی اس کا معاد قرار پائے گی۔ اور ان تمام تجربات سے زمین کی کشش ثابت ہوتی ہے۔ جب سائنٹفک تجربہ نے بتایا کہ سب چیزیں زمین پر گرتی ہیں کوئی سورج کی طرف نہیں جاتی۔ تو معلوم ہوا کہ ساری کشش زمین میں ہے نہ کہ آفتاب میں۔

فیثاغورس اور دورِ حاضر کے ماہرین فن ہیئت و جغرافیہ جو ماہر فلکیات بھی تھے ان کا نظریہ یہ ہے کہ زمین مع چاند کے اور زہرہ عطارد یہ تینوں سورج کی کشش میں ہیں اگر ان کا یہ نظریہ درست رہتا تو مذکورہ تجربات میں سے کوئی چیز کبھی تو اپنا گھر سورج میں بناتی کو غلطی سے ہی۔

ہماری رائے ہے کہ فیثاغورس کو مذکورۂ بالا خیال اس وقت سے پیدا ہوا جب کہ وہ رصدگاہ میں بیٹھا ہوا زہرہ اور عطارد کو آفتاب کے مقابل دیکھ رہا تھا۔ اس کو آفتاب میں سیاہ دھبہ نظر آیا۔ اور جب یہ مقابل سے جاتا رہا تو آفتاب میں سیاہ دھبہ کا وجود نہ تھا۔ اور زہرہ و عطارد بھی اس وقت نظر سے اوجھل تھے۔ یہیں سے اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ زہرہ و عطارد اور زمین مع چاند کے آفتاب کا چکر لگا رہے ہیں۔

کیونکہ آفتاب زمین سے جسامت میں بہت بڑا اور زمین کی بہ نسبت آفتاب مختلف خوبیوں کی بدولت ممتاز ہے اور زمین کے

حیوانات و نباتات جہاں تک آفتاب کی روشنی رہتی ہے زندہ ہیں اور غالباً ایسے ہی تصورات کی بنا پر آفتاب کی پرستش کی جاتی تھی جس کا نمونہ اب تک موجود ہے یہ بھی ممکن ہے کہ فیثا غورس اور دور حاضر کے ماہرین کا نظریۂ نظام شمسی محض تفہیم کے لئے ہو۔ جو بطور مثال کے اختیار کیا گیا ہے۔ تاکہ بات جلد سمجھ میں آجائے اور فن سے لگاؤ پیدا ہو۔ ان کا خیال یہ ہوگا کہ آئندہ نسلیں تحقیق کریں گی اور معلومات حاصل کرکے اس پر اضافہ کریں گی اس کے قطع نظر ان لوگوں کو آلات مثل جہاز طیارہ، کیمرا، اور دوربین، ریڈیو وغیرہ جو فی زمانہ موجود ہیں نہ مل سکے۔ تاہم فیثا غورس اور دور حاضر کے ماہرین نے محنتِ جانکاہ سے کواکب و سیارگان کے عکوس نقشہ جات، محوری گردش دریافت کرنے کے آلات وغیرہ تیار کئے ہیں۔ جو خراج تحسین حاصل کرنے کے مستحق اور تاریخ عالم کے صفحات پر آب زر سے لکھے ہوئے ہیں۔ ان حالات کے مدنظر صرف ایسے پرانے خیالات پر اس روشن زمانہ میں قناعت کرنا اور ان کی کورانہ تقلید کرنا درست نہ ہوگا۔
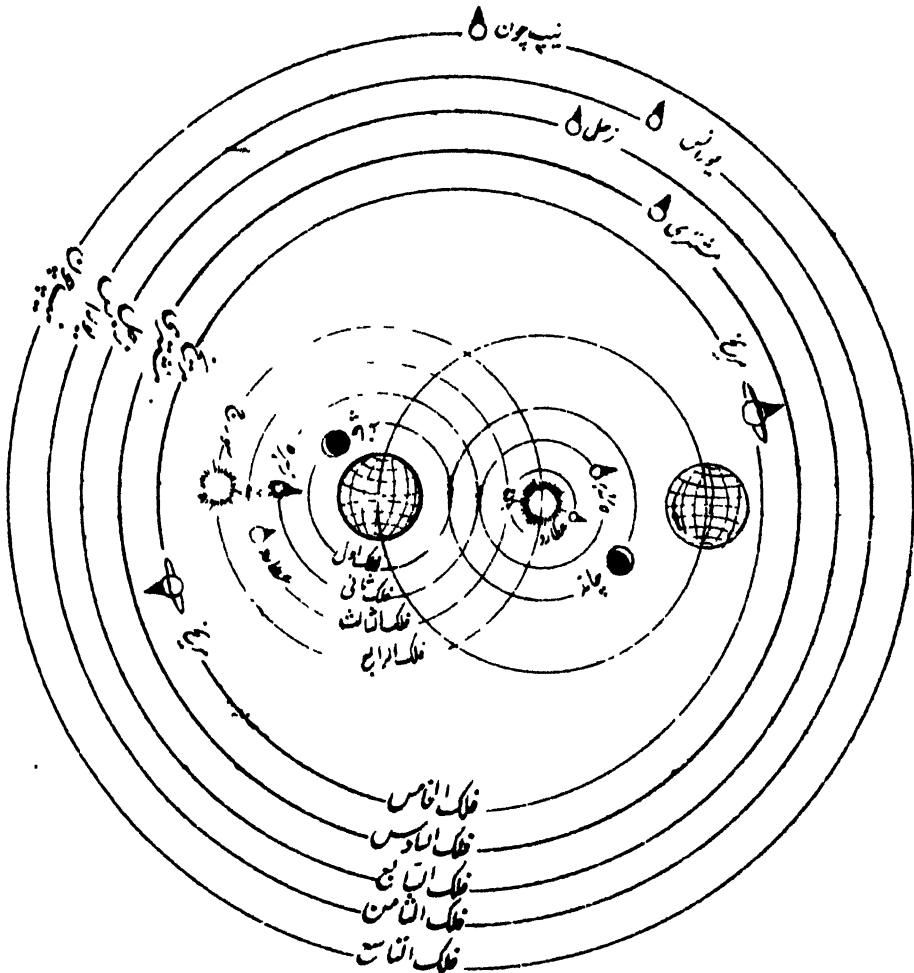
جو آلات فی زمانہ استعمال ہوتے ہیں ان کی مدد سے تحقیق کو آگے بڑھانا ہمارا فرض قرار پاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اس سلسلہ میں ایک کتاب

لکھی ہے جس میں اپنی تحقیقات کے دلائل واضح طور پر پیش کئے ہیں جو براہین نظریہ محسوسہ. سمعیہ. لامسیہ. بصریہ پر مشتمل ہیں. اور جو بالکل سائنٹفک تجربہ پر مبنی ہونے کے باوجود عام فہم بھی ہیں. جس طرح یہ کتاب عقل و نقل و درایت کے مطابق اور صاحبان معقول وارباب منقول دونوں کے لئے مفید ہے. نیز اس کتاب میں دوائر فلکیات کثرت سے دیئے گئے ہیں. جس کے منجملہ ایک شکل ضرور تا درج کی گئی ہے. جس سے معلوم ہوگا کہ رصادان عالم کو کہاں کہاں غلط فہمی ہوئی ہے. امید کہ نقادان فن ہیئت ہماری اس تحقیق و تدقیق پر غور کریں گے. جو دوائر متنازعہ فیہ ہیں، وہ دوائر زہرہ عطارد اور شمس ہیں اس لئے ان کے دوائر بھی علحدہ علحدہ بتا دیئے گئے ہیں. (نقشہ گزشتہ صفحہ پر ملاحظہ ہو)

ان دونوں کواکب کی تصویروں سے اس بات کی کیفیت کا اندازہ ہوگیا ہے کہ کوئی سیارہ جب دوسرے کے لئے حاجب ہوتا ہے تو محجوب میں کیا کیفیت ہوتی ہے. اس سے ظاہر ہو جاتا ہے. نیز موسم کا پیدا ہونا اور اس کا تغیر و تبدل. تواریخ شمسی و قمری چاند گہن و سورج گہن کے مسائل بتائے گئے ہیں اور ان کو دلائل معقول و منقول سے ثابت کیا گیا ہے. اور ایسے نظریے جن کے ثبوت میں کوئی معقول دلیل نہیں نظر انداز کئے گئے ہیں. چونکہ ہمارا مذہب معقول ہے ہم معقول بات کو پسند کرتے ہیں.

عید

سید اسمٰعیل

عید کا دیکھو نظر آیا ہے چاند
عید کی لے کر خبر آیا ہے چاند

اک طرف شانِ امیری رقص و رنگ
اک طرف دنیا غریبوں کی ہے تنگ

اک طرف عیش و نشاطِ بے پناہ
اک طرف عسرت سے حالت ہے تباہ

اک طرف سرمایہ داری باغ باغ
اک طرف مزدور کا دل داغ داغ

اک طرف خوش حالیاں اور واہ واہ
اک طرف بدحالیاں ہیں آہ آہ

اک طرف فرعونیت آمادگی
اک طرف ہے بندگی بے چارگی

اک طرف شور مبارک باد ہے
اک طرف بس نالہ و فریاد ہے

اک طرف وہ قہقہوں کا زور ہے
اک طرف آہ و بکا کا شور ہے

اک طرف پوشاک رنگا رنگ ہے
اک طرف عریانیوں کا رنگ ہے

اک طرف خوش حالی و آسودگی
اک طرف بدحالی و فرسودگی

اک طرف تحفہ ہے عطر اور پان کا
اک طرف بس خون ہے ارمان کا

اک طرف سب صاف ہیں اور پاک ہیں
اک طرف سب سر سے پا تک خاک ہیں

شیر خرما اور سوئیاں اک طرف
قلبِ سوزاں چشمِ گریاں اک طرف

دیکھکر یہ عید اونچ اور نیچ کی
عید کی آزاد نے بھی ہیچ کی

اے مہ خوبی تو نازِ عید ہے
عشق تیرا بے نیازِ عید ہے

"عید گاہ ما غریباں کوئے تو
انبساطِ عید دیدن روئے تو"

سید محمد حسین آزاد

حیاتِ نو

نہ رو ہمنشیں! آئیں گے دن خوشیاں منانے کے!
نئے انداز سیکھے گی یہ دنیا، مسکرانے کے!

لکھی جائیں گی تازہ داستانیں حسن والفت کی
فسانے محو ہو جائیں گے سب اگلے زمانے کے!

مسرت پھول برسائے گی باغِ زندگانی پر
نظر افروز منظر ہوں گے سارے کارخانے کے!

نئے انداز ہوں گے حسنِ خود بیں کی اداؤں میں
نئے عنوان ہوں گے عشق والفت کے فسانے کے!

بدل جائے گا سب کچھ، رنج کے دن، ہجر کی راتیں
عجب کچھ کیف پرور روز و شب ہونگے زمانے کے!

مسرت صفحۂ ہستی سے نقشِ غم مٹا دے گی
گزر جائیں گے یہ مایوس دن رونے رلانے کے!

حیاتِ نو کے ہونٹوں پر تبسم کھیلتا ہوگا
بدل جائیں گے یہ بدلے ہوئے تیور زمانے کے!

زمیں کا چپہ چپہ غیرتِ باغ ارم ہوگا
لٹانے گا دُر و گوہر فلک اپنے خزانے کے!

غرض سارے اصولِ زندگی بدلے ہوئے ہوں گے
قفس کی تیلیاں تنکے بنیں گی آشیانے کے!

اختر

فریبِ تمنّا

شکارِ گردشِ دوراں بنا ہوا ہوں میں
تغیّرات کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

کچھ ایسے سازِ شکستہ کی اک صدا ہوں میں
دلوں میں درد کی صورت سما گیا ہوں میں

سمجھ سکے مجھے کیوں کر کوئی کہ کیا ہوں میں
وہ ابتدا ہوں کہ خود رازِ انتہا ہوں میں

ہنوز وہ ہیں اور ان کا فریب جلوہ گری
کہ شاخِ گل پہ نشیمن بنا رہا ہوں میں

مرے وجود سے قایم ہے نظمِ دو عالم
زمانہ عکس ہے میرا اور آئینہ ہوں میں

نشاطِ ہستیٔ موہوم کچھ نہیں ہے ظفر
فقط فریبِ تمنا ہے کھا رہا ہوں میں

ظفر (عثمانیہ)

نئی کتابیں

۱۔ بیان غالب (مجموعہ شرح کلام غالب) از آغا محمد باقر ۴۸۶ صفحہ قیمت عاں۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب۔ لاہور۔

۲۔ پاکیزہ محبت (ناول) از پنڈت وگپال وملکراج سرا، ۲۴۴ صفحہ قیمت عسم پریم سنگھ کشن لال تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

۳۔ خزینہ رباعیات از شفق عماد پوری ۵۴۴ صفحہ قیمت عہ شفق بک ڈپو۔ حاجی پور۔ رفیق گنج۔ گیا۔

۴۔ میلاد شہید (منظوم) (قصائد و نظمیں) مرتبہ انتظام اللہ اکبر آبادی ۴۰ صفحہ قیمت ۴ر مصطفائی بکڈپو متصل میوہ کٹرہ۔ آگرہ۔

۵۔ منتخب داغ حصہ اول و دوم (انتخاب کلام داغ) مرتبہ احسن مارہروی ۴۰۰ صفحہ قیمت صہ انوار احمدی پریس۔ الہ آباد

۶۔ پھر یری (افسانے) از عظیم بیگ چغتائی قیمت عاں۔ کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳۔

۷۔ خونی تحریکیں (انقلابی تحریکیں) از اظہر امرتسری۔ ۳۰۰ صفحہ قیمت عہ۔ عالمگیر بکڈپو۔ لاہور۔

۸۔ نادر شاہ اور ستارہ (تاریخی ناول) از عبدالرحیم شبلی ۲۵۰ صفحہ قیمت عہ 〃 〃 〃

۹۔ زرتشت اعظم کاروان (تاریخی ناول) از سید احسان علی شاہ ۳۰۰ صفحہ قیمت عہ 〃 〃 〃

۱۰۔ تاریخی افسانے از مولانا احمد ایم۔ اے ۳۰۰ صفحہ قیمت عہ 〃 〃 〃

۱۱۔ روسیو کی داستان عشق مرتبہ ادارہ عالمگیر قیمت ۱۲ر 〃 〃 〃

۱۲۔ علم الحروف از حکیم محمود علی خاں ماہر ۲۵۰ صفحہ قیمت ۳ے محمود منزل۔ روشن آرا روڈ۔ دہلی۔

۱۳۔ کلیات میر (نیا ایڈیشن) مرتبہ عبدالباری آسی و سید جعفر علی ۹۶۰ صفحہ قیمت صہ۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔

۱۴۔ مجموعہ قوانین دیوانی و مال جدید ترمیم شدہ قیمت ۵ے۔ شمس المطابع۔ نظام شاہی روڈ۔ حیدر آباد

۱۵۔ ضابطہ ملازمت سیول سرکار عالی جدید مرمہ قیمت عاں 〃 〃 〃

۱۶۔ ماوراء (نظمیں) از ن۔ م۔ راشد قیمت عسم۔ مکتبہ اردو۔ لاہور

۱۷۔ پرواز لق لق (مزاحیہ) از حاجی لق لق قیمت عسم۔ 〃 〃

۱۸۔ حسن کی قیمت (نیا ایڈیشن) از حکیم احمد شجاع قیمت عہ 〃 〃

۱۹۔ مشین اور مزدور از باری قیمت ۶ر 〃 〃

۲۰۔ جاگیرداری از عبداللہ ملک قیمت ۶ر 〃 〃

۲۱۔ ہندوستان کے لیڈر از یوسف مہر علی مترجمہ اکرام قمر بی اے قیمت ۶ر 〃

۲۲۔ روزنامچوں کے اوراق (مختلف زندگیوں کا نفسیاتی مطالعہ) از مقصود زاہدی۔ مکتبہ ساغر۔ ادبی مرکز۔ میرٹھ

۲۳۔ روح مکاتیب (مشاہیر کے مکتوب) مرتبہ ساغر نظامی۔ 〃 〃 〃

۲۴۔ کاروان (انقلابی نظمیں) از قمر جلال آبادی ۶۴ صفحہ قیمت ۶ر دفتر اخبار اشارہ ہسپتال روڈ۔ لاہور

۲۵۔ پریم پجاری (نیا ایڈیشن) (ایڈورڈ ہشتم اور انکی محبوبہ کے حالات) قیمت ۹ر دفتر رسالہ چاند۔ اردو نگر۔ سہارنپور۔

۲۶۔ دنیائے آرزو (افسانوی روزنامچہ) از میرزا ادیب بی اے۔ ۲۲۰ صفحہ قیمت عہ۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز۔ لاہور

مرزا سیف علیخاں

ادارہ کی خبریں

اردو امتحانات

امیدواران امتحانات | اس سال ادارہ کے اردو امتحانات میں حسب تفصیل ذیل امیدواروں نے شرکت کی۔

امتحان	شریک	حاضر	کامیاب	درجہ اول	درجہ دوم	درجہ سوم
اردو فاضل	۵۵	۴۷	۳۶	۰	۱۴	۲۲
اردو عالم	۱۱۵	۹۹	۶۵	۱	۲۴	۴۰
خوشنویسی	۲۲	۱۹	۱۱	۴	۲	۶
اردو دانی	۴۳۵	۳۴۳	۳۱۷	بہ امتیاز ۷۸		کامیاب ۲۳۹

نتائج امتحانات

اردو فاضل

ناموں کی ترتیب بلحاظ نشانات محصلہ کی گئی ہے۔

رول نمبر	نام		درجہ
۲۱	محمد حسین اظہر	(بلدہ)	دوم
۳۶	سید محمد نور الحسن انور	(گلبرگہ)	دوم
۲۲	محمد عبد الغنی فاروقی	(بلدہ)	دوم

۱۔ مرکز حیدرآباد (سٹی کالج)

رول نمبر	نام	درجہ
۱۰	مغل مرزا نذیر بیگ	دوم
۱۵	سید فدا اللہ حسینی	"
۱۴	میر محبوب علی خاں	"
۱۲	سید احمد محی الدین	"
۷	محمد عبد العزیز	"
۱۹	محمد عبد الوہاب اکمل	سوم
۱۸	سید محمود شاہ قادری	"
۱۳	محمد یوسف	"
۴	حکیم شیخ منصور علی	سوم
۲	محمد مسعود مرزا خاں	سوم
۲۰	محمد عزیز الدین مبشر	سوم
۶	میر حبیب علی امدادی	سوم
۹	محمد غوث الدین داؤدی	سوم
۱	محمد احمد سعید خاں	سوم

۲۔ مرکز حیدرآباد (مدرسہ فوقانیہ نسوان نامپلی)

رول نمبر	نام	درجہ
۱۱	سیدہ بدر رافعہ	دوم
۳	طیبہ بیگم	سوم

۳۔ مرکز پربھنی

رول نمبر	نام	درجہ
۲۴	سید مظفر علی رضوی	دوم
۲۷	شیخ امیر	سوم
۲۵	عبد الحبیب خاں	سوم
۳۳	محمد ناصر انصاری	سوم

نمبر	نام	درجہ
۳۴	لکشمن راؤ	سوم
۲۸	محمد عبدالرزاق فاروقی	سوم
۳۰	سید صدرالدین ہاشمی	"
۳۲	صالح بن محمد	"
۲۹	امین الدین احمد	"
۲۶	محمد نعیم الدین فاروقی	"

۴ - مرکز گلبرگہ

نمبر	نام	درجہ
۳۶	سید محمد نورالحسن انور	دوم
۳۹	ملا ممتاز الدین احمد انصاری	سوم

۵ - مرکز خانہ پور

نمبر	نام	درجہ
۴۱	محمد شمس الدین خاں	دوم

۶ - مرکز نرسی

نمبر	نام	درجہ
۴۳	محمد نذیر الدین	دوم
۴۴	قاضی محمد شریف الدین	"
۴۵	محمد عبدالکریم	سوم

۷ - مرکز پرلی

نمبر	نام	درجہ
۵۳	اشرف الدین فیضی	دوم
۵۲	غلام حسن صدیقی	سوم

اردو عالم

نمبر	نام	درجہ
۱	محمد ظہور الحق معین الدین احمد انصاری (بلدہ)	اول
۵۴	سید داؤد (پربھنی)	دوم
۱۰	شوکت النساء بیگم (بلدہ)	دوم

۱ - مرکز حیدرآباد (سٹی کالج)

نمبر	نام	درجہ
۱۶	محمد بن عمر باکلکا ساکت	دوم
۱۱۵	محمد عبدالرحمن فاضل	دوم
۱۵	سید عبدالغنی	دوم
۲۶	زنگیا دیو درگی	دوم
۱۱۳	غلام محمد	سوم
۱۷	سید احمد	سوم
۲۷	محمد خواجہ معین الدین	سوم
۱۱	سید نورالحسنین	سوم

۲ - مرکز حیدرآباد (مدرسہ فوقانیہ نسواں نام پلی)

نمبر	نام	درجہ
۱۰	شوکت النساء بیگم	دوم (مرکز میں اول)
۲	عطیہ	دوم (" " دوم)
۹	رضیہ بیگم	دوم (مرکز میں دوم)
۳	شمیم آرا	دوم
۳۴	وحید النساء بیگم	دوم
۸	عاشوری بیگم	دوم
۲۳	فاطمہ صغریٰ	سوم
۱۲	سیدہ رحیم النساء بیگم	سوم
۲۲	ساجدہ بیگم	سوم
۴	تمیز النساء بیگم	سوم

۳ - مرکز کلیانی

نمبر	نام	درجہ
۳۵	سید منظور احمد	دوم (مرکز میں اول)
۳۹	محمد حمید الدین	دوم
۳۴	محمد علی خاں	دوم
۳۳	خواجہ شمس الدین	سوم
۳۷	سید مہر علی	سوم

۴۔ مرکز پربھنی

۵۴	سید داؤد	دوم (مرکز میں اول)
۵۳	غلام احمد	دوم
۵۱	محمد عبدالرزاق عثمانی	سوم
۴۳	محمد عبیداللہ خاں	سوم
۵۰	سید عیسیٰ	سوم
۵۵	محمد عظیم الدین	سوم
۵۸	محمد انصاری	سوم
۴۲	محمد عبدالکریم	سوم
۵۲	تاج محی الدین	سوم
۳۹	سید شمس الضحیٰ	سوم
۵۷	محمد بشیر	سوم
۴۷	سید حسین	سوم
۳۸	محمد عبدالوہاب	سوم

۵۔ مرکز گلبرگہ

۶۴	محمد عبدالغنی افسر	دوم (مرکز میں اول)
۶۳	سید امر مہدی نقوی	دوم
۶۲	سید حسام الدین	دوم
۶۵	محمد رحمت اللہ	سوم

۶۔ مرکز کشتگی

۶۶	سعدالدین خاں	سوم

۷۔ مرکز خانہ پور

۶۹	سید ناظر علی	دوم (مرکز میں اول)
۷۶	محمد عبدالمجید خاں قائم خانی	سوم
۷۸	محمد عبدالشکور خاں	سوم
۸۱	محمد عبدالوہاب	سوم
۷۷	محمد عبدالجبار خاں	سوم

۸۔ مرکز نرسی

۸۳	سید غلام دستگیر	سوم (مرکز میں اول)
۹۲	عبدالکریم خاں	سوم
۸۹	عبدالرحیم	سوم
۹۰	سید عثمان	سوم

۹۔ مرکز پرلی

۹۴	سید عبدالخالق	دوم (مرکز میں اول)
۹۵	سید شریف الحسن	سوم

۱۰۔ مرکز پرینڈہ

۹۶	عبدالرشید	سوم (مرکز میں اول)
۱۰۱	سید محمد ابراہیم	سوم
۱۰۰	محمد یونس	سوم

۱۱۔ مرکز کپل

۱۰۵	محمد عبدالمجید	دوم (مرکز میں اول)
۱۰۸	محمد عبدالرشید	دوم
۱۰۳	محمد شرف الدین	دوم
۱۰۴	سید اسمٰعیل علوی	دوم
۱۰۷	سید محبوب حسین	سوم
۱۱۱	محمد عبدالحق	سوم
۱۱۰	محمد امین الدین	سوم
۱۱۲	محمد عبدالقیوم	سوم

۱۲۔ مرکز کپل (نسواں)

۱۰۶	سیدہ حبیب النساء بیگم	سوم

خوشنویسی

۴ محمد غیاث الدین (بلدہ) اول
۳ محمد جہانگیر الدین (") اول
۲۱ سید مرتضیٰ قادری (کپل) اول
۲ محمد صلاح الدین (بلدہ) اول

۱۔ مرکز حیدرآباد

۱ سید اظہر حسین دوم

۲۔ مرکز پربھنی

۶ سید شمس الضحیٰ دوم

۳۔ مرکز کشتگی

۲۲ سید تاج الدین سوم

۴۔ مرکز کاماریڈی

۱۴ سید عزیز الدین سوم

۵۔ مرکز خانہ پور

۱۶ محمد قطب الدین سوم
۱۹ شیخ داؤد سوم

۶۔ مرکز کپل

۲۰ محمد مروان سوم

اردودانی

۲۳ فاطمہ (حیدرآباد) اول
۲۴ کلثوم فاطمہ (") دوم
۲۵ قیصر سلطانہ (") سوم

۱۔ مرکز حیدرآباد (سٹی کالج)

حسب ذیل امیدوار بدرجۂ امتیاز کامیاب ہیں۔

۱۶ مظہر القدوس
۴۶ محمد تفضیل الدین
۴۷ امیر الدین
۴۸ محمد ابراہیم
۵۱ شیخ ابراہیم
۵۴ محمد جلال الدین
۵۷ محمد معین الدین
۵۸ خواجہ مصلح الدین صابری
۶۴ راج لنگم

حسب ذیل امیدوار کامیاب ہیں۔

۱۳ برج موہن لال
۱۵ محمد صلاح الدین
۱۷ خواجہ عقیل احمد
۱۸ خواجہ جمیل احمد
۳۶ محمد حنیف
۴۳ موہن راؤ
۴۴ محمد اسمٰعیل
۴۵ عبدالرحیم
۴۹ مگاسم راؤ
۵۰ محمد علیم الدین
۵۲ شیخ مولانا
۵۳ محمد مولانا
۵۶ میر شوکت علی

۶۲ محمد حسین
۶۳ سید فضل اللہ حسینی
۷۲ گنگا دیال
۷۳ آر بجرنگ پرشاد
۷۵ لکشما ریڈی
۷۶ کے نرسلو
۷۷ بی ویربھدر پا
۷۸ محمد علی
۷۹ مرزا خواجہ بیگ
۸۰ محمد عبدالرشید
۸۱ الیشورایا
۹۲ نرہری
۹۳ حبیب الدین
۹۴ جگناتھ
۹۵ خوش محی الدین احمد
۹۷ ڈی وینکیا
۱۰۰ مرزا محمد علی بیگ
۱۰۱ پانڈو رنگیا
۱۰۲ راملو
۱۰۳ ایم ایس لنگیا
۱۰۵ محمد مولانا
۱۰۶ بندہ علی
۱۰۷ قمرالدین
۱۰۸ شیخ جہانگیر
۱۱۰ حبیب اللہ خاں
۱۱۱ میر عزیز الدین علی
۱۱۲ محمد قاسم
۱۱۵ محمد ہارون الرشید فاروقی
۱۱۸ محمد طاہر رشید فاروقی
۳۸۲ محمد اظہر الدین

۲- مرکز حیدر آباد (مدرسہ فوقانیہ نسواں نامپلی)

بدرجۂ امتیاز کامیاب

۹ امت المنان صداقت النساء
۱۰ امت المومن عصمت النساء
۱۱ حنیفہ بی
۱۴ رام ولاری سکینہ
۱۹ سعید النساء بیگم
۲۰ امام النساء بیگم
۲۱ حفیظ النساء بیگم
۲۶ اقبال جہاں بیگم
۲۷ نزہت آرا
۲۸ رضیہ
۲۹ فاطمہ بی
۳۱ روزان
۳۲ کرین
۳۵ پشپا
۳۷ کنیز فاطمہ
۳۸ سیدہ راحت فاطمہ
۳۹ سیدہ عفت فاطمہ
۴۱ اظہر النساء بیگم
۴۲ امت الرافع شجیع النساء
۵۹ ملکہ بیگم
۶۴ وحید النساء
۶۵ خورشید النساء
۶۶ ذکی النساء
۶۷ عزیز خاتون
۶۸ سکینہ بیگم
۶۹ صفیہ بیگم
۷۱ لطیفہ بیگم
۸۳ حفیظہ بی
۸۴ ہاجرہ بانو
۸۵ نور جہاں
۸۶ آمنہ بیگم
۸۷ عائشہ بیگم
۸۸ بلقیس بیگم
۹۸ صالحہ بیگم
۱۱۳ رضیہ سلطانہ
۱۱۷ افسر سلطان

کامیاب

۶ انور بیگم
۷ حسینی بیگم
۸ افتخار جہاں بیگم
۲۲ تلاوت النساء بیگم
۳۰ روزما
۳۳ شریزہ
۳۴ داؤمنی
۴۰ سیدہ فیاض فاطمہ
۵۵ بی پاشا

۷۰ خورشید بیگم
۸۲ اقبال بیگم
۹۰ امیر النساء بیگم
۹۱ جہانگیر بی
۱۱۳ خورشید سلطانہ

۳۔ مرکز کلیانی (ذکور)

کامیاب

۱۸ نظام الدین (مرکز میں اول)
۱۲ بھیمنا
۱۲ عبد القادر باگ
۱۲۲ نیلکنٹ پرشاد
۱۲۴ محمد عبد الرحیم
۱۲۵ مہادپا
۱۳۰ عبد القادر
۱۳۲ محمد عبد الرزاق
۱۳۰ محمد مستان
۱۴۰ میر محمود علی
۱۳۰ دستگیر حسین
۱۵۶ محمد حمید الدین
۱۵۰ سید اسمٰعیل
۱۵۰ مانک راؤ
۱۵۹ خواجہ حبیب اللہ خاں
۱۶۰ مساجی
۱۶۲ دتو سنگھ
۱۶۳ سید اقبال حسین
۱۶۰ میر انور علی

۱۶۹ محمد فخر الدین
۱۷۰ محمد عظمت اللہ خاں
۱۷۱ محمد عبد الرحیم
۱۷۲ محمد اکبر خاں
۱۷۳ محمد عبد القادر
۱۷۶ نذیر الدین
۱۷۸ منذیر علی
۱۷۹ محمد اسمٰعیل

۴۔ مرکز کلیانی (اناث)

۱۴۱ زیب النساء بیگم (مرکز میں اول)
۱۳۹ زلیخا بیگم
۱۴۰ زاہدہ بیگم
۱۴۲ بیگم جانی
۱۴۴ محمودہ بیگم
۱۴۵ فرخندہ بی
۱۴۶ کریمہ بی
۱۵۲ سردار النساء بیگم
۱۵۳ خواجہ بانو

۵۔ مرکز پربھنی (ذکور)

بدرجۂ امتیاز

۱۸۲ سید حسین (مرکز میں اول)
۱۸۳ مرزا واحد بیگ
۱۸۶ غلام ادریس

کامیاب

۱۸۴ شیخ محی الدین
۱۸۷ عبد العزیز

۱۹۹ محمد ابراہیم
۲۰۱ سید روشن ہاشمی

۶۔ مرکز پربھنی (اناث)

کامیاب

۱۹۱ احمدی بیگم (مرکز میں اول)
۱۸۹ حمیدہ بیگم
۱۹۰ رابعہ بیگم
۱۹۲ حبیب النساء بیگم
۱۹۳ مہر النساء بیگم
۱۹۴ فاطمہ بی
۱۹۵ محمدی بیگم
۱۹۶ افسر بیگم
۱۹۷ رضیہ سلطانہ
۱۹۸ مصطفیٰ بیگم
۲۰۰ حلیمہ بی

۷۔ مرکز گلبرگہ (ذکور)

کامیاب

۲۰۷ محمد عبد القادر (مرکز میں اول)
۲۰۴ محمد عثمان علی
۲۰۵ محمد عبد اللہ
۲۱۵ سید سجاد احمد
۲۱۶ محمود علی
۲۱۷ محمد عبد الرحمٰن

۸۔ مرکز گلبرگہ (اناث)

کامیاب

۲۰۲ نور النساء بیگم (مرکز میں اول)

۲۱۴ کنیز فاطمہ

۹۔ مرکز کشنگی (ذکور)

بدرجۂ امتیاز

۲۴۷ شیخ اسمٰعیل (مرکز میں اول)

کامیاب

۲۲۰ سدپا
۲۲۱ سدرامپا
۲۲۲ کرسدیا
۲۲۸ شیخ حسین
۲۴۹ ڈھونڈی با

۱۰۔ مرکز کشنگی (اناث)

کامیاب

۲۳۶ رضیہ بیگم (مرکز میں اول)
۲۴۵ عالم بی

۱۱۔ مرکز کامارڈی (ذکور)

بدرجۂ امتیاز

۳۰۰ منگیا (مرکز میں اول)
۲۷۴ شیخ علی حسین

کامیاب

۲۵۴ بھومیا
۲۵۵ محمد ابراہیم
۲۵۶ شیخ حیدر
۲۵۸ اے ایس آرانجیولو
۲۵۹ پٹودھن
۲۶۱ سید حمید اللہ
۲۶۲ شیخ احمد اول
۲۶۳ شیخ احمد دوم
۲۶۴ سید کریم الدین
۲۶۵ محمد اعظم
۲۷۲ غلام محی الدین
۲۷۶ سید باقر علی
۲۷۷ محمد عبدالرزاق
۲۷۸ میر حسین علی
۲۷۹ محمد رفیع الدین
۲۸۰ سید واحد علی
۲۸۱ میراں محی الدین
۲۸۲ لوکا ملیا
۲۸۳ اپاوار پٹیا
۲۸۷ ششنکر پا
۲۸۸ گنگا ریڈی
۲۹۲ شیخ سمیع اللہ
۲۹۵ نرسلو
۲۹۷ راگھو راؤ
۲۹۸ پی نتا ریڈی
۲۹۹ گلہ ونکیا
۳۰۲ غلام احمد

۱۲۔ مرکز کامارڈی (اناث)

بدرجۂ امتیاز

۳۰۸ نفیس فاطمہ (مرکز میں اول)

کامیاب

۳۰۹ لکشمی

۱۳۔ مرکز خانہ پور (ذکور)

بدرجۂ امتیاز

۳۱۷ عبدالصمد (مرکز میں اول)
۳۱۶ عبدالصمد

کامیاب

۳۱۰ ظہور علی خاں
۳۱۱ محمد عثمان
۳۱۲ سید اکرام حسین
۳۱۳ سید احمد
۳۱۹ سید اظہر حسین
۳۲۰ محمد عبدالستار
۳۲۱ محمد خواجہ
۳۲۲ گنگا دھر راؤ

۱۴۔ مرکز خانہ پور (اناث)

بدرجۂ امتیاز

۳۲۴ خیر النسا بیگم (مرکز میں اول)
۳۲۷ بسم اللہ بیگم
۳۲۶ عزیز النسا بیگم
۳۲۹ رشیدہ بیگم
۳۳۱ شہزادی بیگم
۳۳۳ حمیدہ بیگم

کامیاب

۳۱۸ محبوب بانو
۳۲۸ زیب النسا بیگم
۳۳۰ مریم بیگم
۳۳۲ کریم النسا بیگم

۳۴۴ آمنہ بیگم

۱۵۔ مرکز نرسی (ذکور)

کامیاب

۳۴۹ سید امین (مرکز میں اول)
۳۲۶ مصطفیٰ خاں
۳۳۷ محمد ابراہیم
۳۴۴ ایوب علی
۳۴۵ شیخ چاند
۳۴۶ محمد ابراہیم
۳۴۷ جبار علی خاں
۳۴۸ عابد خاں
۳۵۰ سید ولی اللہ حسینی
۳۵۱ عبدالکریم
۳۵۲ رحمت علی خاں

۱۶۔ مرکز نرسی (اناث)

بدرجۂ امتیاز

۳۴۰ رفیع النساء (مرکز میں اول)
۳۳۸ اقبال النساء

کامیاب

۳۳۹ کرم النساء
۳۴۲ اقبال النساء بیگم
۳۴۳ میمونہ خاتون

۱۷۔ مرکز پرلی (ذکور)

بدرجۂ امتیاز

۳۵۴ شیخ امیر (مرکز میں اول)
۳۶۱ خواجہ صدیق احمد
۳۷۰ ابوالخیر فاروقی

کامیاب

۳۵۵ محمد اسحاق
۳۵۶ سید رحیم الدین
۳۶۰ ملا محمد اسحاق
۳۶۴ سید عبدالباسط قادری
۳۶۸ اننت
۳۶۹ عبدالغنی
۳۷۱ سید اسد اللہ حسینی
۳۷۲ عبدالرب
۳۷۳ محمد ہاشم
۳۷۴ نصیر الدین
۳۷۵ ڈگمبر
۳۷۶ سلطان خاں
۳۷۷ باپو
۳۷۸ محمد قاسم
۳۷۹ کشن راؤ
۳۸۰ شیخ محبوب
۳۸۱ رؤف الحق
۳۸۳ تاج خاں

۱۸۔ مرکز پرلی (اناث)

بدرجۂ امتیاز

۳۶۶ فاطمہ امت العزیز (مرکز میں اول)
۳۵۸ قمر النساء بیگم
۳۸۴ اقبال النساء بیگم

کامیاب

۳۵۷ اقبال بیگم
۳۵۹ سرلا دیوی
۳۶۲ زیتون بی
۳۶۳ عزت فرزانہ بیگم
۳۶۵ اصغر سلطانہ
۳۶۷ عائشہ امت الحمید
۴۰۵ حقانی بیگم
۳۸۶ امت الہادی بیگم
۳۸۷ افسر النساء بیگم
۳۸۸ وحید النساء بیگم
۳۸۹ صابرہ بیگم

۱۹۔ مرکز پرینڈہ

بدرجۂ امتیاز

۳۹۳ محمد خلیل (مرکز میں اول)
۴۰۶ سید احمد علی

کامیاب

۱۴۷ محمد قاسم
۳۹۰ بشیر الدین
۳۹۱ بھگوان راؤ
۳۹۲ شبیر علی
۳۹۴ محمد مظفر حسین
۳۹۶ محمود
۳۹۷ عطاء الرحمن
۳۹۸ محمد یونس
۳۹۹ عبدالغنی

۴۰۰ شیخ محمد
۴۰۱ محمد حسین
۴۰۳ محمد عبدالرحمٰن
۴۰۴ محمد امیرالدین
۴۰۸ نذیرالدین

۲۰۔ مرکز کپل (ذکور)

بلحاظ امتیاز

۴۳۲ خواجہ معین الدین (مرکز میں اول)
۴۱۲ چندر حسین
۴۱۳ ترنبک راؤ
۴۱۹ سید معین الدین علوی
۴۲۰ محمد فخرالدین

کامیاب

۴۰۹ سید سلطان محی الدین
۴۱۰ محمد عبدالرشید شاہ نوری
۴۱۴ سید حسین علوی
۴۱۵ سید فیاض الدین
۴۱۶ سید شاہد علی
۴۱۷ محمد نفیع الدین
۴۱۸ سید حسین کوتوال
۴۲۱ گنگپا نائک
۴۲۲ محمد جعفر
۴۲۳ محمد عبدالغفور
۴۲۴ محمد عبدالسلام
۴۲۶ واسدیو
۴۲۷ محمد حنیف
۴۲۸ محمد بادشاہ
۴۲۹ ایم سیویا
۴۳۰ سید قربان حسین
۴۳۱ محمد مخدوم علی
۴۳۵ سیویا

۲۱۔ مرکز کپل (اناث)

کامیاب

۴۳۳ امت العزیز

تمغے ۱۹۴۱ء کے کامیاب امیدواروں کے لئے مختلف مخلص دوست احباب کی طرف سے جو تمغے عطا کئے جارہے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

اردو فاضل

نشان سلسلہ	معطی	قسم تمغہ	نام حاصل کنندہ	وجہ تمغہ
۱	آنریبل سر عقیل جنگ بہادر	طلائی	محمد حسین اظہر	اول بہ امتحان
۲	محمد فاروق صاحب دوم تعلقدار	نقرئی	سید منظفر علی رضوی	اول بہ مرکز پربھنی
۳	محمد احسان اللہ صاحب	نقرئی	اشرف الدین فیضی	اول بہ مرکز پرلی

اردو عالم

نشان سلسلہ	معطی	قسم تمغہ	نام حاصل کنندہ	وجہ تمغہ
۱	آنریبل عبدالعزیز صاحب	طلائی	معین الدین احمد انصاری	اول بہ امتحان
۲	بزم رنداں پربھنی	نقرئی	سید داؤد	اول بہ مرکز پربھنی
۳	نواب محمد جلال الدین حسین خاں بہادر الٰہی اسٹیٹ کلیانی	نقرئی	سید منظور احمد	اول بہ مرکز کلیانی
۴	شیخ حسین صاحب	نقرئی	سید عبدالخالق	اول بہ مرکز پرلی
۵	بلونت راؤ صاحب گھانے منصف	نقرئی	سعدالدین خاں	اول بہ مرکز کشتگی
۶	ہدایت احمد صاحب منصف	نقرئی	عبدالرشید	[illegible]

خوش نویسی

۱	ادارۂ ادبیات اردو	نقرئی	محمد غیاث الدین	اول بہ امتحان
۲	سید سجاد حسین صاحب زراعتی تحصیلدار	نقرئی	سید تاج الدین	اول بہ مرکز کشنگی

اردو دانی

۱	احمد عبداللہ صاحب انسپکٹر آبکاری	نقرئی	منگیا	اول بہ مرکز کاماریڈی
۲	نرسا گوڑ صاحب متاجر آبکاری	"	نفیس فاطمہ	اول بہ مرکز " (اناث)
۳	محمد حسین صاحب سب انسپکٹر آبکاری	"	رضیہ بیگم	اول بہ مرکز کشنگی (اناث)
۴	قاضی محمد حسین صاحب سب انسپکٹر آبکاری	"	شیخ اسمٰعیل	اول بہ مرکز " (ذکور)
۵	سبط نبی صاحب منصف کلیانی	"	زیب النساء بیگم	اول بہ مرکز کلیانی (اناث)
۶	احمد حسین صاحب تعلقدار "	"	نظام الدین	" " " (ذکور)
۷	عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری	"	احمدی بیگم	اول بہ مرکز پربھنی (اناث)
۸	عبدالجلیل صاحب مددگار زراعت	"	سید حسین	" " " (ذکور)
۹	سید فیاض الدین صاحب سررشتہ دار عدالت منصفی	"	محمد خلیل	" " پربنیڈہ
۱۰	سید قدرت اللہ صاحب قادری صدر مدرس تحتانیہ بہادل (نقروی)		عبدالرشید	دوم " "

ان کے علاوہ امتحان اردو دانی میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہونے والے جملہ امیدواروں کو ادارہ کی طرف سے آسان اور دلچسپ کتابیں بطور انعام دی گئیں۔

تبدیلی کتب نصاب

اردو امتحانات کی مجلس نصاب کی تحریک اور مجلس انتظامی کی منظوری کے بعد اردو عالم، اردو فاضل اور خوشنویسی کی نصابی کتابوں میں حسب ذیل تبدیلی عمل میں آئی ہے۔ ۱۳۵۱ف م ۱۹۴۲ء کے امتحانوں کے لئے انہی تبدیل شدہ کتابوں کی تیاری لازمی ہے۔

امتحان	پرچہ	سابقہ کتاب	حالیہ کتاب
امتحان اردو عالم	پہلا	سی پارۂ دل یا	باغ و بہار مطبوعہ
"	"	چٹکیاں و گدگدیاں	اعظم اسٹیم پریس
"	"	قواعد اردو حصہ دوم	قواعد اردو حصہ سوم
"	دوسرا	تلخیص عروض یا خضر عروض	بلاغت
امتحان اردو عالم	چوتھا	دنیا کی کہانی	اجتماعی زندگی کی ابتدا
"	پانچواں (خوشنویسی)	رسم الخط نذیر احمد	اردو رسم خط سجاد مرزا صاحب
امتحان اردو فاضل	پہلا	مضامین چکبست	آب حیات
"	تیسرا	آب حیات	جدید اردو شاعری
"	چوتھا	اجتماعی زندگی کی ابتدا	دنیا کی کہانی
"	"	آئین حکومت	۱۔ سیاسیات کی پہلی کتاب
"	"	"	۲۔ ہندوستانی " ب
"	"	"	برطانوی حکومت

" پانچویں پرچہ میں ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء کے لئے حسب ذیل دو مصنفین میں سے کسی ایک کا تفصیلی مطالعہ ضروری ہے۔ اقبال و شبلی۔

امتحان خوشنویسی۔ ایک پرچہ کی جگہ دو پرچوں میں لیا جائے گا۔ جس کا نصاب حسب ذیل ہے۔
پہلا پرچہ۔ ۱۔ انشائے نوراحمد ۲۔ رسم خط آموز اظہرالدین صاحب
دوسرا پرچہ۔ ۱۔ رسم خط از سجاد مرزا صاحب۔ ۲۔ رسم خط از نذیر احمد ۳۔ قواعد اردو حصہ سوم سررشتہ تعلیمات کا آخری حصہ متعلقہ اوقاف۔

ایک نئے امتحان کا آغاز یعنی امتحان اردو زباندانی

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی منعقدہ ۴ آذر ۱۳۵۰ف نے مجلس اردو امتحانات کی حسب ذیل تجویز منظور کر لی ہے جس کی بنا پر ۱۳۵۱ف م ۱۹۴۲ء کے امتحانات کے ساتھ اردو زبان دانی کا بھی امتحان لیا جائے گا جس کی تفصیل یہ ہے۔

گزشتہ دو سال کے عرصہ میں اردو امتحانات کے متعدد مرکزوں اور ادارہ کی شاخوں نیز بیسیوں امیدواروں کی استدعا اور درخواست کی بنا پر یہ مجلس ایک ایسے امتحان کے قیام کی سفارش کرتی ہے جو اردو دانی اور اردو عالم کے امتحانوں کے درمیان ان امیدواروں کی سہولت کے لئے لیا جائے گا جنھوں نے اردو دانی کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد اپنی تعلیم جاری رکھی ہے اور جو چاہتے ہیں کہ علم کے اس ذوق میں اضافہ کریں جو امتحان اردو دانی کی تیاری اور لکھنے پڑھنے کی دنیا میں داخل ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

(۱) اس امتحان کا نام امتحان اردو زبان دانی ہوگا۔

(۲) اس کا معیار سررشتہ تعلیمات (کمشنری امتحانات) کے امتحان زبان دانی کے مماثل ہوگا۔ اور حکومت سرکار عالی کے جو دوسرے سررشتے اردو زبان دانی کا امتحان لیتے ہیں ان کے امتحانات سے بھی اس کی مماثلت برقرار رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۳) اس امتحان میں حسب ذیل دو پرچے تین تین گھنٹے کے ہوں گے اور ان کے علاوہ سو نشانات زبانی امتحان کے لئے مختص رہیں گے۔

پہلا پرچہ۔ نثر و نظم و قواعد .... ۱۰۰ نشانات

دوسرا پرچہ۔ پہلا حصہ (لازمی) مضمون نگاری و خلاصہ نویسی .... ۵۰ "

اس حصہ میں مضمون نگاری کے لئے ۳۵ اور خلاصہ نویسی کے لئے ۱۵ نشانات مخصوص رہیں گے اور اس میں ہر امیدوار کا امتحان لیا جائے گا۔

دوسرا حصہ۔ (اختیاری) .... ۵۰ نشانات

اس حصہ کے لئے حسب ذیل مضامین میں سے کسی ایک کی تیاری کرنی ہوگی۔

(۱) ترجمہ تلنگی یا مرہٹی یا کنڑی سے اردو میں۔

(۲) عام معلومات۔

(۳) ابتدائی امور خانہ داری (برائے طبقۂ اناث)

(۴) امتحان اردو زبان دانی کے لئے کامیابی کے نشانات ۳۳ فیصد اور کسی پرچے میں ۲۵ فیصد سے کم نہ ہوں گے۔

(۵) اس امتحان کی فیس شرکت عام امیدواروں سے چار روپے اور ان امیدواروں سے چھ روپے لی جاتی کی جو کسی سرکاری محکمہ کی طرف سے اس امتحان میں شریک کئے جائیں گے۔

(۶) اس امتحان کے ہر دو تحریری پرچوں کا نصاب حسب ذیل ہوگا۔

پہلا پرچہ۔ نظم و نثر۔ قواعد۔ ۱۔ اردو کی چھٹی کتاب مرتبہ انجمن ترقی اردو۔ ۲۔ قواعد اردو حصہ اول مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب

دوسرا پرچہ۔ عام معلومات کے لئے "شہری اور دیہی معلومات" از غلام رسول صاحب اور ابتدائی امور خانہ داری کے لیے "خانہ داری" مرتبہ ادارہ ادبیات اردو۔

امتحان کے مرکزوں کی رودادیں

مرکز خانہ پور ڈاکٹر عبدالغفار صاحب بی ڈی اس کی رپورٹ کا اقتباس یہ ہے:

میں بحیثیت صدر نگران کار مرکز خانہ پور بتاریخ ۱۹ اگست ۱۹۴۱ء شام کی لوکل ٹرین سے نظام آباد روانہ ہوا۔ اسٹیشن پر ڈاکٹر زور صاحب پروفیسر سروری مسٹر فیض محمد مسٹر غلام جیلانی اور مہتمم صاحب ادارۂ ادبیات اردو نے خدا حافظ کہا۔ رات کے گیارہ بجے ٹرین نظام آباد پہونچی اسٹیشن پر ناظر علی صاحب سے ملاقات ہوئی جو مرکز خانہ پور سے مجھ کو لینے آئے تھے۔ صبح چھ بجے کی بس سے براہ نرمل ناظر علی صاحب کے ساتھ روانہ ہوا ساڑھے دس بجے بس نرمل پہونچی۔ یہاں عبدالوہاب صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جو مع ناظر علی صاحب میرے لینے کے لئے مرکز خانہ پور سے آئے تھے۔ خانہ پور بس اسٹانڈ پر سربراہ معتمد صاحب، طلباء کمرہین، سب انسپکٹر صاحب آبکاری وغیرہ موجود تھے مہتمم صاحب جنگلات کے مکان پر میرے قیام اور طعام کا انتظام کیا گیا تھا۔ جہاں میرا تعارف حسب ذیل اصحاب سے کرایا گیا مہتمم صاحب جنگلات تحصیلدار صاحب انسپکٹر آبکاری منتظم صاحب پولیس [illegible] صاحب وغیرہ [illegible] خصوصیات اور ساتھ ہی اردو دانی کے پھیلانے کے کام کا ذکر رہا

لوکل مدرسہ میں فرنیچر کی کمی کی وجہ سے امتحان مہتمم صاحب جنگلات کے [illegible] منعقد کیا گیا امتحان تحریری بخوبی ختم ہوا۔ زبانی امتحان تحصیلدار صاحب کے مکان میں لیا گیا جس کا انتظام مسٹر نورالدین اور مہرالنسا بیگم صاحبہ نے کیا تھا۔

خانہ پور کی آبادی تقریباً ۳۰۰۰ کے لگ بھگ ہے۔ اس گاؤں کے اطراف گھنا جنگل ہے۔ یہاں ہر وقت اور خصوصاً رات کے وقت درندوں کا ڈر لگا رہتا ہے۔ اس مقام پر افلاس زیادہ ہے اس موضع کے لوگ زیادہ تر لکڑی کی تجارت کرتے ہیں [illegible] کام بھی اچھا ہوتا ہے امتحان ادارہ کے مطبوعہ اعلان کے بموجب مقررہ دنوں اور تاریخوں میں لیا گیا مہر زدہ لفافہ پرچہ جات دو گواہوں کو دکھانے کے بعد اور ان کے دستخط لینے کے بعد چاک کیا گیا۔ جسٹس لچھما ریڈی رکن عدالت العالیہ نے جو بغرض تفریح خانہ پور آئے ہوئے تھے امتحان گاہ اور اس کے انتظام کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا۔ خاص خصوصیت اس مرکز کی یہ تھی کہ تمام امیدوار جو امتحان میں شریک تھے سفید شیروانیوں میں ملبوس تھے۔

نورالدین صاحب بی اے، ایل ایل بی (عثمانیہ) اس تعلقہ کے تحصیلدار ہیں اور جب کبھی آپ مستقر پر رہتے ہیں طلبا کو درس دیا کرتے ہیں۔ الحاج عبدالکریم صاحب مہتمم جنگلات دفتری معلومات کی تعلیم دیا کرتے تھے اور آئندہ بھی اپنی جگہ کو جاری رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد خلیل صاحب جو مستقر کے ڈاکٹر ہیں طلبا کو سائنس کا درس دیا کرتے تھے اور آئندہ بھی اپنی فرصت میں اس مشغلہ کو جاری رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔

شمس الدین صاحب منتظم پولیس خود امتحان اردو فاضل میں شریک تھے۔ اور انھوں نے طلبا کو دامے، درمے، سخنے، غرض ہر طرح کی مدد کی ہے۔ اور سچ کہا جائے تو یہی اس مرکز کے روح رواں ہیں۔

عبدالرشید صاحب شاخ کے نائب معتمد ہیں اور معتمد صاحب کی غیر حاضری میں معتمدی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

تحصیلدار صاحب کی بیگم صاحبہ لڑکیوں کو سینے اور پکوان کی بھی تعلیم دیتی ہیں۔ اور ساتھ ہی امتحان اردو دانی کے لئے تیار بھی کیا ہے۔

مہرالنسا بیگم نے بھی جو زنانہ مدرسہ کی معلمہ ہیں لڑکیوں کو امتحان اردو دانی کے لئے تیار کرنے میں مدد دی۔

مرکز کاماریڈی | مولوی سید کاظم حسین صاحب بی اے (مدراس) اپنی رپورٹ میں تحریر فرماتے ہیں :- مرکز کاماریڈی سے اس سال امتحان اردو دانی میں مجموعی ۴۰ خواست گزاروں کے ۳۶ نے شرکت کی جن میں طلبہ کی تعداد ۳۴ اور طالبات کی ۲ رہی۔ امتحان ۱۵، ۱۶ اور ۱۶ مہر ۱۳۵۰ف کو مدرسہ وسطانیہ کاماریڈی میں منعقد ہوا۔ مولوی احمد عبداللہ صاحب انسپکٹر آبکاری نے قبل از قبل نشستوں کا معقول انتظام کیا تھا۔ مولوی عبدالرزاق صاحب نے جو دفتر انسپکٹر آبکاری کے اہلکار ہیں نگرانی میں کافی مدد دی۔

امیدواروں میں اکثر و بیشتر اطراف و اکناف کے قصبہ جات کے رہنے والے تھے۔ ہر امیدوار تھوڑی بہت اردو بولنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ مولوی احمد عبداللہ صاحب نے فرمایا کہ اگر انھیں کافی موقع ملتا تو ممکن تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ امیدواروں کو فراہم کر سکتے انھوں نے کاماریڈی میں ادارہ کی شاخ قایم کرنے کا خیال بھی ظاہر فرمایا۔ کاماریڈی میں گو انجمن اتحاد المسلمین کی ایک شاخ قایم ہے لیکن اس سے ادارہ امتحانات کو عوام میں مقبول بنانے میں کسی قسم کی توقع نہیں۔ البتہ اگر ادارہ کی شاخ قایم ہو جائے تو آئندہ ترقی کے امکانات زیادہ ہو جائیں گے۔

مدرسہ وسطانیہ کاماریڈی کے اساتذہ صاحبان ہمارا ہاتھ بٹا سکتے ہیں بشرطیکہ انھیں اس پر آمادہ کیا جائے، ورنہ کام آسانی سے ہو سکتا ہے

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سال امتحان اردو دانی میں ایک گریجویٹ یعنی طیلسانی بھی شریک تھے۔

مولوی واحد علی صاحب سب انسپکٹر آبکاری نے بھی اپنے حلقے سے چند امیدوار امتحان میں شریک کروائے۔

مرکز کشنگی | مولوی اکبرالدین صاحب صدیقی بی اے کی رپورٹ کا اقتباس یہ ہے :- میں کشنگی بروقت پہنچا اور پرچوں کی تقسیم بروقت عمل میں آئی۔ امتحان گاہ کے لئے مدرسہ کی عمارت مخصوص کی گئی تھی۔ شرکاء امتحان تو بہت زیادہ تھے لیکن وبائی امراض اور سقامت ہنگام کی وجہ سے امتحان کے وقت متعدد غیر حاضر تھے نگرانی کا معقول انتظام کیا گیا اردو دانی کے امتحان کے دن مولوی محمود حسین صاحب صدر مدرس اوران کے ایک مددگار نگرانی کے لئے موجود رہے اور بعد کے دو دنوں میں دوسرے دو مدرسین نے نگرانی کے فرائض انجام دئے۔ سقامت ہنگام نے تو اب یہاں تک نوبت پہنچا دی ہے کہ سڑک کے علاوہ دور دراز کے کچے راستوں پر تنہا سفر خطرے سے خالی نہیں۔ کشنگی پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ان کو تعلیم دینے کے فرائض بھی عہدہ داران مقامی نے اپنے تفویض کر لئے تھے اور رات میں دس بجے تک درس و تدریس کا شغل جاری رہتا تھا۔ لیکن ان میں بھی حاضر رہنے والے وہی لوگ ہوتے جن کا مستقر ہی کشنگی ہے اور جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ گزشتہ دو نوں امتحانات کے موقعوں پر عہدہ داران مقامی نے نہ صرف شرکاء امتحان ادارہ کو ممکنہ سہولتیں بہم پہنچائیں بلکہ دوران امتحان میں امتحان ہال میں تشریف لاکر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا اور نہ صرف علم دوستی کا بلکہ میرے المکلف و الداعی بن کر مہمان نوازی کا بھی۔

میرے محترم میزبانوں کے خلوص کا یہ عالم تھا کہ مجھے اس وقت ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ویسے پرخلوص الفاظ بھی نہ مل سکے۔

مرکز کپل | مولوی خیرالدین صاحب وکیل و واعظ کی روداد مرکز کا خلاصہ یہ ہے :- اسٹیشن کپل پر مولوی مرزا سرفراز علی صاحب بی اے ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر تعلیمات ضلع کپل و دیگر اراکین ادارہ موجود تھے موصوف نے میرے قیام اور دیگر امتحانات سے متعلق جملہ امور میں میری پوری امداد فرمائی۔

امتحانات مدرسہ فوقانیہ کی عمارت میں لے گئے۔ ٹھیک وقت مقررہ پر بموجودگی مولوی سید عبدالحی صاحب مہتمم کوتوالی و مولوی بہادر خاں صاحب وکیل و مولوی مرزا سرفراز علی صاحب امتحانات کے پرچے جو سربمہر تھے کھولے گئے اور طلبہ کو تقسیم کئے گئے اور ختم وقت پر جملہ کاپیاں امتحان کی میں سربمہر کی گئیں اور یہی عمل جملہ پرچہ جات کے لئے کیا گیا۔

مرکز اناث مدرسہ سے قریب ایک مدرس صاحب کے مکان میں تھا اس کی نگران کار ایک مدرس صاحب کی اہلیہ تھیں۔

ختم امتحان پر ۱۷ مہر ۱۳۵۰ف کو ۱ بجے شام کو مدرسہ فوقانیہ

کپل میں امتحانات ادارہ کے قواعد کے عنوان پر ایک تقریر کے لئے جلسہ قرار دیا گیا جس کی صدارت پنڈت ونکوبہ راؤ صاحب امل تعلقدار ضلع کپل ... نے کی۔ ابتدا میں ... نے اردو امتحانات پر ایک تقریر کی جو بہت ... چنانچہ عام ... کے بعد مسٹر ... اچاری وکیل اور ایک دوسرے وکیل ... نوجوان ... علی صاحب مہتمم تعلیمات کپل کی تقریریں ہوئیں۔ صدارتی ... تعلقدار صاحب نے اردو کے امتحانات سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اور ادارہ و منظر کا شکریہ ادا کیا۔ اس جلسہ میں تمام عہدہ داران ... معززین رعایا و طلبہ کا کافی مجمع تھا۔

مرکز کپل کے امتحانات میں ایک امر نہایت مسرت بخش قابل ... ہے کہ مدرسہ فوقانیہ سے عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر کی خدمت ... کی گئی کہ ... امتحانات ادارۂ ادبیات اردو مدرسہ کی عمارت ... کو منانا چاہ ... اجازت دی جائے۔ عالیجناب نواب صاحب نے اس کی اجازت ... عطا فرمائی جس سے ان کی اردو سے دلچسپی ظاہر ہے۔

ادارے کی شاخیں

ہمناباد ۲۰ آبان ۱۳۵۰ف کو ہمناباد میں ایک جلسہ کیا گیا جس میں ادارہ کی شاخ کے لئے حسب ذیل عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

۱۔ سید اسمٰعیل صاحب وکیل ہائیکورٹ .... صدر
۲۔ مولوی سید شیر الزماں صاحب سوداگر .... معتمد
۳۔ " مرزا فقیر محمد بیگ صاحب .... رکن انتظامی
۴۔ " احمد خاں صاحب .... " "
۵۔ " سید امیر محمد صاحب سوداگر .... " "
۶۔ " محمد امتنان علی صاحب سوداگر .... " "

کپل حسب تحریک مولوی مرزا سرفراز علی صاحب بی اے بی ٹی ڈپٹی ... مہتمم تعلیمات ضلع کپل بتاریخ ۱۱ فروردی ۱۳۵۰ف اس شاخ کا آغاز ہوا۔

مولوی محمد حسین صاحب مدرس وظیفہ یاب نے معتمدی و مولوی حاجی عبدالرزاق صاحب پیش امام مسجد یوسفیہ نے نائب معتمدی و مولوی قاضی امین الدین صاحب نے خزانچی کے فرائض کو انجام دیتے ہوئے اراکین ادارہ ہذا مولوی میر سعادت علی صاحب و مولوی سید امین الدین صاحب وکلا و مولوی سید فیض علی صاحب و عبدالرشید صاحب مدرسین مدرسہ فوقانیہ کے تعاون سے کپل کو مرکز قرار دینے میں انتہائی جد و جہد سے کام لیا جو مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ کپل کی عمارت میں حسب منظوری عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہٗ مرکز قرار پایا۔

مولوی خیر الدین صاحب نے صدر دفتر ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی جانب سے اس مرکز کی صدارت کی اور بطور امداد عالیجناب مہتمم صاحب تعلیمات و مولوی سید اختر علی صاحب بی اے و مولوی فیض علی صاحب مولوی کامل و مولوی محمد قمر الدین صاحب بی اے مسٹر نارائن راؤ صاحب بی ایس سی و ہنمنت راؤ صاحب گنگا وتی سرینواس راؤ صاحب مدرسین مدرسہ فوقانیہ اور زنانہ کے لئے مولوی سید فیض علی صاحب کی اہلیہ محترمہ نے نگرانی کی۔

بعد ختم امتحان بتاریخ ۱۱ مہر ۱۳۵۰ف بوقت ۵ بجے شام منجانب ادارہ جلسہ منعقد ہوا جس میں جملہ معزز عہدہ داران مقامی و وکلا وغیرہ شریک رہے۔ حسب تحریک مہتمم صاحب تعلیمات و بتائید مولوی قمر الدین صاحب عالیجناب ونکوبہ راؤ صاحب تعلقدار ضلع کپل نے کرسی صدارت کو شرف بخشا۔

صدر نگران کار مولوی خیر الدین صاحب نے موضوع "امتحان" کی تشریح فرماتے ہوئے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد اور اس کے امتحانات کا تعارف کرایا۔ پھر مسٹر ... کستا چاری صاحب وکیل نے تقریر کی۔ آخر میں انھوں نے اپنی مادری زبان کی تحصیل کی اہمیت اور ساتھ ہی ساتھ امتحان ادارہ کے تحصیل کی ترغیب دی پنڈت جنار دھن راؤ صاحب ایل ایل بی نے تشریح کی کہ پنڈت موصوف کے خیالات میں ہمیں فائدہ معلوم نہیں ہوتا پورے ہندوستان اور خاص کر

وکنیوں کا اردو کی تحصیل سے ضرور۔ بات زندگی کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ اس کے
بعد مہتمم صاحب تعلیمات کپل کی تقریر نے تضیع اوقات کرنے والوں اور غافلوں
کو تازیانہ کا کام کیا یہ فرمایا کہ "بیکار نہ رہ کچھ تو کیا کر" کا مفہوم اس طرح
ادا ہوگا اور کچھ نہ کچھ تو کیا بہت کچھ حاصل ہو جائے گا اور ثابت کردیا
کہ انسان حصول علم سے انسان کہلانے کا مستحق ہے لہذا موقع کو غنیمت
جان کر ان امتحانات میں شریک ہونے اور انسان بننے کی طرف تشویق
دلائی جس سے علم سے گریز کرنے والوں میں بھی شوق پیدا ہوگیا۔
عالیجناب پنڈت وینکوب راؤ صاحب تعلقدار صدر نشین جلسہ نے
قیام شاخ ادارہ سے خوشنودی ظاہر فرماتے ہوئے شرکا کو مبارکباد
دی اور حوصلہ افزا الفاظ سے جلسہ کو کامیاب بنایا۔

۱۸ ر بہمن ۱۳۵۰ف ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں باتفاق آرا شاخ
ہذا کے حسب ذیل عہدہ دار منتخب ہوئے۔

صدر۔ مولوی سید فیض علی صاحب مولوی کامل
معتمد۔ " محمد حسین صاحب مدرس وظیفہ یاب
نائب معتمد۔ حاجی عبدالرزاق صاحب پیش امام
منتظم " محمد امین الدین صاحب قاضی و مدرس

اراکین :-

۱۔ مولوی محی الدین شریف صاحب قاری
۲۔ " اختر علی صاحب بی اے
۳۔ مسٹر نارائن راؤ صاحب بی یس سی
۴۔ مولوی میر سعادت علی صاحب وکیل
۵۔ " عبداللہ خان صاحب رئیس کپل
۶۔ " فضل الرحمن صاحب حکیم یونانی
۷۔ " حسین شریف صاحب وکیل
۸۔ " نورالدین صاحب صیغہ دار تحصیل کپل
۹۔ " مرتضیٰ قادری صاحب خوشنویس
۱۰۔ " محمد عبدالرشید صاحب مدرس
۱۱۔ مسٹر بشنو پنت صاحب ناظر تعلیمات ضلع کپل
۱۲۔ مولوی عبدالسبحان صاحب مدرس
۱۳۔ " محمد سرور صاحب مدرس
۱۴۔ " شرف الدین صاحب "
۱۵۔ " محمد عبدالملک صاحب تاجر اسٹیشنری مارٹ
۱۶۔ " عبدالحق صاحب صدر مدرس یلبرگہ
۱۷۔ " سید محبوب حسین صاحب صدر مدرس ہٹن ہال

پرلی

شاخ ادارہ ادبیات اردو پرلی کا ایک غیر معمولی جلسہ بصدارت
حکیم مولوی فخر الدین صاحب منشی فاضل (پنجاب) بتاریخ ۲۳ ر بہمن ۱۳۵۰ف
روز جمعہ منعقد ہوا جس میں پرلی کے اصحاب ذوق اور علم دوست
کے علاوہ محمد یٰسین صاحب جلالی اور سید داؤد صاحب ہاشمی
ادبیات اردو پربھنی نے بھی شرکت فرمائی۔

معتمد شاخ پرلی نے تفصیلی رپورٹ سنائی جس کا اقتباس یہ

یکم تیر ۱۳۵۰ف کو ایک جلسہ منعقد ہوا اور باتفاق آرا منظور کیا گیا کہ پرلی میں
ایک شاخ قایم کی جائے جس کے صدر حکیم مولوی فخر الدین صاحب منشی فاضل
(پنجاب) معتمد غلام حسن صدیقی خطیب اور اراکین مولوی سید عبدالرزاق صاحب
جعفری مولوی افلاطون خان صاحب آمین، مولوی اشرف الدین صاحب
فیضی، ابوالخیر فاروقی اور محترمہ طاہرہ بیگم صاحبہ مقرر کئے گئے۔

حضرات! حقیقت یہ ہے کہ ادارہ ادبیات اردو کی قدر و قیمت
اور اس کی حقیقی اہمیت نے ہمیں بھی واقعیت پسند اور حقایق آشنا بنا دیا
ہے۔ ہمارا یہ مقصد نہیں تھا کہ صرف برائے نام پرلی میں شاخ قائم کردی
جائے اور کام کی جگہ خالی رہے جب شاخ کا قیام ہوچکا تو ہم لوگ بے
محابا کام کی طرف دوڑ پڑے، چنانچہ حالیہ امتحان میں یہاں سے اردو دانی
میں (۳۶) امیدوار شریک ہوئے، جن میں مرد، عورت، بچے، بوڑھے
اور ہندو مسلم سب ہی شریک ہیں۔ اسی امتحان کے ایک امیدوار کا ذکر

اس موقع پر شاید بے موقع تصور نہ فرمایا جائے گا۔ یہ صاحب ایک معمول اور سربرآوردہ خاندان کے سرپرست اعلیٰ ہیں ان کی عمر اندازاً و تخمیناً نہیں بلکہ حقیقت میں (۷۰) سال ہے ہماری کوششوں کا داؤ ان پر بھی چل گیا۔ چنانچہ آج کل یہ مدرسہ میں شریک ہیں اور اپنی مثال سے دوسرے ان پڑھ نوجوانوں کو درس شوق دے رہے ہیں۔

حضرات! یہ امتحان "اردو دانی" کا ذکر تھا۔ "اردو عالم" میں سترا غازہ کار گیارہ امیدوار تعلیم پاتے رہے ان سب کی تعلیم اور باقاعدہ تدریس کا مفت بندوبست کیا گیا تھا۔ اسی طرح "اردو فاضل" میں چار امیدوار تعلیم پاتے رہے ان کی تعلیم کا بھی مفت انتظام کیا گیا تھا مگر بعض موانع کی وجہ سے دو شریک امتحان ہوئے۔

محترم حضرات! آخر میں، میں ایک مکتوب کا مختصر اقتباس آپ حضرات کو سنانا چاہتا ہوں۔ خط لکھنے والی ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاتون سیدہ عزیز النساء بیگم ہیں اور مدرسہ نسواں اردو پیٹھ بیڑ کی صدر معلمہ ہیں۔ اس اقتباس سے آپ حضرات اس امر کا اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اس قلیل مدت میں اس شاخ نے کس قدر شہرت اور اس کے کام نے کس قدر مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ اقتباس درج ذیل ہے۔

"قابل فخر ہیں وہ اکثر زندہ اور روح ہستیاں جنھیں طبقۂ اناث کی تعلیم اور ان میں بیداری پیدا کرنے کا خیال آیا۔ مجھے یہ سن کر دلی مسرت ہوئی کہ ضلع بیڑ میں اس کام کی پہل مولوی غلام حسن صاحب صدیقی اور آپ (مولوی اشرف الدین صاحب فیضی) نے کی، پری امتحان گاہ سے اول آنے والی امیدوارہ کو میں انعام دوں گی۔"

حضرات! اس سال یہاں جو امتحانات ہوئے ان کی صدر نگرانی کے فرائض جناب پروفیسر مہدی علی صاحب نے انجام دیے۔ صاحب موصوف نے یہاں تک تکلیف گوارا فرما کر اور ہمارے ناچیز کام کا عینی مشاہدہ فرما کر صرف یہی نہیں کہ ہم کو ممنون کرم فرمایا ہے بلکہ ہماری ہمتوں میں ایک نئی تازگی اور ہماری طبیعت میں اک تیزی کی روح پھونک دی ہے۔ ہمیں محترم پروفیسر صاحب سے توقع ہے کہ ہماری شاخ کے مخصوص حالات اور ہماری پُرخلوص خدمات

ادب، ارباب ادارۂ ادبیات اردو پر ظاہر فرمائے جائیں گے۔

اگر میں ایک باہمت شخص کی پیہم کوششوں اور نت نئی جد و جہد کا ذکر نہ کروں تو میری احسان فراموشی ہوگی حقیقت یہ ہے کہ یہ ... مولوی اشرف الدین صاحب فیضی کا ہے، ان کی کوشش اور ... اگر شامل حال نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

حسب احکام صدر ادارہ، نشان ۵۲/۱۴۸ مورخہ ... حسب ذیل کابینہ کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر حکیم مولوی فخر الدین صاحب منشی فاضل (پنجاب)، معتمد: غلام حسن خان، مولوی محمد نواز الدین صاحب کتب خانہ دار، مولوی سید عبدا...

اراکین:- مسٹر دینا نوبارا ڈہوکے دھتمانیہ، مولوی افلاطون خان، مولوی شیخ حسین صاحب، محترمہ طاہرہ بیگم صاحبہ، محترمہ نیاز النساء بیگم، مولوی اشرف الدین صاحب فیضی فتح آبادی۔

اس کے بعد جناب صدر نے ایک معلومات آفریں صدارتی تقریر ... آخر میں مولوی اشرف الدین صاحب فیضی نے معزز مہمانوں اور حاضرین ... ادا کیا اور اعلیٰحضرت سلطان العلوم، خانوادۂ آصفی اور بانیٔ ادارہ محترم محی الدین صاحب قادری زور کی صحت و سلامتی کی دعا پر جلسہ ختم ہو گیا۔

عطیۂ مخطوطات | عالیجناب نواب عنایت جنگ بہادر نے از ... ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانۂ مخطوطات کے لئے قدیم دکنی اردو کی قلمی ... حسب ذیل اکیس (۲۱) مجلد کتابیں عطا فرمائی ہیں۔

تحفۃ الاحباب، راجی۔ سیف الملوک، بخواہی پنچھی بلیا، وجدی۔ مجموعہ دین دیپک الفت۔ روضۃ الشہدا، ولی۔ حملۂ حیدری۔ صفا چندربدن۔ مقیمی۔ چندربدن و مہیار، محمد آیا۔ دیوان شیر محمد خان ایمان۔ ترجمہ شرح دیوان میر (فارسی و اردو)۔ کلیات سودا۔ چہار درویش، میر امن دہلوی۔ قصہ ہمیشہ بہار، نواب میر حسین علیخاں۔ رقعات بہار عالم۔ مرغوب، نواب میر حسین علیخاں۔ چہار درویش نواب میر حسین علیخاں۔ مذہب عشق۔ مثنوی بدر منیر۔

ادارہ کی طرف سے نواب صاحب موصوف کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کیا جاتا ہے